جنوری ۱۹۹۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہواری علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی　　　۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد

۳۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی　　　۴۔ ضیاء الدین اصلاحی

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے　　　فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ــــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۳ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۴ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

جمہوریت کو موجودہ دور کا سب سے مقبول اور پسندیدہ طرز حکومت سمجھا جاتا ہے، ہندوستان میں بھی آزادی کے بعد یہی طرز
رائج ہوا مگر رفتہ رفتہ یہاں اس کی بڑی مضحکہ خیز اور بدنما صورت سامنے آنے لگی ہے جس کا مشاہدہ نئے دن ہوتا رہتا ہے، اس جمہور
تصویر بت بگڑتی جا رہی ہے وہاں ہر شعبۂ زندگی میں تنزل و انحطاط تیزی سے شروع ہوگیا ہے، اخلاقی پستی اور معاشی خرا
بڑھ رہی ہے معمولی دفتروں سے لیکر ایوان بالا تک لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم ہے تعلیم گاہوں اور عدالتوں میں بھی رشوت، بد
ناانصافی، دھاندلی، کنبہ پروری، فرض ناشناسی اور کام نہ کرنے کا رجحان وبائی بیماریوں کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہوئی ہے کہ جمہوریت نے لوگوں کو آزاد، بے لگام اور غیر مکلف بنا دیا ہے، نہ کسی پر کسی طرح
ذمہ داری ہے اور نہ پابندی، ہر چیز کی چھوٹ مل گئی ہے جس کام پر آدمی مامور ہے اسے انجام دینا اس کی مرضی پر منحصر ہے اس کے
اسے مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ اس پر کوئی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے لیکن خود اسے ہر طرح کے حقوق حاصل ہیں جس میں کو
کمی نہیں ہونی چاہیئے اگر اس پر کسی طرح کی قدغن لگائی جاتی ہے تو وہ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے ہر قسم کے طریق
کرتا ہے، ہڑتال، دھرنا اور مرن برت سے لیکر تشدد اور خون ریزی تک پر آمادہ ہو جاتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ دفتروں میں نہ
طور سے کام ہو رہا ہے اور نہ کام نہ کرنے پر کوئی باز پرس ہوتی ہے، معمولی معمولی کاموں کیلئے عام آدمیوں کو سینکڑوں با
لگانا پڑتا ہے، خوشامد، سفارش اور رشوت کے بعد بھی کام ہو جائے تو بڑی بات ہے، قانون و قاعدہ اور عدل و انصا
کی بالادستی ختم ہو گئی ہے۔

تعلیم پر قوموں کی فلاح و ترقی اور افراد کی سیرت و کردار سازی کا دار و مدار ہوتا ہے اور تعلیم گاہیں ہی وہ کارخا
جہاں لائق اور مناسب اشخاص ڈھل کر نکلتے ہیں مگر انکا جو ابتر حال ہے اس میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ ا
اشخاص مہیا کر سکتی ہیں جن کی ذہنی و دماغی قابلیت سے قوم و ملک کا کچھ بھلا ہو سکتا ہے، تعلیم کو ایک کاروبار بنا لیا
ہے اور عام کاروباری معاملات ہی جیسے اسکے بھی معیار وضع کر لیے گئے ہیں جن کے لیے فن تعلیم سے مناسبت اور ذہا
و استعداد کی کوئی شرط نہیں رہ گئی ہے بس ڈگری ہونی چاہیے خواہ وہ کسی طرح سے بھی حاصل کی گئی ہو، اسی لیے اسا
اور کالجوں اور اسکولوں کا نظام چلانے والوں کو تعلیم و تربیت کے اصلی مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، رہی سہی کسر جگہ جگہ
سے وابستہ لوگ پوری کر دیتے ہیں جن کی کارستانی مزید برآں انگیز ہے، ایسی صورت میں ع چہ کار طفلاں تمام خواہد شد۔

چنانچہ پڑھنے لکھنے کے علاوہ طلبہ کی دلچسپی کے میدان کچھ اور ہی ہو گئے ہیں، وہ امتحان میں نقل کو اپنا حق تصور کرتے ہیں جس کے نہ ملنے پر وہ ہر آفت ڈھانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

بیابان کی اس شب تاریک میں اپنے محدود وسائل و ذرائع کے باوجود دینی مدارس قندیل رہبانی بن کر ملک کے گوشے گوشے کو جگمگا رہے تھے، ان کے اخلاص، ایثار اور قناعت پسند طلبہ، اساتذہ اور منتظمین اپنے فرائض منصبی کی تکمیل میں حسبۃً للہ مصروف تھے، یہ لوگ نہ کسی مراعات کے خواستگار ہوتے تھے اور نہ اپنے حقوق و مطالبات کو منوانے کے لیے ہنگامے اور شور شیں برپا کرتے تھے، الحمد للہ بعض بعض مدارس میں جو حکومت کی امداد و سرپرستی کے بغیر مسلمانوں کے عام چندے سے چل رہے ہیں یہاں اور فضا ابھی تک برقرار ہے اور وہاں لوگ تعلیم و تعلم کے مشغلے میں یکسوئی کے ساتھ منہمک ہیں لیکن جو مدارس کی نگاہیں حکومت کے سیم و زر کی طرف اٹھیں وہ اس کا سبز باغ دیکھ کر للچا اٹھے ان کا حال جدید تعلیم گاہوں جیسا ہو گیا ہے، اخلاص، برکت اور روحانیت غائب ہوتی جا رہی ہے، نظم و ضبط کا حال بدتر ہو رہا ہے، نہ طلبہ کو پڑھنے سے غرض اور نہ اساتذہ کو پڑھانے سے واسطہ، سب یک گونہ بار میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے ہی ہاتھوں مدارس کی تباہی کا سامان کر رہے ہیں، موجودہ ہوش ربا گرانی میں جس پر قابو پانے میں حکومت بالکل ناکام ہو گئی ہے اچھی اور معقول تنخواہوں کا بندوبست ضرور ہونا چاہیے لیکن کیا حکومت کی دریوزہ گری کے بعد مدارس کی خصوصیات و امتیازات باقی رہ سکتے ہیں۔

اجودھیا کی بابری مسجد کو شر پسندوں نے مرکزی و صوبائی حکومتوں کی ملی بھگت سے ڈھا دیا اب دوسری مساجد کی تباہی و بربادی کے لیے بھی حکومت نے دام ہم رنگ زمین بچھایا ہے، ائمہ مساجد کی تنظیم اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس کو پردھان منتری کا آشیرواد حاصل ہے، وہ مسجدوں کے ائمہ اور موذنوں کی خستہ حالی سے بہت "دکھی" ہیں اس لیے ان کی تنخواہوں کی ادائی کا بوجھ محکمۂ اوقاف اور حکومت کا خزانۂ عامرہ برداشت کرے گا۔ جو حکومت بابری مسجد اور مسلمانوں کے جان و مال کا تحفظ نہیں کر سکی اور جس کا رویہ مسلمانوں کے معاملے میں ہمیشہ معاندانہ رہا ہے اور جس نے انہیں دوسرے اور تیسرے درجے کا شہری بنا دیا ہے آخر وہ ائمہ مساجد پر کیوں اس قدر مہربان ہو گئی ہے، اس راز کو بھلا یہ دو رکعت کے امام کیا

سمجھیں گے اور انہیں یہ صدائے غیبی کس طرح سنائی دے سکتی ہے۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یہ تو فقہا اور مفتیانِ کرام ہی بتائیں گے کہ اذان و امامت کی اجرت جائز ہے یا ناجائز ؟ لیکن چند سکوں اور معمولی فائدوں کے لیے مساجد کی تباہی و بربادی کا آلۂ کار بن جانا کس قدر شرمناک ہے۔ اگر ائمہ میں غیرتِ ایمانی کی کوئی چنگاری باقی ہے تو انہیں دانہ و دام لے کر آنے والے صیادوں سے صاف صاف یہ کہہ دینا چاہیے کہ

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہہ کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اترپردیش کے وزیرِ اعلیٰ مسٹر ملائم سنگھ یادو نے دہلی میں آل انڈیا سیکولر فرنٹ کے استقبالیہ جلسہ میں بتایا کہ ان کی حکومت نے اردو کو یو۔ پی میں دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے کچھ اقدامات کیے ہیں، وزیرِ اعلیٰ کا اردو کے ان حامیوں کا مذاق اڑانا بجا ہے جو اردو کی وکالت انگریزی میں کرتے ہیں، ابھی تک کم و بیش تمام حکومتوں کا رویہ اردو کے ساتھ معاندانہ رہا ہے، کمزور اور مظلوم طبقوں کے حامی وزیرِ اعلیٰ ہی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی تلافی کریں گے، دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرنے سے اردو کی ترقی نہیں ہو سکتی، یہ اس کی موت کا پیش خیمہ ہے، جو لوگ اس طرح کے شوشے چھوڑتے ہیں ان کا مقصد اردو کے مسئلے کو الجھانا ہوتا ہے، وزیرِ اعلیٰ کو اس سے ہوشیار رہنا چاہیے، اردو والے اردو کو اس کی شناخت اور امتیاز کے ساتھ باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

ماہرِ علم الانسان ڈاکٹر خلیل عباس صدیقی (کلکتہ) علامہ شبلی توسیعی خطبات کے سلسلے میں دار المصنفین تشریف لائے اور ۲۶ دسمبر کو "ہندو مسلم تعلقات" کے موضوع پر اپنا عالمانہ خطبہ دیا جس میں شہر کے معزز ہندو مسلمان شریک ہوئے اور خطبہ بہت پسند کیا گیا۔

مقالات

مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ

کچھ خیالات، کچھ تاثرات

از ضیاء الحسن فاروقی

۳ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ڈیفنس آف انڈیا آرڈیننس کے تحت مولانا آزاد کو حدود بنگال سے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے رانچی (بہار) کا انتخاب کیا کہ دہلی، پنجاب، یو۔ پی اور مدراس میں پہلے ہی سے انکا داخلہ ممنوع تھا اور یہ خیال بھی تھا کہ کلکتے سے قریب ہونے کی وجہ سے رانچی میں رہکر شاید وہ تصنیف و تالیف اور البلاغ کی طباعت کا کام جاری رکھ سکیں لیکن جولائی کے اوائل میں رانچی میں انکی نظر بندی کے احکامات جاری ہو گئے اور پھر باہر کی دنیا سے انکا تعلق ختم ہو گیا۔ اب بس نظر بندی کی تنہائی میں ان کی دل و دماغ کی دنیا آزاد تھی، اس نے ہار نہیں مانی۔ بعد میں ترجمان القرآن کے طبع اول کے دیباچے میں انھوں نے اپنی اس کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"اب میرے اختیار میں صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا، یعنی تصنیف و تسوید کا مشغلہ۔ نظر بندی کی انیس دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی مجھے اس سے نہیں روکتی تھی، میں نے اس پر قناعت کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے خیال کیا کہ اگر زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر بھی لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اس کے نتائج

محفوظ ہیں تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی۔
میں اسی عالم میں پوری زندگی بسر کر دے سکتا ہوں"[1]

تذکرہ کی تصنیف ابھی مولانا آزاد کے قیام رانچی پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انکے ایک دوست فضل الدین احمد نے وہاں پہونچ کر انہیں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنا خود نوشت لکھیں اور یہ کہ وہ جلد از جلد اسے مرتب کر دیں۔ مولانا نے عہد اکبری کے ایک بزرگ شیخ جمال الدین معروف بہ شیخ بہلول دہلوی کے احوال سے جو ان کے ننھیالی بزرگ (سکردادا کے) تھے اس کا آغاز کیا، لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے بعض اکابر اسلام کی دعوت و عزیمت کے کارناموں کے بیان تک دراز ہو گیا جو انجام کار حق و صداقت کی راہ میں علمائے حق کے دعوتی موقف، مجاہدانہ سعی و عمل اور جذبۂ ایثار و قربانی کے اظہار کی ایک موثر اور دلآویز داستان بن گئی۔ اسی کا نام تذکرہ ہے فضل الدین احمد نے اس کے مقدمہ میں تفصیل سے لکھا ہے کہ تذکرہ کس طرح لکھا گیا اور کن حالات میں شایع ہوا اس کے مصنف کو اس پر نظر ثانی کا موقع نہیں دیا گیا اور اسے اخباروں سے پتہ چلا کہ تذکرہ چھپ گیا ہے فضل الدین احمد کو معلوم تھا کہ اگر کتاب کا مسودہ نظر ثانی کے لیے مصنف کو دیا گیا تو پھر شاید کبھی اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئے۔

تذکرہ جس شکل میں چھپا، مولانا آزاد اس سے خوش اور مطمئن نہ تھے فضیلت علمی سے متعلق ان کا ایک معیار تھا، یقیناً وہ چاہتے ہوں گے کہ وہ چھپنے سے پہلے مسودہ کو عالمانہ طرز پر ایڈٹ کریں اور حسب ضرورت اس کے بعض ٹکڑوں کو از سر نو لکھیں،

[1] مولانا ابو الکلام آزاد "ترجمان القرآن" جلد اول، ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی ۱۹۶۴ء ص ۱۹
[2] مولانا ابو الکلام آزاد "تذکرہ" ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن، نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۳۱۔

اس کے حوالوں اور حاشیوں پر احتیاط کی نظر ڈالیں اور حاشیوں میں جہاں جہاں اختصار کی ضرورت ہے وہاں عبارتوں کو مختصر کر دیں۔ انہیں تو اس کا بھی موقع نہیں ملا کہ فضل الدین کے مقدمہ میں ہی کچھ ترمیم و تنسیخ کر سکیں، چنانچہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کو اپنے ایک خط میں انھوں نے لکھا: "دراصل اس تذکرہ کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں"[1]

رانچی میں اگرچہ ان کا تعلق رانچی کے باہر کی دنیا سے ختم سا ہو چکا تھا، مولانا کی مصروفیتیں خاصی تھیں، تذکرہ لکھنے کے دوران ہی انھوں نے سیرت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ قلم بند کی جس میں متوسط تقطیع کے ایک سو تہتر (۱۷۳) صفحات تھے اور حدیث بدء الاسلام غریباً و سیعود کما بدء کی تشریح و توضیح شرح حدیث غربت کے نام سے لکھی جس میں سو (۱۰۰) صفحے تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ کتابیں چھپ نہ سکیں اور تذکرہ کے بقیہ مسودات کی طرح ان کے مسودے بھی ضایع ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ترجمان القرآن پر اپنی پوری توجہ کی، لیکن اس کی تسوید کی داستان خاصی المناک ہے کہ مولانا کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز اور حکومتِ وقت کی دار و گیر کے سبب اسے بھی ایک دورِ انتشار و آلام سے گذرنا پڑا تب کہیں جا کر ۱۹۳۱ء میں ترجمان القرآن کی پہلی جلد بشمول تفسیر سورۂ فاتحہ جو ان کا شاہکار ہے، شایع ہو سکی[2]

رانچی کے شب و روز | رانچی میں علمی سرگرمیوں کے علاوہ مولانا آزاد مقامی جامع مسجد میں جمعہ کے دن مسلمانوں کو خطاب بھی کرتے تھے اور آسان زبان میں انہیں اسلام کی بنیادی تعلیمات سمجھاتے تھے اور ہمیشہ اس بات کو ضرور کہتے تھے مسلمانوں کو پورے

---

[1] مولانا آزاد کا خط، معارف (اعظم گڈھ) جلد ۷۲، شمارہ نومبر ۱۹۵۳ء ص ۳۰۹ [2] ترجمان القرآن (ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن) ج ۱، مولانا آزاد کا مقدمہ۔

طور پر اپنے وجود کی تمام توانائی کے ساتھ اسلام میں داخل ہونا چاہیے جس کا مطلب اللہ تعالیٰ کی مکمل اور غیر مشروط فرمانبرداری اور بندگی ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کی فرمانروائی کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ رانچی سے متصل مورآبادی گاؤں میں جہاں وہ رہتے تھے ان کی کوششوں سے ایک مسجد کی تعمیر عمل میں آئی اور رانچی میں ایک مدرسہ اور ایک ادارہ انجمن اسلامیہ کے نام سے قائم ہوا جس کا مقصد مقامی مسلمانوں کی تنظیم اور اشاعت اسلام تھی۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ رانچی تشریف لے گئے تھے، وہاں سے آنے کے بعد یکم اپریل ۱۹۱۹ء کو انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو مندرجۂ ذیل خط لکھا جو کئی لحاظ سے مولانا آزاد کے سوانح نگاروں کے لیے اہم ہے:

"اعظم گڈھ

یکم اپریل ۱۹۱۹ء

مکرم! السلام علیکم

والانامہ ملا۔ ایک عشرہ اپنے مرکز سے غائب رہا، رانچی پہونچا، تین برس کے بعد مولانا ابوالکلام کی زیارت ہوئی، بڑے تپاک سے ملے، بڑی مسرت ظاہر کی، خوب خوب صحبتیں رہیں، وہ تطبیق معقول ومنقول کے دیرینہ ذائقہ سے گھبرا گئے ہیں۔ آج کل ابن تیمیہ اور ابن قیم کا رنگ غالب ہے۔ فقہ وعقائد میں ہر چیز میں ٹھیک ظاہریت مسلک ہے۔ رانچی کی شوروسنگستانی زمین ان کے سحر زبان اور جادوئے بیان سے پانی ہوگئی ہے، وہ بھی میٹھا۔ مدرسہ کی عمارت چھوٹی لیکن خوبصورت اور شاندار بنی ہے، لوگ بہت مانتے ہیں..."[1]

---

[1] عبدالماجد دریابادی، مکتوب سلیمانی، ج ۱، ص ۱۱۴ - ۱۱۵۔

ابھی اوپر جن بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے ایسا لگتا ہے کہ مولانا آزاد اپنے آپ کو ان ہی علمارِ حق کے سلسلہ کی ایک کڑی تصور کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو تذکرہ دراصل اظہارِ ذات کی ایک کہانی ہے جس میں مذکورہ اکابرین فکر و عمل ایک رمز و علامت کی حیثیت رکھتے ہیں، مولانا آزاد کا خیال تھا کہ ان کی پوری زندگی تصدیقِ حق اور اثباتِ صداقت کے اسی رمز کی ایک عملی تفسیر ہے اور آیندہ بھی یہی ان کی راہِ عزیمت ہوگی۔

تذکرہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں اصلاحِ حال کا جذبہ پیدا ہو اور انہیں اخلاقی انحطاط کی دلدل سے نکالا جائے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ظلم و تعدی کے خلاف مسلمانوں کے ضمیر کو بیدار کیا جائے تاکہ سیاسی و سماجی اداروں پر قابض اربابِ اقتدار کی ناانصافیوں کا متحد ہو کر مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ ایک طرح کا اصلاحی کام تھا، اس لیے تذکرہ کے اندازِ نگارش اور طرزِ استدلال کو کسی قدر جذباتی ہونا ہی تھا، اس میں یہ جو بعض افراد اور گروہی تعصب کے حامیوں سے متعلق تنقید کا لہجہ خاصا سخت و تلخ ملتا ہے، اس کا سبب بھی وہی تذکرہ کے مقاصد کی اصلاحی و دعوتی نوعیت ہے، لیکن اس کے باوجود کہیں بھی مولانا نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے جو غیر معقول ہو۔

تذکرہ، الہلال اور البلاغ | تذکرہ اپنے بنیادی پیغام کے لحاظ سے الہلال اور البلاغ کے اسی مشن کا تسلسل تھا جس کی اشاعت وہ اپنے ان اخبارات کے ذریعہ پہلے ہی سے کر رہے تھے۔ الہلال اور البلاغ میں انھوں نے مذہبی اور سیاسی امور میں طبقۂ علمار اور جدید تعلیم یافتہ جماعت دونوں کے یک رُخے، تنگ نظر اور متعصب عناصر کی انتہاپسندیوں کو اپنی تنقید و ملامت کا ہدف بنایا تھا اور مسلمانوں پر یہ واضح کیا تھا کہ اچھی باوقار زندگی کے لیے اسلام کے نزدیک حقوقِ انسانی اور شرفِ آزادی کتنی اہم باتیں

اہمیت کے حامل ہیں۔ عہد اکبری کے مذہبی تنازعوں سے متعلق ایک پُر درد لہجے میں بحث کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ ان بے بنیاد جھگڑوں کا اصل سبب افراط و تفریط کا وہ انتہا پسندانہ رویہ تھا جن میں ایک طرف متعصب اور تنگ نظر علماء تھے جنھیں انھوں نے " علمائے سُوء اور بندگانِ دنیا"[1] کہا ہے اور دوسری طرف وہ " مدعیان تحقیق جدید و اجتہاد فکر" تھے جنھیں انھوں نے " حکمت و دانشمندی اور مذہب عقلی اور طریق حکیمانہ کے نام سے الحاد و بے دینی اور اباحت و بے قیدی"[2] کا مبلغ لکھا ہے اور پھر اس صورتِ حال کے آئینہ میں اپنے زمانہ کے حالات پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

" یہی صورت حال آج بھی درپیش ہے۔ مذہب کے دکانداروں نے جہل و تقلید اور تعصب و ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے اور روشن خیالی و تحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت و اجتہاد کے لباسِ فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسہ میں علم ہے، نہ محراب مسجد میں اخلاص اور نہ میکدے میں رندانِ بے ریا۔ اربابِ صدق و صفا ان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ انکی راہ دوسری ہے:

ہم کعبہ و ہم بت کدہ سنگِ رہ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم ہم

عہد اکبری میں بھی اربابِ حق و صفا کا جو گروہ تھا، وہ ان دونوں سے الگ تھا اور چونکہ دربار شاہی پر بدبختانہ یکے بعد دیگرے انہیں دو گروہوں کا تسلط رہا، اسلئے ان کو طرح طرح کے مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت شیخ جمال الدین بھی

۱؎ تذکرہ ص ۴۴　۲؎ ایضاً ص ۴۰۔

ان دونوں مسئلوں سے جن کے باعث شیخ جمال الدین کو صعوبتیں اٹھانی پڑیں مولانا آزاد کو خاص دلچسپی ہوگئی، شاید اس لیے کہ خود ان کے وطن میں کبھی ان مسائل کی وجہ سے بڑے بڑے معرکہ ہائے دار و رسن برپا ہو چکے تھے اور ان کے اپنے زمانے میں علما اور مورخین کے حلقوں میں ان سے متعلق پُرجوش بحث و نظر کی گرم بازاری تھی (اور اب بھی ہے)؛ غالباً اسی لیے مولانا نے مناسب سمجھا کہ ان دونوں مسئلوں پر (اپنے خیال میں) ایک متوازن نقطۂ نظر پیش کریں۔ پہلے معاملے سے متعلق انھوں نے لکھا:

"اصلاً تو یہ بات ٹھیک تھی۔ فی الحقیقت خلیفۂ وقت و ارباب حل و عقد و اصحاب شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حق اجتہاد حاصل ہے اور اسی کے سد باب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنیاد ڈالی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اکبر بالکل مذہب سے بے خبر تھا اور اس کے مشیروں کا رنگ دوسرا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا (اور نکلا) کہ بادشاہ کی امامت و اجتہاد بے قیدی اور الحاد کا ایک محکم ذریعہ بن جاتی اور بالآخر بنی۔ اس لیے ضرور تھا کہ علمائے حق کو اس محضر کے قبول کرنے میں تامل ہو۔"[1]

مولانا آزاد کا خیال ہے کہ سید محمد جونپوری کے اس دعوے کو کہ وہ مہدی ہیں، کسی طرح غیر معمولی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مہدی کے معنی ہیں ہدایت یافتہ، اور ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے کسی روحانی تجربے کا اظہار یہ کہہ کر کیا ہو کہ وہ 'مہدی ہیں' اور ان کے عقیدت مند پیروؤں نے ان کے 'مہدی آخر الزماں' ہونے کا اعلان کر دیا ہو۔ مولانا نے لکھا ہے کہ "اکثر اہل اللہ اور علمائے حق کی نسبت منقول ہے کہ سید محمد جونپوری ... سے حسن ظن رکھتے تھے یا اقلاً ان کے بارے میں توقف و سکوت سے کام لیتے تھے۔"[2]

---

[1] تذکرہ، ص ۱۴۱ [2] ایضاً ص ۴۰۔

ان دونوں مسئلوں سے جن کے باعث شیخ جمال الدین کو صعوبتیں اٹھانی پڑیں، مولانا آزاد کو خاص دلچسپی ہوگی، شاید اس لیے کہ خود ان کے وطن میں کبھی ان مسائل کی وجہ سے بڑے بڑے معرکہ ہائے [illegible] برپا ہو چکے تھے اور ان کے اپنے زمانے میں بھی علماء اور مورخین کے حلقوں میں ان سے متعلق پُرجوش بحث و نظر کی گرم بازاری تھی (اور اب بھی ہے)۔ غالباً اسی لیے مولانا نے مناسب سمجھا کہ ان دونوں مسئلوں پر (اپنے خیال میں) ایک متوازن نقطۂ نظر پیش کریں۔ پہلے معاملہ سے متعلق انھوں نے لکھا:

"اصلاً تو یہ بات ٹھیک تھی۔ فی الحقیقت خلیفۂ وقت و ارباب حل و عقد و اصحابِ شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حق اجتہاد حاصل ہے اور اسی کے سد باب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنیاد ڈالی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اکبر بالکل مذہب سے بے خبر تھا اور اس کے مشیروں کا رنگ دوسرا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا (اور نکلا) کہ بادشاہ کی امامت و اجتہاد، بے قیدی اور الحاد کا ایک محکم ذریعہ بن جاتی اور بالآخر بنی۔ اس لیے ضرور تھا کہ علمائے حق کو اس محضر کے قبول کرنے میں تامل ہو۔"[1]

مولانا آزاد کا خیال ہے کہ سید محمد جونپوری کے اس دعوے کو کہ وہ مہدی ہیں، کسی طرح غیر معمولی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مہدی کے معنی ہیں ہدایت یافتہ، اور ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے کسی روحانی تجربے کا اظہار یہ کہہ کر کیا ہو کہ وہ مہدی ہیں، اور ان کے عقیدتمند پیروؤں نے ان کے "مہدی آخر الزماں" ہونے کا اعلان کر دیا ہو۔ مولانا نے لکھا ہے کہ "اکثر اہل اللہ اور علمائے حق کی نسبت منقول ہے کہ سید محمد جونپوری [illegible] سے حسن ظن رکھتے تھے یا اقلاً ان کے بارے میں توقف و سکوت سے کام لیتے تھے۔"[2]

اور اس سلسلہ میں انھوں نے شیخ داؤد جہنی وال (۱۴۰۶-۱۵۷۴/۷۵) شیخ جمال الدین شیخ وجیہ الدین گجراتی (۱۵۰۵-۱۵۸۹) شیخ علی متقی (۱۴۸۰/۸۱-۱۵۶۷) شیخ بڈھ دانا پوریؒ اور شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳-۱۷۶۲) جیسے اکابر علم و تقوی کا نام لیا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض خواطر و واردات ان پر ایسے گزرے ہوں کہ وہ خود اپنے روحانی تجربے سے متعلق دھوکے میں پڑ گئے۔ "ملک کی جو حالت اس وقت ہو رہی تھی وہ یقیناً ایک مہدی ہی کے ظہور کی مقتضی و منتظر تھی نہ کہ ایک مضل و دجال کی"[1] ان کے خیال میں ہو سکتا ہے کہ سید محمد جونپوری کو ایک غلط فہمی یہ ہوئی ہو کہ لفظ 'مہدی' کو انھوں نے 'مہدی آخر الزمان' سمجھ لیا کہ درحقیقت انتظار اسی مہدی کا ہے اور عام شہرت بھی اسی کی ہے۔ پھر بھی یہ رائے اس صورت میں ہے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ انھوں نے 'مہدی آخر الزماں' ہونے ہی کا دعوی کیا تھا اور یہ بات قطعی طور پر ثابت نہیں ہے کہ انھوں نے یہ دعوی کیا، البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کے معتقدوں اور مریدوں کی خاصی بڑی تعداد نے اس وقت یہی سمجھا اور اس بات کو خوب شہرت بھی دی۔

مالک رام صاحب کی قیاس آرائی مالک رام صاحب ایک اچھے محقق ہیں' غالبیات اور ابوالکلامیات میں ان کی تحقیقات نہایت وقیع ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے تدوین و ترتیب کا ایک شاندار معیار قائم کیا ہے، لیکن کبھی کبھی ان کا چونکا دینے والی بات کہنے کا شوق' خود ان کے معیار تحقیق کو مجروح کر دیتا ہے۔ بحیثیت ایڈیٹر کے تذکرہ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: "تذکرہ کا غائر مطالعہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان

---

[1] انکی تاریخ پیدائش و وفات نہ معلوم ہو سکی۔ شیر شاہ سوری کے معاصر تھے جو اپنے قیام بہار کے زمانے میں انکی جوتیاں سامنے لاکر رکھتا تھا۔ [2] تذکرہ' ص ۶۱ (حاشیہ)

(مولانا) کے دل میں رہ رہ کر کوئی خیال کروٹیں لے رہا ہے"۔[1] یہ خیال کیا تھا؟ مالک رام صاحب اسے مبہم ہی رکھتے ہیں، لیکن مولانا آزاد کا ایک بے درد سوانح نگار اس ابہام کو لے اڑا اور آزاد پر کھل کر یہ الزام عائد کر دیا:

"اگرچہ آزاد اب اپنے متعلق حزب اللہ کے قائد کی حیثیت سے کچھ نہیں لکھ رہے تھے لیکن واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلیفۂ وقت یا مہدی یا اسی قبیل کی کوئی چیز منوانے کے لیے زمین ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔[2]

مالک رام صاحب کا مذکورہ بیان تذکرہ کے دو ٹکڑوں پر مبنی ہے، جن سے ہمارے نزدیک کسی طرح یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس زمانے میں مولانا آزاد کے ذہن میں راسخ العقیدگی کے منافی کسی قسم کا کوئی خیال پرورش پا رہا تھا۔ بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کے بزرگ شیخ جمال الدین (معروف بہ بہلول دہلوی) کے علمِ حدیث سے گہرے شغف، تقدس و تقویٰ اور بلندیٔ کردار کا ذکر کیا ہے۔[3] اسے پڑھ کر آزاد کے دل و دماغ پر ایک خاص اثر ہوا اور اسے بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"یہ شہادت دیکھ کر طبیعت کو نہایت درجہ خوشی ہوئی، کہہ نہیں سکتا کہ یہ خیال کس درجہ سرورِ قلب و کیفِ دماغ کا باعث ہوا کہ الحمد للہ علمِ حدیث و سنت کی خدمت و چاکری کی سعادت سے ہمیشہ یہ خاندان ممتاز رہا ہے اور 'بہ ننگِ محدثین' ذوقِ سنت اور 'باطلِ دنیا کارے نہ داشتن' کی دولت ابتدا ہی سے ہم خاک نشینان نقرونامرادی

[1] تذکرہ، پیش لفظ، ص ۱۱۔ [2] آئی۔ ایچ۔ ڈگلس، ابوالکلام آزاد (انگریزی)، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۶۔ [3] بدایونی، منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۱۳۔ واضح رہے کہ تذکرہ میں جو دو فقرے ہیں، وہ شیخ جمال الدین کے متعلق بدایونی کے ہیں۔

اور اس سلسلہ میں انھوں نے شیخ داؤد جہنی وال (۷۵/۱۵۷۴-۱۴۰۶) شیخ جمال الدین، شیخ وجیہ الدین گجراتی (۱۵۸۹-۱۵۰۵) شیخ علی متقی (۱۵۶۷-۸۱/۱۴۸۰) شیخ بڈھہ دانا پوری[1] اور شاہ ولی اللہ (۱۷۶۲-۱۷۰۳) جیسے اکابر علم و تقویٰ کا نام لیا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض خواطر و واردات ان پر ایسے گزرے ہوں کہ وہ خود اپنے روحانی تجربے سے متعلق دھوکے میں پڑ گئے۔" ملک کی جو حالت اسوقت ہورہی تھی وہ یقیناً ایک مہدی ہی کے ظہور کی مقتضیٰ و منتظر تھی نہ کہ ایک مضل و دجال کی۔[2]

ان کے خیال میں ہوسکتا ہے کہ سید محمد جونپوری کو ایک غلط فہمی یہ ہوئی ہو کہ لفظ 'مہدی' کو انھوں نے 'مہدی آخر الزماں' سمجھ لیا کہ درحقیقت انتظار اسی مہدی کا ہے اور عام شہرت بھی اسی کی ہے۔ پھر بھی یہ رائے اس صورت میں ہے کہ یہ ثابت ہوجائے کہ انھوں نے 'مہدی آخر الزماں' ہونے ہی کا دعویٰ کیا تھا اور یہ بات قطعی طور پر ثابت نہیں ہے کہ انھوں نے یہ دعویٰ کیا، البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کے معتقدوں اور مریدوں کی خاصی بڑی تعداد نے اس وقت یہی سمجھا اور اس بات کو خوب شہرت بھی دی۔

مالک رام صاحب کی قیاس آرائی مالک رام صاحب ایک اچھے محقق ہیں' غالبیات اور ابوالکلامیات میں ان کی تحقیقات نہایت وقیع ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے تدوین و ترتیب کا ایک شاندار معیار قائم کیا ہے، لیکن کبھی کبھی ان کا چونکا دینے والی بات کہنے کا شوق' خود ان کے معیار تحقیق کو مجروح کر دیتا ہے۔ بحیثیت ایڈیٹر کے تذکرہ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: "تذکرہ کا غائر مطالعہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان

---

[1] انکی تاریخ پیدائش و وفات نہ معلوم ہوسکی۔ شیر شاہ سوری کے معاصر تھے جو اپنے قیام بہار کے زمانے میں انکی جوتیاں سامنے لاکر رکھتا تھا۔ [2] تذکرہ' ص ۱۶ (حاشیہ)

(مولانا) کے دل میں رہ رہ کر کوئی خیال کروٹیں لے رہا ہے"[1] یہ خیال کیا تھا؟ مالک رام صاحب اسے مبہم ہی رکھتے ہیں، لیکن مولانا آزاد کا ایک بے درد سوانح نگار اس ابہام کو لے اڑا اور آزاد پہ کھل کر یہ الزام عائد کر دیا:

"اگرچہ آزاد اب اپنے متعلق حزب اللہ کے قائد کی حیثیت سے کچھ نہیں لکھ رہے تھے لیکن واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلیفۂ وقت یا مہدی یا اسی قبیل کی کوئی چیز منوانے کے لیے زمین ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"[2]

مالک رام صاحب کا مذکورہ بیان تذکرہ کے دو ٹکڑوں پہ مبنی ہے، جن سے ہمارے نزدیک کسی طرح یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس زمانے میں مولانا آزاد کے ذہن میں راسخ العقیدگی کے منافی کسی قسم کا کوئی خیال پرورش پا رہا تھا۔ بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کے بزرگ شیخ جمال الدین (معروف بہ بہلول دہلوی) کے علم حدیث سے گہرے شغف، تقدس و تقویٰ اور بلندی و آزادیِ کردار کا ذکر کیا ہے[3]، اسے پڑھ کر آزاد کے دل و دماغ پر ایک خاص اثر ہوا اور اسے بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"یہ شہادت دیکھ کر طبیعت کو نہایت درجہ خوشی ہوئی، کہہ نہیں سکتا کہ یہ خیال کس درجہ سرورِ قلب و کیفِ دماغ کا باعث ہوا کہ الحمد للہ علم حدیث و سنت کی خدمت و چاکری کی سعادت سے ہمیشہ یہ خاندان ممتاز رہا ہے اور 'برنگ محدثین' ذوقِ سنت اور 'بااہلِ دنیا کارے نہ داشتن' کی دولت ابتدا ہی سے ہم خاک نشینانِ فقر و نامرادی[4]

---

[1] تذکرہ، پیش لفظ، ص ۱۱ [2] آئی۔ ایچ۔ ڈگلس، ابوالکلام آزاد (انگریزی) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۲۶ [3] بدایونی، منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۱۳ [4] واوین میں جو دو فقرے ہیں، وہ شیخ جمال الدین کے متعلق بدایونی کے ہیں۔

کے حصے میں آئی ہے۔ عجب نہیں کہ یہ بادۂ کہن وقت کی خمار آلودگیوں کے علی الرغم پھر جام و مینا کی گردش تک پہونچے اور یہ سرمستیِ پارینہ واردئے تازہ سے ترکیب پاکر ہنگامۂ گزشتہ اور شورش رفتہ کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کا عالم پھر از سرِ نو تازہ کردے:

بہ بدمستی سنزد، گر متہم سازد مرا ساقی
ہنوز از بادۂ پارینہ ام پیمانہ بو دارد[1]"

ایک ٹکڑا تو یہ ہے جسے مالک رام صاحب نے نقل کیا ہے اور دوسرا وہ جو تذکرہ میں اس مقام سے لیا گیا ہے جہاں رانچی کی نظربندی کے پہلے ہی مہینے میں جو رمضان المبارک کا مہینہ تھا، "عشرۂ اخیر کی شب ہائے تمنا اور روز ہائے انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں" کا ذکر ہے، جہاں تصنیف و تالیف کی مشغولیتوں کا بیان ہے کہ "تمامتر کتاب عزیز و سنت مطہرہ کی شرح و تفسیر پر مشتمل ہیں" جہاں چند مہینوں کے اندر ہی نئے دروازوں کے کھلنے اور کتنے ہی پچھلے فیصلوں کے معطل ہونے کی صدا آتی ہے اور جہاں وہ اپنا یہ احساس قلمبند کرتے ہیں کہ عاشقی جسے ہم کمالِ ہنر تصور کرتے تھے وہ بھی اپنی غفلتوں کے سبب ننگ و عار ثابت ہوئی[2]۔ اب وہ ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے جسے پڑھ کر مالک رام صاحب کو معاً خیال آیا کہ "وہ کوئی خاص دعویٰ کرنے کو پر تول رہے ہیں[3]"۔ مولانا لکھتے ہیں:

"زمانے کو کل تک جہاں تک جانا تھا، الحمدللہ اب خود اس سے بھی منزلوں آگے بڑھ چکے ہیں اور گو ہمرہانِ راہ اب تک اسی منزل میں کمریں کھولے بے فکر

---

[1] تذکرہ، ص ۳۰۲ [2] ایضاً، ص ۳۴۵ - ۳۴۳ [3] ایضاً، پیش لفظ ...

پڑے ہیں، مگر اپنا کاروان طلب اب کسی دوسری ہی منزل کے آثار سامنے دیکھ رہا ہے:

مے کہ می رود امروز در گلوئے دو کون[1]

کمینہ جرعۂ تہ شیشہ ہائے دوش من است[2]

ہمارے نزدیک مذکورہ بالا دونوں ٹکڑوں میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے جس کی بنا پر کسی کو یہ مغالطہ ہو کہ مولانا آزاد ۱۹۱۶ء میں رانچی میں کوئی خاص دعویٰ کرنے کے مرحلے پر پہونچ چکے تھے۔ مالک رام صاحب اپنی اس بے بنیاد قیاس آرائی کے لیے پہلے حزب اللہ اور پھر ۱۹۲۰ء میں مسئلہ امامت کا ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ حزب اللہ اور مسئلہ امامت' دونوں سے متعلق اردو اور انگریزی میں خاصا مواد فراہم ہو چکا ہے' ان میں کہیں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو مذہب میں راسخ العقیدگی اور سیاست و معیشت میں تنظیم' اصلاح اور آزادی کے رائج الوقت تقاضوں کے منافی ہو۔

مولانا آزاد کی راہ اعتدال و توازن کی راہ مذہبی' علمی اور سیاسی مسائل میں مولانا آزاد تفریط و انتہا پسندیوں کے درمیان اعتدال و توازن کی راہ کو پسند کرتے تھے، اس سے یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ انہیں اصول و کلیات کے معاملہ میں کوئی کسی سمجھوتہ پر آمادہ کر سکتا تھا۔ آزاد کی طبیعت کی یہ افتاد تذکرہ کے درج ذیل اقتباس سے آشکارا ہے۔ اعلام الموقعین عن رب العالمین (جلد ۳، قاہرہ، ۱۳۲۵ھ ص ۲۲۰) ابن قیم (۱۲۹۲ - ۱۳۵۰ء) کی ایک عبارت کی تشریح اور عقائد و احکام و نصوص سے

[1] تذکرہ ص ۳۳۵ [2] ایضاً ص ۱۲۔

متعلق کتاب و سنت کی مرکزی حیثیت سے تصدیق و توثیق کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"... یعنی صحیح راہِ حق و اعتدال (کہ) یہ ہے کہ دو اصل ہیں اور دونوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ہر حال میں کتاب و سنت و نصوص شرعیہ کو مقدم رکھنا چاہئے اور اسی پر حکم و عمل کرنا چاہیے، دوسری یہ کہ تمام ائمۂ اسلام اور علمائے حق سے حسن ظن اور محبت و ارادت رکھنی چاہیے اور ان کے مراتب و حقوق کی رعایت سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ یہی دو اصل ہیں جن کے توازن و تناسب کو باعتدال ملحوظ نہ رکھنے سے ساری مصیبتیں پیش آتی ہیں اور بدبختانہ لوگوں نے ہمیشہ ان ہی میں افراط و تفریط کی ہے.... اور دنیا میں جس وقت سے نوعِ انسانی آباد ہوئی ہے، ہمیشہ گمراہی کے یہی دو بھیس رہے ہیں یا افراطِ بغض نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے یا افراطِ محبت نے:

ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر

لیکن اہلِ حق کی صراطِ مستقیم ان دونوں سے الگ ہے:

میانِ کعبہ و بت خانہ راہیست[1]

اور آزاد کا یہ طرزِ فکر اور ان کی افتادِ طبع کا یہ اظہار کوئی تذکرہ ہی تک محدود نہیں، اس سے پہلے الہلال اور البلاغ میں بھی ہمیں یہی بات ملتی ہے، عمر اور تجربے کے ساتھ ان کے اس موقف اور طریقِ فکر میں اور بھی پختگی آئی اور ان کی زندگی ان کے کردار کے اس وصف کی آئینہ دار بن گئی۔

---

[1] تذکرہ، ص ۵۶-۵۴۔

تذکرہ اور ترجمان القرآن | یقیناً نصوص کتاب و سنت کے سوا کوئی چیز حق و باطل کا معیار اور حجت و برہان نہیں ہوسکتی لیکن مولانا نے علماء کو توجہ دلائی کہ کتاب و سنت کو ان کی حقیقی روح کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ یہ کہ ہم انہیں فقہی ضابطوں کے بے لچک فریم ورک میں بٹھانے کی کوشش کریں۔ انھوں نے کہا کہ علماء اپنی روایتی دانشوری کو خیرباد کہہ کر تقلید کی بے جا پاسداری کی تنگ نائے سے نکلیں اور تعلیماتِ قرآنی کی آفاقی اور دائمی حقیقتوں کی نورانی فضا سے ذہن انسانی کو منور کریں۔ ان کی شاہکار تصنیف ترجمان القرآن کا یہی پیغام ہے جس کی چمک سے تذکرہ کے بعض مقامات پہلے ہی روشن ہو چکے تھے۔

تذکرہ مولانا آزاد کے ارتقائے خیال کی اولین منزلوں میں سے ہے۔ اس لیے صرف فکرِ آزاد کا مخصوص مطالعہ کرنے والوں نے ہی اس پر خاص توجہ کی ہے اور ترجمان القرآن اور تذکرہ کا سرسری مطالعہ کرنے والوں نے یہ رائے قائم کرلی ہے کہ چونکہ ان دونوں تصانیف کے درمیان کوئی پندرہ برس کا وقفہ ہے' اس لیے اصولاً تذکرہ والے مولانا آزاد میں اور ترجمان القرآن کے مولانا آزاد میں فرق ہونا چاہیے اور ایسے لوگ بڑی قطعیت سے یہ بات کہتے ہیں کہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے مولانا آزاد (اپنے بنیادی فکر کے لحاظ سے) بدل گئے تھے۔ بہرحال یہ نقطۂ نظر گفتگو کا موضوع بن سکتا ہے۔ لیکن ہمیں پروفیسر محمد مجیب کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے (بنیادی فکر میں) اس وقفہ کے دوران کوئی تبدیلی نہیں ہوئی وہ لکھتے ہیں:

" مولانا آزاد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ (خیالات کے ارتقا کی راہوں سے گزر کر) ایک مسلم لیڈر سے ترقی کرکے ہندوستان کے مدبر رہنما (بھی) بنے، تذکرہ میں

اس موڈ (کیفیت ذہنی) کا عکس نظر آتا ہے جس میں اثباتِ حق کے لیے جم جانے کا شوق و ولولہ غالب تھا اور مولانا کی یہ آرزو تھی کہ اس راہ میں ان کے ساتھ ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہو جائے جو ان کی روحانی زبان کو سمجھتے ہوں اور جنھیں ایک عظیم اخلاقی روایت کو زندہ رکھنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ یہاں ان کے اسلوب اور استدلال میں وہ ایک زیریں امکان، ایک گہری تنا ئجلی محسوس ہوتی ہے جو کلمۂ حق یعنی وحیِ الٰہی کی تشریح کی صورت میں ترجمان القرآن میں پوری ہوئی۔ تذکرہ اور ترجمان القرآن ایک دوسرے کے متمم ہیں اور ترجمان القرآن کی روشنی میں دیکھیے تو تذکرہ کے انداز خطیبانہ میں پُرجوش مبلغانہ مقصد کو ایک عالمگیر رفعت و اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔[1]

تذکرہ کا مطالعہ | یہ صحیح ہے کہ تذکرہ عام لوگوں کے پڑھنے کے لیے نہیں لکھا گیا تھا۔ لیکن یہ تمام عالموں کے لیے بھی نہیں ہے۔ خواہ اسلام اور تاریخ اسلام سے متعلق ان کی معلومات کتنی ہی گہری اور وسیع کیوں ہوں، اسے صرف وہی عالم قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے جنھوں نے مذہب کو جذبۂ محبت و خیر اور وسیع تر ہمدردیوں کے ساتھ سمجھا ہو۔ اس میں اس کشادہ دل اور بے تعصب راسخ العقیدگی کی ترجمانی کی گئی ہے جس سے سچی مذہبیت پیدا ہوتی ہے، سچی مذہبیت جو سرچشمہ ہے اس بابرکت ہمت اور عزیمت کا جسے ہم دنیا پرست عالموں، حد سے تجاوز کرنے والے صوفیوں اور بے دین اور ظالم حکمرانوں کے مقابلہ میں حق و صداقت کے لیے اٹھ کھڑی ہونے والی دینی شخصیتوں میں پاتے ہیں:

---

[1] محمد مجیب "تذکرہ۔ اے بایوگریفی اِن سمبلس"، ہمایوں کبیر (مرتب)، مولانا ابوالکلام آزاد ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی، ۱۹۵۹ء ص ۱۵۲۔

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے

ایک خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تذکرہ کے مطالعہ کا آغاز اس کے مصنف کے حالات و واردات پر مشتمل اس کے آخری صفحوں (۳۰۹۔ ۳۳۲) کی ان دو فصلوں سے کیا جائے جن میں اعترافِ گناہ کے بعد توبہ و انابت کی سعادت و انعام کا ذکر ہے اور جنھیں مصنف علام نے یہ کہہ کر قلم بند کیا ہے کہ "... کئی سو صفحے روشن دلانِ سلف کے تذکرۂ آثار و مناقب سے نورانی ہو چکے ہیں۔ اب دو چار صفحے اپنی سیہ روئیوں اور سیہ بختیوں کے سوادِ تحریر سے بھی سیاہ کرتا ہوں کہ تعرف الاشیاء باضدادھا۔"[1] لیکن اس خیال کے ساتھ یہ سوال بھی اٹھ سکتا ہے کہ ایک ایسے سماج میں جہاں ظواہر کو ہی اصل اہمیت حاصل ہو گئی ہو، توبہ و استغفار کی داخلی کیفیات کا ذکر، استعاروں کی زبان ہی میں سہی، کس کی نظر میں قابلِ اعتنا ٹھہرے گا۔ مسلمانوں کے فکرِ مذہبی کی تاریخ کا یہ ایک بڑا کارنامہ تھا کہ گیارہویں صدی عیسوی میں شریعت اور طریقت میں ایک خوشگوار مفاہمت ہو گئی اور ایک عرصہ کے بعد برسرِ منبر کھُل کر یہ بات کہی جانے لگی کہ خدا کی نگاہ میں سچے احساس و اعترافِ گناہ کی بڑی قدر و منزلت ہے، لیکن اس کے باوجود ہم میں کتنے ہیں جو مولانا آزاد کے درجِ ذیل بیان اور اس کے معنی کے متحمل ہو سکیں گے، وہ کنایوں اور استعاروں کے پردے میں اپنی "درجوانی چنانکہ افتد و دانی" کی کہانی بیان کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ "غفلت ہر حال میں غفلت ہے اور ایک لمحۂ غفلت کے معاوضہ میں عمر بھر کا ماتم بھی کافی نہیں" اور پھر لکھتے ہیں:

"... بلاشبہہ یہ لغزش تھی، لیکن اس لغزش کو کیا کہوگے جو محبوب کے قدموں

---

[1] تذکرہ، ص ۳۰۹۔

پرگرادے۔ مقصد تو ساری باتوں سے اس تک پہونچنا ہی ہے.... توفیقِ الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و تربیتِ غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں...(میں نے) جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے۔ جتنی رہنمائیاں ملیں صرف اسی مرشدِ فیض و ہادیٔ طریق سے ملیں۔ درد بن کر آیا تھا، مگر درمان بن کر گیا۔ مرض بھی وہی تھا، شفا بھی اسی سے ملی :

تداویت من لیلیٰ بلیلیٰ عن الھویٰ

کما یتداوی شارب الخمر بالخمر

علم کا دروازہ اسی نے کھولا۔ عمل کی حقیقت اسی نے تبلائی۔ معرفت کے صحیفے اس کی زبان پر تھے۔ حقیقت کے خزانے اس کے دستِ کرم میں تھے۔ شریعت کے حقایق کا وہی معلم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا۔ قرآن کے بھید اسی نے تبلائے۔ سنت کے اسرار اسی نے کھولے۔ نظر اس نے دی، دل اس نے بخشا، کون سی مشکل تھی جو اس سے حل نہ ہوئی... کون سی بیماری تھی جس کی دوا اس کے دارالشفا سے نہ مل سکی ؟

شاد باش اے عشقِ خوش سودایِ ما اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما !

اے دوائے نخوت و ناموسِ ما اے تو افلاطون و جالینوسِ ما !

اور یہ جو کچھ کہا گیا تو یہ نہ سمجھا جائے کہ اپنے عیبوں کو بھی ہُنر بنا کر دکھلانا مقصود ہے۔ جس عالم میں ہُنر کو بھی ہُنر سمجھنا معصیت ہو وہاں عیب کو حسن بنانے کا وہم بھی گذرے تو کفر سمجھا جائے[1]

---

[1] تذکرہ، ص ۳۱۸-۳۲۱۔

ابن تیمیہ اور مولانا آزاد | تذکرہ میں مولانا آزاد نے ان ائمہ مجتہدین اور علمائے حق کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے جنھوں نے قرآن و سنت کی عظمت اور برتری کو قائم رکھا، ان گنت مصائب و آلام میں صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، علمائے سوء کی حیلہ سازیوں کا پردہ چاک کیا اور غیر منصف اور سخت گیر حکمرانوں کے ظلم و استبداد کو بے باکی سے چیلنج کیا۔ انہیں میں حضرت امام احمد بن حنبل بھی ہیں جن کی شخصیت میں انہیں شاید اپنے وجود کا وہ پیکر نظر آتا تھا جو اپنے وقت کے نام نہاد تجدد پسندوں اور عقلیت دوستوں کے مقابلہ میں قرآن و سنت کی صداقتوں کا علمبردار تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے نویں صدی عیسوی میں معتزلی حامیانِ عقلیت کے خلاف جنھیں وقت کے حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی، ایک جرارت آموز موقف اختیار کیا تھا اور تن تنہا قرآن کے غیر مخلوق ہونے کی صداقت پر ایمان کو وقت کے مسلم معاشرے میں اور زیادہ مضبوط اور مستحکم بنادیا تھا۔

لیکن تذکرہ میں حنبلی مسلک کے شامی مصلح و مجتہد ابن تیمیہ کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ مولانا آزاد بار بار اپنے زمانے کی بے مثال شخصیت ابن تیمیہ کی تعریف و توصیف اور ان کے لیے اپنے گہرے جذبۂ احترام کا اظہار کرتے ہیں۔ ان پر ابن تیمیہؒ کی شخصیت، جذبۂ جہاد اور مجتہدانہ طرزِ فکر کا اثر کن کن اطراف و جوانب سے پڑا، یہ الگ سے ایک مقالے کا موضوع ہے اور یہاں اس موضوع کو چھیڑنے کا موقع نہیں، بس یہ سمجھ لیجیے کہ زندگی کے آخری لمحوں تک مولانا آزاد کی شخصیت اور مذہبی دانشوری پر ابن تیمیہؒ کے فکر و عمل کی مجاہدانہ و مجتہدانہ خصوصیات کا اثر باقی رہا۔

ابن تیمیہؒ آزاد کے ہیرو تھے، ان کے روحانی رہنما، اس لیے کہ انھوں نے اپنے عہد کے مسلم سماج کے انحطاط و اضمحلال کو ایک تقدیری صورتِ حال نہیں تصور کیا۔ انھوں نے منگول حملہ آوروں کے خلاف مدافعت اور مزاحمت کی تنظیم کی، اپنے زمانے کے علماء کی اخلاقی خرابیوں اور مختلف صوفی سلسلوں کے پیروؤں کے غیر محتاط رویے اور اعمال و رسوم کو جن کی سند کتاب و سنت میں کہیں نہیں ملتی تھی، ہدفِ ملامت بنایا، متکلمین و فلاسفہ، منطق کی جدلیات اور فلسفے کے مجرد تصورات کی سخت تردید اور تنقید کی اور اس بات پر زور دیا کہ قرآن کو قرآن ہی کی مدد سے اور اس حکمت و دانش کی روشنی ہی میں جو رسول کریمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کی سنت کی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہے، صحیح صحیح سمجھا جاسکتا ہے۔

اس طرح اپنے عہد کے مسلم معاشرہ کے عہدِ وسطیٰ کے اس مزاج کے خلاف جو صدیوں پرانی صورتِ حال میں کسی تبدیلی کو پسند نہیں کرتا تھا، ایک باغی کی حیثیت سے مولانا آزاد کو مسلم ذہن کو تقلید کی پابندیوں سے آزاد کرانے اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی روحِ اجتہاد کو زندہ کرنے کی ابن تیمیہؒ کی کوششوں میں اپنے انقلابی خیالات کا اثبات اور جواز مل گیا۔ علامہ ابن تیمیہؒ ہی سے مولانا آزاد نے یہ فیض حاصل کیا کہ جدید فلسفہ و علوم کے بعض ان بنیادی مفروضوں کی اندھی تقلید کے بجائے جن پر مغرب نے اپنے اس جھوٹے دعوے کی بنیاد رکھی تھی کہ سفید فام اقوام کی یہ ذمہ داری ہے کہ باقی ماندہ دنیا کو "مہذب" بنائیں، انہیں ناقدانہ نظر سے دیکھیں اور

ان کی کمزوریوں کو واشگاف کریں۔

مولانا آزاد نے دیکھا کہ مغرب کی پروردہ جدید تعلیم کے سبب تشکیک والحاد کو تقویت مل رہی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا بلکہ انھوں نے ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کی حقانیت کو تذکرہ کے صفحات پر ایک پُر اعتماد اور پُرجوش آہنگ و اسلوب کے توسط سے پیش کر دیں جس کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ میں اعلائے کلمۃ الحق کی ایمان پرور مثالیں پہلے ہی سے موجود تھیں، مولانا نے محسوس کیا کہ آج بھی اس کی ضرورت ہے کہ ہم میں حق و صداقت کو سمجھنے اور برتنے کا، جیسا کہ اس کا حق ہے، حوصلہ ہو، اعمال صالح کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دینے کا ولولہ ہو اور یہ عزم و ہمت کہ جب اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے تائب ہونے سے خوشی ہوتی ہے[1] تو ہم اپنی جد و جہد سے ایسے حالات پیدا کریں کہ دنیا میں فتنہ و شر اور بدی و گمرہی کا زور کم ہو۔

---

[1] دیکھئے صحیح مسلم، ج ۲، کتاب التوبہ، نولکشور پریس، لکھنؤ، ص ۳۵۵۔

اقبال کے کلام کی قرآنی تلمیحات کے اشاریے

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب، پٹنہ

ایسے تو اقبالؔ کا پورا کلام قرآن کی منظوم تفسیر ہے مگر جہاں تک قرآنی تلمیحات کا سوال ہے یہ ان کے کلام میں تین درج ذیل عنوانات کے تحت آتی ہیں۔ پہلا یہ کہ اقبالؔ نے بہت اشعار میں قرآنی تلمیحات کو ہوبہو قرآن کے عربی متن کے الفاظ، فقرے یا آیات کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور ایسی ہی اصطلاحات کے اشاریے اس مضمون میں حروف تہجی کے اعتبار سے دیے جا رہے ہیں۔

دوسرا طریقہ ان قرآنی تلمیحات کا اقبالؔ کے کلام میں یہ ہے کہ انھوں نے اشعار میں بجائے قرآن کے عربی متن کے الفاظ، فقرے یا آیات لانے کے پوری آیت کا منظوم ترجمہ شعر کے دونوں مصرعوں یا ایک مصرعہ میں سمو دیا ہے، جیسے "بانگ درا" کی نظمیں "ترانۂ ملّی" اور "طلوعِ اسلام" کے چوتھے بند کے علی الترتیب یہ اشعار:

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

پہلے شعر کا پہلا مصرعہ ہوبہو سورۂ آلِ عمران ۳ کی آیت ۹۶ کا منظوم ترجمہ ہے اور دوسرے مصرعہ میں سورۃ الحج ۲۲ کی آیات ۲۶ تا ۲۹ کی منظوم ترجمانی کی گئی ہے۔ اسی طرح

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں ہو بہو سورۃ حٰمٓ السجدۃ ۴۱ کی آیات ۳۰ تا ۳۲ اور سورۃ الاحقاف ۴۶ کی آیت ۱۳ کی منظوم ترجمانی کی گئی ہے۔ ایسی تلمیحات کی فہرست بھی بہت طویل ہے جو اس مضمون کا موضوع نہیں۔

تیسری قسم اقبال کے کلام میں تلمیحات کی یہ ہے کہ انھوں نے اشعار میں قرآنی قصوں کو ایک شعر میں سمو دیا ہے جس کے لیے اس موضوع پر پورے قرآنی قصوں سے واقف ہونا ضروری ہے جو مختلف طریقوں سے مختلف سورتوں میں وارد ہوئے ہیں۔ جیسے بانگ درا کی نظمیں "جواب شکوہ" کے بارہویں بند اور "خضر راہ" کی ذیلی نظم "صحرا نوردی" کے علی الترتیب یہ اشعار:

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں ... جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب ... جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ

پہلے شعر میں حضرت موسیٰ کے کوہِ طور پر خدائے تعالیٰ سے ملاقات کے قرآنی قصہ کی تلمیح کی گئی ہے جو سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۱۷ میں وارد ہوا ہے اور دوسرے شعر میں حضرت ابراہیمؑ کے ایمان لانے کی قصہ کی تلمیح ہے جس کی تفصیل سورۃ الانعام ۶ کے رکوع ۹ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ ایسی تلمیحات کی فہرست بھی بہت لمبی ہے جو اس مضمون کا موضوع نہیں۔

ان تینوں قسم کی قرآنی تلمیحات کے اشاریے مرتب کیا جانا اس لیے ضروری ہے کہ ایک تو عام طور سے مسلمان نہ تو قرآن کے عربی متن یا اس کے ترجمے پر اتنا عبور رکھتے ہیں کہ وہ کسی شعر میں ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کی تلمیح کو فوراً گرفت میں لا سکیں اور دوسرے اردو زبان کے متوسط درجہ کے قاری کے لیے تو یہ گرفت اور بھی مشکل ہے اس طرح نتیجتاً ایسی قرآنی تلمیحات سے ترتیب دیے گئے اقبال کے کلام کے قریب

پانچ سو اشعار ناقابلِ فہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس مضمون میں طوالت کے خوف سے صرف پہلی قسم کی قرآنی تلمیحات کے اشاریے، ان تلمیحات سے ترتیب دیے گئے کل اشعار کے حوالہ جات کے ساتھ، دیے جا رہے ہیں جن کی تعداد ساٹھ ہے اور میری تحقیق کے مطابق ایسی تلمیحات کی یہی تعداد پورے کلام میں ہے۔ اس اشاریے میں پانچ اشاریے حدیث سے ماخوذ ہیں جن کا نمبر شمار ۷، ۴۹، ۵۰، ۵۱ اور ۵۴ ہے۔ اس طرح اس مضمون میں ۶۵ تلمیحات کے اشاریے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ اشاریے اقبال فہمی کی راہ عام کرنے اور اقبالیات کی تحقیق میں لگے لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنے میں ممد و معاون ہوں گے۔

(۱) اَرِنِیْٓ : یہ سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۴۳ میں وارد ہوا ہے اور اس سے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگ درا" کی نظم "دل" میں ہے۔ باقی دو "بالِ جبریل" کی غزلیات ۲۰، ۱۲ اور ۴۱ میں۔ اس کے معنی ہیں: "مجھے یار اُسے نظر دے"۔

(۲) اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ : سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی آیت ۱۸ میں وارد ہوا ہے،

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ گواہی دی اللہ نے یہ کہ نہیں کوئی معبود مگر وہ

اس سے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۵۹ میں ہے۔

(۳) اَعْرَاف : اس کے معنی بلندیوں کے ہیں اور قرآن میں اس سے مراد ایک خاص مقام ہے جس کی تفصیل سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۵ اور ۶ میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے کلام میں کل ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۶۰ میں ہے۔

(۴) اَلْحُكْمُ لِلّٰهِ (۵) اَلْمُلْكُ لِلّٰهِ : پہلی اصطلاح سورۃ یوسف ۱۲ کی آیت ۶۷ میں بمعنی "حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں چلتا" اور سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت

۳۶ میں بمعنی "اللہ حکومت کر رہا ہے" وارد ہوئی ہے۔ دوسری اصطلاح سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۱۲۰ میں بمعنی "ایسی بادشاہی جس میں کبھی ضعف اور کہنگی نہ آئے" اور سورۃ المومنون ۲۳ کی آیت ۱۱۶ میں بمعنی "پس بالا و برتر ہے اللہ، پادشاہ حقیقی"، سورۃ النور ۲۴ کی آیت ۴۲ میں بمعنی "بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے" اور سورۃ الفرقان ۲۵ کی آیت ۲ میں بمعنی "بادشاہی کا مالک" وارد ہوئی ہے۔ ان دونوں اصطلاحوں سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضرب کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے چوتھے بند میں ہے۔ جن میں دونوں ساتھ لائی گئی ہیں۔

(۶) اَلَستُ : یہ اصطلاح سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۷۲ میں وارد ہوئی ہے۔ فقرہ یہ ہے "اَلَستُ بِرَبِّکُمْ" (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں)۔ اسی آیت کو اقبال نے "بانگِ درا" کی نظم "سرگزشت آدم" میں "پیمانِ اولیں" سے موسوم کیا ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "ضرب کلیم" کی نظم "شکست" میں ہے۔

(۷) اَلفَقْرُ فَخْرِی : یہ اصطلاح اس حدیث سے ماخوذ ہے: "شانِ فقر میرے لیے باعثِ فخر ہے"۔ اس سے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں ہے۔

(۸) اَلٓمّٓ : قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں ۲۹ سورتوں کی پہلی آیت حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں جن سے شروع ہونے والی آخری سورۃ القلم ۶۸ ہے۔ "الٓمّٓ" کا حرف مقطع چھ سورتوں کی پہلی آیت میں آتا ہے۔ جن کا نمبر شمار ۲، ۳، ۲۹، ۳۰، ۳۱ اور ۳۲ ہے۔ یہ مقطعات اہل عرب کے لیے کوئی چیستاں نہ تھے کیونکہ وہ بالعموم جانتے تھے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ بعد میں یہ اسلوب متروک ہوتا چلا گیا، اس بنا پر مفسرین

کے لیے ان کے معانی متعین کرنا مشکل ہوگیا۔" اُلمٓ" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر " بانگِ درا" کی نظم: " فلسفۂ غم" کا ہے۔ اس کے ساتھ سورۃ لگا دینے سے ابہام کا رنگ پیدا ہوگیا ہے اور " جزو" جو قرآن کے پارہ کو کہتے ہیں اور" کتاب" کا لفظ بھی ساتھ لانے سے، جو لفظ کہ سورۃ المائدہ ۵ کی آیت ۴۸ میں قرآن مجید کیلئے "اَلْکِتٰبْ" آیا ہے اس میں صنعتِ مراعات النظیر بھی آگئی ہے۔

(۹) اُمُّ الکتاب : اس کے معنیٰ ہیں" اصل کتاب" یعنی وہ منبع و سرچشمہ جن سے تمام کُتبِ آسمانی نکلی ہیں۔ یہ اصطلاح سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت ۳۹ اور سورۃ الزُخروف ۴۳ کی آیت ۴ میں وارد ہوئی ہے۔ سورۃ المائدۃ ۵ کی آیت ۴۸ میں اسے" اَلْکِتٰبْ" بھی کہا گیا ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی مصرعہ" علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُمّ الکتاب" "ضربِ کلیم" کی نظم" علم و عشق" کے آخری بند میں ہے۔

(۱۰) اِنَّ الْمُلُوْكَ : یہ اصطلاح حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات کے سلسلہ میں سورۃ النمل ۲۷ کی آیت ۳۴ میں وارد ہوئی ہے۔ اسے اقبال نے اصطلاح کے طور پر سامراجیت اور اس کے اثرات کے معنی میں اپنے کلام میں صرف ایک بار" بانگِ درا" کی نظم: "خضرِ راہ" کی ذیلی نظم" سلطنت" میں استعمال کیا ہے۔

(۱۱) اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ : (فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا ہے)۔ یہ فقرہ ہوبہو انہی الفاظ میں سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۵۵، سورۃ الروم ۳۰ کی آیت ۶۰، سورۃ لقمٰن ۳۱ کی آیت ۳۳، سورۃ الجاثیہ ۴۵ کی آیت ۳۲ اور سورۃ الاحقاف ۴۶ کی آیت ۱۷ میں وارد ہوا ہے۔ علاوہ ازیں" وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا" کا فقرہ بھی سورۃ النساء ۴ کی آیت ۱۲۲، سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۴ اور سورۃ لقمٰن ۳۱ کی آیت ۹ میں اسی معنیٰ میں وارد ہوا ہے۔ اس

فقرے سے تلمیح کے ساتھ اقبال نے "لسان العصر" اکبر الہ آبادی کے ایک مصرعہ کی تضمین "بانگِ درا" کی غزلیات حصۂ سوم کی آخری غزل کے آخری شعر میں کی ہے اور اس سے صرف یہی ایک شعر کلام میں ہے۔

(۱۲) بِسمِ اللّٰہ : (اللہ کے نام سے)۔ یہ مخفف ہے آیت "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" کا جسکے معنٰی ہیں: "اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے"۔ یہ آیت قرآن میں دو بار وارد ہوئی ہے۔ پہلی بار سورۃ الفاتحہ ۱ کی پہلی آیت میں جو قرآن کی سب سے پہلی آیت ہے اور دوسری بار سورۃ النمل ۲۷ کی آیت ۳۰ میں۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم "قربِ سلطاں" میں ہے۔

(۱۳) بشیری، نذیری : قرآن میں الفاظ "بشیر" (بشارت دینے والا) اور "نذیر" (خبردار کرنے والا) رسول اللہ کی دعوت اور منصب کے سلسلہ میں بہت سی سورتوں میں وارد ہوئے ہیں جیسے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۱۹، سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۸۸، سورۃ ہود ۱۱ کی آیت ۲، سورۃ الفرقان ۲۵ کی آیت ۵۶، سورۃ الاحزاب ۳۳ کی آیت ۴۵ اور سورۃ الفتح ۴۸ کی آیت ۸ میں۔ اقبال کی یہ دونوں اصطلاحیں انہی دونوں الفاظ سے انہی قرآنی معنوں میں ماخوذ ہیں جن سے ان کے کلام میں کل دو اشعار ہیں اور دونوں اشعار میں یہ دونوں اصطلاحیں ایک ساتھ لائی گئی ہیں۔ پہلا شعر "بالِ جبریل" کی نظم "دین و سیاست" میں ہے جس میں "بشیری" سے مراد "دین" اور "نذیری" سے مراد "سیاست" ہے۔ دوسرا شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "محراب گل افغان کے افکار" کے پندرہویں بند میں ہے جس شعر کو سورہ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۱۰ کے ساتھ پڑھا جائے۔

(۱۴) تَقۡنَطُوا، لَا تَقۡنَطُوا : جن کے معنی علی الترتیب مایوس ہونے اور

نہ ہونے کے ہیں۔ اقبال نے یہ دونوں اصطلاحیں علی الترتیب سورۃ الحجر ۱۵ کی آیت ۵۶ اور سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۵۳ سے اخذ کی ہیں۔ ان دونوں اصطلاحوں سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی نظم: "جبریل و ابلیس" میں ہے۔

(۱۵) **چوبِ کلیم** : (عصائے موسیٰ) ۔ عصائے موسیٰؑ ان نُو نشانیوں میں سے ایک ہے جن نشانیوں کے ساتھ خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے پاس بھیجا تھا۔ جن کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل ۱۷ کی آیت ۱۰۱، سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۰۳ اور سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۵۶ میں وارد ہوا ہے۔ ان نُو نشانیوں میں ایک نشانی "عصا" اور دوسری نشانی "ید بیضا" تھیں۔ عصا کا ذکر سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۱۸ میں وارد ہوا ہے۔ اسی سے اقبال نے "چوبِ کلیم" کی اصطلاح وضع کی جس سے ان کے کلام میں کل دو اشعار ہیں۔ ایک شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۲۹ میں ہے اور دوسرا "ضربِ کلیم" کی نظم "اہلِ مصر سے" میں۔ یدِ بیضا کا ذکر اس مضمون میں نمبر شمار ۴۶ میں لایا گیا ہے۔

(۱۶) **خُلُقِ عَظِیم** : (اخلاق کا بلند مرتبہ) ۔ یہ اصطلاح قرآن میں صرف ایک بار اور وہ بھی رسول اللہؐ کی شان میں سورۃ القلم ۶۸ کی آیت ۴ میں وارد ہوئی ہے۔ اس پہ ایک روایت بھی ہے کہ فرمایا حضورؐ نے کہ: "بعثت لا تمم مکارم الاخلاق" (میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں)۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی نظم: "مسجدِ قرطبہ" کے چھٹے بند میں ہے۔

(۱۷) **رحمٰن** : (رحم کرنے والا) ۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "مردِ مسلماں" میں ہے جس میں انھوں نے سورۃ الرحمٰن ۵۵ کی تلمیح کی ہے جس شعر میں مردِ مسلماں کی فطرت کی سورہ الرحمٰن ۵۵ کی صفات سے ہم آہنگی

بتائی گئی ہے۔

(۱۸) رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ : (اے نبیؐ، تمہاری خاطر ہم نے تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کیا)۔ یہ فقرہ سورۃ الم نشرح ۹۴ کی آیت ۴ میں وارد ہوا ہے اور اس سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر" بانگِ درا" کی نظم: جوابِ شکوہ کے چونتیسویں بند میں ہے۔

(۱۹) سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلیٰ : (اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح)۔ اقبال نے یہ اصطلاح حدیث سے اخذ کی ہے اور احادیث میں یہ سورۃ الاعلیٰ ، ۸۷ کی پہلی آیت سے لی گئی ہے۔ احادیث میں حضرت عقبہ بن عامر جہنی سے منقول ہے کہ رسول اللہؐ نے سجدہ میں اسے پڑھنے کا حکم اسی آیت کی بنا پر دیا تھا اور"سبحان ربی العظیم" پڑھنے کا جو طریقہ حضورؐ نے رکوع میں مقرر فرمایا تھا وہ سورۃ الواقعہ ۵۶ کی آیت ۹۶ پر مبنی تھا۔ (مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، ابن المنذر)۔

(۲۰) سلسبیل : (جنت کا ایک چشمہ) یہ اصطلاح سورۃ الدھر، ۷۶ کی آیت ۱۸ سے ماخوذ ہے اور اس سے اقبال کے کلام میں صرف دو اشعار ہیں اور دونوں "بانگ درا" میں ہیں۔ پہلا شعر نظم" عشرتِ امروز" میں ہے اور دوسرا نظم "خضرِ راہ" کی ذیلی نظم "صحرا نوردی" میں۔

(۲۱) شمس : (آفتاب)۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر" بانگ درا" کی نظم: " انسان اور بزم قدرت" میں ہے جس شعر کی وضاحت اس نظم کے پہلے تین اشعار کے ساتھ ہوتی ہے۔ قرآن میں سورۃ کا نام صرف "الشمس" ہے مگر اقبال نے اپنے اس شعر میں اس سورۃ" الشمس" ۹۱ کی پہلی آیت میں وارد" والشمس"

کی تلمیح کی ہے۔

(۲۲) عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ : (ناموں کا علم)۔ یہ ترکیب سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۳۱ میں وارد ہوئی ہے جس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "ذکر و فکر" میں ہے۔

(۲۳) قلب سلیم : (صحیح سلامت دل) قرآنی معنوں میں "قلبِ سلیم" سے مراد ایسا دل ہے جو تمام اعتقادی اور اخلاقی برائیوں سے پاک ہو، جس میں کفر و شرک اور شکوک و شبہات کا شائبہ تک نہ پایا جاتا ہو اور جس میں نافرمانی اور سرکشی کے جذبے یا برے میلانات اور ناپاک خواہشات کے جذبوں کے پائے جانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا ہو۔ یہ اصطلاح قرآن میں سورۃ الشُّعَرَآء ۲۶ کی آیت ۸۹ اور سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷ کی آیت ۸۴ میں وارد ہوئی ہے اور دونوں بار حضرت ابراہیمؑ کے شان میں آئی ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم: "جوابِ شکوہ" کے اکیسویں بند میں ہے اور دوسرا "ضربِ کلیم" کی نظم: "فقر و ملوکیت" میں۔

(۲۴) قُلِ الْعَفْوَ : (کہو، جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو)۔ "عفو" کا یہی معنی حضرت عطاؒ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس فقرہ سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "اشتراکیت" میں ہے جو ماخوذ ہے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۱۹ سے۔

(۲۵) قُلْ هُوَ اللّٰه : (کہو، وہ اللہ ہے)۔ اقبال نے سورۃ الاخلاص ۱۱۲ کی پہلی آیت "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" سے دو اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ ایک "قُلْ هُوَ اللّٰه" اور دوسری "هُوَ اللّٰهُ اَحَد" اور دونوں کو الگ الگ شعر میں اس برجستگی سے استعمال کیا ہے کہ ہر شعر کے موضوع کی مناسبت سے پوری آیت کا حق ادا کرتا ہے۔

دوسرے ٹکڑے کے لیے دیکھیں اسی مضمون کا نمبر شمار ۶۲۔ "قُلْ هُوَ اللهُ" سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "توحید" میں ہے۔

(۲۶) قُمْ: (اٹھ)۔ قم عربی لفظ ہے اور امر کا صیغہ ہے بمعنی اٹھ۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم: "صقلیہ" کے پہلے بند میں ہے۔

(۲۷) قم بِاِذْنِ اللهِ: (اللہ کے حکم سے اٹھ) اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک منفرد شعر "بالِ جبریل" کی نظم: "خانقاہ" میں ہے۔ علاوہ ازیں "ضربِ کلیم" میں "قم باذن اللہ" نام کی ایک نظم ہی ہے جس میں تین اشعار ہیں اور اسے مطلع کے دونوں مصرعوں اور باقی دو اشعار میں ردیف کے طور پہ لایا گیا ہے۔

(۲۸) کُنْ: (ہو جا) "کن" کی اصطلاح قرآن میں "فَیَکُوْنُ" کے ساتھ سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیات ۴۷ اور ۵۹ اور سورۃ یٰسین ۳۶ کی آیت ۸۲ میں وارد ہوئی ہے۔ "کُن" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل دو اشعار ہیں اور دونوں "بانگِ درا" کی نظم: "شمع" کے پانچویں بند میں ہیں۔

(۲۹) کُنْ فَیَکُوْنُ: (ہو جا اور وہ ہو گیا)۔ آیات کے حوالے اوپر نمبر شمار ۲۸ میں دیے جا چکے ہیں۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۳ (دوئم) میں ہے۔

(۳۰) کاف و نون: (کُنْ)۔ یہ کنایہ ہے لفظ "کن" سے۔ جس پر آیات کے حوالے نمبر شمار ۲۸ میں دیے جا چکے ہیں۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ارمغانِ حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ہے۔

(۳۱) لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ: (نہیں ہے کوئی معبود سوا اللہ کے) اس کلمۂ طیبہ کا ذکر

سورۃ ابراہیم ۱۴ کے رکوع ۴ میں تمثیلی پیرایۂ بیان میں وارد ہوا ہے، جس کی ضد کلمۂ خبیثہ ہے جس کا بھی ذکر اسی پیرایۂ بیان میں اسی سورۃ کے اسی رکوع میں وارد ہوا ہے۔ ایک روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ انھوں نے ایک مرتبہ رسول اللہؐ سے دریافت فرمایا کہ آپؐ کی شفاعت کا سب سے زیادہ نفع اٹھانے والا قیامت کے دن کون شخص ہوگا تو آپؐ نے جواب میں فرمایا:

"سب سے زیادہ سعادتمند اور نفع اٹھانے والا میری شفاعت کے ساتھ وہ شخص ہوگا جو دل کے خلوص کے ساتھ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہے۔"

اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل آٹھ اشعار ہیں۔ ایک منفرد شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۲۳ میں ہے۔ باقی سات "ضربِ کلیم" کی نظم: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ" میں ہیں جن میں مطلع کے دونوں مصرعوں اور باقی چھ میں یہ بطور ردیف لایا گیا ہے۔ اقبال نے اس کے ٹکڑے کرکے چار مزید اصطلاحیں وضع کی ہیں جن کا ذکر اگلے نمبر شمار ۳۲ اور ۳۴ تا ۳۶ میں لایا گیا ہے۔

(۳۲) لَآ اِلٰہَ اِلَّا: یہ اصطلاح قرآن میں الگ نہیں آئی مگر اقبال نے اسے نمبر شمار ۳۱ کو مخفف کرکے خود وضع کی ہے اور اسے اپنے کلام میں صرف ایک بار "بالِ جبریل" کی غزل ۲۲ میں استعمال کیا ہے مگر پورے کلمۂ طیبہ کے معنی فراہم کردیا ہے۔

(۳۳) لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ: (اس ایک رب کے سوا کوئی اور معبود نہیں)۔

یہ فقرہ ہو بہو قرآن کی سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۵۵، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۲، سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۱۰۶، سورۃ المومنون ۲۳ کی آیت ۱۱۶، سورۃ القصص ۲۸ کی آیت ۸۸ اور سورۃ الحشر ۵۹ کی آیت ۲۲ میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے

اقبال کے کلام میں کل دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۹ (اول) میں ہے اور دوسرا "ارمغان حجاز" کی نظم "مسعود مرحوم" میں۔

(۳۴) لَا و اِلَّا : (نہیں اور سوا)۔ اقبال نے لَآ اِلٰہَ کے لیے "لا" اور "اِلَّا اللّٰہُ" کے لیے "اِلَّا" کی اصطلاحیں لاکر لَآ و اِلَّا کی ایک اصطلاح وضع کی ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ا (دوئم) میں ہے اور دوسرا شعر "ضرب کلیم" کی نظم "لا و اِلّا" میں ہے

(۳۵) لَآ و اِلَّا اللّٰہُ : (نہیں اور سوا اللہ کے)۔ یہاں بھی اقبال نے لَآ اِلٰہَ کی جگہ صرف لَآ کو الگ اصطلاح بنایا ہے اور اِلَّا اللّٰہُ کو الگ اصطلاح۔ ان دونوں اصطلاحوں سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگ درا" کی نظم "سوامی رام تیرتھ" میں ہے جس میں انھوں نے اللہ سے ملنے کی آرزو کو اِلَّا اللّٰہُ سے تعبیر کرتے ہوئے پہلے لَآ کی منزل سے گزر کر اپنی اور کائنات کی نفی کرنی لازمی قرار دیا ہے۔

(۳۶) لَآ اِلٰہَ : (نہیں ہے کوئی معبود)۔ اقبال نے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی جگہ صرف لَآ اِلٰہَ کی ایک اصطلاح بھی وضع کی ہے۔ اس لیے کہ ایک مومن جب صرف لَآ اِلٰہَ کہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ سارے معبودوں کی نفی کرتا ہے۔ مگر نفی کر کے وہ خاموش نہیں رہ جاتا بلکہ اس کا دل، اس کا ضمیر اور خود اس کا اپنا وجود ساتھ ساتھ اِلَّا اللّٰہُ کا بھی اثبات کرتا ہے، یعنی "سوا اللہ کے"۔ اس لیے اقبال صرف لَآ اِلٰہَ کہہ کر ہر ایسے شعر میں جہاں یہ اصطلاح لائی گئی ہے اس کے استعمال کی برجستگی سے پورے کلمۂ طیبہ (نمبر شمار ۱۳) کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اقبال نے یہ اصطلاح کلمۂ طیبہ کے معنی میں

اپنے کلام میں بارہ[۱۲] اشعار میں استعمال کیا ہے۔ پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم "تضمین بر شعر انیسی شاملو" میں ہے۔ تین[۳] اشعار "بالِ جبریل" کی غزلیات ۸ (دوم)، ۳۲ اور ۴۸ میں ہیں۔ پانچواں شعر "بالِ جبریل" کی نظم "مسجدِ قرطبہ" کے چوتھے بند میں ہے۔ چھ[۶] اشعار "ضربِ کلیم" کی نظمیں "تصوف"، "نکتۂ توحید"، "حکیم نطشہ"، "جاوید سے"، "مسجدِ قوت الاسلام" اور "محراب گل افغان کے افکار" کے انیسویں بند میں ہیں اور بارہواں شعر "ارمغانِ حجاز" کی بارہویں رباعی میں ہے۔

(۳۷) لات و منات : اقبال نے لات و منات کی اصطلاحیں علی الترتیب سورۃ النجم ۵۳ کی آیات ۱۹ اور ۲۰ سے اخذ کی ہیں۔ یہ دونوں بت ان بہت سے بتوں میں سے ہیں جنھیں قبل از اسلام قریش ان کے عمدہ کارناموں کی وجہ سے پرستش کیا کرتے تھے۔ ان دونوں کی پرستش سبھی کیا کرتے تھے اور باقی کے خاص قبائل۔ منات مرد بت تھا۔ "لات" و "منات" کی اصطلاحوں سے اقبال کے کلام میں کل آٹھ اشعار ہیں۔ جن میں پہلے پانچ[۵] "ضربِ کلیم" کی نظمیں "نماز"، "تیاتر"، "مخلوقاتِ ہنر"، "بلشویک روس" اور "محراب گل افغان کے افکار" کے اٹھارویں بند میں ہیں۔ باقی تین[۳] "ارمغانِ حجاز" کی نظمیں "ابلیس کی مجلس شوریٰ"، "عالمِ برزخ" اور "مسعود مرحوم" میں ہیں۔

(۳۸) لاتی و مناتی : یہ اصطلاحیں نمبر شمار ۳۷ سے وضع کی گئی ہیں۔ ان سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم کی نظم" ایک فلسفہ زدہ سیدزادے کے نام" میں ہے۔

(۳۹) لَا تَخَفْ : (مت ڈر)۔ یہ اصطلاح اقبال نے سورۃ القصص ۲۸ کی آیت ۳۱ اور سورۃ النمل ۲۷ کی آیت ۱۰ سے اخذ کی ہے۔ دونوں بار یہ فقرہ حضرت موسیٰؑ کے

...ہ طور پر خدائے تعالیٰ سے ملاقات کے سلسلہ میں وارد ہوا ہے۔ اس سے اقبال کے کلام
...ں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۱۶ (دوم) میں ہے۔

(۴۰) لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰهًا اٰخَرَ: (اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود
...ہ نہ پکارو) یہ فقرہ قرآن میں کئی سورتوں میں وارد ہوا ہے جیسے سورۃ الشعراء ۲۶ کی آیت
۲۱۳، سورۃ المومنون ۲۳ کی آیت ۱۱۷ اور سورۃ القصص ۲۸ کی آیت ۸۸ میں۔ اس سے
اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم "لاہور و کراچی" میں ہے۔

(۴۱) لَا تَذَرْ: (نہ چھوڑ)۔ یہ فقرہ سورۃ نوح ۷۱ کی آیت ۲۶ میں طوفانِ نوحؑ
کے وقت حضرت نوحؑ کی زبان پر رکھا گیا ہے۔ نہ چھوڑنے کے معنی ہی میں یہ فقرہ سورۃ
المدثر ۷۴ کی آیت ۲۸ میں بھی وارد ہوا ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک
ہی شعر "بالِ جبریل" کی نظم "طارق کی دعا" میں ہے۔

(۴۲) لَا شَرِیْكَ لَہٗ: (جس کا کوئی شریک نہیں)۔ یہ فقرہ سورۃ الانعام
۶ کی آیت ۱۶۳ میں وارد ہوا ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر
"ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے دوسرے بند میں ہے۔

(۴۳) لَا شَرِیْكَ: (کوئی شریک نہیں)۔ یہ بھی نمبر شمار ۴۲ کے معنوں
میں اقبال کے کلام میں آیا ہے۔ جس سے صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم
"سلطان ٹیپو کی وصیت" میں ہے جس شعر کے دوسرے مصرع میں سورۃ الحج ۲۲ کی آیت
۱۱ کی منظوم ترجمانی کی گئی ہے۔

(۴۴) لَا غَالِبَ اِلَّا هُوَ: یہ فقرہ اقبال نے ہم معنی قرآنی آیات سے خود وضع
کی ہے۔ ہم معنی آیات سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیات ۱۳۹ اور ۱۵۹ اور ۱۶۰، سورۃ المائدہ

۵ کی آیات ۵۵ اور ۵۶، سورۃ محمد ۴۷ کی آیت ۳۵ اور سورۃ المجادلہ ۵۸ کی آیت ۲۱ ہیں۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے بارہویں بند میں ہے۔

(۴۵) لَا يَحْزَنُوْنَ : (نہ غمگین ہوں گے)۔ یہ اصطلاح قرآن کی بہت سی سورتوں میں وارد ہوئی ہے جیسے سورۃ البقرہ ۲ کی آیات ۳۸ اور ۲۶۲، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیات ۱۶۹ اور ۱۷۰، سورۃ المائدہ ۵ کی آیت ۶۹، سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۴۸، سورۃ الاعراف ۷ کی آیات ۳۵ اور ۴۹، سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۶۲، سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۶۱، سورۃ حٰمٓ السجدہ ۴۱ کی آیت ۳۰، سورۃ الزخرف ۴۳ کی آیت ۶۸ اور سورۃ الاحقاف ۴۶ کی آیت ۱۳ ہیں۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک شعر "بالِ جبریل" کی ایک دعائیہ رباعی میں ہے۔

(۴۶) لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ : (وعدہ سے ٹلنے والا نہیں)۔ یہ فقرہ الفاظ کے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۲۰، سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۹، سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت ۳۱ اور سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۹۴ میں وارد ہوا ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں کل ۲ دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم "خضر راہ" کی ذیلی نظم "دنیائے اسلام" میں ہے اور دوسرا اسی مجموعہ کی غزلیات حصہ سوم میں۔

(۴۷) لَنْ تَرَانِيْ : (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا)۔ یہ جواب خدائے تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ کو دیا تھا جو جواب کہ سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۴۳ میں وارد ہوا ہے۔ اسے اس مضمون کے نمبر شمار ۱ کے ساتھ پڑھیں۔ اس سے کلام میں کل ۳ تین اشعار ہیں۔ پہلے ۲ دو اشعار "بانگِ درا" کی غزلیات حصہ اول و حصہ دوم میں ہیں اور تیسرا "ضربِ کلیم"

کی نظم "خاقانی" میں۔

(۴۸) حدیث لن ترانی: (لن ترانی کا قصہ)۔ یہ ترکیب اقبال نے نمبر شمار ۴ سے وضع کی ہے۔ یہ ترکیب کلام میں صرف دو رباعیوں میں آئی ہے۔ پہلی رباعی "بالِ جبریل" میں ہے اور دوسری "ارمغانِ حجاز" کی نظم "تصویر و مصوّر" میں۔

(۴۹) لولاک: اس اصطلاح سے اقبال کی مراد ذات محمدیؐ ہے اور درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہے:۔

"لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ" اگر تو نہ ہوتا تو میں یہ کائنات پیدا نہ کرتا۔

اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگ درا" کی نظم "بلادِ اسلامیہ" میں ہے۔ دوسرا "بالِ جبریل" کی غزل ۴۹ میں اور تیسرا اسی مجموعہ کی ایک رباعی میں۔

(۵۰) لولاکی: یہ اصطلاح اقبال نے نمبر شمار ۴۹ سے وضع کی ہے جس سے ان کی مراد حضورؐ کے ایمان کا رنگ، روشن ضمیری اور روحانیت کی شان ہے۔ اس سے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی ایک رباعی میں ہے۔

(۵۱) صاحبِ لولاک: اس سے اقبال کی مراد حضورؐ کا اتباع کامل یا غلام ہے۔ یہ ترکیب بھی اقبال نے نمبر شمار ۴۹ سے وضع کی ہے۔ اس سے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۰ (دوم) میں ہے۔

(۵۲) لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی: (انسان کے لیے کچھ نہیں ہے، مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے)۔ یہ سورۃ النجم ۵۳ کی پوری آیت ۳۹ ہے۔ یہ آیت اقبال کے کلام میں صرف ایک بار "بانگِ درا" کے "ظریفانہ" کے ایک شعر میں آئی ہے۔

(۵۳) مَازَاغَ : (آنکھیں نہیں چوندھیائیں)۔ یہ اصطلاح سورۃ النجم ۵۳ کی آیت ۱۷ میں واقعۂ معراج کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی غزل (بعد از نظم "اساتذہ") میں ہے۔

(۵۴) مَا عَرَفْنَا : یہ اصطلاح درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہے:

مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ — اے خدا! ہم نے تجھکو اس طرح نہیں پہچانا جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے۔

اس اصطلاح سے کلام میں ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی غزلیات حصہ اول میں ہے۔

(۵۵) متاعِ غرور : (ظاہر فریب چیز)۔ یہ اصطلاح سورۃ آل عمران ۳ کی آیت ۱۸۵ میں وارد ہوئی ہے اور اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" میں ہے۔

(۵۶) نشور : (دوبارہ زندہ ہو کر حاضر ہونا)۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ دو "بالِ جبریل" کی غزل ۱۲ (اول) اور نظم "دعا" میں اور تیسرا "ضربِ کلیم" کی غزل بعد از نظم "فقر و راہبی" میں۔ یہ اصطلاح سورۃ ملک ۶۷ کی آیت ۱۵ میں وارد ہوئی ہے۔ ایسے تو "نشور" کے معنی قیامت کے ہیں مگر قرآن میں قیامت ہی کے پس منظر میں یہ دوبارہ زندہ کیے جانے کے معنی میں بھی مراد لیا جاتا ہے۔ اقبال نے "بالِ جبریل" کے دونوں اشعار میں اسے قیامت کے معنی میں اور تیسرے شعر میں دوبارہ زندہ کیا جانا مراد لیا ہے۔ اسی معنی میں سورۃ الانبیاء ۲۱ کی آیت ۲۱ میں "یُنْشِرُوْنَ" کا لفظ بھی وارد ہوا ہے۔

(۵۷) وَالنَّجْمِ : (تارہ)۔ اقبال نے یہ اصطلاح سورۃ النجم ۵۳ کی پہلی آیت

سے اخذ کی ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "معراج" میں ہے۔

(۵۸) وَالنُّور : اقبال نے سورۃ النور ۲۴ سے یہ اصطلاح وضع کی ہے گرچہ سورۃ کا نام صرف "النور" ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک شعر "بالِ جبریل" کی نظم "پیامِ صبح" میں ہے جس میں انھوں نے "سورۂ و النور" استعمال کیا ہے۔

(۵۹) وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ : (تم خود ہی اس (قیامت) کے جلد آنے کا تقاضا کر رہے تھے)۔ یہ فقرہ سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۵۱ میں وارد ہوا ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگِ درا" کے "ظریفانہ" میں ہے۔

(۶۰) هُوْ : یہ عربی زبان کا لفظ ہے جو ضمیر کے طور پر آتا ہے۔ اس کے ایک معنی تو خدا کے ہیں۔ اس لیے ہم ریگستان یا کسی سناٹے کو "ہو کا عالم" کہتے ہیں یعنی وہاں خدا کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں۔ اس کے دوسرے معنی عربی میں شور مچانے یا ڈرانے کے ہیں اور اردو میں یہ اس معنی میں بھی مستعمل ہے۔ هُوْ کے معنی اشارے کے بھی آتے ہیں اور یہ معنی اسوقت پیدا ہو سکتا ہے جب هُوْ کو لَا اِلٰہ کا مخفف قرار دیا جائے۔

"هُوْ" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم "شکوہ" کے پچیسویں بند میں ہے اور باقی دو "ارمغانِ حجاز" کی نظم: "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں۔ پہلے شعر میں هُو سے مراد رحمتِ باری ہے۔

(۶۱) اللّٰہ هُوْ : اس سے اقبال عشقِ الٰہی میں گرویدگی مراد لیتے ہیں۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں پانچ ۵ اشعار ہیں۔ جن میں چار "بالِ جبریل" کی نظمیں "دعا" "مسجدِ قرطبہ" (تیسرا بند)، "جبریل و ابلیس" اور ایک رباعی میں ہیں۔ پانچواں شعر

"ارمغانِ حجاز" کی ساتویں رباعی میں ہے۔

(۶۲) هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ : (وہ اللہ ہے یکتا)۔ جیسا اس مضمون کے نمبر شمارہ ۵ میں عرض کیا گیا اقبال نے سورۃ الاخلاص ۱۱۲ کی پہلی آیت کے دو ٹکڑے کر کے دو اصطلاحیں وضع کی ہیں اور یہ اس کا دوسرا ٹکڑا ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم "شکوہ" کے دسویں بند میں ہے۔

(۶۳) یَدُ اللّٰهِ : (اللہ کا ہاتھ)۔ اقبال نے یہ اصطلاح سورۃ الفتح ۴۸ کی آیت ۱۰ سے وضع کی اس سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ جن میں دو "بالِ جبریل" کی غزل ۴۸ اور نظم "مسجدِ قرطبہ" کے پانچویں بند میں ہیں۔ اور تیسرا شعر "ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے چودھویں بند میں ہے۔

(۶۴) یَدِ بَیضَا : جیسا اس مضمون کے نمبر شمارہ ۱۵ میں عرض کیا گیا "ید بیضا" نو نشانیوں میں ایک نشانی ہے۔ "ید بیضا" کی اصطلاح سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۲۲ میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱ (دوم) کے تیسرے بند میں ہے اور دوسرا "ارمغانِ حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں۔ اقبال نے ان ہی معنوں میں "ید بیضا" کی جگہ "بانگِ درا" کی نظم "بلال" (بعد از نظم "چاند") کے ایک شعر میں "دستِ موسیٰ" کی ترکیب لائی ہے۔

(۶۵) یَنسِلُوْنَ : (نکل پڑیں گے) یہ لفظ سورۃ الانبیاء ۲۱ کی آیت ۹۶ اور سورۃ یٰسین ۳۶ کی آیت ۵۱ میں وارد ہوا ہے۔ پہلی آیت میں قیامت کے قبل یاجوج اور ماجوج کے نکل پڑنے اور دوسری آیت میں حشر کے وقت مردوں کے اپنے اپنے قبروں سے نکل پڑنے کے سلسلہ میں یہ لفظ لایا گیا ہے۔ اس لفظ سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگِ درا" کے "ظریفانہ" میں ہے۔

نوٹ: ان ۶۵ تلمیحات کے تحت ۱۱۸ اشعار آتے ہیں جن اشعار کے بھی تفصیلی حوالے اس مضمون میں دیے گئے ہیں۔

مشرقی بنگال (بنگلا دیش) اور اردو ادب (۱۸۰۰ء تا ۱۹۴۷ء)

از ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر۔ ڈھاکہ

شمالی ہند میں اردو زبان کے وجود میں آنے کے زمانے سے ہی بنگال کے مسلمانوں کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ لیکن اٹھارویں صدی کے آخر تک یہاں اردو کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چلتا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے مغربی بنگال کے شہر کلکتہ کی ادبی اہمیت مسلم ہو چکی تھی اور نثر اردو میں رنگ برنگ پھول کھل اٹھے تھے اس وقت بنگلا دیش کے مختلف اضلاع میں بھی کئی اردو شعراء و ادباء منظر عام پر آئے۔ جن کے کارنامے شاعری کی متعدد اصناف میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بنگلا دیش کی جنوبی سرحد چاٹگام سے لے کر شمال میں رنگپور تک اردو زبان و ادب کا چرچا تھا۔ پایۂ تخت ڈھاکہ کو سب اضلاع پر برتری حاصل رہی۔ اس زمانے میں اردو اور فارسی کو شرفاء کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ بنگلا دیش کے کئی ضلعوں نے اردو ادب کے خزانے میں انمول کتابوں کا اضافہ کیا۔ اردو کی یہ نثری کتابیں زیادہ تر مذہبی، اخلاق اور حدیث و فقہ سے متعلق تھیں۔ شاعری میں غزل کے علاوہ مثنوی کی طرف بھی توجہ دی گئی تھی مگر برائے نام۔ بنگلا دیش کے کئی قادر الکلام شعرا آج بھی ادب اردو میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔

"ارمغان حجاز" کی ساتویں رباعی میں ہے۔

(۶۲) هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ : (وہ اللہ ہے یکتا)۔ جیسا اس مضمون کے نمبر شمار ۲۵ میں عرض کیا گیا اقبال نے سورۃ الاخلاص ۱۱۲ کی پہلی آیت کے دو ٹکڑے کر کے دو اصطلاحیں وضع کی ہیں اور یہ اس کا دوسرا ٹکڑا ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "بانگ درا" کی نظم "شکوہ" کے دسویں بند میں ہے۔

(۶۳) یَدُ اللّٰهِ : (اللہ کا ہاتھ)۔ اقبال نے یہ اصطلاح سورۃ الفتح ۴۸ کی آیت ۱۰ سے وضع کی ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ جن میں دو "بال جبریل" کی غزل ۴۷ اور نظم "مسجد قرطبہ" کے پانچویں بند میں ہیں۔ اور تیسرا شعر "ضرب کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے چودھویں بند میں ہے۔

(۶۴) یَدِ بیضا : جیسا اس مضمون کے نمبر شمار ۱۵ میں عرض کیا گیا "ید بیضا" نو نشانیوں میں ایک نشانی ہے۔ "ید بیضا" کی اصطلاح سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۲۲ میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بال جبریل" کی غزل ۱ (دوئم) کے تیسرے بند میں ہے اور دوسرا "ارمغان حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں۔ اقبال نے ان ہی معنوں میں "ید بیضا" کی جگہ "بانگ درا" کی نظم "بلالؓ" (بعد از نظم "چاند") کے ایک شعر میں "دست موسیٰؑ" کی ترکیب لائی ہے۔

(۶۵) یَنْسِلُوْنَ : (نکل پڑیں گے) یہ لفظ سورۃ الانبیاء ۲۱ کی آیت ۹۶ اور سورۃ یٰسین ۳۶ کی آیت ۵۱ میں وارد ہوا ہے۔ پہلی آیت میں قیامت کے قبل یاجوج اور ماجوج کے نکل پڑنے اور دوسری آیت میں حشر کے وقت مردوں کے اپنے اپنے قبروں سے نکل پڑنے کے سلسلہ میں یہ لفظ لایا گیا ہے۔ اس لفظ سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگ درا" کے "ظریفانہ" میں ہے۔

نوٹ : ان ۶۵ تلمیحات کے تحت ۱۱۱۸ اشعار آتے ہیں جن اشعار کے بھی تفصیلی حوالے اس مضمون میں دیے گئے ہیں۔

مشرقی بنگال (بنگلا دیش) اور اردو ادب
(۱۸۰۰ء تا ۱۹۴۷ء)

از ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر۔ ڈھاکہ

شمالی ہند میں اردو زبان کے وجود میں آنے کے زمانے سے ہی بنگال کے مسلمانوں کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ لیکن اٹھارویں صدی کے آخر تک یہاں اردو کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چلتا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے مغربی بنگال کے شہر کلکتہ کی ادبی اہمیت مسلم ہوچکی تھی اور نثر اردو میں رنگ برنگ پھول کھل اٹھے تھے اس وقت بنگلا دیش کے مختلف اضلاع میں بھی کئی اردو شعراء و ادباء منظر عام پر آئے۔ جن کے کارنامے شاعری کی متعدد اصناف میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بنگلا دیش کی جنوبی سرحد چاٹگام سے لے کر شمال میں رنگپور تک اردو زبان و ادب کا چرچا تھا۔ پایۂ تخت ڈھاکہ کو سب اضلاع پر برتری حاصل رہی۔ اس زمانے میں اردو اور فارسی کو شرفاء کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ بنگلا دیش کے کئی ضلعوں نے اردو ادب کے خزانے میں انمول کتابوں کا اضافہ کیا۔ اردو کی یہ نثری کتابیں زیادہ تر مذہبی، اخلاقی اور حدیث و فقہ سے متعلق تھیں۔ شاعری میں غزل کے علاوہ مثنوی کی طرف بھی توجہ دی گئی تھی مگر برائے نام۔ بنگلا دیش کے کئی قادر الکلام شعراء آج بھی ادب اردو میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔

مذکورہ مقالہ میں، میں نے مشرقی بنگال یا بنگلادیش کے صوبہ "ڈھاکہ" کے ادبار شعرار کا تذکرہ نہیں کیا ہے کیونکہ اس پر میرا مقالہ "ڈھاکہ میں اردو ادب ــــ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک" ماہنامہ 'ماہ نو' لاہور، نومبر ۱۹۹۱ء میں شایع ہو چکا ہے۔ یہاں بنگلادیش کے چند اہم اضلاع کے شعرار و ادبار کی ادبی خدمات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سلہٹ: ۔ بنگلادیش کے شمال مشرق میں سلہٹ کا خوبصورت پہاڑی سلسلہ ہے جہاں حضرت شاہ جلال تبریزی کی تبلیغ اسلام سے اسلام کی جڑیں مضبوط و مستحکم ہو چکی تھیں۔ بہت سے درویش، علما اور اولیا ان کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ اس لیے اس علاقے میں فارسی، عربی اور اردو کا خاص چرچا رہا۔ یہاں کے زیادہ تر شعرا اور ادبا، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے، انھوں نے مذہبی رسائل اور دینی معلومات سے پُر کتابیں تصنیف کیں۔ ان مصنفین میں حاجی اللہ بخش، سعید بخت مجموعہ دار، اشرف علی مصنف، حاجی عبداللہ آشفتہ، عبدالمنعم ذوقی، ابو نصر وحید، نصیرالدین حیدر ساقی اور مولوی ماجد علی قابل ذکر ہیں۔

حاجی اللہ بخش اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے ماہر تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اقبال عظیم نے ان کی اردو تصانیف میں 'دیوان حامد'، مسائل ضروریہ، تحفۃ الاحباب اور برہان الموحدین کا نام لیا ہے[1]

سعید بخت مجموعہ دار، حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی

[1] مشرقی بنگال میں اردو، ص ۴۳، مطبوعہ ڈھاکہ، ۱۹۵۴ء۔

دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ انہیں تاریخ گوئی کا بھی بڑا شوق تھا۔ مخلص العقائد مطبوعہ ۱۲۷۱ھ اور رسائل موتی، مطبوعہ ۱۲۷۵ھ ان کی یادگار کتابیں ہیں۔

حکیم اشرف علی مست (۱۲۶۱ھ - ۱۳۰۲ھ) بھی کثیر التصانیف تھے۔ انہیں کیمیا گری اور طب کا شوق تھا۔ اس لیے علم کیمیا گری پر انھوں نے کئی چھوٹے رسالے اردو میں لکھے ہیں۔ جن میں رسالۂ چیچک، رسالۂ طاعون، رسالۂ ہیضہ، رسالۂ کشتی، رسالۂ دافع سموم اور رسالۂ تصویر علم اہم ہیں۔ ان کی ایک کتاب 'اشرف البیان فی حکمت الایمان' ۱۳۰۱ھ میں لکھنؤ سے شایع ہوئی تھی۔

حاجی عبداللہ آشفتہ شاعر کے ساتھ ایک بہترین نثار بھی تھے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنی ریڈیائی تقریر میں ان کی ایک مثنوی 'گلِ دوستانہ' کا تذکرہ کیا ہے۔ آشفتہ، عبدالغفور نساخ کے ہم عصر تھے۔ نساخ نے 'سخن شعرا' میں ان کا ایک شعر درج کیا ہے۔

دیکھا شوقِ شہادت عاشقِ دل گیر کا

کیا تڑپ کے چوم لیتا ہے گلا شمشیر کا

نصیر الدین حیدر ساقی ڈھاکہ کے شرفا میں سے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی ساری زندگی سلہٹ میں گزاری۔ ان کی تصنیف 'سہیل یمن' یعنی تاریخ جلالی ایک مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے بڑی تفصیل سے سلہٹ نے شاہ جلال تبریزی کے حالات لکھے ہیں۔

مولوی عبدالرحمن ضیا کی کتاب 'احسن العقائد' میں اہلِ سنت کے عقیدوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ کتاب ڈھاکہ کے نواب احسن اللہ شاہین کے نام معنون ہے اور کانپور

سے ۱۳۰۰ھ میں شایع ہوئی۔

مولوی عبدالمنعم ذوقی کی کتاب 'اخلاقِ احمدی' آگرہ سے ۱۸۹۱ء میں طباعت پذیر ہوئی۔ دینی معلومات سے پُر یہ کتاب رسول اکرمؐ کی زندگی اور ان کے اخلاق و عادات پر روشنی ڈالتی ہے۔

مولوی ماجد علی نے 'مراتب الدین' کے نام سے ایک چھوٹا سا چوبیس صفحات کا رسالہ کانپور سے ۱۳۰۸ھ میں شایع کیا۔

شاہ اسماعیل فضل الرحمٰن آلم صاحبِ دیوان تھے۔ ۱۳۲۸ھ میں اسّی صفحات کا انکا دیوان شایع ہوا۔

ان حضرات کے علاوہ محمد حسن، حاجی جلال بخش، مولوی فرجام علی بیخود، مولوی محمد علی احمد خاں اور مولوی عبدالعزیز بھی سلہٹ کے باشندے تھے، جنھوں نے اردو اور فارسی میں شاعری کی۔

چٹاگانگ: جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے بنگلادیش کی بندرگاہ چٹاگانگ میں عرب تجّار کی آمد قبل از اسلام شروع ہو چکی تھی۔ بعد از اسلام بھی اس شہر میں مسلمانوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ انھوں نے یہاں کے باشندوں سے شادی بیاہ کرکے اپنی تجارت کو اور مضبوط بنایا۔ اس لیے مذہبی لحاظ سے آج بھی یہ شہر اپنی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہاں پر کئی خاندان ایسے ہیں جن کے آبا و اجداد عربی النسل تھے۔ چٹاگانگ کی بنگلا بولی میں عربی کا اثر اس قدر پڑا کہ حرف 'پ' عربی کی طرح اس بولی سے خارج ہو گیا۔ چنانچہ چاٹگامی بنگلا بولی میں پانی کو فانی اور پان کو فان بولا جاتا ہے۔ اسلام اور اس کے اصولوں کی پابندی میں اس ضلع کے لوگوں نے اردو، فارسی اور عربی زبانوں کو

اپنایا۔ یہاں اردو اور فارسی کے کئی شعرا و ادبا نے اپنی تصانیف سے اردو ادب کے ذخیرے کو وسیع بنایا۔

مولوی دلیل الرحمٰن اردو کے نامی شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے اردو میں ایک مثنوی 'دلآرام' لکھی۔

منشی غلام حیدر عزت، سررشتہ دار فورٹ ولیم کالج کلکتہ تھے۔ ان کا خاندان چاٹگانگ سے منتقل ہو کر کلکتے میں بس گیا تھا۔ وہیں انہوں نے منشی وارث کی فارسی مثنوی "گلشنِ عشق" کا ترجمہ اردو میں "حسن و عشق"[1] کے نام سے کیا۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ ان کے بیٹے مصطفٰے حیدر بھی صاحب دیوان تھے۔

مولانا عبدالاول کثیر التصانیف عالم تھے۔ انہوں نے لاتعداد دینی رسائل لکھے۔ 'التحقیقات الخطیرہ' انکی اردو کتاب ہے جو ڈھاکہ سے چھپی۔

مولوی ضمیر الدین چاٹگامی نے اردو میں پند و نصائح پر مشتمل تقاریر کا ایک مجموعہ 'ہدیۂ ضمیر عرف وعظ بے نظیر' کے نام سے شایع کیا۔

مولوی سعید الرحمٰن نے ایک سو بتیس صفحات پر مشتمل اپنی کتاب 'تذکرۂ راشدین' ڈھاکہ سے شایع کی۔

شاہ بدیع العالم ابوالعلائی نے 'آئینۂ جہانگیری' تصنیف کی۔ یہ کتاب ۱۳۴۵ھ میں دہلی سے شایع ہوئی۔

مولوی اکرام علی نے چالیس حدیثوں کا اردو ترجمہ 'منہاج المومنین' کے نام سے کیا اور سید حمید الرحمٰن نے 'حکمت افلاطون' لکھی جو کانپور سے ۱۳۲۲ھ میں طبع پذیر ہوئی۔

---

[1] اس کتاب پر میرا تحقیقی مقالہ نوائے ادب بمبئی بابت اکتوبر ۱۹۸۵ء میں ملاحظہ فرمائیے۔

مولوی امین الحق نے 'تحفۃ الاحسان' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ابو الفتح احسن اللہ نے 'احسن الانشا' نامی کتاب کانپور سے ۱۳۱۷ھ میں شایع کی۔

مولوی ظہور اللہ رمزؔ اور مولوی وجہ اللہ ساتیؔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے اور ناسخؔ کے ہم عصر تھے۔ ساتیؔ نے ایک فارسی مرثیہ اپنے چچا کی وفات کے بعد 'غم عم' تحریر کیا۔

مولوی ابو المساکین ناسخؔ کے شاگردِ عزیز تھے۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں قادر الکلام تھے۔ ان کی کتاب 'الفوز العظیم فی مولد النبی الکریم' کلکتے سے ۱۳۰۵ھ میں چھپی۔

مولوی مظہر الحق مظہرؔ اپنے وقت کے مشہور عالم و فقیہ تھے۔ انہوں نے کانپور میں کئی سال تک تدریسی فرائض انجام دیے۔ 'انشائے مظہر' ان کی مشہور کتاب ہے جو ۱۳۰۱ھ میں کانپور سے شایع ہوئی۔

مولانا عبد الہادی نے بچوں کے لیے حنفی مسائل و عقائد پر مشتمل ایک درسی کتاب 'ہادی العقائد' تصنیف کی جو ۱۹۰۲ء میں کلکتے سے چھپی۔ تصوف اور تجدید ایمان کا دوسرا رسالہ 'لذت الایمان' کلکتے سے ۱۲۹۴ھ میں شایع ہوا تھا۔

محمد عبد العلی درؔی اردو، فارسی اور عربی کے شاعر تھے۔ انھوں نے 'ارمغانِ احباب' کے نام سے ان تینوں زبانوں کے مشہور شعرا کا مجموعۂ کلام ترتیب دیا۔

مولوی محمد علی اسلام آبادی نے 'تحفۂ حنیفہ' مرتب کی اور مولوی صفی اللہ قادری نے 'فیوضات غوثیہ' لکھی۔ یہ کتاب ۱۸۹۱ء میں کلکتے سے شایع ہوئی۔

عبد الحیٔ بن مولانا عبد الحکیم، سید امیر علی کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ عربی اور فارسی کی کتابوں کے ترجموں میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ فقہ حنفی کی مشہور

کتاب 'ہدایہ' کے ترجمے میں ان کی سعی و کوشش اہمیت رکھتی ہے۔ افسوس بیالیس[۴۲] سال کی عمر میں ہی انکا انتقال ہوگیا۔

فریدپور :۔ سلہٹ کے مجموعہ دار خاندان کی طرح فریدپور میں 'قاضی خاندان' کے افراد نے اردو اور فارسی کی اعلا خدمات انجام دی ہیں۔ ان حضرات میں فقیر محمد، عبدالغفور نسّاخ، شمس کلکتوی، مولوی عبدالباری صید اور مولوی حفیظ الدین شہید قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اس ضلع میں اور بھی اردو و فارسی داں اہل فن موجود تھے، جن میں مولوی محمد فاضل، مولوی عبدالجبار، مولوی سراج الدین سراج، مولوی محمد علی افسر، رحمن بخش شاداں اور مولوی امجد علی مشہور ہیں۔

قاضی فقیر محمد ۱۸۰۳ء میں فریدپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے بیٹے عبدالغفور نسّاخ کا نام بنگلادیش کی اردو تاریخ میں زندۂ جاوید بن گیا ہے۔ قاضی فقیر محمد اپنے آبائی وطن فریدپور کو چھوڑ کر کلکتے جا بسے۔ انہیں حدیث، تاریخ اور فقہ پر عبور حاصل تھا۔ ان کی مشہور کتاب 'جامع التواریخ' اس زمانے میں تین بار طباعت کا شرف حاصل کر چکی تھی۔ پہلی بار یہ فارسی کتاب ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۶ء میں کلکتے سے شایع ہوئی تھی ان کی تاریخ دانی کا اعتراف کرتے ہوئے BRADLEY BIRT لکھتے ہیں:

"THE STUDY OF HIS HISTORY EXERCISED FOR HIM AN ABSORBING FASCINATION AND THE RESULT OF HIS RESEARCH WAS A UNIVERSAL HISTORY WRITTEN BY HIM IN PERSIAN ENTITLED JAME-UL-TAWARIKH"[1]

---

[1] TWELVE MEN OF BENGAL (3rd EDITION) CALCUTTA P. 112

فارسی کے علاوہ وہ اردو اور عربی کے بھی ماہر فن تھے۔

مولوی عبدالغفور نساخ (۱۸۳۴ء۔ ۱۸۸۹ء) کا نام اردو ادب میں محتاجِ تعارف نہیں۔ بنگلہ دیش کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اردو و فارسی کے مسلم الثبوت مایہ ناز شاعر اور نثار نے یہاں کے ضلع نرسدی پور میں جنم لیا ہے۔ ان کا سب سے بڑا شاہکار "تذکرۂ سخن شعرا" ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے پہلی بار بنگال کے گمنام شعرا کو اردو ادب میں روشناس کرایا۔ اس طرح بنگال کی اردو تاریخ سے متعلق مورخین اور محققین نے جو بے التفاتی برتی تھی، اسے اپنی جنبشِ قلم سے بڑی حد تک پورا کیا۔ مرزا غالب سے ان کی خط و کتابت تھی۔ اپنے ایک خط میں مرزا غالب نے ان کی اردو دانی کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں "دانائے رموزِ اردو زبان اور سرمایہ نازشِ قلمرو ہندوستان" سے مخاطب کیا۔ ان کے شاگردوں کا لامتناہی سلسلہ سارے بنگال میں پھیلا ہوا تھا۔ ڈپٹی کلکٹر کے اعلا عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے انہوں نے بنگال کے ہر ضلع میں قیام کیا تھا اور جہاں بھی پہنچے اپنی خوبیوں سے وہاں شعر و سخن کی محفل جمع کر دی۔ اردو میں ان کے تین دیوان کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال عظیم نے ان کی تصانیف کی تعداد سولہ بتائی ہے۔[1] ان کی خود نوشت سوانح حیات کے مخطوطے کی ایک کاپی ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتبخانے میں محفوظ ہے۔ چھپن سال کی عمر میں ۱۸۸۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے کلام میں شوخی ملاحظہ ہو:

نہ بولو منھ سے مگر آنکھ سے سلام تو لو تم اپنے چشمِ سخن گو سے کوئی کام تو لو

ابوالقاسم محمد شمس کلکتوی، عزت مآب نساخ کے فرزندِ عزیز تھے۔ انکی اردو غزل گوئی

---

[1] مشرقی بنگال میں اردو، ص ۵۸۔

کی دھوم سارے بنگالے میں مچی ہوئی تھی۔ انہیں داغؔ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ داغ بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ تحت اللفظ کے پڑھنے کے فن میں وہ ماہر تھے۔ انکا بہت سا کلام ضایع ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ان کے شاگرد عزیز 'طوطیِ بنگال' علامہ رضا علی وحشتؔ نے ان کے فراہم شدہ کلام کی تدوین کر کے ۱۹۱۹ء میں شایع کیا تھا۔ انکے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

شکل وہ شکل کہ تصویر کو بھی سکتہ ہو حسن وہ حسن کہ وہ جائیے حیران ہو کر

فکر دشمن میں وہ آ نکلے ادھر مفت کا احسان میرے سر رہا

اب وہ کیا آئیں گے ملنا انہیں منظور نہیں رات کی آس گئی صبح بھی کچھ دور نہیں

غالبؔ کے ایک شعر سے انھوں نے ایک نیا مضمون اخذ کیا:

غالبؔ: واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

شمسؔ کلکتوی: میں جس کو پی رہا ہوں وہ حاضر ہے واعظو تم جسکو کہہ رہے ہو، سی شراب ہے [1]

مولوی عبد الباری حیدرؔ، ناسخؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ بھی اردو و فارسی میں شاعری کرتے تھے۔

مولوی حفیظ الدین شہیدؔ، ناسخؔ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اردو و فارسی دونوں میں شعر لکھتے تھے۔ کلکتے میں غالبؔ سے ایک مشاعرے میں ان کی ملاقات ہوئی۔ ان کے فی البدیہہ اشعار سن کر غالبؔ بھی متاثر ہوئے۔ ۱۸۳۴ء میں انتقال ہوا۔

مولوی محمد فاضل فریدپور کے باشندے تھے، مگر ساری زندگی انھوں نے باریسال میں گزاری۔ 'کنز السعادت' ان کے اخلاقی اشعار کا مجموعہ کانپور سے

---

[1] ماہنامہ 'خاور' ڈھاکہ، بابت اپریل ۱۹۵۲ء۔

شائع ہوا تھا۔

مولوی عبدالجبار مشہور واعظ تھے۔ اردو کے علاوہ انھوں نے بنگلا زبان میں کئی دینی کتابیں تصنیف کیں۔ 'تزکیۃ النسا' اور 'نصاب المسائل' ان سے یادگار ہیں۔

مولوی سراج الدین سراؔج کے دیوان کا قلمی نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اردو کے اچھے شاعر تھے۔

میمن سنگھ: میمن سنگھ کے ایک چھوٹے موضع بولائی میں اردو کے چراغ کو مولانا عبدالحیٔ اختر نے روشنی دی۔ وہ ایک جید عالم اور فقیہ تھے۔ ۱۸۲۸ء میں اسی موضع میں ان کی پیدائش ہوئی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ یوں تو ان کی تصانیف کی تعداد پچپن ۵۵ کے قریب ہے۔ لیکن ان میں کثیر تصانیف فارسی اور عربی زبان میں ہیں۔ 'کلمۃ الحق' ایک اردو رسالہ ان سے منسوب ہے۔ انھوں نے مولانا کرامت علی جونپوری سے فیض حاصل کیا تھا۔ انکا انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا۔

انہیں کے با افتخار بیٹے خالد بنگالی تھے۔ خالد بنگالی کا اصل نام محمود الرب صدیقی[1] تھا، مگر ادبی دنیا میں وہ خالد بنگالی کے نام سے مشہور ہیں۔ خالد کا شمار ان شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے، جنھیں نظم و نثر دونوں میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ نثر میں انکا قلم سحر نگاری کا نادر نمونہ تھا۔ رسالہ 'نقاد' آگرہ سے ان کے ایک مضمون 'جاندار موتی' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"تیر سے نرم ہاتھ، ساعد سیمیں اور نازک انگلیاں جن حرکاتِ لطیف کی [illegible] ہیں' وہ یوں ہی ایک دنیا کو سلا دینے کے لیے کافی ہیں۔ یہ رقص کی معراجِ کمال ہے کہ

---

[1] ماہنامہ 'خاور' ڈھاکہ' بابت دسمبر ۱۹۵۲ء۔

تجھے خراماں دیکھ کر کائنات رقص کرتی معلوم ہوتی ہے"[1]

اپنے والد کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنے وطن بولائی سے ان کی یاد میں ایک رسالہ 'اختر'[2] نکالا۔ جو بنگلادیش کا ایک معیاری رسالہ تھا۔ اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انہیں بنگلا زبان پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ نظموں کے علاوہ انھوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کئی نعتیں بھی سپردِ قلم کی ہیں۔ ان کی معرکۃ الآرا نظموں میں 'گلِ زمیں ڈھاکا'، 'بنگالے کی برسات'، 'جذبات حاضر'، 'عید مبارک'، 'تصویر دیکھ کر'، 'پہلی جھلک'، 'شہادتِ منصوری'، اور 'نوائے سرو شن' لاجواب ہیں، ان کے مضامین اور کلامِ شاعری اس وقت کے مقتدر رسالوں میں شایع ہوتا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے زاہد صدیقی بنگلادیش بننے کے بعد ریڈیو ڈھاکہ کی اردو نشریات میں کافی عرصے تک کام کرتے رہے۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

میمن سنگھ کی تیسری اردو داں شخصیت منشی مولوی سید نجم الدین حسین نادر کی ہے۔ یہ کافی عرصہ ہندوستان میں رہے۔ عبدالغفور نسّاخ کی کتاب 'دفترِ بے مثال' کی تقریظ انھوں نے لکھی تھی۔

منشی عظیم الدین خلف منشی برہان اللہ نے اردو میں 'رسالۂ عظیم الدین حنفی' نامی کتاب لکھی۔ اس رسالے کے شروع میں پانچ صفحے کی ایک مثنوی ہے اور آخر میں کچھ خطبے ہیں۔ یہ رسالہ کلکتے سے ۱۳۱۲ھ میں شایع ہوا۔

---

[1] ماہنامہ 'خاور' ڈھاکہ، بابت دسمبر ۱۹۵۲ء، ص۔ ۳ [2] اس رسالے کی تفصیل اگلے باب 'ڈاکٹر شادانی' بہ حیثیت مدیر' میں آئے گی۔

بچوں کے تہذیب الاخلاق کے لیے مولوی ابو ناظم محمد کاظم نے 'تہذیب الاطفال' ایک مثنوی تحریر فرمائی۔ اس کی زبان بڑی صاف سادہ اور رواں تھی بتیس ۳۲ صفحات پہ مشتمل یہ مثنوی بریلی سے ۱۳۲۸ھ میں شایع ہوئی۔

حاجی صوفی میاں نے 'میزان معین' کتاب لکھی جس میں اسلامی احکام کے فضائل کو بیان کیا گیا ہے۔ بنگلا دیش کے سب سے پہلے عربی اور فارسی کے مطبع کرڈیہ میمن سنگھ میں یہ کتاب چھپی۔

مولوی نوازش علی نے درسی کتاب 'مختصر جغرافیہ' تالیف کی۔ اس کا حجم اٹھاون صفحات ہے۔ کلکتے کے اسلامیہ پریس میں ۱۹۱۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کتاب ڈھاکہ کے سرکاری مدارس میں شاملِ نصاب تھی۔

شیخ محمد نذیر اٹھارہویں صدی میں کشور گنج میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایک مثنوی 'بدیا سندر' اردو میں تحریر فرمائی۔ میر حسن دہلوی کی گلزارِ نسیم سے متاثر ہوکر انھوں نے یہ مثنوی کہی تھی[1]

نواکھالی: نواکھالی کے باشندے شاہ خلیل الرحمٰن ننددن پوری نے فارسی اور عربی کے علاوہ اردو زبان میں شاعری کی ہے۔ ان کا ایک دیوان 'نوشۂ خلیل' اردو، فارسی اور عربی نعتوں اور منقبتوں پر مشتمل تھا، جو کانپور سے شایع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے بغداد کے سفر کا حال 'سفر نامۂ خلیلی' میں درج کیا ہے۔ ساٹھ ۶۰ صفحات کی یہ کتاب کانپور سے ہی ۱۳۳۴ھ میں چھپی۔

نواکھالی کے دیگر اردو دانوں میں مولوی تبارک علی نے 'حسام الذاکرین' تالیف

[1] حکیم حبیب الرحمٰن' ثلاثۂ غسالہ، غیر مطبوعہ، ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ۔

کی۔ اس کی تالیف میں انھوں نے ۴۵ کتابوں سے استفادہ کیا۔

قاری محمد نور اللہ نے دیوبند سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی کتاب 'انوار الصدیق' دہلی سے ۱۳۵۶ھ میں شایع ہوئی۔

مولوی عبدالسبحان نواکھالی مدرسے کے مدرس تھے۔ انھوں نے 'دیوان علی' کی شرح لکھی اور اس کا نام 'حل دیوان علی' رکھا۔ اس کا حجم ۵۲۰ صفحات ہے اور یہ نواکھالی سے ہی شایع ہوئی۔

مولانا محمد حامد نے کئی دینی رسالے تالیف کیے۔

مولوی عبدالمجید فاضل دیوبند تھے اور مدرسۂ اسلامیہ ڈھاکہ کے ناظم رہ چکے تھے۔ انھوں نے 'مسائل اصول فقہ' اور 'تردید الخطبہ' کتابیں لکھیں۔

کمیلا: بنگلا دیش کے شہر کمرلا جسے کمیلا بھی کہا جاتا ہے، چند اساتذۂ اردو موجود تھے۔ ان میں مولوی فریدالدین احمد نے فارسی میں لکھے ہوئے گورنمنٹ ایکٹ ہشتم کا اردو میں ترجمہ کیا جو ۱۸۵۹ء میں شایع ہوا۔

منشی عبدالحق لطیف نے اپنی زندگی ایک مدت تک لکھنؤ میں گزاری۔ ناسخ کے دوستوں میں تھے۔ اردو میں شاعری کرتے تھے۔

چودھری سید محمد اسمٰعیل رحمٰن اعجازی نے ظرافت کے ذریعے اسلامی تعلیم دی۔ انکی کتاب 'گلزار ظرافت و سعادت' مزاحیہ قصوں سے پُر ہے۔ یہ کتاب بریلی سے شایع ہوئی۔

ان اضلاع کے علاوہ بنگلا دیش کے دوسرے ضلعوں رنگ پور، پبنہ، باریسال، جیسور اور راجشاہی میں بھی چند قابلِ ذکر ہستیوں نے اردو ادب میں چند کتابیں تالیف کی ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ بنگلا دیش کا ہر ضلع کم و بیش اردو زبان و ادب سے وابستہ رہا۔

معارف کی ڈاک

مکتوب اسلام آباد

۶۹ ماڈل ٹاؤن، ہمک، اسلام آباد۔ پاکستان

۹ر دسمبر ۹۳ء

حضرت مکرم اصلاحی صاحب زید عزہ۔ سلام مسنون

راقم السطور کا ایک مضمون بہ عنوان "گیارہویں صدی ہجری کا ایک گمنام مصنف محمد بن جلال شاہی رضوی" معارف بابت مئی ۱۹۹۳ء میں شایع ہوا تھا۔ مضمون کی سرخی میں لفظ "گمنام" اور نفسِ مضمون کے جملے "محمد بن جلال شاہی رضوی ہندوستانی مصنف ہیں، ان کی چند فارسی تصانیف دستیاب ہیں مگر خود ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے" (ص ۳۳۹) نے وسیع اور دقیق مطالعہ رکھنے والے اہلِ علم کی توجہ حاصل کی۔ احمد آباد سے محترم ضیاء الدین ڈیسائی نے راقم السطور کے نام پُر از معلومات مکتوب (محررہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۹۳ء) بھیجا اور مصنف کے بارے میں متقدمین کی نگارشات اور تحقیقات کے حوالے فراہم کیے۔ جناب خضر نوشاہی نے بھی میرے مضمون کی تکمیل کے طور پر ایک مقالہ "روضات شاہی اور اس کا مصنف" معارف، اکتوبر ۱۹۹۳ء میں چھپوایا۔ خضر صاحب کا مقالہ تو قارئین پڑھ چکے، یہاں جناب ڈیسائی کا خط نقل کرنا چاہتا ہوں تاکہ دیگر قارئین اس سے مستفید ہو سکیں۔

" معارف والے مضمون کے سلسلے میں عرض ہے کہ یہ صاحب گمنام نہیں بلکہ مشہور

معروف ہستی ہیں جن کا ذکر جہانگیر کی توزک اور شاہجہاں کی تاریخوں اور شعراء کے کچھ تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ سید محمد المعروف بہ مقبول عالم آپ کے ہاں (پاکستان) اُچ کے مشہور و معروف صاحب ولایت مخدوم جہانیاں جہانگشت سید جلال الدین بن حسین بخاری کے پوتے (جو اُچ سے گجرات آئے) سید برہان الدین محمد قطب عالم کے صاحبزادے سید سراج الدین محمد شاہ عالم کے پڑپوتے اور ان کے صاحب سجادہ تھے۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔ صاحب علم و ورع تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے جس کا ایک نسخہ کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی کے ذخیرے میں، ایک یہاں کتب خانۂ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ (احمد آباد) میں اور ایک لاہور دانشگاہ (پنجاب) لائبریری میں (ڈاکٹر سید عبد اللہ کی فہرست مخطوطات فارسی کے مطابق) موجود ہے۔ یہ لکھتے وقت آپ کا مضمون پیشِ نظر نہیں ہے۔ ان کی ایک کتاب جس کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ "الاسولہ والاجوبہ" کے نام سے لندن انڈیا آفس لائبریری میں بھی ہے۔ (ایتھے کی فہرست سامنے نہیں ہے) جہاں غالباً ان کی ایک اور کتاب رسالۂ سلطان محمد شاہی کا (معاد اور اس سے متعلق موضوعات پر) بھی ذکر کیا ہے۔

H-ETHE, CAT, OF, P. MSS. IN THE LIB. OF THE INDIA OFFICE

VOL. I. COL. 1584 NO 2916

نیز ان پر ایک مفصل مضمون جلالی احمد آبادی کے عنوان سے بمبئی کے نوائے ادب میں چار قسطوں میں شائع ہوا تھا (۱۹۴۹ء) کے لگ بھگ ان کے صاحبزادے سید جلال الدین مقصود عالم المتخلص بہ رضا شاہجہان کے صدر الصدور تھے اور ان کے فارسی دیوان کے دو نسخے موجود ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے ان پر (اور اس خاندان پر مختصراً) اپنے

ڈاکٹر نورالحسن انصاری مرحوم میموریل لکچر دہلی میں لکچر دیا ہے جو کتابچے کی صورت میں شایع بھی ہوا ہے۔ سید جلال کے صاحبزادے سید جعفر بدر عالم نے شاہجہاں کی ان کے والد کے انتقال کے بعد صدر الصدور بنانے کی درخواست کو نامنظور کرتے ہوئے سجادہ نشینی کو غنیمت سمجھا۔ یہ بھی شاعر تھے۔ صفا تخلص تھا۔ متفرق اشعار ملتے ہیں۔ لیکن دیوان کا پتہ نہیں۔ مرآۃ احمدی کے خاتمہ میں اس خاندان کا ذکر موجود ہے۔ اُچہ وغیرہ میں گجرات کے وہاں کے خاندان کی اس شاخ کے بارے میں مواد ضرور ہوگا۔ ایک فارسی کتاب کہیں نظر سے گزری تھی اس قسم کی لیکن اب تفصیلات ذہن میں نہیں ہیں۔ سید جعفر بدر عالم نے کئی مرتبہ اُچہ کا سفر بھی کیا تھا"

احقر راقم السطور مخدومی ڈیسائی صاحب اور جناب نوشاہی صاحب کا ممنون ہے کہ انھوں نے عالمانہ معلومات فراہم کیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہندو پاکستان کی کسی جامعہ کے شعبۂ فارسی کا کوئی طالب علم محمد بن جلال شاہی رضوی کے خاندان کی علمی خدمات پر کوئی امتحانی مقالہ ایم۔ اے یا پی۔ ایچ ڈی کی سند کے حصول کے لیے لکھے۔

والسلام۔ عارف نوشاہی

مکتوب شکاگو

شکاگو (امریکہ)

۱۷ر نومبر ۱۹۹۳ء

محترمی اصلاحی صاحب! سلام وتحیۂ مسنونہ۔ خدا کا شکر ہے کہ معارف کے تین پرچے (جون، جولائی اور اکتوبر) ایک ساتھ ملے۔ اکتوبر کے شمارہ میں علامہ شبلیؒ کے شعرفہمی کے مضمون کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ علامہ شبلیؒ کی شعرفہمی تو ایک مسلمہ حقیقت ہے

مگر مضمون میں آپ کے ذوق شعروادب کی جو عکاسی ہوئی ہے وہ ہر سطر میں نمایاں ہے مضمون ہر طرح قابلِ استفادہ ہے۔ اس کے صفحہ ۲۵ کے آخر میں جو شعر[1] درج ہے اس کا پہلا مصرعہ ہم نے یوں سُنا ہے۔۔

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من

میری رائے میں یہ مصرعہ مصرعۂ ثانی کی مناسبت سے بلیغ تر ہے۔ اس بارہ میں آپ کی رائے مطلوب ہے[2]

کیفی اعظمی کی کتاب کے سلسلہ میں آپ کے دیے ہوئے پتوں کا شکریہ۔ ہندوستانی پتہ سے انشاءاللہ کتاب حاصل کی جائے گی۔ والد محترم کی صحت کے بارہ میں آپ نے کچھ نہیں لکھا۔ انکے لیے دعاگو ہوں۔ امید کہ آپ معہ متعلقین بہ خیروعافیت ہوں گے۔

مخلص۔ سعید صدیقی۔

مکتوب کلکتہ

انڈوعرب کلچرل ایسوسی ایشن، کلکتہ

مورخہ ۴ اپریل ۱۹۹۳ء[3]

مکرمی جناب ضیاء الدین صاحب اصلاحی، سلام مسنون۔

سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرا مقالہ اپنے مؤقر رسالہ

---

[1] پورا شعر یوں ہے: زغارت چمنت بر بہار منت ہاست ؛؛ کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند (معارف)

[2] فارسی زبان کے علما و فضلا اگر اس پر اظہار خیال فرمائیں تو معارف کے صفحات میں اسے شایع کیا جائیگا۔ (معارف)

[3] یہ خط پہلے آیا تھا اور کھو گیا تھا، اس کی اہمیت اور مقالہ نگار کے اصرار کی وجہ سے شایع کیا جاتا ہے تاخیر کے لیے معذرت پیش کی جاتی ہے (معارف)

'معارف' برائے مارچ ۱۹۹۳ء میں شایع کردیا۔ آپ کے ادارے نے اس کے پروف کی تصحیح محنت سے کی ہے یعنی اس میں طباعت کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس کے بارے میں میں مندرجۂ ذیل باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

میرے مقالے کا اصل عنوان تھا "ہندوستان میں اسلامی مخطوطات" جسے بدل کر آپ نے "خطاطی کی اہمیت اور ہندوستان کے دس اہم مخطوطات" کردیا ہے۔ میرے خیال میں اس مقالے کا عنوان "اسلامی خطاطی کی اہمیت اور ہندوستان کے دس اہم اسلامی مخطوطات" ہونا چاہیے تھا۔

ص ۲۰۳ کے فٹ نوٹ میں آپ نے لکھا ہے کہ دارالمصنفین اعظم گڈھ میں بھی نادر مخطوطات ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے آپ کی شبلی اکیڈمی کے اسلامی مخطوطات کی کوئی فہرست اب تک شایع نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے اسلامی مخطوطات کی ایک فہرست شایع کریں یا کم از کم جو نوادرات آپ کے یہاں موجود ہیں ان کا تفصیلی ذکر 'معارف' ہی میں بالاقساط شایع کریں[1]

اس نوٹ میں آپ نے لکھا ہے کہ مقالہ نگار کا انتخاب کلکتہ اور پٹنہ تک ہی محدود ہے۔ آپ کے نوادرات کا مجھے علم نہیں ہے ورنہ میں اپنے مقالے میں ایک دو مخطوطات کا ذکر ضرور کرتا۔

یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ مذکور میری ایک انگریزی تقریر کا اردو ترجمہ ہے، جس میں ہندوستان کے اسلامی مخطوطات کے نوادرات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ میں آپ کی اور اپنے قارئین کی اطلاع کے لیے یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے ایک

---

[1] معارف، برہان اور آجکل میں مضامین شایع ہو چکے ہیں (معارف)

کتاب ISLAMIC MANUSCRIPT IN INDIA کئی سال کی محنت کے بعد مرتب کی ہے اور وہ انگریزی میں 'الفرقان اسلامی فاؤنڈیشن' لندن' کی طرف سے شایع بھی ہو چکی ہے۔ امید کہ آپ ہر طرح مع الخیر ہوں گے۔ فقط والسلام

آپ کا مخلص' محمد صابر خاں کان اللہ لہٗ

مکتوب علی گڑھ

حبیب منزل' میرس روڈ' علی گڑھ

۲۷ر دسمبر ۱۹۹۳ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ کچھ مدت قبل موصول ہوا تھا۔ اس دوران ضیاء الحسن فاروقی صاحب کو ایک خط لکھا تھا جواب نہیں ملا۔ وہ اعظم گڈھ میں ہیں یا وہاں سے ان کی مراجعت ہو گئی ہے؟[1]

دسمبر ۱۹۹۳ء کے معارف میں آپ کا اداریہ حسب معمول متوازن اور فکر انگیز ہے۔ آپ نے بالخصوص یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ مسلمانوں میں "جو لوگ مسجد کا تحفظ نہیں کر سکے انہیں اس کی شہادت کی یادگار اور برسی منانے کا کیا حق ہے۔ آخر ان کی بے تدبیری سے سادہ لوح مسلمانوں کا خون خرابہ کب تک ہوگا"۔ تاہم دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ کیا بابری مسجد کی شہادت کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی ذمہ داری صرف اس قدر تھی کہ اس نے بقول آپ کے "گومگو پالیسی" اختیار کی؟ میرا خیال یہ نہیں ہے اور میرے خیال کو سپریم کورٹ کے دو سابق ججوں اور پنجاب و ہریانہ ہائی کورٹ اور مغربی بنگال ہائی کورٹ کے ایک سابق چیف جسٹس (اور یہ تینوں ہندو ہیں) کے اس بیان سے تقویت ملتی ہے جو انھوں نے

---

[1] لکھنؤ تشریف لے گئے' (معارف)

حال میں پوری تفتیش و تجسس کے بعد جاری کیا ہے اور جس میں نہایت جرأت، غیر جانبداری اور وضاحت کے ساتھ یہ کہا ہے کہ اس بارے میں مرکزی حکومت کی بے عملی اس بنا پر نہیں تھی کہ اسے یو۔پی کی حکومت نے دھوکے میں رکھا بلکہ اس نے یہ رویہ جان بوجھ کر اس وجہ سے اختیار کیا تھا کہ وہ ہندو ووٹوں کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ مجھ جیسے مسلمانوں کو جنھیں اپنی مملکت کے سیکولر کردار پر ناز تھا، صدمہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی معاون جماعتوں کے طرز عمل سے اس لیے نہیں پہنچا ہے کہ ان سے اس کے علاوہ کوئی توقع ہی نہیں تھی بلکہ صدمہ اس مرکزی حکومت کے رویے سے پہنچا ہے جو سیکولرزم کی دعویدار تھی اور آج بھی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کی مختلف تنظیموں اور حزب اختلاف کی سیکولر جماعتوں کا تعلق ہے، وہ تو برابر یہ مطالبہ کر رہی ہیں کہ مرکزی حکومت "سپریم کورٹ سے اپنا ریفرنس زیر دفعہ ۱۴۳ واپس لے کر دستور کی دفعہ ۱۳۸ کے تحت یہ مقدمہ سپریم کورٹ کو فیصلے کے لیے بھیج دے اور عدالت کا جو بھی فیصلہ ہو اس کی پابندی کی جائے" لیکن مرکزی حکومت کے کان پر جوں نہیں رینگتی ہے۔ ابھی حال میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قیادت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا جو وفد وزیر اعظم سے اس مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے ملا تھا اس ملاقات [illegible] وزیر اعظم اتنا سرد تھا کہ مولانا علی میاں کا یہ بیان اخباروں میں آیا تھا کہ وہ اب سلسلے میں وزیر اعظم سے ملاقات نہیں کریں گے اس لیے میری ناچیز رائے میں یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر ان مسلمانوں کی ہے (اور ان میں علمائے کرام اور دانشور دونوں ہی طبقوں کے لوگ شامل ہیں) جو اجودھیا کے المیے کے باوجود کانگریس کے خیر خواہ اور حامی ہیں کہ وہ اپنی پسندیدہ مرکزی حکومت

کوکم سے کم اسی تجویز کو ماننے پر آمادہ کر دیں جس کی نشاندہی آپ نے مذکورہ بالا جملوں میں فرمائی ہے اور جن کا حوالہ میں نے دیا ہے۔ امید ہے مزاج گرامی بخیریت ہوگا۔

نیاز مند۔ ریاض الرحمن شروانی

مکتوب پٹنہ

پھلواری شریف، پٹنہ

۳۰ رنومبر ۱۹۹۳ء

مکرمی جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب۔ السلام علیکم

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ خدا کرے۔ میرا ایک مضمون بہ عنوان: "اقبال کے کلام کی قرآنی تلمیحات کے اشاریے" آپ کو موصول ہو چکا ہے جس کے موصول ہونے پر آپ نے ازراہ تحسین اسے موصول ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے "یادگار مقالہ" سے موسوم کیا ہے۔ اس ہمت افزائی کے لیے میں آپ کا خصوصی طور پر اور دار المصنفین کا عمومی طور پر بیحد مشکور رہوں۔

اس مضمون[1] میں میں نے اقبال کے ان اشعار کے اشاریے دیا تھا جن میں اقبال نے قرآن کے عربی متن کے الفاظ یا آیت کے فقروں کو اپنے اشعار میں عربی متن میں استعمال کیا ہے۔ اب جو مضمون[2] بھیج رہا ہوں اس میں اقبال نے اپنے اشعار میں آیات کا ہو بہو منظوم ترجمہ کر دیا ہے اور عام قاری کے لیے اسے پکڑنا کہ یہ کس آیت کی ہو بہو منظوم ترجمانی ہے مشکل ہے۔ اس لیے ایسے ستر اشعار کے قرآنی آیات کے حوالوں کے ساتھ اشاریے دیے گئے ہیں اور اس مضمون کا اسی لیے نام ہے: "اقبال کے کلام میں قرآنی آیات کے منظوم ترجموں کے اشاریے"

کیا کریں پچھلے پچاس برسوں میں لوگوں نے اقبال کو "حکیم الامتہ" کا لقب دیا ہے

---

[1] مضمون اسی شمارہ میں شامل ہے [2] یہ بھی مل گیا ہے اور انشاء اللہ آئندہ شایع ہوگا۔

اور ان کے نام کے قبل علامہ اور آخر میں رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ مگر اس ستم ظریفی کو کیا کیجیے، کہ مٹھی بھر لوگ جو اقبال کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں وہ اقبال کو ولیؔ سے لے کر حسرتؔ، جگرؔ اور ذوقؔ کی صف میں کھڑا کرکے فیتے لے کر ان کے جسم و جبہ کو ناپتے ہیں۔ کسی نے ان کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ یہ آسان کام نہیں ہے۔

اس ناچیز نے اقبال کی روح کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجہ میں میری آٹھ کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن کی فہرست پچھلی بار ہم نے آپ کو بھیجی تھی۔ دعا میرے لیے نہیں کیجیے، بلکہ اس کی کیجیے کہ اقبال کا نورِ بصیرت عام ہو۔

احقر محمد بدیع الزماں

مکتوب لکھنؤ

۱۲۱۔ نیا گاؤں (ایسٹ) لکھنؤ

۲۰ر دسمبر ۱۹۹۳ء

جناب مولانا صاحب! سلام مسنون

اس وقت میرے پیشِ نظر "معارف" بابت مئی ۱۹۹۳ء کا شمارہ ہے۔ اس میں ص۳۵۵ سے ص۳۷۱ تک جناب جاوید اختر صاحب کا مضمون "رسالہ مخزن لاہور" شایع ہوا۔ فاضل مضمون نگار نے ص۳۵۷ میں لکھا ہے "محسن الملک نے علی گڑھ اور لکھنؤ میں اسکے (اردو ہندی اختلاف) خلاف احتجاج کیا اور کامیاب جلسے کیے۔ اگست ۱۹۰۰ء میں جب لکھنؤ میں جلسہ منعقد ہوا تو پنجاب کی نمایندگی غلام بھیک نیرنگ، شیخ محمد اقبال اور شیخ عبدالقادر نے کی۔۔۔" یہ جملہ "رسالہ مخزن کے اجرا کا سبب" کے تحت درج ہو چکا ہے، جاوید اختر صاحب نے اس عبارت کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ میں اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ عبارت انکو کہاں سے ملی ہے اور اسکا ماخذ کیا ہے۔ میرے پاس جاوید اختر صاحب کا ایڈرس نہیں ہے۔ براہ نوازش انکا ایڈرس لکھکر ممنون فرمائیے گا[1]۔ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔

والسلام۔ نیازمند۔ اکبر حیدری کشمیری

---

[1] وہ اب کسی عرب ملک میں چلے گئے ہیں، مجھے انکا پتہ معلوم نہیں۔ اگر معارف انکی نظر سے گزرے گا تو ممکن ہے جواب دیں۔

وفیات

ڈاکٹر حافظ غلام مصطفٰے

از پروفیسر مختار الدین احمد

دوشنبہ، ۲۱ دسمبر ۱۹۹۳ء کو حافظ غلام مصطفٰے سابق ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی طویل علالت کے بعد علی گڑھ میں وفات پا گئے۔ تدفین یونیورسٹی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

ان کی ولادت الٰہ آباد میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ حفظ قرآن اور ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ انھوں نے نجی طور پر تعلیم حاصل کر کے الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے، آگرہ یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں اور علی گڑھ سے عربی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر عبد العلیم مرحوم کی صدارت کے عہد میں وہ شعبۂ عربی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ [illegible] میں عہد جاہلی کی عربی شاعری میں مذہبی رجحانات کے موضوع پر انھوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ریڈر مقرر ہوئے اور ۲۵ سال شعبے میں تدریسی فرائض انجام دے کر ۱۹۷۶ء میں متقاعد ہوئے۔

ان کی مطبوعہ تصانیف حسب ذیل ہیں:-

(۱) RELIGIOUS TRENDS IN PRE-ISLAMIC ARABIC POETRY (مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۸ء)

(۲) ابن الفارض: عربی صوفیانہ شاعری کی ایک منفرد شخصیت (علی گڑھ ۱۹۷۳ء)

(۳) اخبار الکرام باخبار المسجد الحرام مصنفۂ الشیخ شہاب الدین احمد بن محمد الاسدی

الملکی الشافعی (متوفی ۱۰۶۶ھ) بنارس ۱۹۷۶ء۔

ان کتابوں کے علاوہ انگریزی، عربی اور اردو میں ان کے مضامین متعدد رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔

اولاد میں دو بیٹیاں اور تین بیٹے یادگار چھوڑے ہیں۔ سب تعلیم یافتہ ہیں اور برسرروزگار۔ صفیہ جاریہ نے علی گڑھ سے فارسی میں ایم اے اور ۱۹۷۵ء میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: "داستان یوسف زلیخا در شعر فارسی" فارسی زبان وادب سے متعلق متعدد مقالات برہان، تحریر اور دوسرے رسالوں میں شایع ہوئے ہیں وہ آج کل شعبۂ فارسی میں ریسرچ ایسوسیٹ ہیں۔ میمونہ جاریہ کیمیا میں ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کرکے اسی شعبہ میں لکچرر مقرر ہوگئی ہیں، غلام مرسلین نے عربی میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ایم فل کا مقالہ انھوں نے مولانا عبدالحئی لکھنوی فرنگی محلی پر لکھا تھا جو کتابی شکل میں شایع ہوگیا ہے۔ علامۂ مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کو مرتب کرکے انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ آج کل ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے شعبے میں لکچرر ہیں۔

حافظ غلام مصطفیٰ مرحوم کے رفیق اور دوست پروفیسر محمد اقبال انصاری سابق صدر شعبۂ اسلامیات کی توجہ سے ان کی انگریزی اور اردو کتابیں شایع ہوئیں جب کہ عربی کتاب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کے اہتمام میں مکتبۂ سلفیہ بنارس سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اگر علی گڑھ کا شعبۂ عربی مرحوم کے مضامین بھی جمع کرکے شایع کردے تو یہ ایک مفید علمی خدمت ہوگی۔

مولانا محب اللہ لاری، ندوی

افسوس ہے کہ مولانا محب اللہ ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ ۳۰ نومبر ۱۹۹۳ء

کو رحلت فرما گئے، انکی عمر ۸۸ برس تھی اور وہ نحیف وکمزور بھی ہوگئے تھے لیکن ندوۃ العلما کے دور کمال کی ایک یادگار تھے اور ان کا وجود ندوۃ العلما خصوصاً اس کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے لیے باعث تقویت تھا جن کے مرحوم ہم سبق تھے۔

ان کا وطن لار تھا، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی تعلیم ندوۃ العلما لکھنؤ اور انگریزی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پائی اس کے بعد وہ چاہتے تو اچھی سی اچھی ملازمت مل جاتی مگر انھوں نے فراغت کے بعد کانپور میں اپنی انڈسٹری کر لی۔

کاروبار میں لگ جانے کے بعد بھی انھوں نے ندوۃ العلما اور اس کے فضلا سے اپنا تعلق باقی رکھا اور اس کی مجلس انتظامیہ کے برابر رکن رہے۔ ۱۹۶۹ء میں بعض خاص حالات کی بنا پر انہیں دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داری سپرد کی گئی جس کو کم وبیش ۲۵ برس تک وہ انجام دیتے رہے اور وفات کے بعد ہی اس سے سبکدوش ہوئے۔

دینداری، تقویٰ اور خشیت الٰہی ان کا شعار تھا، طبیعت میں اعتدال، سلامت روی سادگی اور انکسار تھا۔ اپنے اخلاص، مروت، شرافت اور حسن خلق کی بنا پر طلبہ، اساتذہ اور منتظمین کے حلقے میں مقبول رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس نیک بندے کی مغفرت فرمائے۔ آمین

اب مولانا سید محمد رابع ندوی صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلما کے اہتمام کی ذمہ داری سنبھال لی ہے، جن کا انتخاب ان کے طویل تجربہ اور دیرینہ خدمات کی بنا پر بہت مناسب ہوا ہے۔

جناب اسلام احمد

دسمبر کا مہینہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ جناب اسلام احمد ریٹائرڈ۔ آئی۔ جی کے انتقال کی خبر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہوئی۔ وہ علامہ شبلیؒ مرحوم کے ہم خاندان اور خاص عزیز تھے، ان کے والد بزرگوار شیخ محمد اقبال الہ آباد ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے، جنکے

المکی الشافعی (متوفی ۱۰۶۶ھ) بنارس ۱۹۷۶ء۔

ان کتابوں کے علاوہ انگریزی، عربی اور اردو میں ان کے مضامین مقتدر رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔

اولاد میں دو بیٹیاں اور تین بیٹے یادگار چھوڑے ہیں۔ سب تعلیم یافتہ ہیں اور برسرِ روزگار۔ صفیہ جاریہ نے علی گڑھ سے فارسی میں ایم اے اور ۱۹۷۵ء میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: "داستان یوسف زلیخا در شعر فارسی" فارسی زبان و ادب سے متعلق متعدد مقالات برہان، تحریر اور دوسرے رسالوں میں شایع ہوئے ہیں وہ آج کل شعبۂ فارسی میں ریسرچ ایسوسیٹ ہیں۔ میمونہ جاریہ کیمیا میں ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کرکے اسی شعبہ میں لکچرر مقرر ہوگئی ہیں، غلام مرسلین نے عربی میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ایم فل کا مقالہ انھوں نے مولانا عبدالحئی لکھنوی فرنگی محلی پر لکھا تھا جو کتابی شکل میں شایع ہوگیا ہے۔ علامۂ مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کو مرتب کرکے انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ آج کل ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے شعبے میں لکچرر ہیں۔

حافظ غلام مصطفےٰ مرحوم کے رفیق اور دوست پروفیسر محمد اقبال انصاری سابق صدر شعبۂ اسلامیات کی توجہ سے ان کی انگریزی اور اردو کتابیں شایع ہوئیں جب کہ عربی کتاب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کے اہتمام میں مکتبۂ سلفیہ بنارس سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اگر علی گڑھ کا شعبۂ عربی مرحوم کے مضامین بھی جمع کرکے شایع کردے تو یہ ایک مفید علمی خدمت ہوگی۔

مولانا محب اللہ لاری، ندوی

افسوس ہے کہ مولانا محب اللہ ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ ۳ نومبر ۱۹۹۳ء

کو رحلت فرما گئے، انکی عمر ۸۰ برس تھی اور وہ نحیف و کمزور بھی ہوگئے تھے لیکن ندوۃ العلما کے دورِ کمال کی ایک یادگار تھے اور ان کا وجود ندوۃ العلما خصوصاً اس کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے لیے باعث تقویت تھا جن کے مرحوم ہم سبق تھے۔

ان کا وطن لار تھا، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی تعلیم ندوۃ العلما لکھنؤ اور انگریزی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پائی اس کے بعد وہ چاہتے تو اچھی سی اچھی ملازمت مل جاتی مگر انھوں نے فراغت کے بعد کانپور میں اپنی انڈسٹری کر لی۔

کاروبار میں لگ جانے کے بعد بھی انھوں نے ندوۃ العلما اور اس کے فضلا سے اپنا تعلق باقی رکھا اور اس کی مجلس انتظامیہ کے برابر رکن رہے۔ ۱۹۶۹ء میں بعض خاص حالات کی بنا پر انہیں دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داری سپرد کی گئی جس کو کم و بیش ۲۵ برس تک وہ انجام دیتے رہے اور وفات کے بعد ہی اس سے سبکدوش ہوئے۔

دینداری، تقویٰ اور خشیت الٰہی ان کا شعار تھا، طبیعت میں اعتدال، سلامت روی سادگی اور انکسار تھا۔ اپنے اخلاص، مروت، شرافت اور حسن خلق کی بنا پر طلبہ، اساتذہ اور منتظمین کے حلقے میں مقبول رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس نیک بندے کی مغفرت فرمائے۔ آمین

اب مولانا سید محمد رابع ندوی صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلما کے اہتمام کی ذمہ داری سنبھالی ہے جن کا انتخاب ان کے طویل تجربہ اور دیرینہ خدمات کی بنا پر بہت مناسب ہوا ہے۔

جناب اسلام احمد

دسمبر کا مہینہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ جناب اسلام احمد ریٹائرڈ۔ آئی۔ جی کے انتقال کی خبر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہوئی۔ وہ علامہ شبلیؒ مرحوم کے ہم خاندان اور خاص عزیز تھے، ان کے والد بزرگوار شیخ محمد اقبال الٰہ آباد ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے، جنکے

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے مخلصانہ روابط تھے۔ اسلام احمد صاحب بھی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور آخر میں آئی جی ہوکر ریٹائر ہوئے۔

وہ لکھنؤ میں متوطن ہوگئے تھے لیکن اپنے وطن اعظم گڈھ سے انہیں ہمیشہ بڑا تعلق رہا، ان کی تدفین بھی بندول میں ان کے آبائی قبرستان میں ہوئی، یہاں کے لوگوں سے بلا تفریق مذہب و ملت بڑی محبت، خلوص اور گرمجوشی سے ملتے اور ان کی خاطر مدارات میں کمی نہ کرتے۔ ان کی اہلیہ بڑی نیک بخت خاتون تھیں، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کوئریاپار اعظم گڈھ کے ایک شریف و نجیب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اردو کے مشہور ادیب و نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی ان کے حقیقی بھتیجے تھے، جو اور اس خاندان کے دوسرے اشخاص بھی بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہیں۔ علمی و دنیاوی وجاہت کی طرح دینداری میں بھی یہ خانوادہ ممتاز تھا۔

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کی تعلیم مدرسہ الٰہیات کانپور میں ہوئی تھی اور انھوں نے الٰہ آباد بورڈ کے امتحانات بھی اچھے نمبروں سے پاس کیے تھے، ۱۹۲۵ء میں وہ شبلی نیشنل ہائر سکنڈری اسکول میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے۔

مولوی صاحب کو قومی و ملی اشغال سے بھی سروکار رہا اور جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس پارٹی سے وابستہ رہے، اعظم گڈھ کے نسواں اسکول کے جواب گریجویٹ کالج ہوگیا ہے بانی ارکان میں تھے، برسوں اس کے صدر بھی رہے۔

ملازمت کے ابتدائی زمانے سے دار المصنفین آنے کا معمول بنا لیا تھا۔

اس وضع داری کو اس وقت تک نبا ہا جب تک پیروں میں قوت رہی، انہیں مولانا سید سلیمان ندوی صاحبؒ اور مولوی مسعود علی ندوی کی مجلس میں باریاب ہونے کا شرف حاصل تھا، شاہ معین الدین احمد اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبان اور دوسرے رفقا اور کارکنوں سے نہایت بے تکلف تھے، اس ناچیز پر بھی بہت شفقت فرماتے تھے۔

دو تین برس سے بالکل معذور اور خانہ نشین ہو گئے تھے بالآخر ۲۸ اور ۲۹ دسمبر کی درمیانی شب میں واصل بحق ہو گئے، اللہ ان کے درجات بلند کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

"ض"

یادِ رفتگاں

یہ کتاب مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ان ۱۳۵ تعزیتی تحریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے اساتذہ، پیر طریقت، احباب، معاصرین اور دوسرے مشاہیر کی رحلت پر سپرد قلم کی تھیں، قلب و قلم کی دردمندی نے ان تحریروں کو ادب و انشا اور تاریخ و سوانح کے شہ پاروں کی حیثیت بخش دی ہے۔ قیمت :- ۵۰

بزمِ رفتگاں

اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے قلم سے ان کے اکابر و معاصر پر نثری مرثیے ہیں جو پُر اثر ہونے کے علاوہ پُر از معلومات بھی ہیں۔

قیمت جلد دوم ۔۔ ۳۵

"منیجر"

بابُ التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

نقوش مدیر جناب جاوید طفیل، بہترین کاغذ، عمدہ طباعت، مصور و مجلد مع گردپوش

صفحات ۴۴۸، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: نقوش، اردو بازار، لاہور، پاکستان۔

رسالہ نقوش کی شہرت کا سبب اصلاً اس کے خاص نمبر اور سالنامے ہیں، زیرنظر نمبر بھی سالنامہ ہے اور طباعت و ضخامت میں اپنے پیش رُو شماروں کا نقش ہے، بلند پایہ علمی و ادبی مقالات و مضامین، سفرناموں اور منتخب افسانوں کے علاوہ حصۂ شعر بھی خاصا ہے اور اس میں بھی حمد و نعت کا حصہ جدا ہے، مقالات میں ڈاکٹر گیان چند جین کی تحریر "اردو زبان کا پس منظر" کے عنوان سے سر مقالہ کی حیثیت سے ہے، اس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ "اردو محض کھڑی بولی کا شستہ روپ ہے، اس سے جدا نہیں" اس ضمن میں چند ماہرین لسانیات کی تحقیق کا رد بھی کیا گیا ہے، ان کے نرم و نازک لہجہ میں 'لسانی مالیخولیا'، 'لسانی مجذوبیت' اور 'لسانی شعور کی کمی' جیسی درشت تعبیرات کا احساس بھی ہوتا ہے، انھوں نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اس رائے کہ "مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں اس لیے قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا" پہ اعتراض کیا ہے کہ "سید صاحبؒ کو اس سے غرض نہیں کہ سندھ میں آنے والے مسلمانوں کی زبان عربی تھی اور سندھ کے ہندوؤں کی زبان براچڈا پ بھرنش، ان کے میل سے سندھی زبان بن سکتی تھی اردو نہیں" .... فاضل

مقالہ نگار کی یہ ترجمانی درست نہیں، سید صاحبؒ نے صاف لکھا ہے کہ سندھ میں آنے والے مسلمانوں کی زبان صرف عربی ہی نہیں فارسی بھی تھی، انھوں نے کئی معاصر شہادتوں کے بعد ثابت کیا ہے کہ عربی و فارسی الفاظ کا میل جول ہندوستان کے جس حصہ میں واقع ہوا وہ سندھ ہے، پھر سید صاحب اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ "سندھی ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہیں"۔ ایک اور عمدہ مضمون تاریخ اسلامی کے عہد ساز موڑ ہے اس میں ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی نے مکہ میں اسلام کے آغاز میں تبلیغ کے طریقہ کار کا جائزہ لیا ہے، ایک دلچسپ مضمون فراق کی دانشورانہ حیثیت پر ڈاکٹر جمیل جالبی کے قلم سے ہے اس میں ایک جگہ یہ لکھا گیا ہے کہ "فراق کے مزاج نے دوستوں کو دور کیا، مداحوں کو ناراض کیا، خود تمام عمر تکلیف اٹھائی، یہی تخلیقی انسان کی پہچان ہے" ان کے مضمون میں مغضوب (بغضب)، آرجار، کریانے کی دوکان شاید کمپوزنگ کی غلطیاں ہیں، دوسرے مضامین میں بھی کمپوزنگ کی غلطیاں رہ گئی ہیں، ایک اور مضمون میں یگانہ چنگیزی کا وہ کلام یکجا کیا گیا ہے جو ان کے چاروں شعری مجموعوں میں شامل نہیں، ان کے بعض منسوخ اشعار بھی دیدیے گئے ہیں حالانکہ ان کے غیر منسوخ کلام میں ایسے کئی اشعار ہیں جو تنسیخ ہی کے مستحق ہیں، جمال الدین افغانی پر جناب ابوسفیان اصلاحی کا مقالہ مفصل ہے، ایک جگہ لکھا ہے کہ "تسکینی سے چپی تک" یہاں تسکینی کی وضاحت ضروری تھی، لکھنؤ میں اردو گلدستوں کی روایت، مسلم ہسپانیہ کی میراث کے علاوہ شیخ عبدالقادر صاحب مخزن پر مفید اور جامع مضمون ہے یہ گویا شیخ صاحب کے مضامین و تصنیفات کی کتابیات بھی ہے، ایک اور قابل ذکر مضمون "سفر نا تمام غالب کی تلاش میں" ہے، یہ دلچسپ مضمون غالب کے شیدائیوں کے لیے معلومات کے ساتھ بعض نئے موضوعات کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ جناب شیخ نذیر حسین کے دو مضامین ہیں ایک

شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی پر' دوسرے مضمون میں انھوں نے اسامہ بن منقذ کی کتاب الاعتبار سے فرنگیوں کے متعلق مشاہدات وتجربات کا ترجمہ کیا ہے' آغا بابر کے پرکشش 'خدوخال' کے علاوہ ہندوستان کا سفرنامہ بھارت ۸۸ کے عنوان سے ہے۔ اس عمدہ' متنوع اور جاذب نظر شمارہ کے لیے ادارہ نقوش مبارکباد کے لائق ہے۔

سہ ماہی **فکر و نظر** حالی نمبر مدیر جناب شہریار' عمدہ کاغذ اور کتابت وطباعت صفحات ۲۱۶، قیمت ۲۵ روپے' پتہ: سہ ماہی فکر و نظر' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ادارہ فکر و نظر علی گڑھ نے علی گڑھ تحریک سے وابستہ نامور اور اہم شخصیات کے کارناموں کو نمایاں کرنے اور ان کے نام نیک کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے خصوصی شمارے شایع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر اور نامورانِ علی گڑھ نمبر اور زیرِ نظر حالی نمبر اسی منصوبہ کی عملی تصویر ہے' مولانا حالی اور سرسید کے تعلقات کے علاوہ فاضل مدیر کو یہ احساس بھی ہے کہ" اردو شعر و ادب میں حالی کے بغیر نہ تو قدیم ادب پر غور کیا جاسکتا ہے' نہ جدید ادب کو سمجھا جاسکتا ہے"۔ یہ پورا خاص نمبر اسی متن کی جامع شرح اور عمدہ بیان ہے' مضامین کو تین حصوں یعنی تنقید' شاعری اور متفرقات میں تقسیم کیا گیا ہے' حصۂ تنقید سے مولانا حالی کے فلسفۂ تنقید کی وضاحت کے علاوہ خود نقادوں کے نقطۂ نظر کے اختلاف کا دلچسپ مشاہدہ ہوتا ہے، پروفیسر آل احمد سرور کی رائے میں" گذشتہ سو سال میں تنقید میں بہت سی راہیں کھلی ہیں مگر حالی کی شاہراہ .....اردو تنقید کے لیے صراط مستقیم کہی جاسکتی ہے"۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی نظر میں " حالی کے بڑے نقاد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی غلط باتیں کہیں لیکن وہ

سب مقبول اور موثر ثابت ہوئیں"۔ جناب ابوالکلام قاسمی نے لکھا کہ "حالی کی ذہنی نشوونما اور ادبی تربیت میں عربی کی تنقیدی روایت کا عمل دخل بہت نمایاں ہے بخلاف شبلی کے .... جن کا مزاج فارسی ادب کی روایت سے ہم آہنگ ہے"، حالی کی شاعری پر عمدہ تحریریں ہیں، حصۂ متفرقات میں غالب وسعدی، تعلیم نسواں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے حالی کے تعلق کا بیان ہے، آخر میں 'نقش حالی' کے عنوان سے جناب ضیاء الدین انصاری نے مولانا حالی کی کتابوں اور ان کے متعلق کتب ومضامین کی مفصل کتابیات مرتب کردی ہے۔

فکر ونظر سرسید نمبر، مدیر جناب شہریار، صفحات ۲۹۶، قیمت ۳۰ روپے۔ پتہ: ایضاً۔

حالی نمبر کی طرح یہ سرسید نمبر بھی رسالہ فکر ونظر کے منصوبہ کی ایک کڑی ہے، اس شمارہ کے مضامین بھی تین حصوں میں ہیں، پہلے حصہ میں سرسید کی مذہبی، تعلیمی، علمی اور عقلی خدمات کا جائزہ ہے، دوسرے میں ان کی اصلاحی کوششوں کا تجزیہ ہے اور آخری حصہ میں ان کی تین اہم کتابوں خطبات احمدیہ، آثار الصنادید اور اسباب بغاوت ہند کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے، تحریروں میں ایک نمایاں پہلو غیر جانبداری کا ہے مثلاً پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے لکھا کہ "سرسید نے علم کے تین مآخذ تاریخ، فطرت اور متصوفانہ تجربہ میں صرف فطرت سے کسب فیض پر زور دیا... احکامات اور معاشرتی مسائل کی حد تک تو سرسید کا طریقہ کار مفید ثابت ہوسکتا ہے لیکن الٰہیات میں نہیں... وہ کم وبیش ہر مسئلہ کا رشتہ اور ہر بحث کی تان نیچر کے اپنے تصور پر لاکر توڑتے تھے... روح کے وجود کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ناقابل تشفی ہے، ان کے مباحث کی نوعیت صرف

ہنگامی اہمیت کی حامل ہے۔ سرسید کے نظریۂ تعلیم پر ڈاکٹر ظفرالاسلام نے بجا طور پر ایسے شواہد پیش کیے ہیں جن کی روشنی میں "دینی مدارس اور علوم سے سرسید یا ان کے قریبی رفقا کے شدید اختلاف کے مفروضہ کو قطعی طور پر رد کیا جا سکتا ہے"۔ حالی اور سرسید دونوں کے افکار و احوال سے واقفیت کے لیے ان دونوں شماروں کا مطالعہ ضروری ہے۔

ماہنامہ سب رس، عابد علی خاں نمبر، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۴۸۲۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن کے مدیر شہیر میر عابد علی خاں موجودہ دور میں ہندوستان کی اردو صحافت کی آبرو تھے، انھوں نے اپنی لیاقت، صلاحیت اور محنت سے سیاست کو حیدرآباد ہی نہیں، ہندوستان بلکہ بیرون ہندوستان کی صحافتی دنیا میں اہم مقام دلایا، وہ اپنے تجربہ کی بنیاد پر اردو صحافت کی رفتار سے مایوس نہیں تھے لیکن انکی نگاہیں مولانا محمد علی جوہر، مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور قاضی عبدالغفار جیسے جیّد صحافیوں کے نقوش کی متلاشی تھیں، انھوں نے خود ان ناموروں کی تقلید حتی الامکان کی اور اپنے اخبار کو سنجیدہ، متوازن، باوقار لب و لہجہ کا حامل بنایا اور ساتھ ہی سیاسی شعور کے ساتھ ستھرے علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا، اپنے بے لوث اور بے غرض جذبۂ خدمت کی وجہ سے وہ اردو والوں بلکہ عوام و خواص کے ہر طبقہ میں محبوب بنے رہے، ان کی خدمات کے اعتراف میں حیدرآباد کے ادبی ماہنامہ سب رس نے زیر نظر خاص شمارہ شایع کر کے مختلف اہل قلم کی تاثراتی تحریروں کے ساتھ مرحوم کے چند مفید مضامین اور خطوط کو بھی یکجا کر دیا ہے۔ (باقی)

(ع۔ ص)

مطبوعات جدیدہ

تسہیل کلام اقبال پیام مشرق

از جناب احمد جاوید، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ، نفیس طباعت، خوبصورت جلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۶، قیمت ۵۰ اروپے، پتہ: اقبال اکاڈمی لاہور، پاکستان۔

علامہ اقبال کے 'پیام مشرق' کا خاص مدعا ایسے اخلاقی، مذہبی اور ملی حقایق کی تلاش دریافت ہے جو فرد و قوم کی باطنی تربیت کے محرک و معاون ہوں، اس کے دیباچہ میں علامہ نے لکھا تھا کہ "زندگی اپنے حوالی میں اس وقت تک انقلاب نہیں لا سکتی جب تک خود اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اگر انسانوں کے ضمیر میں کسی نئی دنیا کی دریافت متشکل نہ ہو تو خارج میں اس کے وجود کی تلاش بھی لا حاصل ہے۔" 'پیام مشرق' آج بھی اسی قدر اہم اور ضروری ہے جتنا وہ 'حکیم مشرق' کے عہد میں تھا، لیکن برصغیر میں فارسی زبان کا چلن اب کم ہو گیا ہے، اس کا خسارہ کلام اقبال کے شیدائیوں کے لیے اس لیے بھی شدید ہے کہ وہ نصف سے زیادہ فارسی زبان میں ہے، اقبال اکاڈمی پاکستان نے اس کی تلافی کیلئے زیر نظر کتاب شایع کی ہے اس میں پیام مشرق کے اردو ترجمہ کے علاوہ مشکل الفاظ کی تشریح بھی ہے، ترجمہ میں سلاست و روانی کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

نہ ہر کس از محبت مایہ دار است	نہ با ہر کس محبت سازگار است
بروید لالہ با داغِ جگر تاب	دل لعل بدخشاں بے شرار است

ہنگامی اہمیت کی حامل ہے۔ سرسید کے نظریۂ تعلیم پر ڈاکٹر ظفر الاسلام نے بجا طور پر ایسے شواہد پیش کیے ہیں جن کی روشنی میں "دینی مدارس اور علوم سے سرسید یا ان کے قریبی رفقا کے شدید اختلاف کے مفروضہ کو قطعی طور پر رد کیا جا سکتا ہے"۔ حالی اور سرسید دونوں کے افکار و احوال سے واقفیت کے لیے ان دونوں شماروں کا مطالعہ ضروری ہے۔

ماہنامہ سب رس، عابد علی خاں نمبر، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن کے مدیر شہیر میر عابد علی خاں موجودہ دور میں ہندوستان کی اردو صحافت کی آبرو تھے، انھوں نے اپنی لیاقت، صلاحیت اور محنت سے سیاست کو حیدرآباد ہی نہیں، ہندوستان بلکہ بیرون ہندوستان کی صحافتی دنیا میں اہم مقام دلایا، وہ اپنے تجربہ کی بنیاد پر اردو صحافت کی رفتار سے مایوس نہیں تھے لیکن انکی نگاہیں مولانا محمد علی جوہر، مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور قاضی عبد الغفار جیسے جید صحافیوں کے نقوش کی متلاشی تھیں، انھوں نے خود ان ناموروں کی تقلید حتی الامکان کی اور اپنے اخبار کو سنجیدہ، متوازن، باوقار لب و لہجہ کا حامل بنایا اور ساتھ ہی سیاسی شعور کے ساتھ ستھرے علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا، اپنے بے لوث اور بے غرض جذبۂ خدمت کی وجہ سے وہ اردو والوں بلکہ عوام و خواص کے ہر طبقہ میں محبوب بنے رہے، ان کی خدمات کے اعتراف میں حیدرآباد کے ادبی ماہنامہ سب رس نے زیر نظر خاص شمارہ شایع کر کے مختلف اہل قلم کی تاثراتی تحریروں کے ساتھ مرحوم کے چند مفید مضامین اور خطوط کو بھی یکجا کر دیا ہے۔　　　(باقی)

(ع ۔ ص)

مطبوعات جدیدہ

تسہیل کلامِ اقبال پیامِ مشرق

از جناب احمد جاوید، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ، نفیس طباعت، خوبصورت جلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۳، قیمت ۵۰/۳ روپے، پتہ: اقبال اکاڈمی، لاہور، پاکستان۔

علامہ اقبال کے "پیام مشرق" کا خاص مدعا ایسے اخلاقی، مذہبی اور ملی حقایق کی تلاش و دریافت ہے جو فرد و قوم کی باطنی تربیت کے محرک و معاون ہوں، اس کے دیباچہ میں علامہ نے لکھا تھا کہ "زندگی اپنے حوالی میں اس وقت تک انقلاب نہیں لاسکتی جب تک خود اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اگر انسانوں کے ضمیر میں کسی نئی دنیا کی دریافت متشکل ہو تو خارج میں اس کے وجود کی تلاش بھی لاحاصل ہے۔" "پیام مشرق" آج بھی اسی قدر اہم اور ضروری ہے جتنا وہ "حکیم مشرق" کے عہد میں تھا، لیکن برصغیر میں فارسی زبان کا چلن اب کم ہوگیا ہے، اس کا خسارہ کلام اقبال کے شیدائیوں کے لیے اس لیے بھی شدید ہے کہ وہ نصف سے زیادہ فارسی زبان میں ہے، اقبال اکاڈمی پاکستان نے اس کی تلافی کیلئے زیرِ نظر کتاب شایع کی ہے اس میں پیام مشرق کے اردو ترجمہ کے علاوہ مشکل الفاظ کی تشریح بھی ہے، ترجمہ میں سلاست و روانی کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

نہ ہر کس از محبت مایہ دار است — نہ با ہر کس محبت سازگار است

بروید لالہ با داغِ جگر تاب — دلِ لعلِ بدخشاں بے شرار است

"ہر آدمی محبت کی دولت نہیں رکھتا، نہ محبت ہر کسی کو موافق آتی ہے" لالہ جگر چمکانے والا داغ لیے اگتا ہے، لعل بدخشاں کے دل میں کوئی شرارہ نہیں ہے"۔ خاص بات یہ ہے کہ ترجمہ کے ساتھ اسی صفحہ پر اشعار کی فرہنگ بھی ہے، یہ کتاب مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے اشتراک سے شایع ہوئی ہے جس کے ڈاکٹر رضا شعبانی کا فارسی ترجمہ بھی اس کی زینت ہے۔

فارسی قصیدہ نگاری از جناب ڈاکٹر نذیر احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۹۶، قیمت ۴۵ روپے۔ پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ یو۔ پی۔

فارسی زبان و ادب کے نامور محقق اور اس کتاب کے فاضل مولف نے غالب کی فارسی قصیدہ نگاری کے ضمن میں فارسی قصیدہ نگاری کا بھی غائر مطالعہ کیا اس سے وہ اس نتیجہ پہ پہنچے کہ فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز یہی ہے جس کے مطالعہ کا خاطر خواہ حق ہندوستانی نقادوں اور محققوں نے ادا نہیں کیا بلکہ وہ اس صنف سخن کے بارہ میں غلط فہمی پھیلانے کے موجب ہوئے، فاضل مولف نے رودکی، عنصری، فرخی، منوچہری دامغانی، سنائی، مسعود سعد سلمان، خاقانی، انوری، امیر معزی، سعدی اور ملک الشعرا بہار کی قصیدہ گوئی کے جائزہ میں قصیدہ نگاری کے بتدریج زوال میں غزل گوئی کی مقبولیت، علمی انحطاط، زبان کے مزاج کی تبدیلی اور قدر دانوں کی کمی جیسے عناصر کی نشاندہی کی ہے، انھوں نے قصیدہ کے خواص کا ذکر کر کے اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ اگر فارسی شاعری سے قصائد خارج کر دیے جائیں تو اس کا دامن تہی رہ جائے گا اور قصیدہ گو شعرا کے ذکر کے بغیر ادب فارسی کی تاریخ میں دلکشی بھی نہیں رہے گی، انھوں نے قصیدہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت سوگندنامہ پر بھی خاص

توجہ کی ہے، بحث میں اشعار خاصی تعداد میں نقل کیے گئے ہیں اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قارئین کے لیے شعراء کے دواوین حاصل کرنا مشکل ہے، یہ اشعار مقالہ کو خود کفیل بنا دیتے ہیں۔

رباعی از جناب پروفیسر سید وحید اشرف، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۱۴۴، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: دوارثی پبلیکیشنز ۲۲-۳-۶۱۳ چھتہ بازار حیدرآباد اے پی۔

جناب سید وحید اشرف فارسی زبان و ادبیات کے پروفیسر ہیں، تدریس و تحقیق کے ساتھ اردو و فارسی شعر گوئی کی صلاحیتیں بھی ان کو ودیعت ہوئی ہیں، صنف رباعیات سے ان کو خاص دلچسپی ہے، زیر نظر مجموعہ میں ان کی ۱۱۰ اردو اور ۲۹ فارسی رباعیات ہیں، مذہبیات اور سائنس جیسے موضوعات پر مشاہدہ حق کی گفتگو کے علاوہ ایک حصہ بادہ و ساغر کے لیے بھی خاص ہے اور ان دونوں میں ایک آن ہے مثلاً ایک جانب ان کی یہ نعتیہ رباعی ہے:

ہاں پالیا فردوس کا میں نے زینہ ہے عشق نبیؐ سے مرا روشن سینہ
دارین میں ملجا ہے مرا نام نبیؐ نعت نبیؐ اعمال کا ہے گنجینہ

تو دوسری طرف یہ رنگ بھی ہے:

ان ہونٹوں سے مے پائے ہے مستی شباب گل پائے ہے آتش اور گہر آب و تاب
پاتا ہے ہر اک ان سے بقدر استعداد نطق و شکر و نشہ و آتش و آب

رباعی گوئی میں وہ اس اعتراف کے ساتھ انیس و حالی کے پیرو ہیں کہ ان کے لہجہ میں آج بھی تازگی ہے اور ان کے مانوس و موثر لہجہ کی موجودگی میں کسی اور نئے طرز کا

تجربہ رباعیوں کی افادیت کو مجروح کرنے والا ہے، ان کے خیال میں رباعی کا روایتی اور قدیم آہنگ آج بھی زمانہ کی تاخت و تاز سے بڑی حد تک محفوظ ہے، شروع میں خود نوشت حالات کے علاوہ ان کے قلم سے رباعی کے فن و تاریخ پر عمدہ مضمون بھی ہے اردو کے ساتھ فارسی رباعیات کی آمیزش نے مجموعہ کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

صدائے منبر حصہ دوم از جناب مولانا ثناء اللہ عمری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۷۳، قیمت درج نہیں، پتہ: ادارۂ تحقیقات اسلامی، جامعہ دار السلام، عمر آباد ضلع نارتھ آرکاٹ، ٹامل ناڈو۔

زیر نظر کتاب ۸ قرآنی مضامین پر مشتمل ہے۔ اصلاً تو یہ جمعہ کے خطبات تھے لیکن بعد میں یہ مقالات کی شکل میں مختلف رسائل میں شایع ہوئے اور پھر افادۂ عام کی خاطر ان کو کتابی شکل میں جمع کر دیا گیا، پہلا حصہ قریباً دس برس پہلے شایع ہوا تھا، اس دوسرے حصہ میں شہادت اور گواہی، مثالی نوجوان، قانون خلافت ارضی، تصور عہد و میثاق جیسے اہم قرآنی موضوعات کی تشریح و بیان کے علاوہ قرآن حکیم اور مساکین، علم، اسلام اور مسلمان اور ربیع و شعرا کے استعارہ کی تفسیر و ترجمانی بڑے پُر اثر انداز میں کی گئی ہے، فاضل مولف کی تحریروں میں مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کے اسلوب خاص کا عکس صاف جھلکتا ہے، اب علوم قرآن کی خدمت میں جمال ماجدی کی اثر انگیزی کا مشاہدہ بھی ہو کر رہا۔

ع۔ص۔

جلد ۱۵۳ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۴ء عدد ۲

مضامین

شذرات

یہ بجا ہے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہو رہی ہے جس کا اعتراف انصاف پسند ہندوؤں کو بھی ہے مگر مسلمانوں نے اس ظلم و تعدی اور دوسروں کے ہاتھوں اپنی تباہی و بربادی کی شکایت کو اپنا شیوہ بنالیا ہے، ان کی مجلسوں میں گرمی اور انکے رہنماؤں کی تقریروں میں زور اسی سے پیدا ہوتا ہے، ادیب و شاعر اسی پر طبع آزمائی کر رہے ہیں، اخبار اور رسالے اس کے ذکر سے خالی نہیں رہتے، عام سامعین و قارئین بھی اسی کے عادی ہو گئے ہیں اور انکے لیے اس سے زیادہ دلچسپ اور دلپسند کوئی دوسرا موضوع نہیں ہوتا، ایسے ماحول میں اہم حقائق اور بنیادی امور پر کون غور و خوض کریگا اور سنجیدہ اور مفید باتوں کی جانب کیسے توجہ ہوسکتی ہے، اس شکوہ و شکایت میں قوم کا اصل مفاد اور ملت کی تعمیر و ترقی کے مسائل بالکل نظرانداز ہو گئے ہیں اور لوگ بدتر حالات کو درست کرنے کی فکر کے بجائے ظلم و تعدی کرنے والوں کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ میں جلتے رہتے ہیں جس کو ان کے خطیب، صحافی اور قوم و ملت کے ناخدا اپنی سنسنی خیز اور اشتعال انگیز باتوں سے برابر ہوا دیتے رہتے ہیں۔

مسلمان کب تک اس فضا میں گھٹتے اور اپنی پریشانیوں کا دکھڑا بیان کرتے رہیں گے اور کبتک اسی میں اپنی قوت و توانائی اور اپنا قیمتی وقت برباد کرتے رہیں گے۔ کیا اس سے ان پر ہونے والے مظالم کی تلافی ہوسکتی ہے؟ یا اسی ایک موضوع میں خود بھی الجھے اور دوسروں کو الجھائے رکھنے سے قوم و ملت کی کوئی مفید خدمت انجام پاسکتی ہے؟ اس سے تو مسلمانوں کے مسائل اور زیادہ پیچیدہ ہو جائیں گے اور ظلم و جور پر آمادہ لوگوں کی شدت و تلخی میں مزید اضافہ ہوگا، کرید نے سے زخم مندمل نہیں ہوتا، اس لیے شکوہ و بدگمانی کے ماحول میں نہ مسلمانوں کے موجودہ حالات تبدیل ہوسکیں گے اور نہ انکی ابتلاء و آزمائش کی گھڑیاں ختم ہوں گی، ان پر ہونے والے ظلم و تشدد کا

مداوا سوجھ بوجھ، حکمت، تدبر اور ضبط و تحمل ہی سے ہو سکتا ہے۔

ع مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

دراصل مسلمان حق و خیر کے داعی ہیں، ان کی زندگی ذمہ دارانہ نظم دو عالم ہے، وہ خدا کی جانب سے خلق کی اصلاح و ہدایت پر مامور ہیں، حق کو فروغ دینا اور باطل کو معدوم کرنا ان کا فریضہ ہے، کفر و ضلالت کی تیرگی کو مٹانا اور رشد و ہدایت کے چراغ کو روشن کرنا ان کا کام ہے، باطل کی چمک دمک عارضی اور اس وقت تک ہوتی ہے جب تک حق او جھل رہتا ہے، دنیا میں ظلم و تشدد اور شر و فساد کا بول بالا اسی بنا پر ہوتا ہے کہ امن و انصاف اور صلاح و فلاح کی دعوت دینے والے مخفی و مستور ہو جاتے ہیں، مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے اپنے حسن عمل سے اپنے دشمنوں کو بھی اپنا ہمنوا اور گرویدہ بنا لیا ہے اور اپنے حسن تدبیر سے وقت کے دھارے کو موڑ دیا ہے۔ اور اسے اپنے لیے سازگار بنا لیا ہے۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اگر مسلمان اپنے درجہ و مرتبہ کو پہچان کر داعیانہ خصوصیات کے حامل بن جائیں اور اپنے وجود کو دنیا کے لیے موجب خیر و برکت بنا دیں تو ان پر مظالم ڈھانے والے انکے لیے سراپا رحم دل بن جائیں اور تشدد پر آمادہ لوگ ہی انکی حفاظت و پاسبانی کے ذمہ دار ہو جائیں۔

آج کی متمدن دنیا سے امن و آسایش اور سکون و راحت عنقا ہو گئی ہے ہر شخص مضطرب اور پریشان دکھائی دیتا ہے، پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کا کیا ذکر، یورپ جسکا ہر قریہ فردوس کے مانند ہے اسکے شبستان عشرت میں بھی کیف و انبساط مفقود ہو گیا ہے، وہاں کے علمائے نفسیات اس بے اطمینانی اور پریشانی کی وجہ دریافت کرنے میں لگے ہیں لیکن مسلمانوں کے صحیفہ ہدایت میں جا بجا دل کی بیقراری و بے اطمینانی اور دنیا کی بدامنی و خلفشار کا علاج بیان ہوا ہے، اسکے نزدیک خدا پر ایمان ہی دلوں میں اطمینان و بے خوفی پیدا کر سکتا ہے اسی سے قلوب کو اضطراب و تردد سے نجات مل سکتی ہے، نکتہ دانِ روم کے بقول ؎

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

قرآن مجید نے اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں واضح کیا ہے، ارشاد ربانی ہے "ہر مصیبت اللہ کے اذن سے آتی ہے اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے، اللہ اسکے دل کی رہنمائی کرتا ہے" (تغابن۔ ۶۴ : ۱۱) یہ بھی فرمایا کہ "جو اپنے خداوند پر ایمان لائے گا اس کو نہ کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی زیادتی کا" (جن۔ ۷۲ : ۱۳) ایک جگہ ہے کہ "تسکینِ قلوب بس ذکر الٰہی سے ہوتی ہے" (رعد۔ ۱۳ : ۲۸) ایک اور جگہ ہے "اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ دونوں گروہوں میں سے امن و اطمینان کا زیادہ سزاوار کون ہے؟ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن اور چین ہے اور وہی راہ یاب ہیں" (انعام۔ ۶ : ۸۱-۸۲) ایک موقع پر ارشاد ہوا "بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر جمے رہے تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے" (احقاف۔ ۴۶ : ۱۳) دوسرے موقع پر فرمایا "جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے تقویٰ اختیار کیا، انکے لیے دنیا و آخرت میں بشارت ہے" (یونس۔ ۱۰ : ۶۳-۶۴) ایک اور جگہ فرمایا کہ "جن بدبختوں کے قلوب ایمان و ذکر الٰہی سے خالی ہیں انکی زندگی ضیق میں گزرے گی" (طٰہٰ۔ ۲۰ : ۱۲۴) یہ اور اس طرح کی متعدد آیتیں ایمان کی دنیوی برکات کے بارے میں نہایت واضح ہیں، انکے باوجود اگر مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری ہے اور وہ دوسروں کے ظلم و تعدی کے شاکی ہیں تو یہ انکی بے توفیقی اور ایمان کی دولت سے محرومی کا نتیجہ ہے۔

رسالہ معارف کا پہلا نمبر رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ کے مقدس مہینہ میں شایع ہوا تھا، اس لیے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بقول "مسلمانوں کے تمام علوم و معارف کی سب سے پہلی کتاب یعنی قرآن مجید اسی ماہِ مقدس میں نازل ہوا تھا شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ" یہ رسالہ جب قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا تو خیر و برکت کا یہی مہینہ انکے سروں پر سایہ فگن ہوگا، اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے معارف نے یہ طویل مسافت طے کی ہے اور انشاء اللہ آیندہ بھی اسکے فضل سے کریگا گو اس عرصہ میں ہر طرح کے سرد و گرم مواقع اور دلفریب و خوشنما جلوے سامنے آئے لیکن الحمد للہ معارف اپنی دیرینہ روش پر قائم رہا۔

ہر جلوہ مرا نتواند فریب داد پروانۂ چراغ سرِ طور بودہ ایم

مقالات

ہندو مسلم تعلقات

چند بنیادی حقیقتیں[1]

از ڈاکٹر محمد خلیل عباس صدیقی ۔ کلکتہ ۔

ہندوستان کے دو عظیم فرقوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات نے بظاہر خاصی پیچیدہ صورت اختیار کرلی ہے ۔ دونوں مذہبی گروہوں کے درمیان دیرینہ رشتوں، دیرپا روابط، بہت ساری مشترک قدروں، خوشگوار ہمسائیگی، باہمی تعاون اور رفاقت کی پرانی روایات میں بتدریج تبدیلی کا مسئلہ آج خاصا حساس ہوگیا ہے۔ ان رشتوں کو بحال کرنا اور دوبارہ پرانی ڈگر پر لانا کٹھن معلوم ہونے لگا ہے ۔

دونوں فرقوں کے درمیان آپس کے تعلقات کا موضوع آج ایک سماجیات داں کے لیے جس قدر توجہ کا متقاضی ہے اسی قدر ہمارے وطن عزیز کی بقا اور خوش حالی کے لیے بھی اس کی اہمیت ہے ۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ایک طرف تو ہمیں امانت دار تہذیب کہن ہونے کا فخر حاصل ہے تو دوسری طرف ہم اپنے روایتی سماجی اور سیاسی اداروں پر جدید رنگ و روغن کی قلعی کرنے اور قدامت کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرنے میں مصروف ہیں ایسی صورت میں یہ گمان غیر منطقی نہیں معلوم ہوتا کہ قدیم اور جدید کا یہ خاموش تصادم سماجی انتشار کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

---

[1] علامہ شبلی توسیعی خطبات کے تحت ۲۶ دسمبر ۱۹۹۳ء کو دارالمصنفین میں یہ مقالہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک مجمع میں پڑھا گیا۔

لیکن بات اتنی سہل نہیں جتنی کہ معلوم ہوتی ہے اور مسئلے کا تجزیہ اور اس کے پس منظر سے واقفیت شاید اس کے حل میں معاون ہو۔

اس موضوع کی اہمیت کے باوجود سماجی سائنسدانوں نے اس کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی ہے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کم و بیش مخصوص زاویۂ نظر کی نمائندگی کی گئی ہے، موجودہ رخ اختیار کرنے سے پیشتر ہندو مسلم تعلقات کا موضوع برطانوی عہد میں غیر ملکی حکمرانوں کے لیے دلچسپی کا باعث تھا، جتنا کچھ مواد اس پر موجود ہے اس کا معتد بہ حصہ برطانوی دانشوروں کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ گو انھوں نے جس عرق ریزی سے کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن پُراز معلومات ہونے کے ساتھ برطانوی دانشوروں کی تصانیف سے نہ صرف ہماری بصارت رنگین ہو جاتی ہے بلکہ دونوں فرقوں کے تعلقات وہ خاص رخ اختیار کر لیتے ہیں جو برطانوی حکمرانوں کے مفاد کے مطابق اور خود ان دونوں فرقوں کے اپنے مفادات کے منافی ہوتے ہیں، افسوس ہے کہ یہ روش نہ صرف ثابت و قائم ہے بلکہ آج کچھ دوسرے ہی مفادات کے زیر اثر اس میں روزافزوں ترقی بھی دکھائی دے رہی ہے۔

اس موضوع پر سب سے پہلے برطانوی عہد سے پیشتر کے وقائع نگاروں اور مورخوں کی تصانیف سے روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان میں مسلم حکمرانوں اور ہندو رعایا کے تعلقات پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی ہے۔ یہ تصانیف خصوصی مفادات کی ترجمانی سے زیادہ مصنفین کے مشاہدات اور تاثرات پر مبنی ہیں، ان کو نہ تو کسی منظم تحریک کے تحت مرتب کیا گیا تھا اور نہ ان میں دونوں فرقوں کے تعلقات کو کوئی خاص رخ دینے کی کوشش کی گئی تھی، اس لیے ہم یہاں انھیں زیر بحث نہیں لائیں گے۔

برطانوی دور میں ہندو مسلم تعلقات کے موضوع پر ہونے والی کوششوں پر ایک نظر

سماجی سائنسدانوں میں باضابطہ طور پر سب سے پہلے ہم نوآبادیاتی عہد کے برطانوی مورخین کو ہندو مسلم تعلقات کے موضوع سے دلچسپی لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں لٹریچر کی خاصی بڑی مقدار سامنے آئی۔ اس سے ہندو مسلم تعلقات کے موضوع پر بالواسطہ یا بلاواسطہ روشنی پڑتی ہے۔ برطانوی عہد کے مورخین میں جیمس مل JAMES MILL (1817) سر ہنری مین SIR HENRY MAIN (1861) سر ہنری ایلیٹ SIR HENRY ELIOT (1866-67) سر ایلفرڈ لیال SIR ALFRED LYALL (1872) ایف ڈبلو تھامس F. W. THOMAS (1882) وغیرہ شامل ہیں، مورخین کے بعد سماجیات کے علما SOCIOLOGISTS اور سماجی انسانیات کے ماہرین SOCIAL ANTHROPOLOGISTS کے نام آتے ہیں۔ علمائے سیاسیات و نفسیات[1] نے بھی گاہے گاہے اس موضوع سے دلچسپی لی ہے لیکن وہ زیادہ اہم اور قابل لحاظ نہیں ہیں۔ البتہ گارڈنر مرفی کی کتاب اہمیت کی حامل ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں فرقوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت کے بارے میں نہ صرف سماجی سائنس سے تعلق رکھنے والے علوم کے سب ہی شعبے متفق الرائے نہیں ہیں بلکہ کسی ایک شعبے کے مختلف دانشوروں کے درمیان بھی اتفاق رائے

---

[1] یونسکو کے سابق ڈائریکٹر گارڈنر مرفی کی کتاب IN THE MINDS OF MEN خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ اس میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ تناؤ کے اسباب اور اس کے علاج پر بحث کی گئی ہے۔

بمشکل ہی دکھائی دے گا، حالانکہ علم کے یہ تمام شعبے سائنس کے دائرے میں شمار کیے جاتے ہیں اس لیے توقع کی جاسکتی تھی کہ واقعاتی اور سماجیاتی پہلوؤں پہ رائے زنی کرنے کے لیے یہ سائنسی منہاج یا طریق تحقیق پہ عمل پیرا ہوں گے بلکہ اپنے فن یا پیشے کے بنیادی اصولوں جیسے بے غرض بابے لاگ مشاہدہ، کشادہ ذہنی، آفاقیت (UNIVERSALISM) اور زیر مطالعہ لوگوں سے ہمدردی کے اوصاف سے متصف ہوں گے۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔

کسی ایک شعبۂ علم کی ستایش اور دوسرے کی تنقیص کیے بغیر ہم اس تاثر میں حق بجانب ہوں گے کہ عام طور پہ دانشوروں نے اپنے مشاہدات میں حقیقت کے کسی نہ کسی پہلو کو نظر انداز کیا ہے۔ اگر دانستہ طور پہ ان کے مشاہدات بعض مخصوص مفادات کے تابع نہ بھی ہوں تب بھی ان کی یہ فروگذاشت ان کے مشاہدے کو جانبدار بنا دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ سب ہی صورتوں میں یہ جانبداری عمداً نہ ہو اور فروگذاشت کا سبب انکے خصوصی شعبۂ علم کی کوتاہیاں ہوں۔

سوشل سائنس کے مختلف شعبوں کے بنیادی مناہج اور طریق تحقیق و تفتیش پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ سماجی سائنس کا سب سے قدیم شعبہ یعنی تاریخ جس کے مطالعے کے میدان میں انسان، اس کا معاشرہ، اس کی تہذیب اور ماضی و حال میں اس کی تمام سرگرمیاں شامل ہیں۔ اس لیے ایک مورخ سے یہ بجا توقع ہوسکتی ہے کہ وہ حقائق کے ثبوت مہیا کرے اور اس کام کے لیے وہ حسب ذیل کو مدنظر رکھے۔

(۱) ضروری دستاویزات کی تلاش اور ان کا انکشاف کرنا (۲) انکی ناقدانہ چھان پھٹک کرنا (۳) انکی تشریح و وضاحت کرنا (۴) ان کے باہمی تعلق پر گہری نظر

النا (۵) حقایق کے باہمی ربط اور ان کے تعامل کا تجزیہ کرنا۔ تاریخ نگاری ایک فن ہے اس بنا پر ایک صاحب فن کی طرح ایک مورخ کے لیے اسلوب بیان پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ اس کی تحریر قارئین کے لیے سہل اور دلکش ہو۔ (ملاحظہ کیجیے سرکار ۱۹۸۲ء صفحہ ۶۳)

سماجیات SOCIOLOGY کے مطالعے کا میدان عموماً وہ سماجی مسائل ہیں جو بالخصوص پیچیدہ معاشروں[1] COMPLEX SOCIETIES سے متعلق ہوں، سماجیاتی موہوب DATA عموماً دستاویزات، ریکارڈ، مردم شماری اور اعداد و شمار پر مشتمل ہوتے ہیں اور اس کے سانچے یا تو تحقیقاتی لوازم، گوشواروں، سوالناموں اور انٹرویو پر مبنی ہوتے ہیں۔ سماجیات دان عموماً مقدار یا اعداد و شمار کے ذریعہ حقایق کا تجزیہ پیش کرتا ہے اور پیچیدہ COMPLEX معاشرے کی ان تمام روشوں سے دلچسپی رکھتا ہے جو معمول کے مطابق ہوں یا غیر معمولی ہوں۔

سماجی انسانیات SOCIAL ANTHROPOLOGY کے میدان میں روایتی طور پر سادہ، قدیم، ناخواندہ معاشروں کا ایک سالم کی حیثیت سے مطالعہ شامل ہے، تاہم اس میدان میں روزافزوں وسعت عمل میں آرہی ہے اور اب دیہی

---

[1] سماجیاتی اصطلاح میں پیچیدہ معاشرہ ایسے معاشرے کو کہتے ہیں جو تقسیم کار کی بنیاد پر قائم ہو اور اس میں مختلف طبقات ہوں۔ اس کے برعکس سیدھا سادہ یا SIMPLE معاشرہ وہ ہوتا ہے جس کے افراد کم و بیش یک رنگ ہوں اور ان میں بڑے پیمانہ پر تقسیم کار کا چلن نہ ہو۔

اور شہری یا بلدی معاشرے بھی اس کے دائرے میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ سماجی انسانیات کے علما روایتی طور پر فیلڈ ورک پر انحصار کرتے ہیں اور اپنے مطالعے کے نتائج اعداد و شمار کے بجائے ماہیتی QUALITATIVE شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ بیشتر ایسے حقائق سے دلچسپی رکھتے ہیں جو معاشرے کے معمولات PATTERNED NORMS میں شامل ہوں۔ لیکن حالیہ دور میں سوشیالوجی اور سوشل انتھراپالوجی کے میدانوں کا فرق جاتا رہا ہے۔ علم کے ان دونوں شعبوں کے تصورات، نظریات، ضابطے اور قوانین اس حد تک مشترک ہیں کہ اگر ہم سماجیات اور سماجی انسانیات کو ایک دوسرے کا متبادل تصور کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

گو سماجی علوم کے تمام شعبوں کے اندر تحقیقاتی منہاجیات RESEARCH METHO-OLOGY. کی تدریجی ترقی اور تفتیشی آلات کی افادیت و تاثر (اثر آفرینی) اب ثابت ہو چکی ہے۔ . . . . تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ان تمام شعبوں کی دلچسپی کے موضوع یعنی انسانی معاشرے کو تحقیقات کے لیے طبیعی یا کیمیاوی علوم کی طرح کنٹرول میں نہیں لایا جا سکتا۔ انسانی علوم کی لیبارٹری بے حد وسیع ہے اور انسانی معاشرے کا مشاہدہ اور تجربہ ہم اس طرح نہیں کر سکتے جس طرح ایک طبیعیات داں یا کیمیا داں طبیعیاتی یا کیمیائی اشیاء کے متعلق کر سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماجی علوم کے اندر انسانی عنصر صریحاً نمایاں اور قطعاً ناگزیر ہے اور یہ حقیقت محض اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے تاریخ نگاری کی تاریخیں لکھی ہیں یہ (HISTORIAN OF HISTORIOGR- APHY) مورخوں کو کئی خانوں یا گروہوں جیسے یوروپی اور غیر یوروپی، ہندو اور

سلم وغیرہ میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ایک ہی واقعے یا ایک
ی حقیقت کے مشاہدے، تجزیے اور تاویل میں ان مختلف اقسام کے مورخین کے
رمیان فرق کی توقع کی جاتی ہے۔

ابن خلدون (۱۴۰۶۔ ۱۳۳۲) نے آج سے صدیوں پیشتر اس امر کی طرف
شاندہی کی تھی کہ مورخ کے اندر پاسداری اور کورانہ جانبداری کے رجحانات تاریخ
ے اندر غلطیوں اور فروگذاشتوں کے ذمہ دار ہیں، ایک ہی واقعے کی مختلف تاویل کی
حقیقت کے متعلق جدید دور کے سماجیات کے ایک ماہر کارل مینہیم۔ KARL MANN-
HEIM۔ کا یہ نظریہ کہ "علم کی حقیقی ہیئیت کو ہر ایک کلچر اپنے مخصوص انداز میں مسخ
ر دیتا ہے" ابن خلدون کے نظریے سے مطابقت رکھتا ہے۔

اس صورت حال سے اجتناب کے لیے ابن خلدون کی تجویز ہے کہ سماجی
تبدیلی کے پس منظر میں سماجی واقعات کے اسباب اور کیفیتوں کا علم ہونا چاہیے۔
اس کا کہنا ہے کہ ۔۔ جی تبدیلی کبھی تو صریحی اور تیز رفتار ہوتی ہے اور کبھی مخفی اور مضمر
ہوتی ہے۔ ابن خلدون کا یہ نظریہ کہ "تاریخی حقائق کی تاویل زمان و مکان کے
سیاق و سباق میں اور اس سماجی گروہ کے تعلق سے ہونی چاہیے جس سے ان حقائق
کا سابقہ ہو" دراصل اپنے وقت کے لحاظ سے بالکل نیا، انوکھا اور حیرت انگیز طور پر
سائنٹفک ہے اور ہمارے موجودہ مطالعے کے لیے موزوں اور برمحل بھی۔

حقائق کی داخلی معنویت تک رسائی کے جس مسئلے کی ابن خلدون نے نشاندہی
کی ہے اس نے آگے چل کر اجتماعیات و تمدن انسانی کے ماہرین کے ان سماجی حربوں
اور طریقہ تحقیق و تفتیش سے لیس ہونے میں رہنمائی کی۔ جن میں داخلیت EMIC

یعنی خود متعلقہ لوگوں کی طرف سے پیش کردہ توضیح یا پھر خارجیت ETIC یعنی مبصر کی تعبیر یا پھر داخلیت و خارجیت EMITIC یعنی متعلقہ لوگوں اور مبصر کی تعبیروں کے امتزاج کا تصور بھی شامل ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ سماجی سائنسداں خواہ وہ مورخ ہو یا سماجیات داں یا سماجی یا تمدن انسانی کا واقف کار، اقدار' کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہوتا۔ اقدار کے اثرات اس کی تحقیقات کے موضوع اور مقصد پر مترتب ہوتے ہیں اور ان پر اس کے سماجی ماحول اور خود اس کی تربیت SOCIALISA-TION۔ کا بھی اثر ہوتا ہے کیونکہ ان کے زیر اثر اس کے عقائد، جذبات اور اس کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے اور ان کے شکنجے سے وہ پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا۔

انسانی علوم کے میدان میں تحقیقات ایک اور لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے تحقیقات کے بیشتر منصوبے خاصے قیمتی اور طاقت ور اور ذی اقتدار مفادات کی کفالت SPONSORSHIP کے محتاج ہوتے ہیں۔ ایسے مفادات تحقیقاتی کاموں کی جہت، نوعیت، معیار اور ان کی غیر جانبداری پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ایک اور حقیقت کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ جو یہ ہے کہ سماجیات اور سماجی اور انسانی تمدن کے شعبوں نے باقاعدہ امتیازی علوم کی حیثیت اس دور میں حاصل کی جب مغربی اقوام نے عہد وسطیٰ کے حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹا کر بالادستی حاصل کی اور اپنی بحری طاقت کے بل پر ایشیا اور افریقہ کے ایک بڑے حصے کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس سے بھی انکار مشکل ہے کہ نوآبادیاتی عہد میں سماجیات اور سماجی انسانیات علم کے عروج پذیر شعبے بن گئے اور اس پورے عہد میں سماجی

سائنسدانوں کی توجہ محکوم غیر یورپی اقوام کے حالات کا تجزیہ کرنے اور انہیں قلم بند کرنے پر مرکوز تھی اور یہ سب وہ نوآبادیاتی نظم ونسق کے مفادات کے لیے کر رہے تھے۔ انسانیاتی مطالعوں کے لیے پیش کردہ تصورات اور نظریات پر اس نوآبادیاتی عہد کے گہرے اثرات نمایاں ہیں۔ مثال کے طور پر اگر برطانوی انسانیات دانوں کے پیش کردہ نظریہ وظیفیت یا تعلیت FUNCTIONALISM کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس نے قبولیت کا درجہ اس لیے حاصل کر لیا تھا کہ اس سے نوآبادیاتی حکومتوں کی ضروریات پوری ہوتی تھیں FUNCTIONALISM کا نظریہ اس مفروضہ پر قائم ہے کہ سماج نسبتاً غیر مبدل عناصر کی ایک ترتیب ہے اور توافق یا مطابقت سماجی نظام کا ایک حاضرا لوجود عنصر ہے[1]۔ چونکہ وظیفیت کا تصور اس مفروضے پر مبنی ہے کہ سماجی نظام متفقہ قدروں کی مسلمہ صورت ہے اس لیے اس میں سماجی رشتوں کے اندر اقتدار کے رول کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ بلکہ اک سرے سے نظر انداز کیا گیا ہے۔

نوآبادیاتی حالات میں جہاں حکمرانوں کو افریقہ کی وسیع مملکت پر تھوڑے سے سفید فام لوگوں اور کم سے کم وسائل کی مدد سے حکومت کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میلنوسکی MALINOWSKE کے نظریۂ وظیفیت اور اس کے مرکوز فیلڈ ورک کے تصور کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ افریقی نوآبادیات کے اندر ان حالات میں

---

[1] FUNCTIONALISM ASSUMS THAT SOCIETY IS A RELATIVELY PERSISTING CONFIGURATION OF ELEMENTS AND CONSEUS IS UBIQUITOUS ELEMENT OF THE SOCIAL SYSTEM:

بالواسطہ حکومت کرنے کی ضرورت تھی اور اس نامور برطانوی ماہر انسانیات نے اپنے وضع کردہ اصولوں کے مطالعات کو بڑے پیمانہ پر رائج کر کے استعماری قوتوں کے ہاتھ مضبوط کیے۔ بالواسطہ حکمرانی کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ محکوم گروہ کے سرکردہ لوگوں کو آلۂ کار بنا کر نوآبادیاتی حکمرانوں کے معین کردہ حدود کے اندر اپنے داخلی نظم و نسق کی اجازت دی جائے۔ اس کام کے لیے متعلقہ گروہ کے ویسے ہی انسانیاتی مطالعے کی ضرورت تھی جو STRUCTURAL FUNCTIO-NAL ضابطوں کے مطابق عمل میں آیا ہو۔ اس طرح کے مطالعے میں سماجی اور سیاسی تنظیم سے واقفیت کے ساتھ اس امر کی وضاحت درکار تھی کہ سماجی امور کس طرح انجام پاتے ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیے LACKNER, 1973)

فعلیتی FUNCTIONALIST چوکھٹے کے اندر محکوموں کے حالات کے مطالعات کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ حالات کے بدستور رہنے پر زور ہو اور سماجی و سیاسی تبدیلی کی گنجائش نہ ہو۔ ایسے مطالعے بالواسطہ نوآبادیاتی نظام کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ ان میں جبر و تشدد اور مظالم پر نکتہ چینی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

ترکیبی وظیفیتی STRUCTURAL FUNCTIONAL چوکھٹے کے اندر مطالعے خواہ وہ ای۔ ای۔ ایوانس پریچرڈ E. E. EVANSPRITCHEARD کی مصنفہ نیور NEUR (1940) ہو یا ایس۔ ایف نادل S.F. NADEL کی اے بلیک بائزنٹیم A BLACK BYZANTIAM (1942) اور دی نیو با NUBA (1947) ہو۔ ان سب مطالعات میں متعلقہ معاشرے کے اندر اقتدار کے رول کی طرف مطلق توجہ نہیں دی گئی ہے۔ گویا طاقت کے زور سے مسلط

نو آبادی نظام ان کی تنظیم کا جزو ہے اور سزاوار تنقید نہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ انسانیاتی مطالعات کی منہاجیاتی ترقی، خصوصاً تصورات، نظریات اور مطالعات کے نمونہ کی شکل میں، نو آبادیاتی قوتوں کی ضروریات کے مطابق عمل میں آتی رہی ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ وظیفیت FUNCTION-ALISM کی اہمیت نو آبادیاتی نظام کے ٹوٹ جانے کے بعد باقی نہیں رہی اور یہ نظریہ گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔ پھر جب نو آبادیاتی نظام نے نیا چولا بدلا تو اسے نئی اطلاعات اور نئے اعداد و شمار کی ضرورت پڑی۔ کہتے ہیں کہ فریڈ ایگن FRED-EGAN کا پیش کردہ نیا طریقۂ تحقیق جسے منضبط موازنہ CONTROLLED COMPA-RISION کہتے ہیں، ترقی یافتہ اور بہتر ہے۔ یہ طریقۂ تحقیق ترکیبی وظیفیتی STRUC-TURAL FUNCTIONAL اصولوں اور تاریخی تخصیص پسندی[1] HISTORICAL PARTICULARISM. کے امتزاج پر مبنی ہے اور نو آبادیاتی عہد کے بعد کے دور کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ مغرب کی نئی ضرورتوں کے تحت علم الانسان کے تصورات اور نظریات میں تبدیلی پر تبصرہ کرتے ہوئے ہیلن لیکنر HALLEN LAYNER کہتی ہیں کہ

---

[1] میلنوسکی اور ریڈکلف براؤن کے نظریات کے امتزاج سے جو ترکیبی وظیفیتی یعنی STRUCTURAL FUNCTIONAL اصول نو آبادیاتی عہد میں مقبول ہوا تھا وہ بعد کے دور میں متروک ہونے لگا اور نئی ضرورتوں کے تحت فریڈ ایگن نے انسانیاتی مطالعے کے لیے جو نمونہ پیش کیا وہ ترکیبی وظیفیتی اصولوں کے ساتھ امریکی مکتب فکر کے فرینز بوس FRAN Z BOAS کے نظریہ تحقیق، تاریخی تخصیص پسندی HISTORICAL PARTICULARISMS کے امتزاج پر مبنی ہے اور اسے CON-TROLLED COMPARISM کا نام دیا گیا ہے۔

اب ترکیبی و ظیفیتی نظریہ متروک ہو چکا ہے اور نو آبادیاتی نظام کی بدلی ہوئی شکل ایک طرح کی شہنشاہیت جیسی ہے۔ اس نئے نظام کی کامیابی کے لیے نئے نظریات اور نئے تصورات کی ضرورت تھی اور فریڈ ریگن FRED EAGAN نے یہ ضرورت پوری کرنے کی کوشش کی۔ امریکہ میں بھی نئی ضرورتوں کے تحت علم الانسان کے اعداد و شمار کے حصول اور ان کے تجزیہ کے طریقوں میں تبدیلی دکھائی دیتی ہے اور یہ تبدیلی اس کے اپنے مفادات کے تابع ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھرتے ہی امریکہ نے دوسری اقوام کو 'مہذب بنانے' کے نام پر کھلم کھلا مداخلت کے ذریعہ انہیں اپنے مرتب کردہ 'عالمی نظام' کو تسلیم کرنے پر مجبور کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر خود امریکی نظریہ نسبتیت[1] RELATIVISM کی جگہ ارتقائیت[2] EVOLUTIONISM کی بڑھتی ہوئی مقبولیت قابل فہم ہے۔

---

[1] تمدنی نسبتیت CUTURAL RELATIVISM سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی مثبت یا منفی رسم و رواج کے مناسب یا نامناسب ہونے کے بارے میں متعلقہ جماعت کے دوسرے گروہی عادات کو پیشِ نظر رکھ کر ہی کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر تعدد ازدواج اقتصادی اعتبار سے بعض گروہوں کے لیے مناسب ہو سکتا ہے

[2] ارتقائیت EVOLUTIONISM کا تمدنی نظریہ اس مفروضے پر قائم ہے کہ سب ہی تہذیبیں مختلف ادوار سے گزر کر اپنی موجودہ سطح پر پہنچی ہیں اور انہیں اسی تمدنی نقطۂ عروج پر پہونچنا ہے جس کی نشاندہی امریکی تہذیب سے ہوتی ہے۔ جدید امریکی ارتقائیت کا مقصد انسانی تہذیب کو اپنی معین کردہ راہ پہ چلانے کے لیے جدوجہد کرنا ہے اور اس کام کے لیے اسے GENETICS اور سوشل انجینئرنگ کو کام میں لانا ہے۔

انسانی علوم سے متعلق تصورات اور نظریات کی ارتقائی تاریخ پہ نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کم از کم انسانیات کے ماہرین کے ایک حلقے نے ایسے تصورات اور نظریات پیش کیے ہیں جن سے نوآبادیاتی اور استعمار پسند قوتوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں اور انہیں اپنے زیر دستوں کو زیر نگیں رکھنے میں مدد ملتی رہی ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیقاتی تصنیفات کو عوام الناس اور محکوم و مظلوم طبقات کے مفاد کے خلاف ذی اقتدار اور استحصال پسند طبقوں کے استعمال کی اجازت دی ہے بلکہ انکا آلۂ کار بن کر کام کیا ہے۔ جیرالڈ بیرامین نے اپنے مقالے مطبوعہ کرنٹ انتھراپالوجی شمارہ ۱۹۶۳ء میں تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح امریکی انتظامیہ، امریکی فوجی عملہ اور امریکی خفیہ ایجنسی سی۔ آئی۔ اے انسانیات کے ماہرین کی تحقیقاتی تصانیف اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرتی ہے۔

ہندوستان میں بھی برطانوی مورخوں، سماجیات دانوں اور انسانیات کے ماہرین کا حصہ خصوصاً ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ انھوں نے اپنے پیشے کے اخلاقی ضابطوں کو پس پشت ڈال کر بڑی جانفشانی سے محکوم لوگوں کے آپس کے فرق پر گہری نظر ڈالی اور بڑی مبالغہ آمیزی کے ساتھ اسے برسر عام لائے۔ انھوں نے اپنے مطالعے کے ماحصل کو ہندوستانی عوام کو استحصال کرنے والی طاقتوں کے سامنے پیش کیا اور اکثر حالتوں میں حکومت کو ایسی حکمت عملی کے اپنانے میں مدد دی جو محکوموں کے جائز مفادات کے خلاف تھی۔ اس اہم اور فیصلہ کن دور کے سماجی سائنسدانوں اور دانشوروں نے جو اکثر حالتوں میں برطانوی انتظامیہ کے اعلیٰ افسر بھی تھے ہندوستانی عوام کی تہذیب کے مشترک عناصر پہ روشنی ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور اپنی بددیانتی کا

ثبوت دیتے ہوئے منافقانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ اس عہد میں سوشل سائنس استحصال کرنے والی طاقتوں کے زیرِ نگیں ہو گیا جس کے دیرپا اثرات ہونے لازمی تھے۔

سب سے پہلے سر ہنری مین SIR HENRY MAN نے ہندوستانی معاشرے پر دو کتابیں تصنیف کیں۔ پہلی کتاب ANCIENT LAW (1861) میں اور دوسری VILLAGE COMMUNITIES IN EAST & WEST (1871) میں لکھ کر برطانوی انتظامیہ کے لیے مفید خدمت انجام دی جو برطانوی سماجیات دانوں کو دعوتِ فکر بھی دے رہی تھیں۔ سر ایلفرڈ لیال SIR ALFRED LYALL جو اعلیٰ برطانوی افسر ہونے کے ساتھ سماجیات داں بھی تھے، سر ہنری مین سے بے حد متاثر ہوئے اور ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کی تشکیل میں ان سے مدد لی۔ سر ایلفرڈ کے مضامین کا مجموعہ جو ایشیاٹک اسٹڈیز کے عنوان سے ۱۸۸۲ء میں شایع ہوا اس میں بڑی وضاحت کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے متعلق نئی برطانوی حکمت عملی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ایلفرڈ لیال کے مضامین کے اس مجموعے میں دو مضامین ریلیجن آف این انڈین پراونس RELIGION OF AN INDIAN PROVINCE اور ریلیجس سچویشن ان انڈیا RELIGIOUS SITUATION IN INDIA خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں تعجب کی بات نہیں کہ برطانوی نو آبادیاتی حکومت کا یہ اعلیٰ افسر اور مشیر ہندوستان میں برطانوی حکومت کو ہندوؤں کے لیے رحمت تصور کرتا ہے جس نے اس کے خیال کے مطابق انہیں بدترین قسم کے تاراج، عدم تحفظ، لاقانونیت اور مطلق العنان اور جابر حکمرانوں کی تلون مزاجی سے نجات دلائی تھی۔ سر ایلفرڈ نے اپنے مضامین میں سارا زور برطانوی عہد سے پیشتر کے دور کی حکومتوں میں سنگین نقائص کی نشاندہی پر صرف کیا جو

اس کے خیال کے بموجب بربریت اور ہندوؤں پر پیہم اذیت و تعذیب کا دور تھا۔ تاریخی حقایق کی روشنی میں اس طرح کے بیانات قطعاً دروغ گوئی پر مبنی دکھائی دیں گے اور خود کچھ دوسرے برطانوی مورخین و بیشپ ہیملٹن (۱۸۱۲ء) اور جمیس مز (۱۸۱۷ء) کی تحریروں سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ حکومت کے اعلیٰ ترین مشیر اور سماجی سائنسداں کے قلم سے اس طرح کے بیانات کے مقاصد اور ان کے اثرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ابتدائی دور کے برطانوی دانشوروں کے اندر برطانوی سلطنت کو استحکام بخشنے اور اسی قدر محکوم اقوام کے داخلی اتحاد کو کمزور کرنے کا جوجذبہ شدت سے موجود تھا اس کا بخوبی اظہار ہوجاتا ہے۔ انھوں نے عہد وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کے متعلق اسطرح کے خیالات کے اظہار کو اپنی عادت میں داخل کرلیا تھا۔ یوروپی مستشرقین نے انکی عینک پہلے سے ہی رنگین کردی تھی اور جو فرضی خاکہ ان کے سامنے تھا وہ اسی میں رنگ بھرنے پر اپنی ساری کاوش صرف کرتے تھے۔ اس صورت حال کے کچھ بنیادی اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے طلال اسد اپنی کتاب ANTHROPOLOGY AND THE COLO-NIAL ENCOUNTER میں لکھتے ہیں کہ "مسلم آبادی پرمشتمل وسیع خطۂ ارض پر قبضہ جمانے والے شہنشاہیت کے یہ علمبردار اپنی حکمران حیثیت کے لیے یوروپی مستشرقین کے فراہم کردہ دلائل سے جواز پیش کرنے کی کوشش کے سوا اور کیا کر سکتے تھے اور وہ دلائل یہ تھے کہ (۱) تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کی حکومتیں ظالم اور جابر تھیں (نوآبادیاتی حکومتیں رحمدل ہیں) (۲) اسلامی سیاسی نظریہ واقعی DEFACTO حکومت کو جائز تصور کرتا ہے (نوآبادیاتی حکومت بدعنوانی، نااہلی اور بدامنی سے بدرجہا بہتر ہے)

(۳) اسلامی ممالک میں سیاسی اقتدار اسلامی سماجی اور مذہبی زندگی کی گرفت سے باہر ہوا کرتا تھا۔ (اس لیے ان ممالک کی تسخیر سے اسلامی روایات کو ٹھیس نہیں پہونچتی کیونکہ مرکزی سیاسی روایت کا تسلسل قائم اور برقرار ہے)۔

مسلمان حکمرانوں اور ان کی رعایا کے درمیان تعلقات کے بارے میں یوروپی مستشرقین کے تاثرات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے طلال اسد مزید لکھتے ہیں کہ ان کی بنیاد نہ صرف جارح اسلام کے عیسائی تجربے پر ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ یوروپ کے درمیانی طبقے کی اس تشخیص پر ہے کہ "اسلام غیر ترقی پسند اور دقیانوسی ہے اور نوآبادیاتی حکومت کے استحکام کی خاطر اس پر بلا واسطہ کنٹرول ضروری ہے"۔ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مغرب کا یہ گہرا تاثر نوآبادیاتی عہد کے خاتمے کے بعد بھی قائم ہے اور ان کا سماجی نظام اسلامی ملکوں کے استحصال کی غرض سے اس تاثر کو قائم ودائم رکھنے کے لیے کوشاں ہے خواہ اس سے ان کی قدروں، خصوصاً جمہوریت کا خون ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔

عہد وسطیٰ کے مسلمان حکمرانوں پر سخت تنقید اور ہندوؤں کو ان کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی سر الفریڈ لیال کے یہاں ہندو تہذیب کے لیے اچھے الفاظ نہیں۔ وہ ہندوؤں کو بقول خود توہمات کی گمراہی اور جہالت کی تاریکی سے نکال کر اس 'شاندار' تہذیب کا حلقہ بگوش بنانا چاہتے تھے جسے برطانوی حکمراں اور مشنریاں اپنے ساتھ لائی تھیں اور نسل انسانی کے سرپرست اور پاسباں کی حیثیت سے سارے جہاں میں پھیلانے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔

لیکن نسل انسانی کے یہ خود ساختہ سرپرست جنھوں نے ہندوؤں کو "تہذیب" سے روشناس کرنے اور انہیں بدترین قسم کی بدامنی، عدمِ تحفظ، لاقانونیت اور مطلق العنان

فرمانرواؤں کی تلون مزاجی کا شکار ہونے سے نجات دلانے کے عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کرنے کی ٹھانی تھی وہ اسی زمانے میں اپنی "شاندار تہذیب" کی روشنی شمالی اور مرکزی امریکہ میں پھیلانے میں جس طرح مصروف تھے وہ مقام عبرت ہے۔ ان کے ہم وطن اور دوسرے یوروپین بھائی بندوں نے اپنی "شاندار تہذیب" مرکزی اور شمالی امریکہ کے ازٹک، ٹالکسی، کیلشکی، کلماس، ہاؤسٹی اور ٹراسکن جیسے ترقی یافتہ اور مہذب لوگوں پر مسلط کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے اس کی کہانی انتہائی دردناک ہے۔ اگر جدید تحقیقات اسے برسرعام نہ لائی ہوتیں تو شاید یہ ساری داستان زمانے کے گرد و غبار میں ڈھکی رہ جاتی۔ تہذیب و شائستگی کے ان یوروپین دعویداروں کے ساتھ امریکہ کے ان قدیم باشندوں کی مڈبھیڑ ۱۵۱۹ء میں تقریباً اسی زمانے میں ہوئی جبکہ ہندوستان کے مسلم شہنشاہ نے ہندوؤں پر کچھ الزامات عائد کرنے کے جرم میں خود اپنے قاضی القضاۃ کو سخت سزا دی تھی اور ہندوؤں کے پرستار کی حیثیت سے شہرت پائی تھی۔ یوروپین نوآبادکار "اپنی تہذیب کی روشنی پھیلانے کے لیے" شمالی اور مرکزی امریکہ کے قدیم باشندوں کو پکڑ پکڑ کر غلام بنا رہے تھے اور ان کی پُرامن بستیوں کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر رہے تھے۔ کہیں کہیں تو انھوں نے ان کی بستیوں کی پوری آبادی کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ مکسکو کی سطح مرتفع کی آبادی جو ۱۵۰۰ء میں تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ تھی وہ ۱۵۶۵ء تک یعنی صرف ۶۵ سال کے اندر ۴۴ لاکھ ۴۰ ہزار رہ گئی اور ۱۶۰۰ء تک یہ اور گھٹ کر ۲ لاکھ ہو گئی۔ (ملاحظہ کیجئے ناٹنا ریٹیز ران دی نیو ورلڈ مصنفہ چارلس ویگلی اور ماروِن ہیرس صفحہ ۱۷-۱۵)

یوروپین استعماریت پسندوں نے جن لوگوں کو نیست و نابود کر کے صرف ۲۰۰ سال

کے اندر ان کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ سے گھٹا کر صرف ۲۰ لاکھ کر دیا تھا وہ وحشی اور جنگلی نہ تھے بلکہ بہت ہی اعلیٰ تہذیب کے مالک تھے۔ ان کی تہذیب میں تجارت عروج پر تھی۔ ان کی زبان اعلیٰ درجہ کی اور رسم الخط خاصا ترقی یافتہ تھا۔ ہندسے کا ایک نظام بھی ان میں وسیع پیمانہ پر رائج تھا۔ نظام شمسی پر مبنی ان کا کیلنڈر بھی تھا۔ ان کا حکومتی نظام بہت منظم اور مانگی پر وہتا ئی ان کے ترقی یافتہ مذہبی نظام کو بڑی خوش اسلوبی سے چلاتی تھی یہ لوگ اہرام نما عمارتیں، عبادت خانے، قلعے اور محلات تعمیر کرتے تھے۔ ان کے پتھر کے دھاتوں کے بنے اوزار اعلیٰ درجہ کی کاریگری کے نمونے ہوتے تھے۔ ٹونوچیتلان TONOCHITLAN اور ٹکسکوکو TEXCOCO جیسے بڑے شہر ان کی اعلیٰ تہذیب کا نمونہ تھے اور یہ دونوں شہر مکسیکو کی وادی میں واقع تھے۔ ان شہروں کی آبادی تقریباً ۵ لاکھ افراد پہ مشتمل تھی اور ان میں ایسے بازار تھے جن میں لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا اور جو اس زمانے میں اسپین کے بازاروں سے کچھ کم نہ تھے (ملاحظہ کیجیۓ مارون اور ہیرس صفحہ ۵۰۔۴۹ مطبوعہ ۱۹۵۰ء)

لیکن اس کے برعکس ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کا طرزِ عمل ملاحظہ کیجیۓ۔ ان حکمرانوں میں کچھ تو ہندو پرست کہے جاتے ہیں اور اپنی ہندو رعایا کے خلاف کوئی اقدام کرنا تو کجا اگر ان پر قاضی القضاۃ جیسا اعلیٰ عہدہ دار بھی انگلیاں اٹھاتا تو مستحق سزا ہوتا۔ ان میں سے کچھ حکمرانوں کا تو راجپوتوں سے خونی رشتہ تھا اور وہ ان کے ساتھ مل کر حکومت کرتے بلکہ انہیں حکومت میں ساجھے دار بھی بناتے تھے۔ حتیٰ کہ اورنگزیب جیسا بدنام حکمران اپنے محل کی حفاظت پر صرف ہندوؤں کو مامور کرتا تھا۔ عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کا یہ تجزیہ مسلم حکمرانوں کی وکالت کرنے والے کسی مسلمان مورخ کا نہیں، بلکہ ایک ہندو دانشور کے۔ آر۔ ملکانی کا ہے جو ایک شدت پسند جریدے آرگنائزر کی

ادارت پر مامور رہے ہیں اور راشٹریہ سیوک سنگھ، جن سنگھ اور بھارتیہ جنتا پارٹی جیسی جماعتوں کے اعلیٰ سربراہوں میں شامل ہیں (ملاحظہ فرمایئے ملکانی کا مضمون مطبوعہ اسٹیٹسمین کلکتہ مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۸۰ء)

اب یوروپین مورخین کی وقائع نگاری کا معیار ملاحظہ فرمائیے۔ ان کے ہم وطن، ہم نسل اور ہم مذہب لوگوں نے شمالی امریکہ کے مہذب، شائستہ اور پُرامن لوگوں پر محض لوٹ کھسوٹ کی خاطر جو دردناک مظالم ڈھائے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اس پر اظہار خیال کرنے میں ان کی زبان گونگی ہو گئی ہے اور اسے ضبط تحریر کرنے میں انکی انگلیاں مفلوج ہو گئیں۔ ۹۰ لاکھ بے گناہوں کے خون کا ناقابلِ معافی جرم جو ان کے سفید فام ہم نسل اور ہم مذہب لوگوں نے کیا وہ ان مورخین کے لیے قطعی قابل توجہ نہ تھا۔ موجودہ دور کے کچھ محققین نے ان سنگین جرائم کی تحقیقات نہ کی ہوتی تو ابتک یہ پردۂ راز میں رہ جاتے۔ لیکن عہد وسطیٰ کے مسلمان حکمرانوں پر بہتان طرازی کے لیے انہیں بہت مہلت تھی ہندوؤں کے خلاف مسلمان حکمرانوں کے مفروضہ جرائم، ان کے قتلِ عام، انکی عورتوں کی آبروریزی اور ان کے مندروں کے انہدام کی مبالغہ آمیز، من گھڑت داستانیں ضبط تحریر کرنے سے ان مورخوں کو گہری دلچسپی تھی اور بایں ہمہ وہ مورخ کہلانے کے بھی دعویدار ہیں۔

دنیا کے جن جن حصوں میں یوروپین نوآباد پہونچے وہاں انھوں نے بڑے پیمانہ پر لوٹ کھسوٹ مچایا اور انسانیت سوز حرکتیں کیں اور اسی روشنی میں ہندوستانیوں کو 'تہذیب' سے روشناس کرانے کے برطانوی دعوے کا اصل مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ نویسی کے مقدس فن کو کس طرح اپنے

مفادات کے تابع کرلیا۔ عہد وسطیٰ کی مسلم حکومتوں کے لیے یوروپی مستشرقین نے عام طور پر جو ظالم، سفاک، وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں وہ کچھ تو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تصادم اور اس کے نتیجے میں عیسائی تجربوں کی وجہ سے اور کچھ مغربی استعماریت پسندوں کے مفادات کے سبب تھا اور مغربی مورخین نے نوآبادیاتی مفادات کی خاطر ان مستشرقین کی خوشہ چینی کی جن کی صدائے بازگشت موجودہ دور کے لٹریچر میں پائی جاتی ہے اور ان سے یوروپی اور غیر یوروپی دونوں گمراہ ہوتے ہیں اور مفاد پرست عناصر انہیں فکر وعمل کا ایک خاص رخ دیدیتے ہیں۔

ایلیٹ اور ڈاؤسن (۱۸۶۶ء) نے عہد وسطیٰ کے 'غیر ملکی' حکمرانوں اور دیسی ہندوؤں کے درمیان سلسلہ وار تصادم کی فہرست کئی جلدوں میں پیش کرکے جس

---

[1] عہد وسطیٰ کے حکمرانوں اور ان کی رعایا کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے بارے میں مستشرقین کی غلط اور غیر متبدل رائے کی تردید کرتے ہوئے ایم۔ اے۔ گب اور ایچ باون لکھتے ہیں کہ "حقیقت یہ ہے کہ حکومت اور عوام کے درمیان اندرونی تعلقات کی نوعیت کے بارے میں ہمیں بہت کم علم ہے۔ اس میں شبہ کی گنجائش بہت کم ہے کہ حکومت کا انتظامی پہلو محض ایسے ضابطوں پر مبنی نہیں تھا جو حکمرانوں کی خواہش کے مطابق لوگوں پر مسلط کیے جاتے تھے بلکہ وہ ضابطے ایسے ہیئتی نظام کی طرح تھے جن کا تعلق معاشرے کی ساخت اور عوام الناس کی خصوصیتوں اور ان کے افکار سے بھی تھا۔ اس ہیئتی نظام کا تعلق حکومت اور محکوموں کے درمیان مسلسل ربط پر مبنی تھا ایسی یوروپین اصطلاحوں جیسے مطلق العنانی اور خود مختاری کے بے جا استعمال سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں انہیں دور کرنا اور ان کا از سر نو جائزہ لینا ضروری ہے (دیکھیے اسلامک سوسائٹی اینڈ دی ویسٹ جلد ۱ پارٹ ۱ صفحہ ۹، ۱۹۵۰ء لندن)

جذبۂ منافقت کا اظہار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی حکومت کا پورا دور ہندو رعایا کے قتل وغارت گری کا دور تھا۔ انھوں نے جن حوالوں کا ذکر کیا ہے ان کی چھان پھٹک ہی سے اصل حقیقت سامنے آئے گی۔ تاہم ان متعصبانہ تصنیفات کے نقائص سامنے آچکے ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ محمد اشرف نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان برطانوی مورخین نے انشائیہ اور غیر تاریخی دستاویزات کو بھی مستند تصور کرکے ان کے حوالے دیے ہیں۔

مرے۔ ٹی۔ ٹائٹس نے جو خود بھی متھاڈسٹ اپسکوپل چرچ کا ایک مشنری تھا اپنی کتاب انڈین اسلام مطبوعہ ۱۹۳۰ء میں اس کی تصنیف کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسکا مقصد یہ بتانا ہے کہ " یہ مذہب (اسلام) کس طرح ہندوستان کے حدود میں داخل ہوا، کس طرح پھیلا، کس طرح وہ ..... لوگوں کی تقسیم عمل میں لایا اور منقسم لوگوں کی گروہ بندیاں ہوئیں اس نے ماحول سے کیا اثر لیا اور جدید حالات کا اس پر ردعمل کیا ہے"۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ہندوستان میں شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں چل رہی تھیں اسکو اشتعال دیتے ہوئے ٹائٹس لکھتا ہے کہ " دنیا کے مختلف گوشوں جیسے مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ، مڈغاسکر، ماریشس، ارجنٹائن، آسٹریلیا، برلن، لندن اور پیرس میں مسلمانوں کا پھیلاؤ باعثِ تشویش ہے" اس پر شدید گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے ٹائٹس لکھتا ہے کہ " اپنے مذاہب کی اشاعت کے جوشِ جنون اور عملی جدوجہد میں ہندوستانی مسلمان دنیا بھر میں سب سے آگے ہیں"۔ (صفحہ ۱)۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مشنری سرگرمیوں کا مشاہدہ کسی بھی ایماندار مبصر پر واضح کردے گا کہ اس طرح کے بیانات بے بنیاد مگر بامقصد ہیں۔

ایف ڈبلو تھامس (۱۸۹۲ء) ہندو اور مسلم تہذیبوں کو ایک دوسرے کی ضد بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ہندو تہذیب درجہ بند ہے تو مسلم تہذیب مساوات پر مبنی ہے۔ اول الذکر اگر بت گری کو فروغ دیتی ہے تو آخر الذکر کا شعار بت شکنی ہے۔ اگر ہندو تہذیب ٹھوس اور مادی اشیاء کے سہارے فروغ پاتی ہے تو اسلامی تہذیب کی خصوصیت منفردانہ اور نظری ہے۔ ہندو تہذیب یاس اور جذباتیت پر مبنی ہے اور مسلم تہذیب ولولہ انگیز اور سادگی پسند ہے۔ ان دونوں تہذیبوں کے درمیان انتہائی بُعد اور تضاد کی خصوصیتیں بیان کر کے تھامس یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ دونوں معاشرے افق کے دو کنارے ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔ ہندو اور مسلم معاشروں کی یکجائی ان دونوں کے درمیان تصادم پر منتج ہوگی۔

تھامس نے دونوں تہذیبوں کے تضادات تو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں لیکن دونوں کے معاشرے کے معمولات OPERATIVE NORMS پر نظر نہیں ڈالی ہے اور نہ یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تضادات ان دونوں فرقوں کی زندگی میں کس طرح عمل پیرا ہیں۔ محض سرسری طور پر نگاہ دوڑانے والے مبصر کو یہ دکھائی دے گا کہ درجہ بند ہوتے ہوئے بھی ہندوؤں نے جمہوری مساوات کے اصولوں کو مسترد نہیں کیا ہے۔ ہندوؤں کے اندر کئی ایک فرقے ایسے ہیں جو بت گری کی ہمت افزائی نہیں کرتے اور بت شکن کہے جا سکتے ہیں[1]۔ ایسے مسلمان گروہ بھی موجود

---

[1] ہندوؤں کے فرقے برہمو سماج نے بت پرستی ترک کر دی ہے۔ آریہ سماج بھی بت پرستی سے اجتناب کرتے ہیں۔

ہیں جن کا روزگار بت گری ہے گو کہ وہ بت پرست نہیں ہیں[1]۔ ہندوستان کے بیشتر حصے میں مسلمانوں کا معاشرہ بھی سماجی اعتبار سے درجہ بند ہے۔ ہندوؤں کے کئی ایک فرقے بشمول ویشنب اور برہمو سماج درجہ بندی کے خلاف ہیں اور نظام مساوات کو اپنانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم اس موضوع پر مزید تفصیل میں جانا نہیں چاہتے، صرف اس امر پر زور ڈالنا چاہیں گے کہ حقیقت کی تہ تک پہونچنے کے لیے مزید تفتیش اور چھان بین کی ضرورت ہے۔

اس سے انکار کی گنجایش نہیں کہ اسلام اور ہندومت کی بنیادی قدریں ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں لیکن دونوں تہذیبوں کے آپسی فرق کی وجہ سے دونوں فرقوں میں تصادم کوئی ضروری نہیں کیونکہ دونوں میں سے کسی تہذیب کے بنیادی اقدار معرکہ آرائی کی ہمت افزائی نہیں کرتے۔ لیکن کسی منصوبے کے تحت دونوں فرقوں کو متصادم کرنے کے لیے یہ فرق استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں ایک لمبے عرصہ تک ساتھ رہتے سہتے ان دونوں فرقوں کے درمیان نہ صرف مفاہمت پیدا ہوگئی تھی بلکہ مطابقت، یکجہتی اور ایک دوسرے کا لحاظ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کا تہذیبی فرق انہیں تصادم پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ سماجی اور اقتصادی دائرہ کار میں دونوں ایک دوسرے کا تتمہ تھے اور اس صورت حال میں بنیادی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔

سماجیات دانوں کے ایک حلقے کی یہ رائے کہ بحیثیت سماجی نظام ہندومت اور اسلام باہم مربوط ہونے کی بجائے منفصل ہیں لیکن اسی طرح کا انفصال ہندومت کے درجہ بند نظام اور جمہوری نظام مساوات کے درمیان بھی ہے۔ اس کے باوجود ان

---

[1] مغربی بنگال کی ایک مسلم برادری جو پٹوا کہلاتی ہے۔ ہندوں کے لیے بت بناتی ہے۔

دونوں کے درمیان بامعنی تعامل دکھائی دیتا ہے اور جمہوریت اور روایتی درجہ بند سماج کے درمیان ٹکراؤ بڑے اہم مسئلے نہیں پیدا کرتا ہے۔ بلکہ ان دونوں متضاد نظریوں میں مطابقت پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ہندوں اور مسلمانوں کا مصالحت، موافقت اور یکجہتی کے مرحلوں سے گزرنا کوئی غیرفطری بات نہ تھی اور صدیوں کی مدت میں ایسا ہوا۔

پھر مختلف فرقوں کے تمدنی نظام کے درمیان اتصال یا ربط کی خصوصیت انکے درمیان اچھے تعلقات کی ضمانت نہیں دیتی۔ بدھ مت اور ہندو دھرم صدیوں تک نبرد آزما رہے ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان ان کے تمدنی نظام کے ربط کے باوجود تعلقات کی نوعیت سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے۔ خود ہندوؤں کی مختلف ذاتوں کے درمیان کشمکش جدید ہندوستان کے اہم مسئلوں میں سے ہے۔ لہٰذا اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کے رجحانات ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ مذہبی اختلاف اور تہذیبی فرق کی بنا پر ہوں۔

بہرحال تمام مورخین، سماجیات داں اور انسانیات داں اس نوآبادیاتی طرز فکر سے متفق نہیں کہ ہندو اور مسلمان افق کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے کبھی نہیں مل سکتے اور دونوں کی یکجائی لازمی طور پر دونوں کے ٹکراؤ کا سبب ہوگی۔ برطانوی عہد سے لے کر تا حال اس انداز فکر کا غلبہ رہا اور عام ذہن کو اس حد تک متاثر کرتا رہا کہ نسلی، لسانی، سماجی اور معاشی رشتوں کی ناقابل تردید حقیقت نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔ (باقی)

محمد فرید وجدی اور ان کے افکار

از ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی علیگڑھ

۱۸۸۲ء کے بعد فرانسیسیوں اور انگریزوں نے نہ صرف مصر کو اپنے زیر نگیں کرنا چاہا بلکہ وہ اہل مصر کے مذہب اور فکر و نظر کے زاویوں کو بھی تبدیل کرنے کے خواہاں تھے، اپنے اس مقصد میں انہیں کافی حد تک کامیابی ہوئی اور وہاں کے ایک بڑے طبقہ نے ان کے افکار و خیالات قبول کر کے ان کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی دلچسپی لی۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو فرانسیسیوں اور انگریزوں کو اپنے ملک، مذہب اور تہذیب و تمدن کے لیے عظیم خطرہ تصور کرتا تھا اور ان کے خلاف قلمی جہاد کو اپنا فریضہ سمجھتا تھا۔ اس طرح کے اہل قلم میں محمد فرید وجدی کا نام اہم اور ممتاز ہے۔

مختصر حالات | محمد فرید وجدی ۱۸۷۸ء میں اسکندریہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی، ایک عرصہ انھوں نے دمیاط میں گزارا جہاں ان کے والد محترم ڈپٹی کلکٹر تھے، وہ اپنے والد کے ساتھ سوئٹزرلینڈ بھی گئے جہاں سے انھوں نے "الحیاۃ" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا پھر قاہرہ کو انھوں نے اپنی مستقل رہائش گاہ بنایا اور محکمۂ اوقاف میں معمولی تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ اس سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے ایک مطبع قائم کیا جس سے ایک روزنامہ "الدستور" نکالا جو کچھ دنوں تک جاری رہا۔ اس کے بعد "الوجدیات" کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالا۔ مجلہ

"الازہر" کے بھی وہ دس سال ایڈیٹر رہے۔ وفات سے دو سال پہلے ہی اسکی ادارت سے مستعفی ہوکر گوشہ نشین ہوگئے اور کہیں آنے جانے کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ تاہم جو لوگ ان کے گھر پر آجاتے ان سے بڑی تپاک سے ملتے۔ ۱۹۵۴ء میں قاہرہ میں ان کا انتقال ہوا[۱]۔ انھوں نے اپنے بعد علم و تحقیق کے لازوال نقوش چھوڑے۔

بعض نمایاں خصوصیات

فرید وجدی کی شخصیت بعض حیثیتوں سے دوسروں سے مختلف نظر آتی ہے۔ علمی زندگی سے قطع نظر عام زندگی میں بھی وہ دوسروں سے نمایاں تھے۔ گوشہ نشینی اختیار کی تو اس میں راہبوں کو بھی پیچھے کر دیا۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افکار و خیالات پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دی[۲]۔ ایک دفعہ اخبار جاری رکھنے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں رہ گئے تھے تو "جماعۃ ترکیا الفتاۃ" نے پیش کش کی کہ اگر وہ اخبار کو ہماری تنظیم کا ترجمان بنا دیں تو روپے فراہم کر دیے جائیں گے۔ لیکن انھوں نے یہ پیش کش ٹھکرا دی اور اخبار کا بند ہو جانا گوارا کر لیا، جس کے بعد ملازمین اور کارکنوں کا حساب بے باق کرنے کے لیے اپنی کتابیں اور دوسری چیزیں فروخت کر دیں[۳]۔

فرید وجدی کی سب سے نمایاں خدمت یہ ہے کہ اسلام کے مختلف پہلوؤں اور متعدد فلسفیانہ مسائل کو اپنا موضوع بنا کر وہ چالیس[۴] سال سے زیادہ عرصہ تک اسلام کی صداقت آشکارا کرتے رہے۔ انھوں نے عربی ادب و صحافت اور مصری معاشرت پر گہرے اثرات ڈالے[۵]۔ علم و فن اور تحقیق و تنقید میں بھی ان کا درجہ بلند ہے[۶]۔ فرید وجدی کی پوری زندگی تصنیف و تالیف میں گزری۔ انھوں نے ۱۸۹۰ء میں پندرہ[۷] ہی سال کی عمر سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں ان کی کتاب "علی اطلال المذھب المادی" اس وقت منظر عام پر آئی جب مصر میں شبلی شمیل (۱۸۵۲ء-

۱۹۱۷ء) سلامہ موسیٰ (۱۸۸۷ء-۱۹۵۷ء) اور اسمٰعیل مظہر (۱۸۹۱-۱۹۶۲ء) مغربی تہذیب کے علمبردار اور بہت بڑے مبلغ تھے۔ فرید وجدی نے اس کتاب میں نہ صرف مغربی تہذیب کو ہدف تنقید بنایا بلکہ دلائل کی روشنی میں اس کے کھوکھلے پن کو بھی واضح کیا۔

فرید وجدی کی غیر معمولی اسلامی خدمات کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ جامعۂ ازہر کے فارغ التحصیل تھے، اس غلط فہمی کی یہ وجہ بھی ہوگی کہ انھوں نے معرکۃ الآرا اسلامی موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے اور ایک مدت تک وہ جامعۂ ازہر کے مجلہ "الازہر" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ درحقیقت اسلام کے مختلف پہلوؤں پر انکا عبور انکی ذاتی محنت و مطالعہ کا نتیجہ تھا۔

اسلام سے دلچسپی کا سبب یہ سوال اہم ہے کہ ازہر کے تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود بھی انہیں اسلام اور اسلامی علوم و افکار سے اس قدر غیر معمولی شغف کیوں تھا؟ اس سلسلے میں وہ خود رقم طراز ہیں:

"دینی علوم اور اسلام سے میری دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ میں شروع میں شکوک و اوہام کا شکار رہا، والد محترم کی صحبتوں اور مجلسوں میں جب دینی موضوعات پر بحث و گفتگو ہوتی تو میں اسے بغور سنتا۔ لیکن جب کبھی میں خلق و کون کے بارے میں سوال کرتا تو والد صاحب مباحثہ کو ختم کر دیتے اور مجھے بحث و گفتگو سے منع کرتے۔ اس سے میرے عقائد میں تزلزل آنا شروع ہوگیا جو شک و ریب میں تبدیل ہوگیا۔ جس کے بعد میرا ذہن کسی ایک رائے پر نہ جمتا۔ اسی بنا پر مجھے تمام اسلامی کتب اور عقائد، معاشرت اور فلسفہ کے مسائل و موضوعات

پر موجود لٹریچر کو غور و توجہ سے پڑھنے کا موقع ملا۔ اس سے میرے علم میں بہت
اضافہ ہوا اور میرا مطالعہ بھی وسیع ہوا اور میرے سامنے زندگی کا صحیح تصور واضح
ہوگیا۔ اس طرح میرے شبہات دور ہوتے گئے اور مجھے شرح صدر حاصل ہوتا گیا۔
گویا شک کی وجہ سے مجھے یقین محکم کی نعمت ملی اور مجھے اپنے اور اپنے فکر پر کلی
اعتماد حاصل ہوا۔[۷]

صحیح اسلامی روح سے واقف ہونے کے بعد فرید وجدی نے بدعات و خرافات
کے خلاف آواز بلند کی[۸] اور فکر اسلامی کے محاسن اور عصری تہذیب کی شناعت کی
وضاحت کی اور اس پر مختلف مجلات مؤید[۹]، اللواء[۱۰]، الدستور[۱۱]، الجہاد[۱۲] اور الازہر
وغیرہ میں مضامین لکھے۔

فرید وجدی کی فلسفہ پر گہری نظر تھی اور ان کا اسلوب بھی فلسفیانہ ہے۔ انکا
خیال ہے کہ:

"فلسفہ سے دنیا کی بہت سی اشیاء کے حقایق کا ادراک اور وجود سرمدی
کے رازوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ شخص کے لیے
لازم ہے کہ وہ کائنات کے عجائب پر غور و خوض کرے اور اس کی نت نئی تبدیلیوں
اور موت و حیات کی معنوی تہوں تک پہونچنے کی کوشش کرے۔

اسلام کا مطالعہ میں نے قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں کیا اور
اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسلام معنوی اور مادی دونوں حیثیتوں سے تمام عصری قوانین
سے بالا و برتر ہے، یہی وجہ ہے کہ میں عصر حاضر کی ہر تہذیب و ثقافت سے کنارہ کش
ہوکر اسلام کا گرویدہ ہوگیا اور مسلمانوں کو تاریکیوں سے نکال کر اسلام کی کشتی

ہوئی روشنی میں لانا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا[۱۲]

فرید وجدی خلود و بقائے روح کے قائل تھے[۱۳]

تصنیفات | فرید وجدی نے درج ذیل کتابیں تصنیف کیں ۔

(۱) المدنیۃ والاسلام (۲) دائرۃ معارف القرن الرابع عشر والعشرین۔ یہ دراصل انسائیکلوپیڈیا ہے جو نو۹ جلدوں پر مشتمل ہے، یہ عظیم الشان کام انھوں نے تن تنہا تیس۳۰ سال میں انجام دیا اور یہ ۱۹۳۰ء میں پایۂ اختتام کو پہونچا۔ اس کی طباعت کے لیے انھوں نے ایک پریس بھی خریدا[۱۴]۔ (۳) ماوراء المادہ (دو۲ جلدیں) (۴) صفوۃ القرآن (قرآن کی مختصر تفسیر) (۵) الحدیقۃ الفکریہ فی اثبات وجود اللہ بالبراہین الطبیعیہ (۶) المرأۃ المسلمہ (۷) الاسلام فی عصر العلم (دو۲ جلدیں) (۸) کنز العلوم واللغہ (۹) علی اطلال المذہب المادی (۱۰) مجموعۃ الرسائل الفلسفیہ (۱۱) کتاب المعلمین (۱۲) نقد کتاب الشعر الجاہلی[۱۵]۔

فرید وجدی کی یہ تمام تصانیف موضوع اور استدلال کے لحاظ سے منفرد ہیں۔ یہاں ہم ان کی دستیاب شدہ کتابوں کا اختصار کے ساتھ تعارف کرائیں گے تاکہ اردو خواں طبقہ کو بھی انکی خدمات سے کسی قدر واقفیت ہو جائے۔

المدنیۃ والاسلام :۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۸۹۹ء میں پہلے فرانسیسی زبان میں لکھی تھی۔ اس کے بعد اسے "تطبیق الدیانۃ الاسلامیہ علی نوامیس المدنیہ" کے عنوان سے عربی میں منتقل کیا لیکن دوسرے ایڈیشن میں اس کا نام تبدیل کر کے "المدنیہ والاسلام" کر دیا[۱۶] اس میں اسلام کا مکمل تعارف کرایا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جس وقت یہ کتاب ہندوستان میں آئی تو نواب محسن الملک (۱۹۳۰ء-۱۹۰۷ء)

نے اس کی اہمیت کی طرف ان لفظوں میں توجہ دلائی۔

"اس قسم کے عالمانہ اور محققانہ مضامین کو دیکھ کر میں نے چاہا کہ ہمارے ہندوستانی مسلمان بھائی بھی ان سے محروم نہ رہیں اور شرک و بدعت اور تقلید واوہام کے پردے جو ان کی چشم بصیرت پر پڑے ہوئے ہیں دور ہوں اور وہ اسلام کی اصلی حقیقت سے واقف ہوں اور دیکھیں کہ خود ان کے علماء اور حکماء کیا کہتے ہیں اور اسلام کی حقیقت کیا بتاتے ہیں"[۴۱]

محسن الملک اس کتاب سے بہت متاثر تھے، انھی کی خواہش پر مولوی رشید احمد نے اسے اردو میں منتقل کیا اور جب یہ کتاب اردو میں چھپ گئی تو انھوں نے فرمایا:

"مجھکو امید ہے کہ اس ترجمہ سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہونچے گا اور جو مسلمان عربی نہیں جانتے ان کو معلوم ہوگا کہ اسلام کیا ہے اور جو طالب علم اپنے مذہب سے بے خبر ہیں اور انگریزی تعلیم ان کے دلوں میں ملحدانہ اور لاادریانہ شکوک پیدا کر رہی ہے۔ یہ کتاب ان کے دلوں سے ان تمام شبہات کو دور کر دے گی اور اسلام کی روشنی سے ان کے دل منور ہو جاویں گے"[۴۲]

المدنیۃ والاسلام درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) الانسان (۲) تکالیف الحیاۃ (۳) الدین والعلم (۴) ماہو الاسلام (۵) الناموس الاعظم للمدنیۃ (۶) جہاد الانسان لتوالی الحریہ (۷) حریۃ النفس (۸) حریۃ العقل (۹) حریۃ العلم (۱۰) الواجبات الشخصیہ (۱۱) مطالب النفس (۱۲) تطہیر النفس من الاوہام (۱۳) تہذیب النفس بالعلم (۱۴) تادیب النفس بمکارم الخصال (۱۵) تصحیح الاعتقاد (۱۶) الاعتدال فی مطالب الجثمان (۱۷) المطالب الجسمیہ (۱۸)

حفظ الصحۃ (۱۹) الواجبات العائلیہ (۲۰) الواجب الاول ۔ اصلاح حال العائلہ ادبیا ۔

(۲۱) الواجب الثانی ۔ اصلاح حال العائلہ مادیا (۲۲) مقام العمل والجد فی نظر الاسلام

(۲۳) الواجبات الاجتماعیہ (۲۴) استطراد الی الرق فی الاسلام (۲۵) واجبات

المسلمین بالنسبۃ للذمیین (۲۶) واجبات المسلمین بالنسبۃ لمعاہدیہم (۲۷) واجبات

المسلمین بالنسبۃ لمحاربیہم (۲۸) نظرۃ علی الاسلام والمسلمین ۔

ان عنوانات ہی سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ تاہم ذیل میں اس کے

چند ابواب کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے ۔

" باب الدین والعلم " میں فرید وجدی نے علمائے یورپ کے حوالے سے بتایا

ہے کہ وہ علم اور مذہب کو متضاد تصور کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی وجہ سے

تفکر و تدبر کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں ۔

لیکن فرید وجدی اسلام کے متعلق واضح کرتے ہیں کہ اس میں تفکر و تدبر کی پوری آزادی

ہے اور یہ دین بنی نوع انسان کو اس وقت عطا کیا گیا جب اس کا شعور ہر طرح بالغ ہو چکا

تھا ۔ تاکہ وہ ان پر حجت بن سکے اور اس کے ذریعہ انہیں حق و عدل اور ہدایت کے راستوں

کی جانب رہنمائی مل سکے جس کے بعد اس کے لیے شک و انکار کی گنجائش باقی نہ رہ جائے[۱۹] ۔

فرید وجدی آگے فرماتے ہیں یہ ہمارا پختہ یقین ہے کہ اسلام علم و عقل کے مطابق ہے اور

مذاہب کے بارے میں علمائے یورپ کے جو خیالات ہیں ان کا انطباق مذہب اسلام پر

نہیں ہوتا[۲۰]

باب حریۃ النفس میں قرآن و حدیث کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے

فخر و مباہات کے تمام ستون مسمار کر دئے ہیں اور صرف تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیا ہے ۔

اس نے فضل و معیشت کا دروازہ تمام لوگوں کے لیے وا کردیا اور اپنے پیروکاروں کو ان لوگوں کی اتباع سے منع کیا ہے جو خود کو سعادت و شقاوت کا مالک قرار دیتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص خود کو عالم گردانے وہ جاہل ہے"[21] فرید وجدی نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے متعدد آیات و احادیث پیش کی ہیں ذیل میں صرف ایک آیت اور ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔

ترجمہ	متن
ان کے درمیان پھر کوئی رشتہ نہ رہے گا اور	فَلَآ اَنۡسَابَ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَئِذٍ
نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔	وَّلَا يَتَسَآءَلُوۡنَ (المومنون: ۲۳/۱۰۱)

حدیث شریف ملاحظہ ہو:۔

ترجمہ	متن
اے عباس! (رسول اللہ صلی اللہ علیہ	"یا عباس ویا صفیۃ عمی النبیؐ
وسلم کے چچا) یا صفیہ (آپؐ کی پھوپھی)	ویا فاطمۃ بنت محمد انی لست
اور اے فاطمہ! (آپؐ کی صاحبزادی)	اغنی عنکم من اللہ شیئاً ان لی
میں اللہ کے یہاں تم لوگوں کے لیے کچھ	عملی ولکم عملکم"
نہیں کرسکوں گا۔ میرا عمل میرے لیے اور	
تم لوگوں کا [illegible] لیے۔	

باب حریۃ العقل میں فرید وجدی نے بتایا ہے کہ مذہب اسلام میں عقل کو آزادی حاصل ہے۔ معاملات کی پرکھ اور کھرے کھوٹے میں تمیز کی بنا پر اسے انسان کی فضیلت کا معیار قرار دیا گیا ہے، صرف عبادت و ریاضت کو افضلیت کا معیار سمجھنا غلط ہے[22]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ترجمہ	متن
تم کسی کی دینداری پر ہرگز مت جاؤ۔	لا یعجبنکم اسلام رجل حتیٰ

تنظر واماذا عقل و عقله۔	یہاں تک کہ تمہیں اس کی عقل کا اندازہ ہو جائے۔

آگے حریۃ العلم میں بتایا کہ اسلام نے حصول علم کے سلسلے میں تمام بندشوں کو توڑ دیا اور علم کو تمام لوگوں اور تمام ملکوں کے لیے عام کر دیا اس کے نزدیک اکتساب علم کیلئے جدوجہد عبادت ہے[۲۱]۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے:

افضل العبادۃ طلب العلم	تلاش علم افضل ترین عبادت ہے۔

دوسرے موقع پر فرمایا:۔

نظر الرجل فی العلم ساعۃ	علم و تحقیق میں ایک لمحہ گزارنا انسان
خیر لہ من عبادۃ ستین	کے لیے اس کی ستر سال کی عبادت
سنۃ۔	سے بہتر ہے۔

قرآن کریم کی بے شمار آیات میں انسان کو کائنات اور اس کے نظام میں تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے[۲۲]۔ اور حقایق کائنات پر غور نہ کرنے والوں کو مورد الزام قرار دیا گیا ہے:۔

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ	اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں
وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ	جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں
عَنْهَا مُعْرِضُونَ (یوسف: ۱۲/۱۰۵)	اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔

آگے فرید وجدی نے یہ بتایا ہے کہ اسلام میں ایک آدمی کے ذاتی فرائض کیا ہیں، اس پر خاندان اور معاشرے کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں۔ فرید وجدی کی یہ بحث عالمانہ ہے۔ انھوں نے نفوس انسانی کی اصلاح و تربیت کے لیے اوہام و خرافات سے

بچنے، انہیں معلومات صحیحہ سے آراستہ ہونے، اوصاف حمیدہ کا خوگر ہونے اور عقائد کو درست کرنے پر پورا زور دیا ہے[25] اور اس پر آیات و احادیث کی روشنی میں مفصل بحث کی ہے۔[26]

باب تادیب النفس بمکارم الخصال میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اسلام نے انسان کو کن امور کی تاکید کی ہے اور کن باتوں سے روکا ہے۔ فرید وجدی فرماتے ہیں کہ اسلام دین و دنیا کے تمام قواعد و ضوابط پر مشتمل ہے۔ وہ رہبانیت کا مخالف ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے کہ جس نے رہبانیت اختیار کی وہ ہم میں سے نہیں۔ اسلام میں اجتماعی زندگی کو ترک کرنے سے منع کیا گیا ہے[27] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لصبر احدکم ساعۃ فی بعض	کسی اسلامی کام کے لیے کسی کا مشقت
مواطن الاسلام خیر لہ من	اٹھانا چالیس سال عبادت کرنے
عبادۃ احدکم وحدہ اربعین	والے شخص کی عبادت سے بہتر ہے۔
عاماً۔	

اسلام نے لوگوں کی فطرت کے اعتبار سے جو حدود مقرر کر دیے ہیں اگر کوئی انکو توڑتا اور فطرت سے بغاوت کرتا ہے تو اس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے:۔

من لم یقبل رخصۃ اللہ کان	اللہ کی عنایت کردہ سہولتوں کو
علیہ من الذنب مثل جبال	جو شخص قبول نہ کرے، اسے جبل
عرفۃ۔	عرفات کے برابر گناہ ملے گا۔

فرید وجدی نے "تصحیح الاعتقاد" پر بھی اچھی بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام نے جگہ جگہ تفکر و تدبر کی دعوت دی ہے کیونکہ اسی سے تلاش حق کا راستہ ہموار

ہوتا ہے اور ان لوگوں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے جو اپنے آباء و اجداد کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں[۲۸]۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے :-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس
أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ	چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور
قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ	آؤ پیغمبر کی طرف تو وہ جواب دیتے
آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ	ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ
لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ	کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا
(المائدہ : ۱۰۴/۵)	کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید
	کرتے چلے جائیں گے۔ خواہ وہ کچھ نہ جانتے
	ہوں اور صحیح راستے کی انہیں خبر ہی نہ ہو۔

فرید وجدی نے حفظانِ صحت کے باب میں اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا، اور بتایا کہ حفظانِ صحت کے قواعد منضبط کرنے میں اسلام تمام حکماء سے آگے ہے۔ اور اسے ایمان کی بنیادوں میں سے شمار کیا ہے اور اس پر اسی طرح توجہ دینے پر زور دیا ہے جس طرح ایمان کی دوسری بنیادوں پر زور دیا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ صحت کی نعمت تمام نعمتوں سے بجز توحید کے اعلیٰ و ارفع ہے[۲۹]۔

حفظانِ صحت کے سلسلے میں ایک اصول یہ ہے کہ جسمانی خواہشات میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے۔ اسی لیے اسلام نے نظافت اور پاکیزگی کا حکم دیا ہے اور تمام لطیف اور پاکیزہ چیزوں کو بھی جائز قرار دیا ہے مگر حد سے زیادہ استعمال پر پابندی عائد کی ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے :-

... وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ○ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف: ۳۱-۳۲)

اور کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو، خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اے نبی ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں۔

اسلام نے انسان کو زیب و زینت اور بدن کی آرائش کی تعلیم اسی لیے دی ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرے اور غرور و گھمنڈ میں نہ مبتلا ہو[۱]

باب "الواجبات العائلیۃ" میں فرید وجدی نے بتایا ہے کہ اسلام نے اس سلسلے میں دو چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے ایک تو یہ کہ عورتوں کو اپنے تمام خاندانی امور میں شریک کیا جائے اور دوسرے مرد خود کو بچوں کی تربیت کا ذمہ دار سمجھے[۳۲]۔ عورتوں کے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ما اکرم النساء الا کریم ولا اھانھن الا لئیم۔"

شرفا ہی عورتوں کی قدر کرتے ہیں اور صرف رذیل لوگ ان کی ناقدری کرتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

"کلکم راع وکل راع مسؤل عن رعیتہ۔"

ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ذمہ دار سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں

دریافت کیا جائے گا۔

باب "مقام الجد والعمل فی نظر الاسلام" میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ انسان کو کسب معاش کے لیے جدوجہد اور کدوکاوش کرنی چاہیے، اسلام کے نزدیک کسب حلال سب سے افضل عمل ہے۔

"افضل الاعمال الکسب الحلال" رزق حلال کی تلاش سب سے عمدہ کام ہے۔

فرید وجدی کہتے ہیں کہ اگر مال و دولت سے مسلمانوں کا دور رہنا ہی مقصود ہوتا تو قرآن مجید یہ کیوں کہتا کہ:۔

"وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا" اپنا دنیا کا حصہ نہ بھولو۔

باب "واجبات المسلمین بالنسبۃ لبعضھم" میں اس مسئلہ کو اٹھایا گیا ہے کہ ایک مسلمان پر واجب ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ اخوت و محبت سے پیش آئے، اور ان سب کو برابر اور یکساں سمجھے خواہ وہ کسی رنگ و نسل اور پیشے سے وابستہ ہوں، امتیازات کا دارومدار محض شخصی فضائل پر ہونا چاہیے جس کا فیصلہ خدا کے ذمہ ہے۔ باہم محبت کرنا ایمان کی اولین شرائط میں سے ہے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

"لن تدخلوا الجنۃ حتیٰ تومنوا ولن تومنوا حتیٰ تحابوا" ایمان لانے کے بعد ہی جنت میں داخلہ ملے گا۔ تمہارا ایمان محبت کے بغیر ناقابل یقین ہے۔

باب "استطراد الی الرق فی الاسلام" میں فرید وجدی نے احادیث و آثار کی روشنی میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مذہب اسلام نے غلامی کو ہر طرح سے ناپسند کیا ہے،

اور غلاموں کو بھی اپنا بھائی بند تصور کرنے پر زور دیا ہے :۔

" اخوانکم خولکم جعلھم اللّٰہ تحت اید یکم "　　　تمہارے غلام جنھیں اللہ نے تمہارے قبضہ میں کیا ہے وہ تمہارے بھائی ہیں۔

باب " واجبات المسلمین بالنسبۃ للذمیین" میں اس بات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا رویہ غیر مسلموں اور ذمیوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے، ان کے عقیدہ و مذہب سے تعرض کیے بغیر ان کے ساتھ اخوت و محبت کا معاملہ کیا جائے۔[۳۴] قرآن کریم میں ارشاد ہے :۔

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (الممتحنۃ : ۶۰/۸)

اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اسلام نے انہیں ایذا رسانی سے منع کیا ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے :

" من آذی ذمیا فانا خصمہ ومن کنت خصمہ خصمتہ یوم القیامۃ "　　　ذمی کو ستانے والے شخص کا میں دشمن ہوں اور جس کا میں دشمن ہوں قیامت کے دن اس سے دشمنی کروں گا۔

اسی سے متعلق دوسرا باب " واجبات المسلمین بالنسبۃ لمعاھدیھم" ہے۔ اس

باب میں بتایا ہے کسی بھی قوم کے ساتھ اگر مسلمانوں کا معاہدہ ہو جائے اس کا نبھانا ہر حال میں ضروری ہے معاہدہ اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب خود فریق اسے توڑ دینے کا مرتکب ہو، مشرکین اور اہل کتاب سب اس معاملے میں برابر ہیں[۳۵] قرآن کریم میں ارشاد ہے :۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَوْفُوْا	اے ایمان لانے والو عہد و پیمان کی
بِالْعُقُوْدِ (المائدہ : ۵/۱)	پوری پابندی کرو۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔

من قتل معاهداً لم يرح	جس شخص نے کسی معاہدہ کیے ہوئے
رائحة الجنة	شخص کو قتل کیا اسے جنت کی خوشبو
	نہیں ملے گی۔

اس کے بعد باب " واجبات المسلمین بالنسبۃ لمحاربیھم " میں فرید وجدی نے بتایا ہے کہ ابتدا میں جب کفار مکہ کو اسلام کی دعوت دی گئی تو اسلام کے ماننے والوں کو غیر معمولی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جب ان کی مظلومی کا زمانہ ختم ہوا اور اللہ نے کامیابی عطا کی تو انہیں دشمنوں سے انتقام لینے سے منع کیا کیونکہ یہ حکمت و عدالت کے خلاف ہے[۳۶]۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے :۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ اَنْ	اور دیکھو ایک گروہ جس نے تمہارے
صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ	لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے
اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ	تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل
وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ	نہ ہو جائے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں

وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ٥ (المائدہ: ۵/۲)	ناروا زیادتیاں کرنے لگو، نہیں جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں۔ ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

اسلام نے اپنے دشمنوں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے اور اسے بھی اس نے تعدی قرار دیا ہے۔ اگر کسی سے بدلہ لیا جائے تو اس سلسلہ میں یہ ہدایت کی کہ:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصَّابِرِیْنَ (النحل: ۱۶/۱۲۶)	اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران جنگ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اور انہیں تنگ کرنے سے روکا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ اسیران جنگ کے رتبوں کے مطابق انکی عزت کرتے اور خود بھوکے رہ کر انہیں اپنا کھانا کھلا دیتے، ارشاد نبوی ہے:۔

استوصوا بالاسارى خيراً	قیدیوں کے ساتھ نیکی کی تلقین کرو۔

آخری باب نظرۃ علی الاسلام والمسلمین میں بتایا ہے کہ اسلام ایک متمدن و مہذب دین ہے اور اسکے اصول کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ فطرت اور حیات انسانی سے ہم آہنگ ہیں۔ دنیا جس قدر ترقی سے ہم کنار ہو گی اسی قدر اسلام کی حقانیت آشکارا ہوتی جائے گی۔ دراصل اسلام دنیوی و اخروی سعادت کا حامل و ضامن ہے اور اسی میں دونوں جہاں کی راحت

مضمر ہے[۲۸]

آخر میں مسلمانوں کے موجودہ انحطاط و تنزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ اس زمانہ میں اسلام کا تصور بہت محدود ہو گیا ہے اور اس کے بہت سے اعلیٰ وارفع اصول و کلیات کو دین سے خارج کر دیا گیا ہے یہ اسلام کے غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ اب صاحب تقویٰ اسے کہا جاتا ہے جو سعی و جہد کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کرے۔[۲۹]

(باقی)

حواشی

[۱] دیکھیے محمد عبدالغنی حسن۔ فن الترجمہ فی الادب العربی۔ الدار المصریہ للتالیف والترجمہ (بدون تاریخ) ۱۳۳-۱۴۲ [۲] خیر الدین الزرکلی۔ الاعلام۔ الطبعۃ الثانیہ۔ مطبع کوستا توماس وشرکاہ، ۱۹۵۶ء ۶/۳۲۹ [۳] عباس محمود العقاد۔ فرید وجدی۔ المجلہ۔ القاہرہ۔ ۱۹۶۳ء ۷/۲۳، ص ۴۔ [۴] انور الجندی۔ الکتاب المعاصرون مطبعۃ الرسالہ۔ عابدین ۱۹۵۵ء۔ ص ۶۱-۶۲ [۵] انور الجندی۔ الاعلام الالف۔ مطبعۃ الرسالہ۔ عابدین۔ ۱۹۵۶ء۔ ۱/۱۳۴ [۶] الکتاب المعاصرون، ص ۵۹ [۷] عباس محمود العقاد۔ فرید وجدی۔ ۱۹۶۳ء۔ القاہرہ۔۔۔ [۸] "المؤید" اخبار ۱۸۸۹ء میں علی یوسف اور شیخ احمد ماضی کی ادارت میں مصر سے منظر عام پر آیا [۹] "اللواء" ۱۹۰۰ء میں محمد حافظ رمضان کی ادارت میں شایع ہوا [۱۰] "الدستور" ۱۹۰۷ء میں فرید وجدی کی ادارت میں نکلا [۱۱] "الجہاد" ۱۹۲۵ء میں توفیق ایوسف کی ادارت میں جاری ہوا [۱۲] الکتاب المعاصرون ص ۶۰-۶۱ [۱۳] ایضاً ص ۶۰ [۱۴] الاعلام الالف ص ۱۳۴ [۱۵] الاعلام ۶/ ۲۲۰-۲۲۱ [۱۶] ایضاً ۶/۲۲۹ [۱۷] دیباچہ از محسن الملک۔ المدنیۃ والاسلام۔ محمد فرید وجدی (رشید احمد انصاری) جو تعلیم یافتہ قیس بلدی پریس دہلی ۱۹۰۸ء [۱۸] ایضاً [۱۹] المدنیۃ والاسلام ص ۴ [۲۰] ایضاً ص ۴ [۲۱] ایضاً ص ۱۱ [۲۲] ایضاً ص ۹۶-۱۰۶ [۲۳] ایضاً ص ۹۶ [۲۴] ایضاً ص ۹۶ [۲۵] ایضاً ص ۹۷-۹۸ [۲۶] ایضاً ص ۱۰۲ [۲۷] ایضاً ص ۱۰۳ [۲۸] ایضاً ص ۱۰۶-۱۰۹ [۲۹] ایضاً ص ۱۰۹ [۳۰] ایضاً ص ۱۰۹-۱۱۰ [۳۱] ایضاً ص ۱۱۰ [۳۲] ایضاً ص ۱۱۰-۱۱۱ [۳۳] ایضاً ص ۱۱۱ [۳۴] ایضاً ص ۱۱۲ [۳۵] ایضاً ص ۱۲۰ [۳۶] ایضاً ص ۱۳۰ [۳۷] ایضاً وضاحت کے لیے ملاحظہ کریں ص ۱۳۹-۱۴۳ [۳۸] ایضاً ص ۱۴۳ [۳۹] ایضاً ص ۱۵۰۔

قدیم تامل ناڈو اور اس کے موجودہ عربی مدارس اور کتبخانے

از جناب کاوش بدری صاحب آمبور

تامل ناڈو کی قدامت HISTORY OF SOUTH INDIA کے مصنف نیل کنٹھ شاستری کا خیال ہے کہ جنوب میں انسانی زندگی تین لاکھ برس پرانی ہے۔ گو تمل ناڈو مختلف مذاہب، دراوڑی زبانوں اور رسم و رواج کا گہوارہ ہے مگر اس کثرت میں بھی وحدت (UNITY IN DIVERSITY) ہے جو یہاں کے باشندوں کو مذہب اور زبان کے اختلاف اور نسل، رنگ اور قوم کے فرق و امتیاز کے باوجود متحد رکھتی ہے، چنانچہ اسی فکری وحدت و یکجہتی کے باعث تمل ناڈو کو مورخین نے "جنت نشان" سے تعبیر کیا ہے، ایک ضعیف روایت کے مطابق سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "مجھے ہندوستان سے جنت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے"۔ بعض مورخین کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام جنت سے سراندیپ (لنکا) میں اتارے گئے تھے جہاں ابتک ایک پہاڑ "کوہ آدمؑ" کے نام سے مشہور اور ہزاروں زائرین کا مقدس مرکز ہے۔ سری لنکا اور کنیا کماری کے درمیان جہاں سمندر تھما ہوا ہے وہ آدم کے پل کے نام سے معروف ہے وہ اسی پل کے راستے سے جدہ کو روانہ ہوئے تھے جہاں بی بی حوا کو اتارا گیا تھا اگر عوام میں مشہور یہ روایتیں صحیح مان لی جائیں تو پہلے دراوڑی شخص حضرت آدم علیہ السلام قرار پاتے ہیں اور اس سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ جنوبی ہندوستان

میں ہی پہلی انسانی آبادی پائی گئی۔ جس کی تصدیق ثقافتی تاریخ اور آثار قدیمہ کی کھدائی
سے دریافت شدہ چیزوں سے بھی ہوتی ہے۔

جغرافیائی وسعت | ابھی چند برس پہلے تک جغرافیائی حیثیت سے تامل ناڈو کا رقبہ بہت وسیع
و عریض تھا اور یہ مختلف دراوڑی زبانیں بولنے والی پانچ ذیلی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ (۱)
کرناٹک (۲) آندھرا (۳) ملیبار (۴) تمل علاقہ اور (۵) میسور۔

مغلیہ عہد میں قدیم تمل ناڈو صوبۂ کرناٹک کے نام سے موسوم تھا۔ ۱۹۰۸ء میں تقریباً
سارا جنوبی ہندوستان مدراس پریسیڈنسی میں شامل تھا۔ ۱۹۵۶ء کے بعد جب لسانی
بنیادوں پر صوبوں کی تقسیم ہوئی تو مدراس پریسیڈنسی کو مدراس اسٹیٹ کے نام سے
پکارا گیا اور پھر ۱۹۶۸ء میں اس حصۂ ملک کا نام تمل ناڈو رکھ دیا گیا۔ ۱۹۵۶ء کے بعد
مدراس کے علاقہ سے آندھرا کو الگ کر دیا گیا۔ مدراس کے مختلف تاریخی نام تھے مثلاً
CHANNAI PATTANAM چنیا پٹن TONDAIMANDALAM وغیرہ۔ عربی اور
فارسی تذکروں اور قدیم تاریخی کتب میں مدراس کو چنیا پٹن ہی لکھا گیا ہے۔ جس کی
وجہ سے لوگوں کو مدراس یا تمل ناڈو کی شناخت میں مغالطہ ہو جاتا ہے۔

دراوڑی تہذیب و کلچر | دراوڑی تہذیب جنوب میں پروان چڑھی۔ یہاں کے قدیم ترین
باشندے PROTO ASTRALOID نسل کے لوگ تھے جن کی ناک چپٹی اور ہونٹ
موٹے تھے۔ آریوں کی آمد سے ہزاروں برس قبل EGYPT بحیرۂ روم کے علاقے کی
ایک نسل نے ہندوستان (جنوبی) کا رخ کیا۔ مورخین کی دریافت کے مطابق یہ
تورانی النسل تھے جو ہندوستان کے شمالی مغربی دروں کے راستوں سے پہلے شمالی ہندوستان
میں آئے مگر جب شمالی ہندوستان کی آریائی اقوام نے انہیں وہاں سے بے دخل کیا تو

وہ مجبوراً جنوبی ہندوستان میں آکر بس گئے اور انھوں نے جنوب کے قدیم باشندوں کو جنگلوں کی طرف بھگا دیا اور خود جابجا اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ بحیرہ روم سے آنے والی نسل کے لوگ تنگ ناک، لمبے سر اور اکہرے بدن کے تھے۔ انھی دونوں نسلوں کے انضمام سے موجودہ دراوڑی نسل نے جنم لیا۔ ہڑپہ کلچر کی تحقیق کے بعد ان دونوں نسلوں کے وجود کا صحیح پتہ دریافت ہوچکا ہے۔ بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ ہڑپہ اور مہنجوڈارو کی زبان قدیم ترین تمل زبان ہی کی ایک صورت تھی۔ بعض محققین کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن شریف میں بھی چند تمل الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے قول کے مطابق دراوڑی تہذیب دراصل "دھرتی پوجا" کی علامت ہے اور آریائی اور دراوڑی کلچر کے اتصال سے فنون لطیفہ، رقص، موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی، شاعری، روحانی افکار، رہن سہن کے آداب اور لٹریچر نے جنم لیا جو ہندوپاک کی تہذیب و کلچر کے امتیازی نشانات ہیں۔

عظیم الشان ہندو سلطنتیں | ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں مہنجوڈارو (سندھ) ہڑپہ (پنجاب) کی کھدائیوں سے پتہ چلا ہے کہ ہندوستان کا تمدن پانچ ہزار سال قبل مسیحؑ اور عراق کے سومری تمدن کا ہمعصر ہے۔ بقول عبداللہ یوسف علی مصنف THE MAKING OF INDIA جنوبی ہندوستان میں دراوڑیوں نے تیسری صدی قبل مسیحؑ سے تیرہویں صدی عیسوی تک جگہ جگہ عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ ان خاندانوں میں :-

(۱) آندھرا خاندان (۲) پلّوا (۳) چالوکیہ (۴) چولا (۵) پانڈیا وغیرہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہندو راجاؤں نے عرب کے سیاحوں کی آؤ بھگت کی اور عربی و فارسی کے فروغ کے لیے بے دریغ تعاون کیا۔

مسلمانوں کی آمد | بقول علامہ شبلی نعمانیؒ "اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک

چپہ چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہونچا"۔ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بقول "ہجرت کی پہلی صدی کا خاتمہ تھا کہ اس ابر کرم کے چھینٹوں نے اس (ہندوستان) کے سمندروں کے کناروں اور پہاڑوں کے دامنوں کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ بحر ہند کے سواحل ملیبار، کیل کرے KILA KARAI (جنوبی آرکاٹ، تمل ناڈو) کوولم اور مدراس سے لے کر گجرات و کاٹھیاواڑ تک مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم ہوگئیں"۔ کہا جاتا ہے کہ کوولم میں ایک صحابی حضرت تمیم انصاریؓ کا مزار ساحل سمندر پر واقع ہے اور مالابار سے مدراس تک کے درمیان کا ساحلی علاقہ معبر MA B A R کہلاتا ہے۔ اہل عرب جنوبی ہند کے مغربی ساحل کو مالابار اور مشرقی ساحل کو معبر کہتے ہیں۔ معبر کا دوسرا نام کورومنڈل ہے۔ عرب سیاحوں اور تاجروں کے سفرناموں میں یہی نام "معبر" درج ہے۔ عرب اور ایران کے جہاز "زابج" اور "چین" جاتے آتے راستہ میں ملیبار سے گزر کر معبر کی بندرگاہوں میں بھی لنگر انداز ہوا کرتے تھے اور یہاں بھی ہجرت کی ابتدائی صدیوں میں عرب اور مصر و ایران کے ساحلی باشندوں نے آکر توطن اختیار کر لیا تھا۔ غرض ہندوستان اور خاص طور پر اس ساحلی علاقہ کا تعلق عربوں سے بہت قدیم ہے اور پہلی صدی ہجری میں ہی مسلمان یہاں آباد ہو گئے تھے، جس کی تفصیل مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصنیف "عرب و ہند کے تعلقات" اور دوسری کتابوں میں موجود ہے، اس لیے یہاں اس سے قطع نظر کیا جاتا ہے۔

پروفیسر افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری مرحوم رقم طراز ہیں:۔

"پہلی اور دوسری صدی ہجری ہی میں ملیبار میں اسلام پہونچ چکا تھا۔ اس لیے اس کے اثرات تمل ناڈو کے علاقوں میں بھی محسوس ہونے لگے۔ ۲۳۲ھ/۸۴۶ء

میں مصر کا ایک گروہ محمد خلجی کی سرکردگی میں کنیا کماری کے ساحل پر پہونچا۔ خلقِ قرآن کے مسئلہ میں ان لوگوں میں مامون اور اس کے ہمنواؤں سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور جب جبراً اس مسئلہ کو ماننے پر مجبور کیا گیا تو وہ اپنا وطن (مصر) چھوڑ کر جنوبی ہندوستان چلے آئے .... یہ سب کایل پٹنم اور کیل کرے جیسے ساحلی مقامات پر آباد ہو گئے۔ ...ان کی مادری زبان عربی تھی لیکن آگے چل کر انھوں نے دیسی زبان (تمل) اختیار کی اور دونوں زبانوں میں اظہار خیال کرنے لگے۔ یہ مذہبی لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ اپنے ساتھ تفسیر و حدیث و فقہ و کلام کی بہت سی کتابیں ساتھ لائے ہونگے اور انہیں ایسی کتابوں کو جمع کرنے کا شوق رہا ہوگا۔ اب بھی ان کا یہ شوق باقی ہے۔ کایل پٹنم اور کیل کرے (جنوبی آرکاٹ تمل ناڈو) وغیرہ میں عربی علوم و فنون کی بہت سی تصنیفات قلمی صورت میں موجود ہیں۔[1]

سلطان علاءالدین خلجی کی فتوحات سے بھی پہلے بہت سے صوفیائے کرام تمل ناڈو پہنچ چکے تھے۔ ان حضرات کی مساعی سے بھی یہاں عربی و فارسی زبان اور اسلامی علوم و فنون کی ترویج ہوئی اور تصوف پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

علاءالدین خلجی کے زمانے سے محمد تغلق کے اخیر زمانے تک سلاطینِ دہلی نے دکن پر متعدد حملے کیے اور ہر مرتبہ لشکر کے ہزاروں آدمی ان کے ساتھ ان علاقوں میں آئے اور جب وہ واپس ہوئے تو اپنے لشکر کو بغرض انتظام یہیں چھوڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کے لاکھوں آدمی ترا چناپلی، مدورے، آرکاٹ اور مدراس میں آباد ہو گئے۔ جن کی

---

[1] ماہنامہ آجکل دہلی (تمل ناڈو نمبر) جون جولائی ۱۹۷۲ء مقالہ تمل ناڈو میں عربی اور فارسی کے نادر مخطوطات" ص ۸۷۔

زبانیں عربی فارسی اور ترکی وغیرہ تھیں، باہمی میل جول سے یہاں کے بڑے بڑے شہروں میں تحریر و تقریر، تصنیف و تالیف اور نظم و نثر کی زبان عربی، فارسی اور ریختہ ہوگئی اور جن لوگوں کی مادری زبان تمل یا دکنی تھی انھوں نے بھی عربی فارسی اور اردو زبانوں کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور ان میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں لکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمل ناڈو میں شمالی ہند سے زیادہ عربی، فارسی اور اردو کو مقبولیت حاصل ہے کیونکہ شمالی ہند میں جب سے ہندی کا چلن عام ہوا اردو کا رواج روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور اردو کو ہندی رسم الخط میں لکھنے لگے ہیں مگر جنوبی ہندوستان میں عموماً اور تمل ناڈو میں خصوصاً اردو زبان اس لیے زندہ ہے کہ یہاں اردو کو عربی یا فارسی رسم الخط میں لکھنے کا رواج قائم ہے اور یہاں کے علما روادبا کی عام بول چال کی زبان گو دکنی ہے مگر تحریر و تقریر اور تصنیف و تالیف کی زبان کسی بھی زبان کے اہلِ زبان سے کم نہیں۔

مقامی اور بیرونی زبانوں کا فروغ اور مدارس اور کتب خانوں کا قیام

جلال الدین احسن شاہ نے ۱۳۳۳ء میں خود مختاری کا اعلان کرکے "معبری سلطنت" کی بنا ڈالی۔ انکے خاندان نے تقریباً ۵۰ سال تک یہاں حکومت کی اس دور میں دکنی زبان کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ آگے چل کر نواب ذوالفقار خاں نے جنوبی آرکاٹ کے شہر جنجی کی خراب آب و ہوا کی وجہ سے آرکاٹ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ ان کا عہد ۱۶۹۲ء سے ۱۷۰۳ء تک رہا، اس عہد میں دکنی زبان کے ادبا و شعرا نے نثر و نظم میں ملک گیر شہرت حاصل کی۔ ملک الشعرا نصرتیؔ اسی عہد کا عظیم دکنی شاعر ہے۔ ناصر علی سرہندی، ہاشمیؔ اور اسیدؔ نے بھی دکنی زبان میں اپنے جوہر دکھائے۔ اسی عہد میں کتب خانوں کی بنیاد پڑی۔

کرناٹک (قدیم تمل ناڈو) میں خاندان نوائط کا دور حکومت بھی عربی فارسی اور دکنی کے لیے بہت سازگار رہا۔ نواب سعادت اللہ خاں گلشن نائطی کے عہد میں صوفی شعرا و ادبا نے دکنی، اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی کافی سرمایہ چھوڑا۔ اس دور میں سید شاہ عبدالقادر میران شاہ، ولی اللہ جبلی، شیخ محمد امین، لالہ جسونت رائے منشی اور عبداللہ ذاکر کی فارسی اور اردو شاعری کی دھوم تھی۔ نواب علی دوست خاں کا عہد بھی سید شاہ حمید اولیا اور نواب زین العابدین دیوان کی وجہ سے کافی مشہور تھا۔

کرناٹک (قدیم تملناڈو) میں خاندان والاجاہی کا دور حکومت عربی فارسی اور اردو کے فروغ کے علاوہ مساجد کی تعمیر، کتب خانوں اور عربی و فارسی مدارس کے قیام کے لحاظ سے مغلیہ دور سے کم نہ تھا۔ نواب انورالدین خاں کا عہد ۱۷۴۴ء سے ۱۷۹۵ء تک رہا پھر نواب محمد علی خاں والاجاہ کے زریں عہد اور ان کے جانشینوں کے دور میں بھی علم و ادب کی بڑی سرپرستی ہوئی۔

والاجاہی دور میں تمل ناڈو کی دفتری زبان فارسی تھی اور سرکار کی سرپرستی میں بین الاقوامی تنقیدی مشاعرے بالالتزام منعقد ہوتے تھے۔ ان تنقیدی فارسی مشاعروں کی صدارت خود والئی حکومت کرتا تھا۔ عربی عوام کی مذہبی زبان تھی۔ دانشور طبقہ عربی میں نثر لکھنے اور نظم کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

تمل ناڈو کے شاعروں اور ادیبوں پر اردو میں متعدد تذکرے لکھے گئے ہیں۔ جن میں کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ ذیل میں صرف بعض تذکروں کے اور ان کے مولفین کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) تذکرۂ اشارات بینش (فارسی) از مولوی سید مرتضی بینش مدراسی مطبوعہ

۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء اسے دوبارہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی (دانشگاہ دہلی) نے ترتیب و تحشیہ کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں انڈو پرشین سوسایٹی دہلی سے شایع کیا ہے۔

(۲) منظوم فارسی تذکرہ "سعید نامہ" از راجہ جسونت رائے منشی لاہوری ثم مدراسی، سال تصنیف ۱۷۱۰ء تا ۱۷۳۴ء۔

(۲/الف) "سعید نامہ" (منظوم بزبان فارسی) از: سخنور کامل محمد عبدالعزیز عزت مدراسی، مطبوعہ ۱۳۰۵ھ/۱۸۹۱ء۔

(۳) تذکرۂ شعرائے ریختہ گویاں (بزبان فارسی) از مرزا علی خاں لطف مدراسی، سال تصنیف ۱۸۲۳ء سے پہلے۔

(۴) تذکرۃ الشعراء (بزبان فارسی) از مولوی شاہ رفیع الدین قندھاری ثم مدراسی (تلمیذ حضرت خواجہ رحمت اللہ) مطبوعہ ۱۸۲۵ء۔

(۵) تذکرۂ احباء (بزبان فارسی) از: حضرت سید حسین شاہ حقیقت بریلوی ثم مدراسی، سال تصنیف ۱۸۳۳ء۔

(۶) تذکرۂ گلدستۂ کرناٹک (بزبان فارسی) از حضرت غلام علی موسیٰ رضا ملقب بہ حکیم باقر حسین خاں راقم آرکاٹی مطبوعہ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء۔

(۷) تذکرۂ نتائج الافکار (بزبان فارسی) از: مولانا مولوی قدرت اللہ گوپامئوی ثم مدراسی، مطبوعہ ۱۸۴۳ء۔

(۸) تذکرۂ معدن الجواہر (فارسی) از: مولانا مولوی محمد مہدی واصف مدراسی، موصوف ہی کا تذکرہ حدیقۃ المرام (بزبان عربی) ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء میں شایع ہوا تھا۔

(۹) تذکرۂ معاصر الشعراء (فارسی) از مولوی حکیم غلام دستگیر خاں لائق مدراسی،

سال تصنیف ۱۸۵۵ء۔

(۱۰) تزک والاجاہی (فارسی تذکرہ) از سید برہان خاں ہانڈی ترچاپلی سال تصنیف ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء۔ اس کا پہلا حصہ ۱۹۵۷ء میں پروفیسر حمزہ حسین کیفی عمری نے مرتب کرکے گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری مدراس سے شایع کیا۔ حصہ اول و دوم کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد حسین نائنار نے کیا اور ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۹ء میں دونوں مدراس یونیورسٹی کے زیر اہتمام شایع ہوئے۔

(۱۱) سوانحاتِ ممتاز (فارسی) از: محمد کریم خیرالدین حسن غلام ضامن المعروف بہ خورشید الملک بہادر مدراسی۔ سال تصنیف ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء، اس کو پروفیسر افضل العلماء حبیب خاں سرکش داؤدی عمری مرحوم اور پروفیسر حمزہ حسین کیفی عمری مرحوم نے اڈٹ کرکے گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری مدراس کے زیر اہتمام شایع کیا اور پھر اسکا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد حسین نائنار نے کیا جو ۱۹۴۴ء میں مدراس یونیورسٹی سے شایع ہوا۔

(۱۲) بہار اعظم جاہی (فارسی) از غلام عبدالقادر ناظر مدراسی ابن غلام محی الدین معجز آرکاٹی، اس سفرنامۂ ناگور کا سال تصنیف ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء ہے جس میں عربی اشعار بھی کثرت سے شامل ہیں، اسے پروفیسر افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری مرحوم کے طویل مقدمہ کیساتھ پروفیسر حمزہ حسین کیفی عمری نے ۱۹۶۱ء میں شایع کیا، اس کا بھی انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد حسین نائنار مرحوم نے کیا، جو مدراس یونیورسٹی اسلامک سیریز نمبر ۱۱ کے تحت ۱۹۵۰ء میں شایع ہوا۔

(۱۳) قصر والاجاہی (فارسی) از: قاضی القضاۃ سید محمد حسین تمنا ترپاتوری (شمالی آرکاٹ) یہ ضخیم تذکرہ دکن اور رنگ پر مشتمل ہے، سال تصنیف ۱۷۹۲ء تا ۱۸۵۵ء۔

افسوس ہے کہ یہ تذکرے تمل ناڈو کے عربی مدارس کے کتب خانوں میں خراب حال میں ہیں، جو کتابیں دو تین سو سال قبل شایع ہوئی تھیں ان کے دوبارہ شایع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ رہے مخطوطات تو ان کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے، اب چند مشہور کتبخانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شہر مدراس کے کتبخانے　(۱) گورنمنٹ ریکارڈ آفس لائبریری ایگمور میں عربی اور فارسی کے ہزاروں سرکاری دستاویزات کے علاوہ عربی و فارسی کے نادر مخطوطات موجود ہیں کتبخانہ میں مختلف علوم و فنون کی ڈھائی سو برس پرانی کتابیں دستیاب ہیں، اندازاً ۵۰۰ ہزار سے زیادہ عربی فارسی اور اردو کی کتابیں محفوظ ہیں، جن کو قرینے سے مرتب کرکے رکھا گیا ہے۔

(۲) کتب خانۂ مخطوطات شرقیہ حکومیۂ مدراس GOVERNMENT ORIENTAL MANUSCRIPT LIBRARY MADRAS یہ کتب خانہ مدراس یونیورسٹی لائبریری کے ایک حصہ میں موجود ہے۔ یہ نادر مخطوطات اور قدیم کتابوں کے نایاب نسخوں کا بیش بہا خزانہ ہے، سنہ ۱۹۴۷ء میں عربی فارسی اور اردو مخطوطات کے علاوہ دوسری علاقائی زبانوں کے صدیوں پرانے مخطوطات کو محفوظ کیا گیا ہے، جن کی صحیح نقل اور انہیں ایڈٹ کرکے شایع کرنے کا لائحہ عمل بھی بنایا گیا ہے، یہ کام لائبریری کے کیوریٹر پروفیسر سید محمد فضل اللہ مرحوم متوفی سنہ ۱۹۷۲ء کی تقرری کے بعد شروع ہوا۔ انھیں کی جدوجہد سے مرکزی حکومت نے مذکورہ کتب خانے کے مخطوطات کی اشاعت کے لیے سالانہ ایک لاکھ روپے منظور کیا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومت کی جانب سے بھی سالانہ ڈیڑھ لاکھ روپیوں کا مسلسل عطیہ RECURRING GRANT ملنے لگا۔ عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات کی باقاعدہ نقل، اڈیٹنگ اور اشاعت کا آغاز پروفیسر

سید حمزہ حسین کیفیؔ عمری بنگلوری کے منشی مقرر ہونے کے بعد ہوا۔ ان دونوں حضرات نے مدراس کے چند قابل اور مستند اساتذہ، حکماء، ادباء اور شعراء کی خدمات حاصل کر کے ان سے بعض اہم اور نایاب مخطوطات کو اڈٹ کرا کے کتابی شکل میں شایع کیں۔

۱۹۳۱ء میں لائبریری کی فہرست مخطوطات AN ALPHABETICAL INDEX OF URDU MANUSCRIPTS بھی کتابچہ کی شکل میں شایع ہوئی ہے۔ جس میں ۳۵ مخطوطات اور ان کے مصنفین کے اسماء اور ان کے موضوعات کی صراحت کی گئی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں فارسی مخطوطات کی فہرست بھی کتابی شکل میں شایع ہوئی تھی جس میں تقریباً ۶۱۴ مخطوطات کا ذکر ان کے مصنفین کے ناموں اور موضوعات کی صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ عربی مخطوطات کی فہرست ہنوز شایع نہیں ہوئی۔

(۳) کتب خانۂ عام اہلِ اسلام مدراس۔ انگریزی حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی کی بنا پر مدراس کی گورنمنٹ کے ایجنٹ بالفور نے مسلمانوں کو کتب خانے اور مدرسے قائم کرنے کی ترغیب دلائی۔ چنانچہ ۲۲ رجب ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء کو پالی ٹکنک انسٹی ٹیوشن مدراس میں دن کے گیارہ بجے باشندگان مدراس کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کے علاوہ نوابینِ آرکاٹ اور شہر مدراس کے ذی اثر حضرات، علماء فضلا اور ادباء و شعراء نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ قاضی القضاۃ مولوی ارتضیٰ علی خاں بہادر خوشنودؔ مدراسی میر مجلس بنائے گئے...... یکم محرم ۱۲۶۵ھ سے لوگوں کو اس کتب خانے کا عام رکن بنایا جانے لگا اور [illegible] نواب [illegible] خاں بہادر نے اس کو سات سو روپے عطیہ دیا اور خرچ کے لیے ۳۵ روپے ماہانہ بھی مقرر فرمایا۔ گورنر مدراس سر ہنری پاٹنجر نے ۵۰ قیمتی کتابیں دیں اور نو سو چورانی (۹۹۴) روپے انفرادی عطیات اور چندے ہوئے عام

ارکان کے ذریعہ ۵۱۳ عربی فارسی کی کتابیں جمع ہوئیں۔ اس طرح اس مشہور کتب خانے کی ابتدا ہوئی جو نہ صرف مدراس میں بلکہ سارے ہندوستان میں بے نظیر تصور کیا گیا۔ نوابین آرکاٹ نے ہزاروں روپے بطور عطیہ پیش کیے۔ والیٔ مصر محمد علی پاشا نے بھی کئی ترکی کتابیں روانہ کی تھیں۔ اس سے پہلے پورے ہندوستان میں اس قسم کا کوئی عمدہ کتبخانہ قائم نہیں ہوا تھا[1] اس وقت اس کے ناظم پروفیسر محبوب پاشا ہیں۔ والا جاہ روڈ مدراس میں واقع اس کتب خانے سے ہند و پاک کے عظیم اشخاص نے استفادہ کیا ہے۔ اس میں نوابین آرکاٹ کے علاوہ ملک و بیرون ملک کے ارباب کمال کی متعدد فنون پر نایاب عربی فارسی اور اردو کتابیں محفوظ ہیں۔ اس کی عمارت مخدوش ہو جانے کی وجہ سے اس کا سارا سرمایۂ کتب اب ایک محفوظ جگہ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

(۴) مدرسۂ محمدی عربک کالج دیوان صاحب باغ کی امانتی لائبریری۔ جناب صلاح الدین محمد ایوب رقم طراز ہیں کہ:۔

"ایک سو سال قبل مدرسہ محمدی کے قیام کے ساتھ ہی اس کا کتب خانہ بھی قائم ہوگیا جس میں اسلامیات کے تمام موضوعات پر عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ہزاروں مخطوطات و مطبوعات موجود ہیں۔ بانیانِ مدرسۂ محمدی کا تعلق مشہور نوائط خاندان سے ہے جو علمی خدمت گذاری میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس خاندان میں کتابوں کی حفاظت نسلاً بعد نسل چلی آرہی ہے۔"

فخر خاندان مولانا محمد غوث شرف الملک (المتوفی ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء) نواب

---

[1] ماخوذ از "خانوادۂ قاضی بدر الدولہ اور انکے خاندان کے بعض باکمال اہلِ علم و قلم کا مختصر اور مستند تذکرہ" مرتبہ افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری، ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۳ء ص ۱۴۰۔

کرناٹک و فرمانروا اعظم الدولہ کے دیوان تھے، ان کا خاندان جب آرکاٹ سے آکر مدراس میں آباد ہوا تو اہلِ خاندان کے پاس اپنے اپنے گھروں میں جو کتب خانے تھے انہیں ایک بڑے ہال میں عام استفادہ کے لیے کر دیا گیا اور اس کا نام "امانتی کتب خانہ خاندانِ شرف الملک" رکھا گیا۔ اس کی بے شمار کتابیں اکابر خاندان کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں اور بہت سی حج کے موقع پر خریدی گئی ہیں[1]۔ ذیل میں اس کے چند نادر مخطوطات کی فہرست دی جاتی ہے[2]۔

(۱) احکام اہل الذمہ (دنیا کا یہ واحد نسخہ ہے۔ جس کی کتابت ۸۶۹ھ/۱۴۶۴ء میں ہوئی۔ مؤلف کا نام شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر المعروف بہ ابنِ قیم الجوزیہ ہے۔

(۲) غریب الحدیث۔ مؤلف ابو عبید القاسم بن سلام الہروی متوفی ۲۲۴ھ/۸۳۸ء۔ سالِ تصنیف ۵۹۷ھ/۱۲۰۱ء ہے۔

(۳) تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف۔ مؤلف جمال الدین ابی الحجاج یوسف بن ذکی عبد الرحمٰن بن یوسف المزّی متوفی ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء۔

(۴) قرآن مجید (مطلّا) اس کو زین الدین علی بن میر حبیب نے ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں لکھا تھا۔

(۵) فہرست قرآن۔ یہ قرآن مجید کے الفاظ کی ابجد کے مطابق فہرست ہے۔ جو ٹیپو سلطان شہید کے استعمال میں بھی تھی۔

(۶) کتاب المصباح المضی فی کتاب النبی العربی الامیؐ۔ حضورؐ کے زمانہ کے کاتبینِ وحی کے حالات پر مشتمل ہے۔ کاتب: ابن حدیدہ اور سن کتابت ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء ہے۔

(۷) الرسالۃ الشرفیہ فی النسب التالیفیۃ وکتاب الادوار۔ یہ فن موسیقی

---

[1] یادگار نمبر بہ تقریب جشن صد سالہ مدرسہ محمدی مدراس۔ دیوان صاحب باغ ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء ص۲ فہرست میں مقامی حضرات کے بجائے بیرونی ممالک کے مصنفین کے مخطوطات کے ذکر ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔

پرمشتمل مطلا نسخہ ہے جسے سیف الدین عبدالمومن الرمادی البغدادی نے ہرون بن محمد الجوینی کے لیے ہلاکو کے زمانے میں لکھا جس میں پانچ مقامات ہیں :۔

(١) الکلام علی الصوت و لواحقہ (٢) فی حصر نسب الاعداد (٣) فی اضافۃ الابعاد (٤) ترتیب الاجناس فی طبقات الاعداد (٥) فی الایقاع و نسب الادوار کا۔

اختتام میں مختلف راگوں کے تعلق سے عربی اشعار و قطعات درج ہیں۔ اس کے دو ہی اور نسخے ہیں، قاہرہ کا نسخہ شکستہ ہے۔

(٨) تحفۃ المجاھدین فی العمل بالمیادین۔ تالیف مقتی لاچینی الرمی (فنون جنگ پر مشتمل ہے۔

(٩) تحفۃ الاشراف للشیخ جمال الدین المزی الشافعی۔

(١٠) غریب الحدیث۔ مولف: ابو عبید قاسم بن سلام۔

(١١) الذخیرۃ فی محاسن اھل الجزیرۃ۔ مولف: ابوالحسن علی المعروف بابن بسام المتوفی سنہ [illegible]۔ یہ اندلس کے محدثین و علماء کے حالات پر مشتمل ہے۔

(١٢) دلائل النبوۃ۔ مولف حافظ موفق الدین ابوالقاسم اسماعیل بن محمد بن الفضل التیمی۔

(١٣) مجمل اللغۃ۔ مولف ابوالحسن احمد بن فارس بن ذکریا۔ ابوالحسن علی بن خلف نے سنہ [illegible] میں اسے نقل کیا ہے۔

(١٤) اقضیۃ الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما قضی فیہ او امر بالقضا بہ۔ مولف ابو عبداللہ محمد بن فرح الطلاع۔ سال تالیف [illegible] ہے۔

(۱۵) کتاب الایثار بمعرفۃ رواۃ الآثار۔ مولف: ابن حجر العسقلانی۔ اس میں موطا امام محمد کے رواۃ پر تنقید ہے۔

(۱۶) ارشاد العامل الی اصول المسایل۔ مولف: الشیخ شہاب الدین احمد بن المجدی الشافعی۔ اس میں جمال الدین ابو عبداللہ الماردین کی کتاب فلکیات "الدر المنثور فی العمل بربع الدستور" کی شرح شامل ہے۔

(۱۷) عوارف المعارف۔ مولف شیخ شہاب الدین سہروردیؒ المتوفی ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء۔

(۱۸) بلوغ المرام من أدلۃ الاحکام (فقہ) مولف ابن حجر عسقلانی۔

(۱۹) خبایا الزوایا من کتاب الطھارۃ الی التیمم۔ مولف بدر الدین محمد ابن الزرکشی تاریخ نسخ: ۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء۔

(۲۰) التحریر فی شرح الفاظ التنبیہ۔ مولف یحیٰ بن شرف بن المری النواوی۔ تاریخ کتابت ۶۷۰ھ/۱۲۷۱ء۔

(۲۱) جمع الوسایل فی شرح الشمائل الجزء الاول۔ مولف ملا علی قاری۔ تاریخ نسخ خطی ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء۔

(۲۲) الترغیب والترھیب۔ مولف شیخ عبد العظیم المنذری۔ تاریخ کتابت ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء۔

(۲۳) کتاب الامتاع با الاربعین المبانیۃ بشرط السماع۔ مولف شہاب الدین ابی الفضل احمد بن علی بن محمد بن حجر عسقلانی۔ کاتب: محمد بن ابراہیم بن محمد بن عبداللہ تاریخ کتابت ۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء۔ ابن حجر عسقلانی نے یہ حدیثیں سولہ مجلسوں میں بیان کی تھیں۔ آخری مجلس ۱۳ رمضان ۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء میں حلب کے مقام میں منعقد ہوئی تھی۔

(۲۳) المنتقیٰ السنن المسندة عن سید نا رسول اللہؐ ۔

مولف ابو محمد عبداللہ بن علی بن الجبارود النیسا پوری۔ تاریخ ۵۶۷ھ ۔

امانتی لائبریری میں ہزاروں عربی و فارسی مخطوطات ہیں اور مولانا عبدالماجد دریابادی
پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ، میر اکبر علی خان ،
پروفیسر محمد مجیب، حکیم عبدالحمید (ہمدرد دوتعث دہلی) پروفیسر نذیر احمد، مولانا ابوالقاسم
محمد عتیق میاں فرنگی محلی، پروفیسر مختار الدین احمد، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، قاضی اطہر مبارکپوری
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ابوالسعود احمد، ظ انصاری، ڈاکٹر
فہمیدہ بیگم، عصام الشفطی (ادارۂ مخطوطات عربی کویت)، شریف (ایران) شرف جہاں
(تاجکستان)، اسحاق جلیس ندوی مرحوم وغیرہ نے اس کتبخانہ کی زیارت کی ہے اور
اس کے بارے میں اپنی گرانقدر آرا تحریر فرمائی ہیں۔ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی نے
لکھا ہے کہ "یہ دنیا کا ایک انمول کتبخانہ اور بے مثال خزانہ ہے"۔

مسٹر حسن الدین احمد۔ ایم۔ اے۔ آئی۔ اے۔ ایس لکھتے ہیں :۔

" جنوبی ہند کی تاریخ عہد وسطیٰ اور انگریزی دور میں جن خطوط، فرامین اور دستاویزات
نے تاریخ بنانے کا کام انجام دیا ہے، ان میں اکثر اس خاندان کے ذخیروں میں موجود
ہیں مغل سلاطین کے شاہی فرامین و تاریخی دستاویزات کے علاوہ ٹیپو سلطان اور
گورنر مدراس کی مراسلت، سلطان محمد عادل شاہ اور سلطان علی عادل شاہ کے فرامین
شاہ جی بھونسلہ وغیرہ کے نام، مرہٹہ پیشواؤں کے فارسی فرامین اور مرہٹہ راجہ تنجاور

لہ راقم کو بھی اس عدیم المثال کتب خانہ کی زیارت کا شرف حاصل ہو چکا ہے، جس کے لیے جناب
جی۔ عبدالرشید لکچرر عربی اور قاضی حبیب اللہ صاحب مہتمم کتبخانہ کا شکر گزار ہوں۔ (ض، ر)

کے خطوط و فرامین، آصف جاہ اول کے فرامین، سلاطینِ آصف جاہی کی مراسلت، مغل سلاطین سے انگریزوں، فرانسیسیوں اور مرہٹہ پیشواؤں، دیگر مرہٹہ راجاؤں، حیدر علی اور ٹیپو سلطان وغیرہ۔ نواب والا جاہ اور کارنوالس، وارن ہیسٹنگز کی مراسلت ایسے نایاب مخطوطے ہیں جن کے منظر عام پر آنے اور محققین کی توجہ کا مرکز بننے سے ان ادوار کی تاریخ پر نئی روشنی پڑ سکتی ہے.... دکن میں مسلمانوں کی ملی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کی تدوین کے لیے اس کتب خانہ میں بیش بہا اور نادر ریکارڈ اور کتابیں موجود ہیں۔[1]

عرب لیگ کلچرل مشن کے صدر شاہ عبدالمطلب قاہرہ، بغداد کے ذکریا یوسف وغیرہ نے اس کتب خانہ کو دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا تھا۔ ان حضرات کو نہ یہاں سے کوئی کتاب مستعار مل سکی اور نہ نایاب مخطوطات کی فوٹو کاپی لینے کی اجازت ہی ملی۔ ابھی تک اس کتب خانے کی کوئی باقاعدہ اور ضخیم فہرست شایع نہیں ہو سکی ہے، البتہ اس کی اور کتبخانۂ رحمانیہ مدراس کے اردو مخطوطات کی مختصر فہرست ۱۹۸۹ء میں شایع ہوئی ہے۔

مدراس کے اہل علم کے ذاتی کتب خانوں میں بھی نایاب کتب محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ شہر مدراس میں امیر محل مدراس کا کتب خانہ، مدراس یونیورسٹی کا کتب خانہ اے جے اردو سمینار کا کتب خانہ اور جمالیہ عربک کالج مدراس کا کتب خانہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔

شمالی آرکاٹ کے کتب خانے (۱) مدرسۂ لطیفیہ عربک کالج ویلور کا کتب خانہ اور مدرسۂ باقیات الصالحات عربک کالج ویلور کا کتب خانہ ہزاروں عربی فارسی

[1] تذکرۂ سعید، مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال ص ۹۲ مطبوعہ ۱۹۷۳ء۔

اور دکنی مخطوطات سے پر ہیں۔ یہاں قدیم ترین عربی فارسی اور دکنی کتب کے جو ذخائر ہیں اب ان کی طباعت کا آغاز ہوا ہے، جامعہ دار السلام عمر آباد عربک کالج کی عم لائبریری میں بھی عربی فارسی اردو کتابوں، رسائل اور انگریزی کی ہزاروں کتابیں اور ماہنامے اور روز نامے محفوظ ہیں۔ دراصل یہ کتب خانہ حضرت کاکا محمد ابراہیم صاحب مرحوم کے ذوق علم و فن کا نتیجہ ہے جو ۱۳۴۹ھ میں قائم ہوا تھا اور جس کی دیواروں پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ اسی عربک کالج سے علامہ رشکر نائطی نے مصحف نامی ماہنامہ بھی نکالا تھا، شہر آمبور کے کتب خانۂ فلاح ملت میں بھی عربی، فارسی اور اردو کی ہزاروں کتابیں ہیں۔

شہر وانم باڑی | تمل ناڈو میں علمی ادبی، تہذیبی ثقافتی اور مذہبی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے اور اس حیثیت سے اس شہر کی وہی اہمیت ہے جو لکھنؤ کی ہے۔ یہاں کے مولانا خطیب سر محمد حسین نواب امین جنگ بہادر صدر المہام عدالت باب حکومت سرکار عالی، اعلیٰ حضرت حضور نظام، حیدرآباد دکن کو بچپن ہی سے نادر مخطوطات اور قدیم کتب عربی، فارسی و اردو کو جمع کرنے سے شغف رہا ہے اس کی وجہ سے انکا ذاتی کتب خانہ نہایت وسیع ہو گیا تھا جو حیدرآباد دکن میں منتقل ہو گیا۔ آج بھی شہر وانم باڑی کے مختلف کتب خانوں سے اس شہر کے علماء اور ارباب فضل و کمال استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

کیل کرے | کیل کرے (جنوبی آرکاٹ تمل ناڈو) کے مدرسہ موالی عربک کالج اور مدرسہ عروسیہ عربک کالج میں عربی، اردو، فارسی اور اردو کے سینکڑوں مخطوطات محفوظ ہیں، یہاں کے کتب خانوں سے عرب، مصر اور دوسرے بیرونی ممالک کے محققین نے استفادہ کیا ہے، یہاں کے عظیم روحانی پیشوا حضرت صدقۃ اللہؒ کے دست مبارک پر ہندوستان کے

شہنشاہ اورنگزیب نے بیعت کی تھی۔ آج بھی جنوبی آرکاٹ کے علمائے کرام کو عربی زبان وادب پر پورا عبور حاصل ہے اور وہ ہیروں کے بڑے تاجر بھی ہیں۔ افضل العلما ڈاکٹر تیکہ شعیب عالم صاحب ہیرے کے بڑے تاجر اور عربی زبان وادب کے ماہر ہیں، پروفیسر سید احمد اکبرآبادی نے انکی عربی دانی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی شخصیت کو ایک عجوبہ قرار دیا ہے۔ ان سے مصر وشام، سعودی عرب وغیرہ کے اہل علم بھی بخوبی واقف ہیں، شمالی آرکاٹ اور مدراس کے کئی مقتدر علمائے کرام سے بھی بلاد عربیہ کے لوگ واقف ہیں۔ انہیں حضرات کی مسلسل کوشش سے عربی مدارس، مساجد اور کتب خانے تمل ناڈو بھر میں قائم ہوئے۔

حواشی

۱؎ مجلہ ثقافۃ الہند فصلیۃ دہلی، المجلد ۴۱، العدد ۱ سنہ ۱۹۹۰ء ۲؎ فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس از ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال مطبوعہ سنہ ۱۹۷۰ء ۳؎ مدراس میں اردو ادب کی نشوونما " " " " " " ۴؎ تذکرۂ سعیدیہ، حیدرآباد دکن از افضل الدین، سنہ ۱۹۳۷ء ۵؎ ارمغان شادی نواب خطیب سراج حسین۔ از خطیب محمد عبدالرشید، ۱۹۲۷ء/۱۳۴۶ھ ۶؎ آئینۂ دائم باڑی، از آمنہ حاجی محمد ابراہیم وارا کین انجمن۔ ۱۹۷۰ء ۷؎ امانتی کتبخانہ خاندان شرف الملک مدراس، از ڈاکٹر محمد غوث و ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، ۱۹۷۰ء/۱۹۸۹ء ۸؎ قاضی عبیداللہ اورینٹل لائبریری، مدراس کے اردو مخطوطات، از ڈاکٹر محمد غوث و ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، سنہ ۱۹۸۹ء ۹؎ کتب خانۂ رحمانیہ مدراس کے اردو مخطوطات، از ڈاکٹر محمد غوث و ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، سنہ ۱۹۸۹ء ۱۰؎ گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری، ۱۹۳۱ء۔ ۱۹۳۲ء۔

اخبار علمیہ

انگریزی زبان میں اسلامی علوم و فنون کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت ہے اور خوشی ہے کہ ادھر چند برسوں میں مختلف حلقوں کی جانب سے کئی اچھے رسائل شایع ہوئے، بعض کا تعارف ان سطروں میں کرایا جاچکا ہے، اس سلسلہ میں نیا اضافہ دہلی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز کا مجلہ "مسلم اینڈ عرب پرسپکٹیوز" ہے، جناب ظفر الاسلام خاں کے زیر ادارت اس کے نقش اول اور اب نقش ثانی "فلسطین نمبر جزو اول" سے اس کے بہتر مستقبل کے آثار روشن ہیں، معیاری مضامین کے علاوہ دوسرے مستقل اور مفید کالم ہیں اور مضمون نگاروں میں مستشرقین بھی ہیں، ظاہری نفاست نمایاں ہے، سالانہ قیمت ۱۵۰ روپے ہے اور پتہ ہے دی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز، پوسٹ آفس بکس ۹۷۰۱، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔ ایک اور انگریزی رسالہ مفتی زبیر بایات کی ادارت میں جنوبی افریقہ سے شایع ہوا ہے، "النصیحۃ دی ایڈوائس" نامی یہ مختصر رسالہ آزادوے AZADVILLE جنوبی افریقہ کے مدرسہ عربیہ اسلامیہ کا ترجمان ہے، اس میں خالص مذہبی تحریریں ہیں، جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی علمی و مذہبی بیداری اور دین حق کی تبلیغ و اشاعت کی یہ ایک اہم مبارک کوشش ہے، رسالہ کی قیمت درج نہیں، پتہ یہ ہے: النصیحۃ، مدرسہ عربیہ اسلامیہ پی او بکس ۹۷۸۶، آزادوے ۱۷۵۰، ساؤتھ افریقہ۔

زبانوں اور بولیوں کی تاریخ، قوموں اور ملکوں کی تاریخ سے کم دلچسپ اور عبرت آموز نہیں،

قرآن مجید کا بھی ارشاد ہے، وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ، گذشتہ ماہ لندن سے دنیا کا پہلا مفصل لسانی اٹلس شایع ہوا، اسکے معلومات و شمولات حد درجہ حیرت انگیز ہیں مثلاً آیندہ صدی میں تین ہزار سے زیادہ زبانیں اور بولیاں ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جائیں گی اور دو ہزار سے زیادہ زبانیں فنا کے قریب پہنچ جائیں گی، اسوقت دنیا کی ایک تہائی زبانیں ایسی ہیں جنکے بولنے والے ایک ہزار سے بھی کم ہیں، آسٹریلیا میں ۲۰۰ قدیم زبانوں میں ۱۳۲ کے بولنے والے کہیں کہیں اب دس سے کم رہ گئے ہیں، سابق سوویت یونین سے قطع نظر یورپ میں ایک درجن سے زیادہ زبانیں بولنے والے ۱۵ ہزار سے کم ہیں، ان میں جرمنی کی سوروبین (۴۰۰) مشرقی فریسین (۱۱۰۰۰) شمالی فریسین (۱۰۰۰۰) بھی شامل ہیں، شمالی اسکنڈے نیویا کی لیپی زبان کی چار قسموں کو بولنے والوں کی مجموعی تعداد صرف ۵۰۰۰ ہے، جنوبی یونان کی ایک بولی تسوکینین کے بولنے والے صرف ۳۰۰ ہیں، ماہرین علم لغات کا خیال ہے کہ زبان کے معاملہ میں دنیا اب نقطۂ انتہا تک پہنچ چکی ہے، ان کا اندازہ ہے کہ ۱۵ ہزار برس پہلے دنیا میں دس سے پندرہ ہزار تک مختلف زبانیں رائج تھیں اور اوسطاً ہر زبان کے بولنے والے کم از کم ۶۰۰ اشخاص تھے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب دنیا کی آبادی کا تناسب آج کے مقابلہ میں قریباً صفر اعشاریہ صفر صفر دو (۰.۰۰۲) تھا، زبانوں کی اس کثرت اور گوناگونی میں زوال شاید دس ہزار سال پہلے اس وقت شروع ہوا جب ایک منظم زندگی بسر کرنے کی ابتدا ہوئی، ماہرین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ماضی میں زبانوں کی عمر تین سو سال سے ایک ہزار تک کی ہوتی تھی، پھر یہ بتدریج فنا کے مرحلوں سے گزر کر کسی نئی زبان کے قالب میں ظاہر ہوتی تھیں، اس کی وجہ سے یہ قیاس عین ممکن ہے کہ ایک لاکھ سال پہلے جب انسان نے ایک دوسرے سے بات چیت کی ضرورت محسوس کی ہوگی اس وقت سے اب تک پانچ لاکھ زبانیں بنتی بگڑتی رہیں، اٹلس میں گذشتہ پانچ سو برسوں میں لسانی ہست و نیست کی داستان کا بڑی دردمندی سے جائزہ لیا گیا ہے

اور یورپ کے ان ماہرین نے اس احساس شرمندگی کو چھپایا بھی نہیں کہ پانچ سو سال پہلے کم از کم سات ہزار زبانیں موجود تھیں لیکن یوروپی استعمار کی وسعت اور اس کے غلبہ و تسلط کے بعد ان میں تقریباً پندرہ فیصد زبانیں معدوم ہوگئیں، امریکہ اور آسٹریلیا میں جب یوروپی قدم پہنچے تو اس کے بعد ۱۱۰۰ امریکی زبانیں اور ۳۰۰ آسٹریلیائی زبانیں بالکل فنا ہوگئیں، فنا پذیر زبانوں کے ماہر اور الاسکا یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل کراس نے زبانوں کی بقا و فنا پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ جن بعض زبانوں کو بچوں نے پڑھنا اور سیکھنا بند کر دیا ہے یہ بربادی کے بالکل قریب ہیں، بعض زبانوں کو بچے سیکھتے ہیں لیکن ان کے بولنے والے اب چند ہی ہیں اس لیے ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی ان زبانوں کی موت کی گھڑی بھی آجائے گی۔ جن زبانوں کا حال ان کے برعکس ہے وہی نسبتاً محفوظ ہیں، پروفیسر موصوف کا اندازہ ہے کہ اس وقت امریکا کی قدیم زبانوں میں ایک تہائی ایسی ہیں جن کو بچے اب سیکھ نہیں رہے ہیں، ان کے موجودہ بولنے والوں کا آخری فرد جوں ہی ختم ہوگا ان زبانوں کا چراغ بھی گل ہو جائے گا، ماہرین کو زبانوں کی موت کے دکھ کے علاوہ سب سے بڑا غم یہ ہے کہ گفتگو اور تحریر کی ادبی روایات، صرف و نحو کے بہترین قواعد، لغات کے علاوہ افکار اور معاشرتی اقدار اور بے شمار انسانی تہذیبوں اور ثقافتوں کی امانتیں بھی مفقود ہو کر دنیائے دوں کو اور مفلس و قلاش بنا دیں گی، اگر ماضی میں استعمار کا غلبہ اور GENOCIDE (نسل کشی) زبانوں کی موت کے مہلک جراثیم تھے تو موجودہ دور میں ٹیلی ویژن کا حملہ، تیسری دنیا میں بڑے بڑے شہروں کی کثرت، اصل وطن و زاد بوم سے بے اعتنائی بلکہ بربادی اور فلسفۂ قومیت کی عدم رواداری ایسے قاتل جرثومے ہیں جو اس وقت دنیا کی ۹۰ فیصد زبانوں کی موت کے درپے ہیں۔ حق ہے، إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ۝

ع۔ ص

وفیات

شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی

از ضیاء الدین اصلاحی

شیخ الحدیث مولانا ابو الحسن عبید اللہ رحمانی ۵؍ جنوری کو رحلت فرما گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝ ان کے نام سے میں بچپن ہی میں آشنا ہو گیا تھا، میرے والد مسلکاً اہل حدیث ہیں، وہ جریدۂ اہل حدیث (امرتسر) اور رسالہ محدث اور اس مسلک کے بعض دوسرے رسالوں کے خریدار تھے، محدث مولانا نذیر احمد رحمانی کی ادارت میں دار الحدیث رحمانیہ دہلی سے شایع ہوتا تھا، اس میں فتاویٰ اور مضامین مولانا عبید اللہ رحمانی کے بھی برابر چھپتے تھے، میں ۱۹۴۶ء میں پرائمری درجات میں پڑھتا تھا، اس وقت "محدث" میری سمجھ میں کیا آتا، تاہم اسے پڑھنے کی کوشش ضرور کرتا، ایک روز والد صاحب نے اسے الٹتے پلٹتے دیکھا تو فرمایا کہ "میں تمہیں اسی مدرسہ میں پڑھنے کے لیے بھیجوں گا جہاں سے "محدث" شایع ہوتا ہے"۔ مگر افسوس

ع　آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

جس سال میں مدرسۃ الاصلاح کے درجہ چہارم عربی میں پڑھتا تھا اس سال میرے درجہ میں ایک نئے طالب علم داخل ہوئے جن کی طرف ہمارے استاذ مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم بڑا اعتنا کرتے تھے، جب یہ کسی تعطیل کے بعد اپنے گھر سے مدرسہ آتے تو مولانا ان کے والد کی خیریت ضرور دریافت فرماتے، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انکا بڑا احترام کرتے تھے، اس کی وجہ سے میرے دل میں بھی ان کے والد کی عزت و عظمت کا نقش ثبت ہو گیا تھا۔

ہمارے یہ نئے رفیق درس مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری تھے اور ان کے والد محترم کا نام شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی تھا جو خود بہت ممتاز عالم اور سیرۃ البخاری کے مصنف مولانا عبدالسلام مبارکپوریؒ کے صاحبزادے اور ترمذی شریف کی مشہور و مقبول شرح تحفۃ الاحوذی کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نور اللہ مرقدہٗ کے خاص تربیت یافتہ تھے وکفیٰ بہ فخراً۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب چوتھے درجہ کے بعد ہی دوسرے مدارس میں چلے گئے اور میں مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم مکمل کرکے دارالمصنفین آ گیا، اس وقت مولانا عبیداللہ رحمانی صاحب مشکوٰۃ المصابیح کی شرح مرعاۃ المفاتیح لکھ رہے تھے، اسی دینی علمی اور تحقیقی کام کے سلسلے میں وہ کتابیں دیکھنے کے لیے اپنے وطن مبارکپور سے کبھی کبھی دارالمصنفین بھی تشریف لاتے تھے، یہیں جب ان سے ملاقات ہوئی تو محسوس ہوا کہ میں ایک باوقار مگر نہایت خلیق و متواضع عالم و محدث اور بڑے متبع سنت اور صاحب ورع و تقویٰ بزرگ سے مل رہا ہوں۔

مولانا بڑے متبحر عالم تھے، وہ دینی علوم میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے لیکن ان کا خاص میدان فن حدیث تھا جس کے مسائل و مباحث کی تحقیق و تدقیق میں ان کی عمر گزری تھی۔ مجھے بھی صاحب تصانیف محدثین پر کام کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ان سے استفادہ کا موقع ملا، مولانا شمس الحق ڈیانویؒ کی تصنیف عون المعبود شرح سنن ابی داؤد کے بارے میں بعض تحقیق طلب امور کے متعلق خاص طور پر ان سے رہنمائی کا طالب ہوا جس کا ذکر میں نے اپنے ایک مضمون "عون المعبود کا مصنف کون ہے" میں کیا ہے۔

مبارکپور میں میرے لیے کشش کا باعث مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی ذات گرامی بھی ہے، جن کی دعوت پر اکثر وہاں جانے کا اتفاق ہوتا ہے، اس کی وجہ سے بھی حضرت شیخ الحدیث

کی خدمت میں حاضری اور استفادہ کا موقع مل جاتا تھا۔

مولانا عبید اللہ صاحب نے فارسی کے علاوہ متوسطات تک کی عربی کتابیں بھی اپنے والد بزرگوار ہی سے پڑھی تھیں لیکن درسیات کی تکمیل دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں کی جس سے فراغت کے بعد ہی ان کی ذہانت و استعداد دیکھ کر شیخ عطاء الرحمن صاحب مہتمم نے ان کو دارالحدیث رحمانیہ میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور کر دیا اور جب تک یہ مدرسہ رہا وہ اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، کئی برس بعد بنارس میں اسی کا ثمنی جامعہ سلفیہ قائم ہوا تو وہ اس کی سرپرستی فرماتے رہے۔

درس و تدریس کے علاوہ تحریر و تصنیف سے بھی انہیں سروکار رہا، اردو اور عربی میں لکھنے پر پوری قدرت تھی، ان کی اردو تحریریں شستہ، پُرمغز اور حشو و زوائد سے پاک ہیں، گو اردو میں کم لکھتے تھے مگر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے وسیع علم و مطالعہ، دقتِ نظر اور استحضار کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا عبد الرحمن مبارکپوریؒ نے آخر عمر میں ضعفِ بصر کی وجہ سے تحفۃ الاحوذی کی تکمیل کے لیے مولانا عبید اللہ صاحب کو اپنا معاون بنا لیا تھا جس سے ان کو بڑا فائدہ ہوا اور ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور غالباً اسی بنا پر انہیں بھی مشکوٰۃ المصابیح کی شرح لکھنے کا خیال ہوا ہو گا جو ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ شرح پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکی جس میں بڑا دخل ان کی خرابی صحت، پیری اور دوسرے عوارض کو تھا۔ ہندوستان میں مشکوٰۃ المصابیح کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا اور یہاں کے اہل علم نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا، اردو فارسی اور عربی میں اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، مرعاۃ المفاتیح اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر بہت ممتاز اور قدما کی شرحوں کے ہم پایہ ہے۔

وہ علم و فضل سے زیادہ عمل، اخلاص، للّٰہیت، بے نفسی، قناعت، زہد و تقویٰ اور سیرت و کردار کی پختگی میں فائق و برتر تھے، بڑی پاکیزہ، محتاط، سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، اپنی عسرت اور پریشانی کسی کو محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ عجز و انکسار، خاکساری و فروتنی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ انھوں نے اپنا کام شاید ہی کسی سے لیا ہو لیکن دوسروں کی خدمت کرنے میں ان کو لطف ملتا تھا، اپنے مہمانوں کی تکریم و مدارات میں بچھے رہتے تھے، خوردوں سے بھی جس انداز سے پیش آتے تھے اس سے انہیں بڑی شرمندگی ہوتی تھی۔

اپنے مسلک میں پختگی کے باوجود دوسرے مسلک کے لوگوں کو برا بھلا نہ کہتے بلکہ نیک ذی علم اصحاب کے ادب و احترام کا پورا لحاظ رکھتے تھے، دینی حمیت کے باوجود غصہ، برہمی اور جھنجھلاہٹ کا اظہار نہ کرتے لیکن نرمی اور لطافت سے صحیح اور سچی بات کہدیتے، نہ کسی کو ان کی زبان اور ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہوگی اور نہ کسی کی شکایت اور غیبت سے انکی زبان آلودہ ہوئی ہوگی، عصبیت اور فرقہ بندی کے اس دور میں ایسے معتدل اور پختہ سیرت کے اشخاص مشکل سے ملیں گے۔

شرم و حیا کا یہ حال تھا کہ ع برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب۔ سخت گرمی اور خلوت میں بھی ساتر لباس زیب تن رہتا، بڑے نظافت پسند تھے، لباس سادہ مگر صاف پہنتے اور اپنے مکان کو بھی بہت صاف ستھرا رکھتے۔

وہ طبعاً نہایت خاموش اور گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے، نہ بلا ضرورت بات کرتے اور نہ فضول کاموں میں وقت ضایع کرتے، جلسے جلوس، ہنگاموں اور ہر قسم کی سرگرمیوں سے الگ رہ کر صرف علمی کاموں میں مشغول رہتے، نام و نمود کا شائبہ بھی ان میں نہ تھا، خود نمائی ظاہرداری اور تکلف و تصنع سے نفرت تھی، کبھی اپنے کو نمایاں اور ممتاز کرنے کا خیال بھی دل میں

نہ آیا ہوگا، اسی لیے عام لوگوں کو ان کے نام سے بھی واقفیت نہیں تھی مگر ہندوستان ہی نہیں اسلامی ملکوں کے خواص کو بھی ان کے علمی کمالات کا اعتراف تھا، ان کے وطن کے ہر فرقہ و مذہب کے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جنازے میں آدمیوں کا جم غفیر تھا، دوسرے ضلعوں اور صوبوں کے لوگ بھی آگئے تھے۔

اس قحط الرجال میں ایسے عالم باعمل کا اُٹھ جانا نہ صرف جمعیۃ اہلحدیث بلکہ ملت اسلامیہ کا خسارہ ہے، گو وہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ فن حدیث کی مشکلات میں اب کون رہنمائی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ علم دین اور حدیث نبویؐ کے اس خادم اور اپنے مقبول بندے کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین!!

ڈاکٹر غلام محمد

مشہور صاحب علم و قلم پروفیسر محمد اسلم پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے گرامی نامہ سے مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب کے انتقال کی اندوہ ناک خبر ملی، ان کا وطن حیدرآباد دکن تھا، وہ جامعہ عثمانیہ کے گریجویٹ تھے، تقسیم کے بعد کراچی تشریف لے گئے اور بالآخر اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رہنمائی میں تصوف و سلوک کے مراحل طے کیے اور خود علم و عرفان اور شریعت و طریقت کے جامع ہوگئے، اپنے مرشد عالی مقام سے ان کو والہانہ تعلق تھا، اس کا ثبوت ان کی تصنیف "تذکرہ سلیمانؒ" اور وہ مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً حضرت سید صاحبؒ پر وہ لکھتے رہے ہیں، ان سے فرط تعلق کی بنا پر انہیں دارالمصنفین سے بھی عشق تھا اور وہ برابر اس کی بقا و تحفظ کے لیے دعا فرماتے تھے، انہی کی کوشش سے

ان کے ایک مسترشد جناب محمد یحییٰ صاحب نے پاکستان میں معارف کی ترسیل کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

راقم کو ان سے ملاقات کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن گذشتہ دس بارہ سال سے مراسلت کا سلسلہ قائم تھا۔ جس کا باعث بھی حضرت سید صاحب کی ذات گرامی ہوئی۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر راقم نے بہار اردو اکاڈمی کے سیمینار کے لیے سیرۃ النبیؐ جلد سوم پر ایک مضمون لکھا، اس کے تتمہ میں اس جلد پر کیے گئے اعتراضات کے جواب میں خاص طور پر معجزات کے تعلق سے ایک مشہور عالم و محدث کی ایرادات زیر بحث آئی تھیں، اس پر فرنگی محل کے ایک بزرگ کو کسی قدر ناگواری ہوئی تھی مگر مولانا غلام محمد صاحب نے اسے ملاحظہ فرمانے کے بعد مجھے پہلی مرتبہ خط لکھا کہ "آپ نے اہل ندوہ اور حضرت سیدی و مولائی کے وابستگان دامن کی جانب سے فرض کفایہ ادا کر دیا"۔ میں نے معارف میں مولانا آزاد اور ربوبیت الٰہی اور بابری مسجد کے انہدام پر جو شذرات لکھے ان کی تحسین فرما کر بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔

مرحوم کا علم و مطالعہ وسیع تھا، فلسفہ و تصوف کے علاوہ تفسیر و قرآنیات پر بھی اچھی نظر تھی، اردو بہت سلیس لکھتے اور تحریر ما قل و ما دل ہوتی، سچے عالم کی طرح تشدد و تعصب کے اعتراف میں انہیں تامل اور تنقید و اعتراض پر کبیدگی نہیں ہوتی تھی، اپریل ۹۳ء کے معارف میں ان کی کتاب "رموز سورۂ یوسفؑ" کے تبصرے میں اس کی بعض فروگذاشتوں کی جانب توجہ دلائی تو پہلے مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء نے اپنے گرامی نامہ میں اس کی تحسین فرمائی پھر خود صاحب تصنیف نے اپنی فروگذاشتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اظہار تشکر فرمایا۔

پروفیسر محمد اسلم کا گرامی نامہ قدرے طویل ہے اس لیے اس کے بعض اقتباسات ہی کی نقل پر اکتفا کیا جاتا ہے :-

جناب من زید مجدکم سلام مسنون

... ۱۸ر دسمبر کو ہم پر قیامت گزر گئی۔ بزم اشرفؒ کا ایک روشن چراغ بجھ گیا یعنی ہمارے مخدوم و محترم ڈاکٹر غلام محمد صاحب اس روز علی الصبح کراچی میں امراض قلب کے ہسپتال میں انتقال فرما گئے، اسی شام ہزاروں عقیدتمندوں نے ان کا جسد خاکی پنجابی سوداگران کے قبرستان مسمّٰی بہ شفیق پورہ میں سپرد خاک کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ٥

گذشتہ ماہ جولائی میں کراچی میں ان کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان دنوں ڈاکٹر سید سلمان ندوی کراچی تشریف لائے ہوئے تھے، انھوں نے چند احباب کو رات کے کھانے پر مدعو کیا، ان میں میرے علاوہ قبلہ ڈاکٹر غلام محمد مرحوم بھی تھے، تین گھنٹے خوب محفل جمی اسکے بعد سلمان صاحب ہمیں اپنی قیام گاہوں تک پہنچانے گئے۔ دو تین روز کے بعد ڈاکٹر صاحب نے عشاء سے قبل مجھے اپنے دولت کدہ پر بلایا، نو بجے روہیل کھنڈ سوسایٹی لے گئے۔ ایک مکان کی چھت پر فرش بچھا ہوا تھا۔ اندازاً تیس پینتیس افراد وہاں موجود تھے، ڈاکٹر صاحب نے نماز کے بعد پون گھنٹے تک ذکر کرایا۔ اس کے بعد کھانے کا اہتمام تھا، میں انکے برابر بیٹھا ہوا تھا، موصوف اپنے دست مبارک سے میری پلیٹ میں بریانی ڈالتے رہے، کھانے کئی قسم کے تھے لیکن انھوں نے مجھے صرف بریانی ہی کھلائی۔ کھانے سے فراغت کے بعد دعا ہوئی اور مرحوم مجھے میری قیام گاہ پر چھوڑنے آئے۔

میں نے اپنی کتاب "سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کا ذوق موسیقی" ڈرتے ڈرتے ان کی خدمت اقدس میں ارسال کی، انھوں نے کتاب کے مندرجات کی دل کھول کر تعریف

فرمائی اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ ایک زمانے میں انھیں بھی اس موضوع سے دلچسپی رہی ہے"

ڈاکٹر صاحب اپنے گھر میں ہومیو پیتھک مطب چلاتے تھے۔ میں نے ایک روز عرض کیا کہ اس میں کیا راز ہے کہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے کئی خلفاء اور آگے ان کے خلفاء اور مریدین ہومیو پیتھ ہیں۔ کراچی میں حضرت عبدالحیٔ عارفی بڑے کامیاب ہومیو پیتھ ڈاکٹر تھے۔ مجذوب بھی غالباً اس فن سے واقف تھے۔ کیا حضرت تھانوی نے بھی اس طریقۂ علاج سے استفادہ کیا ہے۔ فرمانے لگے کہ ہاں ایک بار جب حضرت تھانوی دوا لینے لگے تو حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ اس میں نشہ آور اجزا بھی ملائے جاتے ہیں۔ اس پر فرمایا "میاں! ہم اتنے پرہیزگار کہاں ہیں؟" یہ کہتے ہوئے انھوں نے وہ پڑیا منہ میں انڈیل لی۔ خود سید سلیمان ندوی مرحوم کراچی میں حضرت عبدالحیٔ عارفی کے زیر علاج رہے تھے۔

ڈاکٹر غلام محمد صاحب چھوٹوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ خط کے لفافے پر مرحوم نام کے ساتھ جو القاب لکھتے انہیں پڑھ کر مجھے شرم آجاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب سول سیکریٹریٹ کراچی کی مسجد میں خطبۂ جمعہ بھی ارشاد فرماتے تھے۔ اکثر پڑھے لکھے لوگ وہیں نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ افسوس کہ میں کراچی جاکر بھی کبھی انکا خطبہ نہ سن سکا۔ والسلام

غم زدہ : محمد اسلم

مولانا کے مسترشد خاص جناب محمد یحییٰ صاحب کی حالت اس حادثہ کی وجہ سے اس قابل نہیں تھی کہ فوراً خط لکھتے۔ یکم جنوری کا لکھا ہوا ان کا والا نامہ ۱۵ جنوری کو ملا، وہ علالت و وفات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

"کیا عرض کروں؟ ایک قیامت گزر گئی ... اس احقر کا تعلق حضرت اقدس سے اٹھارہ برس سے تھا، حضرت والا کی جدائی کے صدمہ کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ ہر آنے والا دن پہلے سے زیادہ غم اور دکھ دے رہا ہے ... میرے درد دل کو آپ یقیناً محسوس فرمائیں گے کیونکہ آپ سے تعارف کا ذریعہ بھی تو شیخ محترم ہی تھے، دفتر پابندی سے نہیں آ رہا تھا، آج ذرا ہمت ہوئی ہے تو آپ کو خط لکھ رہا ہوں، آپ سے درخواست ہے کہ حضرت اقدس کے لیے خصوصی دعا فرمائیں آمین فقط محمد یحییٰ"

اللہ تعالیٰ اپنے اس صاحب علم و معرفت بندے کو جنت الفردوس نصیب کرے اور اعزہ و متوسلین کے غم کو زائل فرمائے آمین۔

مولانا شاہ عبدالرحیم مجددیؒ

دینی حلقوں میں مولانا عبدالرحیم مجددی صاحب کی وفات کی خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی جائیگی، انکے جد امجد حضرت مولانا شاہ ہدایت علی صاحبؒ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک بڑے شیخ طریقت تھے، جنکی ذات سے جے پور (راجستھان) میں مدتوں رشد و ہدایت کا چراغ روشن رہا، وہ صاحب تصانیف بھی تھے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا اردو ترجمہ "درالثانی" کے نام سے کیا تھا، انہی کے سایۂ عاطفت میں مولانا عبدالرحیم صاحب کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ مولانا مفتی محمد رضا انصاری مرحوم اور دوسرے علمائے فرنگی محل سے درسیات کی تکمیل کی، سلوک و تصوف کی منزلیں اپنے جد بزرگوار کی رہنمائی میں طے کر کے خود بھی شیخ کامل ہوئے اور جب انکے انتقال کے بعد انکی مسند ارشاد پر متمکن ہوئے تو انکا فیض بہت وسیع اور عام ہو گیا۔

مولانا کی تعلیم و تربیت قدیم طرز پر ہوئی تھی اور وہ ایک صاحب ورع و تقویٰ بزرگ اور شریعت و طریقت کے جامع شخص تھے مگر ان میں اجتہاد و اختراع کی قابلیت بھی تھی اور وہ زمانے

کے حالات و مسائل اور وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں سے بھی واقف تھے، علاوہ ازیں وہ مخلص اور بڑے عملی شخص تھے، انھوں نے اپنے دادا کے کاموں کو وسعت و ترقی بھی دی اور ان میں اضافہ بھی کیا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ جامعۃ الہدایۃ کا قیام ہے، جس کو وہ قدیم و جدید تعلیم اور عصری علوم سائنس و ٹکنالوجی کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے انھوں نے اپنی اولاد کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کیا۔

دسمبر ۱۹۸۵ء میں مولانا عبدالرحیم صاحب نے جامعۃ الہدایۃ کے افتتاح کی تقریب بڑے اہتمام سے منائی تھی جس کا دعوتنامہ ازراہ کرم مجھے بھی بھیجا تھا، اس موقع پر میں نے جو مقالہ پڑھا تھا اس کی تحسین فرماکر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ ابھی اکتوبر ۱۹۹۳ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس بھی وہیں ہوا جس کا دعوت نامہ بورڈ اور جامعہ دونوں کیطرف سے جب مجھے ملا تو بہت خوش ہوا کہ اسی بہانے حضرت کی زیارت اور جامعہ کو دوبارہ دیکھنے کا موقع ملے گا مگر عین وقت پر طبیعت خراب ہو جانے سے اجلاس کی شرکت سے محروم رہا جس کا بہت افسوس ہوا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں مولانا بھی علیل ہو گئے، درمیان میں کسی قدر افاقہ بھی ہوا مگر ۵ جنوری کو صبح نو بجے بمبئی ہاسپٹل میں رشد و ہدایت کا یہ چراغ ہمیشہ کےلیے بجھ گیا، اور مولانا ہدایت علی صاحب کی مسند اجڑ گئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور عزیزوں اور عقیدتمندوں کو صبر و قرار بخشے۔

مولانا کی زندگی ہی میں ان کی پیری، علالت اور ضعف کی وجہ سے ان کے صاحبزادگان مولانا فضل الرحیم اور مولانا ضیاء الرحیم جامعہ کے کام انجام دینے لگے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہمت و قوت اور اخلاص و استقلال عطا فرمائے تاکہ انکے والد مرحوم کا لگایا ہوا یہ باغ سرسبز و شاداب رہے۔

"ض"

مولانا ابوالکلام آزاد، ایک مطالعہ از جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گردپوش، صفحات ۲۴۸،

قیمت ۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ اسلوب، پوسٹ بکس ۲۱۱۹، کراچی ۱۸۔

کئی مہینے پہلے پاکستان سے جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری نے چند جدید مطبوعات کا ایک مجموعہ معارف کے لیے ارسال کیا، ان میں چار کتابوں کا تعلق مولانا ابوالکلام آزاد سے ہے، ایک انڈیا ونس فریڈم کا اردو ترجمہ ہے اور تین مولانا مرحوم کے سوانح سے متعلق ہیں، یہ سب ان کے صد سالہ یوم پیدایش کے موقع پر پاکستان کی آزاد نیشنل کمیٹی کی جانب سے شایع ہوئی تھیں، زیر نظر کتاب میں فاضل مرتب نے مولانا کی شخصیت، مذہب، سیاست، خطابت، فلسفہ، ادب، صحافت اور تعلیم کے ابواب قائم کرکے اہم اہل قلم کی منتخب مطبوعہ تحریروں کو یکجا کیا ہے اور اس طرح مولانا آزاد کی ہشت پہل شخصیت کے مختلف دلکش رنگوں اور عکسوں کا حسن ایک نظر میں سامنے آجاتا ہے، ۲۳ مضامین کے اس مجموعہ میں خود مرتب کے قلم سے دو مضامین مولانا آزاد کی خطوط نگاری اور شاعری پر ہیں، مولانا آزاد سے ان کا غیر معمولی تعلق اور عقیدت معروف ہے اور یہ ان کی ان تحریروں میں بھی نمایاں ہے مثلاً غبار خاطر کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "... اردو کی پوری تاریخ تصنیف و تالیف میں کوئی کتاب ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جسے غبار خاطر جیسی مقبولیت حاصل ہوئی ہو"۔ کاروان خیال کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ خطوط ادبی، تاریخی اور صدیقین کی محبت اور اخلاص کی ایک

ایسی بے مثال کہانی ہے جو شاید اب کبھی دنیا میں نہ دہرائی جائے گی۔ غبار خاطر کے متعلق ان کا یہ خیال بجا ہے کہ شروع اور آخر سے چند الفاظ نکال دیئے جائیں تو ان پر مکاتیب کا گمان بھی نہیں ہوتا" ان کے خیال میں اس کی حیثیت مجموعہ مکاتیب کی کم اور تحریرات کی زیادہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد از جناب مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۸، قیمت ۲۵ روپے، ناشر: ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان کراچی ۔ ۱۴۔

اس کتاب میں فاضل مرتب نے برہان کے مدیر شہیر مولانا اکبرآبادی مرحوم کی ان تمام تحریروں کو یکجا کر دیا ہے جو مولانا آزاد سے متعلق ہیں ان میں وہ مفصل خطبہ بھی شامل ہے جو انھوں نے انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ایک مجلس میں پیش کیا تھا، برہان اور دیگر جرائد میں جو تحریریں وقتاً فوقتاً مولانا اکبرآبادی کے قلم سے نکلیں ان کو اور مولانا آزاد کی تصنیفات اور ابوالکلامی لٹریچر پر ان کے تبصروں کو بھی جمع کر دیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد از جناب ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۱۲، قیمت درج نہیں، پتہ، مکتبہ شاہد، علی گڑھ کالونی، کراچی ۱۴۔

اس کتاب کے مولف ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے اس لحاظ سے وہ اس کتاب کی اشاعت (۱۹۸۶ء) کے وقت مولانا آزاد کے سب سے معمر و بزرگ معتقد تھے، انھوں نے اپنی دید و شنید اور احساسات و تاثرات کو بڑے پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے، لفظ لفظ سے

ان کی عقیدت مندی نمایاں ہے، مولانا آزاد اور پاکستان کے متعلق بھی ان کی رائے متوازن ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ "کسی عالم دین نے جس کا تعلق جمعیۃ العلما سے ہو، نیشنلسٹ ہو، کانگریسی ہو یا مولانا آزاد کا عقیدت مند ہو، تقسیم ملک کے فیصلہ کے بعد پاکستان کی مخالفت کی نہ اسے نقصان پہنچایا، اس کے برعکس پاکستان کو سب سے زیادہ نقصان ان لوگوں نے پہونچایا جو تحریک پاکستان میں اعلیٰ مناصب رکھتے تھے وہی اقتدار کی جنگ میں مصروف ہوئے" مولانا آزاد کی تحریروں اور خطبات کے منتخب اقتباسات کے علاوہ اس میں ان کے چار خطبات بھی دیے گئے ہیں جن میں ۱۹۴۷ء کی جامع مسجد کی اہم تقریر کے علاوہ ۱۹۵۴ء میں پارلیمنٹ میں ان کی وہ یادگار تاریخی تقریر بھی شامل ہے جو شبلی اکیڈمی کو دی جانے والی امداد کے بارے میں پرشوتم داس ٹنڈن کے اعتراض کے جواب میں کی گئی تھی۔

میزان اقبال (فارسی) از جناب پروفیسر محمد منور، ترجمہ ڈاکٹر شہین کامران مقدم صفیاری، متوسط تقطیع بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۲۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور، پاکستان۔

کئی سال پہلے علامہ اقبال کے کلام و پیام پر یہ قابل قدر کتاب شایع ہوئی تھی، اب ڈاکٹر شہین کامران صفیاری نے اس کو فارسی قالب عطا کیا ہے، ترجمہ کے ساتھ ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں، علامہ اقبال کے کلام و فلسفہ کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے ساتھ مطالعات اقبال کو بھی مختلف زبانوں میں عام کرنے کی یہ کوشش مفید اور قابل تعریف ہے۔

ع۔ ص۔

جلد ۱۵۳ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۴ء عدد ۳

مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

گذشتہ ماہ انہی صفحات میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ گو مسلمانوں پر ظلم و زیادتی ہو رہی ہے لیکن اسکی شکایت و احتجاج کو شیوہ بنا لینے سے انکا کچھ بھلا ہونے والا نہیں ہے بلکہ اس سے الٹا نقصان ہی پہونچے گا۔ اسلیے اس میں قوت و توانائی اور قابلیت و صلاحیت صرف کرنا سعی لا حاصل اور وقت عزیز کو ضایع کرنا ہے۔ پیچیدہ اور خراب حالات کی اصلاح حکمت، تدبر، سوجھ بوجھ اور دور اندیشی سے ہو سکتی ہے اور مسلمانوں کو ہر حال میں خدا کی ذات سے یہ امید رکھنی چاہیے کہ وہ حالات کو تبدیل کر دینے پر قادر ہے، اس نے دنیا کو حق و غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہ ظلم و ناانصافی اور شر و فساد کو پسند نہیں کرتا، جب بھی طغیان و عدوان حد سے بڑھ جاتا ہے تو کوئی موسیٰ بڑھ کر طلسم سامری توڑ دیتا ہے۔ جس طرح رات کے اندھیرے کے بعد دن کا اجالا آتا ہے، اسی طرح بد تر حالات کے بعد بہتر حالات رونما ہوتے ہیں، سختیاں اور پریشانیاں جھیلنے کے بعد آسائشیں اور آسانیاں میسر ہوتی ہیں۔ دار و رسن سے گزرنے کے بعد ہی تخت و تاج نصیب ہوتا ہے۔

قوموں کی زندگی میں ان کے تشخص کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، وہ اپنی نسلوں کے فنا ہونے سے نہیں بلکہ اپنے قومی و ملی تشخص کے باقی نہ رہ جانے سے ختم ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کو انگریزوں کے زمانے میں بھی اپنے تشخص و امتیاز کے ضیاع و عدم تحفظ کا شکوہ رہا اور اب قومی حکومت کے دور میں بھی اسی کا گلہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود انھوں نے اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھنے اور اس پر اپنی آیندہ نسلوں کو قائم رکھنے کے لیے کیا جد و جہد کی؟ کیا وہ خود بھی اس کی طرف سے غافل اور بے پروا نہیں رہے؟ کیا انھوں نے کبھی اس پر سنجیدگی سے توجہ دی کہ انکی نسلیں انکے مذہبی عقائد، تہذیبی روایات اور صالح اقدار کو اپنے اندر جذب کر لیں جن سے انکی شناخت برقرار رہے، کیا اس کے لیے کوئی سرگرمی دکھائی گئی کہ مسلمان اپنے تشخص اور پہچان کو برباد کرنے والے نئے حالات اور نئے چیلنج کا مقابلہ خود بھی کریں اور اپنی نسلوں کو بھی اس کے لیے تیار کریں۔ کیا زور خطابت دکھانے، فلک شگاف

نعرے لگانے اور بلند بانگ دعوے کرنے سے مسلمانوں کی شناخت باقی رکھی جاسکتی ہے؟

عقائد و ایمانیات کی صحت و درستگی، عبادات و شرائع کی پابندی و بجاآوری، سیرت و اخلاق کی بلندی و پختگی یعنی دین اور معاملات کی سچائی اور کھرا پن ہی مسلمانوں کی خاص شناخت اور اصلی پہچان تھی جن کو وہ گنوا بیٹھے ہیں، اس میں اغیار کی جارحیت اور چیرہ دستی کا کوئی دخل نہیں ہے، انھوں نے خود خدا پرستی اور راسخ العقیدگی کو چھوڑ کر جاہلانہ عقیدے، فاسد خیالات، مشرکانہ توہمات اور غیر شرعی اعمال و رسوم اختیار کر لیے ہیں، اللہ سے تعلق کے بجائے طاغوت سے پینگ بڑھالی ہے، خدائے واحد کو چھوڑ کر عقیدت و نیاز کے سینکڑوں آستانے بنالیے ہیں، شب و روز پارسی کا دعویٰ کرنے والوں کا حال بنی اسرائیل کے ان ناخلف لوگوں جیسا ہو گیا ہے جن کے متعلق قرآن مجید نے کہا ہے: فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَوٰةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ ۖ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (مریم۔ ۱۹: ۵۹) مسلمان اچھے اوصاف، پاکیزہ کردار، ایمان داری، راست بازی، سچائی، امانت، دیانت اور نیک چلنی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور ہر قسم کی برائیاں اور عیوب ان میں رچ بس گئے ہیں، جب جھوٹ، فریب، مکاری، عہد شکنی، بد دیانتی، اکل اموال بالباطل، مداہنت فی الدین، ضمیر فروشی اور دورخا پن قائدین کا وتیرہ بن گیا ہو تو عوام کو اس کے لیے کیسے ملامت کی جاسکتی ہے۔

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربا	فلاتلم الاولاد فیہ علی الرقص

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ خود ان کی وجہ سے انکے اندر جو کمی پیدا ہو گئی ہے، وہ کس طرح دور ہو سکتی ہے، ان کی بے احتیاطی سے ان کی قومی و ملی زندگی میں جو نقائص اور خرابیاں سرایت کر گئی ہیں ان سے وہ کیسے نجات حاصل کر سکتے ہیں، ان کی غفلت و بے حسی کے نتیجے میں ان کے جو امتیازات و تشخصات ختم ہو گئے ہیں، ان کی بازیابی کیونکر ممکن ہے، انھوں نے خود اپنے دین و مذہب میں جو خرافات داخل کر لیے ہیں ان کی اصلاح کا راستہ کیا ہے؟ ان کے ہاتھوں ان کی تہذیب، انکا کلچر اور ان کا پرسنل لا جو مسخ ہو گیا ہے وہ اپنی اصل

ہیئت میں کیسے آسکتا ہے، انھوں نے خود اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو اسلامی تعلیمات سے جو دور کر لیا ہے وہ کس طرح ان کے مطابق ہو سکتے ہیں، ان چیزوں کا بقا و تحفظ دستوری ضمانت پر موقوف نہیں ہے، ان پر خود انہی کو سنجیدگی سے توجہ دینا اور فکرمند ہونا ہوگا۔ رہے ان کے وہ حقوق و امتیازات جو دستور کی ضمانت کے باوجود پامال ہو رہے ہیں تو وہ بھی جوشش تقریر اور شکوہ و احتجاج سے انہیں نہیں ملیں گے بلکہ انکے لیے منظم، پُرامن اور آئینی جدوجہد کرنی ہوگی۔

عالی جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے مختلف مفید اقدامات کیے ہیں، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی بھی اسی کی کڑی ہے، جس کا اہتمام و انصرام جناب سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سپرد ہے، حال ہی میں سوسایٹی نے دینی مدارس و مکاتب کے سروے کا منصوبہ بنایا ہے، اس اہم اور ضروری کام کی تکمیل کے لیے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے دینی مدارس و مکاتب کے مکمل پتے ہمدرد ایجوکیشن سوسایٹی۔ تعلیم آباد۔ سنگم وہار، نئی دہلی 110062 کو مطلوب ہیں۔

افسوس ہے کہ ۲۴ رمضان المبارک کو علامہ شبلیؒ کے حقیقی نواسے حافظ محمد عرفان صاحب وفات پاگئے، ان کا وطن بندول تھا مگر قیام اعظم گڈھ میں تھا وہ دارالمصنفین برابر آتے اور جمعہ کی نماز بھی یہیں پڑھتے، انہیں قرآن مجید بہت اچھا یاد تھا اور ہر سال تراویح میں اسے سناتے اس سال بھی ضعف و علالت کے باوجود روزے چھوڑنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ تھے، رمضان کے مقدس مہینہ میں وفات ان کے حسن خاتمہ کا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ پس ماندگان کو صبر و قرار عطا کرے۔ آمین!

مقالات

ہندو مسلم تعلقات
چند بنیادی حقیقتیں

از ڈاکٹر محمد خلیل عباس صدیقی۔ کلکتہ

(۲)

سماجیاتی حقائق ہندوستان کے مختلف خطوں جیسے شمالی ہند، جنوبی ہند، مشرقی ہند اور مغربی ہند کے لوگوں خصوصاً قبیلوں اور ذاتوں کی مردم شماری کے اعداد و شمار پر مبنی کئی جلدیں گذشتہ صدی کے آخر سے لے کر ۱۹۱۶ء تک شایع ہوئی ہیں۔ ان میں مندرج قبیلوں، ذاتوں اور برادریوں کی فہرست کے ساتھ ان کا مختصر پس منظر بھی درج ہے۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نسلی پس منظر کے علاوہ ان کے آبائی پیشوں، معیشت اور اقتصادیات کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتے ہیں۔ ان ذہنگوں (GLOSSAR IES) کی ترتیب مندرجہ ذیل اصحاب نے کی ہے۔

ایلیٹ (۱۸۴۴ء) ایبٹسن (۱۸۸۳ء) نسفیلڈ (۱۸۸۵ء) رزلے (۱۸۹۲ء) کروک (۱۸۹۴ء) تھرسٹن (۱۹۰۹ء) اور رسل اور ہیرالال (۱۹۱۶ء)۔ ان میں بہت ساری ذاتوں کے ہندو اور مسلمان دو متوازی گروہ ہیں۔ ان جلدوں کی اشاعت کے بعد ہٹن (۱۹۴۶ء) اسمتھ (۱۹۴۷ء) بوس (۱۹۵۱ء) اور سرنیواس (۱۹۶۸ء) نے دونوں مذہبی گروہوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی تنظیموں کے درمیان مماثلت اور

ان کی یکساں خصوصیات کی نشاندہی کی اور ساتھ ہی ان کی امتیازی خصوصیتوں پر بھی روشنی ڈالی۔
کچھ دوسرے سماجیات دان جیسے غوث انصاری (۱۹۶۱ء ۱۹۵۶ء) گپتا (۱۹۵۶ء)
زرینہ احمد (۱۹۶۲ء) فریڈرک مارتھ (۱۹۶۰ء) مصرا (۱۹۶۳ء) صدیقی (۱۹۷۹ء) نے
مسلم سماجی تنظیم اور سماجی ماحول سے اس کے تعلقات کا مطالعہ سنجیدگی سے کیا۔ ان لوگوں نے
بڑے پیمانے پر فیلڈ ورک اور شماریاتی موہوب کے ذریعہ مسلم معاشرے کی ہیئت ساخت
اور تنظیم کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس سے ہندوستانی مسلمانوں کی ہندوستانیت بدرجۂ اتم ظاہر
ہوتی ہے مسلم معاشرے اور ہندوستانی معاشرے میں ان کی ساخت اور دیگر خصوصیات
کی بنا پر بُعدالمشرقین نہیں ہے بلکہ ہر تہذیب کی امتیازی خصوصیات کے باوجود ان میں
بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ علاوہ ازیں ان دونوں فرقوں کے درمیان معاشی اور پیشہ
ورانہ دائرۂ کار میں بھی گہرا تعلق اور تعامل ہے۔ لیکن نوآبادیاتی عہد کے دانشوروں نے
دونوں فرقوں کے درمیان لسانی، نسلی اور تہذیبی رشتوں کو نظرانداز کیا ہے۔ یہاں تفصیل
کی گنجایش نہیں ہے اس لیے ہم بہت اختصار سے ان بنیادی حقیقتوں کی طرف اشارہ
کریں گے۔

۱۔ مسلمانوں کی آبادی اور اس کا پھیلاؤ: یہ خیال بے بنیاد نہیں ہے کہ ہندوستان
میں مسلمانوں کی آبادی اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کہ مردم شماری کی رپورٹوں میں
دکھائی گئی ہے۔ پھر بھی اگر چہ انہی اعداد و شمار پر انحصار کریں تو ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے
مطابق ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی آٹھ کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ اس طرح مسلمان
ہندوستان کی کل آبادی کا کم و بیش ۱۲ فیصد ہیں جبکہ ہندو ۸۲،۶۴ فیصد ہیں۔
دوسری اہم اقلیتوں میں عیسائی ۲٫۴۳ فیصد، سکھ ۱٫۹۶ فیصد، بودھ ۰٫۷۱ فیصد

اور جین ۴۸ء۰ فیصد ہیں۔

مسلمانوں کی آبادی ملک کی سب ہی ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے اور ملک کے طول و عرض، دیہی، شہری حتیٰ کہ آدی باسی قبائل کے علاقوں میں مسلمانوں کے پھیلاؤ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک میں ان کی جڑیں بہت گہری ہیں، ان کا یہ تنوع ملک کے گوناگوں اقسام کے لوگوں سے ان کے گہرے رشتہ کا پتہ دیتا ہے۔

برطانوی عہد اور اسکے بعد کے بھی بیشتر مورخین نے مسلمانوں کے اس تنوع کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ انہیں ترک مسلم نسل MOHAMMADAN RACE وغیرہ جیسے القاب سے نوازا اور انہیں یکرنگ گروہ تصور کیا۔ چنانچہ ان کے علاقائی، لسانی، نسلی، اور پیشوں کے پس منظر جو دراصل سرزمین ہند سے ان کے مضبوط رشتے اور گہرے تعلق کی طرف نشاندہی کرتے ہیں ان دانشوروں کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ بعض مورخین نے تو عہد وسطیٰ کے حکمرانوں اور مسلم عوام میں امتیاز نہیں برتا۔

۲۔ لسانی رشتہ: محض سرسری نظر ڈالنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے اندر جتنی زبانیں رائج ہیں اور یہاں جو بولیاں بولی جاتی ہیں مسلمانوں کی آبادی اتنے ہی گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جنوبی ہند میں دراوڑی بولنے والے مسلمان دوسرے اہل وطن کی طرح ملیالی، تامل، تلگو، کناڑی اور کورگی زبانیں بولتے ہیں۔ مغربی بنگال، آسام اور منی پور میں مسلمانوں کی خاصی بڑی آبادی ہے اور وہ بنگلہ، آسامی اور منی پوری زبانیں بولتی ہے۔ اودھی، برج، بھوجپوری، مگدھی، میتھلی، انگیکا وغیرہ ہندوستانی بولیاں متعلقہ علاقے کے مسلمان بھی اسی طرح بولتے ہیں جس طرح ہندو۔ اترپردیش، بہار، مدھیہ پردیش، ہریانہ اور پنجاب کے شہروں کی ادبی زبانوں ہندی اور

اردو کے متعلق نوآبادیاتی شاطرانہ سیاست شروع ہوئی اور اس نے لسانی اعتبار سے یکرنگ گروہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ عام طور پر ہندوؤں نے ہندی اور مسلمانوں نے اردو کی حمایت کی اور ہندی نے رفتہ رفتہ غلبہ حاصل کر لیا۔ لیکن یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ اردو کا جنم اسی ملک کے آب و گِل میں ہوا اور اس کا وجود ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی میل جول سے عمل میں آیا جو اپنی شیرینی اور لطافت کے سبب آج بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں مقبول ہے۔

ہندوستان میں 'اسلامی یا مسلم زبان' نام کی کوئی شئے نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں اور ان کے ادب میں مسلمانوں کا حصہ کچھ کم نہیں۔ پورے برصغیر میں پشتو اور بلوچی زبانوں کے علاوہ کوئی دوسری ہندوستانی زبان کسی بھی اسلامی ملک میں نہیں بولی جاتی۔ پس ہندوستان کی کوئی بھی رائج زبان نہ خالص ہندو ہے اور نہ خالص مسلمان بلکہ تہذیب کے اس اہم عنصر میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک ہیں۔

۳۔ علاقائی نسبت : ہندوؤں کی مختلف ذاتوں کی طرح مسلمانوں کی برادریوں یا جمعیتوں کی نسبت مختلف علاقوں کے ساتھ اتنی گہری ہے کہ ان جمعیتوں یا برادریوں کی شناخت متعلقہ علاقے کے سیاق و سباق سے باہر کرنا مشکل ہے۔ مرائیکر، راؤتھر، لبئی، کیالار، کے ای، موپلا وغیرہ جنوبی ہند کے دراوڑی علاقوں میں ہی ملیں گے۔ بیدیا، ہلدار، بیلدار، بازیگر، پٹوا، نکاری وغیرہ بنگال کے ڈیلٹائی علاقوں میں ملیں گے۔ گوریا اور میدیا نام کی جمعیتیں وادیٔ برہمپتر میں اور منگن منی پور میں آباد ہیں۔ شیخاوتی، مارٹی منیہار وغیرہ راجستھان میں ملیں گے، میئو ہریانہ میں اور گوجر ہماچل پردیش میں بسے ہوئے ہیں، بوہرے میمن اور ایسے ہی متعدد گروہوں کی آبادی گجرات میں مرکوز ہے، ترڈوی،

نرلے، نہال اور گونڈ مسلمان مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش کے مخصوص علاقوں میں ہی رہتے ہیں۔ قوم پنجا بیان نام کے کھتری مسلمانوں کا تعلق مغربی اتر پردیش اور دہلی سے ہے۔ اپنے علاقوں سے باہر ان کی حیثیت آباد کاروں یا متوطنوں کی سی ہے۔ متعلقہ علاقوں کے ساتھ مسلمان برادریوں یا جمعیتوں کی ابتدا اور گہری نسبت کی یہ محض چند مثالیں ہیں اور جن علاقوں سے انکا تعلق ہے وہ ان کی شناخت اور ان کی مناسب سماجی توضیح کے لیے ناگزیر ہیں۔

ان میں سے کچھ مسلم جمعیتوں کی جڑیں اپنے اپنے علاقوں کے اندر اتنی گہری ہیں کہ وہ اپنے علاقوں سے باہر کے دوسرے مسلمانوں کو بیرونی تصور کرتے ہیں اور اپنے علاقے کے ہندوؤں کو ہم وطن اور داخلی تصور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر منی پوری مسلمان جو خود کو پنگن کہتے ہیں ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ آسام اور بنگال کے مسلمانوں کو بیرونی یا "میانگ" کہتے ہیں۔ منی پوری ہندوؤں پر اس اصطلاح کا اطلاق نہیں ہوتا، 'میانگ' کی روایتی اصطلاح سے مراد ایسے لوگ ہوتے ہیں جن سے ربط ضبط اور خلط ملط سے اجتناب ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح کی دوسری مثالیں بھی موجود ہیں اور ان سے کم از کم اتنا پتہ چلتا ہے کہ مذہبی فرق کے باوجود علاقائی بنیاد پر یہ لوگ مقامی لوگوں کو اپنا تصور کرتے ہیں۔

۴۔ سماجی نظام : ہندوستانی مسلمانوں کے سماجی نظام پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ملک کے مختلف حصوں میں اس کی نوعیت جدا جدا ہے۔ جنوبی ہند کے جزیرہ نما کے قریب کیرل کے کچھ حصوں لکش دیپ، آمین دیپ اور کلپینی کے جزائر میں 'امہاتی' نظام ہے۔ اسی علاقے میں ہندو نائر بھی رہتے ہیں اور ان کا سماجی نظام بھی 'امہاتی' ہے۔ رہے ملک کے

دوسرے حصے جہاں پدری نظام ہے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تھوڑے سے فرق کیساتھ رائج ہے۔

مختلف علاقوں یا ذیلی علاقوں کے چوکھٹے کے اندر مسلم معاشرہ کئی جمعیتوں یا برادریوں میں منقسم ہے اور ہر ایک کی مختلف خصوصیتیں ہیں۔ ان کا مخصوص پس منظر یا تو قبائلی ہے یا پیشہ ورانہ یا ذات پات کی نوعیت کا، یا پھر ایک جماعت جیسا۔ اب تک جو سماجیاتی مطالعے سامنے آئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ہر ایک گروہ کی سماجی تنظیم دوسرے گروہوں سے مختلف ہے۔ جن گروہوں کی سماجی تنظیم قبائلی نوعیت کی ہے ان میں ہماچل پردیش اور کشمیر کے مسلم گوجر، ہریانہ میں گوڑ گاؤں اور راجستھان سے متصل علاقوں کے میو، مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش کے تڑوی، نرلے اور نہال ہیں۔ لکش دیپ کے جزائر کے مسلمانوں اور بڑی حد تک منی پور کے مسلمانوں کی سماجی تنظیم قبائلی نوعیت کی ہے۔ ان کی سماجی تنظیم کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا معاشرہ ایسے متعدد جز قبیلوں (CLAN) پر مشتمل ہے جن کے یہاں ازدواج خارجی (EXOGAMOUS) کا رواج ہے یعنی جز قبیلوں کے اندر رشتہ ازدواج نہیں ہوتا حالانکہ تمام ازدواجی رشتے قبیلے کے اندر ہوتے ہیں۔

۵۔ علاقائی سماجی نظام اور مسلمان: تمدنی اعتبار سے ہندوستان کئی بڑے بڑے خطوں میں منقسم ہے جن کی بعض تہذیبی خصوصیتیں ان کو دوسرے علاقوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس طرح کی ایک خصوصیت ان خطوں میں آباد مختلف گروہوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت ہے۔ یہ تعلق یا تو عمودی یعنی درجہ بند ہوتا یا پھر افقی یا مساوات پر مبنی ہوتا ہے۔ ہندو اور مسلم معاشرے کے اندر گروہ بندیاں یکساں نظریاتی بنیادوں

پر نہیں ہوتیں۔ ہندوؤں میں درجہ بندی کو ان کے اعتقادات کی تائید حاصل ہے تاہم سب ہی خطوں میں اس کے ضابطے یکساں طور پر سخت نہیں۔ مسلمانوں کے معاشرے میں گروہ بندیاں طبقاتی نوعیت کی اور خالص سماجی ہوتی ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ملک کے جن خطوں میں وسیع تر معاشرے کے اندر درجہ بندی کے ضابطے سخت اور مستحکم ہیں وہاں مسلمان معاشروں کے اندر بھی اس کے آثار دکھائی دیتے ہیں لیکن جہاں یہ ضابطے زیادہ سخت نہیں وہاں مسلمان معاشروں کے اندر بھی گروہ کم وبیش مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر شمال مشرقی خطے کے اندر وادی برہمپتر میں ہندو معاشرہ درجہ بندی کی سختی سے پابند نہیں اور مسلمان معاشرے کے اندر مودیا، گوریا، حتیٰ کہ سید جیسے گروہوں میں باہم برتری اور کمتری کا احساس نہیں پایا جاتا۔ یہ گروہ آپس میں بے روک ٹوک ازدواجی رشتے بھی کرتے ہیں۔

۶۔ پیشے اور خدمات: ہندوستانی معاشرے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بیشتر روایتی پیشے موروثی ہوتے ہیں اور ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ خصوصیت موجود ہے۔ مزید براں کچھ استثنار کے باوجود سب ہی روایتی پیشے والوں کی خدمات بلا امتیاز دوسرے فرقے کے لیے بھی ہوتی ہیں۔ ان میں فرقہ وارانہ بنیاد پر تخصیص نہیں برتی جاتی یعنی ہندو پیشہ ور گروہوں کی خدمات مسلمانوں کے لیے اور مسلمان پیشہ ور گروہوں کی خدمات ہندوؤں کے لیے بھی ہوتی ہیں۔ بعض ہندو اور مسلمان پیشہ ور گروہوں کے درمیان تقسیم کار بھی ہے۔ مثال کے طور پر مغربی بنگال میں جیلے نام کی ہندو ذات کے لوگ ماہی گیری کرتے اور نکاری نام کی مسلم برادری مچھلیاں فروخت کرتی ہے۔ بعض مسلمان برادریوں کے پیشے صرف ہندوؤں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔

جیسے بنگال کی پٹوا برادری گو کہ بت پرست نہیں پھر بھی ہندوؤں کی ضرورتوں کے لیے مورتیاں بناتی ہے۔ راجستھان کی چند مسلم برادریوں جیسے ٹھیکیدار، ٹی، مارٹی، منیہار اور حجام کا انحصار روایتی طور پر راجستھانی ہندوؤں کی خدمات پر ہے اور جب مارواڑیوں نے بیوپار کے سلسلے میں شہروں کا رخ کیا تو ان کی خصوصی خدمات کے لیے مسلم برادریوں کے لوگ بھی ان کے ساتھ شہر آئے۔ کلکتہ میں بھی اس کی مثال دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ لوگ مارواڑیوں کے محلوں میں یا ان کے قریب آباد ہوئے۔ موجودہ دور میں مارواڑیوں کی طرز رہائش میں تبدیلی اور کسی حد تک فرقہ وارانہ تناؤ کے سبب اس طرح کا انحصار کم ہوتا دکھائی دیتا ہے پھر بھی یکسر ختم نہیں ہوا ہے۔

۷۔ مذہبی اعتقادات کا انسانیاتی تجزیہ: خالص انسانیاتی زاویۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو مذہبی اعتقادات پر بھی کچھ نہ کچھ مقامی رنگ نظر آئے گا۔ انسانیاتی مفروضات کی روشنی میں اگر ہم مسلمانوں کے فرقوں پر نظر ڈالیں تو یہ دلچسپ حقیقت سامنے آئے گی کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا فرقہ اپنے اعتقادات اور رسم ورواج کے ان پہلوؤں پر جو روایتی ہیں۔ چنداں نکتہ چیں نہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ نکتہ چیں ہیں وہ عددی اعتبار سے بہت ہی کم ہیں۔ اس سے شاید یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ رسم ورواج، اعتقادات اور توہمات کے بارے میں بھی مسلمانوں کی آبادی کے معتدبہ حصے نے مقامی رنگ اور مقامی رجحانات کو اپنے اندر باقی رکھنے کی کوشش کی ہے گو کہ یہ لاشعوری ہے۔

اس کے باوجود کہ ہندوستانی مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے ہندوستان کے ماضی سے پوری طرح ناتہ توڑنے کے بجائے اس کو اپنے موجودہ اعتقادات میں سمونے کی کوشش کی ہے تاہم کچھ روایتی عناصر کو جذب کرنے کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں جو بات کھل کر سامنے آئی وہ یہ ہے کہ ہندوستان کا مسلم معاشرہ اسلام کے آئیڈیل اور ہندوستان کے سماجی آئیڈیل کا نقطہ اتصال یا سنگم ہے۔ اس معاشرے کے اندر دو مختلف نظام کے متضاد منتہائے مقاصد باہم مطابقت پیدا کرتے دکھائی دیتے اور بقائے باہم کی اعلیٰ مثال پیش کرتے ہیں۔

ہندو تہذیب پر اسلام کا اثر

ہندو معاشرے پر اسلام کا اثر کچھ کم نہیں ہے۔ ابتدا میں وہ جب اس ملک میں داخل ہوا تھا تو ممکن ہے تھوڑی سی جھنجھلاہٹ کا باعث ہوا ہو لیکن جلد ہی اس نے ہندو سماج کے اندر خوش آیند تبدیلی کے عمل کو مہمیز کیا۔ گو کہ ہندومت نے مساواتی اقدار کو کبھی تسلیم نہیں کیا ہے تاہم اب پہلے کی طرح اس میں زیادہ شدت نہیں رہ گئی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے بھی ہندومت میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا اظہار اس میں کئی فرقوں کے وجود میں آنے سے ہوتا ہے۔ وشنو دھرم کا وجود ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد پندرہویں صدی عیسوی میں ہوا یہ مساوات کے اصولوں پر مبنی اور ہندوستان کے درجہ بند معاشرے کے اندر انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ سکھ دھرم کے بانی گرونانک جی مساوات کی تعلیم دیتے تھے۔ آریہ سماج کی تحریک ہندو دھرم کے احیاء اور اس میں نئی روح پھونکنے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اس نے ہندوؤں کو اسلام کے اثرات سے دور رکھنے کے لیے اس تبدیل شدہ ہندومت کو پیش کیا۔ لیکن اس کی وجہ سے اسے اسلام اور اس کی تعلیم مساوات کو اپنے اندر جذب کرنا پڑا۔

برہمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے اسلام کی تعلیمات سے آراستہ تھے اور ان کی تصنیف 'تحفۃ الموحدین' جو برہمو سماج کی بنیادی کتاب ہے پر بھی اسلامی تعلیمات

کا اثر تھا، نہ صرف قرآنی آیات اور اصطلاحات سے مزین ہے بلکہ اس میں قرآن مجید کی بہت ساری تعلیمات کو جذب کیا گیا ہے۔

عوامی سطح پر اور بھی بڑا انقلاب آیا چنانچہ عام لوگوں کے ایک بڑے طبقہ نے بغیر کسی اثر اور دباؤ کے اسلام کی بہت ساری علامتیں اختیار کرلیں حالانکہ رسمی طور پر انھوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ نوآبادیاتی حکومت کی منافقانہ حکمت عملی کے تحت رفتہ رفتہ محدود ہوگیا۔ پھر بھی ایسے کئی عوامی مسلک جیسے کبیر پنتھی، دادو پنتھی، پانچ پیر، سنجوگی، پیرانہ وغیرہ اسلام سے تعلقات ہی کے نتیجے میں وجود میں آئے اور یہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی ہیں۔

ہندو اور مسلم تہذیبوں کے عدم اتصال یا انفصال کے باوجود دونوں نے ایک دوسرے کی خصوصیات اپنائی ہیں اور ہر ایک نے دوسرے کے بعض منتخب عوامل کے اندر رد و بدل یا تاویل کرکے انہیں اپنے اندر کامیابی کے ساتھ سمونے کی کوشش کی ہے، تہذیبی و تمدنی اختلاف کے باوجود یہ دونوں فرقے مطابقت کی راہ پر گامزن رہے ہیں۔ ان کے درمیان باہمی تعاون اور تعامل کی ایک لمبی روایت چلی آرہی ہے اور کم از کم اس وقت تک جب نوآبادیاتی حکمرانوں کی منافقت کی پالیسی کے اثرات نمایاں ہوئے، دونوں فرقوں نے آپسی تعاون اور تعامل کی ایک لمبی روایت قائم کی اور مصالحت، موافقت اور مطابقت کی سمت رواں دواں رہے ہیں۔

افسوس ہے کہ ان تمام روایتی تعلقات کے باوجود آج دونوں فرقوں کے درمیان تناؤ اور کشمکش کی کیفیت بڑھتی جارہی ہے اور اب یہ جتنی آسانی سے متصادم ہوجاتے ہیں اس سے پہلے پہلے کبھی نہیں ہوتے تھے۔ اس صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے موجودہ

دور میں ہندوستانی معاشرے کے اندر پائی جانے والی مختلف انواع کی کشمکش پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہوگا۔

آج ہندوستانی معاشرہ مختلف قسم کی کشمکش سے دو چار ہے، ان میں طبقاتی، علاقائی، قبائلی و غیر قبائلی، ہندو سکھ، ہندو بودھ، ہندو مسلم اور ہندوؤں کی مختلف ذاتوں خصوصاً اعلیٰ و ادنیٰ ذاتوں کے درمیان تناؤ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان کے کثیر گروہی اور جغرافیائی اعتبار سے متنوع ملک میں جہاں مختلف گروہوں کے اندر ترقی کی رفتار یکساں نہیں، گروہی عدم توازن نہ صرف باقی ہے بلکہ وہ شدت اختیار کر رہا ہے، بعض گروہوں نے کم ترقی یافتہ علاقوں میں اپنی داخلی کالونیاں بنالی ہیں اور پس ماندہ لوگ اور بھی پس ماندہ ہو گئے ہیں اور ان کے اندر اپنے استحصال کا احساس بڑھ گیا ہے، تناؤ اور کشمکش کا ہونا تعجب کی بات نہیں۔ لیکن اگر ہم فی الحال ہندو مسلم اور اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں کے درمیان کشمکش کے مسئلے تک ہی اپنا تبصرہ محدود رکھیں تو ہم دیکھیں گے کہ ہندو مسلم کشمکش کے بیشتر اسباب یا تو محض نفسیاتی ہیں یا غلط اور مبالغہ آمیز مفروضات پر مبنی ہیں۔ برطانوی عہد میں نوآبادیاتی حکومت کے مفاد کے لیے تاریخ کو فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا اور فرقہ وارانہ کشمکش کے لیے زمین ہموار ہوئی۔ صدیوں تک میل جول، تعاون، ہم آہنگی اور یکجہتی کی سمت رواں دواں رہنے کے بعد مغربی تعلیم حاصل کرنے والے ایک نئے طبقے نے محسوس کیا کہ یہ دونوں فرقے ازل سے ہی ایک دوسرے کے مخالف تھے اسے ان کے میل جول سے وجود میں آنے والے تمدنی عناصر عداوت اور نفاق کی علامت نظر آنے لگے اور نسلی بنیادیں، علاقائی نسبتیں، لسانی رابطے پس پشت ہو گئے۔ نوآبادیاتی مفادات نے جس کشمکش کو جنم دے کر پروان چڑھایا بالآخر وہ ملک کی تقسیم جیسے عظیم سانحے پر

نتیج ہوئی۔ آزاد ہندوستان میں ملک کے استحصال پسند مفادات کے ہاتھوں اقتدار کی جنگ میں یہ کشمکش ایک موثر حربہ بن گئی ہے۔ فرقہ وارانہ تعصبات وسیع پیمانہ پر پھیلے اور ملک کے سیاسی، انتظامی اور معاشی نظام میں شرکت اور ساجھے داری کا تصور، جو جمہوریت کی روح ہے، بالادستی اور زیردستی کے اکثریتی اقلیتی رشتوں میں تبدیل ہوتا دکھائی دینے لگا۔ یہ رجحانات درحقیقت ملک کی ترقی کے لیے سم قاتل ہیں۔ اس کی ہمہ گیر ترقی کے لیے اس صورت حال میں تبدیلی ناگزیر ہے جس کے لیے سماجی ڈھانچے میں انقلاب کیلئے صرف انداز فکر بدلنے اور غلط اور مبالغہ آمیز مفروضات سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ مگر چونکہ یہ مبالغہ آمیز اور غلط مفروضات طاقتور مفادات کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اس لیے ان سے نجات گو مشکل ضرور ہے تاہم تشدد کی متقاضی نہیں ہے۔ اس کے برعکس سماجی ڈھانچے میں پُرامن طور پر تبدیلی امر محال ہے۔ کیونکہ فوقیت کے درجہ پر فائز اور ترجیحی مراعات کے عادی گروہ بخوشی ان نعمتوں سے دستبردار نہیں ہونگے۔

دوسری قسم کی کشمکش مختلف ذاتوں کے درمیان ہے۔ عام خیال کے برعکس ذات پات کا نظام گروہی کشمکش سے کبھی پاک نہیں رہا ہے۔ جنوبی ہند کی مالا اور میڈیگا نام کی ذاتیں صدیوں سے ایک دوسرے کی رقیب رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی مختلف ذاتوں کے درمیان مقابلہ اور محاذ آرائی کوئی نئی بات نہیں۔ اعلیٰ ذاتوں کی خصوصیات حاصل کرکے ان کے ہم پلہ بننے کی ادنیٰ ذاتوں کی کوشش جسے سنسکرتیانہ کہتے ہیں دراصل 'ہندو آنے' کی تحریک کے بجائے احتجاجی تحریک تھی۔ ۱۷۹۳ء کے دوا بندوبست کے نتیجے میں بیشتر ادنیٰ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے کسانوں کی بدحالی۔ انہیں اعلیٰ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے زمینداروں کے خلاف خاموش احتجاج کر

پر مجبور کر دیا تھا۔ زمینداروں کی گرفت جوں جوں سخت ہوتی گئی مظلوم طبقات میں بے چینی بڑھتی گئی۔ احتجاج کے جارحانہ اظہار کی روایت اور مواقع نہ ہونے کے سبب بڑے پیمانہ پر تشدد کے واقعات تو نہیں رونما ہوئے لیکن کرمی، کوئری، یادو دغیرہ ذاتوں کی کل ہند سبھائیں وجود میں آئیں جن کے مقاصد میں اپنی ذات کے لوگوں کو استحصال سے بچانا بھی تھا۔ البتہ موجودہ صدی کے دوسرے اور تیسرے دہے میں کئی مقامات پر خصوصاً شمالی اور جنوبی بہار میں تصادم کے واقعات بھی ہوئے۔

لیکن جدید ہندوستان میں مختلف ذاتوں کی آپسی کشمکش اپنی وسعت اور نوعیت کے اعتبار سے بالکل ہی جداگانہ اور سنگین ہے۔ اعلیٰ ذاتیں جنھیں روایتی طور پر سماجی اعتبار سے فوقیت اور سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے بالادستی حاصل رہی ہے۔ ان ذاتوں کے مقابلے میں جنھیں روایتی طور پر کمتر تصور کیا جاتا رہا ہے اور جو صدیوں سے محرومی اور پسماندگی کا شکار رہی ہیں، اب اپنے جمہوری اور انسانی حقوق کے لیے سینہ سپر ہیں۔ اس کشمکش کا حل سماجی اقتصادی اور طبقاتی ڈھانچے میں انقلاب کا متقاضی ہے، یعنی یہ کہ اس گروہ کو جسے سماجی، معاشی اور انتظامی اعتبار سے فیصلہ کن بالادستی اور فوقیت حاصل ہے اور اس بالادستی کو وہ اپنا ازلی حق تصور کرتا ہے، اپنی ان خصوصی مراعات سے، زیردستوں کے حق میں دستبردار ہونا ہے لیکن یہ سب انقلاب انگیز تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔

ہندو مسلم اور ذات پر مبنی نظام کی اندرونی کشمکش کا موازنہ کیجیے تو یہ اندازہ ہوگا کہ اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں کی کشمکش میں ہندو مسلم تناؤ کی طرح غلط اور مبالغہ آمیز مفروضات کو دخل نہیں۔ یہ طبقاتی کشمکش کی طرح سماجی اقتصادی مفادات کے

ٹکراؤ کا نتیجہ ہے. لیکن طبقات کی حد بندیاں ذات پات سے منسلق ہوتی ہیں اور ان میں وہ حرکت پذیری نہیں جو عام طبقاتی سماج میں ہوتی ہے اس لیے ان دو گروہوں کے درمیان تناؤ کا شدت اختیار کرنا قرین عقل ہے۔ اس کشمکش اور محاذ آرائی کے سلسلے کا جاری رہنا اس وقت تک لازمی ہے جب تک ان دونوں گروہوں میں توازن قائم نہیں ہو جاتا یا پھر دونوں میں سے کسی ایک کی پسپائی عمل میں نہیں آتی ۔

ہندو مسلم اور جدید اصطلاح میں فارورڈ بیکورڈ (بشمول ہریجن) ہر دو نوع کی کشمکش کے درمیان ربط تو اب ایک سطحی ذہن کو بھی دکھائی دے گا۔ وہی عناصر جو ہندو مسلم کشمکش کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، پس ماندہ ذاتوں سے نبرد آزمائی سے اجتناب کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ زیر دست ذاتیں غالب اکثریت میں ہیں اور ان کی بیداری بالا دست اقلیت کی برتری اور اس کے حوصلوں کے لیے سنگین خطرہ ہے۔ بالادست ذاتیں اپنے مفادات اور اپنی برتری کے تحفظ کے لیے جائز و ناجائز کا لحاظ کیے بغیر سب کچھ کرنے کو تیار دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں ہر ایسے موضوع (ISSUE) کی تلاش رہتی ہے جو اس سیلاب کا رخ دوسری طرف موڑ دے۔ مسلمانوں سے مشترک خطرے کے احساس سے بڑھ کر کوئی دوسرا ایشو نظر نہیں آتا۔ تعصبات کی وہ خلیج جو برطانوی حکمرانوں نے اپنے مفادات کی خاطر ان دو فرقوں کے درمیان حائل کی تھیں، ان کے مقاصد کے لیے بھی مفید ثابت ہوئی۔ اس خلیج کی وسعت بظاہر ان مفاد پرستوں کے حق میں ہے لیکن ملک و قوم کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہے۔

اس مختصر تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندو مسلم کشمکش اور تصادم کا بنیادی سبب ان کے تہذیبی اقدار کا فرق نہیں ہے جیسا کہ برطانوی دانشوروں نے

باور کرانے کی کوشش کی تھی۔ دراصل مفاد پرست عناصر اقتدار کی جنگ میں منافرت کے شعلوں کو ہوا دیکر اپنا مطلب حاصل کرتے ہیں۔

سماجیات داں اس امر پر متفق ہیں کہ اک رنگ گروہ کے مقابلے میں کثیر گروہی معاشرے کی زندگی بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ کیونکہ مختلف گروہوں کی انفرادیت اور سماجی شناخت باقی رکھتے ہوئے اگر عدل اور انصاف کی بنیاد پر ان میں توازن قائم کیا جائے اور کوئی ایک گروہ دوسرے گروہوں کو مغلوب کرنے کے درپے نہ ہو تو یہ امن اور ترقی کا ضامن ہوگا۔ لیکن سماجیات داں صرف مشورے ہی دے سکتے ہیں۔ ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانا انکے بس میں نہیں ہے۔

دینِ رحمت : از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اسلام اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لیے خواہ وہ کسی مذہب و ملت، نسل و رنگ اور زاد و بوم سے تعلق رکھتے ہوں سراپا رحمت ہے، اسکی رحمت و رافت پر مبنی تعلیم و ہدایت پر عمل پیرا ہو کر عام انسانوں کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں اور اسلام ہی کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی بسر کر کے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہنچ سکتا ہے، مصنف نے اس کے مختلف ابواب میں تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ اسلام کی ہر تعلیم و ہدایت تمام نوع انسانی کے لیے موجب خیر و برکت اور آیۂ رحمت ہے، اس میں دنیا کے کمزور طبقوں، عورتوں اور غلاموں کے علاوہ غیر مسلموں کے حقوق بھی بیان کیے گئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیم رحمت نے دوسری قوموں اور غیر مذہب والوں کے ساتھ اچھے تعلق اور برتاؤ پر کس قدر زور دیا ہے۔ آخر میں دنیا پر اسلام کے علمی احسانات، مسلمانوں کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۴۰ روپے۔

محمد فرید وجدی اور اُن کے افکار

از ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی ۔ علی گڑھ۔

(۲)

۲۔ الاسلام دین عام خالد[۱]: یہ فرید وجدی کی دوسری اہم تصنیف ہے۔ اسکا موضوع یہ ہے کہ اسلام کے اصول و قوانین ہر طرح کے نقص و عیب سے پاک ہیں، وہ ساری دنیا کے لیے رحمت و ہدایت بن کر آیا ہے۔ اس میں تمام پیش آمدہ مسائل کا حل موجود ہے، انیسویں صدی میں علم و سائنس کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے بعض لوگوں نے ان سے اسلام کو مطابق بنانے کے لیے اس کی ہیئت ہی کو تبدیل کرنا چاہا گو اس طرح کے لوگوں میں بعض نیک نیت بھی تھے مگر فرید وجدی کا نقطۂ نظر اس کے برخلاف ہے جس کا اندازہ الاسلام دین عام خالد سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۲ء میں شایع ہوئی۔ ترکی فارسی اور اردو میں اس کے ترجمے ہوئے[۲]۔ فرید وجدی نے اس کتاب میں مستشرقین کے اعتراضات کے جواب بالواسطہ اور بلاواسطہ دیے ہیں۔ یہ کتاب اصلاً ان مقالات پر مشتمل ہے جو پہلے بعض مصری رسائل میں چھپے تھے۔ اس میں ستّرہ[۳] ابواب ہیں، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے کہیں کہیں سے کچھ اقتباسات دیے جاتے ہیں۔

فرید وجدی کے نزدیک مذہب ہر انسان کے تحت الشعور میں موجود ہے۔ اجوست سبانیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"میں کیوں مذہبی ہوں ؟ ابھی اس سوال کو میرے ہونٹوں نے اٹھایا بھی نہ تھا کہ میرے قلبی واردات نے اس کا جواب اس طرح ادا کرنا شروع کیا۔ ہاں میں مذہبی ہوں کیونکہ لامذہب رہنا میرے لیے ممکن ہی نہیں، مذہب کا اقرار میری رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے"[۱]

"شان الاسلام مع العلماء المتنقعین" میں فرید وجدی نے بتایا ہے کہ مذہب اسلام میں علماء کی روح کی تسکین اور گرمی کا سامان موجود ہے۔ ان کے احساسات وجذبات کو عرفان کی بلندیوں پر پہنچا دینے کی اس میں قوت ہے۔ وہ چاہتے ہوں تو انہیں فکر کے زندان سے نکال کر ان کی روح کو ملاء اعلیٰ کی روحانیت سے ملا دے اور چاہتے ہوں تو حجاب اور اسرار کے تمام پردے ایک ایک کر کے ان کی آنکھوں سے اٹھا دے"[۲]

باب "اسلام عقل وعلم کی حکومت کا اعلان کرتا ہے" میں اس کا ذکر ہے کہ اسلام میں عقل کا اعتبار کیا گیا ہے، فکر ونظر کی دعوت دی گئی ہے اور یقین واذعان کی اہمیت بتائی گئی ہے۔

اس بحث کو بھی اس کتاب میں اٹھایا گیا ہے کہ اسلام ترقی کا مانع نہیں، بلکہ اسے فرض عین تصور کرتا ہے اور عقل کی آزادی کو اس کا بنیادی ستون قرار دیتا ہے[۳]۔ مگر فرید وجدی کے نزدیک "علم وہی ہے جس کا تعلق زندگی سے ہو۔ یعنی ارض وسما کی نشانیوں میں غور کرنا اور حقائق موجودات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہے"[۴]

اسلام فطری مباحات کو حرام نہیں ٹھہراتا" کے زیر عنوان بتایا گیا ہے کہ اسلام نے انسان کو کسی ایسی چیز کا مکلف نہیں بنایا ہے جس کا تحمل اس کے لیے دشوار ہو۔ یہی

محمد فرید وجدی اور اُن کے افکار

از ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی - علی گڑھ۔

(۲)

۲۔ الاسلام دین عام خالد[۱]: یہ فرید وجدی کی دوسری اہم تصنیف ہے۔ اسکا موضوع یہ ہے کہ اسلام کے اصول و قوانین ہر طرح کے نقص و عیب سے پاک ہیں، وہ ساری دنیا کے لیے رحمت و ہدایت بن کر آیا ہے۔ اس میں تمام پیش آمدہ مسائل کا حل موجود ہے، انیسویں صدی میں علم و سائنس کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے بعض لوگوں نے ان سے اسلام کو مطابق بنانے کے لیے اس کی ہیئت ہی کو تبدیل کرنا چاہا گو اس طرح کے لوگوں میں بعض نیک نیت بھی تھے مگر فرید وجدی کا نقطۂ نظر اس کے برخلاف ہے جس کا اندازہ الاسلام دین عام خالد سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۲ء میں شایع ہوئی۔ ترکی فارسی اور اردو میں اس کے ترجمے ہوئے[۲]۔ فرید وجدی نے اس کتاب میں مستشرقین کے اعتراضات کے جواب بالواسطہ اور بلاواسطہ دیے ہیں۔ یہ کتاب اصلاً ان مقالات پر مشتمل ہے جو پہلے بعض مصری رسائل میں چھپے تھے۔ اس میں سترہ ابواب ہیں، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے کہیں کہیں سے کچھ اقتباسات دیے جاتے ہیں۔

فرید وجدی کے نزدیک مذہب ہر انسان کے تحت الشعور میں موجود ہے۔ اجوست سبانیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"میں کیوں مذہبی ہوں ؟ ابھی اس سوال کو میرے ہونٹوں نے اٹھایا بھی نہ تھا کہ میرے قلبی واردات نے اس کا جواب اس طرح ادا کرنا شروع کیا۔ ہاں میں مذہبی ہوں کیونکہ لامذہب رہنا میرے لیے ممکن ہی نہیں، مذہب کا اقرار میری رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے۔"

"شان الاسلام مع العلماء المنتھین" میں فرید وجدی نے بتایا ہے کہ مذہب اسلام میں علماء کی روح کی تسکین اور گرمی کا سامان موجود ہے۔ ان کے احساسات و جذبات کو عرفان کی بلندیوں پر پہنچا دینے کی اس میں قوت ہے۔ وہ چاہتے ہوں تو انہیں فکر کے زندان سے نکال کر ان کی روح کو ملاء اعلیٰ کی روحانیت سے ملا دے اور چاہتے ہوں تو حجاب اور اسرار کے تمام پردے ایک ایک کرکے انکی آنکھوں سے اٹھا دے۔"

باب "اسلام عقل و علم کی حکومت کا اعلان کرتا ہے" میں اس کا ذکر ہے کہ اسلام میں عقل کا اعتبار کیا گیا ہے، فکر و نظر کی دعوت دی گئی ہے اور یقین و اذعان کی اہمیت بتائی گئی ہے۔

اس بحث کو بھی اس کتاب میں اٹھایا گیا ہے کہ اسلام ترقی کا مانع نہیں، بلکہ اسے فرض عین تصور کرتا ہے اور عقل کی آزادی کو اس کا بنیادی ستون قرار دیتا ہے۔

مگر فرید وجدی کے نزدیک "علم وہی ہے جس کا تعلق زندگی سے ہو۔ یعنی ارض و سما کی نشانیوں میں غور کرنا اور حقائق موجودات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہے۔"

اسلام فطری مباحات کو حرام نہیں ٹھہراتا" کے زیر عنوان بتایا گیا ہے کہ اسلام نے انسان کو کسی ایسی چیز کا مکلف نہیں بنایا ہے جس کا تحمل اس کے لیے دشوار ہو۔ یہی

وجہ ہے کہ جو لوگ محض عبادت کی خاطر معاشرہ سے کنارہ کش ہو کر کے رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں انہیں اسلام پسند نہیں کرتا۔ حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو کوڑے مارنے کا حکم دیا جو مسجد میں معتکف ہو کر جد و جہد اور اجتماعی زندگی سے دستکش ہو گیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "تم مذہب میں غلو مت کرو، تم سے پہلے کے لوگ محض اسی لیے ہلاک ہو گئے۔"

ایک باب میں فرید وجدی نے علم کے معاملہ میں اسلام اور مسلمانوں کی بے تعصبی دکھائی ہے اسی لیے عربوں نے علمی تحقیقات میں یونان و روم سے استفادہ کیا اور مامون اور دوسرے خلفا کے زمانے میں دوسری زبانوں اور مذاہب کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔

انھوں نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ اسلام کے اثرات پوری دنیا پر پڑے اور اور اس کی دولت سے آبی و خاکی کوئی بھی محروم نہیں رہا۔ خود یورپ جو آج علم و فن میں ساری دنیا میں ممتاز سمجھا جاتا ہے، اٹھارہویں صدی تک علم و اختراع کے معاملہ میں مسلمانوں اور عربوں کا ممنون رہا ہے۔

فرید وجدی نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کا پہلا اصول یہ ہے کہ وہ عقل و علم کا داعی ہے، وہ ترقی کا حامی اور رجعت پسندی کا منکر ہے۔ وہ تحقیق و اکتشاف، ارتقا و اختراع کو پسند کرتا ہے اور وہ زمان و مکان کے قیود سے مبرا ہے۔ اس کے فلسفۂ دین میں لچک ہے اور وہ مابعد الطبیعاتی حقائق سے بھی بحث کرتا ہے۔

کتاب کے آخر میں اسلام کے بارے میں ایک امریکن اسکالر کی کتاب "مسائل فی الدین" سے شکوک و شبہات نقل کر کے ان کا جواب دیا ہے، اس سلسلہ میں مندرجۂ ذیل

امور پر قرآن و حدیث کی روشنی میں گفتگو کی ہے۔

(۱) کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ اعصابی مرض میں گرفتار تھے۔ (۲) کیا وحی آپ کی ذہنی اختراع تھی؟ (۳) کیا آپ بے رحم اور قسی القلب تھے۔ (۴) کیا اسلام جنگ و خوں ریزی کا مذہب ہے اور وہ رحم و مروت سے خالی ہے۔ (۵) کیا اسلام نوع انسانی کی ترقی کا ضامن نہیں۔ (۶) کیا اسلام نے غلامی، تعداد ازدواج اور طلاق جیسے مسائل کو اٹھا کر نوع انسانی کو مضرت پہنچائی؟ (۷) کیا اسلام نے صدقہ و خیرات کی ترغیب و تلقین کر کے معاشرے میں اپاہجوں اور مفت خوروں کی حوصلہ افزائی کی ہے یا فقر و فاقہ کا سد باب کیا ہے۔ (۸) کیا قرآن کریم ان روحانی مشاہدات سے بھرا ہوا ہے جو بعید از عقل ہیں[۱۰]۔ فرید وجدی نے معروضی انداز میں ان تمام اعتراضات کا عالمانہ اور سنجیدہ جواب دیکر بتایا ہے کہ یہ محض تعصب پر مبنی ہیں۔

المرأة المسلمة: محمد قاسم امین نے "تحریر المرأة"[۱۱] اور "المرأة الجدیدة"[۱۲] کے نام سے دو کتابیں لکھیں جن کی تردید میں اسلامی حمیت رکھنے والے جن اہل قلم نے کتابیں لکھیں ان میں بعض نے انتہا پسندی کی وجہ سے قاسم امین کی بعض مفید اور قابل غور باتوں کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ فرید وجدی کی زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس میں مدلل انداز میں قاسم امین کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ عورتیں مردوں کے بالکل مساوی ہیں اور وہ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کے شانہ بشانہ جدو جہد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ فرید وجدی کی کتاب دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ جامع ہے۔ اسی لیے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے مولانا شبلیؒ کی ادارت میں نکلنے والے الندوہ میں اس کا آزاد ترجمہ کیا تھا جو بعد میں کتابی صورت میں بھی چھپا۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور تیرہ[۱۳] ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں فرید وجدی نے بتایا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورت کو انسانی نسل کی افزائش کا وسیلہ بنایا ہے اسی لیے اس کو ان صفات سے متصف کیا ہے جو بچوں کی پرورش اور نگہداشت کے لیے ضروری ہیں۔ اس کی اس ذمہ داری کے پیش نظر قدرت نے اس کی جسمانی ساخت مردوں سے مختلف بنائی ہے[۱۳]

دوسرے باب میں عورتوں کی زندگی میں پیش آنے والے ان چار ناگزیر مراحل کا ذکر ہے حمل، وضع، رضاعت اور تربیت اولاد ان اہم اور دشوار گزار مراحل میں ادنیٰ بے احتیاطی سے سنگین مسائل رونما ہوتے ہیں، اسی لیے حکماء و اطباء نے بھی ان کے سلسلے میں مکمل احتیاط پر زور دیا ہے۔ فرید وجدی کے خیال میں ان چاروں اہم ذمہ داریوں کے ساتھ عورت کے لیے معاشرتی اور تمدنی تگ و دو میں شامل ہونا ممکن نہیں ہو سکے گا[۱۴]

تیسرے باب میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے کہ کیا جسمانی اور عقلی اعتبار سے مرد و عورت برابر ہیں، یورپ نے دونوں کو ایک ہی سطح پر کھڑا کر دیا ہے۔ جس کے تتبع میں بعض اہل مشرق بھی اس کے قائل ہو گئے ہیں، مگر فرید وجدی نے خود یورپ ہی کے متعدد حکماء و فلاسفہ کے اقوال نقل کر کے اس کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ "مرد جسمانی اعتبار سے عورت سے بہت قوی ہے" انھوں نے علم النفس کے ماہرین کے تجربے نقل کر کے بھی اسی امر کو ثابت کیا ہے[۱۵]

چوتھے باب میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ جس قسم کی آزادی عورتوں کو دلانا چاہتے ہیں، اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ خود یورپین علما نے بھی اس نوع کی آزادی کی مخالفت کی ہے، اس بنا پر علمائے اسلام کا فرض ہے کہ وہ آزادی نسواں کے مطالبہ کی مخالفت کریں کیونکہ اس میں عورتوں کی ذلت و رسوائی اور بدبختی ہے، علاوہ ازیں یہ فطرت و حکمت الٰہی

کے بھی بالکل منافی ہے۔[16]

پانچویں باب کا حاصل یہ ہے کہ عورتیں اپنی اصل ذمہ داری کو انجام دینے کی صورت میں مردوں کے کاموں کو انجام دینے یا خارجی امور میں حصہ لینے سے قاصر و معذور ہیں۔[17]

چھٹے باب میں فرید وجدی نے اس پر زور دیا ہے کہ تمام مخلوقات کے اعضا و جوارح اللہ تعالیٰ نے ایک خاص ترکیب اور حکمت سے اس لیے بنائے ہیں کہ وہ اپنی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ عورتوں کی تخلیق میں بھی اسی کی رعایت کی گئی ہے۔ اب اگر وہ اپنے اصلی کاموں کو انجام نہ دیں تو یہ فطرت سے انحراف اور بغاوت ہوگی جس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہے، لیکن افسوس ہے کہ آج دنیا میں عورتوں کو ان کی طبیعت و مزاج اور فطرت کے خلاف کاموں کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ فرید وجدی عورتوں کے مردوں کے میدان میں داخل ہونے کو معاشرتی اقدار کی پامالی اور طبعی قوانین کی خلاف ورزی بتاتے ہیں۔[18] انھوں نے پردہ کے سلسلے میں بتایا ہے کہ مردوں پر چونکہ عورتوں کی کفالت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کا اقتضا یہ ہے مرد عورت سے پردہ کرائے اور عورت بغیر مرد کی اجازت کے پردہ نہ اتارے۔[19] عورتوں کی آزادی اور بے پردگی کو وہ معاشرتی بے راہ روی بتاتے ہیں جس کو مرد کی غیرت و حمیت عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں اس کا انجام تباہی و بربادی ہوگا جس کی مثال دیتے ہوئے فرید وجدی نے رومن امپائر کی شکست و ریخت کا ذکر کیا ہے۔[20] وہ عورتوں کی آزادی و بے پردگی کو عیاشی اور فضول خرچی کا باعث بھی بتاتے ہیں جس کا انجام فقر و افلاس اور زوال و انحطاط ہے۔ پردہ کو وہ قید و بندش کے بجائے عورتوں کی عفت و پاکدامنی کے تحفظ اور ان کی سعادت کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔[21] فرید وجدی نے پردہ کے بعض اہم فوائد بھی بتائے ہیں اور اس کے

مخالفین نے اس کے جو نقصانات بتائے ہیں ان کا تشفی بخش جواب دیا ہے۔ انھوں نے یہ بحث بھی اٹھائی ہے کہ مادیت اور الحاد کی یلغار کے نتیجہ میں ممکن ہے پردہ کا بالکل ہی خاتمہ ہو جائے لیکن اس کے باعث مختلف قسم کے امراض پیدا ہوں گے اور بالآخر ایک وقت آئے گا کہ لوگ پردہ کی اہمیت کو مان کر اسلام کے سایۂ رحمت میں رہنے ہی کو پسند کریں گے۔

گو فرید وجدی نے اس کتاب میں یہ اور اسی قسم کے بعض مفید خیالات پیش کیے ہیں مگر ان کی کتاب میں بعض مباحث کا تکرار ہے، علاوہ ازیں عورتوں کی تعلیم کے مسئلہ پر بھی انھوں نے وضاحت کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی ہے۔

الاسلام فی عصر العلم : اسلامی علوم کی طرح جدید علوم خصوصاً حکمت و فلسفہ پر بھی فرید وجدی کی اچھی نظر تھی۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں بتایا ہے کہ دین اسلام کی عظمت و اہمیت آج بھی اسی طرح برقرار ہے جس طرح چودہ سو سال پہلے تھی، جدید علوم اور سائنس کی ترقی نے بھی اسلام کی عظمت و صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، یہ سمجھنا غلط ہے کہ اسلام جدید علوم کا مخالف ہے اس ضمن میں فرید وجدی نے فلاسفہ کی طرف سے اسلام پر کیے گئے بہت سے اعتراضات کے مدلل جوابات دیے ہیں

الاسلام فی عصر العلم : دو جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ مصنف کے عہد شباب کی تصنیف ہے، اس کے متعلق ان کا خود یہ بیان ہے کہ اس میں فلسفۂ روحانی اور مذہب اسلام کا سچا خاکہ پیش کیا گیا ہے، اسے انھوں نے ان نوجوانوں کے لیے لکھا تھا جو جدید فلسفہ کی رعنائیوں میں گم ہو کر اسی کو نوع انسانی کی ترقی کا راستہ تصور کرتے ہیں فرید وجدی کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں جب کہ سائنس کی ترقی نے تمام ادیان کی بنیا

متزلزل کر دی ہیں صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس کی بنیادوں کو کوئی چیز ہلا نہیں سکتی۔

الاسلام فی عصر العلم کی پہلی جلد چار اجزاء پر مشتمل ہے۔ پہلا جزء بنی نوع انسانی کی ماہیت پر مبنی ہے، دوسرے میں تہذیب و تمدن پر اظہار خیال کیا گیا ہے، تیسرے میں مابعد الطبیعیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور چوتھے میں خاتم النبیینؐ کی حیات مبارک کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

فرید وجدی نے مختلف حیثیتوں سے انسان کا مطالعہ کیا ہے، ان کے نزدیک یہ نہایت پیچیدہ موضوع ہے، کائنات اور اشیائے کائنات کا جاننا اتنا دشوار نہیں جتنا انسان کے حقائق و اسرار کا پتہ لگانا دشوار ترین ہے[۳۲]۔

انھوں نے انسان کی حقیقت و ماہیت، مادہ کے وجود و دوام اور انسان کے وجود بالحدوث والعدم وغیرہ مختلف امور پر بحث کی ہے اور اس بارے میں حکما کا نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے، آخر میں سعادت و شقاوت اور فضائل و رذائل پر بحث کی ہے کہ انسان کو سعادت کیسے نصیب ہو سکتی ہے؟ ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے وابستگی ہی انسان کو عظمت و رفعت عطا کر سکتی ہے، اسی حقیقت کو قرآن مجید میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ (الانسان ۷۶/۳) ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا	جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے۔
لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ	انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے "
لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (العنکبوت ۲۹/۶۹)	یقیناً اللہ نیکو کاروں کے ہی ساتھ ہے۔
إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي	بے شک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو

هِيَ أَقْوَمُ (الاسراء: ۱۷/۹) پاک سیدھی ہے۔

اس بحث کے بعد تہذیب وتمدن (مدنیت) پر بحث کی گئی ہے، عام طور سے یورپ کی ظاہری چمک دمک اور ان کے عادات ورسومات کو اصل مدنیت قرار دیا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک بلند وبالا روحانی شئے ہے جو صالح مومنین ہی کو حاصل ہوتی ہے، گو مسلمان اس سے اپنی موجودہ حالت کی بنا پر محروم ہو گئے ہیں۔ تاہم انہیں مایوس اور رحمتِ حق سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔

کتاب کے تیسرے باب میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو تاریکی پھیلی ہوئی ہے اس سے نجات صرف اسلام ہی دے سکتا ہے اور اسلام کی فہم ومعرفت کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا رشتہ استوار کرنا پڑے گا، اس سلسلہ میں بعثت کے زمانے کے حالات بیان کرکے دکھایا ہے کہ کس طرح آپؐ کے فیضان سے انسانیت کا مقدر جگمگا اٹھا تھا۔ چوتھے باب میں مابعد الطبیعیاتی امور زیر بحث آئے ہیں۔ اس کتاب کی دوسری جلد ۴۸ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں حسب ذیل تینؔ طبقوں کا ذکر ہے۔

(۱) منکرین (۲) مذبذبین ومتشککین (۳) مومنین۔

اس منفرد نوعیت کی کتاب کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے پہلے باب میں ابتدا سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک انسان کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ "العلم عند المسلمین" اس کتاب کا اہم باب ہے۔ اس میں اسلام میں علم کی اہمیت اور تعلیم کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حوصلہ افزائی کا ذکر کرنے کے بعد مسلمانوں کے علمی کارنامے بتائے ہیں اور ہیئت، کیمیا، ریاضی اور طبیعیات وغیرہ میں ان کی خدمات دکھائی ہیں، اس کے بعد توحید کی حقیقت اور اہمیت

پر گفتگو کی ہے۔ اس کتاب کا ایک اور اہم باب "الولایۃ والکرامۃ والوسیلۃ والشفاعۃ" ہے۔ فرید وجدی نے ان سب کی نوعیت و حقیقت پر اپنے خاص انداز میں اچھی بحث کی ہے۔ جن کو اصل کتاب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں انھوں نے پوری کتاب کے مباحث کا خلاصہ دیا ہے، کتاب کا خاتمہ متفرق مقالات پر ہوا ہے۔ جن کے بعد ایک ضمیمہ بھی ہے اس میں کتاب کے بعض دقیق پیچیدہ فلسفیانہ مباحث کی توضیح کر کے انھیں آسان اور عام فہم بنا دیا گیا ہے۔[۱۱]

حواشی

[۱] افسوس ہے کہ اصل عربی کتاب ہم کو دستیاب نہیں ہو سکی، بعد میں پتہ چلا کہ یہ دارالمصنفین میں موجود ہے اس لیے اس کے مباحث کی ترجمانی اردو ترجمہ ہی سے کی گئی ہے۔ جو سید احمد حسن نقوی صاحب نے اسلام کے عالمگیر اصول کے نام سے کیا تھا [۲] اسلام کے عالمگیر اصول۔ بار اول ۱۹۴۴ء ج۱۔ ص ۹-۱۰ [۳] ایضاً ص ۲۰ [۴] ایضاً ص ۳۶-۳۷ [۵] ایضاً ص ۶۰ [۶] ایضاً ص ۶۳-۶۴ [۷] ایضاً ۴۸-۴۹ [۸] تفصیل کے لیے دیکھیے اسلام کے عالمگیر اصول ص ۹۰-۱۰۰ [۹] وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو ص ۱۴۴-۱۴۶ [۱۰] وضاحت کے لیے دیکھیے ص ۱۸۹-۲۶۲ [۱۱] اس کتاب میں قاسم امین نے عورتوں کی آزادی سے بحث کی ہے [۱۲] اس میں انھوں نے دور جدید کی عورتوں کا موازنہ مشرقی عورتوں سے کر کے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ مشرقی عورتوں کو آج کے دور میں کن خطوط پر چلنا ضروری ہے [۱۳] فرید وجدی۔ المرأۃ المسلمہ۔ الطبعۃ الاولیٰ۔ مطبعۃ الترقی، مصر سنہ ۱۹۰۱ء ص ۱۴-۲۰ [۱۴] ایضاً ص ۳۰ [۱۵] المرأۃ المسلمہ صفحات ۳۰ تا ۳۵ [۱۶] ایضاً ص ۵۲-۵۳ و ۶۹ و ۷۰ [۱۷] دیکھیے ص ۹۰-۹۱ [۱۸] ایضاً ص ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵ و ۹۹، ۱۰۰ و ۱۰۱ [۱۹] ایضاً ص ۱۱۱-۱۲۰ [۲۰] ایضاً ص ۱۲۱-۱۲۴ [۲۱] ایضاً ص ۱۳۶-۱۳۸ و ۱۴۶ [۲۲] فرید وجدی، الاسلام فی عصر العلم مصر ۱۹۳۲ء ۱/۷ [۲۳] ایضاً ۱/۲۴-۲۶۔

قطب العالم سید برہان الدین ابو محمد عبداللہ بخاری

از مولانا محمد یوسف متالا - لندن

خاندانی حالات سید برہان الدین ابو محمد عبداللہ بخاری قطب العالم کے لقب سے مشہور رہیں۔ ان کے والد کا نام سید ناصر الدین اور دادا کا سید الاقطاب مخدوم جہانیاں تھا۔ اکا نسبی سلسلہ سید جعفر ثانیؒ تک منتہی ہوتا ہے جو حضرت امام حسن عسکری کے بھائی ہیں۔ سنہ ۷۹۰ھ ۱۳۸۸ء میں ۱۴ رجب دوشنبہ کی رات کو صبح کے قریب پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں والد صاحب کا انتقال ہوگیا اور شاہ راجو قتّال جو والد محترم کے چچا تھے کفیل بنے اور انھوں نے تربیت کی اور دو سال میں مرتبہ ہدایت تک پہنچا کر فرمایا کہ گجرات والوں کی رشد و ہدایت کا کام آپ کو سپرد کیا گیا ہے۔ اس لئے وہاں تشریف لے جائیں۔

گجرات کا سفر چنانچہ یہ اپنی والدہ بی بی ہاجرہ عرف سعادت خاتون کے ساتھ سنہ ۸۰۰ھ میں پٹن تشریف لائے۔ سید راجو قتّال کے مشورہ سے وہ شیخ رکن الدین کی خدمت میں رہے اور ظاہر و باطن کی اصلاح میں مشغول ہوئے۔ احمد آباد کے سلطان مظفر چونکہ سید الاقطاب مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے مرید تھے اس لئے جب انھوں نے یہ سنا تو صاحبزادے کا خاطر خواہ استقبال کیا۔ پٹن میں اس وقت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے پوتے شیخ رکن الدین کی خانقاہ تھی ان سے باطنی ترقیات حاصل کیں۔ اور ظاہری علوم مولانا شیر علی سے حاصل کئے۔ جن کا اس زمانہ میں پٹن میں مدرسہ مشہور تھا۔

وفات | قطب العالم ۶۸ سال کی عمر میں ۸۵۷ھ میں انتقال کر گئے۔ تاریخ انتقال ۸ ذی الحجہ ہے۔ جو مطلع "یوم الترویہ" سے نکلتی ہے۔ اور احمد آباد کے موضع بٹوہ میں دفن کئے گئے۔

بعض مشائخ سے ملاقات | پٹن میں قطب العالم شیخ رکن الدین کے مہمان ہوئے جو بابا فرید الدین شکر گنج کے نواسے تھے۔ انھوں نے بہت خاطر مدارات کی۔ سید شرف الدین مشہدی کو جو بھروچ میں رہتے تھے جب ان کے پٹن میں قیام کا علم ہوا تو وہ انسے ملنے کیلئے پٹن روانہ ہوئے۔ راستہ میں پہلے احمد آباد رکے پھر سرکھیج شیخ احمد کھٹو کی خدمت میں پہونچے پھر پٹن پہونچ کر قطب عالم سے ملاقات کی۔ قطب العالم کی عمر تقریباً چودہ سال تھی کہ سید گیسو دراز دکن سے گجرات تشریف لائے اور جب ان سے ملاقات کی اور ان کے اندر قطبیت کے آثار دیکھے تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ

"میرے بزرگوں سے جو فیض مجھے کو ملا ہے وہ میں آپ کو بطور تحفہ دینا چاہتا ہوں۔"

نکاح | حضرت قطب عالم کا پہلا نکاح بادشاہ وقت کی صاحبزادی سے ہوا پھر دوسرا بادشاہ کے وزیر امین الدین خداوند خاں کی صاحبزادی سے ہوا۔ ان دو کے علاوہ ایک اور خاتون سے بھی ان کا نکاح ہوا تھا۔

سلاطین سے تعلقات | سلطان مظفر شاہ ان کے دادا حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے مرید تھے۔ قطب عالم جب گجرات میں رونق افروز ہوئے اور پٹن میں قیام فرمایا تو مظفر شاہ حضرت کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے حاضر خدمت ہوئے اور آخر تک عقیدتمند رہے پھر سلطان احمد شاہ بہت معتقد رہے۔ ان کے بعد سلطان قطب الدین تخت نشین ہوئے تو وہ بھی حضرت کے مرید ہوئے۔

اوصاف و کمالات | قطب العالم زہد، توکل اور قناعت کی دولت سے مالا مال تھے۔ اکثر ریاضت و مجاہدے میں وقت گزارتے۔ جود و سخاوت میں مشہور تھے۔ شریعت و حقیقت و طریقت میں کامل تھے۔ ان کی عمر نو سال تھی کہ ایک دن خیال آیا کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ملا ہوتا تو قدمبوسی کا شرف حاصل کرتا۔ اسی رات کو سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر سر رکھ دیا[1]

کرامات | قطب العالم کی کرامات بے شمار بتائی جاتی ہیں۔ ایک دن علی الصباح[2] گھر سے مسجد تشریف لے جا رہے تھے کہ اچانک ان کے پیر سے کوئی چیز ٹکرا گئی بے ساختہ زبان سے نکلا کہ "یہ پتھر ہے یا لوہا ہے یا لکڑی ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں صفتیں اس چیز میں پیدا کر دیں۔ کبھی پتھر نظر آتا ہے کبھی لوہا اور کبھی لکڑی[3]۔ مرآۃ احمدی کی عبارت ہے "قضارا پائے ایشاں بہ آبخورِ خورد افتاد چنانچہ مجروح گشت و خون آلود گردید بر زبانِ مبارک گذشت کیا ہے لوہا ہے لکڑی ہے کہ پتھر ہے"۔ شہنشاہ ہمایوں نے اس یادگار کو دیکھا اور اکبر بھی جب احمد آباد آیا تو متبرک یادگار کو دیکھا اور اس کا آدھا حصہ آگرہ لے گیا[4]۔

قطب العالم کی زبان | تحفۃ الکرام، اخبار الاخیار، اور دوسری کتابوں میں حضرت قطب عالم[5] کے حالات کے ضمن میں ہندی ملفوظات بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ بزرگ موصوف نے مقامی زبان کو استعمال کیا ہے۔ لیکن اس میں پنجابی عنصر زیادہ ہے۔ جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ حضرت قطب عالم کی پیدائش اوچ شریف کی ہے اور ان کی

---

[1] تاریخ صوفیائے گجرات ص ۳۵ ۔ [2] گلزار ابرار ص ۱۴۲ ، [3] مرآۃ سکندری۔
[4] اخبار الاخیار ص ۱۵۲ ۔ تذکرہ قلندریان ہند ص ۱۳۳ [5] تذکرہ اولیائے پاک و ہند ص ۱۹۰ ، ۲۶۱

ابتدائی پرورش پنجاب میں ہی ہوئی۔

احمد آباد کیلئے دعا: سلطان احمد شاہ نے احمد آباد تعمیر کیا تو ان سے اس میں قیام کی درخواست کی جب یہ احمد آباد تشریف لائے تو سلطان نے قصیدہ لکھا اور خدمت میں حاضر ہو کر شعرا کی طرح خود کھڑے ہو کر اسے پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔

قطب عالم برہان بس است مارا　　برہان او ہمیشہ چوں نامش آشکارا

قصیدہ سننے کے بعد سلطان نے دعا کی درخواست کی تو قطب العالم نے فرمایا کہ آپکے خاندان کیلئے ہمارے جد امجد مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے دعا کی ہے۔ سلطان نے عرض کیا کہ انھوں نے ہمارے جد امجد سلطان مظفر کی اولاد کیلئے سلطنت کی دعا کی ہے آپ شہر کی آبادی اور قبولیت کیلئے دعا فرمائیں۔ اس پر فرمایا احمد آباد ابدالاباد انشاء اللہ آباد ہون بالعبادۃ

قطب العالم نے پرانے اساول میں سابرمتی کے کنارے سکونت اختیار کی اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی یہاں شیخ احمد کھٹو سے بھی روحانی تربیت اور خلافت پائی پھر وہ موضع بٹوہ میں مقیم ہوئے جہاں سلطان نے رہائش وغیرہ کے تمام انتظامات کر دیئے تھے۔

نسبی و معنوی اولاد: قطب العالم کے بارہ[12] صاحبزادے اور سترہ[17] صاحبزادیاں تھیں۔ اس تر صاحبزادگان نے ان سے بیعت و خلافت بھی حاصل کی جس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

ا۔ سید محمود بن قطب العالم یا قطب عالم کے صاحبزادے تھے جن کا عرف شاہ بڈاھ، ۸۰۵ھ میں ۳ ماہ رمضان المبارک کو پٹن میں پیدا ہوئے۔ والدہ محترمہ کا اسم گرامی بی بی سلطان خاتون بنت خداوند خاں ہے۔ یہ قطب العالم کے مرید تھے۔ جن کو ان سے اجازت و خلافت ملی تھی اور قطب العالم کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ سید راجو قتال نے بھی ان کے نام خلافت نامہ اُچ شریف سے ارسال کیا تھا[1] ۸۵۶ھ میں یکم ذوالقعدہ

خاتمہ مرات احمدی ص ۲۸

کوٹوہ میں انتقال فرمایا اور قطب العالم کے قریب دفن کئے گئے۔ ان کے پانچ صاحبزادے تھے۔ شاہ پیارن، سید ذاکر محمد، سید شیر محمد، سید جلال الدین جنکو شاہ شیخ جیو کہتے تھے اور شاہ عتیق اللہ۔ شیخ جیو اگرچہ ان کے چھوٹے فرزند تھے لیکن کمالات صوری و معنوی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کی ولادت باسعادت اساول میں ہوئی۔

چوتھے فرزند شاہ حامد بھی قطب العالم کے مرید اور خلیفہ تھے۔

پانچویں فرزند سید صالح بھی قطب العالم کے مرید اور خلیفہ تھے۔ انکے عجیب واقعات مشہور ہیں

چھٹے شاہ امین اللہ بھی قطب العالم کے مرید اور خلیفہ تھے۔ انہیں دفن کر کے لوگ واپس آئے تو رات سید محمد زاہد نے خواب دیکھا کہ یہ فرماتے ہیں کہ میری ایک انگلی صندوق کے تختے کے نیچے دبی ہوئی ہے اسکو نکلوادیجئے خواب سمجھ کر اعتبار نہیں کیا گیا۔ تین دن مسلسل خواب کے بعد جب قبر کو کھولا گیا تو دیکھا واقعی پیر کی انگلی تختے کے نیچے پھنسی ہوئی ہے۔ اور اس سے خون بہہ رہا ہے۔ چنانچہ اسے درست کر کے انھیں دوبارہ دفن کیا گیا۔

ساتویں صاحبزادے سید محمد زاہد تھے۔

آٹھویں سید محمد اصغر جو شاہ شیخ محمد کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے سلوک کے مراحل اپنے بڑے بھائی سید ناصر الدین سے طے کئے۔

نویں سید محمد صادق انھوں نے بھی بڑے بھائی سے ارشاد و تربیت پائی۔ اور چھبیس ۲۶ سال کی عمر میں جوانی میں انتقال کیا۔

دسویں فرزند سید محمد راجو حضرت قطب العالم کے مرید اور خلیفہ تھے۔ انھیں حضرت قطب العالم نے بارہ[۲] صاحبزادوں کی بشارت دی جو پوری ہوئی۔ انکی قبر محمد آباد معروف بہ چاپا نیر میں واقع ہے۔

گیارھویں شاہ سالم قطب العالم کے مرید تھے لیکن خلافت اپنے بڑے بھائی سے پائی۔ اہل سماع میں سے تھے۔ بعض دفعہ تین چار روز تک حال طاری رہتا۔ کھانا پینا متروک ہو جاتا۔ یہ بھی قطب العالم کے قریب مدفون ہیں۔

بارھویں سید علم ہیں جو ایام شیر خوارگی میں انتقال کر گئے۔

قطب العالم کے خلفا میں سید عثمان جو شمع برہانی کے لقب سے معروف ہیں۔ خلیفہ خاص اور متبنیٰ تھے۔ اس علاقہ کے مشائخ کبار سے صغر سنی میں مرید ہوئے اسکے بعد قطب العالم کی خدمت کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اور ان کی صحبت میں رہ کر بلند مقامات اور سلوک کی منازل طے کیں۔ جب ان کی طرف خلائق کا رجوع ہوا تو حضرت قطب عالم کے ارشاد سے بہار الدین پور منتقل ہو گئے اور وہاں بھی طلبار، علمار، امرار، سلاطین کا اس قدر ہجوم ہوا کہ تنگی ہونے لگی۔ تو وہاں سے اس جگہ منتقل ہو گئے جو عثمان پور کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پہلے وہ تنہا ہی تھے مگر بعد میں آبادی اتنی بڑھی کہ ایک پورہ آباد ہو گیا۔ ان سے متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ جن میں سے مدارج المعارج مشہور ہے۔ کبھی ذوق و شوق کے عالم میں غزل بھی کہتے تھے۔ ایک غزل کا مطلع یہ ہے ؎

عرش فرشیست کہ در خلوت درویشان است
رنج گنجیست کہ ہم صحبت درویشان است[۱]

دوسرے خلیفہ شیخ علی جو خطیب کے لقب سے مشہور ہیں صغر سنی ہی سے بڑے پاکباز اور زاہد و مرتاض تھے۔ جب ان کی عمر بارہ سال ہوئی تو عبادت و اطاعت میں مصروف ہوئے۔ مشغولی اس قدر بڑھی کہ کھانا پینا ترک کر کے صحرا میں رہنے لگے۔ وہاں پر روزہ بھی گھاس پات ہی سے افطار ہوتا۔ مسلسل بارہ سال اسی طرح مجاہدے میں گذارے اور صفائی باطن میں اس درجہ ترقی کی کہ ملائکہ کی تسبیح و تہلیل سنتے تھے۔ پانچوں نمازیں سابرمتی کے کنارے ادا فرماتے تھے۔ نماز کو جاتے ہوئے ایک مجذوب ملا جو رستہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ "علی مسلمان شو"۔ آیندہ بھی یہ اسکا معمول بن گیا تھا کہ جب یہ گذرتے تو مجذوب وہی جملہ کہتا۔ ایک دفعہ جب یہ تشریف لے جارہے تھے تو وہ راستہ میں پکا ہوا کھانا لوگوں کو تقسیم کر رہا تھا۔ انھیں دیکھ کر ان کی طرف دوڑا اور زمین پر گرا کر ان کے سینے پر چڑھ کر دو تین لقمے زبردستی ان کے منہ میں ڈالے اور شمع برہانی کو دو تین تکے بھی مارے اسکے بعد چھوڑ دیا اور وہی جملہ کہا کہ "علی مسلمان شو"۔

مجذوب کی ضرب کی وجہ سے ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی جب ہوش میں آئے تب "علی مسلمان شو" کے معنی ان پر واضح ہوئے یعنی مجذوب یہ کہتا ہے کہ کہیں جاکر کسی کا مرید ہونا چاہیئے۔ اس وقت حضرت قطب العالم اور حضرت گنج بخش رح بقید حیات تھے۔ حضرت قطب عالم کے یہاں سماع بھی ہوتا تھا۔ اسلئے وہ گنج بخش رح کی خدمت میں پہنچنے کیلئے بیل پر سوار ہوکر سرکھیج کی طرف چلے جب سابرمتی کے کنارے پر پہنچے تو بیل رک گئے۔ ایک قدم آگے بڑھانے کیلئے تیار نہیں۔ اس دوران ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا اور شیخ کی گدی پر پنجہ مارا اور گریبان کھینچا۔ جسکی وجہ سے شیخ کے کپڑوں پر پانچ انگلیوں کا نشان شوربے کیساتھ کپڑوں پر پڑ گیا۔

شیخ نے ساتھیوں سے کہا کہ کوئی مجھے پیچھے کھینچ رہا ہے۔ بیلوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو جہاں وہ جائیں گے وہ ہی ہماری منزل ہے۔ بیل پرانے اساول کی طرف چلنے لگے۔ جہاں حضرت قطب عالم کا قیام تھا۔ وہاں پہنچ کر حضرت قطب عالم نے دیکھتے ہی ارشاد فرمایا کہ پہلے خلافت پھر اسکے بعد ارادت یعنی پہلے تم کو خلافت دی جاتی ہے اسکے بعد مرید کریں گے۔ نیز ارشاد فرمایا کہ چراغ تیل اور بتی سب تیار کر کے لائے ہو کوئی اسکو روشن کردے۔ چنانچہ خلافت مرحمت فرمائی اسکے بعد مرید کیا۔ اسکے بعد حضرت قطب عالم نے ان کیلئے جو کھانا رکھوایا تھا وہ مرحمت فرمایا۔ شیخ علی نے ابھی دو تین لقمے بھی نہ کھائے تھے کہ جوش محبت اور ذوق و شوق کا غلبہ ہوا اور زار و قطار رونا وغیرہ لگانا شروع کردیا۔ اسکے بعد کچھ لوگ جو بیعت کیلئے قطب عالم کے پاس پہنچے ہوئے تھے قطب عالم نے شیخ علی سے فرمایا کہ ان کو بیعت کیجئے۔ چنانچہ قطب عالم کے سامنے انھوں نے ان کو بیعت کیا۔ اسکے بعد قطب عالم نے شمع برہانی کو ارشاد خلق کیلئے رخصت کردیا۔ شمع برہانی کا مزار قدنپور یا مدنپور میں واقع ہے۔ قدنپور اور قطبی اس وقت دو پورے تھے[1]

میر سوز | قطب عالم کے نسبی سلسلہ سے ہندوستان کے مشہور شاعر سوز بھی ہیں ان کا سلسلہ نسب حضرت قطب عالم گجراتی قدس سرہٗ تک پہنچتا ہے۔ نام سید محمد میر اور سوز تخلص ہے پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ لیکن جب دیکھا کہ میر تقی میر کا نام زیادہ روشن ہے۔ تو انھوں نے سوز تخلص اختیار کرلیا۔ ان کے دادا سید ضیاء الدین بہت بزرگ شخص اور تیر اندازی میں مشہور تھے۔ والد پرانی دہلی کے محلہ قراول پورہ میں سکونت پذیر تھے۔ جب دہلی کی حالت خراب ہوئی تو یہ لباس فقیرانہ اختیار کر کے

[1] خاتمۂ مرأت احمدی ص ۳۲

لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں بھی کامیابی نہ دیکھی تو ۱۲۱۱ء میں مرشد آباد چلے گئے مگر کچھ روز وہاں رہ کر پھر واپس لکھنؤ آئے تو قسمت نے یاوری کی اور نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہو گئے۔ اسی برس کی عمر میں بمقام لکھنؤ انتقال فرمایا۔ ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

عاشق ہوا، اسیر ہوا، مبتلا ہوا ؎ کیا جانیے کہ دیکھتے ہی دل کو کیا ہوا

سرشق ظلم تو نے کیا مجھ کو واہ واہ ؎ تقصیر یہ ہوئی کہ ترا آشنا ہوا

دل تھا بساط میں سو کوئی اسکو لے گیا ؎ اب کیا کروں میں اے مرے اللہ کیا ہوا

پاتا نہیں سراغ کروں کس طرف تلاش ؎ دیوانہ دل کدھر کو گیا آہ کیا ہوا

سنتے ہی سوز کی خبر مرگ خوش ہوا ؎ کہنے لگا کہ رنڈ تو چھوٹا بھلا ہوا[1]

---

[1] تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۰۶ ۔ مرآۃ الشعراء صفحہ ۲۴۰

فارم ۱۷

دیکھو نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت : دار المصنفین اعظم گڈھ پتہ : دار المصنفین اعظم گڈھ

نوعیت اشاعت : ماہانہ نام پبلشر : " "

نام پرنٹر : عتیق احمد ایڈیٹر : ضیاء الدین اصلاحی

قومیت : ہندوستانی قومیت : ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ : دار المصنفین شبلی اکیڈمی۔

میں عتیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ عتیق احمد

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا سنہ ولادت

اور

ابو طالب کلیم کا قطعۂ تاریخ

از

جناب عبدالرؤف خاں ایم۔ اے (اُودی کلاں) راجستھان

عموماً تاریخ گو حضرات واقعات کی تاریخیں ان کے پیش آنے کے وقت یا تھوڑے عرصہ بعد کہا کرتے ہیں لیکن بہت سی تاریخیں طویل عرصہ گزر جانے کے بعد کہی گئی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر تاریخ گو کسی مستند ماخذ کے بجائے اپنے قیاس سے سنی سنائی اور عوام میں مشہور روایت پر اعتماد کر کے مادۂ تاریخ موزوں کر دے تو آنے والی نسلیں اس مادہ سے واقعے کا درست سال نہیں برآمد کر سکیں گی۔ مگر کسی مادۂ تاریخ سے درست سال برآمد کرنے میں ایک اور دشواری یہ پیش آتی ہے کہ قطعۂ تاریخ کے کسی شعر اور قواعد تاریخ گوئی کی رو سے اصح یہ ہے کہ تاریخی شعر بلکہ مادہ میں نہایت لطیف اور پوشیدہ تعمیہ داخلی یا خارجی پنہاں ہوتا ہے۔ جس کی طرف بادی النظر میں توجہ منعطف نہیں ہوتی مثلاً غالب نے جنگ آزادی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء کی تاریخ "رستخیزِ بیجا" سے برآمد کی جو حسب واقعہ ہونے کے علاوہ لطیف تخرجہ کی بھی حامل ہے۔ یعنی "رستخیز" کے اعداد بحساب ابجد ۱۲۷۷ ہوتے ہیں اس میں سے لفظ "بجا" کے چار عدد خارج کرنے پر مطلوبہ سنہ ۱۲۷۳ برآمد ہو جائیگا جس کا واضح قرینہ حرف نفی "بے" ہے۔

موجود ہے لیکن بعض اوقات قطعۂ تاریخ میں تعمیۂ داخلی وخارجی دونوں موجود ہوتے ہیں، جس کے باعث مطلوبہ تاریخ برآمد کرنے کا عمل مزید پیچیدگی اختیار کرلیتا ہے مثلاً ۱۰۵۶ھ میں جب شہنشاہ شاہ جہاں نے نذر محمد خاں والیٔ بلخ و بدخشاں پر فتح حاصل کی تو عبدالرزاق یمنی نے بطریق تعمیۂ تخرجہ وتدخلہ ایک مثالی تاریخ موزوں کرکے حضور شاہ پیش کی اور انعام واکرام سے نوازا گیا۔ تاریخ یہ ہے:

چو سالِ فتح بدخشاں و بلخ راجستم زپیر عقل کہ دانا بود بر اہل زماں
زروئے تعمیہ فرمود فی البدیہہ بمن زمین مرکب و فرِّ قدوم شاہ جہاں

بشد ز "بلخ و بدخشاں" "نذر محمد خاں"
"زر و قبیلہ و املاک" راگذاشت دراں ۱۵۹۵

اس قطعہ کا تاریخی شعر تین حصوں میں منقسم ہے یعنی "بلخ و بدخشاں" کے اعداد کا میزان مع عطف ۱۵۹۵ ہوتا ہے ظاہر ہے کہ جب بلخ و بدخشاں فتح کرلیا گیا تو سابقہ والی "نذر محمد خاں" جسکے حروف کا میزان بحساب جمل ۹۹۷ ہوتا ہے ملک سے خارج ہوگیا یعنی بلخ و بدخشاں کے اعداد ۱۵۹۵ میں سے نذر محمد خان کے اعداد ۹۹۷ منہا کردیئے گئے تو [۱۵۹۵ - ۹۹۷ =] ۵۹۸ باقی رہے۔ اب چونکہ ملک کے "زر و قبیلہ واملاک" پر شاہ جہاں متصرف ہوگیا اسلئے ۵۹۸ میں "زر و قبیلہ واملاک" کے مجموعی اعداد مع عطف ۴۵۸ داخل کردیئے گئے تو مطلوبہ سال [۵۹۸ + ۴۵۸ =] ۱۰۵۶ھ حاصل ہوگیا۔ اور یہی شاعر کا مقصد تھا لیکن اس تاریخ میں از روئے قواعد فارسی تاحال ایک اور پیچیدگی موجود ہے اور وہ یہ کہ "نذر محمد خاں" کے حروف کی عددی قیمت حروف ابجد کی قیمتوں کے حساب سے ۱۶۹۲ ہوتی ہے۔ جبکہ ہم نے ۹۹۷ عدد ہی شمار کئے ہیں یعنی بجائے "نذر" [۹۵۰] کے "ندر" [نون دال مہملہ ورائے مہملہ] کے ۲۵۴ عدد لئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فارسی زبان میں ذال معجمہ دال مہملہ سے تبدیل ہوجاتی ہے۔ جیسے استاذ سے استاد، کاغذ سے کاغد اور گنبذ سے گنبد۔ اور رسیذ سے رسید وغیرہ جس کا قاعدہ اس رباعی سے ظاہر ہے۔

آنانکہ بفارسی سخن میرانند　　در معرض دال ذال رانشانند
قبل وے ار ساکن جز وائے بود　　دال ست وگرنہ ذال معجم خوانند [۱]

یعنی جو لوگ فارسی میں گفتگو کرتے ہیں وہ دال کی جگہ ذال معجمہ کو بٹھاتے ہیں [یعنی بولتے اور لکھتے ہیں] اگر اس سے پہلے ساکن حرف واؤ کے علاوہ ہو تو وہ دال ہے ورنہ اسے ذال معجم کہتے ہیں۔ چنانچہ قطعہ میں تدر [۹۰۰] کے بجائے نذر [۲۵۴] کے عدد حساب میں لئے ہیں

اسی طرح دال مہملہ ذال معجمہ سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کاکوروی کے روضہ کی تعمیر سنہ ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴ء پر جسے ان کے مرید حافظ لعل محمد سوداگر نے تعمیر کروایا تھا۔ حضرت شاہ تراب علی قلندرؒ نے یہ قطعہ تاریخ کہا:

خدایا لعل محمد جزائے خیر دہد　　زسعی او چو بنا گشت روضہ پیرش
تراب خوش شد زبہر یادگاری دہر　　بگفت۔ گنبد پر نور۔ سال تاریخش [۲] ۱۲۳۰ھ

اس تاریخ میں گنبد [۶۷] کے بجائے گنبذ [۲۷۰] کے عدد شمار کئے گئے ہیں جس کا مادہ تعریف سے بے نیاز اور حضرت کے شایان شان ہے۔

اسی طرح کی تاریخیں جو معانما ہوتی ہیں، معمولی ذہنی کاوش سے حل ہو جایا کرتی ہیں، بشرطیکہ طبیعت کو اس فن سے کچھ مناسبت ہو۔

لیکن کسی بھی مادہ تاریخ سے مطلوبہ (درست) سنہ برآمد کرنے میں ایک تیسری دشواری بھی سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض حروف ابجد کے اعداد اخذ کرنے میں اساتذۂ فن کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ ان اختلافی حروف میں الف ممدودہ سرفہرست ہے کہ آیا اس کا ایک عدد شمار کیا جائے یا دو۔ فن تاریخ گوئی کے اصول و مبادیات کی کتابوں میں ہمیں الف ممدودہ کی دونوں طرح کی مثالیں ملتی ہیں، کیونکہ جو تاریخ گو اسکے دو عدد شمار کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ الف ممدودہ میں دو الف [اا] ہیں اور یہ اسی

طرح لکھا جاتا تھا مثلاً آل احمد کو اال احمد لکھتے تھے۔ اسکے برعکس جو اساتذہ الف ممدودہ کا ایک ہی عدد لینے کے سختی سے قائل ہیں ان کا کہنا ہے کہ مد (~) حرف نہ ہو کر محض حرکت ہے جسکے عدد ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ حروف ابجد میں "مد" کوئی حرف نہیں۔ چونکہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی تاریخ ولادت ۱۵ ذیقعدہ سنہ ۱۰۲۷ھ / ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۶۱۸ء کے اُس مادۂ تاریخ میں جسے ملک الشعراء ابو طالب کلیم کاشانی نے برآمد کیا لفظ "آفتاب" وارد ہوا ہے جسکا پہلا حرف الف ممدودہ ہے بستزاد یہ کہ قطعۂ تاریخ کے ایک مصرع میں ایک عدد کے تخرجہ کا اشارہ بھی موجود ہے بہرکیف مادۂ تاریخ "آفتاب عالمتاب" کے الف ممدودہ کو ایک یا دو عدد شمار کرنے کی مثال میں پیش کرتے ہوئے بہت سے تاریخ گو حضرات کو اس مادہ سے سنہ مطلوبہ ۱۰۲۷ھ مستخرج کرنے میں اشتباہ واقع ہوا ہے۔ یا (۲) بعض نے ۱۰۲۶ھ برآمد کرتے ہوئے اسے ہی اورنگ زیب کی ولادت کا سنہ تسلیم کیا ہے۔ یا (۳) الف ممدودہ کے "مد" کے ایک عدد کا اسقاط کیا ہے جس کے سبب بھی ۱۰۲۸ھ ہی برآمد ہوتا ہے۔ جو صحیح سنہ پیدائش ۱۰۲۷ھ کے مطابق نہیں ہے۔ دربار شاہجہانی کے ملک الشعراء مرزا ابو طالب کلیم کاشانی (متوفی ۱۰۶۱ھ) نے اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کی ولادت ۱۰۲۷ھ کے چند سال بعد جو قطعۂ تاریخ کہا تھا وہ یہ ہے۔

داد ایزد بپادشاہ جہاں — خلفی ہمچو مہر عالمتاب
تاج صاحبقران ثانی یافت — گوہر بحر از گرفتہ حساب
نامش اورنگ زیب کردہ فلک — تخت ازیں پایہ گشتہ عرش جناب
چوں بآں مژدہ آفتاب انداخت — افسر خویش بر ہوا چو حباب (۱۰)

خامہ از بہر سال تاریخش

زد رقم: آفتاب عالمتاب[۵] ۱۰۲۸-۱=۱۰۲۷ھ
۴۸۴+۵۴۴=۱۰۲۸

اس مادہ کی سند پر اورنگ زیب عالمگیر کا سال ولادت ۱۰۲۸ھ قرار دینے والے محققین ادب میں ملک و بیرون ملک کے کئی ممتاز اشخاص شامل ہیں مثلاً پروفیسر حامد حسن قادری صاحب نے مادۂ تاریخ آفتاب عالمتاب لکھتے ہوئے خطوط وحدانیہ میں [۱۰۲۸ھ] ثبت کیا ہے[۶]۔ جناب بشیر الدین احمد نے بھی مادۂ آفتاب عالمتاب کے نیچے ۱۰۲۸ھ ہی لکھا ہے[۵] حتیٰ کہ مشہور تذکرہ نگار مولانا مفتی نسیم احمد فریدی علیہ الرحمہ نے بھی سلطان الہند اورنگ زیب عالمگیر کا سال ولادت ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۸ھ شب یکشنبہ اور مادۂ تاریخ آفتاب عالمتاب لکھا ہے[۵]۔ ملک کے باہر کے محققین میں حسین پرتو بیضائی نے اپنے مرتب کردہ دیوان کلیم[۹] تصحیح و مقدمہ ص ۸ اور مہدی افشار نے دیوان کامل کلیم ص ۵ پر مادہ سے بدون تخرجہ ۱۰۲۸ھ ہی لکھا ہے۔ مفتی محمد غلام سرور لاہوری نے بھی اپنی تصنیف گنجینۂ سروری ص ۱۸۷ پر ۱۰۲۸ھ کے مادے ہی برآمد کئے ہیں ممکن ہے ان کے پیش نظر بھی کلیم کا مادۂ تاریخ رہا ہو۔

اب فن تاریخ گوئی کے اصول و مبادیات پر بیش بہا تصنیفات یادگار چھوڑنے والے تاریخ گو حضرات کی وضاحت و تشریح ملاحظہ ہو۔ اس سلسلہ میں پہلے فن تاریخ گوئی کے مسلم الثبوت استاد جناب منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی (م ۱۹۱۱ء) کا یہ بیان ملاحظہ ہو۔

"ابوطالب کلیم ہمدانی نے الف ممدودہ کے دو عدد قرار دیئے ہیں۔ اور یہی طریقہ اچھا ہے ...... [اسکے بعد مذکورہ قطعۂ تاریخ کے تین شعر یعنی پہلا اور آخری دو شعر "طبع دریافت سال تاریخش" نقل کر کے فرماتے ہیں]

اس مادہ میں بقاعدۂ مرقومہ بالا [یعنی الف ممدودہ کے دو عدد شمار کرنے پر] ایک عدد زیادہ تھا۔ شاعر نے آفتاب افسر نوش انداخت سے اشارہ کیا کہ مدالف جو علامت ممدودہ کی ہے گرا دیا پس ایک ہزار ستائیس باقی رہے[۱۰]۔"

لیکن تسلیم صاحب کے قاعدہ کی رو سے آفتاب کے ۴۸۴ عدد کے بجائے ۴۸۵ ہونگے اور پورے مادۂ تاریخ "آفتاب عالمتاب" کے ۱۰۲۹ لہٰذا ایک عدد کے اسقاط کے بعد ۱۰۲۸ھ حاصل ہونگے نہ کہ ۱۰۲۷ھ۔

اس فن کے ایک دوسرے ماہر جناب مولانا نذر علی درد کاکوروی نے اس مادۂ تاریخ کو "مد کے ایک عدد کی مثال" کے تحت نقل کر کے وہی تین شعر پیش کئے ہیں جو تسلیم صاحب نے لکھے ہیں پھر فرماتے ہیں :-

"اس تاریخ میں ایک عدد زیادہ تھا شاعر نے الفاظ آفتاب افسر خویش انداخت سے مد کو گرا کر ایک عدد کی کمی کر دی اس طرح ۱۰۲۷ھ برآمد ہوئے بادشاہ کے لڑکے کا سنہ ولادت یہی تھا۔"

درد صاحب نے اورنگ زیب کا سنہ ولادت یقیناً درست برآمد کیا ہے۔ مگر ان کی توقیع رائے پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب "آفتاب" کا مد ساقط کر دیا گیا تو بدون مد "افتاب" ہوا جس کی عددی قیمت بھی وہی ۴۸۴ ہوگی۔ ایسی صورت میں مد ساقط کرنے سے آفتاب کی عددی قدر پر کیا فرق واقع ہوا؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا جبکہ مادہ سے مد نہیں بلکہ الف [الف ممدودہ] خارج کیا ہے۔ اور مع مد اس کی عددی قیمت وہی شمار کی ہے جو الف کی ہوتی ہے۔

تیسری رائے صاحب فرہنگ آصفیہ جناب سید احمد دہلوی کی ہے سید صاحب الف ممدودہ کی عددی قیمت کی نسبت اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

"الف ممدودہ کی نسبت اختلاف ہے۔ اگرچہ تمام تاریخ گویوں نے اس کا ایک ہی عدد مانا ہے۔ مگر بعض نے دو بھی شمار کئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ مد درحقیقت الف مقصورہ اور ہمزہ سے مرکب ہے پس اسکے دو عدد کیوں نہ مانے جائیں۔ چنانچہ

مرزا طالب کلیم نے اسی پر عمل کر کے عالمگیر کے پیدا ہونے کی تاریخ میں آفتاب کے
الف ممدودہ کو دو الف لے کے تخرجہ کیا ہے۔"

سید صاحب کے آخری فقرہ کا منشا درحقیقت تاریخ آفتاب عالمتاب سے ہے اور ان کے بقول
اس مادہ سے ۱۰۲۸ھ کا سنہ نکلتا ہے۔ گویا یہی شہزادہ کی تاریخ ولادت ہے۔

شمس العلما نواب عبدالعزیز جنگ بہادر جو الف ممدودہ کا ایک عدد محسوب کرنے
کے سختی سے قائل ہیں فرماتے ہیں کہ :-

"اس میں کچھ شک نہیں کہ متقدمین فارس میں اس کا رسم الخط دو الف کے
ساتھ تھا۔ [یعنی اا] جیسا کہ بعض فرہنگ ہائے فارس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے
اور غالباً ان کا یہ طرز عربی رسم پر مبنی تھا جو اب تک قائم ہے لیکن جب متاخرین
نے اسکو بدل دیا اور رسم الخط عربی کی حقیقت کی صراحت جو اوپر کر دی گئی ہے، کا
ذکر اوپر ہوا ہے۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ کلیۂ عام اور قاعدے کے برخلاف الف
ممدودہ کے دو محسوب ہوں۔ صاحب [illegible] الف ممدودہ کے
عدد دو ہی محسوب ہوں۔ اور مرزا محمد جعفر اوج نے اپنی تالیف ارمغان میں بھی
انہیں کے ساتھ اتفاق فرمایا ہے۔ اور سند میں کلیم ہمدانی کی تاریخیں پیش کی ہیں
جن کی نقل ذیل میں کی گئی ہے"

دیگر تاریخوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہاں صرف مفید مطلب قطعہ تاریخ کے
تین شعر ہی نقل کرتے ہیں۔ جو [illegible] صاحب ان سے نقل کئے ہیں۔ اور [illegible]
موصوف نے لکھتے ہوئے کلیم پر نقد کیا ہے۔ نیز مادہ کے نیچے اعداد بھی لکھے ہیں۔

وآد ایزد بپادشاہ جہاں　　خلفے ہمچو نو گل شاداب

چوں بدیں مژدہ آفتاب انداخت   افسر خویش بر ہوا چو حباب
طبع دریافت سالِ تاریخش   زد رقم۔ آفتاب عالمتاب
۱۰۲۹ = ۱۰۲۸

نواب صاحب موصوف کلیم پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"کلیم ہمدانی کا پایہ فن جمل میں کچھ ایسا بلند نہ تھا جس کی سند پر قاعدہ عام اور استادان فن اور ائمہ جمل کے قول کی خلاف ورزی کریں۔"[۳۱]

نواب عبدالعزیز و آآ، راسی صاحب نے اپنا زورِ قلم تسلیم و اوج کی تردید میں صرف کرتے ہوئے کلیم کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتلاتے کہ اورنگ زیب علیہ الرحمہ کا صحیح سالِ ولادت کیا تھا؟ دراصل ان تاریخ گو اساتذہ کو اشتباہ اسلئے ہوا کہ انھوں نے سالِ ولادت ۱۰۲۸ تسلیم کیا ہے۔ اسکے برعکس اگر صحیح صورت حال ان بزرگوں کے پیش نظر ہوتی تو اس تاریخ میں نہ الف ممدودہ کے دو عدد شمار کرنے کی نوبت آتی اور نہ وہ کلیم کا پایہ فن تاریخ گوئی میں فروتر بتلاتے۔ میر نذر علی درد کاکوری نے سنہ البتہ درست برآمد کیا مگر چاہے الف ممدودہ کے "مد" کو گراکر۔ دیگر حضرات نے بھی "افسر خویش" سے مراد آفتاب کا مد ہی لیا ہے جبکہ افسر آفتاب انداخت سے مراد آفتاب کا پہلا حرف الف ممدودہ [آ] ہے جسکی عددی قدر کلیم نے اصول کے مطابق صرف ایک شمار کی ہے نہ کہ دو۔ جیسا کہ پروفیسر عبدالرب عرفان صاحب صدر شعبۂ اردو و فارسی دانش کدہ ناگپور۔ نے مذکورہ مادہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

"مادۂ تاریخ "آفتاب عالمتاب" تعمیہ کے ساتھ کہا گیا ہے۔ اس سے ۱۰۲۸ کا عدد مستخرج ہوتا ہے جبکہ حضرت اورنگ زیب کی ولادت کا سال ۱۰۲۷ ہے۔ چنانچہ کلیم نے چوتھے شعر میں آفتاب کے اپنے تاج یعنی پہلے حرف (الف) کو ہوا میں گرا دینے کی بات کہہ کر ۱۰۲۸ میں سے الف کے ایک عدد

کے اسقاط کی جانب اشارہ کیا ہے۔[۱۴]

اس رائے کی تائید دیگر اساتذۂ فن کے بہت سے مادہ ہائے تاریخ سے بھی ہوتی ہے کہ افسر یا تاج سے مراد کسی لفظ کا پہلا حرف ہوتا ہے مثلاً شہنشاہ ہمایوں نے ۹۴۲ھ میں سام مرزا پر فتح حاصل کی تو ملا بیکسی نے یہ قطعۂ تاریخ کہا:

آں دم کہ تاج و کاسۂ زر در نظر نمود | در بزم رزم شکل صراحی و نقش جام
پرسید از خرد کہ چرا تاج زرفتاں | افگند ہمچو لالۂ احمر دریں مقام

گفتا سپہر از پئے تاریخ ایں مقال
افگند تاج زر ز شکست سپاہ سام[۱۵]
۹۴۹ - ۷ = ۹۴۲ھ

یعنی "شکست سپاہ سام" کے مجموعی اعداد ۹۴۹ میں سے "زر" کا تاج جو زائے معجمہ کے سات عدد "افگند" کرا دینے سے مطلوبہ سنہ ۹۴۲ برآمد ہو گیا۔

حافظ معز اللہ علوی کاکوروی نے حضرت شاہ محمد کاظم کے سانحۂ ارتحال پر درج ذیل قطعۂ تاریخ موزوں کیا۔

شاہ کاظم ازیں جہاں بربست | رخت ہستی بجانب اعلیٰ
از خدا زیرِ افسر طوبیٰ | مسکنے یافت جنت الماوی[۱۶]
۱۲۱۲ + ۹ = ۱۲۲۱ھ

اس تاریخ میں افسر طوبیٰ طائے حطی ہے جس کے ۹ عدد کا تدخلہ کرتے ہوئے سال رحلت برآمد کیا ہے۔

"تاج" الفاظ کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو: نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی شہادت ۱۱۵۹ھ کے موقع پر فارسی کے مشہور شاعر شیخ علی حزیں نے یہ تاریخ کہی:-

چو قرعہ بہ شرف دولت وصال زدند | بریں میانہ بنام امیر خاں افتاد؟

قلم تعمیہ کرد ایں رقم بہ فراق | زفرقِ فخر و شرف تاجِ زیب و شاں افتاد
۱۴۶۶ − ۳۰۷ = ۱۱۵۹ھ

یعنی فخر و شرف کے سر سے زیب و شاں کا تاج گر گیا۔ تاریخ گو کا مقصد یہ ہے کہ "فخر و شرف" کے مجموعی اعداد ۱۴۶۶ میں سے "زیب و شاں" کے تاج [ز + ش] کے ۳۰۷ عدد خارج کر دیئے جائیں مطلوبہ سنہ ۱۱۵۹ برآمد ہو جائیگا۔

یا: نواب ممتاز حسین خاں والیٔ پاٹودی ۱۸۹۸ء کے قطعۂ وفات کا تاریخی شعر:

از سرِ آہ فکرِ سال تھا یاس | بولا رضوان: خدا نے بخشش کی
۱۸۹۷ + ۱ = ۱۸۹۸ء

اس تاریخ میں "سرِ آہ" مدنظر ہو کر الف تعمیہ ہے۔

گو کاظم ہمدانی کا مادۂ تاریخ بے حد لطیف اور تعریف سے بے نیاز ہے لیکن اس میں یہ قم مزور ہے کہ تعمیہ تاریخی شعر یا مادہ کے بجائے اس سے پہلے کے شعر میں وارد ہوا ہے جبکہ اسے اسی بیت میں ہونا چاہیئے تھا۔ جو تاریخ کا حامل تھا۔ مثلاً محمد طاہر نصر آبادی نے قاضی حاجی کی وفات ۹۶۱ھ پر تعمیہ تخرجہ کے ساتھ تاریخ کہی:

جو تاریخِ وفات اوز سرِ عقل پرسیدم | بصد آہ و فغاں گفتا یکے از قاضیاں کم شد
۹۶۲ − ۱ = ۹۶۱ھ

یعنی قاضی حاجی کے انتقال کے سبب "قاضیاں" [۹۶۲] میں سے ایک قاضی کم ہو گیا۔

اگرچہ کاظم نے دیگر بھی قطعاتِ تاریخ نہایت لطیف تعمیہ کے ساتھ کہے ہیں۔ جن کے مادہ ہی میں تعمیہ موجود ہے۔ مثلاً خود اورنگ زیب کی کتخدائی [۱۰۴۶] کے قطعہ کا یہ تاریخی شعر دیکھیے:

فلک گفت تاریخِ جشنِ زفافش | "دو گوہر بہ یک عقد دوراں کشیدہ"
۱۰۴۷ − ۱ = ۱۰۴۶ھ

بقول پروفیسر عبدالوہاب عرفان:

"یہ تاریخ اتنے لطیف، مبہم اور داخلی نوعیت کے تعمیے کے ساتھ کہی گئی ہے کہ مطلوبہ سال تک ذہن کی رسائی فوراً نہیں ہو پاتی[اسی وجہ سے بعض حضرات نے

۱۰۴۷ لکھا ہے۔ تعمیے کی صورت یہ ہے کہ زمانے نے دو گوہروں کو ایک رشتے [لڑی، ڈورے] میں پرو کر ایک کر دیا۔ اس قرینے سے ایک گوہر یعنی ایک عدد حساب سے خارج ہو گیا۔ (۱۰۴۷-۱=۱۰۴۶)[19]

اورنگ زیب کی ولادت کے مادہ میں بظاہر جو سقم نظر آتا ہے اسکے بارے میں علامہ غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ نے فرمایا ہے کہ:

"یک عدد ایں تاریخ زیادہ دارد لہذا تعمیہ کردہ گفت، آفتاب افسر خود کہ الف است، انداخت۔ مولف گوید: تعمیۂ تاریخ خارج زیبی کہ مشتمل بر مادۂ تاریخ است، طبع نازک نمی پسندد و فقیر تعمیۂ اسقاط الف در خود مصراع تاریخ بر آوردہ، یعنی مادۂ تاریخ الف اول آفتاب صورت رقم ہندسی دارد، آفتاب عالمتاب رقم را زد، الف ساقط گشت"[20]

علامہ کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ اس تاریخ میں ایک عدد زیادہ تھا، اسے تعمیہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ آفتاب کا افسر یعنی تاج جو کہ الف ہے، گرا دیا گیا۔ مؤلف یعنی مصنف کہتا ہے کہ تعمیہ اُسی بیت میں ہونا چاہیے جو مادۂ تاریخ پر مشتمل ہو، ورنہ طبع نازک اسے پسند نہیں کرتی۔ فقیر نے مصرعۂ تاریخ ہی سے اسقاط الف کا یہ قرینہ برآمد کیا ہے یعنی مادہ تاریخ میں آفتاب عالمتاب میں پہلا الف رقم ہندسی کی صورت رکھتا ہے یعنی حرف الف "ا" اور ایک کا عدد "۱" ہم شکل ہوتے ہیں اور دونوں کی عددی قیمت بھی ایک ہے۔ چنانچہ مصرعۂ آخر میں آفتاب عالمتاب کو "زد" کا فاعل اور رقم کو اسکا مفعول قرار دیا جائے۔ تو مصرعہ کی نثر علامت مفعول کے ساتھ۔ آفتاب عالمتاب رقم را زد۔ ہوگی اور اس قرینے سے آفتاب کے پہلے الف کے اسقاط کی صورت نکل آئیگی۔ علامہ آزاد نے تعمیے کی اس لطیف داخلی صورت کی بازیافت سے کلیم ہمدانی کے مادۂ تاریخ کے فنی سقم کا ازالہ فرما دیا[21]

اور بہت ممکن ہے کہ ملک الشعرا کلیم کے ذہن رسا میں بھی یہ قرینہ رہا ہو۔

مذکورہ بالا تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ :-

اولاً :- کلیم نے آفتاب کے الف ممدودہ کا ایک عدد ہی محسوب کیا ہے جو تاریخ گوئی کے اصول کے عین مطابق ہے۔ کلیم جیسا ذہین و فطین انسان، دو عدد شمار کرتے ہوئے اصول تاریخ گوئی سے انحراف کا مرتکب ہونا ہرگز پسند نہیں کر سکتا تھا۔

ثانیاً :- افسر آفتاب خویش انداخت [یا آفتاب عالمتاب] میں افسر آفتاب سے مراد آفتاب کی حرکتِ مد نہ ہو کر بذات خود الف ممدودہ ہے۔ معنوی تاریخوں میں حرکت کا کوئی عدد شمار نہیں ہوتا۔ حرکات کے اعداد صرف صنعتِ اعراب کی تاریخوں ہی میں شمار کیے جاتے ہیں جو بالکل علاحدہ اور کسی حد تک نسبتاً ایک مشکل صنعت ہے۔

ثالثاً :- تعمیہ تخرجہ و تدخلہ کے اظہار کیلئے اساتذۂ فن موقع کی مناسبت اور عروضی وزن کے لحاظ سے مصرعۂ تاریخ یا بیت تاریخ میں کبھی افسر کبھی تاج لاتے ہیں۔ جیسا کہ مثالیں پیش کی گئیں۔ اور کبھی "سر یا رُو" وغیرہ لاتے ہیں۔ مثلاً سقوط خلافت عثمانیہ ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۰ء کی یہ تاریخ دیکھئے جو مفہوم کے اعتبار سے ملت اسلامیہ پر آج بھی صادق آتی ہے۔

مسلم آج زمانے سے اٹھ رہے ہیں　　　سنتے ہی نہیں بات گرگی

سر پیٹ کے کہہ اے اہل اسلام - ا

"افسوس ہوئے تمام ترکی" ۱۳۴۹-۱=۱۳۴۸ھ

یا شاہجہاں کے بیٹوں کی باہمی جنگ کی تاریخ ۱۰۶۸ھ کا صرف یہ تاریخی شعر ملاحظہ ہو جو صاحبِ مفتاح التواریخ نے نکالی ہے۔

"بے تامل تیر آہے بکشید و فرمود　　　"پسراں را ہمہ بدخواہ پدر دید بہ بیم"

۴۷۱ + آ = ۴۷۲ -　　　۱۵۴۰ - ۱۰۶۸ھ

پہلے مصرعہ میں تأمل + آ کے تخرجہ کا قرینہ موجود ہے۔ یہاں بھی سر آب ہے "الف ممدودہ ہے نہ کہ صرف مد۔ یہ پورا قطعہ تاریخ حافظ کی ایک غزل کے اشعار یا مصرعوں پر [illegible] رؤ کے تخرجہ کی مثال ہیں ایک حمام کی تعمیر کی تاریخ کا یہ شعر دیکھئے جو حکیم [illegible] اللہ [illegible] نے تعمیر کرایا تھا

بشستم روئے لفظ آں گاہ گفتم — "شدہ تعمیر اکبر [illegible]" ۱۲۹۸ - ۳۰ = ۱۲۶۸ / ۱۲۹۸ - ۳۰ = ۱۲۶۸ھ

اورنگ زیب علیہ الرحمتہ کے مادۂ ولادت کے سلسلہ میں اساتذۂ تاریخ گوئی کی فروگذاشت کی طرف توجہ اسلئے مبذول کرائی گئی ہے کہ شائقین تاریخ گوئی اور اس فن پر کام کرنے والے طلبہ ان معیاری کتب کا مطالعہ کرتے وقت [illegible] تاریخ [illegible] ان حضرات کے سقم کو درست سمجھ کر غلط نتیجہ برآمد نہ کرلیں۔

حواشی

ؔلہ مقالہ فن تاریخ گوئی از مولانا نذر علی درد کاکوروی مشمولہ ماہنامہ شاعر آگرہ بابت ماہ جون ۱۹۳۳ء ص ۱۵ کالم ۱ واقعات دارالحکومت [دہلی ۱: ۴۵۲ فٹ نوٹ].

ؔلہ رسالہ قواعد از پروفیسر مولوی محمد نجف علی خان ص ۲۴ سنہ طباعت غالباً ۱۸۶۲ء یا اسکے بعد

ؔلہ تفصیل مزارات صاحبان خانقاہ کاظمیہ کاکوری از ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی ص ۴۲ مطبوعہ ۱۹۹۰ء

ؔلہ اے شارٹ ہسٹری آف اورنگ زیب از جدو ناتھ سرکار، ہسٹری آف شاہجہاں آف دہلی از بنارسی پرساد سکسینہ ص ۱۵۔

ؔ۵ مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی ایم۔ اے ص ۲۱ - ۱۲۰ دار المصنفین اعظم گڈھ سنہ طباعت ندارد

۶ے رک داستان تاریخ اردو ص ۳۲، حاشیہ ناشر لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ سنہ ۱۹۵۶ء

۷ے رک واقعات دار الحکومت دہلی از بشیر الدین احمد ج ۱ ص ۳۷۶ فوٹ نوٹ۔

۸ے دیکھئے مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی ص ۲۹۷ کتب خانہ الفرقان لکھنؤ ستمبر سنہ ۱۹۸۴ء

۹ے ملہم تاریخ [ترجمہ تلخیص تسلیم] از سید اقتدار احمد ساحر سہسوانی ص ۳۶ مطبوعہ سنہ ۱۹۱۲ء مطبع العلوم مراد آباد

۱۰ے مقالہ فن تاریخ گوئی از درد کاکوروی مشمولہ ماہنامہ شاعر آگرہ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء ص ۱۵ کالم ۲

۱۱ے فرہنگ آصفیہ ج ۱ ص ۸۰۵ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی سنہ ۱۹۷۴ء

۱۲ے عرائب الجمل ص ص ۸۵-۸۴ عزیز المطابع حیدرآباد سنہ ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء

۱۳ے مقالہ اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں مشمولہ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ج ۱۴۲
شمارہ ۲ ص ۱۰۳-۱۰۲ ۔

۱۵ے واقعات دار الحکومت دہلی ۲: ۲۴۲-۲۴۱

۱۶ے تفصیل مزارات ..... کاظمیہ کاکوری ص ۲۱

۱۷ے شعر العجم فی الہند از شیخ محمد اکرام ص ۲۰۷ مطبوعہ سنہ ۱۹۶۱ء

۱۸ے مکتوب گرامی استاذ محترم پروفیسر عبدالرب عرفان صاحب (سابق ناگپور) مورخہ ۸ مارچ ۱۹۹۳ء
بنام راقم

۱۹ے معارف فروری سنہ ۱۹۸۹ء ص ص ۱۰۸-۹ ۔

۲۰ے خزانۂ عامرہ ص ص ۲۹۶-۷ مطبوعہ سنہ ۱۹۰۰ء مطبع نولکشور، کانپور۔

۲۱ے دفتر تاریخ ۸: ۸۲ مصنفہ نواب سید محمد جعفر علی خاں جناب رئیس شمس آباد، یا حی المومنین
پریس کاظمین لکھنؤ سنہ ۱۹۲۰ء

۲۲ے واقعات دار الحکومت دہلی ۲: ۱۸۲

سندھ میں بھگوت گیتا
کا
دو سو سال پرانا اُردو مخطوطہ

از پروفیسر سید محمد سلیم لاہور۔

شاہ ولی اللہ اورنیٹل کالج منصورہ جو ہالا اور پیر جھنڈا کے درمیان ۱۹۶۰ء میں قائم ہوا تھا اور تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینے کی اسکیم کے تحت ذوالفقار علی بھٹو کے دور (۱۹۷۲ء) میں یہ واحد اورنیٹل کالج تھا جو سرکاری تحویل میں لیا گیا۔ ادارہ کے منتظمین نے بدنیتی کے تحت حکومت کے خلاف مقدمہ دائر کیا جو آج تک چل رہا ہے۔

اس کالج میں ایک دارالکتب اور ایک دارالآثار ہیں۔ دارالکتب میں قلمی کتابیں ڈھائی سو کے قریب ہوں گی۔ ان میں سے ایک کتاب بھگوت گیتا ہے جس کا تعارف یہاں کرانا مقصود ہے۔

یہ بھگوت گیتا کا ترجمہ ہے۔ کاتب کا نام اس طرح ہے۔

" مولرام ولد مہتہ آنند رام باشندہ سیوستان "۔ سیوستان کو آج کل سیوہن کہتے ہیں جو ضلع دادو کا مشہور شہر ہے۔ یہاں لال شہباز قلندر کا مزار ہے۔ جس کی زیارت کرنے محمد شاہ تغلق اور فیروز شاہ تغلق بھی آئے تھے۔ کتاب کے ایک خالی صفحہ پر ایک صاحب دھرم داس نے کاتب آنند رام سے اپنا تعلق اس طرح ظاہر کیا ہے۔

آنند رام

ھردا رام — مولرام — محبوب رائے

مولرام

ڈیون مل
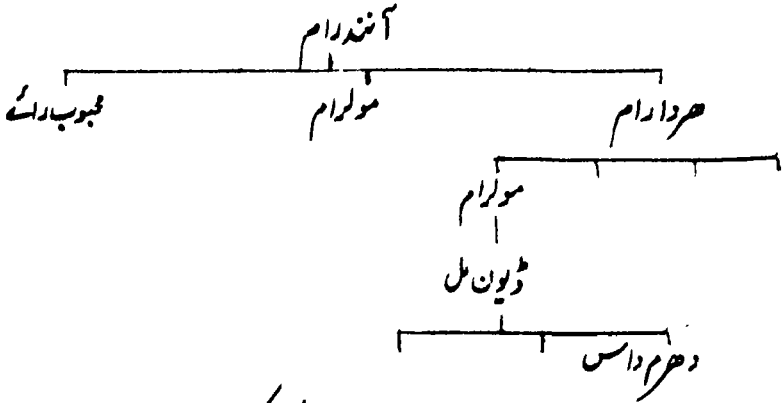
دھرم داس

دھرم داس نے یہ تحریر ۲۷ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو لکھی ہے۔ کاتب کے مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔

کاتب نے یہ نسخہ (فارسی حصہ) ۲۵ ماہ ذی الحجہ ۱۱۹۵ کو ختم کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں وہ لکھتا ہے:

"ایں مہا پران سری بھاگوت کہ مشتمل بر بیدانت و دہرم دلیلائے سری مہاراج جیواست، بہ یمن تائیدات سری مہاراج جیو از دست ہیچ مدان نیاز ارتام غلام مولرام ولد حضرت آنند رام سرگ باشی بتاریخ بیست و پنجم ماہ ذی حجہ ۱۱۹۵ ہشت درادسی سندھی ماہ نہری سمبت ۱۸۳۸ اتمام یافت۔"

قلمی کتاب کا تتبع کرنے سے معلوم ہوا کہ کاتب ۲ تو ۲ کے لیے ۳، ۳ کے لیے لکھتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ۱۸۳۸ سمبت ہے جو ۱۷۸۱ عیسوی کے مطابق ہے۔

یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اس میں بارہ ابواب ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

باب اول۔ در مفصل ساختی خلق ۱۴ فصل

باب دوئم۔ در بیان کردن حقیقت اوتار ۶ فصل

باب سوئم۔ در تفقد اوتار ۱۲ فصل

باب چہارم ۔ در حقیقت بعضے اوتار ۱۰ فصل

باب پنجم ۔ در احوال راجہ بھیر برت دراجہ جدرتھہ ۵ فصل

باب ششم ۔ در آفرینش دیوتہا و دیوتہاں ۱۰ فصل

باب ہفتم ۔ در احوال جی بجی داوتار نرشنگھ ۱۳ فصل

باب ہشتم ۔ در شور اندن دریا و ظہور آں ۱۰ فصل

باب نہم ۔ در تفصیل اولاد سہنوی ۱۳ فصل

باب دہم ۔ در بیان لیلائے سری کرشن ۱۹ فصل

باب یازدہم ۔ در گیان گفتن •

باب دوازدہم ۔ در احوال مردم کلجگ ۶ فصل

کتاب کے آخر میں ایک باب اردو میں لکھا ہے ۔ اس کا عنوان ہے ۔

سوست سری گنشیاءا لخ سری سچا نندا لخ بھگوت باسدیو، سری بھگوت گیتا ۔ سری کرشن جیو ارجن سنیاوے ۔

نمونہ زبان ۔

جب پاندو اور کروں مہا بھارتھہ کے جدہ کوں کورکھیتر کوں چلے ۔ تب راجہ دہراشت کہو ۔ ہوں بھی جدہ کا کوتک دیکھن کوں چلوں ہوں ۔ جب بات دہراشت کہی تب تس کوں سری بیاس جیو کہیو ۔ جو ہی راجہ تیرے تو نینتر[1] ناہیں ۔ نینتر[1] بنا کیا دیکھیں گا ۔ تب دہراشت کہو ۔ جو ہوں دیکھوں کا ۔ ناہیا تو سروں دوار کر سروں کروں کا ۔

---

[1] مسئلہ غالباً یہ نیں ہے ۔

ایک اور مقام پر ہے:

"ارجنو ورچہ ۔ ہے جادو نبسیوں کہی سریشٹ سری کرشن بھگوان کرپا ندہان

جیو ۔ ریہہ بات سبھی منکہ سمجھتے ہیں۔ جو پاپ کیے تیں دو کہہ پاے ہے ۔

جیسے بکہہ کھایئے ۔ تیں پرانے کا مانس ہوتا ہے تیسے ہی پاپ کرم تیں

دوکہہ پائے ہے ۔ ریہہ بات سمجھ کر ہے ۔ پر بہہ جیو ان منکھوں کوں پاپ

بل کرکر کون کراوے ہے ۔ سو مجہہ کوں کرپا کر کہو ۔

اردو حصہ سوسوا سو صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کے آخر میں یہ تحریر ہے:

سپورن بھئی بھگوت گیتا تمہت پورن ماسی تاریخ چہاردہم ماہ محرم ۱۹۷

سنہ ہی ماہ پوہ سمت ۱۸۲۰ بکرما سری کرسن بھگوان جیو کرپا ساگر دیا سروپ آنند

روپ کرپال دیال۔

بدستخط درساں کے داس بندہ نیاز ارتسام مولرام ولد مہتہ آنند رام سرگباشی

سورت قیامیت یافت واقع حویلی سیوستان۔

اس سے کاتب کا نام اور کتابت کا سن معلوم ہو گیا۔ لیکن مترجم کون ہے؟

ترجمہ کب ہوا؟ فارسی اور اردو کا مترجم ایک ہی شخص ہے؟ یا دو۔ یہ کچھ نہیں معلوم۔

مقالات شبلی (جلد دوم)

اس جلد میں مولانا شبلی نعمانیؒ کے ادبی مضامین جمع کیے گئے ہیں، جن کے آخری

تین مضامین یہ ہیں، اردو ہندی، بھاشا زبان اور مسلمان، تحفۃ الہند (ہندی صنائع

بدائع) اس جلد کی قیمت ۱۵ روپے۔ آٹھ جلدوں پر مشتمل پورے سیٹ کی قیمت

۲۲۰ روپے ہے۔

"منیجر"

اخبار علمیہ

ایران سوسایٹی کلکتہ اور اس کے علمی و تحقیقی انگریزی مجلہ انڈو ایرانیکا کی بعض اہم خدمات کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے، یہ فارسی زبان و ادب کی خدمت کی غرض سے اگست ۱۹۴۴ء میں قائم ہوئی تھی اور بعض نامساعد حالات کے باوجود اب تک سرگرم سفر ہے، اس کے مجلہ انڈو ایرانیکا کو ملک و بیرون ملک کے اہم اہل قلم کا تعاون حاصل رہا، ان میں ایک نام دار المصنفین کے سابق ناظم مرحوم جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا بھی ہے، حال ہی میں مجلہ کی پینتالیسویں جلد کا خاص شمارہ ملا تو معلوم ہوا کہ اسے ایران سوسایٹی نے ازراہ قدر و احسان شناسی ڈاکٹر بی، سی، لا کے ساتھ جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم کے نام معنون کیا ہے اور اس میں مرحوم کی شخصیت اور علمی خدمات پر جناب سید شہاب الدین دسنوی، جناب غلام سرور، ڈاکٹر ایم فیروز اور ڈاکٹر جاوید علی خاں کے مضامین شایع کیے ہیں، جن سے ایران سوسایٹی سے مرحوم کے قلبی ربط کی یادیں تازہ ہوگئیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ ادارہ اس سال اگست کے مہینہ سے اپنے جشن طلائی کی تقریبات منعقد کر رہا ہے اور اس موقع پر علمی و ادبی پروگراموں کے علاوہ مجلہ انڈو ایرانیکا کا گولڈن جبلی نمبر بھی شایع ہوگا۔

اسلام آباد پاکستان کا مقتدرہ قومی زبان اس وقت اردو زبان کی خدمت انجام دینے والوں میں سر فہرست اور لایق رشک ہے، اس کے مختلف شعبوں میں شعبۂ لغات

واصطلاحات کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس کی شایع کردہ انگریزی اردو لغت کا ذکر کیا جا چکا ہے، اب معلوم ہوا کہ سائنسی و تکنیکی لغت اور قانونی انگریزی اردو لغت کی تیاری شروع ہو چکی ہے، اسپرانتو، عربی اور ترکی زبانوں کے لغات پہلے ہی شایع ہو چکے ہیں، ۹۳-۱۹۹۲ء کے مالی سال میں جرمن اردو اور سنسکرت اردو کے علاوہ نائیجریا کی اہم زبان "ہوسا" کا ہوسا اردو لغت بھی شایع ہوا، ہندی اردو اور چینی اردو لغات کی تیاری میں پیش رفت کی خوش خبری بھی ہے، ان قابل قدر کاوشوں کے لیے ادارہ داد و تحسین کا مستحق ہے۔

عرصہ ہوا موہنجداڑو اور ہڑپا کی کھدائی کے دوران قریباً سات سو مہریں ملی تھیں ان پر کندہ تحریریں اس وقت سے اب تک محققین کو حیران و سرگرداں کیے ہوئے ہیں ان میں والٹر اے فیرسروس بھی ہیں جنھوں نے اپنی ضخیم کتاب دی روٹس آف اینشنٹ انڈیا میں مایوس ہو کر اس راز کو حل کرنے کی کوشش کو ترک کرنے کا اعلان کیا اور یہ لکھا کہ یہ مہریں کبھی نہیں پڑھی جا سکتیں، ان کے علاوہ بعض اور اہم ماہرین و محققین بھی اپنی ناکام کوششوں سے دل برداشتہ ہو گئے، لیکن اب ایک عام اور گمنام اور کیرالا کے معمر ریٹائرڈ فوجی مسٹر کے رمن نے اس میدان میں اپنی کامیابی کا دعویٰ کیا ہے، معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے چالیس سال سے ان مہروں کو اپنی کاوش و تحقیق کا مرکز بنا رکھا ہے، وہ کئی زبانوں سے واقف ہیں اور انھوں نے "انڈس ویلی اسکرپٹ اسٹڈی سوسایٹی" کے نام سے انجمن بھی قائم کر رکھی ہے، ان کی ایک کتاب بھی ملیالم زبان میں "ہڑپائی مہروں کے متعلق سچائیاں" کے نام سے شایع ہوئی ہے، ان کی دریافتیں وادی سندھ کے رسم الخط کے متعلق عام تصورات اور مفروضوں سے مطابقت نہیں رکھتی ہیں بلکہ بعض حیثیتوں

سے وہ کئی لسانی اور تمدنی مسلمات پر سوالیہ نشان قائم کر دیتی ہیں، مثلاً ان کا خیال ہے کہ آریوں کا وجود بہت نمایاں اور ممتاز نہیں تھا اور ہندوستان میں دراویڈیوں کی تہذیب سے جدا کوئی اور تہذیب نہیں تھی، ان کے نزدیک یہ نظریہ بھی مضحکہ خیز ہے کہ دراویڈی تہذیب صرف وادی سندھ ہی میں محدود تھی۔ مسٹر رمن نے اپنے خیالات کی تائید میں ایک دلیل یہ دی ہے کہ ہڑپائی رسم الخط کے معاملہ میں مغربی محققین کو یہ مغالطہ ہوا کہ وہ محض ایک مخصوص اور محدود زبان کی علامت ہے، اس کے برعکس مسٹر رمن نے اس مفروضہ سے کام شروع کیا کہ ہڑپائی زبان نے دیگر زبانوں پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے اور بعض آثار و قرائن سے انکو اپنے اس نظریہ کے اثبات میں قوت ملی کہ تمام زبانوں کی اصل دراویڈی ہے اور اس طرح انھوں نے ہندوستان کے ابھی عام اور مقبول نظریہ کو باطل اور رد کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنسکرت زبان ام الالسنہ ہے، انھوں نے مثال میں ایک دراویڈی لفظ تھرا THURA کو پیش کیا جس کے معنی دروازہ کے ہیں، یہ لفظ تامل میں THURAI انگریزی میں DOOR ہندی میں دوار، جرمن میں THUR سندھی میں DHARO اور فارسی میں در ہے، انھوں نے ایسی اور بھی کئی مثالیں دی ہیں، انھوں نے دراویڈی زبان کی بربادی کا سبب سنسکرت زبان کے ظہور و عروج کو بتایا جسے دیوتاؤں کی زبان قرار دیا گیا، مسٹر رمن کے الفاظ میں اس قسم کی باتیں "لسانی سوفسطائیت" کی مظہر ہیں، انھوں نے دراویڈی الفاظ کے متعلق بتایا کہ ہر لفظ کسی نہ کسی شکل میں جنس سے متعلق ہے اور اس کا رسم الخط تین حصوں میں منقسم ہے، ایک مرموز و مخفی، دوسرا تصویری رسم الخط اور تیسرا علامتی یا اشارتی، مسٹر رمن کی ان تحقیقات کو ابھی بمشکل چند لوگوں نے قبول کیا ہے۔ تاہم خود ان کو یقین

ہے کہ جلد یا بدیر ان کی تحقیقات کو تسلیم کر لیا جائے گا۔

ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے مسائل سے تعلق اور باخبری کا رجحان اب ہندی اہل قلم میں بھی نظر آرہا ہے، ہندی کے اخبار راشٹریہ سہارا سے معلوم ہوا کہ ایک اشاعتی ادارہ وانی پرکاشن نے کم قیمت پر جدید مسائل سے متعلق کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کی پہلی دو کتابیں 'اجودھیا اور اس سے آگے'، اور 'بھارتیہ مسلمان' ہیں، ان دونوں کے مرتب مشہور صحافی راج کشور ہیں، اول الذکر میں اجودھیا کے قضیہ کے متعلق متعدد مضمون نگاروں کے مضامین کا انتخاب ہے' گردھری راٹھی'، راج موہن گاندھی' سوربھ دوبے' پرشوتم اگروال' اور پرکاش جوشی وغیرہ کے مضامین میں غیر جانبدارانہ رویہ نمایاں ہے' ایک ذمہ دار شہری کے فرائض کیا ہیں' اس سوال کے ساتھ راج موہن گاندھی نے یہ سوال بھی کیا ہے کہ کیا ایک مسجد کو منہدم کر کے تاریخ کی سچائیوں کو بھی نیست و نابود کیا جا سکتا ہے؟ کچھ باتیں مبہم بھی ہیں جیسے یہ کہنا کہ' اجودھیا کا قضیہ ہمارے ماضی کے ساتھ ایک خطرناک فریب ہے، دوسری کتاب بھی ۱۵ مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں پرویز گنگوپادھیائے' منی شنکر ایر' اروند موہن ترپاٹھی کے علاوہ پروفیسر امتیاز احمد' ڈاکٹر رفیق زکریا اور اطہر فاروقی وغیرہ کے مضامین بھی شامل ہیں' ان میں مسلمانوں کے معاشرتی' سیاسی' اقتصادی اور لسانی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ذہن و فکر کی پراگندگی اور آلودگی سے تہذیب' زبان اور آثار قدیمہ کی تباہی و بربادی ناگزیر ہے' اسی طرح فضائی آلودگی سے اور ماحول کی صفائی نہ ہونے سے قدرت کی بے شمار قیمتی مخلوقات بھی برباد ہو کر رہ جاتی

ہیں، حال ہی میں ہندوستان کی ماحولیات اور جنگل کی وزارت نے نباتاتی، حیواناتی اور غاباتی تحقیق و تجزیہ کی نمایندہ تنظیموں کی مدد سے ایک رپورٹ پیش کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں ۴۵ ہزار نباتاتی قسمیں ہیں، ان میں ۱۵ ہزار پھولوں ۵ ہزار سمارودغ (کھمبی) ۲ ہزار سات سو بیلوں اور ۶۰۰ TERIDO PHYTES کی قسمیں ہیں، جانوروں کی ۷۵ ہزار قسمیں ہیں ان میں ۵۰ ہزار کیڑے مکوڑے، ۴ ہزار صدفی (سیپیوں والے) اور ۲ ہزار مچھلیوں کی قسمیں ہیں، ۱۴۰ جل تھلیا (تری اور خشکی دونوں میں رہنے والے جانور) ۴۲۰ حشرات الارض، ۱۲۰۰ چڑیوں اور ۳۴۰ دودھ دینے والے جانوروں کی قسمیں ہیں، ان میں ۱۵۰۰ پودوں ۷۹ دودھ پلانے والے جانوروں، ۴۴ چڑیوں ۱۵ حشرات الارض اور ۳ جل تھلیا جانوروں کی قسموں کا وجود اب خطرہ میں ہے، چاول کی ۵۰ ہزار قسموں میں آیندہ دہائی میں ہندوستان میں صرف ۳۰۰ قسمیں ہی رہ جائیں گی، ان فنا پذیر اقسام کے تحفظ و بقا کے لیے سائنسدانوں نے اس طبعی ماحول کی حفاظت پر توجہ دلائی ہے جس میں ان انواع کی زندگی و روئیدگی کی صلاحیت ہو، دودھ کی افزائش کی غرض سے دیسی گایوں کے ساتھ بعض غیر ملکی گایوں کے اختلاط نسل کا تجربہ بھی دیسی گایوں کی نسل کے خاتمہ کا محرک ثابت ہو رہا ہے، کاش سائنسدانوں کی باتیں سیاست دانوں کے لیے بھی غور و فکر کا ذریعہ بنتیں۔

ع ۔ ص ۔
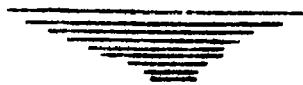
معارف کی ڈاک

مکتوب کراچی

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

جناب محترم ضیاء الدین اصلاحی صاحب السلام علیکم!

امید کہ مزاج گرامی بخیریت ہوگا۔ معارف بابت نومبر ۱۹۹۳ء موصول ہوا حسب معمول یہ پرچہ بے حد معیاری ہے۔ العلم سہ ماہی میں کسی نہ کسی عنوان آپ کے رسالہ کا ذکر بھی ہوتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کا مقالہ ' بریلی کے اہم اخبارات غور سے پڑھا۔ یہ میرے حقیقی پھوپھی زاد بھائی اور سید الطاف بریلوی کے حقیقی بھانجہ ہیں۔ ماشاء اللہ لائق فائق شخص ہیں۔ روہیل کھنڈ گزٹ کے سلسلے میں ایک تحریر ہے کہ:

"پرنٹر پبلشر" کا نام محمد عبدالحمید تھا ... محمد عبدالحمید کا تعلق پنجابیان کی شمسی برادری سے تھا اور وہ مہرالٰہی کلیم مدیر روزانہ اخبار بریلی کا برادر کلاں تھا۔"

حقیقی صورت حال یہ ہے۔ مہرالٰہی شمسی منشی کرم الٰہی کلیم ایڈیٹر روزانہ اخبار بریلی کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ اور ان کے بڑے بھائی کا نام احسان الٰہی تھا۔ مہرالٰہی نے سکھر سندھ سے روز نامہ "کلیم" جاری کیا جو اس وقت بھی جاری ہے اور میرے پاس آتا ہے۔ احسان الٰہی انجمن پنجابی سوداگران کراچی میں بہ حیثیت کاتب ملازم تھے۔ غالباً حیات ہیں۔ مہرالٰہی کا دو سال قبل انتقال ہوگیا۔ منشی کرم الٰہی کلیم کے بڑے بھائی کا نام منشی عبدالعزیز تھا۔ وہ روہیل کھنڈ گزٹ نکالتے تھے۔ محمد عبدالحمید غالباً منشی عبدالعزیز کے صاحبزادے تھے۔ مجھے تحقیق نہیں ہے۔ منشی کرم الٰہی کلیم، عم محترم سید الطاف علی بریلوی

کے کرایہ دار تھے۔ 'روزانہ اخبار' محلہ عقب کوتوالی شاہ آباد سے شایع ہوتا تھا۔ یہ مرنجاں و مرنج قسم کے بزرگ تھے۔ اس دور کی مصالح کے مطابق سرکار پرستی کی پالیسی اپنائے ہوئے تھے لیکن ساتھ ساتھ اسلامی قومی جذبات کی ترجمانی بھی کرتے تھے۔

'العلم' سہ ماہی برابر بھجواتا ہوں[1]۔ جناب محترم شہاب الدین دسنوی صاحب کی معرفت 'العلم' اور چند کتب (مطبوعات کانفرنس) بھی بھیجی تھیں۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر میں دسنوی صاحب کے اعزاز میں نشست تھی، میں بھی اس مختصر نشست میں مدعو تھا۔ خرچ ڈاک اس قدر بڑھ گیا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا، محض ۱۲۸ صفحات کا 'العلم' آپ کی خدمت میں اب -/۲۶ روپیہ میں۔ SURFACE MAIL RAGD جا سکے گا۔ پھر کتب کا مسئلہ دگر ہے[2] کسی عنوان سے قارئین 'معارف' کو اتنا تو بتا دیجئے کہ 'العلم' نام کا کوئی پرچہ کراچی پاکستان سے نکلتا ہے۔ فقط والسلام مخلص

مصطفیٰ علی بریلوی

پس تحریر: ایک ہفت روزہ 'العرش' اختر مرزا بسولوی کی ادارت میں ۳۴-۱۹۳۳ء میں نکلتا تھا جس میں سید الطاف بریلوی لکھتے تھے۔ میرے پاس اخبار کے تراشے ہیں۔

۱۹۴۰ء میں بریلی سے ایک اخبار روزنامہ آزاد کے نام سے راقم نے بھی جاری کیا تھا، میری قبل از وقت بلوغیت اور سیاسی ناتجربہ کاری کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اسکی ایک کاپی محفوظ ہے۔ فوٹو اسٹیٹ ارسال خدمت ہے[3]۔

---

[1] شکریہ، اگرچہ ڈاک کے نظام کی خرابی سے کبھی ملتا ہے کبھی نہیں [2] ڈاک خرچ بڑھ جاتا ہے اسکے باوجود ڈاک یا تو ضایع ہو جاتی ہے یا بہت تاخیر سے ملتی ہے [3] افسوس ہے کہ اس کے بعد کا صفحہ لفافے میں شامل ہونے سے رہ گیا اور فوٹو اسٹیٹ کاپی نہیں ملی۔

ادبیات

غزل

از ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی، علی گڑھ۔

دشمنِ جانم نہ منظورِ نظر خواہم نوشت
من ترا در نامہ القابِ دگر خواہم نوشت

تا نیاید بر مزاجِ نازکت حرفم گراں
آرزوی دل بہ آیینِ خبر خواہم نوشت

دلبرانہ خندہ ای کردی و رفتی از برم
عمرہا من ماجرای چشمِ تر خواہم نوشت

می نگنجد در بیان کیفیت تنہائیم
داستانِ حسرتِ دیوار و در خواہم نوشت

کاش تاثیری گذارد در دلِ بی مہر تو
نامۂ شوقی کہ با خونِ جگر خواہم نوشت

تا در آیندہ فریبِ حسنِ خوبان کم خورند
ہرچہ با من کردہ ستی سر بسر خواہم نوشت

یک دلِ با ہوش را خرم ندیدم در جہان
قصۂ محرومیِ اہلِ نظر خواہم نوشت

در کنارِ من رساند کاش دلدار مرا
تا زیم، حمد خدای دادگر خواہم نوشت

بر ہمین اطوار اگر ماند بساطِ روزگار
زیست را بازیچهٔ شام و سحر خواہم نوشت

فتنه ہا در چارسو بینند و نگشایند لب
ماجرای کوریِ اہلِ بصر خواہم نوشت

قصهٔ نمرود ہا، افسانهٔ جمشید ہا
از برای عبرتِ اربابِ زر خواہم نوشت

تا بکی ایراد گیرم بر رفیقانِ سفر
بعد ازین ہر راہزن را راہبر خواہم نوشت

منتظر ہستم شبِ اندیشه تا آید بسر
صبحدم روداد این خونین سفر خواہم نوشت

بر نیاید تا بکی یارب، یکی از صد امید؟
تا بکی یارب، دعا را بی اثر خواہم نوشت؟

غیر دشمن، یار غافل، چیست انجام رئیس
ہر چه میخواہم نوشتن، آہ گر خواہم نوشت

غزل

از جناب محمد عبدالقدیر ایڈوکیٹ ہائی کورٹ الٰہ آباد

یوں ابتدائے یوم بہ وقتِ طلوع کر — ہر کام اس کے نام کو لے کر شروع کر
حاجت میں گر کہیں بھی نہ دستِ طلب دراز — جو سب کا کارساز ہے اس سے رجوع کر

ہو شادماں تو سجدۂ صد شکر کر ادا
کلفت میں اہتمام قیام و رکوع کر

ممکن ہے بخش دے وہ تیرے انگنت گناہ
اک سجدہ بے ریا بہ خشوع و خضوع کر

نیکی ہے تیری اصل میں ایمان و اتقا
چہرے کو خواہ مشرق و مغرب رجوع کر

مٹ جائے اس جہان سے نفرت کی تیرگی
سورج اک ایسا مہر و وفا کا طلوع کر

اک خواب ٹوٹنے سے کوئی ٹوٹتا نہیں
پھر حوصلے سے زیست دوبارہ شروع کر

سونے پڑے ہیں دیر سے دار و رسن قدیرؔ
تازہ فروغِ رسمِ صلیبِ یسوع کر

غزل

از مولانا عثمان احمد قاسمی جونپوری

نصیب دشمناں برگشتہ جب ہوتی ہیں تقدیریں
نہیں پھر کام بنتا ہے کرو تم لاکھ تدبیریں

رباب و چنگ چھوڑو نغمۂ بلبل سے منھ موڑو
علم بردوش ہو کر ہاتھ میں لو اپنی شمشیریں

خدا کے نام کی عظمت نمایاں ہو کے رہتی ہے
لرز جاتا ہے باطل سن کے اہل حق کی تکبیریں

مجاہد خندہ لب ہو کر مصائب جھیل جاتا ہے
ہو پھندہ دار کا یا قید خانے کی ہوں زنجیریں

حقیقت پر ہے مبنی حضرت اقبال کا مصرع
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

بہت کمزور اپنی زندگانی کی عمارت ہے
تو کیا ہوں گی ہمارے واسطے مضبوط تعمیریں

ہمیشہ دل کی بیماری دوا سے اور بڑھتی ہے
دوائے دل میں ہوتی ہیں مرض بڑھنے کی تاثیریں

سنہرے خواب جو دیکھے تھے آغازِ محبت میں
سب الٹی ہو گئیں عثمانؔ ان خوابوں کی تعبیریں

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر اور نئے رسالے

ماہنامہ **آج کل** فروری ۱۹۹۵ء اخترالایمان نمبر، مدیر جناب محبوب الرحمٰن فاروقی، صفحات ۹۴، قیمت تین روپے، پتہ: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱۔

اردو کا مشہور و مقبول ماہنامہ آج کل اپنے معیاری مضامین اور حسن سلیقہ کیلئے محتاج تعارف نہیں، اس کے خاص شماروں میں یہ خوبیاں اور زیادہ نمایاں ہوجاتی ہیں اور اس کی تازہ مثال زیر نظر اخترالایمان نمبر ہے۔ اخترالایمان موجودہ شعرائے اردو کی صف اول میں ہیں، مداحوں کی نظر میں وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنی منفرد پہچان اپنی شاعری کے آغاز سے ہی بنالی، خود اخترالایمان کا بیان ہے کہ فراق، فیض، میراجی، راشد اور مجاز کی طرح وہ اپنے عہد کے نمائندہ شاعر ہیں، ایک انٹرویو میں جو اس رسالہ میں شامل ہے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت مجھ سے بہتر شاعری کوئی نہیں کرتا" اسی اجمال کی تفصیل اس شمارہ کی تقریباً تمام تحریریں ہیں جو اردو کے چلے ہوئے نقادوں اور ادیبوں کے قلم سے نکلی ہیں، مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں "آج کوئی نہیں جو اخترالایمان کی طرح کثیر الصوت لہجے میں نظم شروع کرسکے" ایک عام قاری کے لیے کثیر الصوت اور متحفظ جیسے الفاظ کا ابہام خود محتاج بیان ہے، اخترالایمان کے نام کچھ خطوط ہیں اور سوانح و حالات کے باب میں انکی خود نوشت مختصر آپ بیتی کے علاوہ انکی

بیگم کے قلم سے بھی ایک مضمون ہے۔

ماہنامہ **نیا دور**' قومی یک جہتی نمبر' مدیر جناب سید امجد حسین' صفحات ۱۲۰' قیمت ۵ روپے' سالانہ ۳۰ روپے' پتہ: انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ' لکھنؤ' اترپردیش'

یو پی کے محکمہ اطلاعات کا ترجمان رسالہ نیا دور اپنے معیاری خاص شماروں کے لیے شہرت و وقعت رکھتا ہے۔ زیر نظر قومی یکجہتی نمبر' موجودہ حالات میں ایک بروقت کاوش ہے، جو مشہور اہل قلم کی مفید تحریروں سے مزین ہے' اس نمبر سے قومی یک جہتی کی ضرورت واہمیت نمایاں ہونے کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد' باہمی رواداری اور احترام آدمیت کا سبق ملتا ہے' اس پیغام محبت کو عام کرنے کے لیے اس نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب شمارے کی قیمت صرف پانچ روپے رکھی گئی ہے۔

سہ روزہ **دعوت**' ہندتوا ایک مطالعہ' ایک جائزہ' مدیر جناب پرواز رحمانی صفحات ۲۱۰' قیمت پچیس روپے' پتہ: دفتر دعوت سی۔ ۲۴۰' ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر' اوکھلا' نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

ہندوستان کے موجودہ سیاسی اور فکری دور انتشار میں ہندتو کا نعرہ ایک مخصوص طبقہ کی جانب سے زور و شور سے بلند کیا گیا، ہندو مذہب یا قدیم ویدک دھرم سے انتساب کے باوجود عملاً اس کی ایسی تصویر پیش کی گئی کہ اب اس کی شناخت کی چنداں ضرورت نہیں رہی، تاہم اس کے مطالعہ و محاسبہ کی گنجائش تھی اور خوشی ہے کہ موقر جریدہ دعوت نے اس تقاضہ کو بطریق احسن پورا کیا اور ہندتو کی تاریخ' عصر حاضر میں اس کے احیاء کی ضرورت' اس کا طریق کار' معاشرہ کے مختلف شعبوں میں اس کو رائج کرنے کی کوشش

اور مسلمانوں کے متعلق اس کے نظریات کا عمدہ جائزہ پیش کر دیا گیا ہے، موجودہ حالات کی مناسبت سے اس شمارہ کا مطالعہ اور بھی ضروری ہے۔

ماہنامہ **شیرازہ**' اقبال نمبر' مدیر اعلیٰ جناب محمد یوسف ٹینگ' صفحات ۲۰۰' قیمت درج نہیں' پتہ: شیرازہ اردو' جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز لال منڈی سرینگر' کشمیر

۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال صدی تقریبات کے موقع پر رسالہ شیرازہ نے بھی اقبال نمبر شایع کیا تھا، بلند پایہ مضامین کی وجہ سے اسے علمی و ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا، زیر نظر شمارہ اس کا دوسرا اور جدید ایڈیشن ہے۔ اس میں جہاں اس کے بعض مشمولات حذف کیے گئے ہیں تو بعض نئے مضامین شامل ہیں اور اس سے دونوں ایڈیشنوں کی اہمیت برقرار ہے۔

ماہنامہ **آموزگار**' یوپی تعلیمی کارواں نمبر' مدیر جناب اکبر رحمانی' صفحات ۵۰' قیمت ۱۵ روپیہ سالانہ ۵۰ روپیے' پتہ: مکتبہ آموزگار' کاشانہ سہیل' ۳۰ رحوانی پلیجہ اسلام پورہ' جلگاؤں' مہاراشٹر۔

مسلمانوں اور اردو کے تعلیمی و تدریسی مسائل کے سلسلہ میں ماہنامہ آموزگار کی خدمات قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں' اس کے چند خصوصی شمارے جیسے نئی تعلیمی پالیسی نمبر' اقلیتی تعلیمی حقوق نمبر' تاریخ نمبر اور ادب اطفال نمبر مقبول ہوئے، گذشتہ سال یوپی میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب و علاج کی تلاش میں بعض درد مند افراد پر مشتمل ایک تعلیمی کارواں جناب سید حامد کی قیادت میں سرگرم سفر ہوا' مدیر آموزگار بھی اس میں شامل تھے، زیر نظر شمارہ اسی سفر کی روداد کا پہلا حصہ ہے جس میں علی گڑھ' ایٹہ' پٹیالی

بیگم کے قلم سے بھی ایک مضمون ہے۔

ماہنامہ **نیا دور**' قومی یکجہتی نمبر' مدیر جناب سید امجد حسین' صفحات ۱۲۰' قیمت ۵ روپے' سالانہ ۳۰ روپے' پتہ: انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ' لکھنؤ' اترپردیش'

یو پی کے محکمہ اطلاعات کا ترجمان رسالہ نیا دور اپنے معیاری خاص شماروں کے لیے شہرت و وقعت رکھتا ہے۔ زیر نظر قومی یکجہتی نمبر' موجودہ حالات میں ایک بروقت کاوش ہے، جو مشہور اہل قلم کی مفید تحریروں سے مزین ہے' اس نمبر سے قومی یکجہتی کی ضرورت واہمیت نمایاں ہونے کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد' باہمی رواداری اور احترام آدمیت کا سبق ملتا ہے' اس پیغام محبت کو عام کرنے کے لیے اس نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب شمارہ کی قیمت صرف پانچ روپے رکھی گئی ہے۔

سہ روزہ **دعوت**' ہندتوا ایک مطالعہ' ایک جائزہ' مدیر جناب پرواز رحمانی صفحات ۲۱۰' قیمت پچیس روپے' پتہ: دفتر دعوت سی۔ ۴۰۲' ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر' اوکھلا' نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

ہندوستان کے موجودہ سیاسی اور فکری دور انتشار میں ہندتو کا نعرہ ایک مخصوص طبقہ کی جانب سے زور و شور سے بلند کیا گیا، ہندو مذہب یا قدیم ویدک دھرم سے انتساب کے باوجود عملاً اس کی ایسی تصویر پیش کی گئی کہ اب اس کی شناخت کی چنداں ضرورت نہیں رہی، تاہم اس کے مطالعہ و محاسبہ کی گنجایش تھی اور خوشی ہے کہ موقر جریدہ دعوت نے اس تقاضہ کو بطریق احسن پورا کیا اور ہندتو کی تاریخ' عصر حاضر میں اس کے احیاء کی ضرورت' اس کا طریق کار' معاشرہ کے مختلف شعبوں میں اس کو رائج کرنے کی کوششوں

اور مسلمانوں کے متعلق اس کے نظریات کا عمدہ جائزہ پیش کر دیا گیا ہے، موجودہ حالات کی مناسبت سے اس شمارہ کا مطالعہ اور بھی ضروری ہے۔

ماہنامہ **شیرازہ** اقبال نمبر مدیر اعلیٰ جناب محمد یوسف ٹینگ، صفحات ۲۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ: شیرازہ اردو، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، لال منڈی سرینگر، کشمیر

۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال صدی تقریبات کے موقع پر رسالہ شیرازہ نے بھی اقبال نمبر شایع کیا تھا، بلند پایہ مضامین کی وجہ سے اسے علمی و ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا، زیر نظر شمارہ اس کا دوسرا اور جدید ایڈیشن ہے۔ اس میں طبع اول کے بعض مشمولات حذف کیے گئے ہیں تو بعض نئے مضامین شامل ہیں اور اس سے دونوں ایڈیشنوں کی اہمیت برقرار ہے۔

ماہنامہ **آموزگار** یوپی تعلیمی کارواں نمبر، مدیر جناب اکبر رحمانی، صفحات ۵۶، قیمت ۱۵ روپیے سالانہ ۷۵ روپیے، پتہ، مکتبہ آموزگار، کاشانہ سہیل، ۳۰، بھوانی پیٹھ اسلام پورہ، جلگاؤں، مہاراشٹر۔

مسلمانوں اور اردو کے تعلیمی و تدریسی مسائل کے سلسلہ میں ماہنامہ آموزگار کی خدمات قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں، اس کے چند خصوصی شمارے جیسے نئی تعلیمی پالیسی نمبر، اقلیتی تعلیمی حقوق نمبر، تاریخ نمبر اور ادب اطفال نمبر مقبول ہوئے، گذشتہ سال یوپی میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب و علاج کی تلاش میں بعض درد مند افراد پر مشتمل ایک تعلیمی کارواں جناب سید حامد کی قیادت میں سرگرم سفر ہوا، مدیر آموزگار بھی اس میں شامل تھے، زیر نظر شمارہ اسی سفر کی روداد کا پہلا حصہ ہے جس میں علی گڑھ، ایٹہ، پٹیالی

کا ذکر ہے، رحمانی صاحب کی اور تحریروں کی طرح اس سفر نامہ کی افادیت بھی مسلم ہے۔

مجلہ المآثر مدیر مسئول مولانا رشید احمد الاعظمی، مدیر تحریر مولانا اعجاز احمد اعظمی،
زر سالانہ ۵۰ روپے، فی شمارہ ۱۵ روپے، پتہ: المجمع العلمی، مدرسہ مرقاۃ العلوم، پی او
بکس نمبر۱، مئو، یوپی ۲۷۵۱۰۱۔

شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے سانحہ ارتحال کے بعد ان کی مبارک حدیثی وفقہی خدمات کے فیضان کو جاری رکھنے کی غرض سے اس رسالہ کا اجرا ہوا ہے، اب تک اس کے جتنے شمارے شایع ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے، شیخ الحدیث کے مضامین اور دوسری تحریروں کا انتخاب عمدگی اور خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور باطن کی طرح اس کے ظاہر سے بھی پاکیزگی نمایاں ہے۔ اکتوبر تا دسمبر ۹۳ء کے شمارے میں تین طلاق کے مسئلہ پر حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کے فتاوی کی روشنی میں شیخ الحدیث مرحوم کی بلند پایہ تحریر شامل ہے جو پہلی بار طبع ہوئی ہے، بیمہ کے جواز و عدم جواز کے متعلق تین اہم مضامین بھی ہیں، رسالہ میں ایک مستقل کالم الفتاوی کا بھی ہوتا ہے، رسالہ قدردانی کا مستحق ہے۔

عالم اسلام اور عیسائیت مدیر اعزازی سیفر اختر، فی شمارہ دس روپے،
سالانہ ایک سو روپے، پتہ: بک پروموٹرز، بلاک ۱۹ مرکز ایف سیون، اسلام آباد،
پاکستان۔

رسالہ کا مقصد نام سے ظاہر ہے، چنانچہ عالم اسلام خصوصاً پاکستان میں مسیحیوں کے مسائل اور اسلام اور مسلمانوں سے ان کے علمی و سماجی رشتوں کی استواری کی کوشش اس کے صفحات سے نمایاں ہے، لہجہ معتدل اور غیر جذباتی ہے بعض مضامین مثلاً انگلستان

اور عربی علوم و فنون، مستشرقین کی تحقیقات، اقبال کی نظر میں، اور اسلام کا سابقہ عیسائیت سے، اچھے ہیں، یہ مفید رسالہ بھی اہل نظر کے ملاحظہ کے لائق ہے۔

ضیاءِ وجیہہ خواجہ معین الدین چشتی نمبر، مدیر جناب وجاہت اللہ خاں قادری، صفحات ۱۹۰، قیمت ۱۲ روپے، سالانہ قیمت ... پتہ: دفتر ضیاءِ وجیہہ، مستان گنج، رامپور، یوپی۔

جامع العلوم فرقانیہ رامپور کا ترجمان ماہنامہ ضیاءِ وجیہہ گوکم عمر رسالہ ہے۔ لیکن تھوڑے عرصہ میں اس نے اپنے مفید مضامین کی وجہ سے اچھا تاثر قائم کیا ہے، اضطراب و بے چینی کے موجودہ حالات میں خواجہ معین الدین چشتی کی تعلیمات کی بڑی اہمیت ہے اس کے پیش نظر اس خاص شمارہ میں شاہ وجیہ الدین قادری، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، خواجہ حسن ثانی نظامی وغیرہ کی مؤثر تحریریں شامل ہیں، حصۂ نظم بھی خاصے کی چیز ہے، رسالہ کا یہ پہلا خاص شمارہ ہے اور اپنے نیک مقصد میں کامیاب ہے۔

نصرۃ الاسلام، میرواعظ مولوی محمد فاروق شہید ملت نمبر، مدیر جناب محمد سعید الرحمٰن شمس، صفحات ۸۰، زرسالانہ ۵۰ روپے، خاص نمبر کی قیمت درج نہیں، پتہ: شعبۂ نشر و اشاعت، انجمن نصرۃ الاسلام، سرینگر جموں وکشمیر۔

میرواعظ مولوی محمد فاروق، کشمیر کے ممتاز مذہبی و دینی قائد تھے، اخلاص، سوز دروں اور قوم کی خدمت کے جذبہ صادق نے ان کو وادی کشمیر کا رہنما اور ترجمان بنا دیا تھا، ۱۹۹۰ء میں ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو ان کا جنازہ جس شان سے اٹھا اسکو مثال کم ملتی ہے، ماہنامہ نصرۃ الاسلام کے وہ سرپرست تھے اور اس کے صفحات انکی تقریروں اور تحریروں سے مزین رہتے تھے، ان کی یاد میں گزشتہ سال انجمن کے زیراہتمام

ایک علمی مجلس میں مقالات و خطبات پیش کیے گئے، ان میں بعض ایسی مفید تحریروں کو اس شمارہ میں جمع کر دیا گیا ہے جن سے سید واعظ شہید کی زندگی کے مختلف گوشے سامنے آجاتے ہیں۔

ماہنامہ **ارمغان** شاہ ولی اللہ، دعوت اسلامی پیشکش، مدیر جناب وصی سلیمان ندوی، صفحات ۱۱۹، قیمت دس روپے زر سالانہ ۳۰ روپے، پتہ: دفتر ارمغان، پھلت ضلع مظفر نگر یوپی ۲۵۱۲۰۱۔

زیر نظر رسالہ جمعیتہ شاہ ولی اللہ کا ترجمان ہے، مولانا محمد کلیم صدیقی کی رہنمائی میں اس جمعیتہ کا مقصد مسلمانوں کے عقیدہ و دین کی اصلاح و حفاظت کے ساتھ غیر مسلموں اور پوری انسانیت کو اسلام کے پیام رحمت سے روشناس کرنا ہے، زیر نظر خصوصی شمارہ دعوت اسلامی کے موضوع پر محیط ہے، صدر جمعیتہ کے قلم سے دعوت کی اہمیت، طریقہ کار خصوصاً مرتدین اور اقوام غیر میں دعوت اسلامی کو عام کرنے کے متعلق مفصل و موثر تحریر ہے، رسالہ میں چند مکتوبات بھی ہیں، ان میں ماہر غالبیات جناب مالک رام کا ایک خط بھی ہے جو انھوں نے اپنے انتقال سے صرف ۵ روز پہلے مولانا کے نام لکھا تھا اس میں انھوں نے اپنے قبول اسلام کا صاف اقرار کیا، یہ تمنا بھی کی کہ "کاش اللہ تعالیٰ صحتیاب فرمائے تو کچھ کفر و شرک کی زندگی کی تلافی کر سکتا"۔

ماہنامہ **ہمدرد نونہال**، پاکیزہ ماحول نمبر، مدیر جناب مسعود احمد برکاتی، صفحات ۱۷۶، قیمت ۱۰ روپے، سالانہ ۸۵ روپے، پتہ: ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد کراچی پاکستان ۷۴۶۰۰۔

ہمدرد نونہال کی شکل میں پاکستان کا ادارہ ہمدرد ہر مہینہ بچوں کو ایک نہایت خوبصورت تحفہ پیش کرتا ہے، دلچسپ کہانیوں، نظموں اور رنگ برنگ تصویروں کے ساتھ

مجموعہ کا خاص وصف بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کا بہترین حکیمانہ انداز تربیت ہے، مختصر تحریروں اور آسان زبان میں اسلامی تعلیمات کو اس خوبی سے آمیز کر دیا جاتا ہے کہ وہ واقعتاً روح افزا ہو جاتی ہیں، زیر نظر خاص شمارہ موجودہ دور کے ایک مسئلہ "آلودگی" سے متعلق ہے جس میں فضا، غذا، پانی اور خود جسم انسانی کی ظاہری و باطنی ہر قسم کی آلودگی شامل ہے، ایسے اہم موضوع پر پُراز معلومات تحریریں، بچوں کے ساتھ بڑوں کے لیے بھی دلکش ہیں، ایسے بامقصد شماروں کی اشاعت کے لیے جناب حکیم محمد سعید اور فاضل مدیر جناب مسعود احمد برکاتی شکریہ اور مبارکباد کے لائق ہیں۔

سالانہ **مجلہ** انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح، مدیر جناب طارق اعجاز اعظمی، صفحات ۱۶۸، قیمت درج نہیں، پتہ: انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڈھ۔

یہ مجلہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے طلبہ کے فکری و تعلیمی معیار کا گویا آئینہ ہے اور اس میں ان کا عکس واضح بھی ہے اور خوش کن بھی، اس کا اندازہ مجلہ کے باب بحث و تحقیق کے ان سات مضامین سے ہوتا ہے جو علوم القرآن سے متعلق ہیں اور یہ سب طلبہ کے قلم سے ہیں، حق و صبر کی حقیقت کے عنوان سے مولانا فراہیؒ کی ایک تحریر بھی دی گئی ہے اور ایک مضمون میں بابری مسجد کی تاریخ کو جامعیت و اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس مجلہ کی اشاعت کے لیے انجمن طلبہ الاصلاح حوصلہ افزائی اور تحسین کی حقدار ہے۔

ماہنامہ **حسامی** مدیر جناب محمد حسام الدین ثانی عاقل، صفحات ۴۸، فی شمارہ ۸ روپے، سالانہ ۹۰ روپے، پتہ: دفتر ماہنامہ حسامی، حسامیہ منزل، حیدرآباد۔۲

یہ حیدرآباد کی مذہبی صحافت میں ایک تازہ اور خوشگوار اضافہ ہے، اسلامی تعلیمات

سلف صالحین کے حالات اور عصری تغیرات پر توجہ اس کے مقاصد میں ہے اب تک جو شمارے موصول ہوئے ہیں ان سے خوب سے خوب تر کی تلاش کے آثار ظاہر ہیں۔

ماہنامہ **الشریعہ** مدیر جناب ابو عمار زاہد الراشدی' فی پرچہ دس روپے' سالانہ سو روپے' پتہ : منیجر ماہنامہ الشریعہ' جامع مسجد شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ پاکستان۔

چھوٹی تقطیع کا یہ رسالہ ایک فعال دینی تنظیم ورلڈ اسلامک فورم کا ترجمان ہے' اور پاکستان کے علاوہ یہ لندن سے بھی نکلتا ہے' مضامین متنوع ہیں مگر سب مذہبی رنگ میں ہیں' زیر نظر شمارہ میں ایک مضمون میں دیوبندی مترجمین قرآن کی فہرست دی گئی ہے' اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی' مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی ثم فرانسوی بھی شامل ہیں۔؟

مجلہ فقہ اسلامی (جزء اول) مصرف زکوٰۃ فی سبیل اللہ' مرتب جناب مولانا مجاہد الاسلام قاسمی' بہترین کتابت و طباعت' صفحات ۱۷۵ قیمت درج نہیں' پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز' ڈی بلڈنگ' حضرت نظام ویسٹ' نئی دہلی ۱۳۔

زیر نظر مجلہ اسلامی فقہ اکیڈمی کی گذشتہ اہم فقہی رودادوں میں ایک اور اہم اضافہ ہے' اس سے پہلے پگڑی' اعضاء کی پیوندکاری' سودی لین دین' بینکنگ' انشورنس وغیرہ جیسے عصری مسائل پر اکیڈمی کے فقہی سیمناروں کی رودادیں تھیں تو اس مجلہ میں اس کے پانچویں سیمنار کے ایک اہم موضوع یعنی آیت زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تعمیم و توسیع کی گنجائش ہے یا وہ محض مجاہدین و متعلقین کے لیے خاص ہے' پر مباحثہ و مقالات کی روداد سلیقہ سے پیش کی گئی ہے' فقہی موضوعات سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ بہترین تحفہ ہے۔

مطبوعات جدیدہ

خطوط ماجدی: مرتبہ جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۲، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ شاہد علی گڑھ کالونی، کراچی ۱۴۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط کے دو مجموعے 'مکتوبات ماجدی' اور رقعات ماجدی' پہلے شایع ہو چکے ہیں، یہ نیا مجموعہ لگ بھگ سوا تین سو خطوط پر مشتمل ہے جس کے ۱۵۱ مکتوب الیہم میں برصغیر کی قریباً تمام معروف و مشہور ہستیاں شامل ہیں، ان میں چند خطوط مکتوبات ماجدی سے لیے گئے ہیں، باقی اخبارات و رسائل میں منتشر تھے، یہ سب علمی، ادبی اور مذہبی حیثیت سے اہم ہونے کے علاوہ مولانائے مرحوم کے مخصوص طرز انشا کا دلکش نمونہ بھی ہیں، ان جواہر پاروں کو اکٹھا کر کے قدردانوں کے لیے یقیناً ایک بیش قیمت خزانہ مہیا کر دیا گیا ہے، فاضل مرتب کے قلم سے مقدمہ میں مولانا کے سوانح و کمالات کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا اور بجا طور پر لکھا گیا ہے کہ "یہ مجموعہ مولانا دریابادی کی خطوط نگاری کی تمام خوبیوں کا جامع ہے"۔ ایک جگہ مولانا کی جائے وفات کے متعلق تسامح ہو گیا ہے، مولانا کا انتقال دریاباد میں نہیں لکھنؤ میں ہوا تھا، البتہ تدفین دریاباد میں ان کے جد امجد خواجہ محمد آبکش کے پہلو میں ہوئی، ص ۱۷۶ پر مولانا کا یہ مختصر مگر پُرمغز خط درج ہے: "ہدیہ گرامی موصول ہو گیا، جزاک اللہ، تیل اور سرمہ کا عطیہ سرآنکھوں پر" اس کے مکتوب الیہ کو نامعلوم لکھا گیا ہے، یہ خط کلکتہ کے بزرگ

عالم و حکیم جناب مولانا محمد زماں حسینی کے نام ہے اور مکتوبات ماجدی میں ان کے نام کی صراحت کے ساتھ مذکور ہے، آیات کی کتابت میں زیادہ توجہ اور احتیاط کی ضرورت تھی، ص۵۳ پر ولله يناً مزيد کی جگہ ولدیناً مزیاً لکھ گیا ہے۔

حیرت کدۂ عالم از جناب ریاض الدین احمد صاحب، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۶، قیمت ۴۵ روپے، پتہ: کتابستان، ۳۰۔ چک الہ آباد ۲۱۱۰۰۳۔

جدید سائنس نے کائنات اور اس کی مخلوقات اور خود انسان اور اس کی زندگی کے متعلق جو اسرار فاش کیے ہیں ان کا مطالعہ طلسم ہوش ربا سے کم دلچسپ اور حیرت انگیز نہیں، عقل و بصیرت کے لیے یہ تحقیقات جدیدہ دراصل آیات بینات ہیں جن سے خالق حقیقی اور قادر مطلق کے وجود اور اس کی قدرت کا مشاہدہ ہوتا ہے، زیر نظر کتاب میں فاضل مرتب نے اسی مقصد سے ان انکشافات پر ایک مومن کی نظر ڈالی ہے جو ملکوت السموات والارض میں نظر و تفکر کی اچھی مثال بھی ہے، مثال کے طور پر جینس (GENES) کے متعلق لکھتے ہیں کہ "یہ اس قدر ناگفتنی حد تک باریک ہوتے ہیں کہ ان کو بغیر طاقتور خوردبین کے دیکھا نہیں جا سکتا، اگر ان کے اسی حصہ کو جمع کیا جائے جن پر دنیا کی تمام آبادی کا انحصار ہے تو وہ سب کے سب ایک انگشتانے سے کم جگہ میں اکٹھا کیے جا سکتے ہیں"۔ اس کی مزید تفصیل قلم بند کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں "... وہ کارساز ہست و بود ہی ہے جو اتنی لمبی چوڑی دنیا کی پوری آبادی وجود میں لا سکتا تھا اور وہی اس آبادی کے ایک ایک فرد کو کم سے کم جگہ میں مجتمع کر کے قیامت کے دن پھر اٹھا سکتا ہے"۔ کمپیوٹر کی طباعت میں کئی جگہ غلطیاں ہیں خصوصاً رب کو

ہر جگہ عرب لکھ دیا گیا ہے۔ کتاب سب کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے لیکن مدارس دینیہ کے طلبہ کے لیے سائنسی مضمون کی حیثیت سے اس کا مطالعہ خاص طور پر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

الواح الصنادید از جناب مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت، عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۹۲، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مولانا آزاد اکیڈمی ۳۰۴۔ ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

دہلی مرحوم کے قبرستان مہندیان کی خاک یوں پاک ہے کہ اس میں شیخ عبدالعزیز شکر بار، شاہ عبدالرحیم دہلوی اور ان کے مایہ ناز فرزند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اولاد و احفاد اور دوسرے متعدد بزرگ آسودہ خواب ہیں، بقول خواجہ احمد فاروقی "یہاں صدیوں کی دولت گڑی ہوئی ہے اور ایسے ایسے اہل کمال جمع ہیں کہ آسمان کو بھی اس زمین پر رشک آتا ہوگا" اسی تاریخی قبرستان کی مسجد میں جامعہ رحیمیہ قائم ہے، جس کے استاد مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی نے شاہ ولی اللہ کے علاوہ اس کے دوسرے گنج ہائے گراں مایہ اور مدفون ہستیوں کی الواح تربت کا پتہ لگا کر ان کے احوال و خدمات کا ایک عمدہ مرقع پیش کر دیا، خانوادہ ولی اللّٰہی کے علاوہ انھوں نے مومن خاں مومن، مولانا مملوک علی نانوتوی، مولانا محمد حسین فقیر دہلوی، سمیع اللہ خاں، ڈاکٹر سید محمود، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حکیم الیاس خاں، مولانا امداد صابری وغیرہ متعدد مشاہیر کے سوانح بھی جمع کر دیے ہیں۔

علوم الحدیث از جناب مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۴۰، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: مکتبہ حراء،

پوسٹ بکس ۹۳، ۲۹۳، لکھنئو یوپی۔

لائق مولف جامعہ عربیہ ہتورا ضلع باندہ میں عرصہ سے درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہیں، دینی علوم کی ترویج اور طلبہ کی تشویق کے خیال سے انھوں نے تسہیل البلاغہ، اصول الفقہ، تسہیل اصول الفقہ کو مرتب کیا، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں انھوں نے مصطلحات حدیث کی تشریح و توضیح آسان اور سلیس زبان اور اچھے پیرایے میں کی ہے، آخرالذکر دو ابواب میں انھوں نے عہد بعہد کی اہم مولفات حدیث کا جائزہ لیا ہے، ائمہ اربعہ کی مولفات، امام ابو حنیفہ کی مرویات کے مجموعوں اور علمائے احناف اور علمائے ہند کی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے، فن حدیث کے طلبہ و اساتذہ کے علاوہ یہ عام لوگوں کے بھی مطالعہ میں آنے کے لائق ہے۔

اردو کی چند نایاب مثنویاں از جناب ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۸، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲۔

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی بمبئی کے اداروں سے وابستہ رہ کر عرصہ سے علمی و تحقیقی خدمت انجام دے رہے ہیں، ابھی چند برس پہلے ان کی ایک کتاب "جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات" کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، اسی کتاب کی ترتیب و تکمیل کے سلسلے میں ان کی نظر سے بعض نایاب اور قدیم مثنویاں گزریں جن میں کچھ تو مخطوطے کی شکل میں تھیں اور بعض گو مطبوعہ تھیں لیکن اب وہ بھی نایاب ہیں، ان مثنویوں کی اہمیت کی بنا پر ڈاکٹر صاحب نے معارف اور دوسرے رسائل میں ان کا سیر حاصل تعارف کرایا، زیر نظر کتاب میں ان تمام مضامین کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت

سے اردو مثنویات پر ایک معیاری علمی و تحقیقی کتاب کا اضافہ ہوا۔

حکیم عبدالقوی دریابادی، حیات و خدمات

مرتبہ جناب عبدالعلیم قدوائی، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۵۹، قیمت ۵ روپے

پتہ: عبدالعلیم قدوائی، خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، لکھنؤ، یوپی۔

جناب حکیم عبدالقوی دریابادی مرحوم صدق کے سابق مدیر اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے جانشین تھے، ان کے قابل رشک اور لائق تقلید سوانح ایک مفصل کتاب کے متقاضی ہیں، زیر نظر رسالہ میں ان کے بعض اعزہ و اقارب اور احباب و مخلصین کی چند تعزیتی تحریریں اور خطوط جمع کر دیے گئے ہیں، لائق مرتب حکیم صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں ان کے قلم سے جو تحریر اس مجموعہ میں شامل ہے وہ بڑی موثر ہے، اس رسالہ کی اشاعت کے وقت ان کو اپنی نوجوان صاحبزادی کی اچانک وفات کا جانکاہ صدمہ بھی اٹھانا پڑا، مرحومہ کے عم محترم ڈاکٹر ہاشم قدوائی اور بھائی ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی کے قلم سے ان کی وفات پر دو نثری مرثیے بھی اس رسالہ میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

دین اسلام گورو نانک جی کی نظر میں

از جناب عبداللہ گیانی مرتب ایس ایم شریف قریشی، عمدہ کاغذ اور طباعت، صفحات ۱۲۲، قیمت ۱۵ روپے

پتہ: کتبخانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶۔

اس مختصر کتاب میں سکھوں کے گورو نانک جی کے وحدت کے گیتوں کی مدد سے ثابت کیا گیا ہے کہ ان کی تعلیمات میں اسلامی عقائد و اقدار کا نور جھلکتا ہے، لائق مرتب کا خیال ہے کہ گورو نانک جی توحید، رسالت و آخرت پر دل سے ایمان رکھتے تھے، شریعت و طریقت کے عالم اور صوفی منش تھے، اپنے خیال کی تائید میں انھوں نے

سکھ مذہبیات اور گورمکھی زبان کے مسلمان عالم عبیداللہ یا عباداللہ گیانی کے اس رسالہ کو از سرِ نو مرتب کرکے شایع کیا ہے، اس میں گورونانک جی کی تعلیمات سے ایسے متعدد شواہد نقل کیے گئے ہیں جو مرتب کے خیال کی تائید کرتے ہیں، مسلم سکھ اتحاد کی غرض سے بھی اس رسالہ کی اشاعت یقیناً مفید ہوگی۔

تجلیات رحمت عالمؐ (منظوم) از جناب مولانا حکیم سید محمد مصلح الدین ثاقب مرحوم متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، خوبصورت سرورق، صفحات ۲۳۲، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر سید رضوان اللہ کاظمی ۲۲۲، پہاڑپور، اعظم گڈھ ۲۷۶۰۰۱۔

زیرِ نظر مجموعہ اشعار، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور سیرت مبارکہ کے منظوم بیان پر مشتمل ہے اور اس میں شمائل و خصائل نبویؐ کا حصہ خاصا ہے، مصنف حاذق طبیب اور جید عالم تھے، اس لیے نعت نگاری میں ان کے اشعار حقیقت کے آئینہ دار ہیں، شمائل سے متعلق اشعار کے حواشی میں انھوں نے اصل روایتیں مع ترجمہ کے نقل کر دی ہیں اور بقول مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم "یہ اس سراپا کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جو اردو کی اس قبیل کی نظموں میں مشکل سے مل سکتی ہے"۔ شاہ صاحب کے علاوہ مولانا شاہد فاخری مرحوم اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تعارفی و تعریفی تحریریں اس کی خوبی کی ضمانت ہیں، مگر کتابت کی غلطیاں جا بجا ہیں، اس کتاب کی اشاعت میں صاحب کتاب کے برادرِ خورد جناب سید علاء الدین کاظمی نے بڑی جد و جہد کی، جس کے لیے وہ ستایش کے مستحق ہیں۔

ع۔ ص۔

جلد ۱۵۳ ماہ شوال المکرم ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۹۴ء عدد ۴

مضامین

شذرات

مسلمانوں کا مذہب انہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ وہ اپنے ملک وطن کے وفادار رہیں اور اپنے وطنی بھائیوں کے دوش بدوش اس کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں کیونکہ حب الوطنی انکے ایمان کا جز ہے اس لیے وہ وطن کی حفاظت، سالمیت اور استحکام کے لیے مرمٹتے ہیں، ان کی تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنے وطن کے لیے بڑی سی بڑی قربانی دی ہے، جہاں انکے قدم پڑے وہاں علم و ہنر کا ایک تازہ جہاں آباد ہوگیا اور وہ سرزمین علم و فن اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گئی، خود ہندوستان کو مسلمانوں نے گل وگلزار بنانے اور تہذیبی و تمدنی حیثیت سے اعلاء ارفع درجہ پر پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، صنعت، حرفت، زراعت اور فلاحت کو ترقی دی، ہر طرف باغ و چمن لگائے، نہر تالاب اور کنوئیں کھدوائے، ان کی پرشکوہ عمارتوں کے نقوش اب بھی ملک کی عظمت کا نشان بنے ہوئے ہیں، چند کو چھوڑکر ہندوستان کے تمام مسلم فرمانرواؤں نے یہاں کے باشندوں کے عقیدہ و مذہب سے تعرض کیے بغیر انہیں ہر قسم کی آزادی، آسایش اور سہولت بہم پہنچائی، ہر ایک کے ساتھ عدل و مساوات کا برتاؤ اور ایک جیسا سلوک کیا، انگریزوں کی غلامی سے ملک کو چھٹکارا دلانے میں بھی وہ پیش پیش رہے اور ہر قسم کے مظالم برداشت کیے اور اب یہ حقیقت بھی واشگاف ہوچکی ہے کہ ملک کی تقسیم کا ذمہ دار جو بھی رہا ہو، مسلمان ہرگز نہیں تھے۔

وطن سے اس قدر والہانہ لگاؤ کے باوجود مسلمانوں نے اپنی شناخت اور دینی و اسلامی حیثیت باقی رکھی، اسلام کے رنگ و روغن پر کسی اور رنگ و روغن کو چڑھنے نہیں دیا، قرآن مجید کی رہنمائی اور محمد عربی فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی پر انہیں ہمیشہ ناز رہا، سخت آزمایش و آشوب میں بھی انھوں نے نہ اپنے دین و ایمان کو سودا کیا اور نہ اپنے ملی و مذہبی مفاد کو پامال ہونے دیا، وہ نہ کسی دھارے میں بہے اور نہ کسی فکر و فلسفہ سے متاثر ہوئے، کوئی مذہب اور کوئی تہذیب انہیں

اپنے اندر جذب نہیں کر سکی، ملت ابراہیمی، دین بیضا اور اسلام کی صراط مستقیم کے سوا ہر چیز کو بولہبی و بوجہلی سمجھ کر اپنے پیروں تلے روند ڈالا، آزاد ہندوستان میں بھی وہ ملک کے وفادار اور اس کے آئین و دستور کے پابند ہو کر اپنی شناخت اور پہچان برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اپنی دینی و اسلامی خصوصیات پر قائم رہنا چاہتے ہیں، جو متعصب، تنگ نظر اور ہندوتوا کے نشہ میں سرشار لوگوں کو کسی حال میں گوارا نہیں ہے، اس لیے وہ ہر روز مسلمانوں کے خلاف نئی نئی سازشیں تیار کرتے رہتے ہیں ؎

کیوں تیرگیٔ وقت خفا ہم سے ہوئی ہے اک شمع جلانے کی خطا ہم سے ہوئی ہے

کیا اس طرح کے مذہبی جنون میں گرفتار لوگ ہندوستان کی تاریخ سے ناواقف ہیں، کیا انہیں خبر نہیں کہ یہ ملک ہمیشہ سے مختلف قوموں، مذہبوں اور تہذیبوں کا سنگم رہا ہے اور اس کے زیر سایہ ہر مذہب و ملت کے لوگ پھلتے پھولتے رہے ہیں، اس نے ہر عقیدہ و خیال کے لوگوں کا خیر مقدم کیا ہے، مذہب، زبان اور رنگ و نسل کے فرق کی وجہ سے کسی کے ساتھ ناانصافی اور غیریت کا برتاؤ نہیں کیا، رواداری اور فراخدلی اس کی سرشت میں داخل ہے، آریوں کی طرح بودھوں، جینیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کو بھی اس نے اپنایا ہے، یہی اختلاف و رنگارنگی اس کی زینت تھی، آج جو لوگ وحدت و یکتا کے نام پر اس اختلاف و تنوع کو ختم کرنا اور مسلمانوں کی شناخت کو مٹا کر انہیں خود ساختہ قومی دھارے میں بہانا چاہتے ہیں وہ دراصل ملک کے دشمن ہیں، جو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں، ان کے سامنے صرف اپنا مفاد اور اقتدار ہے، ملک میں اسی وقت ترقی اور خوش حالی آسکتی ہے، جب یہاں کے ہر فرقہ و مذہب کے لوگوں کو [illegible] کرنے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع ملیں اور گوناگوں فکری، مذہبی، نسلی اور تہذیبی اختلاف کے باوجود سب مطمئن و مسرور اور بے خوف و خطر رہیں، اگر جسم کا

کوئی حصہ بھی دکھ درد میں مبتلا ہو تو دوسرے حصے بھی چین سے نہیں رہتے، اسی طرح ملک کا کوئی گروہ اگر نامطمئن ہو تو دوسرے گروہ بھی خوش و خرم نہیں رہ سکتے۔

مسلمانوں کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ اتنے بڑے ملک میں جہاں ہر طرح کے لوگ آباد ہیں، معقول کے ساتھ نامعقول اور لغو باتیں بھی انہیں سننی پڑیں گی جو اس لیے کہی جاتی ہیں کہ وہ انہیں میں الجھے رہیں اور ان کی پیش قدمی اور ترقی رک جائے برابر اختلاف و نزاع کا شکار رہیں، فروعات میں اپنا وقت اور صلاحیت برباد کریں، ذاتی اغراض کے پیچھے پڑکر متحد و منظم نہ ہوں، ہمیشہ خوف و دہشت زدہ رہیں، پست ہمتی، بے دلی، سستی اور کاہلی ان کا وطیرہ بن جائے اور وہ محنت، عمل، جد و جہد اور جفاکشی ترک کر دیں، فرقہ پرستوں کو ناکام بنانے کے لیے مسلمانوں کو ان کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے اپنی اور وطن عزیز کی تعمیر و ترقی سے سروکار رکھنا چاہیے، اپنی شناخت اور خصوصیات کو قائم رکھنا چاہیے، اپنے دین و مذہب سے دست کش ہونا تو درکنار اس کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے اور اسی کے ساتھ ملک کو بھی زوال، انتشار اور تباہی سے بچانا چاہیے جس کی ذمہ داری بحیثیت مسلمان ان پر دہری ہے۔

اترپردیش کے وزیراعلیٰ مسٹر ملائم سنگھ یادو کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے کہ "پرائمری اور جونیر ہائی اسکولوں کو بھی اقلیتی حیثیت دی جائے گی"۔ گذشتہ ماہ اردو اور اقلیتی تعلیمی اداروں کے بارے میں دینی تعلیمی کونسل کے ایک وفد کے اکثر مطالبات وزیراعلیٰ نے مان لیے اور ان کے متعلق احکام بھی جاری کر دیئے، وہ اپنی بات کے پکے اور بڑے کھرے شخص ہیں، گو ان کی حکومت کو غالب اکثریت حاصل نہیں ہے، تاہم وہ اخلاص اور ایمانداری کے ساتھ اپنے انتخابی وعدوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں، اقلیتوں اور کمزور و مظلوم طبقوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔

مقالات

اسلامی تعلیم کے ابتدائی مقامات و مراکز

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

عہد نبوی میں پورے جزیرۃ العرب میں اسلام پھیل چکا تھا، خاص طور سے فتح مکہ کے بعد عرب کے تمام قبائل اسلام میں داخل ہو کر قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم و تعلم میں مشغول ہو گئے تھے اور ہر قبیلہ اور ہر بستی میں پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔

مکہ مکرمہ میں حالات کی ناسازگاری کے باوجود کسی نہ کسی طرح قرآن کی تعلیم جاری تھی، اس پورے دور میں کوئی باقاعدہ درسگاہ نہیں تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو تعلیم دیتے تھے، موسم حج اور دیگر مواقع پر لوگوں کو قرآن سناتے تھے، اس دور میں مسجد ابوبکر صدیقؓ، دار ارقمؓ، بیت فاطمہ بنت خطاب، شعب ابی طالب وغیرہ کو کسی حد تک درسگاہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اس کے باوجود مکی دور میں متعدد قرآء و معلمین پیدا ہوئے جنھوں نے دوسروں کو قرآن اور تفقہ فی الدین کی تعلیم دی، حضرت خباب بن ارت مکہ میں بیت فاطمہ بنت خطاب میں قرآن کی تعلیم دیتے تھے، حضرت سالم مولیٰ ابو حذیفہ ہجرت عامہ سے پہلے قبا میں، حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت ابن ام مکتوم (عمرو بن قیس اعمیٰ) نقیع الخضمات میں اور حضرت رافع بن مالک زرقی مسجد بنی زریق میں تعلیمی خدمت انجام دیتے تھے، یہ سب مکہ کے فضلاء و فارغین ہیں،

ان کے اصحاب و تلامذہ مدینہ منورہ کی مسجدوں میں امامت اور تعلیم کی خدمت انجام دیتے تھے۔

ہجرت عامہ کے بعد مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ میں مرکزی درسگاہ قائم ہوئی جس میں سید المعلمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم دیتے تھے، نیز حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عبادہؓ بن صامت وغیرہ اس درسگاہ کے معلم و مقری تھے، یہاں کے طلبہ اپنے گھروں میں بچوں اور عورتوں کو تعلیم دیتے تھے اور چند دنوں میں پورا شہر مدینہ دار العلم بن گیا، اس کے گلی کوچے قرآن مجید کی آواز سے گونجنے لگے، مختلف علاقوں سے قبائل اور وفود مدینہ آکر تعلیم حاصل کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرائے صحابہ کو معلم بنا کر قبائل میں روانہ فرماتے تھے، درسگاہ نبویؐ سے تعلیم حاصل کرکے قبائل کے رئیس و ترجمان اپنے یہاں تعلیم دیتے تھے، اس دور میں مکہ اور مدینہ کے بعد یمن کے مختلف علاقوں اور بستیوں میں تعلیم و تعلم کی سرگرمی زیادہ تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امرا و عمال قرآن، سنت، فرائض، تفقہ فی الدین اور شرائع اسلام کی تعلیم اپنے اپنے حلقوں میں دیتے تھے، خاص طور سے مکہ میں فتح مکہ کے بعد حضرت معاذؓ بن جبل، طائف میں حضرت عثمانؓ بن ابو العاص ثقفی، عمان میں حضرت ابو زیدؓ انصاری، نجران میں حضرت خالدؓ بن ولید، یمن میں حضرت علیؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح، مقام جند میں حضرت معاذؓ بن جبل رضی اللہ عنہم اس خدمت پر مامور تھے۔

ان حضرات کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن امراء و عمال کو عرب کے مختلف مقامات پر مقرر فرمایا تھا، وہ اپنے اپنے مقام کے معلم و امام تھے اور مسلمانوں

کے جملہ دینی امور ان کے سپرد تھے، وہی حضرات اس منصب پر رکھے جاتے تھے جو قرآن، سنت، تفقہ فی الدین اور شرائع اسلام کے عالم ہوتے تھے اور ان باتوں کی تعلیم دیتے تھے۔ تعلیمی اسفار اور رحلات کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور دور دراز کے وفود و امراء خدمت نبویؐ میں آتے تھے، وفد عبد القیس کے ارکان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا کہ ہم لوگ بہت دور سے مشقت برداشت کرتے ہوئے آئے ہیں، راستہ میں کفار مضر کے قبائل ہیں، اس لیے صرف شہر حرام میں آپ کے پاس آ سکتے ہیں، حضرت عقبہؓ بن حارث صرف ایک مسئلہ معلوم کرنے کے لیے خدمت نبویؐ میں مدینہ آئے۔

ابتدا میں طلبہ کے قیام و طعام کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا، مکہ مکرمہ میں دار ارقمؓ میں مقیم صحابہ کے کھانے کا انتظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستطیع صحابہ کے یہاں فرمایا تھا جس کو جاگیر سے تعبیر کیا جا سکتا [illegible] سعدؓ بن خیثمہ کا مکان بیت العزاب دار الطلبہ تھا، اصحاب صفہ مسجد نبوی میں قیام کرتے تھے اور بیرونی طلبہ یعنی وفود اور افراد دار رملہ بنت حارث میں عام طور سے قیام کرتے تھے، اصحاب صفہ کے خورد و نوش کا انتظام انصار مدینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بطور جاگیر کے تھا اور بیرونی حضرات کے لیے خصوصی دعوت و مدارات کا انتظام تھا۔

قرآن مجید کی تعلیم عام طور سے زبانی ہوتی تھی، مصاحف کا انتظام نہیں تھا، یوں بھی عرب میں کتابت کا رواج بہت کم تھا، اس کے باوجود کتابت وحی کے ساتھ بعض سورتیں تحریری شکل میں پائی جاتی تھیں، مکہ مکرمہ میں بیت فاطمہ بنت خطاب میں صحیفہ کا ذکر

ہے، مدینہ منورہ میں حضرت عبادہؓ بن صامت قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ کتابت بھی سکھاتے تھے، نیز بدر کے قیدیوں کے ذریعہ کتابت کی تعلیم ہوئی اور صحابہ میں لکھنے کا رواج ہوا، مصاحف لکھے گئے اور بعض صحابہ مجلس نبویؐ میں احادیث بھی لکھا کرتے تھے، اس کے باوجود عموماً قرآن کی تعلیم زبانی ہوتی تھی، خاص خاص حضرات پورے قرآن مجید کے حافظ و قاری تھے جب کہ عام صحابہ بقدر ضرورت چند سورتیں یاد کر لیتے تھے۔

عہد صحابہ و تابعین میں اسلامی فتوحات ہوئیں، عالم اسلام کا رقبہ وسیع ہوا اور جزیرۃ العرب کے علاوہ دیگر ممالک میں تعلیم و تعلم کی سرگرمی جاری ہوئی، اس دور میں بھی دینی علوم کا مرکز مدینہ منورہ تھا جہاں کثیر تعداد میں صحابہ موجود تھے، یہیں سب سے زیادہ علم دین کا چرچا تھا اور یہی مرجع تھا، اس کے بعد مکہ مکرمہ دوسرا مرکز تھا، اس زمانہ میں عراق کے دونوں شہر کوفہ اور بصرہ اسلامی علوم کے اہم ترین مرکز تھے، جہاں کثیر تعداد میں صحابہ اور تابعین موجود تھے، خاص طور سے کوفہ میں حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابو موسیٰؓ اشعری وغیرہ کی وجہ سے تعلیمی سرگرمی بہت زیادہ تھی، یہاں تقریباً پانچ سو اہل روایت تابعین موجود تھے، اس کے بعد بصرہ کتاب و سنت اور تفقہ فی الدین کا مرکز تھا اور حضرات صحابہ کے علاوہ تقریباً دو سو اہل روایت تابعین آباد تھے، اس کے بعد شام و مصر کا درجہ تھا، خاص طور سے بنو امیہ کے دور میں یہاں علمی و تعلیمی سرگرمی بہت زیادہ تھی اور اجلہ صحابہ و تابعین تعلیم و تعلم میں مصروف تھے، اس زمانہ میں یمن اور اس کے مخالیف و اضلاع اس میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے، صنعاء، جُند، رمع، زبید وغیرہ مرکز تھے، حضرت فروہؓ بن مسیک نے یہاں اشاعت اسلام اور دینی تعلیم میں شاندار خدمات انجام دیں، تابعین میں وہب

بن منبہ، ہمام بن منبہ، طاؤس بن کیسان، معمر بن راشد وغیرہ مرجع تھے۔

مشرقی عالم اسلام اور خراسان وغیرہ میں صحابہ و تابعین کی تعداد کم تھی اس لیے اس دور میں مذکورہ بالا مقامات کے مقابلہ میں یہاں تعلیم و تعلم کا رواج کم تھا، اسی طرح افریقہ میں اس کی کمی تھی۔

عہد صحابہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعلیم و تعلم پر خاص توجہ فرمائی، خود سنن جمع کرنے کا ارادہ کیا مگر اس خیال سے جمع نہیں کیا کہ کہیں اگلی امتوں کی طرح یہ امت بھی کتاب اللہ سے غافل نہ ہو جائے، شام، کوفہ، بصرہ اور مختلف شہروں میں علمائے صحابہ کو تعلیم کے لیے روانہ کیا، بچوں کی تعلیم کے لیے مکاتب جاری کیے، قرآن کی کتابت کرائی اور کثیر تعداد میں مصاحف تیار کرا کر عالم اسلام میں بھیجے، قرآن یاد کرنے والوں کو انعام اور وظیفہ سے نوازا اور ان کی توجہ اور کوشش سے عالم اسلام کا ہر شہر و قریہ دار العلم بن گیا تھا، حضرت عمرؓ کی خصوصیات میں دینی علوم کی اشاعت اہم درجہ رکھتی ہے، ان کے بعد حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے اس خدمت میں نمایاں حصہ لیا اور احادیث و سنن کے جمع و تدوین اور ان کی تعلیم کا اہتمام کیا اور پورے عالم اسلام میں کتب حدیث و فقہ کی تدوین و تالیف کی ابتداء ہوئی، شہروں میں معلمین روانہ کیے، دوسری صدی تک اسلامی علوم کے مشہور مرکز یہ مقامات تھے، مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، طائف، کوفہ، بصرہ، یمن، شام، مصر، عواصم، جزیرہ، موصل، یمامہ، بحرین، واسط، موصل، انبار، مدائن، خراسان، رے، قم، طبقات کے قدیم مورخ خلیفہ بن خیاط اور محمد بن سعد نے ان بلاد و امصار کے علماء و فقہاء و محدثین اور ان کی تعلیمی و علمی سرگرمی کا تذکرہ کیا ہے۔

اس دور میں تعلیمی و علمی اسفار و رحلات کا عام رواج ہو گیا تھا، تابعین کے شاگرد

مدینہ کا سفر کر کے اپنے استادوں کے استاد یعنی صحابہ سے براہ راست احادیث کا سماع کرتے تھے، سند عالی کا حصول بھی علمی سفر کا باعث تھا، تابعین اور تبع تابعین میں حصول علم کے لیے اسفار کا ذوق زیادہ تھا، صحابہ کے وجود کی برکت سے دنیا خالی ہورہی تھی، انکے تلامذہ ان کے علوم کے وارث وامین تھے اور اہل علم ان سے حصول علم کو غنیمت سمجھتے تھے، حضرت ابوسعید خدری نے ایک مرتبہ تابعین کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

حتی لوکان احد هم من وراء	یہانتک کہ اگر تابعین میں سے کوئی شخص
البحر لرکبوا الیہ یتفقہون	سمندر پار ہوگا تو لوگ اس کے یہاں
منہ [1]	جا کر تفقہ فی الدین کی تعلیم حاصل کریں گے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسعید خدری سے فرمایا تھا کہ تمہارے پاس لوگ علم دین حاصل کرنے آئیں گے تم ان کے ساتھ اچھا برتاو کرنا، زبان رسالت سے علمی و تعلیمی اسفار کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

عہد نبویؐ سے مسجدوں میں تعلیمی حلقات و مجالس قائم کی جاتی تھیں، بعض حضرات اپنے مکانوں پر تعلیم دیتے تھے، بعد میں اسی سنت کے مطابق علمائے اسلام نے مسجدوں کو تعلیم و تعلم کا مرکز بنایا اور دو تین صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا، اس درمیان میں تعلیم کے لیے یا طلبہ کے لیے کسی مستقل عمارت کا پتہ نہیں چلتا ہے، البتہ عبّاد و زہّاد کے قیام و طعام اور دیگر ضرویات کے لیے عمارت وکفالت کے بعض واقعات خلافت راشدہ میں ملتے ہیں، علامہ مقریزی نے کتاب الخطط والآثار میں ابونعیم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت زید بن صوحان بن صبرہ متوفی ۳۶ھ نے جو خود بھی عابد وزاہد اور بصرہ کے سادات تابعین

---

[1] مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ ص ۲۲۲۔

تھے، اہل بصرہ کے کچھ بزرگوں کو دیکھا کہ نہ وہ تجارت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی ذریعۂ معاش ہے، وہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے ہیں تو ان کے لیے مکانات بنوائے اور ان کے خورد و نوش کا انتظام کیا[1] یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا، خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی نے حکماء و فلاسفہ کے لیے بیت الحکمۃ قائم کر کے ان کے قیام اور وظیفہ کا انتظام کیا، ایک قریشی باذوق عالم عبد الحکم بن عمرو بن صفوان نے اپنے اخوان و احباب کے لیے ایک مکان بنایا جس میں آلات لہو و لعب کے ساتھ کتب العلم بھی جمع کیا[2]

خلیفہ معتضد باللہ متوفی ۲۸۹ھ نے حکماء و فلاسفہ کے لیے عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی، بغداد کے علاقہ شماسیہ میں شاہی محل کے لیے زمین کی پیمائش کرائی تو ضرورت سے زیادہ زمین کی پیمائش کرائی جس میں بہت بڑی شاندار عمارت اور اس میں نظریاتی اور عقلی علوم و فنون کے لیے کمرے تعمیر کرائے اور ہر کمرہ میں علوم عقلیہ و نظریہ کے نامور اساتذہ کو رکھ کر ان کا سالانہ خطیر وظیفہ مقرر کیا تاکہ جو شخص جس فن کے ماہر سے تعلیم حاصل کرنا چاہے آسانی سے حاصل کر سکے[3] مگر اس وقت تک فقہاء و محدثین اور اصحاب روایت نے مسجد ہی کو درسگاہ بنائے رکھا، نہ انھوں نے اس کے لیے الگ سے کوئی عمارت بنائی، اور نہ کسی خلیفہ و امیر نے اس کی طرف توجہ کی، البتہ مغرب اقصیٰ میں دو بہنوں نے شاندار جامع بنا کر ان کے اردگرد طلبہ کے قیام کے لیے حجرے تعمیر کرائے، تیسری صدی میں دینی درسگاہ کے سلسلہ میں یہ پہلا اقدام تھا، مغرب کے شہر فاس کی فقیہ و مفتیہ حضرت ام البنین فاطمہ بنت محمد بن عبد اللہ فہری نے یکم رمضان ۲۴۵ھ میں جامع قرویین

---

[1] کتاب الخطط والآثار ج ۴ ص ۲۹۳ [2] جمہرۃ انساب العرب ص ۱۶۰ [3] کتاب الخطط والآثار ج ۲ ص ۳۶۲۔

کی بنیاد رکھی، اس کے لیے اپنے پاک موروثی مال سے قبیلہ ہوارہ میں زمین خریدی، اپنی زمین سے پتھر نکلوایا اور مسجد کے اندر گرد دینی علوم کے طالب علموں کے لیے حجرے اور کمرے تعمیر کرائے، جامع قرویین میں آج تک دینی تعلیم جاری ہے اور اس کا شمار مغرب کے قدیم ترین جامعات میں ہوتا ہے، ان کی بہن حضرت مریم بنت محمد بن عبداللہ فہری نے بھی اسی سال ۲۴۵ھ میں جامع الاندلس کی بنیاد شہر فاس میں رکھی اور اس کے اطراف میں طلبہ کے قیام کے لیے حجرے تعمیر کرائے، فاس کے سلطان ادریس بن ادریس نے اندلس کے مسلمانوں کی ایک جماعت کو مشرقی فاس میں آباد کیا تھا، اسی علاقہ میں مریم بنت محمد نے مسجد تعمیر کر کے اس کا نام جامع الاندلس رکھا تھا،[1] اس کے بعد ۳۶۱ھ میں قاہرہ میں جامع ازہر کی تعمیر ہوئی، جس میں طلبہ کے لیے رواق تعمیر کیے گئے، مسجدوں سے متعلق طلبہ کے قیام کے لیے کمرے تو تعمیر ہوئے مگر تعلیم مسجدوں ہی میں ہوتی تھی، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ طلبہ کے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا کیا انتظام تھا وہ خود اس کا انتظام کرتے تھے یا انکی کفالت کی کوئی صورت تھی، بغداد و قاہرہ اور دوسرے بڑے اسلامی شہروں میں تیسری اور چوتھی صدی تک مسجدوں میں تعلیمی حلقے قائم ہوتے تھے، خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ بغداد کی جامع منصور میں اپنی مجلس درس قائم کرتے تھے، داؤدی مسلک کے مشہور امام و عالم ابراہیم بن محمد نفطویہ متوفی ۳۲۳ھ نے جامع منصور کے ایک ستون کے پاس پچاس سال تک درس دیا اور جگہ نہیں بدلی، شافعی مسلک کے عالم ابو حامد احمد بن محمد اسفرائنی متوفی ۴۰۶ھ بغداد میں حضرت عبداللہ بن مبارک کی مسجد میں درس دیتے تھے جس میں تین سو سے سات سو تک فقہاء و علماء شریک ہوتے تھے، مقدسی بشاری کا بیان ہے کہ

---

[1] حاضر العالم الاسلامی۔

جامع ازہر میں عشاء کے بعد ایک سو دس ۱۱۰ علمی مجلسیں قائم ہوتی تھیں۔

مدرسوں کی تعمیر کے بعد بھی مسجدوں میں دینی تعلیم کی افادیت زیادہ تھی، اس میں اتباع سنت کے ساتھ عام مسلمانوں کے لیے بھی علمی و دینی فائدہ تھا، ابن الحاج المدخل میں لکھتے ہیں:

اخذ الدرس فی المسجد	مسجد میں درس لینا افضل ہے کیونکہ
افضل لاجل کثرة الانتفاع	اس میں طلب علم کا قصد کرنے والے
بالعلم لمن قصده ومن لم	اور نہ قصد کرنے والے دونوں کے حق
یقصده، بخلاف المدرسة	میں زیادہ فائدہ ہے بخلاف مدرسہ
فانه لا یاتی الیها الا من قصد	کے کہ وہاں صرف علم کا طالب یا استفتاء
العلم او الاستفتاء فاخذه	کرنے والا ہی آئے گا، اس لیے مسجد
فی المدرسة اقل رتبة	کے بجائے مدرسہ میں تحصیل علم سے اس کی
فی الانتشار منه فی المسجد،[1]	اشاعت کم ہوگی۔

اسی لیے مدرسوں کی تعمیر کے بعد بھی مسجدوں میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، بلکہ آج تک جاری ہے، موجودہ طرز کے مدارس کی ابتدا کے بارے میں علامہ مقریزی نے بیان کیا ہے:

ان المدارس مما حدث	مدارس اسلام میں بعد میں بنائے گئے
فی الاسلام ولم تکن تعرف	ہیں، صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں
فی زمن الصحابة ولا التابعین	ان کا پتہ نہیں چلتا ہے، ان کی تعمیر

[1] المدخل ج ۱ ص ۲۰۲۔

انما حدث عملها بعد الاربعمائة	چوتھی صدی ہجری کے بعد ہوئی ہے،
من سنی الھجرۃ واول من	اور اہل نیساپور نے سب سے پہلے
حفظ عنہ انہ بنی فی الاسلام	مدرسہ بنایا اور مدرسہ بیہقیہ کی تعمیر
اھل نیسابور فبنیت المدرسۃ	کی گئی۔
البیھقیۃ بہ[1]	

ہمارے نزدیک چوتھی صدی کے بعد نہیں بلکہ چوتھی صدی کے اندر نیساپور کے شافعی فقہاء و علماء نے مدرسوں کو تعمیر کیا ہے، عام طور سے مشہور ہے کہ وزیر نظام الملک طوسی متوفی ۴۸۵ھ نے مدارس کی بنیاد ڈالی حالانکہ امام تاج الدین سبکی کی تصریح کے مطابق وزیر موصوف کی ولادت سے پہلے کئی مدارس تعمیر ہو چکے تھے، صرف نیساپور میں چار مدرسے جاری ہو چکے تھے، پہلا مدرسہ بیہقیہ، دوسرا مدرسہ سعدیہ، جس کو امیر نصر بن سبکتگین سلطان محمود غزنوی کے بھائی نے نیساپور کی امارت کے دور میں تعمیر کیا تھا، تیسرا مدرسہ جس کو نیساپور میں ابو سعد اسمٰعیل بن علی بن مثنیٰ استر آبادی واعظ صوفی متوفی سنہ ۴۴۰ھ نے قائم کیا تھا، چوتھا مدرسہ نیساپور میں استاد ابو اسحاق اسفرائنی کے لیے بنایا گیا، بقول حاکم مدرسۂ ابو اسحاق سے پہلے نیساپور میں ایسا شاندار مدرسہ تعمیر نہیں ہوا تھا، اس کے بعد امام سبکی نے لکھا ہے کہ میں نے غور و فکر کیا تو ظن غالب ہوا کہ سب سے پہلے نظام الملک نے طلبہ کے لیے معالیم اور وظائف مقرر کئے ہیں[2]۔

مذکورہ مدرسوں کے علاوہ اس زمانہ میں نیساپور وغیرہ میں شافعی علماء و فقہاء کے کئی مدرسے جاری تھے، قاضی ابوبکر محمد بن احمد بن علی بن شاہویہ فارسی متوفی ۳۶۲ھ

---

[1] کتاب الخطط والآثار ج ۲ ص ۳۶۲ [2] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴ ص ۳۱۴۔

مدرسہ ابوحفص الفقیہ میں درس دیتے تھے[1] فقیہ ابوالحسن محمد بن شعیب بیہقی متوفی ۳۲۴ھ نیساپور کے مدرسہ شوافع کے مدرس تھے[2] فقیہ ابوطاہر محمد بن علی بن محمد بن بویہ زراد مروالروز کے مقام پنج دہ میں مدرسہ مرست میں درس دیتے تھے[3] امام ابوالمظفر منصور بن محمد سمعانی تبدیل مسلک کر کے حنفی سے شافعی ہو گئے اور مرو کے مدرسۂ اصحابِ شافعی میں رکھے گئے[4] فقیہ ابوالمعالی شبیب بن عثمان رحبی بغداد کے مدرسہ ناجیہ میں پڑھاتے تھے، اس مدرسہ کو تاج الملک مرزبان بن خسرو وزیر ملک شاہ سلجوقی نے تعمیر کیا تھا، استاد ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری زین الاسلام نیساپوری کا ذاتی اور خاندانی مدرسہ تھا جس میں خاندان کے علماء و مشائخ دفن کیے جاتے تھے[5]

وزیر نظام الملک طوسی سے پہلے نیساپور وغیرہ میں علماء و فقہاء نے متعدد مدارس تعمیر کیے، ان میں سے چند مدرسوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے، وزیر موصوف نے اپنے دورِ وزارت میں مشرقی عالم اسلام کے ہر بڑے شہر میں مدرسے تعمیر کرائے، اور طلبہ کے وظیفے اور قیام و طعام کا انتظام کیا، اس کارِ خیر کی ابتدا کے بارے میں ذکریا بن محمد قزوینی نے لکھا کہ ایک مرتبہ سلطان الب ارسلان متوفی ۴۶۵ھ نیساپور گیا، اور ایک مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ مسجد کے دروازے پر فقہاء (طلبہ) کی ایک جماعت پھٹے پرانے کپڑوں میں موجود ہے، ان لوگوں نے نہ سلطان کا استقبال کیا اور نہ ان کے لیے دعا کی، سلطان الب ارسلان نے نظام الملک سے ان کے بارے

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۳ ص ۸، [2] انساب سمعانی ج ۲ ص ۴۱۳ [3] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۲۰۴ [4] ایضاً ج ۵ ص ۳۴۴ [5] ایضاً ص ۳۲۹۔

میں سوال کیا، انھوں نے بتایا کہ یہ طلبۂ علم ہیں، یہ لوگ بہت اعلیٰ و اشرف مزاج کے ہیں، ان کو دنیا سے کوئی مطلب نہیں ہے، ان کی حالت ان کے فقر و محتاجی کی شہادت دیتی ہے، جب وزیر نظام الملک نے محسوس کیا کہ سلطان کا دل ان لوگوں کے بارے میں نرم ہو گیا ہے تو کہا کہ اگر سلطان اجازت دے تو میں ان لوگوں کے لیے کوئی عمارت بنا کر ان کا وظیفہ جاری کر دوں تاکہ وہ طلب علم میں مشغول رہ کر سلطان کو دعا دیتے رہیں، سلطان نے اس کی اجازت دے دی اور نظام الملک نے پورے قلمرو میں مدارس کی بنا کا حکم دیا اور یہ کہ سلطان کی جو دولت وزیر نظام الملک کے لیے مختص ہے اس کو مدارس کی تعمیر میں خرچ کیا جائے[1]

اس کے بعد نظام الملک نے بغداد، بلخ، نیساپور، ہرات، اصفہان، بصرہ، مرو، آمل طبرستان، موصل اور عراق و خراسان کے ہر شہر میں مدرسے تعمیر کرائے اور یہ سب مدرسہ نظامیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ بغداد میں مدرسہ نظامیہ کی تعمیر ذوالحجہ ۴۵۷ھ میں شروع ہوئی اور شنبہ دس ذوالقعدہ ۴۵۹ھ میں اس کا افتتاح ہوا، نظام الملک نے حکم دیا تھا کہ اس کے مدرس فقیہ ابو اسحاق شیرازی متوفی ۴۷۶ھ ہوں گے، چنانچہ طے ہوا کہ مدرسہ کے افتتاح کے دن طلبہ ان کے ساتھ آکر تعلیم و تدریس میں شریک ہوں گے، مگر ابو اسحاق شیرازی نہیں آئے، اور تلاش کرنے پر بھی نہیں ملے تو فقیہ ابو نصر بن صباغ کو بلا کر مدرس بنایا گیا، اس کے بعد ابو اسحاق شیرازی اپنی مسجد میں پائے گئے اور ان کے شاگردوں نے ابن صباغ کے درس میں جانا بند کر دیا، اس لیے بیس[2] دن کے بعد ابن صباغ کو معزول کر کے ابو اسحاق شیرازی کو لایا گیا۔

---

[1] آثار البلاد و اخبار العباد ص ۳۱۲ ۔

اور وہ وفات تک اسی میں درس دیتے رہے، ان کے انتقال پر ان کے شاگرد مدرسہ نظامیہ میں تعزیت کے لیے بیٹھے اور نظام الملک کے بیٹے مؤید الملک نے ابو سعد المتولی کو ابو اسحاق شیرازی کی جگہ مقرر کیا، جب اس کی خبر نظام الملک کو ہوئی تو اس تقرری کو ناپسند کر کے کہا کہ ضروری ہے کہ ابو اسحاق شیرازی کی وفات پر مدرسہ ایک سال کے لیے بند کر دیا جائے، پھر شیخ ابو نصر عبدالسید بن صباغ سابق مدرس کو انکی جگہ پر مقرر کیا[1]۔

اس کے بعد پورے مشرقی عالم اسلام کے سلاطین، وزراء اور امراء نے اپنے اپنے علاقہ میں مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں کو تعمیر کر کے علماء، فقہاء، محدثین اور مشائخ کو جمع کیا اور ان کے وظائف مقرر کیے اس بارے میں ہر صاحب اقتدار دوسرے پر سبقت کی کوشش کرتا تھا اور اہل علم میں مخلصین کی ایک جماعت ماتم کر رہی تھی کہ اب علم اور اہل علم سلاطین و امراء کے رہین منت ہو رہے ہیں اور علم دین پر ارباب دنیا کا سایہ پڑ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مدارس کے قیام و انتظام کے نتیجہ میں تعلیم و تعلم کی فضا میں خوشگوار انقلاب پیدا ہوا، حالات اور ضروریات کے مطابق دینی نصاب میں دنیاوی علوم و فنون داخل کیے گئے، اور طلبہ و مدرسین غم روزگار سے آزاد ہو کر تعلیم و تعلم میں منہمک ہوئے۔ جس زمانہ میں فقہاء مدرسوں کی چہار دیواری میں تعلیم و تعلم میں سرگرم تھے، محدثین مسجدوں کی فضاء سے نکل کر میدانوں اور عام مقامات میں حدیث کے املا کی مجلسیں قائم کرتے تھے اور ہزاروں لاکھوں طلبۂ حدیث جمع ہو کر ان سے حدیث سنتے اور لکھتے تھے، املا کرانے والے محدثین کے کئی کئی مستملی ہوتے تھے جو انکی آواز کو مجمع تک پہنچاتے تھے، مسجد، مدرسہ اور کھلے مقامات کی مجلسیں تینوں اسلامی علوم کی عام درسگاہیں تھیں اور چوتھی صدی تک ان مرکزوں سے اسلامی علوم کی نشر و اشاعت ہو رہی تھی، املا کی مجالس میں خاص طور سے طلبۂ حدیث شریک ہوتے تھے، بعد میں اسکا رواج تقریباً ختم ہو گیا اور مسجدوں، مدرسوں کی مرکزیت تا حال قائم ہے۔

---

[1] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۳ (طبع اصفہان)

محمد فرید وجدی اور ان کے افکار

از ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی ۔ علی گڑھ۔

(۲)

مقدمہ فی صفوۃ العرفان فی تفسیر القرآن: فرید وجدی کی علمی و دینی خدمات کا دائرہ متنوع اور وسیع ہے، اسلام کی فلسفیانہ و متکلمانہ تشریح کے علاوہ انھوں نے قرآن مجید کے علوم و معارف کی شرح و تفسیر کو بھی اپنا موضوع بنایا تھا، اس کتاب میں پہلے انھوں نے قرآن مجید کی اصل حیثیت واضح کی ہے پھر قرآن مجید کے نزول کے زمانے کے ابتر حالات بیان کرکے دکھایا ہے کہ اس نے ان میں دفعتاً کیا اصلاح و تبدیلی کی اور جن لوگوں نے اس کی دعوت قبول کرلی انہیں کتنے اعلا و ارفع مقام پر پہنچا دیا۔

فرید وجدی کے نزدیک مسلمانوں کے وجود و بقا کا دارو مدار اسی کتاب حکیم پر ہے، اس کی طرف سے بے اعتنائی ہی کی وجہ سے مسلمان آج ذلیل و خوار ہو گئے ہیں، اگر انہیں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا ہے تو اسی کا سہارا لینا پڑے گا ع نیست ممکن جز بقرآں زیستن

فرید وجدی نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ قرآن مجید اس لیے نہیں نازل کیا گیا تھا کہ مسلمان تبرکاً اس کی تلاوت کرلیں یا ایصال ثواب اور مصائب کو دفع کرنے کے لیے اس کو پڑھ لیں، وہ اس پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ اب بلا سمجھے بوجھے قرآن مجید پڑھنے کو معمول بنا لیا گیا ہے جب کہ اس میں تدبر و تفکر کرنا چاہیے اور اس کی حکمتوں اور

اس کے اسرار و رموز سے واقف ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس کے بعد انھوں نے یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید کے مفسر کو کن کن علوم سے واقف ہونا ضروری ہے۔

وہ قرآن مجید کے ہر قسم کے تغیر و تحریف سے پاک ہونے اور اس کے غیر معمولی موثر اور انقلاب آفریں ہونے کا ذکر بھی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس نے فکر و عمل، معاشرت و اخلاق اور تہذیب و تمدن میں کیا انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس کتاب کے بعض مباحث کا ذکر ان کی کتابوں المدنیۃ والاسلام اور الاسلام فی عصر العلم میں آچکا ہے، یہاں ہم بعض نئی باتوں کی جانب توجہ منعطف کرائیں گے۔

پہلے باب "الادیان فی نظر القرآن" میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام ادیان کے صحائف جن کو وحی الٰہی کہا جاتا ہے یا تو وہ تمام تر ان کے علماء کے اقوال و آراء پر مبنی ہیں یا ان میں مذہبی رہنماؤں اور دینی پیشواؤں کی رائیں شامل ہوگئی ہیں خود توریت اور انجیل میں بھی غیر معمولی تحریف ہوئی ہے۔ ان کے محرفین کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ (البقرہ: ۲/۷۹)	پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں، پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے۔

دوسرا باب "الناس فی نظر القرآن" ہے۔ جس میں فرید وجدی نے قرآن کریم کی رو سے انسانوں کے حسب ذیل تین گروہوں کا ذکر کر کے ان کے بارے میں مشترک اور جدا جدا تعلیمات بیان کی ہیں: (۱) مومنین (۲) یہود و نصاریٰ (۳) اور مشرکین و منکرین۔

ایک باب "المسلمون فی نظر القرآن" ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ ملت اسلامیہ

سے تعلق رکھنے والوں کو مسلم کہا جاتا ہے، اللہ نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ آپس میں متحد رہیں اور اپنے بھائیوں کے رنج و خوشی میں شریک ہوں۔ جغرافیائی حد بندی، رنگ نسل اور زبان و تہذیب انہیں جدا نہیں کر سکتی ہے۔ دین ہی ان کی اصل بنیاد ہے اور اسی کی نسبت سے وہ ساری دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں، وہ دنیا میں ظلم و زیادتی سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر اللہ سے قربت حاصل کی جا سکتی ہے۔ قرآن کریم میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ جب ان کے دشمن عہد کا پاس و لحاظ نہ رکھیں، تب ہی ان کے لیے جائز ہوگا کہ انکے ساتھ رعایت نہ برتیں۔ اللہ نے مسلمانوں کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ وہ ایمان و حسن عمل کی بدولت زمین میں تمکن و اقتدار حاصل کرتے ہیں اور اللہ کے حکم سے سرتابی کے نتیجہ میں اقتدار و اختیار سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔[۳]

اس کے بعد باب " الکافرون فی نظر القرآن " میں منکرین کی صفات بیان کرکے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر یہ خلافت اسلامیہ کے زیر نگیں ہوں اور مسلمانوں کے محکوم بن کر رہنا چاہیں تو انکے مال و دولت اور عزت و ناموس کا پاس و لحاظ کرنا مسلمانوں پر واجب ہے اور اگر وہ ان کے زیر نگین نہ ہوں لیکن ان کے مابین کوئی عہد ہو تو مسلمانوں کو اس کا خیال کرنا لازمی ہے اور اگر وہ مسلمانوں سے برسرپیکار ہوں تو مسلمانوں کے لیے بھی ان سے جنگ کرنا روا ہے۔ اگر جنگ میں یہ قید ہو جائیں تو انکے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔

اس کے بعد باب " الانسان فی نظر القرآن " ہے۔ قرآن کریم نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ نے اسے اپنا خلیفہ اور دنیا کی تمام چیزوں کو

اس کی خدمت کے لیے بنایا ہے، مگر بسا اوقات وہ خواہشات کے پیچھے پڑ کر اپنی اس حیثیت اور عظمت کو فراموش کر بیٹھتا ہے اور وہ اللہ کے ناشکرے بندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (الاسراء: ۱۷/۶۷) انسان بڑا ناشکرا ہے۔

اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو زمین کا وارث بناتا ہے جو بنی آدم کے خیر و فلاح کے لیے کوشاں رہتے ہیں[4]

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ (الانبیاء: ۲۱/۱۰۵) زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہوں گے۔

باب "الوجود فی نظر القرآن" میں بتایا گیا ہے کہ بعض فلاسفہ دنیا ہی کو اول و آخر قرار دیتے ہیں۔ لیکن جدید تحقیق نے اس نظریہ کو پاش پاش کر دیا ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے کہ انسان کو علم کا بہت تھوڑا حصہ عطا کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کائنات کی بہت سی اشیا سے بے بہرہ ہے[5]

"الدنیا فی نظر القرآن" میں یہ بتایا گیا ہے کہ فلاسفہ، شعراء اور مفکرین دنیا کو حقیر اور آفات و مصائب سے پُر بتاتے ہیں، اسی بنا پر کچھ لوگ تارک الدنیا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں قرآن مجید کا نقطۂ نظر نہایت اعتدال پر مبنی ہے، ایک طرف تو اس نے دنیا کو متاع غرور، لہو و لعب اور سامان آرائش قرار دیا ہے تو دوسری طرف یہ بھی کہا ہے کہ:

لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا اپنے دنیاوی حصہ کو تم فراموش مت کرنا۔

دوسری جگہ فرمایا :

فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ: ۶۲/۱۰) تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی پاک چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا حکم دیا ہے، اور حرام چیزوں سے روکا ہے، منکرات و فواحش سے دور رہنے اور انہیں مٹانے کی تلقین کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے روحانی اور جسمانی تقاضوں کو ہم آہنگ کرنے کی پوری کوشش کی ہے[۶]

"ناموس الارتقاء فی نظر القرآن" میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ انسان کا ابتدائی دور موجودہ دور سے بہت بہتر تھا۔ یہ خیال بھی باطل ہے کہ علم ایک جامد شے ہے۔ اسلام کے نزدیک پہلے بنی نوع انسان کے پاس علم کم تھا مگر رفتہ رفتہ اس کا علم بڑھتا گیا۔ اسی بنا پر اسے قرآن کریم نے اس دعا کی تلقین کی ہے کہ :

رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (طہ : ۲۰/۱۱۴) اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ کر۔

بعد کے دور میں مسلمانوں نے علوم و فنون میں جو غیر معمولی ترقی کی اس سے کون واقف ہے۔

"الشریعۃ فی القرآن" میں اس کا ذکر ہے کہ اصول شریعت کی بنیاد مساوات عدل اور آزادی پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ دنیا کے تمام انسانوں کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے گا، اگر اپنے اوپر بھی اس کی زد پڑتی ہو تب بھی عدل و انصاف پر قائم رہنا چاہیے۔

"الحکومۃ فی القرآن" میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد عدل پر ہوگی۔ ایک صالح شخص کو بذریعہ انتخاب حکومت کی ذمہ داری سپرد کی جائے گی اور مسلمانوں

کے تمام امور و مسائل باہمی مشورے سے طے ہونگے[۸]

اس کے بعد "الجہاد فی نظر القرآن" میں بتایا گیا ہے کہ قتل و غارت گری اور دنیا سے شر و فساد کے ازالہ کے لیے جہاد کی ضرورت ناگزیر ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ	اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ
بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ	کو دوسرے گروہ کے ذریعہ سے ہٹاتا
(البقرہ: ۲/۲۵۱)	نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا۔

اس طرح گویا دفاع، قیام عدل اور انسداد ظلم کے لیے جنگ جائز قرار دی گئی ہے تاہم دشمنوں کے بچوں، کمزوروں اور سپر ڈالدینے والوں کو قتل کرنا منع ہے[۹]

"العبادات فی نظر القرآن" میں فرید وجدی نے بتایا ہے کہ اسلام میں عبادات کا دائرہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قربانی ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جسمانی اور روحانی دونوں قسم کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی عبادت ہے[۹]

"المعجزات فی القرآن" میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں نہ جلنے، لاٹھی کے سانپ بن جانے اور حضرت عیسیٰؑ کے مردوں کو زندہ کر دینے وغیرہ کا ذکر بطور معجزہ کیا ہے لیکن فرید وجدی کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا اصل معجزہ اسکی تاثیر، دلنشینی اور ذہن انسانی کی تسخیر اور نفوس و قلوب کو اپنا والہ و شیدا بنا لینا ہے[۱۰]

"الناسخ والمنسوخ فی القرآن" میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی منسوخ آیتوں کی بنا پر اس کے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ وہ نعوذ باللہ اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ کا حکم ثابت اور اٹل ہوتا ہے، فرید وجدی نے اس کا مدلل اور معقول جواب دیا ہے[۱۱]

"الولایۃ والکرامۃ" پر بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ کوئی غم، وہ خدا پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کے غیظ و غضب سے ڈرتے ہیں۔ خوارق و کرامات کا ظہور ولایت و کرامت کی شرط نہیں ہے۔ اولیاء کی قبروں پر گنبد بنانے اور ان سے استمداد و اعانت کو فرید وجدی نے ناجائز بتایا ہے[۳]

"الشفاعۃ والتوسل فی نظر القرآن" میں شفاعت و توسل کے متعلق قرآنی نظریہ کی وضاحت کی گئی ہے اور اس ضمن میں یہ آیت بھی پیش کی گئی ہے کہ:

كَمْ مِنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا[۴] (النجم: ۵۳/۲۶) آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں جن کی شفاعت کچھ کام نہیں آسکتی۔

"القضاء والقدر فی نظر القرآن" میں فرید وجدی نے اس پر روشنی ڈالی ہے کہ کائنات خدا کے بنائے ہوئے ایک مخصوص و مستحکم نظام کے مطابق چل رہی ہے۔ انسان بھی اللہ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا، فرمایا:

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (النساء: ۴/۷۸) کہو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ دنیا میں انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہے، فرید وجدی اس طرح کی لایعنی بحث میں نہ پڑنے کی تلقین کرتے ہیں اور انسان کو اسکی دعوت دیتے ہیں کہ وہ خالق سے اپنے تعلق پر غور و خوض کرے، یہ دیکھے کہ دنیوی اعمال کا آخرت میں کیا اثر مرتب ہوگا اور دنیا میں شر کے پائے جانے کا سبب کیا ہے اور اس کائنات کی کیا غرض و غایت ہے[۵]

اس کے بعد باب "النعیم والعذاب الاخرویان" ہے یعنی دنیا میں نیک کام کرنے والوں سے آخرت میں اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں جنت ملے گی۔ کچھ لوگوں کا خیال

ہے کہ جنت کوئی مادی شے نہیں ہے بلکہ یہ روحانی شے ہے۔ مگر فرید وجدی جنت کے جسمانی ہونے کے قائل ہیں، وہ اسے صالحین کی آرام گاہ اور جہنم کو بدکاروں کا ٹھکانہ بتاتے ہیں[15]۔

اس کتاب کے آخری باب "جمع القرآن" میں قرآن کریم کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا کے لیے ابدی ہدایت ہے جو ہمیشہ تحریف و تبدیل سے محفوظ رہے گی کیونکہ خداوند قدوس نے اس کے تحفظ کی ذمہ داری خود اپنے ذمہ لی ہے۔ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول شروع ہوا اور تیئیس[23] سال اور ایک قول کے مطابق بیس[20] سال تک پورا قرآن مجید نازل ہوا۔ اس کی سب سے پہلی سورہ "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ" غار حرا میں نازل ہوئی۔ آیات قرآنی کے نزول کے بعد آپؐ متعدد صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کو انہیں لکھنے کا حکم دیا کرتے تھے اور وحی الٰہی کے مطابق ان کی ترتیب قائم کرتے تھے۔ جمع قرآن کا کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں انجام پا چکا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں جب بکثرت حفاظ شہید ہوئے تو قرآن کریم کو مجلد صورت میں جمع کیا گیا اور جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے نسخہ کی کاپیاں کرا کے انہیں مختلف علاقوں میں بھجوایا۔ یہ قریش کے لہجہ کے مطابق تھا اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اختلاف قرأت سے آئندہ لوگوں کو پریشانی نہ ہو۔ فرید وجدی نے صحابہ کرامؓ کے مابین قرأت کے اختلاف اور ان کے مختلف مکاتب کے علاوہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: انزل القرآن علی سبعۃ احرف یعنی قرآن کریم کا نزول سات لہجوں میں ہوا ہے۔ پر بھی بحث کی ہے[16]۔

فرید وجدی کی یہ کتاب قرآنیات میں ایک مفید اضافہ ہے۔ جو کئی پہلوؤں سے قابل قدر ہے۔

"نشانِ قرآن" قرآن مجید ہی کے موضوع پر ان کی یہ کتاب بھی ہے۔ یہ دراصل وہ مضمون ہے جو ان کی مرتب کردہ دائرۃ المعارف میں شامل ہے، جس کا ذکر آگے آئیگا۔ اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کا اردو ترجمہ بھی کیا گیا ہے، اس میں قرآن مجید کی کتابت و تدوین اور اس کے تحریف و تبدیل سے پاک ہونے اور کے اعجاز اور وجوہ اعجاز پر بحث و گفتگو کی گئی ہے۔ چونکہ اس کی اکثر بحثوں کا ذکر اس سے پہلے والی کتاب کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ اس لیے یہاں صرف اعجاز کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بیان کیا جاتا ہے۔

اعجاز قرآن کے باب میں علماء کے مختلف اقوال ہیں ایک جماعت کا خیال ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز اس لحاظ سے ہے کہ اس کا اسلوب انسانی کلام کے اسلوب سے بالکل مختلف ہے، کوئی انسان ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہے' دوسری جماعت کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید تضاد و تناقض سے پاک ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن مجید غیب کی خبریں بتاتا ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت کو بھی اعجاز قرآن قرار دیا گیا ہے، فرید وجدی کہتے ہیں کہ قرآن کریم کا اصل اعجاز یہ ہے کہ وہ نفوس انسانی پر اپنا غیر فانی نقش بیٹھا دیتا ہے۔ یقیناً بلاغت کا اثر نفس انسانی پر پڑتا ہے۔ لیکن ایک بلیغ کلام کو بار بار سننے سے اس کا لطف و اثر رفتہ رفتہ زائل ہونے لگتا ہے' اس کے برعکس قرآن مجید کی تلاوت جس قدر کثرت سے کی جائے اسی قدر اس کی تاثیر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا	اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے
مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ	ایک روح تمہاری طرف

مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ۔ وحی کی ہے، تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ
(الشوریٰ: ۴۲/۵۲) کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔

قرآن کریم کے روحانی وحی ہونے سے لازماً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ جن وانس کے کلام سے بالاتر ہے۔ چنانچہ سارے جن وانس مل کر بھی قرآن مجید کی ایک چھوٹی سورۃ یا اس کی ایک آیت بھی نہیں پیش کر سکتے۔

المصحف المفسر: فرید وجدی کی قرآنی خدمات میں ایک اہم چیز انکی تفسیر قرآن بھی ہے، اس کے آغاز میں ایک مقدمہ ہے جس میں اس تفسیر کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی گئی ہے، سب سے پہلے قرآن کریم کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہ مشعل ہدایت اور دنیا واخرت میں نجات دہندہ ہے، اس نے بہت سے مستور حقائق کو وا کر دیا، اس کی وجہ سے علوم وفنون وجود میں آئے۔

فرید وجدی نے ۱۳۲۳ھ میں جب قرآن مجید کا مطالعہ طلب ہدایت کے لیے تفکر وتدبر کے ساتھ کرنا شروع کیا تو انہیں تفسیروں کا مطالعہ بھی کرنا پڑا لیکن اپنی گوناگوں علمی مشغولیتوں کی وجہ سے طویل وضخیم تفسیروں سے استفادہ ان کے لیے ناممکن تھا، وہ ایسی تفسیر کے جویا تھے جو کم سے کم وقت میں انہیں اصولِ تفسیر اور الفاظ کے مفاہیم ومعانی سے واقف کرا دے اور جس میں فنی مسائل سے بحث نہ ہو مگر نزولِ آیات کے اسباب بتائے گئے ہوں، اس کی وجہ سے انہیں خود قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا خیال ہوا جس کو اللہ کی مدد سے انھوں نے پایۂ تکمیل تک پہچایا۔

یہ تفسیر اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہے جو ائمہ مفسرین واہل سنت کے اقوال پر مبنی ہے۔ لیکن یہ نہ کسی خاص مکتبِ فکر کی حامل ہے اور نہ اس میں کسی منفرد رائے

کی تائید و حمایت کی گئی ہے۔ جہاں اپنی رائے یا کسی غیر اہل سنت کا خیال بیان کیا گیا ہے وہاں اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔

فرید وجدی نے اپنی تفسیر میں لغت پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہے، الفاظ کے اصول و مشتقات بھی بیان کیے ہیں، اگر کوئی لفظ کئی جگہ آیا ہے تو پہلی جگہ اس کی تشریح کر دی ہے اور دوسری جگہوں پر اس کے حوالے دے دیے ہیں۔ تفسیر لکھنے کا اصل مقصد قرآن مجید کے مقاصد اور نور بصیرت کو عام کرنا ہے تاکہ امت قرآن مجید کی حامل و عامل بن کر اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرے[۴۹]

فرید وجدی کے طریقۂ تفسیر کو سمجھنے کے لیے یہاں سورۂ لہب کی تفسیر سے لفظوں کے مفہوم کی وضاحت کی ایک مثال پیش کی جا رہی ہے۔

"تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ" کا مفہوم یہ ہے کہ ابولہب کی جان چلی گئی اور یقیناً وہ ہلاک ہو گیا۔ پہلے اس کے حق میں بد دعا کی گئی ہے اس کے بعد اس کی ہلاکت کی خبر دی گئی ہے۔ تَبَّتْ تَبًّا کا مفہوم ہلاک ہونا ہوتا ہے۔ يَدَا أَبِي لَهَبٍ سے مراد ابولہب کی جان ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" ان کے نزدیک یہاں أَيْدِيكُمْ جان کے مفہوم میں ہے۔ آگے سَيَصْلَى نَارًا سے مراد آگ میں داخل ہونا ہے اور "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" کا مطلب جہنم کا ایندھن ہے۔ "فِي جِيدِهَا" میں جید کے معنی گردن ہے اور "حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ" کا مطلب بٹی ہوئی رسی ہے۔"

اس کے بعد آیات کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ ابولہب کی ہلاکت ہو، یقیناً وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کا مال و دولت اور اس کی شان و شوکت اس کے کچھ کام نہ آئے گی۔

عنقریب دہکتی ہوئی آگ میں اسے ڈال دیا جائے گا، اس کی بیوی وہاں جہنم کا ایندھن لیے کھڑی ہوگی، اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی پڑی ہوگی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ جس وقت آیت "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ" نازل ہوئی تو آپؐ نے اپنے اعزہ کو انذار کے لیے جمع کیا۔ اس مجمع میں ابولہب نے آپؐ کی دعوت کو سننے کے بعد کہا کہ تمہارا برا ہو اور اس نے آپؐ کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا، اس کی عورت بھی پتھر اٹھائے ہوئے تھی۔ جب کہ دونوں میں شدید خصومت تھی[۵۱]۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ فرید وجدی آیتوں کے اسباب نزول پر بھی خاص توجہ دیتے ہیں کیونکہ اگر ان کے نزول کا صحیح سبب معلوم ہو جائے تو بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں، اسی لیے تفسیر قرآن کریم میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں فرید وجدی کی تفسیر سے اس کی صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

انھوں نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۵ (یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ) کا سبب نزول یہ بتایا ہے کہ عمرو بن الجموع نے جو بہت دولتمند تھے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہم اپنے اموال میں سے کیا اور کہاں خرچ کریں؟ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں خرچ کی جگہوں کی تعیین کر دی گئی ہے۔ یعنی والدین، مستحق اقربا اور یتیم و مسکین اور مسافر وغیرہ[۵۲]۔

سورۂ آل عمران کی آیت فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی الخ اس وقت نازل ہوئی تھی جب حضرت ام سلمہؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ یا رسول اللہ! ہجرت کے بیان میں اللہ تعالیٰ نے صرف مردوں کا ذکر کیا ہے، عورتوں کا ذکر اس میں نہیں ہے، پس یہ آیت اتری جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ مرد و عورت میں سے کسی کے عمل کو ضایع نہیں کرتا[۵۳]۔

فرید وجدی کی یہ تفسیر عام لوگوں کے لیے اس لحاظ سے بہت مفید ہے کہ اس میں ادق اور پیچیدہ فلسفیانہ مسائل اور تعدد و کثرت اقوال بیان کرنے سے پرہیز کیا گیا ہے۔

کنز العلوم واللغۃ کو ترتیب دینے کے بعد وہ چار سال تک دائرۃ المعارف کے لیے مواد اکٹھا کرتے رہے، یہ نو جلدوں پر مشتمل ہے جن کے مجموعی صفحات ۸۴۲۰ ہیں، یہ کام انھوں نے تن تنہا انجام دیا تھا، اس سے ان کی محنت شاقہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے[20]

اس مضمون میں اسلامی و قرآنی موضوعات سے متعلق فرید وجدی کی نو تصانیف پر بحث و تبصرہ کیا گیا ہے۔ ادب و فلسفہ سے متعلق ان کی تصانیف ہم کو دستیاب نہیں ہو سکیں اس لیے ان کے بارے میں یہاں کوئی اظہار خیال نہیں کیا گیا تاہم انکی مذہبی کتابیں بھی ادبی اور فلسفیانہ رنگ سے خالی نہیں ہیں۔

حواشی

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: محمد فرید وجدی۔ مقدمہ صفوۃ العرفان فی تفسیر القرآن مطبعۃ الشعب مصر ۱۳۲۱ھ ص ۴ تا ۱۳ [2] ایضاً ص ۱۵۲-۱۵۴ [3] ایضاً ص ۱۵۵-۱۵۷ [4] ایضاً ص ۱۵۹-۱۶۰ [5] ایضاً ص ۱۶۰-۱۶۲ [6] ایضاً ص ۱۶۲-۱۶۳ [7] ایضاً ص ۱۶۶ [8] ایضاً ص ۱۶۶-۱۶۷ [9] ایضاً ص ۱۶۸-۱۶۹ [10] ایضاً ص ۱۶۹-۱۷۰ [11] تفصیل کے لیے دیکھیے حوالہ سابق صفحات ۱۷۰-۱۷۲ [12] ایضاً ص ۱۷۲-۱۷۳ [13] ایضاً ص ۱۷۴ [14] ایضاً ص ۱۷۵-۱۷۶ [15] وضاحت کے لیے دیکھئے ایضاً ص ۱۷۶-۱۷۹ [16] ایضاً ص ۱۷۹-۱۸۱ [17] وضاحت کے لیے دیکھئے فرید وجدی کی تفسیر کا مقدمہ (المصحف المفسر)۔ محمد فرید وجدی الطبعۃ السادسۃ۔ مطبع محمد علی صبیح، مصر ۱۹۵۳ء [18] المصحف المفسر، ص ۱۴ [19] ایضاً ص ۴۴ [20] ایضاً ص ۱۰۰۔

اردو میں مستعمل قرآنی امثال

از

ڈاکٹر شمس بدایونی

اردو میں عربی فارسی کے بے شمار فقرے، جملے، مقولے، مصرعے اور اشعار وغیرہ بطور ضرب الامثال مستعمل ہو کر جزءِ زبان ہو گئے ہیں، خصوصاً فارسی امثال کی تعداد کثیر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ پندرہ سو[15] کے قریب ہیں اور عربی امثال کی تعداد بھی تقریباً تین سو[30] ہے، جن میں بڑا حصہ آیات و احادیث پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں آیات کے ان ٹکڑوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اردو میں ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہیں۔ آیتوں کے ترجمے اور حوالے بھی دیئے گئے ہیں اور محل استعمال کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ انتخاب میں وہی آیتیں دی گئی ہیں جو اردو میں بطور مثل مروج ہیں۔

ان امثال کی ترتیب لغوی انداز پر باعتبار حروف تہجی رکھی گئی ہے۔ آیتیں لکھنے میں عربی کے بجائے اردو املا اختیار کیا گیا ہے۔ ترجمے کے علاوہ امثال کی کسی قدر تشریح بھی کر دی گئی ہے اور کہیں کہیں مزید وضاحت کیلئے مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

استغفراللہ خدا سے مغفرت چاہتا ہوں (سورۃ البقرہ: ۲ آیت ۱۹۹)

جب کوئی برا کام ہوتے دیکھتے ہیں، یا بری آواز کان میں آتی ہے۔ تب یہ کلمہ بول کر اس کام یا بات سے اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ "خدا معاف کرے" کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

اسفل سافلین سب نیچوں سے نیچ۔ (التین: ۵)

کسی خاص شخص کی برائی اور تنقیص مقصود ہو تو اسکے لئے یہ کلمہ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی شخص سے بچنے کی تلقین مقصود ہو تو کہا جاتا ہے کہ۔ ایسے اسفل سافلین سے بچنا ہی بہتر ہے۔

اعوذ باللہ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں (البقرۃ : ۶۷)

یہ اردو میں "اللہ کی پناہ" کے ہم معنیٰ اور اس وقت استعمال ہوتا ہے۔ جب کسی چیز سے خوف یا نفرت و بیزاری کا اظہار مقصود ہوتا ہے یا اس کی شدت و ہولناکی دکھانی ہوتی ہے۔

الحمد للہ تمام تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں۔ (الفاتحہ : ۱)

اطمینان قلب، خوشی اور تشکر کے اظہار کے موقع پر بولا جاتا ہے۔

الفتنۃ اشد من القتل فتنہ قتل سے بھی شدید تر ہے (البقرۃ : ۱۹۱)

انتشار و فتنہ کی مذمت کیلئے بولتے ہیں۔

اللہ اکبر اللہ سب سے بڑا ہے۔ (العنکبوت : ۴۵)

حیرت و استعجاب کے موقع پر یہ کلمہ بولتے ہیں۔

الا ماشاء اللہ سوائے اسکے جو اللہ چاہے۔ (الاعلیٰ : ۷)

کسی کام کو کلیتاً اللہ تعالیٰ کی رضا سے متعلق کر دینے کے مفہوم میں یہ کلمہ بولا جاتا ہے مثلاً: تم اس معاملہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے "الا ماشاء اللہ"

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم تم میں اللہ کے نزدیک سب سے باعزت وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ (الحجرات : ۱۳)

جاہ و منصب اور نسب وغیرہ جھوٹے اور خود ساختہ انسانی معیارِ عظمت و شرف کی نفی کے طور پر بولا جاتا ہے۔

ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (البقرۃ : ۲۰)

عاجزی اور اظہارِ بے بسی کیلئے یا کسی حیرت انگیز چیز کے وقوع پر یا کامیابی کی توقع و امید کیلئے یہ کلمہ بولتے ہیں۔

ان اللہ علیم بذات الصدور اللہ دلوں کے پوشیدہ راز تک جانتا ہے (آل عمران ۱۹۱)

جب کسی شخص یا کسی بات پر رائے قائم کرنے کے باوجود بے یقینی کی کیفیت باقی رہتی ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے کہ دل کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔

ان اللہ مع الصابرین یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (البقرۃ: ۱۵۳)

صبر کی تلقین کرتے وقت یا صبر کا اظہار کرتے وقت یہ کلمہ بولتے ہیں۔

ان اللہ یحب المحسنین اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔ (البقرۃ: ۵۳)

جب کسی احسان یا احسان کرنے والے کا ذکر گفتگو یا تحریر میں آتا ہے اس وقت تعریف کے طور پر یہ کہتے ہیں بعض اوقات حسن طلب کے موقع پر بھی یہ بولا جاتا ہے۔ جو ایک مؤثر انداز ہے

انا للہ وانا الیہ راجعون ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ (البقرۃ: ۱۵۶)

عموماً موت کی خبر سن کر بلکہ ہر بری خبر سن کر بھی یہ کلمہ بولا جاتا ہے۔

انما المومنون اخوۃ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں (الحجرات ۱۰)

آپس کی بھائی چارگی، یگانگت اور محبت کے اظہار کیلئے اسکا استعمال ہوتا ہے۔

بسم اللہ اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں (النمل: ۳۰)

کسی کام کے آغاز سے پہلے اسکا استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی کسی کام کی طرف پیش قدمی کیلئے اشارۃً بھی اسکا استعمال ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ (النمل: ۳۰)

اسلام کی یہ عام تعلیم ہے کہ ہر کام کا آغاز اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام نامی سے کیا جائے تاکہ اس میں برکت بھی ہو اور وہ درست بھی ہو۔ اسی خیال کے تحت اسکا استعمال کرتے ہیں۔

بعضکم لبعض عدو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو (البقرة: ۳۶)

جب سوسائٹی کے افراد کی اخلاقی پستی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو تو اس کا استعمال کرتے ہیں۔

تعز من تشاء و تذل من تشاء وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ (آل عمران: ۲۶)

جب عزت و ذلت زیرِ گفتگو ہو یا کوئی شخص ان میں سے کسی ایک سے ہمکنار ہوا ہو یا کوئی منصوبہ بند کام ہو جس میں عزت و سرفرازی یا ذلت و ناکامی کا اندیشہ ہو تو ان مواقع پر تسلی و تشفی بہم پہنچانے کیلئے اس کلمہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

حسبنا اللہ و نعم الوکیل ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

(آل عمران: ۱۷۳)

خدا پر توکل کے اظہار کیلئے بولتے ہیں۔

ختم اللہ علی قلوبھم اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے (البقرة: ۷)

جب کوئی شخص حق اور صحیح بات کو نہ مانتے یا اس کی طرف توجہ نہ کرے بلکہ سنی ان سنی کردے یا رد کردے تو اس وقت یہ کلمہ بولتے ہیں۔

خسر الدنیا والآخرة اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ (الحج: ۱۱)

جب کوئی شخص ایسا بے ضرورت کام کرے جس سے نہ دین کی بھلائی ہو نہ دنیا کی یا جسکے کرنے سے دنیا و آخرت خراب ہو رہی ہو تو یہ اس شخص کیلئے اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔
(المائدہ: ۵۴)

کسی شخص کی ذاتی عزت و وقار، کامیابی و کامرانی، وصف و قابلیت، وسعت و اختیار یا مالی و ملکی فتوحات کو دیکھ کر اور سن کر یہ کہتے ہیں۔

رب زدنی علما اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر (طٰہٰ: ۱۱۴)

علم کے تعلق سے یہ ایک دعائیہ کلمہ ہے۔ چونکہ علم کی کوئی حد نہیں ہے اور حصول علم کی راہ میں ایسے بھی مقامات آتے ہیں جن میں عالم کو اپنی کم علمی کا احساس ہونے لگتا ہے تو اس وقت وہ اس کلمہ کو ادا کر کے اپنے قلب کو سکون دیتا ہے۔

رضی اللہ عنہ اللہ ان سے راضی ہو۔ (البینہ: ۸)

قرآن میں عنہ کی جگہ عنہم استعمال ہوا ہے۔ یہ ایک دعائیہ فقرہ ہے جو خصوصیت سے صحابہ کرام کیلئے مستعمل ہے۔

سبحان اللہ پاک ہے اللہ۔ (الحشر: ۲۳)

اکثر کوئی اچھی چیز دیکھ کر یا اچھی بات اور اچھا شعر سن کر، یا لذیذ غذا کھا کر جب اسکی تعریف کرنا مقصود ہو تو اسکا استعمال کرتے ہیں۔ تعجب اور طنز کرتے وقت بھی یہ بولا جاتا ہے۔

سمعنا و اطعنا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی (البقرہ: ۲۸۵)

اظہار اطاعت کیلئے بولتے ہیں۔

صم بکم عمی یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ (البقرۃ: ۱۸)

جب کوئی آدمی پند و نصیحت پر توجہ نہ دے اور حق بات کو سنی ان سنی کر دے صحیح اور درست باتوں اور حقائق کو تسلیم نہ کرے تو ایسے آدمی کیلئے یہ کلمہ بولتے ہیں۔

طوعًا وکرہًا چار و ناچار۔ (آل عمران: ۸۳)

یہ الفاظ اس وقت ادا کیئے جاتے ہیں جب کسی شخص کو کوئی کام بادل ناخواستہ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی آخر کار کے معنی میں بھی مستعمل ہو جاتا ہے۔ اردو میں اسکا مفہوم چار و ناچار سے بھی کیا جاتا ہے۔

عٰلم الغیب والشہادۃ وہ غیب و شہادت ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ (الانعام: ۷۳)

انسان کی واقفیت کی ایک حد ہے۔ جب وہ حد ختم ہو جاتی ہے اور نا واقفیت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس کلمہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کلمہ انسان اپنی محدود واقفیت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے بیکراں علم کے اقرار میں بولتا ہے۔

علّم الانسان مالم یعلم انسان کو وہ علم دیا جسکو وہ جانتا نہ تھا (علق: ۵)

انسان کی بنیادی جہالت اور علم کے وہبی ہونے کے اظہار کیلئے بولتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار: عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو (حشر: ۲)

جس واقعہ یا بات سے عبرت و نصیحت کا پہلو نکلتا ہو۔ اس واقعہ یا بات کو سن کر یا بیان کر کے یہ فقرہ بولتے ہیں۔

فضلنا بعضہم علیٰ بعض: ہم نے ایک کو دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیئے (البقرہ ۲۵۳)

جب تقابل کے ساتھ کسی کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہو یا کبھی اس معنی میں بھی یہ بولا جاتا ہے کہ دنیا میں فضیلت کے اعتبار سے ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔

کل من علیہا فان: ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے۔ (رحمٰن: ۲۶)

جب دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہو تو اس آیت کا استعمال ہوتا ہے۔

کل نفسٍ ذائقۃ الموت: ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ (آل عمران: ۱۸۵)

موت کے یقینی ہونے پر یہ فقرہ دلالت کرتا ہے یعنی ہر ذی حیات شئے کو فنا ہے۔

لاالٰہ الا اللہ : اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (الصّٰفّٰت: ۳۵)

جب تمام طاقتوں، قوتوں اور معبودوں کی نفی کی جارہی ہو تب اثبات نفی کیلئے اس کا استعمال کرتے ہیں مسلمانوں کے کلمہ طیبہ کا بھی یہ پہلا جزء ہے۔

لاتقنطوا من رحمۃ اللہ : اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ (الزمر: ۵۳)

ناامیدی سے بچنے اور پرامید رہنے کی تلقین کیلئے اسکا استعمال کرتے ہیں۔

لایکلف اللہ نفسًا الا وسعھا : اللہ کسی نفس پر اس کی قدرت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ (البقرہ: ۲۸۶)

لعنت اللہ علی الکاذبین : جھوٹے پر خدا کی لعنت ہو۔ (آل عمران: ۶۱)

جب کسی جھوٹ یا جھوٹے شخص کا ذکر چل رہا ہو اس وقت اظہار تنفر کے طور پر یہ بات کہتے ہیں۔ کبھی اپنی صداقت کو معتبر کرنے کیلئے بھی اسکا استعمال کرتے ہیں۔

لکُم دِینُکُم وَلِیَ دِین : تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین (الکافرون: ۶)

جب دو افراد یا قوموں کے متضاد خیالات و عقائد زیر بحث ہوں اور نتیجہ برآمد نہ ہوتا ہو تب اسکا استعمال کرتے ہیں۔ یعنی تم اپنے دین پر اور میں اپنے دین پر۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ : انسان کیلئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جسکی اس نے سعی کی۔ (النجم: ۳۹)

انسان دنیا میں جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ اپنی ذاتی کوشش اور جدوجہد ہی سے کرتا ہے۔ اس خیال کے اظہار کے موقع پر یہ کہا جاتا ہے۔

ماشاء اللہ : اللہ نے جو کچھ چاہا۔ (الانعام: ۲۸)

کسی چیز، کسی واقعہ یا کسی خبر کو دیکھ کر یا سن کر اسے سراہنے کیلئے بولتے ہیں۔ مثلاً ماشاءاللہ آپ کا بچہ بڑا ذہین ہے۔

نصر من اللہ و فتح قریب : اللہ کی طرف سے نصرت اور جلد حاصل ہونے والی فتح ۔ (الصف : ۱۳)

کلمہ دعائیہ ہے جب کسی کو کسی مہم پر رخصت کرتے ہیں تو یہ کہہ کر رخصت کرتے ہیں مسلمان عام طور پر اسے اپنی سواریوں پر کندہ کراتے ہیں ۔

نورٌ علیٰ نور : روشنی پر روشنی ۔ (النور : ۳۵)

کسی چیز کا حسن یا خوبی بیان کرنا ہو تو اس کا استعمال کرتے ہیں ۔ کبھی یہ طنز کے طور پر بھی بولا جاتا ہے ۔ اور کبھی یہ اس معنی میں بھی مستعمل ہے کہ فلاں چیز اچھی تھی یہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے ۔

ورفعنا لک ذکرک : تمہارے ذکر کو بلند کیا ۔ (الانشراح : ۴)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کی عظمت و رفعت کے اظہار کیلئے یہ کہا جاتا ہے ۔

وکفیٰ باللہ شہیدا : اللہ کی گواہی کافی ہے ۔ (النساء : ۷۹)

بعض حالات میں جب آدمی ناامید ہو کر یا اپنے عقیدے کی بنیاد پر خدا کو اپنا گواہ بناتا ہے تب یہ فقرہ بولتے ہیں ۔

لنا اعمالنا ولکم اعمالکم : ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ۔ (البقرۃ : ۱۳۹)

ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے ۔ اس حقیقت کے اظہار کے وقت اس جملہ کا استعمال کرتے ہیں ۔ خاص طور پر اس وقت جب آپسی بحث و تکرار کے بعد کوئی متفق فیصلہ برآمد نہیں ہوتا ۔

واللہ اعلم : اور اللہ زیادہ جانتا ہے ۔ (یوسف : ۷۷)

جب کسی بات کے بیان کرنے میں یادداشت اور علم صحیح طور پر ساتھ نہ دے یا محض ظن

اور گمان پر بات کی جائے تو کہہ دیتے ہیں واللہ اعلم، اور کبھی یہ پہلو بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ ہمارے علم و واقفیت اور معلومات میں ہے اسے ہم نے بیان کر دیا حقیقت حال سے خدا ہی واقف ہے۔

واللہ خیر الرّازقین اور اللہ سب سے اچھا روزی پہنچانے والا ہے (الجمعہ: ۱۱)

یہ کلمہ دعائیہ بھی ہے اور رزق کے معاملہ میں خدا پر بھروسہ کرنے اور اسی سے پر امید رہنے کی طرف بھی اس سے اشارہ ہوتا ہے۔

واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب : اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ (البقرۃ: ۲۱۲)

رشک کے طور پر بولا جاتا ہے مطلب یہ کہ دولت و رزق کی فراوانی خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے بے حد و حساب دے۔

ولا خوف علیہم ولا ہم یحزنون : اور نہ وہ خوف کھائیں گے اور نہ وہ غمگین ہوں گے (البقرۃ ۶۲)

مومن کے اخروی مقام کے اظہار کی جانب اشارہ ہے۔

وما توفیقی الا باللہ : اللہ کی توفیق پر ہی میں نے بھروسہ کیا۔ (ہود: ۸۸)

جب کسی کام کے کرنے کا عزم و ارادہ کیا جائے یا کسی کام میں کامیابی مل چکی ہو تو عزم و ارادہ کی توثیق اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر کامیابی کے اظہار کیلئے یہ کہا جاتا ہے۔ اسکے اعلان کا مقصد یہ بھی ہے کہ کوئی کام اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک اس کام کو کرنے کی خدا توفیق نہ دے۔

وما علینا الا البلاغ : ہم پر پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں۔ (یٰسین:)

عموماً تحریر یا تقریر کے خاتمہ کے بعد اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس سے جہاں قاری یا سامع یہ سمجھ لیتا ہے کہ تحریر یا تقریر ختم ہو گئی وہاں قائل کا مقصد اپنے کو بری الذمہ قرار دینا بھی ہوتا ہے کہ میں نے تو تمہیں صحیح اور سچی بات بتا دی اب تم چاہے مانو یا نہ مانو۔

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس   در بند آں مباش کہ شنید یا نشنید

ہٰذا صراط مستقیم : یہی سیدھا راستہ ہے۔ (آل عمران : ۵۱)

عموماً اسلام کی حقانیت کے اظہار کیلئے اسکا استعمال کرتے ہیں۔

ہٰذا من فضل ربی : یہ میرے رب کا فضل ہے۔ (النمل : ۴۰)

اپنی کوششوں کامیابیوں، ترقیوں اور فتوحات کو ذاتی خیال نہ کرتے ہوئے خدا کے فضل کا نتیجہ بتاتے ہوئے یہ بولا جاتا ہے مسلمان عام طور سے اپنے مکانوں پر بھی اس آیت کو کندہ کرتے ہیں۔

ہل جزاء الاحسان الا الاحسان : نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

(الرحمٰن : ۶۰)

یہ الفاظ بالعموم اس موقع پر بولے جاتے ہیں جب یہ جتانا ہوتا ہے کہ ہر حال میں نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا چاہیئے۔

سنسکرت سے ماخوذ عربی، فارسی اور اردو کا ادب

از جناب رام لعل نابھوی

" جناب رام لعل نابھوی اردو کے مشہور اہل قلم ہیں، زیر نظر مضمون میں انھوں نے سنسکرت سے ماخوذ یا ترجمہ کی گئی اردو، فارسی اور عربی کتابوں کی فہرست بڑی محنت و جانکاہی سے تیار کی ہے، مہا بھارت، گیتا اور یوگ واششٹ سے متعلق کتابوں پر انکے مضامین پہلے چھپ چکے ہیں اس لیے ان کا تذکرہ زیر نظر مضمون میں نہیں ہے۔ (معارف)

سنسکرت سے عربی میں تراجم

(۱) سنسکرت سے عربی میں حسب ذیل علوم کی کتابیں نقل کی گئیں۔ حساب، نجوم، طب، ہیئت، اخلاق، افسانے اور کہانیاں، سیاست اور امور سلطنت، لہو و لعب[1] (۲) یحییٰ بن خالد برمکی نے ایک فرستادہ کو ہندوستان اس غرض سے بھیجا کہ وہ وہاں جاکر ہندوستان کی جڑی بوٹیاں لائے۔

(۳) اور ایک وید کو سرکاری دار الترجمہ میں اس لیے مقرر کیا کہ وہ سنسکرت کی طبی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرائے۔

عربی وید

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف/مصنفہ/مؤلف	مطبوعہ / غیر مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت / نام پریس	صفحات	سائز	منظوم / منثور	کیفیت

اس سلسلہ کی کتابوں کی تلاش جاری ہے۔

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی۔

فارسی وید

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ یا غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱	اتھربن وید	فیضی							دیکھئے دربار اکبری از محمد حسین آزاد
۲	رگ وید	داکٹر ایس اے رضا جلالی نینی							دیکھئے مضمون سومناتھ در پروفیسر ٹربیون چنڈی گڑھ مورخہ ۔ میں۔
۳	خازن اسرار	ناشناس گرفتہ شدہ از "وید"							دیکھئے فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان جلد چہارم ص ۲۱۵۲

اردو وید

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ یا غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱	الکھ پرکاش	کنھیالال	مطبوعہ		۱۸۶۱ گیان پریس آگرہ				دارا شکوہ کے فارسی ترجمہ سر اکبر سے اردو میں الکھ پرکاش کے نام سے ترجمہ کیا۔
۲	رگوید سنگھتا حصہ اول	ماسٹر لچھمن داس			۱۸۷۳				دیکھئے زبان و ادب اپریل سنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۷
۳	رگوید آدی بھاشیہ بھومیکا	رام جگن ناتھ اور جگیہ راشے	مطبوعہ		۱۸۹۸				ایضاً
۴	سام وید	آنند سروپ	"		۱۸۹۷ ودیا ساگر پریس				ایضاً

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ یا مخطوطہ	تاریخ مخطوطہ	سال نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۵	یجروید کی تفسیر	دھرم پال	مطبوعہ		۱۹۲۰ روز بازار سٹیم پریس				دیکھئے زبان و ادب اپریل ۱۹۷۶ء ص ۲۷۔
۶	رگوید آدی بھاشیا بھومیکا۔	نہال سنگھ	″						اورینٹل ببلیوگرافی آف انڈیا سیریز چوتھی جلد صفحہ ۴۴۴، ساہتیہ اکادمی دیکھئے زبان و ادب اپریل ۱۹۷۶ء ص ۲۷
۷	رگوید	مولوی ولایت علی							ایضاً
۸	رگوید	بشیر احمد							″
۹	یجروید اور دوسرے ویدوں کے منتروں کا ترجمہ	خلیل احمد معروف خلیل داس							″
۱۰	تحقیق کا منتر	اثر لکھنوی						منظوم	″
۱۱	رگوید سنگھتا اشٹک	ماسٹر لچھمن داس مترجم			دہلی ۱۸۷۳				دیکھئے فہرست کتب اردو پنجاب پبلک لائبریری لاہور صفحہ ۱۷۸۔
۱۲	خلاصہ چار وید	کنھیا لال الکھ دھاری			آگرہ				″ ″ ″

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مؤلف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱۳	سام وید حصہ اول	آشو رام آریہ	مطبوعہ		آریہ آفسٹ پریس دہلی ۱۹۸۸	۵۴۰	ڈیمائی	نثر	کتب خانہ نابھوی
۱۴	یجر وید حصہ اول	"	"		ہند سماچار پریس ۱۹۸۴	۴۳۷	"	"	" " "
۱۵	یجر وید	نامعلوم	"		نگم پرکاش دہلی ۱۸۹۹ء	۶۴۲	"	"	" " "
۱۶	یجر وید اردو ترجمہ								کیدار ناتھ اینڈ سنز بک ایجنٹ پردیپا نٹر اخبار سوداگر میرٹھ اشتہار کتاب دیباچہ الکھ پرکاش
۱۷	سام وید								بشرح صدر
۱۸	یجر وید اردو ترجمہ	عبد الحق ودیارتھی			احمدیہ انجمن اشاعت اسلام ۱۹۲۷	۲۴۰			دیکھیے نیشنل ببلیوگرافی آف انڈین لٹریچر ساہتیہ اکادمی، صفحہ ۴۴۴۔

عربی پوران

تلاش جاری ہے۔

فارسی پوران

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مؤلف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱	ہر بنس پوران	مولانا تبریزی							دیکھیے پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ یا غیر مطبوعہ	تاریخ مخطوط	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
									عہد جہانگیر سے عہد اورنگزیب تک۔ از ڈاکٹر ظہور الدین احمد صفحہ ۲۶۷۔
۲	بھاگوت پران	از شیخ احمد و دیگران							دیکھئے پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ۔ عہد جہانگیر سے عہد اورنگزیب تک۔ از ڈاکٹر ظہور الدین احمد۔ صفحہ ۲۶۔
۳	بھاگوت فارسی	گردہاری پرشاد باقی	مطبوعہ		۱۹۴۶ء لکھنؤ پریس	۲۰۴	ڈیمائی		دہلی یونیورسٹی دہلی۔ کچھ صفحات ناہوری کے پاس ہیں۔ داستان ادب حیدرآباد صفحہ ۴۵ پر ذکر ہے۔
۴	ہربنس پوران	مولانا شیری							دیکھئے مقالات شبلی جلد ششم
۵	ترجمہ بھاگوت پران دوئم		قلمی						دیکھئے مخطوطات فارسی concise des crit Petiue کیٹلاگ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ صفحہ ۵۰۴
۶	ترجمہ بھاگوت پران سوئم		قلمی						ایضاً
۷	بشن پوران		قلمی						۲۹۴ ms, ۵۲۵ ۶۲۲ B/۵۹۲ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مولف	مطبوعہ یا غیر مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۸	شیو پران		قلمی						۲۹۰،۵۹۲،۵/۵۵۸ ms ۵۸۱ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔
۹	شریمد بھاگوت پران		قلمی						۲۹۴،۵۹۲ B ۵۵ ms ۶۰۴ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔
۱۰	شریمد بھاگوت		قلمی						ss/m ۲۵/۴ محکمہ السنہ پنجاب
۱۱	بھاگوت مہا پران	فیضی							دیکھئے زبان و ادب اپریل ۱۹۷۶ء صفحہ ۲۴۔
۱۲	بھگوت مہا پران	راجہ ٹوڈر مل							ایضاً
۱۳	شیو پران	منسا رام ناتواں							ایضاً ۲۵ اور ۲۹
۱۴	شیو پران	کشن سنگھ نشاط							" "
۱۵	بھاگوت	ویاس	قلمی			۳۴۱			نستعلیق نسخہ ہائے خطی فارسی در کشمیر کلچرل ہاؤس ایران نئی دہلی صفحہ ۵۰
۱۶	بھاگوت پران	نامعلوم	"			۷۸			" " " " ۵۱
۱۷	"	"	"			۱۱۰			" " " ۵۱
۱۸	بھاگوت دسم اسکندھ		"			۲۹۴			" " " ۵۱
۱۹	"		"			۲۹۰			" " " ۵۱
۲۰	"		"			۳۴۷			" " " ۵۲

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۲۱	بھاگوت دسم اسکندھ		قلمی			۳۸۱			نستعلیق۔ نسخہ ہائے خطی فارسی در کشمیر کلچرل ہاؤس ایران نئی دہلی صفحہ ۵۲
۲۲	بشن پوران	نامعلوم	"			۲۰۵			" " " ۱۳۷
۲۳	"	—	"			۲۵۰			" " " "
۲۴	"	—				۸۳			" " " "
۲۵	"	—				۱۵۸			" " " "
۲۶	"	—				۲۳۸			" " " ۱۳۸
۲۷	"	—				۲۹۴			" " " "
۲۸	"	—				۴۳۹			" " " "
۲۹	"	—				۲۱۳			" " " "
۳۰	"	—				۱۷۶			" " " ۱۳۹
۳۱	سری بھاگوت	—				۲۱۵			" " " ۲۴۸
۳۲	"	—				۳۶۰			" " " ۲۴۹
۳۳	"	—				۹۰			" " " "
۳۴	"	امانت رائے						منظوم	دیکھئے فہرست برائے کتب عربی و فارسی سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر صفحہ ۲ اور الزبیر بہاولپور کتبخانہ نمبر

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مؤلف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۳۵	بشن پوران		قلمی				۲۳×۱۴ سم		فہرست مخطوطات ونادر مطبوعات عجائب گھر لاہور ۱۹۷۱ء صفحہ ن
۳۶	شو پران	کشن سنگھ	״		۱۶۸۸ء				فہرست مخطوطات شیرانی جلد سوئم صفحہ ۴۱۶۔
۳۷	بشن پران	بنوالی داس ولی شاید	״						״ ״ ״ صفحہ ۴۷۷
۳۸	ترجمہ بھگوت پران					۱۷۹			فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری ذخیرہ احسن صفحہ ۱۴۶
۳۹	بشن پران		״		۱۸۸۳ بکرمی		۸×۵ ۱/۴		الزبیر بہاولپور کتبخانہ نمبر
۴۰	ترجمہ بھگوت پران				۱۷۰۰ء				״ ״ ״ ص ۵۵۱
۴۱	شو پران	کشن سنگھ	״						کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد
۴۲	مہاشو پران	بیربل کاچرو							دیکھئے سکھوں کے عہد میں پاکستان میں فارسی ادب از ظہور الدین احمد حصہ چہارم
۴۳	بھاگوت پران	قلمی			۵۰۵۰ رمضان مبارک		بڑا	منثور	کتب خانہ گلکشن گنڈا سنگھ پنجابی یونیورسٹی
۴۴	مہاشو پران	کیول سروپ		قلمی	۱۹۵۰ بکرمی			منثور	״ ״ ״
۴۵	بشن پران		״						دیکھئے کیٹلاگ فارسی مخطوطات انڈیا آفس لائبریری VOL II ۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
									ایضاً پنجابی یونیورسٹی لائبریری
۴۶	بشن پران		قلمی						مندرجہ بہ نمبر ۱۹۵۶–۱۹۵۷ء
۴۷	بشن پران		"						"مندرجہ بہ نمبر ۳۰۴۳ لائبریری
۴۸	ترجمہ بھاگوت پران								دیکھئے کیٹلاگ فارسی مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ Ivanow مرتبہ ۱۹۲۶ء
۴۹	بھاگوت پران	دسم سکندہ	قلمی						" " "
۵۰	آب زندگی	ترجمہ بھاگوت پران	"						" " "
۵۱	بشن پوران	بنوالی داس	قلمی						فہرست مشترک پاکستان نسخہ ہائے خطی فارسی ایران کلچرل ہاؤس اسلام آباد، جلد چہارم صفحہ ۲۱۳۷۔
۵۲	بشن پند انت	-	"						" " "
۵۳	وشنو پران	-	"						" " "
۵۴	سری بھاگوت	ابوالفضل	"						" " ۲۱۶۴
۵۵	"	"	"						" " "
۵۶	"	پران ناتھ	"						" " ۲۱۶۶
۵۷	شو پران	کشن سنگھ	"						" " ۲۱۶۷

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مولف	مطبوعہ / غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت / نام پریس	صفحات	سائز	منظوم / منثور	کیفیت
۵۸	عین الظہور ورت پران	ترجمہ کشن سنگھ نشاط	قلمی						فہرست مشترک پاکستان نسخہ ہائے خطی فارسی ایران کلچرل ہاؤس اسلام آباد، جلد چہارم صفحہ ۲۱۷۷
۵۹	ورت پوران	عین الظہور	〃						〃 〃 〃 ۲۹۸
۶۰	ورش پران		〃						〃 〃 〃 〃
۶۱	ہری ونش پوران	ترجمہ	〃						اکبر کے زمانے میں ہوا۔ دیکھئے مغل پینٹنگ۔ ایشیاٹک سوسائٹی۔ کلکتہ صفحہ ۳۴
۶۲	بھاگوت	قلمی				۲۲۶			دیکھئے فہرست نسخہ قلمی سبحان اللہ اورینٹل لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ صفحہ ۴
۶۳	بھاگوت	قلمی	×	۱۲۴۵ ہجری		۲۱۵			〃 〃 〃

اردو پوران

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مولف	مطبوعہ / غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت / نام پریس	صفحات	سائز	منظوم / منثور	کیفیت
۱	بھاگوت نظم اردو	جگن ناتھ خوشتر	مطبوعہ		نولکشور ۱۸۸۱	۱۳۲	ڈیمائی	منظوم	دہلی یونیورسٹی لائبریری۔ کچھ صفحات نابھوی کے پاس ہیں۔
۲	خلاصہ آتم پوران	بابا ہیرا پرکاش	〃		نولکشور ۱۸۸۴	۷۳۴	بڑا	منثور	نابھوی کے پاس ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۳	بھاگوت پران	گنپت کیرانوی	مطبوعہ		۱۹۰۴	۷۲۸	جہازی	منثور	نابھوی کے پاس ہے۔
۴	شریمد بھاگوت	نولکشور	"		۱۹۳۲ نولکشور	۷۷۰	"	"	" " "
۵	گنیش پوران	شنکر دیال فرحت	"		۱۸۸۳ "	۱۶	ڈیمائی	منظوم	" " "
۶	شریمد بھاگوت	افق	"		۱۹۲۱	۷۷۹	"	منثور	" " "
۷	"	پریتم نرائن شوق لاہور	"		جے ایس سنگت سنگھ	-	-	-	اشتہار افق بھاگوت۔ جے ایس سنت سنگھ لاہور
۸	شیو پران		"		نولکشور		جہازی	منثور	نابھوی کے پاس ہے۔
۹	"	شنکر دیال فرحت	"		"	۴۴	ڈیمائی	منظوم	" "
۱۰	پریم ساگر دسم اسکندھ بھاگوت پران	للوجی لال	"		" ۱۸۹۵	۲۲۶	"	منثور	" "
۱۱	پریم ساگر	شنکر دیال فرحت	"		نولکشور ۱۸۷۹	۶۴	"	منظوم	" "
۱۲	شریمد بھاگوت	بھوپت	قلمی				"	"	" "
۱۳	" یک قافیہ	ستیل سنگھ لکھنوی							ڈسٹرکٹ لائبریری سنگرور میں ہے۔
۱۴	شیو پران	کشن سنگھ							سنٹرل لائبریری پٹیالہ کے رجسٹر میں درج ہے۔
۱۵	مہرشی پراشر کے وشنو پران کا ترجمہ موسوم بہ فسانۂ توحید	امر ناتھ مدن ساگر	مطبوعہ			۳۶	بڑا		ڈسٹرکٹ لائبریری سنگرور

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱۶	شیو پوران ترجمہ اردو	منشا رام ناتواں						منظوم	دیکھیے زبان و ادب پٹنہ اپریل ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۲۵ اور ۲۹
۱۷	بھگوت پران کا منظوم ترجمہ		قلمی						،، انیسویں صدی کا ایک مخطوطہ جس کا ذکر برٹش اردو مخطوطات میں ہے۔
۱۸	مارکنڈے پوران	رگھو راج	مطبوعہ		نولکشور ۱۸۸۴				،، صفحہ ۲۹
۱۹	کلکی پوران	آتما رام	،،		۱۸۹۷				،، ۳۰۰
۲۰	،،	پنڈت ہردیال شرما	،،		صادق المطابع میرٹھ ۱۸۹۷				،، ،،
۲۱	،،	منشی منوہر سروپ	،،		لکشمی نرائن پریس ۱۸۹۷				،، ،،
۲۲	سورج پران	گنیش داس	،،		مطبوعہ گوجرانوالہ				،، ،،
۲۳	بشن پران	،،	،،		۱۹۳۶				،، صفحہ ۱۳۰ اور فہرست کتب اردو پبلک لائبریری لاہور صفحہ ۱۷۰
۲۴	آتم پران	دیوان چند	،،		،،				،، ،، ،،
۲۵	شیو پران	سیوا سنگھ	،،		۱۹۱۰				،، صفحہ ۳۰
۲۶	سورج پران	-	مطبوعہ		نولکشور لکھنؤ				فہرست کتب اردو پبلک لائبریری لاہور صفحہ ۱۷۰
۲۷	بشن سہسر نام	بلدیو داس مترجم			،،				،، ،، ،،
					لکھنؤ ۱۸۸۳				،، ،، ،،
۲۸	شیو سہسر نام	شنکر دیال مترجم			لکھنؤ ۱۲۶۱				،، ،، ،،

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۲۹	دیوی بھاگوت بارھواں سکندھ								فہرست کتب اردو پبلک لائبریری لاہور صفحہ ۱۶۹
۳۰	دیوی بھاگوت								" "
۳۱	"								" "
۳۲	آنند سندھ ایکادش اسکندھ بھاگوت کا ترجمہ								" "
۳۳	گلدستۂ حقیقت ترجمہ بھاگوت	سیتو پرشاد			لکھنؤ ۱۸۸۲			منظوم	" "
۳۴	بلبھ چرتر	جواہر لال			لکھنؤ ۱۸۷۱			"	" "
۳۵	پریم ساگر بھاگوت دسم اسکندھ	لکھمن لال			کانپور ۱۸۶۹ء				" "
۳۶	بھگوت اوپدیشنا				گوجرانوالہ				" "
۳۷	شریمد بھاگوت ترجمہ اردو	شیو پرشاد			لکھنؤ			نثر	" ۱۷۴
۳۸	بھاگوت گیتا پرچھا کرشن درادھا	نامعلوم	قلمی	-	-		-	"	مخطوطات متفرقہ اردو پنجابی۔ہندی۔کشمیری۔ترکی پشتو پنجاب پبلک لائبریری لاہور صفحہ ۱۸۱
۳۹	شریمد بھاگوت دسم اسکندھ	سردار سنگھ نسیم			لکھنؤ ۱۹۲۳ بکرمی			منظوم	فہرست کتب اردو سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر صفحہ ۲۰۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۴۰	سری مد بھاگوت	سوامی دیال کائستھ			لکھنؤ ۱۸۹۹ء			منظوم	فہرست کتب اردو سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر صفحہ ۲۰
۴۱	بھگوت دسم اسکندھ	بھوپت	قلمی	×	×	×	ڈیمائی	منظوم	کتب خانہ نابھوی
۴۲	دیوی بھاگوت پران	پیارے لال	مطبوعہ						اشتہار شو پران نولکشور پریس
۴۳	سکھ ساگر								״ ״ ״
۴۴	سورج پران	لالہ خدا بخش	״						״ ״ ״
۴۵	ترجمہ بھگوت پران	منشی سکھ لال	״						״ ״ ״
۴۶	گلدستہ حقیقت نظم شریمت بھاگوت	منشی سنگھ اختر	״						״ ״ ״
۴۷	اسکندھ بھاگوت	ناتواں مبالوی	״						دیکھئے اردو کے ہندو مثنوی نگار صفحہ ۳۰۹ از عطا پالوی
۴۸	سورج پران	غریب لکھنوی	״						״ ״ صفحہ ۱۳
۴۹	ترجمہ بھاگوت پران		قلمی						دیکھئے فہرست مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سال ۱۹۲۶ء صفحہ ۴۵
۵۰	ترجمہ بھاگوت پران								״ ״ ״ ۴۵۸
۵۱	ترجمہ وشنو پران								״ ״ ״ ״
۵۲	״								״ ״ ״ ״

مختلف کتب عربی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
	امرت کنڈ								ا بھوجر برہمن نے سنسکرت کی ایک کتاب امرت کنڈ قاضی رکن الدین سمرقندی کو پیش کی۔ قاضی نے اسکا ترجمہ پہلے فارسی میں اور پھر عربی میں کیا۔ دیکھئے بنگال کا پوتھی ادب صفحہ ۳۔ ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی۔ An earlyArabic work of Muslim Bengal By Qazi Ahmad mian Akhtar Junagarhi مولانا سید سلیمان ندوی مقالات شبلی جلد ششم میں لکھتے ہیں "اتفاق سے بھوجر کا ایک شاگرد جسکا نام انبوانا تھ تھا۔ ہندوستان سے چل کر اس طرف آنکلا۔ ایک سنسکرت داں عالم نے اس سے یہ کتاب پڑھی اور عربی زبان میں اسکا دوبارہ ترجمہ کیا اور مرآۃ المعانی لادراک العالم الانسانی نام رکھا"۔
۲	سدھانتا عربی میں "السندھند"								منصور (بادشاہ دولت عباسیہ) کے دربار میں ۱۵۶ھ میں ہندوستان کا ایک برہم ریاضی داں عالم بغداد

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مخطوطہ مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	سائز	صفحات	منظوم یا منثور	کیفیت
									میں آیا اور سنسکرت کی مشہور زیج جسکا نام سدھانت ہے۔ منصور کی خدمت میں پیش کی۔ محمد ابن ابراہیم فزاری نے منصور کے حکم سے اسکا ترجمہ کیا۔ مامون الرشید کے زمانے تک اعمال کواکب میں اسی زیج پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ دیکھئے مقالات شبلی جلد ششم صفحہ ۱۱ اور عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی صفحہ ۱۲۵
۳	سشرت								سشرت کتاب جو ۱۰ بابوں میں ہے اور سامیکا جس میں زہروں کے علاج کا بیان ہے۔ ایک ہندوستان کے طبیب نے جو فلاسفر بھی تھا، نے بغداد میں ترجمہ کیا۔
۴	سامیکا								رشید کے دربار میں اور بھی ہندو طبیب تھے جنکی وجہ سے ویدک کی معلومات عربی زبان میں منتقل ہوئیں۔ ان میں سے صالح (اصلی نام سالی ہوگا) کا حال علامہ ابن ابی نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ دیکھئے مقالات شبلی جلد ششم

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مؤلف	تاریخ مخطوطہ	مطبوعہ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۵	سنسکرت کی قدیم تصنیفات تیرہ سو								ہندوستان میں سلطان فیروز شاہ جب ۷۶۲ ہجری میں جوالا مکھی پہاڑ کی سیر کو گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے بت خانے میں ۱۳ سو سنسکرت کی قدیم تصنیفات موجود ہیں۔ فیروز شاہ نے وہ کتابیں حضور میں طلب کیں اور ان کے ترجمے کا اہتمام کیا نجوم کی ایک کتاب کا ترجمہ عز الدین نے نظم کیا اور دلائل فیروزی نام رکھا۔ یہ کتابیں اکثر موسیقی اور کشتی کے فن میں تھیں۔ عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ ۱۰۰۰ھ میں جب میں لاہور پہنچا تھا تو یہ ترجمہ شدہ کتب میری نظر سے گذریں × × × یحییٰ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے پنڈتوں، فلاسفروں اور طبیبوں کو طلب کیا اور ان سے سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے کرائے کلیلہ دمنہ کا دوسرا ترجمہ جو عبداللہ بن ہلال اہوازی نے ۱۶۵ھ میں کیا یحییٰ کے حکم سے کیا۔ دیکھئے مقالات شبلی جلد ششم صفحہ ۲۳-۲۴
۶	پنچ تنتر								سو برس کے بعد منصور کو اس پہلی (پنچ تنتر) ترجمے کا ایک نسخہ مل گیا تھا اس نے اسکا ترجمہ عربی میں کرایا۔ دیکھئے تمدن ہند صفحہ ۳۳۲۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۷	آریہ بھٹ عربی نام ارجبند								دیکھئے عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی صفحہ ۱۳۷ یہ عربی میں دوسری کتاب ہے جو منتقل ہوئی۔
۸	کھنڈ کھنڈ یک عربی میں ارکند								،، یہ تیسری کتاب ہے۔ جو سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئی۔ البیرونی نے اسے نئے انداز میں تحریر کیا۔ دیکھئے البیرونی از سید حسن برنی۔
۹		ابوالحسن اہوازی							عربی میں ابوالحسن اہوازی نے سنسکرت کی کتاب کو منتقل کیا۔ دیکھئے عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی صفحہ ۱۳۹۔
۱۰	کرمجیا عربی نام کرمجہ								،، ،، ،، ۱۴۱ یہ سنسکرت اصطلاح ہے۔
۱۱	چرک کی کتاب								کتاب پہلے فارسی میں ترجمہ ہوئی۔ پھر عبداللہ بن علی نے اس کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا دیکھئے عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی صفحہ ۱۴۸
۱۲	سندستان یا سندھستان								،، ،، ،،

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱۳	ندران								دیکھئے عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی صفحہ ۱۴۸
۱۴	جڑی بوٹیوں کے مختلف نسخے دس دس نام								" " " ۱۴۹
۱۵	دواؤں کے سرد گرم قوتوں کی کتاب								" " "
۱۶	استانگر	ترجمہ ابن دھن نے کیا۔							" " "
۱۷	دو کتابوں کے ترجمے جو نوکشنل وید کی لکھی تھیں								" " "
۱۸	"								" " "
۱۹	روسانای کی کتاب کا ترجمہ								" " "
۲۰	حاملہ عورتوں کے علاج میں کتاب								" " " ۱۵۰
۲۱	جڑی بوٹیوں کے حل میں								" " "

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مخطوطہ مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۲۲	نشہ کے بیان میں								دیکھئے عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی ص۱۵۱
۲۳	شاناق یا چانک کی کتاب جانوروں کا علاج								" " " ۱۵۴
۲۴	گھوڑوں کے بیان میں	کنکہ پنڈت							" " "
۲۵	پیدائش کے بھید	"							" " "
۲۶	بڑے لگن کا بیان	"							" " "
۲۷	چھوٹے لگن کا بیان	"							" " "
۲۸	مسمریزم کا بیان								" " "
۲۹	دنیا کے واقعات اور ستاروں کے لگن میں	"							" " "
۳۰	ہتھیلی کی لکیریں اور ہاتھوں کو دیکھکر								" " ۱۵۶
۳۱	سانپوں کی اقسام اور زہروں کا بیان	رائے پنڈت							" " "
۳۲	"	کسی اور پنڈت کی							" " ۱۵۷
۳۳	زہروں کا علم	منکہ پنڈت							" " ۱۵۸

نمبر	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ مخطوطہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۳۴	موسیقی پر کتاب								دیکھئے عرب و ہند کے تعلقات، از سید سلیمان ندوی صفحہ ۱۵۹
۳۵	شاناق								" "
۳۶	یاکھریاجھر								" " "
۳۷	ادب الملک سلطنت کے طریقے	ابو صالح بن شعیب							" " "
۳۸	کیمیا	ابن ندیم							" " صفحہ ۱۶۰
۳۹	منطق								" " "
۴۰	مقدار کو کیا ہونا چاہیے								" " ۱۶۲
۴۱	علم توہم								" " "
۴۲	کہانی اور افسانے	کئی ترجمے ہوئے							" " ۱۶۳
۴۳	تریاحرتر	راجہ کرشن							" " ۱۶۵
۴۴	علم الہند								" " "
۴۵	پانی ساسی	برہم گپت البیرونی							" " ۱۷۷
۴۶	برہم سدھانت	" "							" " ۱۷۸
۴۷	چندر گرہن اور سورج گرہن پر ترجمہ	البیرونی							" " "
۴۸	اربعہ مناسبہ	"							" " "
۴۹	سالکیو کا فلسفہ	"							" " ۱۷۹
۵۰	تنبچلی	"							" " "
۵۱	ٹکبعو حاکم	وراہ مہر "							" " "
۵۲	برہم ہتیا	ترجمہ "							دیکھئے البیرونی از سید حسن برنی ص ۱۵۱
۵۳	مقالات اقلیدس	" "							" "
۵۴	کتاب المجسطی	" "							"

(باقی)

اخبار علمیہ

کتابوں اور رسالوں کی بین الاقوامی نمایش کا ایک بڑا ذریعہ عالمی کتابی میلہ ہے جو گذشتہ دنوں دہلی میں منعقد ہوا اور شائقین کی کثرت اور کتابوں کی فروخت کے لحاظ سے کامیاب رہا، خاص طور پر افریقی ادب مضامین نو کے سبب بڑا پرکشش ثابت ہوا، اس موقع پر نیشنل بک ٹرسٹ نے ہندوستانی زبانوں کے مختلف علمی مجلوں اور رسالوں کی بھی نمایش کا اہتمام کیا، انگریزی کے علاوہ ۱۲ دیگر ہندوستانی زبانوں میں اردو بھی شامل تھی، اب ان تمام رسالوں کی تفصیلات سلیقہ سے مرتب ہوکر 'اکاڈمک اینڈ لٹریری جرنلس آف انڈیا' کے نام سے شایع ہوگئی ہیں، اس میں ۱۵۰۰ سے زیادہ رسالوں کا ذکر ہے، ان میں نصف سے بھی زیادہ انگریزی زبان کے ہیں جنکو ۳۰ مختلف علمی و سائنسی انواع میں تقسیم کیا گیا ہے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ علمی و تحقیقی موضوعات پر ہندوستان میں آج بھی سب سے زیادہ وقیع کام انگریزی ہی میں ہوتا ہے، ہندی زبان کے ۱۱۰ رسالے شامل ہیں، بنگلہ، مراٹھی اور تامل میں بھی علمی رسائل کی تعداد خاصی ہے، لیکن حیرت ہے کہ اڑیا جیسی زبان میں بھی علمی رسائل کی تعداد کم نہیں، اردو کے ۳۸ رسالوں کو منتخب کیا گیا ان میں 'معارف' بھی ہے، معروف رسائل کے ساتھ بعض بالکل غیر معروف رسائل بھی اس انتخاب میں شامل ہیں اور بعض رسائل جیسے سب رس حیدرآباد، گلبن احمد آباد، البلاغ بمبئی اور نخلستان جے پور اور شیرازہ کشمیر اس فہرست میں شامل نہیں، حالانکہ یہ سب بھی اس انتخاب

میں آنے کے لائق تھے۔

کتابوں کی نمائش کا مقصد مختلف علاقوں، زبانوں اور تہذیبوں کے فکر و نظر کے جدید رجحان اور نئے معیار سے واقفیت حاصل کرنا ہے، لیکن تجارتی نقطۂ نظر سے بھی اسکی اہمیت و افادیت کم نہیں ہے، موجودہ مادہ پرست ماحول میں درآمد و برآمد کی اشیاء میں فکر و خیال اور تحریر و تقریر کی تجارت کی گرم بازاری بھی شامل ہے لیکن گذشتہ دنوں بمبئی میں ایک اور نمائش ہوئی تو معلوم ہوا کہ تحریر کے علاوہ خود قلم اور دیگر سامان تحریر و کتابت میں کیسی جدت طرازیاں ہوئی ہیں، اس نمائش میں اصحاب قلم سے زیادہ تاجران قلم کے ذوق اور دلچسپی کا سامان تھا، ہندوستان میں تیار کیے جانے والے قلم، فاؤنٹین پن، بال پن اور قلم کی بہت سی قسموں سے معلوم ہوا کہ ہندوستانی قلم سازی آج بھی ترقی یافتہ تکنیک کے بجائے زیادہ تر دستکاری پر منحصر ہے، تقریباً دو لاکھ افراد اس صنعت میں مشغول ہیں، یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ ہندوستانی قلم دوسرے ملکوں کے قلم سے کم درجہ نہیں، یہ ۷۵ ملکوں میں جن میں بیشتر مشرق اوسط اور یورپ کے ممالک شامل ہیں، برآمد کیے جاتے ہیں، مشینی قلموں کے مقابلہ میں یہ زیادہ سستے بھی ہوتے ہیں، سال رواں میں ہندوستانی قلم سازوں نے ۳۵ ۰ کروڑ کے قلم فروخت کیے جو اس لحاظ سے ضرور تسلی بخش ہے کہ سال گذشتہ کے مقابلہ میں یہ ۲۰ فیصد زیادہ ہے لیکن عالمی بازار کے مقابلے میں یہ رقم زیادہ نہیں ہے کیونکہ وہاں یہ رقم ۵۰ ہزار کروڑ روپے تک پہنچ چکی ہے، قلم کی تجارت میں یہ غیر معمولی خطیر رقم قلم کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے اور شاید عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کی تفسیر کا نیا نکتہ بھی پیش کرتی جاتی ہے۔

ہندوستانی علم و قلم کی قدردانی کے واقعات سے تاریخ کے صفحات روشن ہیں،

لیکن موجودہ دور میں ہند واحیار پرستی کے جوش میں تاریخ کی سچائیوں کو جس بے دردی سے جھٹلایا جارہا ہے مستقبل کے مورخ کو اس کے ذکر سے یقیناً تکلیف ہوگی، بابری مسجد کے انہدام کی گرد ابھی بیٹھنے بھی نہیں پائی کہ اسی قسم کا ایک اور قضیہ اب پانڈیچری کے ۲۴۶ سال قدیم گرجا گھر کے متعلق شروع ہوگیا، ایک متعصب جماعت نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ چرچ اصل میں شیو کا مندر ہے اور اب اسے مندر ہی ہونا چاہیے اور یہ کہ اسے چرچ کہنا 'قومی شرم' کی بات ہے، اس مطالبہ پر ٹائمز آف انڈیا نے ایک تبصرہ میں لکھا کہ " بابری مسجد کی بربادی کے بعد کاشی اور متھرا کی مسجدوں اور دوسرے اسلامی آثار کے متعلق بیانوں کا سلسلہ جاری ہے اور اب اس میں پانڈیچری کا کلیسا بھی شامل کرلیا گیا ہے، چند برسوں پہلے جب بابری مسجد کے انہدام کے نعرے بلند ہوئے تھے تو شاید کچھ لوگوں نے سوچا ہوگا کہ پونے پانچ سو سال قدیم عمارت واقعی نیست ونابود کردی جائے گی، مگر حکومت کی بے حسی سے یہ واقعہ ہوکر رہا، اس لیے کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ پانڈیچری کا یہ قدیم چرچ بھی مذہبی جنون کی صلیب پہ قربان کردیا جائے اور حکومت محض خاموش تماشائی بنی رہے، حالانکہ کوئی ذمہ دار حکومت اس قسم کے مطالبوں کو برداشت نہیں کرسکتی"۔

ظلم اور مظلومیت دونوں کا تعلق خواب غفلت سے ہے اور اس کے اسباب وعلامات کچھ مخفی نہیں، لیکن یورپ وامریکا کے سائنسداں محض نیند کے اسرار سے واقف ہونے کے لیے بے چین ہیں، ایک اوسط عمر کے ۲۵ سال یعنی قریباً ایک تہائی حصہ سونے میں گذر جاتا ہے لیکن نیند کیا ہے، خوابوں کی دنیا کیسے آباد ہوتی ہے یا پھر رات بھر نیند کیوں نہیں آتی ؟ ان سوالوں کے جواب جاننے کے لیے سائنسداں پہلے بھی پریشان تھے اور

اب کمپیوٹر کے دور میں انکا خیال ہے کہ وہ نیند کے راز کو ضرور معلوم کر لیں گے، ادھر
بے خوابی اور نیند کے نظام کی ابتری نے خود امریکی حکومت کی نیند حرام کر دی ہے،
کیلی فورنیا یونیورسٹی میں نیند کے متعلق ایک تحقیقاتی شعبہ کے ڈائریکٹر ولیم ڈیمنٹ کے
الفاظ میں "یہ امریکا میں صحت کا سب سے بڑا، سب سے مہنگا اور سب سے مہلک
مسئلہ ہے"، اسی موضوع پر حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "THE 24
HOUR SOCIETY" کے مولف، رٹن مور ایڈ نے لکھا ہے کہ حالیہ برسوں
میں چند بڑے حادثے اسی نیند کی خرابی کے نتیجے میں ہوئے۔ قیلولہ کے اسرار کے متعلق
ایک اہم مباحثہ سوسائٹی فار سلیپ ریسرچ کی جانب سے ہوا جس میں اتفاق صرف
اس پر ہوا کہ نیند جسم کو محفوظ رکھنے کے عمل کو مسمار نہیں ہونے دیتی ہے بلکہ پورے
جسم کی مشین کو از سر نو کارآمد بناتی ہے، دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ قیلولہ کے مثبت
پہلو پر دھیان دیا گیا، چنانچہ اب امریکا میں اس کی عادت تیزی سے عام ہوتی جاتی
ہے تاکہ "نیند کے امریکی قرض" کو کچھ تو کم کیا جا سکے۔ یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ نپولین اور
چرچل نے عین میدان جنگ میں قیلولہ کے عمل کو اپنایا تھا، لیکن سائنسداں ان
باتوں سے مطمئن نہیں، چنانچہ برسوں سے وہ ایک الکٹرانی طریقہ (EEGs) کے
ذریعہ دماغ کی لہروں کو ناپ رہے ہیں کہ شاید نیند کے کچھ راز کھلیں لیکن اس
کوشش میں دماغ کی لہروں سے زیادہ خود (EEGs) کے پیچیدہ نظام میں
الجھ کر رہ گئے، اب آکسفورڈ یونیورسٹی کے انجینئرنگ سائنس کے شعبہ کے
دو محققوں نے کمپیوٹر ٹکنالوجی کو بنیاد بنا کر دماغ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور
نسبتاً ان کو کامیابی بھی ملی ہے، مثلاً اب یہ ثابت ہو گیا کہ تفتیش و جستجو اور

فرق و امتیاز کرنے اور بکھرے خیالات کو مرتب کرنے کی صلاحیت دماغ اپنے طور پر خود بخود بڑھاتا جاتا ہے، اس عمل کی نقل کو کمپیوٹر میں اتارنے کا طریقہ بھی ان سائنسدانوں نے ایجاد کیا اور پھر (E E G) کی مختلف دریافتوں کو اس کمپیوٹر کے سامنے اس غرض سے پیش کیا گیا کہ وہ نیند کی مختلف کیفیتوں کی تفصیل مرتب کرے، حیرت انگیز طور پر کمپیوٹر نے سائنسدانوں کے سوالات کے معقول اور واضح جواب دیے، بقول ڈاکٹر "مارا سسلو" ہم کو معلوم ہوا کہ نیند تین کیفیتوں کے مجموعہ کا نام ہے، ایک تو نیند میں بیداری کی سی کیفیت، دوسرے گہری نیند، تیسرے وہ جس میں آنکھیں تیزی سے متحرک رہتی ہیں اور جسے خواب دیکھنے کی حالت سے تعبیر کیا جاتا ہے"۔ ان ابتدائی کوششوں سے سائنسدانوں کے خیال میں تحقیقات کی مزید راہیں ہموار اور آسان ہوں گی، فلاسفہ کی یہ چپاں اور چنیں یوں ہی رہے گی، لیکن خدا کی یہ بات کہ ہم نے تمہارے لیے نیند کو باعث راحت بنایا جہاں تھی وہیں رہے گی۔

نیند کے فلسفہ کے متعلق ہندوستانی سائنسدانوں کی تحقیقات بھی دلچسپ ہیں اور ان سے مشرق و مغرب کے فرق کا اندازہ بھی ہوتا ہے، حال ہی میں مدراس میں نیورولوجیکل سوسائٹی آف انڈیا کی بیالیسویں کانفرنس ہوئی، اس میں آل انڈیا انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے تین سائنسدانوں نے مشترکہ طور پر اپنی تحقیقات ایک مقالہ کی شکل میں پیش کیں، اس کا ایک موضوع یہ بھی تھا کہ کیا مراقبہ نیند سے زیادہ بہتر ہے؟ اس سوال کا جواب سائنسدانوں نے اثبات میں دیا، انھوں نے اس مفروضہ کو بنیاد بنایا کہ نیند اور مراقبہ دونوں استراحت کی ایسی کیفیتیں

اور حالتیں ہیں جو سکون و اطمینان پر منتج ہوتی ہیں، لیکن سوال یہ تھا کہ دونوں میں فرق کیا ہے، چنانچہ ۸ گھنٹہ کی نیند اور ۴۵ منٹ کے مراقبہ کا موازنہ کیا گیا اور (GALVANIC SKIN RESISTANCE TO-GSR اور ECG کے ذریعہ نیند میں ہر ایک گھنٹہ اور مراقبہ میں ہر پانچ منٹ کی کیفیات کا پورے اہتمام سے مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مراقبہ کی حالت میں جو سکون حاصل ہوا وہ حیرت انگیز طور پر ۸ گھنٹوں کی نیند سے کہیں زیادہ اور مکمل تھا، یہ بات بھی سامنے آئی کہ مراقبہ کے بعد مسرور و مطمئن ہونے کا احساس نیند کے بعد بیداری کی کیفیت سے زیادہ عمیق و کامل تھا، کاش صوفیہ کے مراقبہ اور سائنسدانوں کے مراقبہ کی باطنی کیفیتوں کا فرق بھی سامنے آجاتا۔

مراقبہ کے سائنسی تجزیہ کے بعد ایک دلچسپ خبر سے سائنس اور موسیقی کے یک گونہ ربط و تعلق کا بھی علم ہوا، ڈاکٹر راجا رمنا ہندوستان کے ممتاز نیوکلیائی سائنسداں ہیں، لیکن انکی ایک تازہ تصنیف سے معلوم ہوا کہ وہ موسیقی کی باریکیوں سے بھی باخبر ہیں، 'دی اسٹرکچر آف میوزک ان راگ اینڈ ویسٹرن سسٹم' نامی کتاب میں انھوں نے ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے تمام بنیادی راگوں کے رموز و اعداد کو بڑی تفصیل سے پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی خصوصاً کرناٹکی اسکول کے اصولوں میں راگ و رتال کے ضابطوں کی پابندی کے باوجود فنکار کیلئے بڑی آزادی ہے، یہ اصول قوتِ حیات کے دوام کا احساس دلاتے ہیں، یورپ کے موسیقار ہندوستانی موسیقی کے آہنگ و اثر سے اس لیے بے خبر رہے کہ راگوں کے بنیادی رموز ان کو تحریری شکل میں حاصل نہیں ہوئے، یہ کتاب اسی کمی کی تلافی کیلئے لکھی گئی اور ماہرین موسیقی کی نظر میں اپنے موضوع پر یہ اولین ہونے کے باوجود نہایت کامیاب کوشش ہے۔

ع۔ ص۔

معارف کی ڈاک

مکتوب ردولی

درگاہ شریف ردولی، بارہ بنکی۔

محترم اصلاحی صاحب!

معارف میں آپ کا مضمون علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر العجم کا ایک مطالعہ بہت پسند آیا۔ واقعہ ہے کہ حضرت شبلی کی شعر فہمی اور لطافت ذوق کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ جسطرح شاعری اللہ کی عطا ہے اسی طرح سخن فہمی بھی اللہ کی عطا ہے۔ علامہ شبلی اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ایک ادارہ تھے وہ علم کا بحر بیکراں تھے۔ ستمبر کے معارف میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں سید محمد طارق صاحب، پروفیسر محمد ذاکر صاحب اور کاوش بدری صاحب کے مضامین پسند آئے۔ معارف کا تازہ شمارہ ملا، اس کے مضامین بھی پسند آئے، محمد بدیع الزماں صاحب کا مقالہ خاصے کی چیز ہے اسی شمارے میں ڈاکٹر کلثوم ابو البشر صاحبہ کا مضمون مشرقی بنگال، بنگلہ دیش اور اردو شائع ہوا ہے موصوفہ نے مقدمہ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ شیخ محمد نذیر نثار ہوئے جو صدی میں کلکتہ میں پیدا ہوئے، انھوں نے ایک مثنوی دریا سندر اردو میں تحریر فرمائی۔ میر حسن دہلوی کی گلزار نسیم سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ مثنوی لکھی۔ مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ گلزار نسیم دیا شنکر نسیم کی مثنوی ہے، میر حسن کی مثنوی کا نام سحر البیان ہے[1] ویسے کلثوم صاحبہ کا مضمون پُر از معلومات ہے۔ خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

نیاز آگیں اقبال ردولوی

---

[1] معارف: بالکل درست، پتہ نہیں مقالہ نگار کیسے لکھ گئیں اور ہم لوگوں سے بھی چوک ہوگئی۔

وفیات

مولانا کوثر نیازی

گذشتہ ماہ اخباروں سے یہ معلوم کر کے بڑا صدمہ ہوا کہ پاکستان کے مشہور عالم و مصنف، ادیب و شاعر اور سیاست داں مولانا کوثر نیازی کا انتقال دماغ کی شریان پھٹ جانے سے ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ہ

وہ ۱۹۳۴ء میں میانوالی پنجاب میں پیدا ہوئے، طالب علمی کا زمانہ پریشانی میں گذرا مگر ان کے حوصلے بلند رہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد قومی اشغال سے انکا شغف بڑھا، ایک زمانے میں جماعت اسلامی کے سرگرم رکن رہے، اس سے علحدگی کے بعد جناب ذوالفقار علی بھٹو سابق وزیر اعظم پاکستان کی پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں سیالکوٹ سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، ۱۹۷۲ء میں وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے انھیں امور مذہبی و اطلاعات و نشریات کا وزیر بنایا۔ موجودہ وزیر اعظم مسز بے نظیر بھٹو نے انھیں اسلامی کونسل کا چیرمین مقرر کیا تھا۔

صحافت و خطابت کے میدان میں بھی وہ اپنے جوہر دکھاتے رہے۔ بڑے اچھے مقرر اور خطیب تھے، کئی برس تک لاہور سے ہفت روزہ "شہاب" نکالتے رہے اور کئی علمی و دینی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ انکی کتابوں اسلام ہمارا دین۔ بصیرت۔ بنیادی حقیقتیں اور آئینہ تثلیث کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، آخر الذکر کتاب اس وقت لکھی گئی جب پاکستان میں عیسائی مشنریاں ناواقف مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں سرگرم تھیں، یہ کتاب

دراصل اسلام کی عیب جوئی کرنے والے عیسائی مبلغین کے لیے ایک آئینہ ہے جس میں عیسائیت کے اصلی خط و خال نمایاں ہو گئے ہیں۔ بھٹو حکومت کے خاتمہ کے بعد انھوں نے "اور لائن کٹ گئی" کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس میں اس کا ذکر ہے کہ فوجی انقلاب کیسے آیا؟ مولانا کی تحریر و تصنیف کی ایک خوبی روانی اور شگفتگی بھی ہے۔

مولانا کوثر نیازی ہندوستان اور پاکستان میں اچھے تعلقات کے متمنی تھے۔ ابھی چند برس پہلے دونوں ملکوں میں خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے ہندوستان کا دورہ بھی کیا تھا۔ دارالمصنفین سے بھی ان کو تعلق خاطر تھا۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ان کا ذکر خیر کیا کرتے تھے، پاکستان کے بعض ناشر دارالمصنفین کی مطبوعات کو غیر قانونی طور پر چھاپ کر اس کو غیر معمولی نقصان پہنچا رہے تھے، اس کے تدارک کے لیے پاکستان کی وزارت تعلیم کے ماتحت نشر و اشاعت کے ایک اہم ادارے نیشنل بک فاؤنڈیشن اور دارالمصنفین کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں مرحوم صباح الدین صاحب کو مولانا کوثر نیازی سے بھی بڑی مدد ملی تھی جس کا اعتراف انھوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> "انھوں (جناب سید حسام الدین راشدی) نے دارالمصنفین کی فریاد پاکستان کے وزیر امور مذہبی مولانا کوثر نیازی تک پہنچائی جو بڑے لائق اور فاضل اہل علم ہونے کے ساتھ بڑے علم نواز اور علم دوست بھی ہیں، انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے اس مسئلہ کی طرف جناب ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان کی توجہ دلائی جنھوں نے اپنی معارف شناسی اور ہندوستان سے خیر سگالی کی خاطر اس سے اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔

مولانا کوثر نیازی نے پاکستان کے وزیر تعلیم جناب عبدالحفیظ پیرزادہ پر بھی اس معاملہ کی نوعیت کو اچھی طرح واضح کیا جنھوں نے اپنی فراخدلی سے پاکستانی ناشروں کی بدعنوانی پر اظہار افسوس کرکے اپنی علم پروری کا ثبوت دیا۔"

معارف برابر مولانا کے مطالعہ میں رہتا تھا اور انہیں اس کا انتظار رہتا تھا، انتقال کی خبر ملنے سے ۲دو تین۳ روز پہلے ان کے یہاں سے جو خط ملا تھا اس میں معارف کی تحسین اور اس کا شکوہ تھا کہ وہ پابندی سے نہیں ملتا۔

مولانا کو اسلام آباد کی فیصل مسجد میں سپرد خاک کیا گیا، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے آمین۔

شاہ ودود احمد

قارئین کو یہ خبر سن کر بھی بڑا ملال ہوگا کہ رمضان المبارک کے دوسرے عشرہ میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق اڈیٹر معارف کے صاحبزادے شاہ ودود احمد کا انتقال حرکت قلب بند ہو جانے سے کراچی میں ہوگیا۔ اپنے والد بزرگوار ہی کی طرح وہ بھی بڑے نیک طینت اور شریف النفس انسان تھے، انکی تعلیم شبلی کالج میں ہوئی اور تقسیم کے بعد پہلے ڈھاکہ پھر کراچی گئے جہاں پیام اجل آگیا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور تمام پس ماندگان خصوصاً ان کی بیوہ، بیٹے اور بیٹی کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

"ض"

یادِ رفتگاں

مولانا سید سلیمان ندوی نے وفیات کے تحت یا شذرات میں اپنے دور کے جن مشاہیر اور ممتاز اہل علم و قلم کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر کیے تھے۔ یہ کتاب ان کا مجموعہ ہے۔

قیمت ۵۰ روپے۔

ادبیات

غزل

از جناب وارث ریاضی

راس آتی ہی نہیں جلوؤں کی ارزانی مجھے
مضطرب رکھتی ہے تاروں کی درخشانی مجھے

اک جگہ مثلِ شجر رہنا نہیں کوئی کمال!!
مل گئی قسمت سے بوئے گل کی حیرانی مجھے

میں زمینِ عشق کا ذرہ ہوں رہ جاتا یہیں
لے گیا ہے عرش تک شوقِ خدادانی مجھے

زخمِ دل پر راہِ الفت میں نمک پاشی کے بعد
یاد ہے وہ تیرا اندازِ پشیمانی مجھے!!

اک اسی بے رحم کو الزام دینا ہے فضول
جس نے جب چاہا دیا دھوکا بہ آسانی مجھے

باوجودِ علم و دانش راہِ الفت میں مدام
"ہر قدم پر تھی سہارا میری نادانی مجھے"[عہ]

مسجد و مندر کے جھگڑوں نے کیا رسوا مگر
وہ پشیماں ہے نہ کچھ احساسِ نادانی مجھے

یونہی میں نغمہ سرا ہوتا رہا وارثؔ اگر
مار ڈالے گا مرا ذوقِ غزل خوانی مجھے

غزل

از پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد فخرؔ

نہ دے یہ دل دہائی تو کوئی بات نہیں
"یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں"

جو مانگنا ہے تجھے صرف ایک در سے مانگ
یہ دربدر کی گدائی تو کوئی بات نہیں

مزہ تو جب ہے بجھے تشنگیٔ خارِ الم
جنونِ آبلہ پائی تو کوئی بات نہیں

خود اپنے دل کو بنائے تو آستانِ حرم
حرم کی ناصیہ سائی تو کوئی بات نہیں

نکل گئی تھی مرے منہ سے دل کی بات جو کل
ہوئی ہے آج پرائی تو کوئی بات نہیں

مئے سخن سے نہ پگھلے جو دل کا آئینہ
تو فخرؔ! شعلہ نوائی تو کوئی بات نہیں

عہ استادِ محترم جگن ناتھ آزاد کی غزل کا مصرعہ۔

باب التقریظ والانتقاد

چند کتب نعت

کعبہ و طیبہ، اللہ و رسول، زمزمۂ درود، زمزمۂ سلام، از جناب ابوالامتیاز ع۔ س مسلم صاحب تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ کتابت و طباعت بہتر، صفحات اول و دوم ۱۶۰، سوم و چہارم ۲۰۸، خوبصورت جلد، قیمت اول و دوم ۱۰۰ روپے، سوم و چہارم ۱۲۵ روپے، پتہ: مقبول اکیڈمی دیال سنگھ بلڈنگ شاہراہ قائداعظم لاہور۔

جناب ابوالامتیاز ع۔ س مسلم صاحب کو شاعری کی مختلف اصناف پہ قدرت ہے اور ان کے متعدد مجموعے شایع ہو چکے ہیں، لیکن ادھر کئی برس سے انھوں نے اپنے شاعرانہ کمالات کے اظہار کے لیے نعت کو وسیلہ بنایا ہے، اس سے پہلے ان کے دو مجموعے حمد و نعت اور کاروانِ حرم کا ذکر معارف میں کیا جا چکا ہے، کئی مہینے ہوئے انھوں نے ازراہ عنایت یہ چاروں مجموعے بھی ہم کو نذر کیے ان سب کا موضوع حمد و نعت ہے جو شاعری کی مقبول اصناف بھی ہیں اور انہیں مذہبی و دینی تقدس کا درجہ بھی حاصل ہے، اردو میں حمد و نعت گو شعرا کی تعداد کم نہیں ہے لیکن انکا خاطر خواہ حق وہی شاعر ادا کر سکتا ہے جو صحیح معنوں میں بادۂ توحید کا متوالا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت میں سرشار ہو، ابوالامتیاز ع۔ س مسلم صاحب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اللہ و رسولؐ کے پوری طرح مرتبہ و عظمت شناس ہیں، اس کے علاوہ ان کو شعر و سخن کا اچھا ملکہ اور زبان و بیان پہ پوری قدرت ہے اس لیے شعری لطافتوں اور خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے انھوں نے خدا و رسولؐ کی توصیف و ستایش کا حق ادا کیا ہے۔

پہلی کتاب کعبہ و طیبہ دو حصوں پر مشتمل ہے گویا ایک میں حمدیہ اشعار اور اللہ کے مقدس گھر کی عظمت کا بیان ہے تو دوسرے میں نعتیہ اشعار اور مدینہ طیبہ کی فضیلت کا ذکر ہے۔ دوسری کتاب میں بھی پہلے اللہ کی حمد و ثنا سے متعلق اور آخر میں رسول اکرمؐ کی نعت و منقبت سے متعلق اشعار ہیں، تیسری کتاب میں بارگاہِ رسالتؐ میں درود و سلام کی سوغات بھیجی گئی ہے۔ آخری کتاب میں بھی نذرانہ سلام پیش کیا گیا ہے لیکن دونوں کی ابتدا حمد سے ہوئی ہے۔

مصنف کو نعت گوئی سے خاص مناسبت ہے اور یہی ابو الامتیاز صاحب کا خاص امتیاز بھی ہے، ذیل میں ان کی نعتیہ شاعری کی چند اہم خصوصیات درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ نہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں نامناسب فراخدلی سے کام لیا گیا ہے اور نہ آپؐ کی جامعیت و کمال اور عظمت و برتری کو بیان کرنے میں کمی و کوتاہی کی گئی ہے۔

۲۔ مصنف کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے جو والہانہ عقیدت و محبت ہے، ان کا نعتیہ کلام پوری طرح اس کا غماز ہے، لیکن غیر معمولی جوش عقیدت و محبت میں بھی وہ اپنا ہوش و حواس قائم رکھتے ہیں، اس لیے عقیدت و محبت کے اظہار کے ساتھ وہ آپؐ کی پاکیزہ سیرت اور ستودہ زندگی اور آپؐ کے اخلاق و شمائل کی مصوری کرتے ہیں، آپؐ کے کمالات اور کارناموں کے جلوے دکھاتے ہیں، آپؐ کے خصائص و معجزات بیان کرتے ہیں، آپؐ کی اصلاح و دعوت کا ذکر کرتے ہیں اور آپؐ کی تعلیم و ہدایت کا مرقع پیش کرتے ہیں جس سے آپؐ کی عظمت و بلندی اور دنیا پر آپؐ کے

احسانات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ مسلم صاحب نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور تعلیم و ہدایت ہی سے بھٹکی ہوئی دنیا کو راستہ مل سکتا ہے اور عالم کو جلا دینے والی آگ کو آپ ہی کی بارش کرم بجھا سکتی ہے۔

۴۔ مسلم صاحب کو زبان و بیان پر اچھی قدرت ہے، وہ شعر و ادب کے مزاج شناس ہیں، فن عروض سے بھی واقف ہیں اس لیے انکا کلام اسقام سے بڑی حد تک خالی اور پیرایۂ بیان بہت موثر اور دلکش ہے۔

۵۔ شاعری کا اصل کمال جدت ادا ہے، اس کی وجہ سے فرسودہ مضامین بھی نئے اور تازہ معلوم ہونے لگتے ہیں، جناب مسلم صاحب کی نعتیہ شاعری میں بھی جدت ادا نے یہی کیفیت پیدا کر دی ہے، انھوں نے ایک ہی قسم کے خیالات کو متعدد بار بیان کیا ہے مگر ہر جگہ ان کا طرز و انداز جدا جدا ہے، اس کی وجہ سے تکرار کا عیب جاتا رہا ہے۔

۶۔ مسلم صاحب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ قدرت نے ان کو دردمند دل دیا ہے اور وہ ہر انسان کے درد و کرب کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں لیکن ان کو سب سے زیادہ دکھ ملت اسلامیہ اور عالم اسلام کے موجودہ پرآشوب حالات سے ہے، اس لیے خدا کی بارگاہ میں بھی وہ اس کی فریاد کرتے ہیں اور آنحضورؐ کو بھی شیرازۂ ملت کے درہم برہم ہو جانے کا حال بتاتے ہیں۔

مثالیں پیش کرنے کی گنجایش نہیں ایک شعر پر تبصرہ ختم کیا جاتا ہے۔

غیرت کا ہے افلاس تو ایمان کا فقدان | اب جزیہ گزاروں کو ادا کرتے ہیں تاوان

"ض"

مطبوعات جدیدہ

نظامِ تعلیم، نظریہ، روایت، مسائل از جناب پروفیسر خورشید احمد، مرتب جناب سلیم منصور خالد، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و اعلیٰ طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ: بک پروموٹرز، جناح سپر مارکیٹ، مرکز الیف ۷/۱، اسلام آباد، پاکستان۔

پروفیسر خورشید احمد پاکستان بلکہ عالم اسلام کے ممتاز ماہر معاشیات ہیں، ان کی علمی و عملی تابانیوں سے یورپ و افریقہ کے کئی ادارے روشن ہیں، تعلیم و تدریس بھی انکا خاص موضوع ہے، مغربی استعمار کے قائم کردہ منہج تعلیم کی برائیوں اور خامیوں سے وہ باخبر ہیں، ان کی نگاہ میں "تخریبی قوتوں کا سب سے موثر حملہ جس میدان میں ہوا ہے، وہ تعلیم کا میدان ہے، اس حملہ کی زد میں فکر و نظر، ایمان و ایقان، اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدن غرض ہر وہ چیز ہے جو ہماری شناخت ہے اور جس میں ہماری زندگی اور بقا کا راز ہے" اسی لیے وہ پاکستان میں نظام تعلیم کی اسلامی روح و قالب کی تلاش میں عرصہ سے مصروف عمل ہیں، زیر نظر کتاب میں اسی موضوع پر ان کی متعدد تحریروں کو ان تین حصوں میں یکجا کیا گیا ہے۔ نظریہ ۲۔ روایت ۳۔ اور مسائل، پہلے حصہ میں اسلام کے نظریۂ تعلیم، قومی تعمیر اور اساتذہ کی ذمہ داریوں کے علاوہ جدید نسل میں مذہب سے انحراف کے اسباب بھی بتائے گئے ہیں، دوسرے حصہ میں برصغیر کے مسلمانوں کے نظام تعلیم پر بحث کی گئی ہے دراصل یہی کتاب کی روح ہے، اس میں مسلم دور حکومت کے نظام تعلیم کا عہد بعہد جائزہ

لیتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ذکر کیا گیا ہے، خصوصاً دیوبند، علی گڑھ، ندوہ اور جامعہ کے خوب و زشت کا تجزیہ بصیرت افروز ہے، دیوبند کی خدمات کا اعتراف وسعت قلب ونظر سے کیا ہے تاہم ان کی یہ رائے موضوع بحث بن سکتی ہے کہ "متحدہ قومیت کے لیے دیوبند کا ایک مورچہ بن جانا ایک تاریخی سانحہ ہے اور آج تک طلبۂ تاریخ کے لیے ایک معمہ ہے"۔ ندوہ کے ذکر میں انھوں نے لکھا کہ "ملت کو اس کا سب سے بڑا علمی عطیہ مولانا سید سلیمان ندوی کی ذات گرامی ہے"۔ ان کی رائے میں دارالمصنفین سے جو عظیم خدمت علوم اسلامی خصوصاً اسلامی تمدن و تاریخ کے میدانوں میں کی ہے وہ ندوۃ العلماء کی وجہ سے ممکن ہوئی، لیکن ان کو یہ شکوہ بھی ہے کہ "جس نوعیت کی تخلیقی و انقلابی جدوجہد کی ضرورت تھی وہ ندوہ نہ کر سکا، ندوہ کی پوری تاریخ میں جدوجہد اور انقلابیت کے بجائے ایک ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت ہے"۔ تیسرے حصہ میں انھوں نے پاکستان کے نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل کے سلسلہ میں کئی مفید تجویزیں پیش کی ہیں اور گو یہ پاکستان کے پس منظر میں ہیں لیکن ہندوستان میں دینی تعلیم کے فروغ میں کوشاں افراد کے لیے بھی مفید ہیں۔

ضعیف احادیث کی معرفت اور انکی شرعی حیثیت

از جناب غازی عزیز، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲۲، قیمت ۸۴ روپے، پتہ: فاروقی کتب خانہ، افضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، پاکستان۔

اس کتاب میں ضعیف احادیث کی فنی تشریح کر کے بتایا گیا ہے کہ علماء کے ایک طبقہ نے بعض حدود و شروط کے ساتھ ان کو قبول کیا ہے، مولف نے ان علماء کے اقوال و آراء کا جائزہ لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ ایسی حدیثوں پر عمل کا کوئی جواز نہیں

خواہ ان کا تعلق فضائلِ اعمال ہی سے کیوں نہ ہو، لائق مولف کی محنت، مطالعہ اور تحقیق سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے تاہم ان کی شدت وانتہا پسندی ہر جگہ نمایاں ہے علاوہ ازیں ان کی تحریر سنجیدہ علمی رنگ اور شائستگی سے عاری ہے، قلم کی جارحیت اور سوئے ادب اور درجہ و مرتبہ کا عدم لحاظ تکلیف دہ ہے، مثلاً علامہ ابن حجر کی ایک تحریر کے متعلق لکھتے ہیں کہ "... اس اعتذار میں اصلاً اصول حدیث اور محدثین کرام کی نسبت کس بغض وعناد سے کام لیا گیا ہے یہ بات مخفی نہیں"۔ ملا علی قاری اور مولانا عبدالحیٔ لکھنوی کے اقوال پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھا کہ "ان فضلاء کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہا تو انھوں نے ضعیف احادیث کے فضائل اعمال میں معتبر ہونے کا جادوئی ڈنڈا گھمایا اور اپنا الو سیدھا کر لیا"۔ مولانا ظفر احمد عثمانی کو 'کم بصیرت' اور علمی خیانت کرنے والا لکھا، علامہ خفاجی کے ایک مناقشہ کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا کہ "وہ انتہائی لغو اور صفحہ سیاہ کرنے والا ہے"۔ درایت کی بحث میں انھوں نے لکھا کہ اس کی موجودہ تعبیر "عقل کی کسوٹی پر پرکھنا" ہے اور "اس کے موجد غالباً مولانا شبلی نعمانی مرحوم اور ان کے حواری ہیں" اس کے بعد کئی جگہ اسی سیاق میں وہ 'نعمانوی تعبیر' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، حالانکہ خود انھوں نے جس درایت کا اس شدت سے انکار کیا ہے وہ متقدمین کے یہاں امر اجتہادی اور ترجیح کی شکل میں اور متاخرین میں نواب صدیق حسن خاں اور مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کی نقل کردہ تعریفوں سے ثابت ہے، مولف کی پریشاں خیالی کا اثر مباحث کی ترتیب میں بھی ظاہر ہے، غیر ضروری تکرار و بے جا اطناب کی وجہ سے مضامین خلط ملط ہو گئے ہیں اکثر جگہ عربی عبارتیں بغیر ترجمہ درج ہیں اور جن کا ترجمہ کیا گیا ہے ان میں بعض صاف نہیں ہیں جیسے "ابن فارس اور فلیح کے درمیان مفاذت واضح ہے"۔ کتابت کی غلطیاں جابجا ہیں

الشمس کو متعدد بار الشمش ہی لکھا گیا ہے۔

مشاہیر شعرائے اردو کی فارسی شاعری از جناب ڈاکٹر انیس ادیب

تقطیع متوسط، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۸۰،

قیمت سو روپے، پتہ: نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ۔ یوپی۔

یہ کتاب لائق مولف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے، اس میں انھوں نے میرزا مظہر جان جاناں سے علامہ جمیل مظہری تک اردو کے ۶۰ مشاہیر شعراء کے مختصر حالات اور ان کی فارسی شاعری کا انتخاب دیا ہے، ہر ایک کے کلام کے حسن و قبح اور نمایاں خصوصیات بھی دکھائے ہیں، موضوع کی ندرت اور مقالہ نگار کی تحقیق و محنت سے کتاب پرکشش ہوگئی ہے، البتہ کہیں کہیں مضامین کی تکرار سے بے لطفی پیدا ہوگئی ہے، بعض جگہ ان کی تحقیق کا رنگ محض تاثراتی ہوگیا ہے، مثلاً سودا کے کلام میں مے و صہبا کے ذکر سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے قدرداں اور لذت شناس تھے"، اس ظنی دلیل سے تو اردو و فارسی شاعری کا پورا تصرف واقعتاً میخانہ نظر آئے گا جس میں زاہد و رند کی دوئی باقی نہ رہے گی، شروع میں ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ کا مختصر جائزہ بھی ہے۔

یادگار یوسف کوکن از افضل العلماء حافظ یوسف کوکن، متوسط تقطیع،

عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۱۸۹، قیمت ۷۵ روپے، پتہ: حافظ باوزن ۱۳

میلاپورن اسٹریٹ، مدراس ۱۴

افضل العلماء مولانا یوسف کوکن مرحوم ہندوستان خصوصاً جنوبی ہند کے گنجان علم کی متاع گراں تھے، انھوں نے وقت کی قدر کی اور زندگی علم و تحقیق کو نذر کردی، سنہ ۹۰ء

میں انکا انتقال ہوا، اب ان کی رفیق حیات نے انکے سوانح، معمولات اور علمی کمالات کی یہ داستان مرتب کی ہے جس سے مولانا مرحوم کے عزم و استقلال اور انکی شبانہ روز جدوجہد کے بہت سے ایسے گوشے سامنے آجاتے ہیں، جن میں اوروں کے لیے بھی حوصلہ و ہمت کا سبق ہے۔

بدیع الزماں خاور: سات سمندر کا شاعر

مرتب جناب ساحر شیوی

متوسط تقطیع، بہترین کاغذ، نفیس طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۰۴، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

بدیع الزماں خاور کو "کوکن کا شاعر" کہا جاتا ہے، لیکن انکے کلام کی خوشبو پوری اردو دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، تقریباً ربع صدی سے دل پہ جو گذرتی رہی وہ اسے رقم کرتے رہے انکے کئی مجموعے شایع ہوئے، انکی شخصیت اور شاعری پر اہل قلم وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں، زیر نظر کتاب میں ایسی تحریروں کو یکجا کر دیا گیا ہے، آخر میں تازہ کلام کا انتخاب بھی ہے۔

کھارے پانیوں کا سلسلہ

از جناب انور جلالپوری، متوسط تقطیع، مجلد مع گردپوش، صفحات ۱۱۲، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: مکتبہ دین وادب، امین الدولہ پارک، لکھنؤ، یوپی۔

جناب انور جلالپوری اب خوش گو شاعر سے زیادہ خوش سلیقہ ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے مشہور ہیں، لیکن ان کی شاعری، عہد و ماحول کی سچی عکاسی اور جذبات کی سادگی کیوجہ سے زیادہ توجہ کی مستحق ہے، زیر نظر مختصر مجموعہ ان کی بیس برس کی کاوش کا انتخاب ہے اور اس سے خود انکی تنقیدی شدت کا اندازہ ہوتا ہے، مجموعہ کا آغاز مناجات سے کیا گیا ہے، اسکا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

محفل دے کہ احباب سے ہنس بول سکوں میں تنہائی مجھے پلکیں بھگونے کے لیے دے

ع ۔ ص ۔

جلد ۱۵۳ ماہ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۴ء عدد ۵

مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

ادبیات

شذرات

۲۰؍ اپریل کو دارالمصنفین میں اسکی مجلس عاملہ اور مجلس انتظامیہ کے جلسے ہوئے جن میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا سید محمد رابع ندوی (لکھنؤ) مولانا محمد سعید مجددی (بھوپال) اور مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی (کلکتہ) مرزا امتیاز بیگ و جناب سلمان سلطان (اعظم گڈھ) کے علاوہ جناب سید شہاب الدین دسنوی معتمد دارالمصنفین اور یہ خاکسار شریک ہوئے علی گڑھ سے پروفیسر خلیق احمد نظامی اور پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، دہلی سے پروفیسر ضیاءالحسن فاروقی اور کلکتہ سے جسٹس خواجہ محمد یوسف اپنی علالت و معذوری کی بنا پر تشریف نہیں لاسکے، مجلس انتظامیہ کے موقر و محترم صدر عالی جناب نواب مفخم جاہ بہادر نے بھی اپنے والا نامہ سے شرکت سے معذرت فرمادی تھی جناب حکیم عبدالحمید صاحب بھی اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے تشریف نہیں لاسکے۔

مجلس عاملہ اور مالیاتی کمیٹی کا مشترکہ جلسہ صبح سے دوپہر تک ہوا اور مجلس انتظامیہ کا جلسہ سہ پہر میں ۵ بجے شروع ہوا اور ۸ بجے شب میں اس کا اختتام ہوا، دونوں جلسوں کی صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمائی، ناظم اور معتمد نے دارالمصنفین کے مختلف شعبوں کی رپورٹ پیش کی اور اس کے موجودہ حالات و مسائل اور ضروریات سے فاضل ارکان کو باخبر کیا جن پر انھوں نے بڑی توجہ اور ہمدردی سے غور فرمایا اور مفید و صائب مشورے دیے جن سے انشاءاللہ دارالمصنفین کے مختلف شعبوں کی کارکردگی بہتر ہوگی، بدلے ہوئے حالات میں دارالمصنفین کی ترقی و استحکام اور اس کو مزید موثر و فعال بنانے کی ضرورت پر بھی بحث و گفتگو ہوئی، ارکان نے دارالمصنفین کا سالانہ بجٹ منظور کیا، اس کے کارکن اس ہوشربا گرانی میں جس قدر ایثار و قناعت سے قلیل معاوضے پر کام کر رہے ہیں اس میں محترم ارکان اور خاص طور پر صدر محترم نے اضافہ کی ضرورت محسوس فرمائی تاکہ کارکنوں کے جوشِ عمل اور حوصلے میں کمی نہ آئے اور کبھی قدر انکی

پریشانیاں بھی رفع ہوں۔

گرانی جس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کی شرح سے دار المصنفین کے کارکنوں کی تنخواہوں میں جیسا اضافہ ہونا چاہیے اپنے محدود وسائل و ذرائع کی بنا پر نہ دار المصنفین اس کا متحمل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے خدمت گزاروں کو اس کی ہوس ہی ہے، وہ کفاف پر قانع ہو کر اسکی خدمت اور اس سے وابستگی ہی کو سعادت اور مایۂ فخر خیال کرتے ہیں، ان کی خواہش صرف یہ ہے کہ بزرگوں کی یہ عظیم الشان یادگار اور ہندوستان کے مسلمانوں کا ممتاز ادارہ اپنی خوبیوں اور خصوصیات کے ساتھ قائم و دائم رہے اور اس کا فیض سدا جاری و باقی رہے، اس نے جو مستند و محققانہ کتابیں شایع کی ہیں، اور آیندہ جن کی اشاعت اس کے پیش نظر ہے وہ برابر چھپتی اور قوم کی پذیرائی سے محروم نہ رہیں، ابھی تک دار المصنفین کا اصلی انحصار اپنی کتابوں کی تجارت ہی پر رہا ہے لیکن اب لیتھو کی طباعت نہ معیاری اور اطمینان بخش ہے اور نہ اس طرح ساری مطبوعات کو بازار میں بعجلت لا دینا ممکن رہ گیا ہے، اسی لیے ان صفحات میں کمپیوٹر مشین کی خریداری کا ذکر کئی بار آچکا ہے، جس پر تقریباً پانچ لاکھ روپے فوراً درکار ہیں، اس زمانے میں اس رقم کا مہیا ہو جانا مشکل نہیں ہے، بشرطیکہ دار المصنفین کی ضرورت اور اس کے مقاصد کی اہمیت کا خاطر خواہ احساس پیدا ہو جائے۔

---

۹ اپریل کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کا جلسہ ہوا اس میں بجٹ اور ضابطہ کی عام کارروائی کے علاوہ یونیورسٹی کے موجودہ حالات بھی زیر بحث آئے، جو بہت خراب بتائے جاتے ہیں، تعلیم و تربیت کا نظام بھی اطمینان بخش نہیں ہے، داخلوں، امتحانات اور دوسرے شعبوں میں گوناگوں قسم کی بد عنوانیوں کی شکایتیں سننے میں آئیں، راقم عین اجلاس کے وقت پہنچا تھا۔ وائس چانسلر صاحب نے اس کے استفسار پر فرمایا کہ وہ دوسرے دن موجود نہیں رہیں گے ورنہ ان سے ان امور کے بارے میں براہ راست دریافت کرتا، شکایتوں میں ضرور مبالغہ ہوگا لیکن

یونیورسٹی کیمپس میں پولیس کی مستقل موجودگی، خوف و دہشت کا ماحول اور قتل کے بعض واقعات کا ہونا بہت اذیت ناک امر ہے، مولانا سید احمد ہاشمی اور بعض دوسرے ممبروں نے جب یونیورسٹی کے حالات کو شرمناک بتاتے ہوئے ان پر تشویش ظاہر کی تو انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے بعض افراد اور یونین کے عہدیداروں نے نامناسب اور غیر شائستہ انداز میں مداخلت کرکے ان کو روکنے کی کوشش کی، گو بعض شکایت کرنے والوں کا لب و لہجہ بھی اچھا نہیں تھا تاہم ان کی شکایتوں کو غور و توجہ سے سُن کر انہیں وائس چانسلر صاحب کو خود مطمئن کرنا چاہیے تھا۔ ان کی موجودگی میں ان کی جانب سے دوسروں کی جواب دہی اور ممبروں کو اظہار رائے سے روکنے کا کیا جواز؟ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے سیکولرازم کا نشان اور ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع ہے، بڑے دکھ کی بات ہے کہ اس کی تباہی و رسوائی میں غیروں کے ساتھ خود مسلمانوں کے ذمہ دار حضرات بھی شریک ہوگئے ہیں۔

---

۱۱ اپریل کو شعبہ اسلامیات میں اس کے استاذوں ڈاکٹر احتشام بن حسن اور ڈاکٹر ظفر الاسلام کے اصرار پر شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر محمد سالم قدوائی کی صدارت میں راقم نے ایک توسیعی خطبہ دیا جس کا موضوع "قرآن مجید کا ایک اسلوب۔ استفہام" تھا، اس میں دوسرے شعبوں کے اساتذہ و طلبہ بھی شریک تھے اور انہوں نے بحث و مباحثہ میں حصہ لیا، ایک روز ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی کے ہمراہ ادارہ علوم القرآن کے دفتر گیا اس کا مختصر مگر ترقی یافتہ کتب خانہ دیکھ کر خوشی ہوئی، یہ ادارہ قرآنی علوم و معارف کی خدمت و اشاعت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔

مقالات

اخلاق نبویؐ کا ایک واقعہ

از مولانا حبیب ریحان خاں ندوی ازہری، بھوپال

حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کا ذکر مدح و ستائش کے انداز میں ذکر الٰہی میں وارد ہوا ہے:

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (قلم: ۴) اور تم اخلاق کے عظیم مرتبہ پر ہو۔

سے خطاب خلاق دو عالم نے فرمایا ہے، آپؐ کی زندگی کا تابناک پہلو آپؐ کی اخلاقی زندگی ہے، آپؐ کی تعلیمات اخلاق سے لبریز ہیں، اس مضمون میں اخلاق نبویہ عالیہ کا ایک واقعہ پیش کیا جا رہا ہے، جس سے آپؐ کی مردانہ شجاعت، کمزوروں اور ضعیفوں کی مدد کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے اور جس میں ایک معجزہ کی طرف اشارہ بھی ہے، اس میں داعیان حق کے لیے صبر و عزیمت جرأت و شجاعت اور جہد و عمل کا تاقیامت ایک مثالی نمونہ اور کامیابی و کامرانی کی بشارت بھی موجود ہے۔

حلبیؒ[1] تحریر کرتے ہیں کہ ایک اراشی (بکسر الہمزہ) شخص نے ابوجہل سے کچھ سامان خریدا، ابن ہشامؒ[2] نے اس کے قبیلے کے بارے میں دو قول نقل کیے ہیں اراشی اور اراشہ اور

---

[1] علی بن برہان الدین الحلبی نے اپنی کتاب "انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون المعروف بالسیرۃ الحلبیہ" میں یہ قصہ جلد ۱ ص ۳۱۵ پر لکھا ہے، مطبوعہ: المکتبۃ الاسلامیہ، بیروت [2] السیرۃ النبویہ لابن ہشام تحقیق مصطفیٰ السقا وغیرہ، مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی ج ۲، ص ۲۹۔۳۰ پر یہ قصہ درج ہے۔

قبیلہ کی طرف نسبت سے اس کو اراشی کہا گیا ہے، حلبی اور سہیلی[1] نے لکھا ہے کہ یہ قبیلہ خثعم کے ایک بطن کا نام تھا، قبیلہ اراش کا نسب سیرت ابن ہشام کے محققین نے حاشیہ میں اس طرح ثبت کیا ہے "ابن غوث یا ابن عمرو بن غوث بن نبت بن مالک بن زید بن کہلان بن سبا" سہیلی نے روض الانف میں یہی نسب بیان کیا ہے، ابن حزمؒ[2] نے ابن غوث یا ابن عمرو بن غوث کے بجائے صاف صاف ایک ہی قول لکھا ہے یعنی "اراشی بن عمرو بن غوث"۔

ابن ہشام کی عبارت میں لفظ "قدم" زیادہ ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ شخص مکہ میں نہیں رہتا تھا بلکہ اپنے قبیلہ سے بیع و شراء کے لیے مکہ آیا تھا نیز ابن ہشام نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ ابوجہل نے اس سے اونٹ خریدے تھے، پھر قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کی۔

ایمان اخلاق عالیہ کا پاسبان یہ غریب الدیار تاجر پریشانی و حیرانی میں قریش کی نادی (اجتماع گاہ) میں پہنچا اور اپنی دکھ بھری داستان مجمع کو سنائی، قریش کے ان افراد نے جن کا شیوہ ہی حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرنا تھا یہ ترکیب سوچی کہ اس شخص کو حضورؐ کا پتہ بتا دیں کہ آپؐ ابوجہل سے اس کا حق دلائیں، یہاں یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کو قریش کے دشمن بھی اچھی طرح جانتے تھے، ان کو یہ معلوم تھا کہ ایک مسافر اور پریشان حال کی پریشانی دور کرنے کے لیے حضور پاکؐ ضرور ہر ممکن...... کوشش کریں گے اور پھر ابوجہل جہالت سرکشی،

---

[1] امام محدث عبدالرحمٰن سہیلی نے سیرت ابن ہشام کی شرح "الروض الانف" تحقیق و شرح عبدالرحمٰن الوکیل، دارالکتب الحدیثہ میں یہ قصہ ج ۳ ص ۳۸۷-۳۸۸ پر تحریر کیا ہے [2] جمہرۃ انساب العرب لابن حزم، تحقیق عبدالسلام ہارون، مطبوعہ دارالمعارف مصر ص ۳۸۷۔

غرور و تکبر اور شدید عداوت کی وجہ سے حضورؐ کو اذیت پہنچائے گا، زبان سے سب وشتم کرے گا اور اراشی کا حق اس کو واپس نہیں کرے گا جس سے حضورؐ کو دہری تکلیفیں اور اذیتیں پہنچیں گی اور خصوصی طور پر نفسیاتی و قلبی کوفت یہ ہوگی کہ آپؐ ایک مسافر اور پریشان کی مدد نہیں کر سکے، حلبی کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود نہیں تھے اور ابن ہشام کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ وہاں موجود تھے لیکن دور بیٹھے تھے اور روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپؐ اس شخص کی گفتگو سُن رہے تھے یا نہیں۔

کفر و اخلاقی کا مظہر یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جس طرح ایمان اور محبت اخلاق عالیہ کو جنم دیتے ہیں اسی طرح کفر و نفاق اور نفرت و عداوت و تعصب، قدیم عالی اخلاق اور رہی سہی شرافت کو بھی نابود کر دیتے ہیں، عرب اور خصوصاً قریش کی قدیم جاہلی تاریخ جاننے والے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ غریب الدیار کی مدد کرنا، مسافر کی ضیافت اور خبر گیری، صاحب حق کو اس کا حق واپس دلانا اور پریشان حال کی مدد کرنا یہ [illegible] صفات حسنہ قریش میں موجود تھیں لیکن اس غریب الدیار اور پریشان حال اراشی کی مدد کرنے اور اس کا حق دلانے کی کوئی کوشش اکابر قریش نے نہیں کی بلکہ اپنے قلب و نظر پر غفلتوں کے پردے ڈال لیے اور حضورؐ کا مذاق اڑانے اور آپؐ کے ساتھ استہزاء و تمسخر کا ایک تماشہ کرنے کی غیر عاقلانہ آرزو کے پس پردہ انھوں نے اپنی آبائی [illegible] قبائلی شرافت متفق علیہ اخلاقی اقدار اور اعلیٰ کردار کو پس پشت ڈال دیا، لیکن عقل و خرد اور شرافت و کرامت کی میزان پر اگر تولا جائے تو یہ استہزاء و تمسخر حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں تھا بلکہ اس سے خود ان کی اپنی اخلاقی و انسانی صفات اور قلبی [illegible] تھا اور قصہ کے آخر میں پتہ چلے گا کہ جو چیز انھوں نے حضور پر نور [illegible]

کے لیے کی تھی وہ خود ان پر اور ان کی جاہلی زندگی کے سردار جہالت شعار ابوجہل پر استہزاء و تمسخر بن گئی، دنیا میں تو یہ حشر ہوا اور آخرت کی نامرادی اور حسرت کا نقشہ اس آیت پاک میں ملاحظہ فرمائیں:

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ	سو آج ایمان والے منکروں پر ہنستے
يَضْحَكُونَ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ هَلْ ثُوِّبَ	ہیں تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں
الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ۔	کیا منکروں نے اس چیز کا بدلہ پایا جو
(المطففین ۳۴ تا ۳۶)	وہ کرتے تھے۔

قبیلہ خثعم کے بطن اراش کا یہ غریب الدیار خواب و خیال میں بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اکابر قریش اپنی شرافت و عظمت اور اس جگہ (نادی) یعنی عرب کی پارلیمنٹ کی عزت و توقیر اس طرح کر سکتے ہیں کہ یہاں ہنسی مذاق اور استہزاء و تمسخر کریں اس لیے یہ مجبور شخص ان کی بات سے متاثر ہو کر اور ان کے مشورہ کو قبول کر کے اس یقین کے ساتھ حضورؐ کے پاس آیا کہ جس شخص سے مدد لینے کا مشورہ اکابر قریش نے دیا ہے وہ یقیناً اتنا باوقار اور عالی اخلاق ہوگا کہ اس کی مدد کر سکے اور اس کا حق اسے ابوجہل سے دلا سکے۔ وہ حضورؐ کے پاس آیا اور اپنا قصہ ابن ہشام کے الفاظ میں اس طرح سنایا:

یا عبد اللہ ان ابا الحکم بن ھشام	اے اللہ کے بندے ابا الحکم بن ہشام
قد غلبنی علی حقی لی قبلہ وانا	(ابوجہل) نے میرے حق پر قبضہ کر لیا ہے
(رجل) غریب ابن سبیل وقد	اور میں اجنبی اور مسافر شخص ہوں
سألت ھؤلاء القوم عن رجل	اور میں نے اس قوم سے کسی ایسے شخص
یؤدینی علیہ یاخذ لی حقی منہ	کے متعلق معلوم کیا جو مجھے اس سے میرا

فاشار والی الیک فجئتک لی حقی منه یرحمک الله ۔

حق دلا سکے تو انھوں نے مجھے تمہارا پتہ بتا دیا (خدا را) میرا حق مجھے اس سے دلادو، خدا تم پر رحم کرے ۔

شجاعت و شرافت کا پیکر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ایک سوالیہ لمحہ تھا، کیا آپ اس مسافر اور مجبور شخص کی مدد کریں؟ یقیناً آپ کے عالی اخلاق، خدا ترسی اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور رحمت کا تقاضہ یہی تھا کہ آپ اس کی مدد کریں اور آپ نے ایسا ہی کیا، غور کرنے کا مقام ہے، ابوجہل جیسے جاہل، خود پرست، مغرور اور زبان دراز دشمن کے پاس جانا انتہائی جرأت اور شجاعت کا کام تھا۔ لیکن یہ عالم آشکارا حقیقت ہے کہ حضور پاک سب سے بہادر اور جرأت مند انسان تھے، خادم رسول اللہ و صحابی جلیل حضرت انس رض کی شہادت بخاری[1] و مسلم[2] میں اس طرح موجود ہے، بخاری کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

عن انس رض قال کان النبی صلی الله علیه وسلم احسن الناس واجود الناس واشجع الناس، ولقد فزع اهل المدینه ذات لیلة فانطلق الناس قبل الصوت، فاستقبلهم النبی صلی الله علیه وسلم

حضرت انس رض سے روایت ہے، کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اچھے، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ بہادر انسان تھے اور ایک رات کا قصہ ہے کہ اہل مدینہ (ایک آواز سے) گھبرا اٹھے اور آواز کی طرف

---

[1] بخاری، کتاب الادب ۷، باب حسن الخلق والسخاء، فتح الباری مطبوعہ مطبع سلفیہ قاہرہ ج ۱۰ ص ۴۵۵، حدیث نمبر ۶۰۳۳۔

[2] مسلم کتاب الفضائل شرح النووی مطبوعہ، مطبع مصریہ قاہرہ ج ۱۵ ص ۶۷۔

وقد سبق الناس الی الصوت — دوڑ پڑے (وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ)

وھو یقول لم تراعوالم تراعوا — نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استقبال

وھو علی فرس لابی طلحۃ عری — کیا کیونکہ آپؐ آواز سُن کر تن تنہا لوگوں

ماعلیہ سرح فی عنقہ سیف۔ — سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے اور کہہ رہے

تھے خوف کی کوئی بات نہیں آپ (جلدی

کی وجہ سے) ابو طلحہؓ کے ننگے پیٹ (بے زین)

گھوڑے پر سوار تھے اور گردن میں تلوار

لٹک رہی تھی۔

آپؐ سب سے اچھے انسان نہ ہوتے تو کیوں ایک غریب کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے،
آپؐ گھبراہٹ یا ہچکچاہٹ کے بغیر اٹھے اور اس شخص کے ہمراہ تن تنہا ابو جہل کے گھر کی طرف
چل پڑے، شجاعت کا یہ اعلیٰ درجہ تائید الٰہی اور مرتبہ نبوت کے بغیر مشکل تھا، کوئی
دوسرا بہادر شخص ہوتا تو کم از کم اپنے ساتھیوں میں سے دو چار بہادر نوجوانوں کو ضرور
ساتھ لے جاتا کہ کسی ہنگامے یا مصیبت کے وقت کام آئیں، لیکن رسول پاک صلی اللہ علیہ
وسلم صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے خود سپر تھے، کیونکہ آپؐ ایمان کامل کے
اس مقام پر فائز تھے جہاں خدا کی قوت اور مدد کا یقین اس طرح ہو جاتا ہے کہ اگر ساری دنیا
مل کر چاہے تو بندے کو کوئی نقصان یا نفع نہیں پہنچا سکتی، اس ایمان و عزم کے ساتھ حضور
پاکؐ ابو جہل کے گھر پہنچے، قریش نے اپنا ایک نمایندہ پیچھے پیچھے ارسال کیا کہ جو تماشہ ہو
اس کی خبر فوراً مجلس تک پہنچے اور اشرار کی محفل اس سے سرور حاصل کرے۔

اللہ کے دشمن پر خوف طاری | خدا کی نصرت پر یقین کامل رکھنے والا یہ بندۂ خداؐ تن تنہا

ابوجہل کے گھر پہنچا اور دروازہ پہ دستک دی گھر کے اندر سے ابوجہل کی آواز آئی کون ؟
محمد حضورؐ نے جواب دیا، پھر فرمایا باہر نکلو، ابوجہل اس طرح باہر آیا کہ اس کے چہرہ پہ زندگی کے آثار نہیں تھے اس کا رنگ متغیر ہو چکا تھا، عربی میں "انتقع لونہ" کا جملہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی حلبی نے اس طرح لکھے ہیں :

ای تغیر و صار کلون النقع	یعنی متغیر ہو گیا تھا اور مٹی اور غبار
الذی هو التراب وهو الصفرة	کی طرح ہو گیا تھا جس میں زردی
مع الکدرة ۔	اور سیاہی شامل ہوتی ہے

سیرت ابن ہشام کے محققین نے دوسری روایت "امتقع لونہ" لکھی ہے جس کے معنی بھی تغیر و تبدیلی ہی کے ہیں بلکہ معنی کے لحاظ سے یہ اجود ہے، ابن منظور تحریر کرتے ہیں :

امتقع لونہ اذا تغیر من حزن	امتقع لونہ کے معنی ہیں رنگ کا
او فزع وکذلك انتقع بالنون	غم یا گھبراہٹ سے بدلنا اسی طرح
وابتقع بالباء والمیم اجود[1]	انتقع اور ابتقع بھی لیکن میم کے
	ساتھ اجود ہے ۔

حلبی نے "چہرہ پہ زندگی کے آثار" کا تذکرہ نہیں کیا ہے، لیکن ابن ہشام کا قول یہ ہے " وما فی وجهه من رائحة" یہاں رائحہ کے معنی خوشبو کے نہیں بلکہ "بقیہ روح" کے ہیں اس کی دلیل قصے کے آخر میں ہے جہاں "روحہ" کا لفظ موجود ہے، ایک معنی یہ بھی لیے گئے ہیں کہ "اس کے چہرہ پہ خون کا کوئی قطرہ نہیں تھا" لیکن دونوں معنی

---

[1] لسان العرب لابن منظور مطبوعہ الدار المصریہ للتالیف والترجمہ ج ۱۰ ص ۲۱۸ - مادہ مقع ۔

متقارب ہیں اور مقصد یہ ہے کہ ابوجہل خوف اور پریشانی کی وجہ سے گھبرایا ہوا تھا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا جیسے کہ خون کا کوئی قطرہ اس میں نہ ہو اور وہ بے روح ہو چکا ہو۔

ایمان باللہ اور جرأت و شجاعت کی تاثیر بھی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ کفر کے خرمن پر بجلی گر جاتی ہے، حضورؐ نے ابوجہل سے کہا اس شخص کا حق اس کو دے دو، ابوجہل نے کہا ہاں ہاں ابھی میں اس کو اس کا حق ادا کیے دیتا ہوں، ابوجہل فوراً گھر کے اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد باہر آیا اور اس شخص کو اس کے حق کی پائی پائی ادا کر دی، پھر رسول پاکؐ واپس آ گئے لیکن آپؐ کے حسن اخلاق اور پریشان حالوں کی مدد کا ایک زندہ قصہ تاریخ کی زینت بن کر باقی رہ گیا۔

خدا محمدؐ کو جزائے خیر دے اراشی مسافر اکابر قریش کی طرح لائق و فائق تو نہ تھا کہ اہل ایمان کے ساتھ تمسخر و استہزا کی اسے سوجھتی لیکن قدیم عربی اخلاق و شرافت کا پیکر ضرور تھا ۔ نے دل ہی دل میں حضور پاکؐ کو دعائیں دیں پھر قریش کی مجلس میں آکر ان کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھا کہ انھوں نے ہی آپؐ کا پتا بتایا تھا اور اس بھری محفل میں جہاں تمام اکابر قریش اس کے منتظر بیٹھے تھے کہ حضورؐ کی رسوائی اور جگ ہنسائی کی خبریں انہیں عنقریب موصول ہونے والی ہیں اچانک اراشی کی زبان اس طرح کھلی "جزاہ اللہ خیرا، فقد واللہ اخذ لی حقی" اللہ محمدؐ کو جزائے خیر دے، انھوں نے مجھے میرا حق دلا دیا۔"

یہ جملے قریش کے اکابر کے لیے زہر سے زیادہ تلخ تھے، وہ رسول پاکؐ کے ساتھ استہزا کرنا چاہتے تھے اور ان کی یہ تدبیر شمشیر بن کر انہیں کے سر پر آپڑی اور زبان حال و قال دونوں سے وہ سب کی نظروں میں رسوا ہوئے اور رسول پاک

صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اراشی کے دل میں پیدا ہوئی اور ابوجہل کی ذلت اور خوف میں مزید اضافہ ہوا۔ ابوجہل کے سلسلے میں ابن ہشام نے یہ روایت لکھی ہے کہ "عام طور پر عدو اللہ ابوجہل کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید بغض و عداوت کے باوجود جب بھی وہ آپؐ کو دیکھتا تھا خدا کے حکم سے ذلیل اور رسوا ہوتا تھا۔"[1]

معجزہ کا ظہور قریش نے جس شخص کو اراشی کے پیچھے بھیجا تھا تھوڑی دیر بعد وہ آیا اسے دیکھکر سب کے سب اس طرح گویا ہوئے، جلدی بتا تو نے کیا دیکھا؟ اس نے کہا ایسی عجیب بات دیکھی جو عجائبات میں سے ہے، خدا کی قسم جونہی انھوں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ اس طرح باہر نکلا کہ گویا اس کی روح اس کے ساتھ نہیں ہے "فخرج الیہ وما معہ روحہ" پھر ساری وہ تفصیل سنائی جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔

اکابر قریش یہ سن کر حیرانی و پریشانی کے عالم میں تھے کہ ابوجہل آگیا انھوں نے اس سے کہا تمھیں کیا ہو گیا تھا؟ خدا کی قسم ہم نے کبھی ایسی بات نہیں دیکھی جیسی کہ تم نے آج کی؟ ابوجہل نے کہا تمھیں کیا پتہ خدا کی قسم جیسے ہی اس نے میرے دروازے پر دستک دی اور میں نے اس کی آواز سنی مجھ پر خوف اور دہشت طاری ہو گئی پھر جب میں باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے سر پر ایک عظیم الجثہ اونٹ کھڑا ہے میں نے اس جیسی پیشانی، گردن اور دانت کسی اونٹ کے کبھی نہیں دیکھے، خدا کی قسم اگر میں انکار کرتا تو وہ مجھے کھا جاتا۔ یہاں اکل کا لفظ تھا اس لیے راقم نے اس کا لفظی ترجمہ "کھا جاتا" کیا ورنہ "نگل جاتا" زیادہ مناسب تھا۔

اصحاب سیر نے اونٹ کے سلسلے میں یہ لفظ استعمال کیے ہیں "فحلا من الابل"

---

[1] سیرت ابن ہشام ۲: ۲۸۔

فحل عربی میں عام طور پر ہر چیز کے مذکر کو کہتے ہیں اور کیونکہ نر مادہ سے زیادہ طاقتور اور عظیم الجثہ ہوتا ہے اس لیے اس لفظ کو بڑائی اور قوت کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، ابن منظور لکھتے ہیں:

الفحل الذکر من کل حیوان ... کبش فحیل یشبہ الفحل من الابل فی عظمہ و نبلہ ... استفحل امر العدو اذا قوی واشتد ... وفحول الشعراء هم الذین غلبوا بالهجاء من هاجاهم مثل جریر والفرزدق واشباههما[1]

فحل ہر جاندار کے نر کو کہتے ہیں، ... فحیل مینڈھا سے کہتے ہیں جو نر اونٹ کی طرح عظیم اور اچھا ہو، ... دشمن کا معاملہ استفحل یعنی قوی اور سخت ہوگیا ... فحول الشعراء ان شاعروں کو کہا جاتا ہے جو ہجو میں اپنے مخالفین پر غالب آگئے جیسے جریر و فرزدق اور ان جیسے دوسرے بڑے شاعر۔

اس مختصر لغوی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ فحل میں قوت و عظمت اور بڑائی کے معنی شامل ہیں اور دراصل یہ اونٹ عام اونٹوں سے زیادہ عظیم الجثہ اور طاقتور تھا کیونکہ اس جیسے دانت گردن اور پیشانی کسی دوسرے اونٹ کے نہیں تھے۔

قریش کے اکابر یہ قصہ سن کر حیران ضرور ہوئے لیکن کفر و ضلال اور حقد و حسد کی دیرینہ بیماریوں نے انہیں ایمان و یقین سے محروم رکھا بلکہ اپنی ناکامی اور رسوائی کے انتقام کی مزید تدبیریں سوچنے لگے۔

---

[1] لسان العرب ج ۱۴، ص ۳۰ - ۳۲ مادہ فحل۔

اس واقعہ کو نعت گو شاعر بوصیری (۶۰۸ - ۶۹۶) نے اپنے مشہور قصیدہ ہمزیہ میں اس طرح بیان کیا ہے[1]:

واقتضاہ النبی دین الاراشی وقد ساءبیعہ والشراء

ورای المصطفی اتاہ بما لم ینج منہ دون الوفاء النجاء

ھو ما قد رآہ من قبل لکن ما علی مثلہ یعد الخطاء

ان اشعار کا ترجمہ مع مختصر تشریح یہ ہے " نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اراشی کا قرض ابوجہل سے طلب کیا کیونکہ آپ کو یہ خرید و فروخت جس میں اراشی کا حق ضائع ہو رہا تھا پسند نہ آئی اور اس نے مصطفیٰؐ کو دیکھا کہ اس کے لیے ایک ایسا معجزہ لے کر آئے جس کی موجودگی میں قرض ادا کرنے اور حق واپس کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا یہ وہ چیز تھی جو ابوجہل نے اس سے پہلے بھی دیکھی تھی لیکن اس جیسے جاہل پر غلطیاں گنی نہیں جا سکتیں"۔

بوصیری نے جس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے مراد وہ قصہ ہے جس میں ابوجہل نے نماز کی حالت میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر پتھر پھینکنے کا ارادہ کیا تھا اور ملائکہ کی مدد سے آپؐ اس سے محفوظ رہے تھے۔ ابن ہشام نے اس قصہ میں بھی اونٹ کا تذکرہ کیا ہے[2]

بخاری و مسلم اور احادیث کی دوسری کتابوں اور تفسیروں میں اس کی تفصیل موجود ہے لیکن یہاں اختصار کے پیش نظر اس کی طرف اشارہ کرنا ہی کافی ہے ورنہ

---

[1] دیوان شرف الدین ابی عبداللہ محمد بن سعید البوصیری تحقیق محمد سید کیلانی، مطبوعہ مصطفیٰ البابی حلبی مصر ص ۵ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۳۱۹۔

دوسرا علمی و تحقیقی مضمون شروع ہو جائے گا جو کسی اور موقع پر پیش کیا جائے گا جس میں داعیان حق کو اقامت دین اور اقامت صلاۃ سے روکنے والوں کے انجام کی طرف بھی نشاندہی کی جائے گی۔

عبرت و بصیرت کے پہلو | اس مختصر واقعہ میں عبرت و بصیرت کے چند پہلوؤں کا ضمنی تذکرہ راقم قصہ کے ذکر کے دوران کر چکا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انکی طرف نمبروار بھی اشارہ کر دیا جائے تاکہ واضح طور پر یہ معلوم ہو کہ اس میں انسانیت کے لیے کیا سبق پنہاں ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ کہ کفر و ضلال اور نفرت و عداوت، تعصب و جہالت پیدا کرتے ہیں اور مسلم النبوت اخلاقی ضرورتوں اور انسانی قدروں کو بھی ختم کر دیتے ہیں، اصحاب سیر نے اس واقعہ کو اس باب کے ماتحت نقل کیا ہے جس میں کفار قریش کی ایذا رسائیوں اور رسول پاکؐ کے ساتھ تمسخر و استہزاء کا تذکرہ ہے، یہ بات کس قدر قابل عبرت ہے کہ قوم کا ایک ایماندار، دیانت دار، صادق وامین جب دین کی دعوت اور توحید کی پکار لے کر اٹھا تو اس پر ایمان لانے کے بجائے اس کی مخالفت شروع کر دی گئی اور استہزاء و ایذا رسانی کے وہ نت نئے طریقے ایجاد کیے گئے جو انسانی عقل کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں، معجزہ طلب کرنا، یا توحید کی دلیل مانگنا، یا رسالت کے حق ہونے کا ثبوت پیش کرنا وغیرہ بہرحال کسی حیثیت سے عقلی سوالات ہو سکتے ہیں مگر ہنسی ٹھٹھا کرنا، مذاق اڑانا، جسمانی اذیتیں پہنچانا اور نفسیاتی عذاب میں مبتلا کرنا، آخر اپنے اندر کیا عقلی جواز رکھتے ہیں۔

۲۔ پھر اس قصہ میں عبرتناک پہلو یہ ہے کہ کفر و ظلم کے اندھیرے میں اور

حضورؐ کی مخالفت کے جوش میں ایک مسافر اور پریشان حال کی مدد سے بھی کفار قریش نے پہلوتہی کی جب کہ یہ چیز ان کے اپنے بنائے ہوئے اخلاقی اصولوں کی رو سے ضروری تھی، بلکہ انھوں نے انسانی کرامت کا خون اس طرح کیا کہ جو واقعہ مروت و شرافت اور کرامت و حسن اخلاق کی دعوت دیتا تھا اسی کو شیطنت، مکر و فریب اور استہزاء و تمسخر کا محور بنالیا۔

۳۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ اس قصے میں پوری طرح نمایاں ہوکر سامنے آگئے، آپؐ غریبوں کے مددگار، یتیموں کے غمگسار، بیواؤں کا مداوی اور پریشان حالوں کا ماویٰ و ملجا تھے، اس قصے میں واضح طور پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ حالات کی مجبوری اور اپنی جان پر مصیبت اور تکلیف کے خطرے کے باوجود آپؐ نے اس غریب الدیار کی مدد کرنے سے پہلوتہی نہیں کی۔

۴۔ رسول پاکؐ کی شجاعت بھی اس واقعہ سے بخوبی پوری طرح آشکارا ہے۔

۵۔ رسول پاکؐ خدا کے فرستادہ تھے، اخلاق عالیہ اور شجاعت نادرہ کے ساتھ جب آپؐ نے غریب الدیار کی مدد کا ارادہ فرمایا تو آپؐ موید من اللہ ہونے کی وجہ سے خدا کی مدد کے مستحق ٹھہرے اور آپؐ کی آواز میں خدا نے وہ رعب پیدا کردیا کہ کفر و جہل کے مرکب ابوجہل کا دل کانپ اٹھا اور وہ فوراً باہر نکل آیا۔

۶۔ پھر خدا کی طرف سے رسولؐ کی تائید میں معجزہ بھی دیا گیا، یہ بات قابل غور ہے کہ رسول پاکؐ کی آواز ہی سے ابوجہل خوفزدہ ہوچکا تھا پھر معجزہ دیکھ کر اور زیادہ خائف ہوا، یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ معجزہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وقتی معجزہ جو ایک مقرر وقت پر ہوا اور چند افراد نے دیکھا، اس قصہ میں اونٹ کو نہ اراشی نے دیکھا اور نہ قریش کے نمائندہ نے دیکھا صرف ابوجہل نے دیکھا، یا جیسے معجزہ شق القمر کہ اسے اس وقت کے

کچھ موجود لوگ ہی دیکھ سکتے تھے، معجزہ کی دوسری قسم وہ ہے جو معجزہ کے ظہور کے بعد بھی باقی و دائم رہے اور تا قیامت ساری انسانیت اسے دیکھ سکے، سمجھ سکے اور اس سے ہدایت کے سبق حاصل کر سکے، جیسے قرآن عظیم کہ وہ تا قیامت حضورؐ کی رسالت پر باقی و زندہ معجزہ بھی ہے اور ہدایت انسانی کا واحد سرچشمہ بھی۔ اس قصہ میں بھی حضور انورؐ کے اخلاق عالیہ کا معجزہ اور غریب الدیار کی مدد و نصرت کا جذبہ اور بے پناہ شجاعت اور مثالی و اعلیٰ کردار اسی دوسری قسم کا معجزہ ہے جو تا قیامت انسانیت کو حسن خلق، طہارت ضمیر، شجاعت و شرافت، محبت و مروت اور رحم و کرم کا سبق سکھاتا رہے گا۔

۷۔ جو داعیان حق عصر حاضر میں توحید کا پرچم بلند کرنا چاہتے ہیں اور دعوت الی اللہ کی اسلامی و انسانی ذمہ داری کے حامل ہیں، دین الٰہی کو تمام ادیان پر غالب کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں اور اسلامی نظام زندگی کو قائم کرنا چاہتے ہیں اور قانون شریعت کے نفاذ کے لیے کوشاں ہیں ان کے لیے اس قصہ میں ایک تاریخی اور واقعاتی حقیقت کا بیان ہے، ایک اپیل یا حکم ہے اور ایک خوشخبری اور مژدہ ہے۔

(الف) تاریخی حقیقت یہ ہے کہ داعیان حق کے سردار انبیائے کرامؑ ہوتے ہیں، جب وہ دعوت حق لے کر اٹھتے ہیں تو کفر و ظلم و فسق کے نمایندے اور حزب شیطان کے کارندے ہر طرح ان کی مخالفت کرتے ہیں، ان پر ظلم ڈھاتے ہیں، ان کے ساتھ استہزا و تمسخر کرتے ہیں، ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، دھمکیاں دیتے ہیں، انکے ضمیر خریدنے کے لیے انہیں لالچ دیتے ہیں، لیکن حق کے پرستار ان تمام شاطرانہ چالوں سے صبر و عزیمت اور تدبر و حکمت سے بچتے ہوئے گذر جاتے ہیں اور آخر کار کامرانی انہیں کو نصیب ہوتی ہے، حق کی فتح ہوتی ہے اور باطل فنا ہو جاتا ہے۔

دعوت الی اللہ کا کام پھولوں کی سیج نہیں ہے، آج بھی داعیان حق کے ساتھ تمسخر کیا جائے گا، اہل کفر کے علاوہ بھی اہل نفاق و ضلال یعنی غیر اللہ کے مریدوں، طاغوت کے پجاریوں، سامراج کے فکری غلاموں، مشرق و مغرب کے ملحدانہ نظام زندگی کے دلدادوں اور علم و تحقیق کے نام پر مستشرقین یورپ اور علمائے کلیسا کے شاگردوں کی طرف سے وہ ظلم و ستم کا نشانہ بنائے جائیں گے بلکہ آج کے دور میں استہزا و تمسخر اور دروغ بیانی کے لیے پروپیگنڈے کے ہتھیار پرانے دور سے زیادہ کرتیج ہیں، اخبار رسالے، ریڈیو، ٹیلی ویژن علمی و تحقیقی ریسرچ اور نشر و اعلام کے سارے وسائل داعیان حق کے خلاف پروپیگنڈے میں استعمال کیے جائیں گے۔ لیکن اہل حق اور داعیان دین ان تمام چیزوں کو وقتی آزمائش سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے اور انہیں اس بات کی اچھی طرح خبر ہوتی ہے کہ اہل حق کے خلاف اہل کفر و ظلم و فسق کے نمائندوں اور مجرموں کے یہ قدیم ہتھکنڈے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ	بیشک وہ جو مجرم (اور گنہگار) تھے
آمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ وَاِذَا مَرُّوْا بِھِمْ	وہ اہل ایمان پر ہنستے تھے اور جب
یَتَغَامَزُوْنَ وَاِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰی اَھْلِھِمُ	ان کے پاس سے گزرتے تھے تو
انْقَلَبُوْا فَکِھِیْنَ وَاِذَا رَاَوْھُمْ قَالُوْا	آپس میں اشارے کرتے تھے اور
اِنَّ ھٰؤُلَاءِ لَضَالُّوْنَ ۔	جب اپنے گھروں کو لوٹتے تو باتیں
(مطففین: ۲۸ - ۳۲)	بناتے ہوئے خوش خوش اور جب
	ان کو دیکھتے تو کہتے بیشک یہ لوگ
	گمراہ اور بھٹکے ہوئے ہیں ۔

(ب) اس قصہ میں داعیان حق کے لیے دوسرا سبق یہ ہے کہ انبیائے کرام صلوات اللہ

علیہم اجمعین کی طرح صبر و عزیمت اور شجاعت و جرأت اور اخلاقی قدروں کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔ یہ ضروری ہے کہ داعی کی زبان اہل حق کے لیے شہد سے زیادہ شیریں ہو، داعی کا دل آغوش محبت ہو، داعی مظلوم و مجبور شخص کو اس کا حق دلانے میں سب سے آگے ہو، داعی جسم کی ہر تکلیف صبر و عزیمت سے برداشت کرے اور اپنی جان بھی قربان کرنے پر راضی ہو، داعی کا مقصد اخلاص کے ساتھ انسانیت کی فلاح و بہبود ہو، وہ مخالفوں کے استہزاء کے جواب میں خدا کی زیادہ تسبیح بیان کرے، خدا سے مدد مانگے اور زیادہ عبادت و طاعت میں مصروف ہو تاکہ نصرت خداوندی کا مستحق ٹھہرے، خدائے پاک نے رسول مصطفیٰؐ کو یہ حکم اس طرح دیا تھا:

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ الَّذِيْنَ	ہم تمہاری طرف سے کافی ہیں ٹھٹھا
يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اٰخَرَ فَسَوْفَ	کرنے والوں کے لیے جو ٹھہراتے
يَعْلَمُوْنَ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ	ہیں، اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود
يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ	سو وہ عنقریب جان لیں گے، اور
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ	تحقیق ہم جانتے ہیں کہ تمہارا سینہ
وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ	ان کی باتوں سے تنگ ہوتا ہے۔
(حجر ۹۵ - ۹۹)	(تکلیف محسوس کرتا ہے) پس تسبیح
	بیان کرو اپنے رب کی حمد کے ساتھ
	اور ہو جاؤ سجدے کرنے والوں میں
	سے اور بندگی کرو اپنے رب کی اس
	وقت تک کہ یقینی چیز (موت) آجائے۔

(ج) تیسری خوش خبری یہ ہے کہ جس طرح اس قصہ میں استہزا کرنے والوں کو عبرتناک ناکامی ہوئی اسی طرح اہل حق اگر ایمان و یقین، صبر و استقامت اور جہاد و عزیمت سے مسلح رہے تو کامیابی آخر کار انہیں کی ہوگی اور دنیا میں بھی باطل کے نمائندے اپنی ناکامی دیکھ لیں گے اور اہل حق و تقویٰ دنیا و آخرت دونوں میں خوش ہونگے۔

قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (زمر: ۱۰)	کہہ دو اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ڈرو اپنے رب سے، جنہوں نے نیکی کی اس دنیا میں ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین کشادہ ہے، بیشک پورا کیا جائے گا صبر کرنے والوں کو انکا بدلہ ان گنت۔

اور آخرت کے دن مذاق اڑانے والے مجرموں کا انجام انتہائی حسرتناک ہوگا۔

وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (زمر: ۴۷-۴۸)	اور اگر ظالموں کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے برابر (اور وہ چاہیں کہ) قیامت کے دن کے برے عذاب کے بدلے وہ فدیہ (بدلہ) میں دیدیں (تو وہ قبول نہ ہوگا) اور نظر آجائے گا ان کو اللہ کی طرف سے وہ جس کا انہیں گمان بھی نہیں تھا اور ظاہر ہو جائیں گے ان پر وہ

برے کام جو انھوں نے کیے تھے اور
گھیر لیگا انکو وہ جو وہ ٹھٹھا کرتے تھے۔

۸۔ اس قصہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کفر و ضلال اور فسق و معصیت، انسان کی عقل کو اس درجہ گمراہ کر دیتی ہے کہ وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ کس وقت اور کس جگہ مذاق و تمسخر کیا جانا درست ہے اور کس جگہ اس کی گنجایش نہیں، نادی جو عرب کی پارلیمنٹ تھی، جہاں مشکلات کے فیصلے ہوتے تھے، جہاں اکابر قریش جمع ہوتے تھے وہ جگہ یقیناً جہد وعمل اور مثبت و ایجابی کاموں کے لیے موزوں تھی، وہاں تمسخر و استہزاء اور ایسی حرکتوں کی گنجایش نہیں جن سے اس جگہ کے وقار کو ٹھیس لگے اور وہاں جمع ہونے والوں کی شخصیت بے آبرو ہو۔

عصر جاہلی کی پارلیمنٹ میں استہزاء و تمسخر کا یہ قصہ ہمیں آج ترقی کے دور کی اسمبلیوں، پارلیمنٹوں اور بین الاقوامی مجلسوں کے کارناموں کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے، اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں میں مخالفوں کے سروں پر گندے انڈے پھوڑنا، کرسیوں اور میزوں سے لڑنا جھگڑنا، ان محترم جگہوں کو سب و شتم کا اکھاڑا بنانا جہاں سے رؤسا عالی مقام اور وزرائے عالی وقار اپنے سیاسی مخالفوں پر جاسوسی کے فتوے صادر کرتے ہیں، سیاسی مخالفوں کو قتل کراتے ہیں، جیلوں میں بند کرتے ہیں، حق و عدل کی محفل کو جھوٹے پروپیگنڈے کے لیے وقف کرتے ہیں، اہل حق کو اہل ضلال ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور دین الٰہی کے خادموں، داعیوں اور قانون الٰہی کے نفاذ کی کوششیں کرنے والوں کو دنیا دار اور صرف حکومت کے طلبگار بتاتے ہیں۔ جب کہ طلبِ حکومت جو اسلامی اقدار کی حفاظت کرے بجائے خود شریعت

ہیں مرغوب بلکہ بعض اوقات واجب ہے، منصب رسالت کے بعد منصب خلافت سب سے بڑا اسلامی منصب ہے اور رسول پاکؐ نبی اور رسول ہونے کے ساتھ ساتھ خلیفہ الہی اور حاکم وقت بھی تھے اور خلافت کے فرض ہونے پر اجماع امت منعقد ہو چکا ہے اور اسلامی شریعت اور قانون کے سوا اسلامی ملکوں میں کسی بھی قانون کی حکمرانی کفر وظلم وفسق کا ثالوث ہے اور شریعت اسلامیہ کی رو سے خلافت وبیعت اور اسلامی قانون کا مطالبہ کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ پورے مسلمانوں پر امن امان کے حدود میں رہتے ہوئے واجب ہے اور اس کے لیے ساری کوششیں کرنی ضروری ہیں، ورنہ ساری امت عند اللہ گنہگار ہوگی، پھر طرفہ تماشہ یہ کہ اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں پر جو حضرات حکومت پر قبضہ جمانے کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں وہ حضرات یا تو خود حکومت حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوتے ہیں یا پھر حکومت پر قبضہ جمانے کے بعد اسے استحکام اور مرتے دم تک اپنے قبضہ سے نہ نکلنے کی جائز و ناجائز کوششوں میں مصروف اور سرگرداں نظر آتے ہیں، حالانکہ قانون اسلامی کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والے ہیں وہ صرف حکومت کے طالب ہرگز نہیں ہیں بلکہ اگر اسلامی نظام کا حقیقی اور مکمل نفاذ کوئی بھی حکومت کردے تو پھر وہ اس کے ساتھ پورا تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن اسلامی ملک میں غیر اسلامی قانون اور اقتدار جب تک موجود ہوں اور ترقی پذیر ہوں اس وقت تک وہ اپنے مطالبہ سے کس طرح دستبردار ہو سکتے ہیں اور قیامت کی جوابدہی سے کس طرح بری ہو سکتے ہیں۔

اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی مجلسوں کا یہ حال ہے کہ

حق و عدل کی آواز پر دربار کوئی کان نہیں دھرتا، مظلوموں کی آہیں اور فلک شگاف نعرے اکثر اوقات زبانی ہمدردی سے بھی محروم رہتے ہیں۔

بیسویں صدی کے یہ ایسے کارنامے ہیں جن پر جاہلی دور کے کارنامے بھی شرماتے ہیں، ان اسمبلیوں، پارلیمنٹوں اور بین الاقوامی مجلسوں کو بنیادی انسانی حقوق اصولی ابتدائی اخلاق اور پریشان حالوں کی دادرسی اور مدد وغیرہ کی تعلیمات سے آگاہ کرنا آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے کیونکہ ان مفقود اخلاقی صفات کے بغیر کوئی ملکی یا بین الاقوامی صالح معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔

سیاست و حکومت میں اعلیٰ بنیادی اخلاق پیدا کرنے کی ذمہ داری ان داعیانِ حق پر عائد ہوتی ہے جو اسلامی نظام زندگی کو اور آسمانی قانون حیات کو کامل و دائم سمجھتے ہیں اور سیاست کی باگ ڈور چاہے وہ کسی ملک کی ہو یا بین الاقوامی ہو جب تک مومن صالح، خدا سے ڈرنے والوں اور آخرت کی جوابدہی پر یقین کرنے والوں کے ہاتھ میں نہیں ہوگی اس وقت تک بین الاقوامی سیاسی و اخلاقی مزاج کے اس بگاڑ کا کوئی علاج نہیں، کیونکہ "تمکین فی الارض" کا مقصد فساد، ظلم و ستم، آمرانہ نظام کی حمایت اور انسانی اقتدار کی نمائش اور غیر اللہ کی اطاعت ہو کر رہ گیا ہے۔

لیکن جب حکومت (تمکین فی الارض) کا مقصد عدل و انصاف، احکام الٰہی کی بجا آوری، اطاعت و عبادت، مساوات و حریت (اپنے صحیح اور حقیقی معنوں میں) اور خدا کی زمین پر خدا کے قانون عبادت و سیاست و معاشرت و حکومت کا نفاذ ہوگا اس وقت تمناؤں کی صبح صادق طلوع ہوگی اور دین الٰہی کی نصرت کے ذریعہ

امت نصرت الٰہی کی مستحق ہوگی۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (حج: ۴۰-۴۱)

اور بے شک مدد کرے گا اللہ ان کی جو مدد کریں اس کی (اس کے دین کی) وہ کہ جب ہم ان کو زمین میں متمکن کریں (حکومت عطا کریں) تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور سارا ی بھلائی کا حکم دیں اور تمام برائیوں سے روکیں اور اللہ کے قبضہ ہی میں ہے تمام کاموں کا انجام۔

سلسلۂ سیرۃ النبیؐ

دارالمصنفین کے سلسلۂ سیرۃ النبی کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے بھی ہوئے۔ اس کی سات جلدوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و کمالات اور آپؐ کی تعلیم و ہدایت کو بڑی تحقیق و استناد کے ساتھ سلیس و شگفتہ زبان اور دلکش و موثر پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں اخلاق نبویؐ کا تذکرہ بھی ہے اور چھٹی جلد میں اسلام میں اخلاق کی اہمیت اور اسلامی فلسفۂ اخلاق کی تشریح کرنے کے بعد اسلامی اخلاقی تعلیمات اور فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کو تفصیل کے ساتھ بیان کرکے دکھایا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پایہ کس قدر بلند تھا۔

اس کے پورے سٹ کی قیمت ۵۸۵ روپے اور جلد ششم کی قیمت ۱۲۵ روپے ہے۔
"منیجر"

من موہن کی باتیں

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا ترجمہ قرآن مجید

از ڈاکٹر سید غیاث الدین محمد عبدالقادر ندوی

نام، ولادت و مولد | تیرہویں صدی ہجری کے مشہور و معروف عالم، محدث اور صوفی بزرگ اویس زمان حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ ملاواں ضلع ہردوئی (یوپی) کے مشہور ولی حضرت مصباح العاشقین چشتیؒ کی اولاد امجاد سے ہیں، ولادت قصبہ ملاواں میں ۱۲۰۸ھ میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد حضرت شاہ اہل اللہ لکھنویؒ کے معروف بزرگ حضرت شاہ عبدالرحمٰن الموحدؒ سے ارادت کا تعلق رکھتے تھے جنھوں نے بیٹے کی پیدائش کی بشارت دیتے ہوئے فضل رحمٰن نام رکھا جس سے تاریخ ولادت نکلتی ہے بعض لوگ نام کو فضل الرحمٰن تحریر کرتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ ال کے اضافہ سے تاریخی نام باقی نہیں رہتا۔

حصول علم و معرفت | ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا نے پہلے لکھنؤ میں مولانا نور بن انوار فرنگی محلیؒ سے شرح وقایہ اور دیگر علماء سے دوسری کتب درسیات پڑھیں اس کے بعد مرزا حسن علی محدث اور مولوی حسین احمد کے ہمراہ دہلی تشریف لے گئے جہاں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے حدیث کا درس لیا اور سند حاصل کرکے وطن واپس آگئے، اس کے بعد دوبارہ دہلی جاکر شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے حضرت شاہ اسحاق

محدث دہلویؒ کا تلمذ اختیار کیا اور صحاح ستہ کی تکمیل کی۔

ابتدائی تحصیل معرفت اپنے والد ماجد سے کی اور نو عمری ہی میں حضرت شاہ آفاق مجددی نقشبندی دہلویؒ کے خلیفہ حضرت حیدر علی سندیلویؒ سے کسب فیض کیا اور دہلی میں پہلے حضرت شاہ غلام علی نقشبندیؒ خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ سے اجازت حاصل کی اس کے بعد شاہ صاحبؒ کی ہدایت کے بموجب حضرت شاہ آفاقؒ سے براہِ راست استفادہ کیا اور اجازت و خلافت حاصل کی، شاہ صاحبؒ ان کو نہایت عزیز رکھتے تھے اور "نورِ حدیث" کے لقب سے نوازا کرتے تھے۔

گنج مرادآباد میں قیام اور سلسلۂ درس وارشاد

دہلی سے کسب علوم و معارف کے بعد وطن واپس ہو کر قصبہ گنج مرادآباد ضلع اناؤ (یو۔ پی) میں مستقل سکونت اختیار فرمائی اور یہیں درس وارشاد کا سلسلہ جاری فرمایا تا آنکہ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ کو بعمر ۱۰۵ سال خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مولانا کے خلفاء، مسترشدین اور تلامذہ میں وقت کے نامور علماء و مشائخ شامل ہیں۔ نواب صدیق حسن خاںؒ، ان کے صاحبزادگان نواب علی حسن خاںؒ اور نواب نور الحسن خاںؒ، ناظرِ اول ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، صاحب نزہۃ الخواطر مولانا سید عبدالحیٔ حسنیؒ، صدر یار جنگ نواب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ، مفسر قرآن مولانا عبدالحق حقانیؒ، مولانا شاہ بدر علیؒ، حاجی ولی لکھنویؒ، مولانا حسام الدین فضلیؒ، مولانا سید عبدالغفار آسیونیؒ نے ان سے بیعت کی اور اجازت حاصل کی۔ ان کے علاوہ جن معاصر جلیل القدر علماء و مشائخ نے مولانا سے کسب فیض کیا ہے ان میں مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ، مولانا شاہ سلیمان پھلوارویؒ، مولانا حبیب اللہ

فیض آبادیؒ (والد ماجد شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ) مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ جنھوں نے نیل المراد فی السفر الی گنج مرادآباد نامی رسالہ میں مولانا کی خدمت میں اپنی حاضری کی روداد بیان کی ہے قابلِ ذکر ہیں۔

اتباع کتاب و سنت اور قرآن مجید واحادیث سے غیر معمولی شغف

مولانا گنج مرادآبادیؒ نے اپنی پوری زندگی کتاب و سنت کا پابند رہ کر گذاری۔ بلاشبہ ان کی حیات پوری طرح اتباع سنت میں ڈوبی ہوئی تھی، ان کو یہ تک گوارا نہ تھا کہ مسنون دعاؤں کے علاوہ مشائخ سے ماثور دعاؤں یا وظائف کا التزام کیا جائے۔ ایسی دعاؤں اور وظائف کے بارے میں استفسار کیا جاتا فرماتے "حدیث میں نہیں آیا ہے"۔ قرآن حکیم سے تعلق خاطر کا یہ عالم تھا کہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

"اگر ہم کو قرآن شریف کے بدلے میں جنت ملے تو جنت لینا منظور نہیں، اگر قرآن شریف بھی ملے کچھ مضائقہ نہیں۔ ہمارے پاس جنت میں حوریں آئیں تو ان سے بھی ہم یہی کہیں گے آؤ بی بی بیٹھ جاؤ تم بھی قرآن شریف سنو"۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

"جو شخص قرآن مجید کے الفاظ اور معانی کی تحقیق اور چھان بین کرتا ہے اسکو وہ شخص جو تمام رات عبادت کرے نہیں پاتا"۔

اسی طرح مولانا کو حدیث و سنت سے نہایت شغف تھا، مولانا تھانویؒ نے نیل المراد میں ان کے درس حدیث کا ذکر خاص طور پر فرمایا ہے۔ ان کے اتباعِ سنت کا اعتراف اور اعتبار کرتے ہوئے مشہور اہلِ حدیث عالم مولانا نذیر حسین محدث دہلویؒ نے اپنے صاحبزادے کو تربیت کی خاطر ان کی خدمت میں روانہ فرمایا تھا۔ مولانا حفیظ اللہ

اعظمیؒ سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جو مسلکاً اہل حدیث تھے مولانا کی جو معیت و خدمت (؟)
اتباع سنت کے نہایت معترف تھے۔

مولانا کے نزدیک مسلکی اختلافات کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ان کی بنا پر نفرت پیدا کرنا (؟)
اور تکفیر مومنین ہرگز برداشت نہ کرتے تھے۔ ہمیشہ تقوائے قلب کو ملحوظ رکھتے رہے۔
مولانا تجمل حسین بہاریؒ نے اپنے رسالہ "کمالات رحمانی" (ص ۷۷) میں سرسید علیہ الرحمہ
کے بارے میں مولاناؒ کا یہ ملفوظ نقل کیا ہے:

"جناب مولانا مونگیریؒ نے فرمایا ایک بار حضرت قبلہ حجرہ میں بیٹھے ہوئے تھے چند
مولوی صاحبان صحن میں لڑ رہے تھے کہ سرسید روایات صحیح و متواتر کا انکار کرتا ہے
کافر ہے حضرت قبلہ حجرے سے باہر نکلے مسجد میں تشریف لائے اور مولانا مونگیریؒ سے
فرمایا یہ مولوی لوگ اس بیچارے کو کافر بناتے ہیں مگر اس کے قلب کی طرف تو دیکھو
کیسا ہے۔"

مولاناؒ اپنے درس میں ہمیشہ عام فہم زبان استعمال فرماتے تھے۔ عام فہم پوربی
زبان پر ان کو درک حاصل تھا۔ عارفانہ دوہے ان کی زبان پر رواں ہو جاتے مثلاً:

سرمہ دیوں تو کرکرا کجرا دیوں نہ جائے　　جن نینن ماں پیو بسیں دوجے کون سمائے
میں پیا کی پیا موری سجنی　　درس دکھائے کے لبھائے لیو رے

ترجمہ قرآن مجید کا عمدہ ذوق | قرآن حکیم کے الفاظ و معانی پر غور فرمایا کرتے اور عام فہم
معانی بیان فرماتے، مفسر حقانی نے ان کی خدمت میں اپنی تفسیر پیش کی انھوں نے
اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ (الغاشیہ: ۱۷) میں اَلْاِبِل کے معنی آن دریافت
کیے مولانا حقانی نے عام طور پر معروف معنی اونٹ بتائے تو مولانا نے عرض کر کے فرمایا کہ یہاں الابل کے معنی بادل کے ہیں

فیض آبادیؒ (والد ماجد شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ) مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ جنھوں نے نیل المراد فی استفرالی گنج مراد آباد نامی رسالہ میں مولانا کی خدمت میں اپنی حاضری کی روداد بیان کی ہے قابلِ ذکر ہیں۔

اتباع کتاب وسنت اور قرآن مجید واحادیث سے غیر معمولی شغف

مولانا گنج مراد آبادیؒ نے اپنی پوری زندگی کتاب وسنت کا پابند رہ کر گذاری۔ بلاشبہ ان کی حیات پوری طرح اتباع سنت میں ڈوبی ہوئی تھی، ان کو یہ تک گوارا نہ تھا کہ مسنون دعاؤں کے علاوہ مشائخ سے ماثور دعاؤں یا وظائف کا التزام کیا جائے۔ ایسی دعاؤں اور وظائف کے بارے میں استفسار کیا جاتا فرماتے "حدیث میں نہیں آیا ہے"۔ قرآن حکیم سے تعلق خاطر کا یہ عالم تھا کہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

"اگر ہم کو قرآن شریف کے بدلے میں جنت ملے تو جنت لینا منظور نہیں، اگر قرآن شریف بھی ملے کچھ مضائقہ نہیں۔ ہمارے پاس جنت میں حوریں آئیں تو ان سے بھی ہم یہی کہیں گے آؤ بی بی بیٹھ جاؤ تم بھی قرآن شریف سنو۔"

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

"جو شخص قرآن مجید کے الفاظ اور معانی کی تحقیق اور چھان بین کرتا ہے اسکو وہ شخص جو تمام رات عبادت کرے نہیں پاتا۔"

اسی طرح مولانا کو حدیث وسنت سے نہایت شغف تھا، مولانا تھانویؒ نے نیل المراد میں ان کے درس حدیث کا ذکر خاص طور پر فرمایا ہے۔ ان کے اتباعِ سنت کا اعتراف اور اعتبار کرتے ہوئے مشہور اہلِ حدیث عالم مولانا نذیر حسین محدث دہلویؒ نے اپنے صاحبزادے کو تربیت کی خاطر ان کی خدمت میں روانہ فرمایا تھا۔ مولانا حفیظ اللہ

اعظمیؒ سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جو مسلکاً اہل حدیث تھے مولانا کی [illegible]
اتباع سنت کے نہایت معترف تھے۔

مولانا کے نزدیک مسلکی اختلافات کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ان کی بنا پر تفریق بین المسلمین
اور تکفیر مومنین ہرگز برداشت نہ کرتے تھے۔ ہمیشہ تقوائے قلب کو ملحوظ رکھتے تھے۔

مولانا تجمل حسین بہاریؒ نے اپنے رسالہ "کمالات رحمانی" (ص ۱۷۷) میں سرسید علیہ الرحمہ
کے بارے میں مولاناؒ کا یہ ملفوظ نقل کیا ہے :

"جناب مولانا مونگیریؒ نے فرمایا ایک بار حضرت قبلہ حجرہ میں بیٹھے ہوئے تھے چند
مولوی صاحبان صحن میں لڑ رہے تھے کہ سرسید روایات صحیح و متواتر کا انکار کرتے ہیں
کافر ہے حضرت قبلہ حجرے سے باہر نکلے مسجد میں تشریف لائے اور مولانا مونگیریؒ سے
فرمایا یہ مولوی لوگ اس بیچارے کو کافر بناتے ہیں مگر اس کے قلب کی طرف تو دیکھو
کیسا ہے۔"

مولاناؒ اپنے درس میں ہمیشہ عام فہم زبان استعمال فرماتے تھے۔ عام فہم پوربی
زبان پر ان کو درک حاصل تھا۔ عارفانہ دوہے ان کی زبان پر رواں ہو جاتے مثلاً :

سر سے دیوں تو کر کرا کجرا دیوں نہ جائے ۔۔۔ جی نینن ماں پیو بسیں دوجے کون سمائے

میں پیا کی پیا موری سجنی ۔۔۔ درس دکھائے کے بھائے لیو رے

ترجمۂ قرآن مجید کا عمدہ ذوق | قرآن حکیم کے الفاظ و معانی پر غور فرمایا کرتے اور عام فہم
معانی بیان فرماتے، مفسر حقانی نے ان کی خدمت میں اپنی تفسیر پیش کی انھوں نے
أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (الغاشیہ : ۱۷) میں الابل کے معنی اونٹ کے دریافت
کیے۔ مولانا حقانی نے عام طور پر معروف معنی اونٹ بتائے تو مولانا نے منع کر فرمایا کہ یہاں الابل کے معنی بادل کے ہیں

لفظ جلالت اللّٰہ کا ترجمہ "من موہن" فرمایا اس سلسلہ میں قابل لحاظ ہے کہ بعض مفسرین "وَلَہٗ" سے اشتقاق بیان کرتے ہیں۔ جسکے معانی میں ایک معنی ہیں: "نہایت محبت و شیفتگی جس سے ہوش و حواس مغلوب ہو جائیں LANE نے "مدالقاموس" ARABIC ENGLISH LEXICON 8:3060 میں انگریزی ترجمہ DISTRUCTION IN LOVE لکھا ہے اور اسی طرح جلد اول صفحہ ۴۹۶ پر "حُبٌّ" کے ذیل میں محبت کے مدارج میں وَلَہٗ کا ذکر کرتے ہوئے یہی معنی تحریر کیے ہیں۔

مولانا کا ترجمہ قرآن | مختلف مجالس میں مولاناؒ نے کبھی ایک دو آیت کا کبھی چند آیات کا اور کبھی پوری سورت کا ترجمہ بیان فرمایا جس کو قلم بند کر لیا گیا اور جمع کر کے پہلی بار مولاناؒ کے خلیفہ حضرت مولانا شاہ تجمل حسین بہاریؒ کے زیر اہتمام گلشن ابراہیمی پریس لکھنو سے "قرآن مجید مترجم ہندی بھاشا اردو میں" کے زیر عنوان طبع کرایا گیا۔ راقم الحروف نے مولاناؒ کے متعدد تذکروں میں مختلف آیات کا ترجمہ دیکھا تھا لیکن اس مجموعہ کا محض نام ہی سنا تھا۔ والد ماجد مولانا سید محمد عبدالغفار ندوی نگرامی نے بتایا کہ ایک نسخہ کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تھا جس کو بہت پہلے انھوں نے دیکھا اور پڑھا تھا لیکن راقم کو بڑی جستجو کے باوجود بھی کتب خانہ میں دستیاب نہ ہو سکا، تا آنکہ ۲۲ تا ۲۶ فروری ۱۹۸۹ء خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے زیر اہتمام قرآنیات پر جنوب ایشائی علاقائی سیمینار کا انعقاد ہوا جس میں شرکت کی سعادت

حاشیہ ص ۳۴۹: [1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مقالہ زیر عنوان آیہ مذکورہ عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" ندوۃ العلماء لکھنؤ مجلد ۳۴، شمارہ ۲ مئی ۱۹۸۹ء ص ۶۶-۷۲۔

نصیب ہوئی، سمینار میں مولانا گنج مرادآبادیؒ کے ترجمہ کا بھی ذکر ہوا اور خوشخبری دی گئی کہ عنقریب لائبریری اس کو اپنے زیر اہتمام شایع کرنے جا رہی ہے چنانچہ سنہ ۱۹۹۰ء میں یہ مجموعہ شائع ہوا اور ایک عزیز کے توسط سے ایک نسخہ کے حصول کی سعادت نصیب ہوئی۔ از سر نو کتابت کے بجائے مذکورہ بالا مطبوعہ گلشن ابراہیمی پریس کا فوٹو لے کر شایع کیا گیا ہے، البتہ اس مطبوعہ میں جو اغلاط باقی رہ گئی تھیں ان کی تصحیحات آخر میں شامل کی گئی ہیں۔ ابتدا میں جناب نظر علی خاں کا جامع مقدمہ ہے۔ جس میں مولانا کے مختصر حالات زندگی اور ترجمہ کے بارے میں کچھ باتیں شامل ہیں۔

نظر علی خاں عرصہ سے سفارت خانۂ کویت برائے ہند دہلی سے وابستہ ہیں، قرآنیات ان کا خاص موضوع ہے، مخطوطات اور مطبوعات دونوں پر کام کیا ہے، مقدمہ میں ترجمہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ترجمہ صرف چند سورتوں اور چند آیات پر مشتمل ہے، ترجمۂ مذکورہ اردو رسم الخط اور دیوناگری رسم الخط (بغیر متن قرآن شریف) دونوں میں چھپ چکا ہے لیکن اب کمیاب ہے۔"

"میرے بزرگ و کرمفرما علامہ سید اخلاق حسین صاحب دہلوی نے ایک روز دوران تذکرہ ترجمۂ مذکورہ مجھ سے فرمایا کہ ہمارے ایک مخلص دوست حافظ جمیل الرحمن صاحب دہلوی ہیں، ان کے پاس یہ ترجمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب موصوف کو قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر کے مطالعے کا خصوصی ذوق عنایت فرمایا ہے، حافظ صاحب کو مختلف تراجم قرآن کی بہت سی عبارتیں حفظ ہیں، دیوناگری رسم الخط میں چھپا ہوا ترجمے کا ایک نسخہ اول و آخر سے تھوڑا ناقص

حافظ جمیل صاحب کو کسی ردی فروش کے ہاں نظر آیا، آپ نے اسے لیا اور پڑھا اور
اردو رسم الخط میں اپنی صاحبزادی زاہدہ بیگم کی مدد سے اسے نقل کیا جو آپ کے پاس
محفوظ ہے، میری طلب پر حافظ صاحب نے اردو نقل کردہ نسخہ مجھے مستعار عنایت
فرمایا جزاہ اللہ خیرالجزاء، میں نے فوٹو کاپی کرنے کے بعد آپ کا نسخہ واپس کر دیا،
اس ہندی نسخہ کا عنوان ہے "من موہن کی باتیں"۔ اس کے بعد مزید تلاش کرنے پر
خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اردو رسم الخط میں مطبوعہ نسخہ بھی بفضلہ تعالیٰ مل گیا۔"

"پوربی ہندی زبان میں یہ ترجمۂ کلام الٰہی بہت عمدہ، دل کو چھو لینے والا ترجمہ ہے کہ
اس جیسا ترجمہ ہندی زبان میں نہ اس سے پہلے کیا گیا اور نہ آئندہ شاید کیا جاسکے۔
موجودہ دور میں ہندی زبان میں قرآن کریم کے متعدد ترجمے شایع ہوئے ہیں لیکن
دل و دماغ کو متاثر کر دینے والی اور روح کو بالیدگی عطا کرنے والی جو کیفیت
اس ترجمے میں ہے وہ کسی بھی دوسرے ہندی ترجمے میں نہیں ہے۔ اس کا سبب
جناب منت اللہ صاحب رحمانی کی زبانی یہ ہے کہ "یہ ترجمہ زبان عشق میں کیا گیا ہے،
اس کو زبانوں کے پیمانے سے ناپنا درست نہیں، یہ الہامی ترجمہ منشاء و مراد آیات
قرآنی کا احاطہ کر لیتا ہے اور مفہوم آیات کی اس طرح وضاحت کرتا ہے کہ ذہن
میں پیدا ہونے والے سوالات و خدشات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں، بعض آیات کا
ترجمہ پڑھ کر وجد طاری ہو جاتا ہے"۔

" حافظ جمیل صاحب مذکور پہاڑی بھوجلہ دہلی میں مندر والی گلی میں رہتے ہیں، اس
چھوٹی سی گلی میں ایک قدیم مندر ہے جس کے نگراں ایک پنڈت جی ہیں، حافظ صاحب
نے یہ نسخہ انہیں پڑھنے کے لیے دیا تاکہ وہ مطالعہ کے بعد اپنی رائے دیں، پنڈت جی نے

اسے پڑھا اور بہت ہی محظوظ ہوئے، پنڈت جی یہ ترجمہ واپس کرنا نہیں چاہتے تھے اسلیے آپ نے واپسی میں بہت دیر لگائی ہو سکتا ہے کہ نقل کر لیا ہو، نسخے کی واپسی کے وقت پنڈت جی نے فرمایا کہ "اس میں تو بڑا ہی رس ہے" اس سادہ اور مختصر جملے سے زیادہ اور کیا تعریف ہو سکتی ہے؟"

اس مجموعہ میں سورۂ فاتحہ، سورۂ مریم، سورۂ یٰسین، سورۂ رحمٰن، سورۂ واقعہ، سورۂ تغابن، سورۂ تبارک الذی (ملک)، سورۂ دہر، سورۂ نبا، سورۂ نازعات، سورۂ عبس، سورۂ تکویر، سورۂ انفطار، سورۂ تطفیف، سورۂ انشقاق، سورۂ بروج، سورۂ فلق، سورۂ ناس کا مکمل ترجمہ اور سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ اعراف، سورۂ یوسف، سورۂ کہف، سورۂ فتح، سورۂ نجم، سورۂ انبیا، سورۂ حشر، سورۂ جمعہ کا جزوی ترجمہ اور آخر میں بعض متفرق آیات والفاظ کے معانی شامل ہیں، ساتھ ہی مولاناؒ کے بعض ملفوظات منقول ہیں ان میں ایک ملفوظ اس طرح ہے:

"حضور نے فرمایا کہ اس سے دو برس پہلے بھاشا ہندی زبان میں ترجمہ تیس پارہ قرآن کا تھا اب وہ گم ہوا۔"[1]

اسی مقام پر ایک اور ملفوظ اس طرح ہے:

---

[1] فخرالدین علی احمد کمیٹی اتر پردیش کے زیر اہتمام قومی یکجہتی کے موضوع پر ہونے والے ایک یادگاری خطبہ کی صدارت کرتے ہوئے اتر پردیش ہندی سنستھان کے سابق صدر ڈاکٹر شیو منگل سمن نے بتایا تھا کہ قرآن کریم کا سب سے پہلا ترجمہ ہندوستان میں سنسکرت زبان میں ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں راقم نے پروفیسر انصار اللہ نظر (شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) سے جن کی نظر ایسے مواد پر کافی گہری ہے استفسار کیا تو انھوں نے بتایا کہ میرے علم میں اتنا ضرور ہے کہ سورۂ فاتحہ کا سنسکرت ترجمہ ہوا تھا۔

"اگر ہندوستان میں قرآن نازل ہوتا تو اسی زبان بھاشا میں ہوتا ہم لوگوں میں بہ اعتبار فصاحت و بلاغت زبان دہلی معتبر ہے اسی طرح ہندوؤں میں یہ بھاشا زبان معتبر ہے"

ترجمے کے بعض نمونے | ذیل میں ہم اس مجموعہ اور دیگر تذکروں میں مذکور بعض الفاظ کے معنی بہ اعتبار حروف تہجی نقل کرتے ہیں۔

(الف) اِبِلٌ (بادل)، اَجْدَاثٌ (مرگھٹ)، اَجْرٌ (نیگ)، اَحْسَنُ نَدِیًّا (سندر سبھا)، اَرَائِكَ (راج چوکی)، اِسْمَاعِیْلُ (مطیع اللہ)، اَشَدُّ (کرڑا کھرا)، اَغْلَالًا (لوہے کی بھاری پاٹ)، اِلٰہٌ (ٹھاکر، مہا ٹھاکر)

(ب) بُکْرَۃً (بھوارے)

(ت) تَفَاوُت (کان)

(ج) جَنَّۃٌ (بیکنٹھ)، جَنّٰتِ عَدْنٍ (سکھ سدا کا بسیرا)، جَہَنَّمُ (نرک)

(ح) حَکِیْمٌ (سیانا)

(خ) خَتَمَ (ٹھپہ لگا دیا)

(ذ) ذِکْرٌ (کتھا، سجھوتی)

(ر) رِءْیًا (روپ سروپ)، رَبٌّ (پالتا)، رَحْمٰن (مہا داتا)، رِزْقٌ (سندر بھوگ)، رَسُوْلٌ (سندیسی بسیٹھ، مہا سدھ)، رُشْدٌ (راہ)، رَیْحَان (اچھی باس کی بھری)

(ز) زَقُّوْم (تھوڑ، سینڈ)، زکوٰۃ (سنت دان)

(س) سُبَاتًا (سکھ، بسرام)، سِجِّیْنٌ (کال کوٹھری)، سَلَامٌ (سکھ چین)، سَلْسَبِیْلٌ (سُرَس ہندی لفظ सुरस معنی: میٹھا چشمہ)

(ص) صِرَاطُ مُسْتَقِیْمٌ (سدھ پنتھ)، صَرِیْخٌ (دہائی، گہار)، صَلوٰۃ (پوجا)

صُوَر (نرسنگھا)

(ع) عَبُوسًا (کڑوا) اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰی (پکا کڑا) عَشِيًّا (سانجھ)

(غ) غَافِلُوْنَ (اچیت) غُفْرَانَكَ (پاپ دھودے) غَنِیٌّ (کڑاہ)

(ف) فُطُوْرٌ (کھونٹ) اَلْفَجْرَةُ (چھنال)

(ق) قُرْآن (دعوت کی چٹھی) قَرْنٌ (جُگ) قَوْم (جات جانت بھانت)

قَمْطَرِیْرًا (کڑا)

(ک) كِتَابٌ (پُران آکاس پاتی) كَلِمْ (بتیاں کیں) اَلْكَفَرَةُ (ملیچھ)

(ل) لَامَقْطُوْعَةٍ (اَن چکت) لَانُفَرِّقُ (ہم نہیں الگ الگ کرتے)

(م) مَابَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَاخَلْفَهُمْ (آگل پاچھل) مُبَارَكًا (بڑھتی وال بھگوان)

مُتَّقِيْنَ (بھگتوں) مُجْرِمُوْنَ (پاپیوں) مَرْيَم (عابدہ، کنواری ستونتی) مُسْرِفُوْنَ

(چنڈال) مَغْفِرَةٌ (پاپ ہرن) مُعْرِضُوْنَ (ادپر مونہہ کیے ہوئے) مَكْنُوْنٌ (رتن)

(ن) نَبِیٌّ (اوتار، مہاسدھ) نُزُلًا (نیوتا) نُطْفَةٌ (کام بوند)

(و) وَعَدَ (مہا بری کی) وَلِیٌّ (ہیت میت) وَيْلٌ (بری گت)

(ی) یٰسٓ (اے پورن جوت) يَوْمِ الدِّيْنِ (چکوتی کا دن)

اس کے بعد ہم متفرق آیات کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ بین القوسین سورہ اور آیت نمبر درج ہے:۔

(۱) بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بقرہ: ۱۱۷ و انعام ۱۰۱) — اے انوکھے بنانے والے آسمان اور زمین کے۔

(۲) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ — کہو تم اے محمدؐ! اگر تم چاہتے ہو اللہ کو

آیت	ترجمہ
فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران: ۳۱)	تو میری چال چلو کہ اللہ تم کو چاہے۔
(۳) وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا (نساء: ۶۹)	اور کیا اچھا ساتھ ہے۔
(۴) فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ (اعراف: ۱۴۳)	جب اس کا نور اجیالا ہوا (مجموعہ میں سورۂ اعراف کی چند آیات کا ترجمہ شامل ہے ان میں یہ آیت بھی ہے اور ترجمہ یوں ہے: پھر اسکے پالتا کی جوت پربت پر پڑی)
(۵) اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (رعد: ۱۱)	اللہ نہیں بدلتا ہے کسی نعمت کو یعنی کسی کی دولت کو اور سلطنت کو جو دیا ہو کسی قوم کو مگر جب کہ وہ اپنے آپ کو بگاڑ دیں۔
(۶) اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (ایضاً: ۲۸)	یاد رکھو کہ من موہن کی یاد میں دل کو آرام ہو جاتا ہے۔
(۷) اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (کہف: ۴۶)	دھن اور پوت سب سنگار ہیں دھرتی کے۔
(۸) وَکَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا (مریم: ۵۵)	اور تھا اپنے رب کا پیارا۔
(۹) اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا (طٰہٰ: ۱۰- نمل: ۷، قصص: ۲۹)	جب اس کی آہٹ پائی۔
(۱۰) غُلِبَتِ الرُّوْمُ ـــ وَہُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِہِمْ سَیَغْلِبُوْنَ (روم: ۲)	ہار گئے روم اور ہارنے کے پیچھے تھوڑے روز میں جیت جاویں گے۔
(۱۱) تَتَجَافٰی جُنُوْبُہُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ	بندے ہمارے خالی کرتے ہیں اپنے پہلو کو

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا	بچھونے سے اور پکارتے ہیں اپنے رب کو
(سجدہ ۵ : ۱۶)	از روئے خوف و طمع کے۔
(۱۲) اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ	اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں
يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (احزاب : ۵۶)	محمدؐ صاحب پر۔
(۱۳) وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ	اور جگمگا اٹھی دھرتی پالنہار کی جوت سے
بِنُوْرِ رَبِّهَا (زمر : ۶۹)	
(۱۴) لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (شوریٰ : ۱۱)	نہیں ہے مثل المثل اسکے کوئی شے۔
(۱۵) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ	اے نبیؐ! جب تیرے پاس عورتیں مرید
الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ فَبَايِعْهُنَّ	ہونے کو آویں تب تم مرید کرو اس بات
اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا	پر کہ نہ شریک کریں خدا کو کسی شے میں
وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ	اور چوری نہ کریں اور زنا نہ کریں۔
(ممتحنہ : ۱۲)	

آخر میں مجموعہ سے سورہ وار منتخب تراجم پیش خدمت ہیں :-

سورۂ فاتحہ

(۱) اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ	ہم تیرا ہی آسرا چاہتے ہیں اور تجھی کو
نَسْتَعِيْنُ (۵)	پوجتے ہیں۔

سورۂ بقرہ

(۲) اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ	جو ان دیکھے / بن دیکھے دھرم لاتے ہیں
وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ	اور پوجا کو سنوارتے ہیں اور ہمارے

يُنْفِقُوْنَ (۳)	دینے کا دان بھی کرتے ہیں۔
(۳) وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۷)	اور انکے نینوں میں موتیا بھرا ہوا ہے۔
(۴) اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (۱۶۴)	آکاش اور دھرتی کے بنانے میں اور دن رات کے ایرا پھیری
(۵) مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۲۵۵)	کون ہے جو اس کے یہاں بنا حکم کچھ کہہ سُن سکے۔
(۶) وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (ایضاً)	اس کی راج چوکی میں آکاس اور دھرتی سما رہے ہیں۔
(۷) لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (۲۵۶)	پریم مت میں کوئی دباؤ نہیں۔
(۸) وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ (۲۸۴)	چاہے کھولے کرو چاہے چھپے کرو۔
(۹) وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (ایضاً)	اور اللہ کو ہر چیز کا بوتہ ہے۔
(۱۰) لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (ایضاً)	نہ پکڑیو ہماری بھول چوک۔
(۱۱) لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (ایضاً)	نہ رکھ ہم پر وہ کہ جس کا ہم کو بوتا نہیں۔

سورۂ آل عمران

(۱۲) تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ (۲۶)

تو جسے چاہے راج گدی دے اور جسے چاہے راج چھین کے جنوئیں ٹیک دے۔

سورۂ اعراف

(۱۳) وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ (۱۴۳)

اور میں سب دھرمیوں کا پرتھم دھرمی ہوں۔

سورۂ یوسف

(۱۴) وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ (۲۳)

اور جس رانی کے نواس وہ رہتا تھا اسی نے من موہا اور دروازے بند کر بولی آؤ میں بنی ٹھنی ہوں۔

سورۂ کہف

(۱۵) إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ (۱۱۰)

میں تو تمہارا ساتھی ہوں

(۱۶) وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (ایضاً)

اور اس کی پوجا میں کسی اور کو ساجھی نہ بنائے۔

سورۂ مریم

(۱۷) وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا (۴)

اور سر میں بڑھاپا چمک آیا۔

(۱۸) وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا (ایضاً)

اور میں تجھ سے مانگ کر کبھی نراس اور ابھاگ نہیں ہوا۔

(۱۹) هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (۲۱،۹)

یہ کام ہمارے اوپر سہج ہے وہ مجھ پر

سچ ہے۔

(۲۰) فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۷)
سو ہم نے اسکے پاس مہیش سندیسی پٹھوایا تو پھر وہ پورا منو مورت بنکر اس کے سامنے آیا۔

(۲۱) قَالَتْ أَنَّى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا (۲۰)
بولی میرے مالک کون بدھ ہوگا میرے بچہ ہی کہ کسی منشی نے مجھکو چھوا تک نہیں اور نہ میں بیسیا ہوں۔

(۲۲) وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا (۲۱)
اور یہ کاج ہو نہار ہے۔

(۲۳) فَحَمَلَتْهُ فَانتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا (۲۲)
پھر وہ پیٹ سے ہوئی سو اسکو لے کر وہ دور جنگل میں چلی گئی۔

(۲۴) وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ (۲۵)
اور تو اپنے اوپر چھوہارے کے ٹھنٹھ کو ہلاؤ۔

(۲۵) لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا (۲۷)
اور تو نے بہت بڑا اچنبھے کا کام کیا۔

(۲۶) ذَالِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ (۳۴)
یہ کتھا عیسیٰ مریم کے پوت کی ہے۔

(۲۷) وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ (۴۱)
اور آکاش بانی میں تو ابراہیم کتھا سن

(۲۸) وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا (۴۲)
اور نہ تجھ سے کچھ ٹال ٹلا سکتا ہے۔

(۲۹) أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ (۴۶)
کیا تو اے ابراہیم میرے دیوتاؤں سے کتراتا ہے۔

(۳۰) وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ
جنکو تم من موہن تیاپوجتے ہو۔

(۳۱) وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (۴۹)	جس کو من موہن کہہ پوجتے ہو۔
(۳۲) وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا (۵۲)	اور کانا پھوسی کہنے کو نیڑے پاس کیا۔
(۳۳) وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا	اور اس کو ہم نے اونچے کھنڈ کا اس
(۵۷)	پر چڑھا لیا۔
(۳۴) اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۵۷)	جن پر من موہن کی دیا بھئی ہے۔
(۳۵) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ	جب ان لوگوں پر جہادآتما کے اشلوک
خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا۔	پڑھے جاتے ہیں جھوئیں پر ، ماتھا ٹیکتے
(ایضاً مقام سجدہ)	ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔
(۳۶) فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ	پھر ان کی جگہ ان کے پیچھے کپوت
اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ	ہوئے انھوں نے پوجن چھوڑ دی اور
(۵۹)	کام دیو کے پیچھے ہو لئے۔
(۳۷) وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا (۶۰)	اور وہ کچھ ستائے نہیں جائیں گے۔
(۳۸) لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا	وہاں وہ بک بک جھک جھک نہیں
(۶۲)	سنیں گے۔
(۳۹) لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا۔	سچ مچ مرگھٹ سے جیتا نکال لیا
(۶۶)	جاؤں گا۔
(۴۰) وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا	اور تم سے کوئی ۔۔۔ وہاں جانے بنا نہ
(۷۱)	رہے گا۔
(۴۱) فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا (۷۵)	جہادآتما اس کی لانبی ڈور چھوڑ دیتا ہے۔

(۴۲) تَؤُزُّهُمْ اَزًّا (۸۳)
انکو خوب ساہ شکاتے بدکاتے ہیں۔

(۴۳) وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ (۹۰)
اور دھرتی تڑک جائے۔

(۴۴) وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ
وَلَدًا (۹۲)
اور بھاداتا کو کہاں بھاتا ہے کہ کوئی
کو اپنا پوت بنا دے۔

(۴۵) لَقَدْ اَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ
عَدًّا (۹۴)
سچ اس نے سینت دھرا ہے اور
ان کی گنتی گن رکھی ہے۔

سورۂ انبیاء

(۴۶) وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ
مُغَاضِبًا (۸۷)
اور تو مچھ بھوج اوتار کی کتھا سن
جب وہ جھنجھلا کر چلے۔

(۴۷) وَاَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ (۸۹)
اور تو اچھا پوت دیون ہار ہے۔

سورۂ یٰسین

(۴۸) وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ
فِيْ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۲)
اور سب کچھ ہم نے جٹ مول پتری
میں ٹانک رکھا ہے۔

(۴۹) اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ (۶۵)
اس دن ہم انکے منہ موند دیں گے۔

(۵۰) وَلَوْ نَشَاءُ لَمَسَخْنَاهُمْ عَلٰى
مَكَانَتِهِمْ (۶۷)
اور جو ہم چاہیں ان کو جہاں تہاں
پتھرائے دیں۔

سورۂ فتح

(۵۱) كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهُ
فَاٰزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى
کھیتی کی طرح اچھی طرح جم کر لہلہائے
کر تسی سیدھی ہو ڈانٹی اسکی۔

عَلٰی سُوْقِہٖ (۲۹)

سورہ رحمٰن

(۵۲) عَلَّمَہُ الْبَیَانَ (۴) — اسکو سندر بولنا سکھایا۔

(۵۳) وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (۹) — اور تولائی میں جھونک نہ ماریو

(۵۴) رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ (۱۷) — وہی چاروں کھنٹ کا مہاراج ہے۔

(۵۵) یَسْئَلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (۲۹) — سارا سنسار اسی کے دوارے کا بھکاری ہے وہ نیس دن نرنکا ہے۔

(۵۶) یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰھُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ (۴۱) — پاپی کالے مکھڑے سے پہچان کر اینٹری چوٹی سے باندھ لیے جاویں گے۔

(۵۷) تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ — تیرے پالنہار جوت کے داتا کا بڑے شوبھا کا ناؤں ہے۔

سورہ واقعہ

(۵۸) اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (۴) — جب دھرتی میں بھاری بھونچال پڑے گا۔

(۵۹) وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (۵) — اور پہاڑ چکس چورا ہو جائیں گے۔

(۶۰) وَلَا یُصَدَّعُوْنَ عَنْھَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ (۱۹) — اس سے ان کا مونسٹر نہیں پراتا اور نہ وہ مدھ ماتے ہوتے ہیں۔

(۶۱) وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ (۲۰)
اور جی بھاتے ہوئے پھل۔

(۶۲) جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲۴)
انکی کرنی کا پھل ہے۔

(۶۳) وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنثِ الْعَظِيمِ (۴۶)
اور مہاپاپ کچھ پنے اوپر اوڑھے ہوئے تھے۔

(۶۴) أَئِذَا مِتْنَا (۴۷)
کیوں جی جب مریں گے۔

(۶۵) هَٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ (۵۶)
یہ ان کا لیوادیبے کے دن کا چارہ پانی ہے۔

(۶۶) لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا (۶۵)
جو ہم چاہیں اسکو سوکھا کردیں۔

(۶۷) لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا (۷۰)
جو ہم چاہیں اسکو کھاری کڑوا کردیں۔

سورہ حشر

(۶۸) لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ (۲۰)
نرک کے بسیاں اور بیکنٹھ باسی برابر نہیں۔

سورہ جمعہ

(۶۹) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (۹)
اے دھرمی لوگو جب شکروار کی پوجا کی پکار ہو تو من موہن کی جپا کو جھٹ چلو اور بیچ بیوپار چھوڑ دیو۔

سورہ تغابن

(۷۰) يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ
آکاش اور دھرتی کا سب کچھ

وَالْاَرْضِ (۴)	جانت ہے۔
(۱۷) وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (ایضاً)	اور من موہن من کی باتوں کا سبھی گیانی ہے۔
(۲۷) یُکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ (۹)	تو من موہن اسکے پاپ جھاڑ دیگا۔
(۳۷) وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۳)	اور دھرمیوں کو اچت ہے کہ من موہن کا بھروسہ رکھیں۔
(۴۷) اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ (۱۵)	سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ تمہاری سمپت اور پوت بکھیڑے ہیں۔

سورۂ ملک

(۵۷) ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ (۴)	پھر بار بار تو آنکھ پھرا کر دیکھ لے
(۶۷) تَکَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ (۸)	تا دُرسے پھٹی پڑتی ہے۔
(۷۷) وَاَسِرُّوْا قَوْلَکُمْ اَوِ اجْھَرُوْا بِہٖ (۱۳)	اور چاہے تم کانا پھوسی کر دیا گرجو
(۸۷) اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُکُمْ غَوْرًا (۳۰)	اگر بھور ہوتے ہی جل پانی سوکھ جاوے

سورۂ دہر

(۹۷) لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا (۱)	اس کا چرچا بھی نہ تھا۔
(۸۰) وَلَقّٰھُمْ نَضْرَۃً وَّسُرُوْرًا (۱۱)	اور انکو بہت ہریایا اور پھلیایا۔
(۸۱) لَا یَرَوْنَ فِیْھَا شَمْسًا وَّلَا زَمْھَرِیْرًا (۱۳)	نہ گھام کی گرمی اور نہ جاڑے کی سردی۔
(۸۲) اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ (۲۷)	یہ لوگ تو دنیا کا روکڑا چاہتے ہیں۔

سورۂ نبا

(۸۳) اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (۳) — جس میں وہ لوگ الٹی سیدھی ہانک رہے ہیں۔

سورۂ نازعات

(۸۴) وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا — اور پہاڑوں کی اس میں کیلیں ٹھونک دیں۔

مَنْ طَغٰی (۳۷) — پھر جس نے سر اٹھایا

مُرْسٰهَا (۴۲) — اسکا لنگر کب پڑے گا۔

سورۂ عبس

(۸۷) اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا — سچ ہم نے جھاجھم برکھا برسائی۔

(۸۸) ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۲۶) — پھر ہم نے تڑاتڑ دھرتی پھاڑی۔

سورۂ تکویر

(۸۹) وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ (۲۲) — اور تمہارا سنگاتی بولا نہیں ہے۔

سورۂ انشقاق

(۹۰) فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا (۸) — سو اس کا سہج لیکھا جوکھا کیا جائیگا۔

سورۂ بروج

(۹۱) وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ — اور من موہن ہر کوئی پر جھانکتا ہے

شَہِیْدٌ (۹)	رکھنے والا ہے۔
(۹۲) فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۱۶)	جو چاہے سو کرے ہے۔

سورۂ فلق

(۹۳) مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۲)	بسہر چیزوں کی برائی سے۔

سورۂ ناس

(۹۴) مَلِكِ النَّاسِ (۲)	لوگوں کے مہاراج
(۹۵) اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ (۵)	جو لوگوں کے جیوں میں دبدھا ڈالتا ہے۔

کتابیات

۱۔ من موہن کی باتیں (ترجمۂ آیات و سور قرآن) از مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی شایع کردہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۹۰ء

۲۔ تذکرۂ انعامات رحمٰن از مولانا سید محمد عبدالغفار ندوی نگرامی لکھنؤ ۱۹۹۳ء

۳۔ تذکرۂ اویس زمان حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بار اول لکھنؤ۔

۴۔ کمالات رحمانی از مولانا تجمل حسین بہاریؒ۔

۵۔ نیل المراد فی السفر الی گنج مرادآباد از مولانا اشرف علی تھانویؒ

۶۔ لغات القرآن اول از مولانا عبدالرشید نعمانی۔ ندوۃ المصنفین دہلی طبع پنجم ۱۹۷۶ء

۷۔ مدّ القاموس (ARBIC ENGLISH LAXICON) BY ADWARAD WI-LLIAMLANE, AES REPRINT NEW DELHI 1985

سنسکرت سے ماخوذ عربی۔ فارسی اور اردو کا ادب

از جناب رام لعل نابھوی

(۲)
مختلف کتب فارسی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مولف	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	مقام طباعت تاریخ یا پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱	امرت کنڈ								(بھوجر برہمن) نے سنسکرت کی ایک کتاب امرت کنڈ قاضی رکن الدین سمرقندی کو پیش کی۔ قاضی نے اسکا ترجمہ پہلے فارسی میں اور پھر عربی میں کیا۔ ص۳۔ کتاب بنگال کا پوتھی ادب۔ ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی AN EARLY ARABIC WORK OF MUSLIM BENGAL از قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی۔ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی
۲	اتھرون وید	حاجی ابراہیم سرہندی							دیکھیے "دربار اکبری" از محمد حسین آزاد۔ حاجی ابراہیم سرہندی نے ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کا قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے۔ (مقالات شبلی ج ۲ ص ۱۰)

نمبر	نام کتاب	نام مصنف یا مولف	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۳	لیلاوتی	فیضی							دیکھئے مقالات شبلی جلد ششم صفحہ ۱۰۰
۴	تاجک	کمال خاں گجراتی							ایضاً
۵	نل دمن	فیضی	مطبوعہ						نلدمن فیضی کتب خانہ ناصریہ میں ہے۔ سنسکرت کی جو کتابیں مہیا کی گئیں وہ نجوم۔ طب۔ بیطاری۔ سپہ گری۔ اخلاق۔ فلسفہ۔ مذہب۔ ناول اور ڈراما کے متعلق تھیں۔ دیکھئے مقالات شبلی جلد ششم صفحہ ۱۷۲۔
۶	تتوا پدیش								فارسی میں سنسکرت کی کتاب تتوا پدیش کا ترجمہ کیا گیا۔ دیکھئے مقالات گارساں جلد اول ص ۷۶۔
۷	پنچ تنتر								سو برس کے بعد منصور کو اس پہلوی (پنچ تنتر) ترجمے کا ایک نسخہ مل گیا اور اس نے اس کا ترجمہ عربی میں کرایا دسویں صدی میں اس کا ترجمہ فارسی نظم میں ہوا۔ دیکھئے تمدن ہند صفحہ ۳۳۵۔
۸	کلیلہ دمنہ کا ترجمہ انوار سہیلی	ملا حسین واعظ							دیکھئے دربار اکبری از محمد حسین آزاد
۹	اپنشد سر اکبر	دارا شکوہ							۱۰۶۷ AH میں ترجمہ ہوا۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مولف	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سنِ طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱۰	سنگھاسن بتیسی / نامۂ خرد افزا	فیضی / عبدالقادر							دیکھئے زبان و ادب بہار اردو اکاڈمی اپریل ۱۹۷۶ء صفحہ ۴۲ اور دربار اکبری صفحہ ۵۳۸۔
۱۱	راج ترنگنی	فیضی							〃 〃
۱۲	راج ترنگنی								زین العابدین کے دورِ حکومت ۱۴۲۰ - ۱۴۷۰ میں راج ترنگنی کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ دیکھئے زبان و ادب بہار اردو اکاڈمی۔ اپریل ۱۹۷۶ء صفحہ ۴۴۔
۱۳	تتر اکبر	محمد دارا شکوہ	قلمی			۷۲۰			دیکھئے نسخہ ہائے خطی کتابخانہ ندوۃ العلماء صفحہ ۷۷۰ ایران کلچرل ہاؤس نئی دہلی۔
۱۴	مثنوی نل دمن	فیضی فیاضی				۲۶۰			〃 〃 صفحہ ۴۵۹ 〃
۱۵	〃					۲۵۴			شکستہ نستعلیق 〃 〃 〃
۱۶	ترجمہ لیلاوتی	فیضی	قلمی			۹۸			نستعلیق 〃 صفحہ ۵۹ 〃
۱۷	اشٹاوکر گیتا ویدانتا	نامعلوم	〃			۷۹			فہرست خطی کتابخانہ کشمیر ایران کلچرل ہاؤس نئی دہلی صفحہ ۳۹۔
۱۸	〃	〃	〃			۲۰			〃 〃
۱۹	انوبان ستیہ	〃	〃			۱۵			نستعلیق 〃 〃 صفحہ ۵۰
۲۰	افسانۂ بکرماجیت	〃	〃			۷۰			〃 〃 〃 〃 ۱۳۲

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مولف	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۲۱	افسانہ ہائے بکرماجیت	نامعلوم	"			۸۸			فہرست خطی کتابخانہ کشمیرہ ایران کلچرل ہاؤس نئی دہلی صفحہ ۱۳۴
۲۲	"	"	"			۷۶			شکستہ " " ۱۳۳
۲۳	"	"	"			۲۲۲			" " " "
۲۴	"	"	قلمی			۱۴۵			نستعلیق " " "
۲۵	انوار سہیلی	ملا حسین واعظ	"			۳۰۷			شکستہ " " ۱۳۴ سنسکرت کتاب پنچ تنتر کا ترجمہ ہے
۲۶	"	"	"			۳۲۱			نستعلیق " " "
۲۷	داستان منظوم	نامعلوم	"			۲۲۵			" " " صفحہ ۱۳۵
۲۸	بکرماجیت داستانہا	"	"			—			" " " " ۱۳۹
۲۹	ترجمہ کتاب باراہی	عبدالعزیز شمس تھانیسری	"			۲۷۶			" نسخہ ہائے خطی فارسی بھوپال " صفحہ ۱۰، یہ سنسکرت نجوم کی کتاب کا ترجمہ ہے۔
۳۰	ترجمہ برہ جاتک در علم نجوم	کرپانات	"			—			" " " " " " " صفحہ ۲۰
۳۱	ترجمہ مانکتوہل راگ درپن	فقیراللہ	"	[illegible]		—			سنسکرت موسیقی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مولف	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۴۵	سنگھاسن بتیسی (سنسکرت سے)		قلمی			-			ترجمہ ہائے متون فارسی بہ زبانہائے پاکستانی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان صفحہ ۲۶۷۔
۴۶	طوطی نامہ (سنسکرت سے)	-	مطبوعہ		۱۳۱۳ھ ہجری حیدرآباد دکن			منظوم	'' '' '' ''
۴۷	''		''						'' '' '' ''
۴۸	''	ابن نشاطی	''		''	۳۱۷		''	'' '' '' ''
۴۹	''	سید محمد قادری	''		بمبئی	۱۲۸۴ ہجری			'' '' '' ۲۶۸
۵۰	''	ابوالفضل	قلمی			۱۰۱۱ ہجری			'' '' '' ''
۵۱	'' ترجمہ	ناشناس	''						'' '' '' ۲۶۹
۵۲	نل و دمن	فیضی	مطبوعہ		کلکتہ کانپور	۱۲۴۰ھ ۱۳۲۳ھ			'' '' '' ۲۷۸
۵۳	وکرم اروسی	شریف علی	''		لاہور				'' '' '' ۲۷۹
۵۴	انوار سہیلی	قلمی	قلمی		۹۱۰ ہجری	۹۱۰ ہجری			'' '' '' ۳۵۲
۵۵	''	''	''						ترجمہ عبدالغفور والی سوات '' ''
۵۶	''	حسین واعظ کاشفی	''		۹۱۰ ہجری	۹۱۰ ہجری ۳۲۰ ورق			فہرست مخطوطات شفیع لاہور ۲۳۱
۵۷	طوطی نامہ	ضیاء الدین	''		۱۲۴۴ ہجری	۲۰۱ ورق			نستعلیق '' ۲۶۷
۵۸	راگ مالا		''			۱۴۱ ورق			'' '' ۳۳۵
۵۹ تا ۶۱	طوطی نامہ		''						چاروں نسخے ہیں سب قلمی '' ۲۶۷
۶۲	محیط معرفت	مہاراج چندر داس	''			۲۵۷			نستعلیق '' '' '' ۶۵

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مخطوطہ مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ نام پریس	سال طباعت	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۶۳	محیط معرفت	معاراج چندداس	قلمی						نستعلیق فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی ممبئی کتب خانہ مرکز تحقیقات فارسی ایران پاکستان صفحہ ۶۷ دوسرا نسخہ
۶۴	سرّ اکبر	دارا شکوہ	"						" " " " " ۶۲
۶۵	"	"	"						" " " " " " " "
۶۶	انوار سہیلی	-	"						" " " " " ۱۰۰
۶۷	برہمن اپنشد	"	"						دیکھئے فہرست بوسیدہ کتب عربی و فارسی سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر صفحہ ۷
۶۸	سنگھاسن بکرماجیت	"				۲۴۴ / ۱۴۴ سم			دیکھئے فہرست مخطوطات و نادر مطبوعات عجائب گھر لاہور ۱۹۶۸ء صفحہ ق
۶۹	سرّ اکبر	"	"			۲۲۰	۶ ½ × ۱۰ ½		تفصیلی فہرست مخطوطات فارسیہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور ۱۹۶۳ء صفحہ ۷۰
۷۰	نل دمن	فیضی		۱۰۸۶ ہجری		۱۲۶	۴ ¾ × ۷		" " " " ۱۱۶
۷۱	گلزار رحال یا پربودھ چندرودے ایک زبان سنسکرت					۵۴	۵ ½ × ۸ ½		یہ سو سو سال پرانا نسخہ ہے " " ۱۴۲
۷۲	انوار سہیلی					۲۴۴	۸ × ۴ ½		" " " ۱۴۵
۷۳	عیار دانش اصل نسخہ سنسکرت	ابوالفضل				۲۹۴	۶ ½ × ۴		" " " ۱۴۶

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مخطوطہ مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۷۴	نل دمن	احمد سلجوری	مطبوعہ						دیکھیے یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی سرمایہ لاہور ۲۰۶
۷۵	بیتال پچیسی		〃						〃 〃 〃 〃 ۲۵۴
۷۶	سراکبر	دارا شکوہ	قلمی						فہرست مخطوطات شیرانی جلد دوم ص ۲۴۶
۷۷	بھگت مالا	سیالکوٹی	〃		۱۰۹۲ ہجری				〃 〃 〃 〃 〃 ۲۶۷
۷۸	〃		〃		۱۸۸۱ بکرمی				〃 〃 〃 〃 〃
۷۹	〃				۱۸۲۶ء				〃 〃 〃 〃 〃
۸۰	〃				—				〃 〃 〃 〃 〃
۸۱	〃				—				〃 〃 〃 〃 〃
۸۲	〃							منظوم	〃 〃 〃 〃 〃 〃
۸۳	گلزار حال ترجمہ از سنسکرت	بھوانی داس بھوانی	قلمی	۱۷۶۶ بکرم					〃 〃 〃 〃 ۲۶۹
۸۴	حکایات راجہ ہائے ہندوستان از سنگھاسن بتیسی ماخوذ		〃	۱۲۴۶ ہجری					〃 〃 〃 جلد سوئم ۴۲۱
۸۵	بکرم بتیسی ترجمہ فارسی	کنہیالال	قلمی	۱۸۸۸ ب ن ۲۴ بھادوں					〃 〃 〃 〃 ۴۱۳
۸۶	سری گنیش آئینہ ترجمہ کرم بپاک		〃						〃 〃 〃 〃 ۴۲۵
۸۷	سنگھاسن بتیسی		〃	۱۰۳۷ ہجری					〃 〃 〃 〃 ۴۲۹

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مخطوطہ مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۸۸	سنگھاسن بتیسی		قلمی	۱۲۲۶ ہجری					فہرست مخطوطات شیرانی جلد سوم ص ۴۲۹
۸۹	″								″ ″ ″ ″ ۴۲۶
۹۰	طوطی نامہ سنسکرت سے		″	۱۰۷۷ ہجری					″ ″ ″ ″ ۴۲۷
۹۱	عیار دانش ترجمہ کلیلہ و دمنہ پنچ تنتر	ابوالفضل	″	۱۶۰۲ء					″ ″ ″ ۴۳۵
۹۲	مہاتم ایکادشی ترجمہ از مکالمات کرشن و ارجن	سنسکرت	″						
۹۳	شرح نل دمن فیضی	ابوالفیض محمد	″	۱۹۱۴ بکرمی					″ ″ ″ ″ ۴۵۶
۹۴	گلزار حال سنسکرت سے	بنوالی داس	″	۱۶۲۲ء					″ ″ ″ ″ ۷۶۵
۹۵	″			۱۸۰۱ء					″ ″ ″ ″ ″
۹۶	محیط معرفت	رائے سین داس	″	۱۸۵۵ء					″ ″ ″ ″ ″
۹۷	بکرم بپاک		″						″ ″ ″ ″ ۴۷۶
۹۸	سر اکبر	دارا شکوہ	″						فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ VOL I PART I صفحہ ۱۴۱
۹۹	طوطی نامہ	ضیاء الدین	″						″ ″ ″ ۱۹۰
۱۰۰	بالا بھی ... سنسکرت سے	ادا ہ میر	″						″ ″ ″ ۲۱۰
۱۰۱	راج ترنگنی سنسکرت	کلہن	″						″ ″ ″ ۱۲۰

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱۰۲	نل دمن	فیضی	قلمی					منظوم	فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ ذخیرہ شیفتہ صفحہ ۸۱
۱۰۳	طوطی نامہ	حمیدی	"						" " " ذخیرہ احسن ۱۰۴
۱۰۴	بیتال پچیسی		"			۹۳			" " " " ۱۴۷
۱۰۵	نل دمن		"	۱۰۰۳ ہجری					" " حبیب گنج کلکشن ۱۸۹
۱۰۶	ترجمہ لیلاوتی فیضی		"						کتب خانہ معین الدولہ۔ دیکھئے "الزبیر" بہاولپور کتب خانہ نمبر گنڈا سنگھ کلکشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری
۱۰۷	نل دمن	فیضی	"	۱۲۳۷ ہجری					کتب خانہ پروفیسر محمد ایوب قادری " " "
۱۰۸	انوار سہیلی	-							" سید محمد بیداری کراچی " " "
۱۰۹	طوطی نامہ		"	۱۰۰۰ ہجری					" " " " " " "
۱۱۰	"	ضیاء الدین بخشی مولف	"	۱۲۳۱ ہجری		۲۶	۴ × ۴		" " " " ۴۷۳
۱۱۱	"	"	"	۱۱۹۹					فہرست کتب خانہ آصفیہ لائبریری حیدرآباد صفحہ ۱۲۷۸ گنڈا سنگھ کلکشن
۱۱۲	نل دمن	فیضی	"						" " " ۱۴۹۳ "
۱۱۳	پوتھی کرم بپاک		"	۱۲۴۲ھ					" " " ۱۵۳۹ "
۱۱۴	سر اکبر	دارا شکوہ	"	۱۰۶۷ھ					" " " ۱۵۴۱ "
۱۱۵	"	"	"	"					" " " " "
۱۱۶			"	۱۱۹۲ھ					" " " " "

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱۱۷	کلیلہ و دمنہ مع شرح								کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد صفحہ ۴
۱۱۸	طوطی نامہ	محمد قادری	مطبوعہ		۱۸۰۱				〃 〃 〃 ۲۲۲
۱۱۹	مفتاح القلوب ترجمہ سنگھاسن بتیسی		قلمی						〃 〃 〃 ۵۲۸
۱۲۰	قصہ بیر بکرماجیت		〃						〃 〃 〃 ۱۲۷۹
۱۲۱	وکرم اروسی	مولوی محمد عزیز	مطبوعہ		۱۹۰۷ء				〃 〃 〃
۱۲۲	کلیلہ و دمنہ مصور								الزبیر بہاولپور کتبخانہ نمبر ۵۵
۱۲۳	سر اکبر	داراشکوہ	قلمی		۱۰۵۰				کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد ص ۶۰۸
۱۲۴	〃	〃	〃		〃				〃 〃 〃
۱۲۵		〃	〃		〃				〃 〃 〃
۱۲۶	عصمت نامہ داستان نل و دمن								مرکز تحقیقات زبان و ادبیات فارسی در ہند۔ کتبخانہ نابھوی میں ہے۔
۱۲۷	رام گیتا سنسکرت کتاب	بنارسی داس							〃 〃 〃
۱۲۸	تاریخ قدیم کشمیر کلہن کشمیر سنسکرت	ملک حیدر مترجم							دیکھئے پاکستان میں فارسی ادب از بہادر شاہ یا انقراض سلطنت مسلمانان از ڈاکٹر ظہور الدین احمد
۱۲۹	راج ترنگنی	مولانا عماد الدین							〃 〃 〃 عہد جہانگیر سے عہد اورنگزیب تک 〃

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱۳۰	بیج گنت	عطاء اللہ رشیدی						منظوم	ترجمہ کا پہلا شعر ہے۔ اول زستایش الٰہی گویم پس نعت رسول او کما ہی گویم
۱۳۱	سبھا سکرا چارتہ شکنتلا کالیداس	علی اصغر حکمت							
۱۳۲	”	پروفیسر ہادی حسن علی گڑھ							
۱۳۳	نل دمن	فیضی	قلمی			۳۴۴؟	بڑا	منظوم	یہ نسخہ پنڈت راجہ رام کول کا لکھا ہوا ہے۔ نہایت خوبصورت ہے۔ یہ ذری کتاب ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی گنڈا سنگھ کلکشن میں ہے۔
۱۳۴	لیلاوتی فیضی		مطبوعہ		حسینی پریس	۴۴	”	منثور	ہریانہ سیکرٹریٹ لائبریری میں ایک کتاب میں شامل ہے۔
۱۳۵	متیا کشرا قانون سنسکرت	اللہ وردی نے پنڈت لال بہاری سے فارسی میں ترجمہ کرایا			۱۶۵۷				دیکھئے ناگری پرچارنی پتریکا بھش ۵۹ نمبر ۳-۴ سنبت ۲۰۱۱ صفحہ ۳۳۔
۱۳۶	سر اکبر	دارا شکوہ	مخطوطہ		۱۹۰۸			منثور	دیکھئے کیٹلاگ آف دی مخطوطات SECOND SUPPLEMENT ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۰۱
۱۳۷	گلزار حال	پربودھ چندر اودے کا ترجمہ مترجم بنوالی داس						”	” ” ” ” ”

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مخطوطہ مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱۵۱	لذۃ النسا	کوک شاستر ترجمہ	قلمی						دیکھئے کیٹلاگ فارسی مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ مرتبہ ۔ IVANOW ۔ صفحہ ۷۷۳ سال ۱۹۲۶
۱۵۲	"	"	"						" " " "
۱۵۳	"	"	"						" " " "
۱۵۴	ستر اکبر	ترجمہ اپنشد	"						" " ۷۷۵ "
۱۵۵	مفرح القلوب	ہت اپدیش کا ترجمہ	"						" " " "
۱۵۶	لت اچھرا	ترجمہ سنسکرت ہندولا	"						" " ۷۷۶ "
۱۵۷	مفتاح الفتح	نجوم پر سنسکرت سے کتاب	"						" " " "
۱۵۸	پوران ارتھ آکاشس	سنسکرت کتاب CHRANOLOGY سے ترجمہ	"						" " " "
۱۵۹	ترجمہ کاشو کھنڈ	ماترا کے متعلق سنسکرت سے۔	"						" ۷۷۷ " "
۱۶۰	آتم بلاس	ترجمہ ناٹک خیالات	"						" " " "
۱۶۱	آتم داس و باسکران	بشنو پنڈت	"						دیکھئے نسخہ ہائے خطی فارسی ایران کلچرل ہاؤس اسلام آباد جلد چہارم
۱۶۲	استو لکر	نصائح استاد بہ شاگرد	"						" " "

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مؤلف	مخطوطہ مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱۶۳	افسانہ بکرماجیت سنگھاسن بتیسی		قلمی						فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی ایران کلچرل ہاؤس اسلام آباد جلد چہارم
۱۶۴	اوپنشد سراکبر		〃						〃 〃 〃 〃
۱۶۵	اوم نامہ	بنوالی داس	〃						〃 〃 〃 〃
۱۶۶	بحر النجات	ترجمہ کاشی آنند گھن	〃						〃 〃 〃 〃
۱۶۷	بھگت مالا	رائے امانت رائے	〃						〃 〃 〃 صفحہ ۲۱۴۰
۱۶۸	〃	ہران بلاس	〃						〃 〃 〃 〃
۱۶۹	بھگت ساگر	رائے ہنت رام	〃						〃 〃 〃 〃
۱۷۰	بھگت مالا	نونیت رام	〃						〃 〃 〃 ۲۱۴۱
۱۷۱	〃	لچھمی رام	〃					منظوم	〃 〃 〃 〃
۱۷۲	پران بلاس ترجمہ بھگت مالا	رائے پران چند	〃						〃 〃 〃 ۲۱۴۵
۱۷۳	پوتھی بھگت اور دسن	لچھمنداس	〃						〃 〃 〃 〃
۱۷۴	بحر الحیات	انرت کھنڈ ترجمہ سنسکرت محمد غوث گوالیاری	〃						〃 〃 〃 〃
۱۷۵	تحفۃ المجالس	ترجمہ جیتل پچیسی از راج کرن	〃						〃 〃 〃 ۲۱۴۶
۱۷۶	حجت الہند	فلسفہ	〃						〃 〃 〃 ۲۱۵۲

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مؤلف	مخطوطہ مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱۷۷	داستان اشٹاوکر درام جنک		قلمی						فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی ایران کلچرل ہاؤس اسلام آباد جلد چہارم صفحہ ۲۱۵۳
۱۷۸	ستر اکبر	دارا	〃						〃 〃 〃 ۲۱۶۱
۱۷۹	بکرم بتیسی ترجمہ سنگھاسن بتیسی	کنھیالال	〃						〃 〃 〃 ۲۱۳۷
۱۸۰	سنگھاسن بتیسی	بہاری مل	〃						〃 〃 〃 ۲۱۷۰
۱۸۱	〃	میر غلام حسین	〃						〃 〃 〃 ۲۱۷۱
۱۸۲	〃	بدھ سنگھ غیرت	〃						〃 〃 〃 〃
۱۸۳	〃	-	〃						〃 〃 〃 〃
۱۸۴	〃	-	〃						〃 〃 〃 〃
۱۸۵	شاہنامہ ترجمہ سنگھاسن بتیسی	بھوگا داس	〃						〃 〃 〃 ۲۱۷۵
۱۸۶	کرم بپاک	ترجمہ از ہندی	〃						〃 〃 〃 ۲۱۷۹
۱۸۷	گلدستۂ دک	دک برہمن	〃						〃 〃 〃 〃
۱۸۸	گلزار حال ترجمہ پربودھ چندر ناٹک	بنوالی داس	〃						〃 〃 〃 〃
۱۸۹	گنجینۂ داستان سنگھاسن بتیسی	بہاری مل	〃						〃 〃 〃 ۲۱۸۱

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ یا مخطوطہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۱۹۰	مجمع البحرین	داراشکوہ	قلمی						نسخہ ہائے خطی فارسی ایران کلچرل ہاؤس ایران جلد چہارم صفحہ ۲۱۸۲
۱۹۱	محیط معرفت ترجمہ پوتھی سرودی	کرپال داس	"						" " " ۲۱۸۴
۱۹۲	مرآۃ الاداب	ترجمہ چار آ ورشس شری وت رکھسوی							" " " " ۲۱۸۵
۱۹۳	مفتاح الاکبر	سید ظفر	"						" " " " ۲۱۸۷
۱۹۴	مفرح القلوب ہتوا پدیش کا ترجمہ	مفتی الملک	"						" " " "
۱۹۵	مفید الخلائق		"						" " " ۲۱۸۹
۱۹۶	مہاتم ایکادشی	ترجمہ سنسکرت	"						فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی جلد چہارم کلچرل ہاؤس پاکستان صفحہ ۲۱۹۵
۱۹۷	نصائح استاد باشاگرد	استولکر	"						" " " " ۲۱۹۶
۱۹۸	دیاگ پرکرن	شری شبھو جی	"						" " " " ۲۱۹۸
۱۹۹	جانوروں سے متعلق کتاب	سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ							اس میں مندرجۂ ذیل ابواب ہیں۔ ۱۔ گھوڑوں کی نسل۔ ۲۔ پیدائش۔ ۳۔ اصطبل کا انتظام ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱ دانتوں سے عمر پہچاننے کے قاعدے بھی بتلائے

[illegible]	نام کتاب	نام مصنف مولف	قلمی یا چھپی	تاریخ قلمی	تاریخ طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
									گئے ہیں۔ دیکھئے قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۱۴۸۔ ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد ۱۹۳۱ء دیکھئے فہرست نسخہ قلمی سبحان اللہ اورینٹل لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ صفحہ ۴۔
۲۰۰	ترجمہ ست بھرا	مترجم لال بہاری کائستھ	قلمی	۱۲۳۵ ہجری		۱۶۹	×	×	"
۲۰۱	بحر الحیات ترجمہ امرت کنڈ	حسین گوالیاری	"			۳۸			"
۲۰۲	کشف الانوار ترجمہ آتما سیتا					۷	۷× ۲۹٫ / ۳۰		"
۲۰۳	ترجمہ لیلاوتی مؤلفہ بھاسکر چارج	شیخ ابوالفضل فیضی		۱۸۳۶ء		۱۴۴			"

(باقی)

مقالات شبلی

دارالمصنفین نے علامہ شبلیؒ کے ان مقالات کو آٹھ جلدوں میں شایع کیا جو معارف علیگڑھ دکن ریویو انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، الندوہ اور مسلم گزٹ وغیرہ میں چھپے تھے، اسکی دوسری جلد کے مضامین میں اردو ہندی۔ بھاشا زبان اور مسلمان اور تحفۃ الہند اور چھٹی جلد میں تراجم اور مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی پر مضامین بھی شامل ہیں جن کے حوالے اس مضمون میں جا بجا دیے گئے ہیں۔

مکمل سٹ کی قیمت ۲۲ روپے ہے۔

"منیجر"

رابطہ ادب اسلامی کا دو روزہ مذاکرہ

از ضیاء الدین اصلاحی

۲۲،۲۳ اپریل ۱۹۹۴ء کو رابطہ ادب اسلامی کا نواں علمی مذاکرہ "حدیث نبوی شریف کی ادبی و فنی خصوصیات" کے موضوع پر جامعہ سلفیہ، مرکزی دارالعلوم بنارس میں ہوا جس میں مختلف عصری جامعات اور عربی مدارس کے فضلاء شریک ہوئے، دارالمصنفین سے راقم کو بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

۲۲ اپریل کو افتتاحی جلسہ ۹ بجے صبح عالمی رابطہ ادب اسلامی کے بانی و صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی صدارت میں ہوا۔ اپنے مقالہ سے پہلے صدر محترم نے رابطہ کے مقاصد اور ادب اسلامی پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا جب ادب پر الحاد، ضلالت، قومیت اور عرب نیشنلزم کے تصورات چھائے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے رفقائے کار کو اسلامی افکار و نظریات کی اشاعت اور عربی ادب میں خصوصاً اور دوسری زبانوں کے ادبیات میں اسلامی عناصر کی تلاش و جستجو کی توفیق عطا فرمائی، رابطہ ادب اسلامی کے جنرل سکریٹری مولانا سید محمد رابع ندوی نے اسکی جو رپورٹ پڑھی اس سے اسکے کاموں کی وسعت و تنوع کا اندازہ ہوا، مولانا ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری کے خطبۂ استقبالیہ میں بنارس کی مرکزیت، اس کی گذشتہ علمی، تعلیمی اور تاریخی اہمیت، ہندوؤں اور بودھوں کے متبرک شہر ہونے کے علاوہ اس سے مسلمانوں کے ربط و تعلق اور یہاں ان کی سرگرمیوں نیز موضوعِ

مذاکرہ کی نوعیت واہمیت کا تذکرہ کیا گیا تھا، مولانا مختار احمد ندوی امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند پروفیسر محمد راشد ندوی (علیگڑھ) اور بعض دوسرے فضلاء نے بھی افتتاحی جلسہ میں تقریریں کیں۔

سمینار کے شرکاء نے جمعہ کی نماز مولانا مختار احمد ندوی کی اقتدا میں ادا کی، انھوں نے اپنے خطبہ میں عقائد کی اصلاح اور توحید خالص کو اختیار کرنے کی تلقین کی اور مسلمانوں کو مختلف گروہوں میں بٹ جانے اور فرقہ آرائی سے بچنے کی ھدایت کی۔

انہی کی صدارت میں سہ پہر میں مقالات کا پہلا جلسہ ہوا جس میں کئی مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر سید محمد اجتبا ندوی کا مقالہ اور مولانا سید سلمان حسینی کی تقریر خاص طور پر پسند کی گئی۔ مغرب لبعد کے جلسہ کی صدارت مولانا سعید الرحمن ندوی نے کی، اس میں مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی نے عربی اشعار اور ڈاکٹر سید محمد طفیل مدنی نے اردو اشعار سے شرکاء کو محظوظ کیا۔

دوسرے روز صبح کے وقت مقالات کے تیسرے اور چوتھے جلسے راقم اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی صدارت میں ہوئے جس میں پروفیسر محمد راشد ندوی، ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر عبد الباری (علیگڑھ) اور ڈاکٹر ظفر عالم کے مقالے پسند کئے گئے۔ مولانا سعید الرحمن ندوی کا مقالہ عربی میں ہونے کی وجہ سے قابل توجہ رہا۔ مذاکرہ کے آخری جلسہ میں مختلف مفید تجویزیں منظور کی گئیں۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی اب ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ جس کی جڑیں اس برصغیر اور عرب اور اسلامی ملکوں میں پھیل چکی ہیں۔ اور اسکے مذاکرے ہندوستان کے علاوہ کئی مسلم ملکوں میں منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ اسلئے اسکے عزائم اور منصوبوں سے علمی اور ادبی ذوق رکھنے والوں کو پوری واقفیت ہو چکی ہے لیکن موسم کی شدت اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر مذاکرہ میں حاضری کم رہی تاہم وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

معارف کی ڈاک

مکتوب کشمیر

سری نگر، کشمیر
۲۸، مارچ ۱۹۹۴ء

مخدوم و مکرم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ایک لمبی مدت تک مراسلت سے محرومی رہی جس کا بے حد قلق ہے۔ کشمیر کی موجودہ بدحالی اور ایک ہرے بھرے چمن کی تاراجی ان اسباب و وجوہ میں سے ایک ہے جنھوں نے سکوت و جمود میں مبتلا رکھا۔ معارف کے ذریعہ ضرور بالواسطہ ملاقات ہوا کرتی تھی۔ مگر جب دوسرے دفاتر اور محکمہ جات کی بربادی کے ساتھ ڈاکخانے بھی ویران ہوئے تو اس نعمت سے بھی محروم رہا۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ حضرت سلطان صلاح الدین ایوبی رح جیسے آہنی عزم و ارادے کے مجاہد اعظم کی آنکھوں سے صرف ایک مرتبہ مایوسی کے آنسو ٹپک پڑے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا تھا کہ ان کا ایک معتمد ترین رفیق صلیبیوں کے ہاتھوں بک چکا تھا۔ اس قسم کے کتنے واقعات ہیں جو آئے دن دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مگر ہر زبان مہر بلب اور ہر ہاتھ مفلوج ہے ؎

یک لحظہ بدل در شو شاید کہ تو دریابی

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ کشمیر میں مبلغ شہیر اور سفیر جلیل حضرت میر سید علی ہمدانی رح کی ندا

عالیہ اور نقوش و آثار کو ہر طرح کی گزند سے محفوظ رکھے۔

دنیا میں سرنگوں علمِ مصطفےٰ نہ ہو ہم خواہ خود ذلیل ہوں لا دنعلی ارجمند

خود اس دوران یہ حال رہا کہ چھ سات مہینوں کے دوران پانچ اموات سے سابقہ پڑا جن میں والدہ اور چھوٹی خالہ بھی شامل ہیں۔ دونوں بیک وقت بظاہر معمولی سی تکلیف میں مبتلا ہوئیں لیکن کئی کئی مہینوں تک علاج و معالجے سے یکسر محروم رہنے کی وجہ سے کینسر کی شکار بن گئیں۔ ان کے ساتھ ہی دو بہنوئی عین جوان عمری میں رخصت ہو گئے۔ خدا گواہ ہے کہ اس دوران کئی کئی بار آپ کی خدمت میں چند سطور لکھنے کا خیال تڑپاتا رہا۔ قلم بھی کئی مرتبہ ہاتھ میں تھام لیا مگر کچھ لکھے بغیر نیچے رکھتا تھا۔ دل ہی دل میں نوحہ ماتم کرتا رہا، ہزاروں نوجوانوں کی مظلومانہ موت پر، بزرگوں عورتوں اور بچوں کی اہانت و تذلیل اور کسمپرسی پر، شعائر اسلام کی کھلی پامالی پر، علم و فکر کے تنزل و انحطاط پر، اسکے ساتھ ساتھ اپنی قسمت پر۔ اجو غالب کے بقول اس قسم کی رہی

با صلیبم فتاد کار بدہر عَلَم کاویاں نمی خواہم

اچانک پرسوں پاکستان کے ایک نوجوان محقق محمد سلیم صاحب (چکوال) کا ایک خط ملا یہی خط اس تحریر کا محرک بن گیا موصوف نے اپنے مکتوب میں حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری کی فارسی تفسیر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کیلئے شاید آپ کی طرف رجوع کیا تھا اور آپ نے انہیں اس خاکسار راقم الحروف کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ایک ذرۂ بے مقدار کے تئیں آپ کے حسن ظن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے سلیم صاحب کو مفصل خط تو لکھ دیا ہے مگر سامنے اتنی رکاوٹیں کھڑی ہیں۔ کہ ان تک اس خط کا پہنچنا مجھے محال نہیں تو مشکل ضرور نظر آتا ہے۔ ان سے قبل کئی

نامور علماء اور محققین کے ساتھ میرے جوابی خطوط کا یہی حال رہا جن میں مولانا زاہد الحسینی اختر راہی اور ڈاکٹر احمد خان صاحب بھی شامل ہیں۔ اگر سلیم صاحب نے آپ کی طرف پھر رجوع کیا تو کم از کم انہیں یہ اطلاع دیجئے کہ شیخ صرفی نے فارسی میں کوئی تفسیر نہیں لکھی ہے۔ البتہ ان کے ایک سوانح نگار مفتی محمد شاہ سعادت مرحوم نے یہ ضرور لکھا ہے کہ حضرت شیخ نے شیخ یعقوب چرخی کے ایما پر پارہ عم اور سورۃ الملک کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، مفتی صاحب کی اس تحقیق کی تائید کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی ہے۔ اور نہ اس ترجمے کا کوئی نسخہ ہی دستیاب ہے۔ البتہ حضرت صرفیؒ کی عربی تفسیر "مطلب الطالبین من کلام رب العالمین" کافی مشہور ہے۔ برصغیر کے تاریخی کتب خانوں میں اسکے نسخے موجود ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ذخیرۂ حافظ محمود خاں شیرانی میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے

معارف جنوری میں استاد محترم پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب مدظلہ کے ذریعہ استاد گرامی ڈاکٹر حافظ غلام مصطفےٰ صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ خاکسار علیگڈھ کی طالب علمی کے زمانے میں حافظ صاحب مرحوم کا ادنیٰ ترین شاگرد رہا ہے۔ وہ عربی علوم آلیہ کے ایک متبحر عالم تھے۔

ثمّ انقضت تلک السنون واھلھا ٭ فکأنّھا وکأنّھم احلامٗ

اللہ تعالیٰ آرزو صاحب کا سایہ تادیر قائم رکھے۔ اپنے ایک نام بردہ رفیق کار کیلئے جب انکا مضمون پڑھا تو ان کے کریمانہ اخلاق اور عالی ظرفی کیلئے دل سے دعائیں نکلیں۔ گذشتہ تین سال کے دوران ملازمت کی ٹھوکریں بھی کھاتا رہا اور اس دوران علمی مجلات و جرائد منگوانے سے پوری طرح غافل رہا براہ کرم پھر میرے پتہ پر معارف کا اجرا فرمائیں۔

امید ہے مزاج گرامی بمع رفقائے کرام واحباب واعزہ بخیر وعافیت ہونگے۔

والسلام

محمد فاروق بخاری

مکتوب علیگڑھ

شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
یکم مئی ۱۹۹۴ء

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ادھر معارف کے اداریئے میں ہندوستان کے موجودہ حالات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ اور مسلمانوں کو درپیش سنگین مسائل کی روشنی میں انہیں مسلسل دعوت فکر وعمل دی جاتی ہے۔ اپریل ۱۹۹۴ء کے اداریے کے شروع میں خاص طور سے اس ملک کی تعمیر وترقی میں مسلمانوں کی خدمات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ آج کل ہندو تنظیموں کی جانب سے یہ بات پھیلائی جارہی ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ایک غیرملکی حکومت تھی۔ اس زمانہ کے مسلم حکمرانوں کو اس ملک کی تعمیر وترقی سے کوئی مطلب نہ تھا۔ ان کا مقصود محض مال ودولت کو سمیٹنا، قوت وطاقت کا حصول کرنا، لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا اور اپنے ہم مذہبوں کے مفاد کیلئے کام کرنا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ یہ بھی مشتہر کیا جاتا ہے کہ حکمرانوں نے رفاہ عام کے جو کام انجام دیئے ان کا فائدہ مسلمانوں تک محدود رہا۔ اس مہم کا مقصود مسلم حکمرانوں کے متعلق بدگمانی پیدا کرنا، ان کے عہد حکومت کو بدنام کرنا اور ہندوستانی مسلمانوں کی مخالفت وعداوت کا بازار گرم کرنا ہے۔ اس بنا پر مسلم عہد حکومت میں اس ملک کی تعمیر وترقی سے متعلق خدمات کو نمایاں کرنے

کی ضرورت ہے۔ معارف کے مذکورہ اداریہ میں بڑے اچھے انداز میں اس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے دیانتدارانہ وغیر جانبدارانہ مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ یہ عہد مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور تمدنی تاریخ کا ایک اہم باب ہونے کے علاوہ خود اس ملک کی سیاسی و سماجی اور علمی و تمدنی تاریخ کا بھی ایک نمایاں حصہ ہے۔ مسلمانوں کی حکومت کو غیر ملکی بتانا حقائق سے چشم پوشی اور سراسر تعصب اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔ آخر اس حقیقت کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے کہ عہد سلطنت اور عہد مغلیہ کے اولین حکمرانوں کو چھوڑ کر باقی تمام کی نشو و نما اسی سرزمین میں ہوئی اور ان سب نے بلا استثناء اس کی تعمیر و ترقی کیلئے اپنی سیاسی و انتظامی صلاحیتوں اور حکومت کے مالی وسائل کو صرف کیا۔

ہندوستان میں مسلم عہد حکومت سے متعلق آپ نے اسی اداریہ میں بجا طور پر یہ واضح کیا ہے۔ اس عہد میں ہندوؤں کو بھی آزادی حاصل رہی ہے۔ درحقیقت واقعات کی بے سیاق و سباق ترجمانی اور غلط بیانی کے ذریعے یہ بات مسلسل ذہنوں میں بٹھائی جاری ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ بدسلوکی و زیادتی ان کے مذہبی و سماجی حقوق کی پامالی اور ان کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی و مسماری مسلم حکمرانوں کی عام پالیسی رہی ہے لیکن تاریخی شواہد سے یہ امر بالکل عیاں ہے کہ مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں کے جان و مال کا تحفظ کیا ہے۔ انہیں مذہبی رسوم و روایات کی بجا آوری اور سماجی تقریبات کے انعقاد کی آزادی دی اور وہ لوگ مندروں کی تعمیر اور ان میں بلا روک ٹوک پوجا پاٹ کرتے تھے۔ آپ نے لکھا ہے :-

"چند کو چھوڑ کر ہندوستان کے تمام مسلم فرمانرواؤں نے یہاں کے باشندوں کے عقیدہ

مذہب سے تعرض کئے بغیر انہیں ہر قسم کی آزادی ہو آسایش اور سہولت بہم پہونچائی ہر ایک کے ساتھ عدل و مساوات کا برتاؤ اور ایک جیسا سلوک کیا"

پتہ نہیں چند سے مراد کون سلاطین ہیں ؟ ہوسکتا ہے بعض مسلم حکمرانوں نے سماجی اصلاح کے نقطہ نظر سے ان کی کسی رسم کو منضبط کرنے یا حکومت کے قانون کے دائرہ میں لانے کیلئے کوئی حکم جاری کیا ہو یا کوئی اقدام کیا ہو لیکن ان کے خاص مذہبی اعمال پر قدغن لگانے کا ذکر مشکل ہی سے ملیگا۔ اس زمانہ کے جو حکمران کچھ دینی رجحان و مذہبی جذبہ رکھتے تھے ان کے بارے میں خاص طور سے یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ ان کے دور میں ہندو ظلم و زیادتی کا زیادہ شکار ہوئے۔ اس سے بڑی ستم ظریفی کیا ہوگی کہ حکومت کے نظم و نسق میں شریعت کی پابندی کے رجحان اور غیر مسلموں کے ساتھ بیجا سختی کو لازم و ملزوم بنا کر پیش کیا جاتا ہے حالانکہ جو حکمران دینی رجحان رکھنے والا اور شریعت کا پابند ہوگا وہ حکومت کے نظم و نسق اور عوام کے ساتھ معاملہ کرنے میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو زیادہ پورا کرنے والا اور بلا تفریق تمام عوام کی فلاح و بہبود کا زیادہ خیال رکھنے والا ہوگا۔ اگر کسی دور میں نظم و نسق میں قانون کی سختی کا مظاہرہ کیا گیا تو اس کے اثرات بلا کسی امتیاز سب پر مترتب ہوئے۔ اس سے ریاست کے کسی خاص طبقہ کو قانون کی سختی کا نشانہ بنانا نہ تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندوؤں میں معاصر حکمرانوں کے سیاسی مخالف، باغی اور انتشار پسند عناصر بھی پائے جاتے تھے اور تاریخی کتب میں ایسے لوگوں کے خلاف حکمرانوں کے سخت اقدامات کے واقعات بھی مذکور ہیں۔ اسلئے ہندوؤں کے دونوں طبقوں میں امتیاز کیے بغیر دوسرے طبقہ کے لوگوں کے ساتھ حکمرانوں کے برتاؤ کو ذمیوں یا عام امن پسند

پہلوؤں پر منطبق کرنا لازمی طور پر بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ باتیں اصل ان حلقوں تک پہونچانے کی ہیں جو مسلم عہد حکومت کی تصویر مسخ کرنے اور مسلم حکمرانوں اور مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات بھڑکانے میں مسلسل مصروف ہیں۔ اللہ کرے ان کی کوئی سبیل نکل آئے۔

رفقاء سے سلام کہدیں۔ والسلام

مکتوب نیویارک

ظفر الاسلام اصلاحی

نیویارک

۸ر اپریل ۱۹۹۴ء

محب من جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب سلام شوق

مزاج گرامی ؟ الحمد للہ آپ کے ارسال کردہ تمام خطوط اور معارف کے گذشتہ شماروں کا ایک پیکیٹ موصول ہوگیا ہے۔ ان تمام عنایات خصوصی کے ہم دونوں یہ خاکسار اور اہلیہ خورشید سلیم شکر گزار ہیں۔ حق تعالیٰ آپ کو ہمیشہ شاداں، کامراں اور فرحاں رکھے آمین۔

معارف جنوری ۱۹۹۴ء میں جناب محمد بدیع الزماں صاحب کا مقالہ "اقبال کے کلام کی قرآنی تلمیحات کے اشاریے" کا مطالعہ کیا، طبیعت خوش ہوگئی، میں محمد بدیع الزماں صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے گذارش کرتا ہوں کہ آئندہ بھی اس قسم کے اہم موضوعات پر قلم اٹھائیں۔

ڈاکٹر کلثوم ابو البشر صدر شعبہ فارسی و اردو کا مضمون "مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) اور اردو ادب" بھی قابل ذکر ہے۔ نہایت ہی معلوماتی مضمون ہے۔ اس مقالہ کو

پڑھ کر میرے علم میں اضافہ ہوا، میں ان کا بھی شکر گذار ہوں۔

کیا ہی بہتر ہو کہ بوسینا، فلسطین اور افغانستان کی موجودہ صورت حال پر ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا جائے۔ ان ممالک کے حالات پڑھ کر کلیجہ منھ کو آتا ہے اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں، مسلمانوں کو سکون و راحت حاصل ہو، آمین۔

رسالوں کے خاص نمبرز پر تبصرے پڑھے۔ ہم جیسے دور افتادہ اشخاص کے لئے اس قسم کے تبصرے بہت ضروری ہیں۔ نئی کتب، نئے جرائد کا علم ہو جاتا ہے اور اس طرح ہم اپنی ذاتی لائبریری کیلئے اعلیٰ کتب و رسائل حاصل کر سکتے ہیں۔

عبدالوہاب خاں سلیم

مکتوب راجستھان

حمیدیہ لائبریری، اودنی کلاں

۳۰ اپریل ۱۹۹۴ء

مکرم و محترم جناب مولانا اصلاحی صاحب زادت معالیکم

مارچ کا شمارہ بکر موصول ہوا تو حسب عادت بصیرت و بصارت افروز شذرات سے اخذ فیض کیا۔ پرسوں جے پور سے ایک کرم فرما لیکچرر (ذمہ دار) آفیسر کا خط آیا۔ جس میں انہوں نے مارچ کے شذرات پر بڑی پسندیدگی ظاہر کی ہے اور لکھا ہے کہ اسے بہت پسند کیا جا رہا ہے۔

اسی شمارہ میں مولانا حسان اللہ کا مقالہ پڑھا جس میں قطب العالم سید برہان الدین ابو محمد عبداللہ بخاری کا سال رحلت ۸۶۰ھ تحریر فرمایا ہے [۱۹۱] مگر مادۂ تاریخ "مطلع یوم الترویہ" سے [۷۴۹+۵۴+۶۶] ۸۶۵ھ مستفاد ہوتا ہے یعنی آٹھ سال زاید چونکہ اہل تحقیق و ریسرچ اسکالرز معارف کی فائلوں سے استفادہ کرتے ہیں اسلئے عرض ہے کہ مادہ ہائے تاریخ کی صحت دفتر میں تقطیع کر کے ملاحظہ فرمالی جائے تو بہتر ہو۔ — والسلام

عبدالرؤف خان

ادبیات

غزل

از جناب غلام محمد صاحب میکشؔ دسوی ایڈوکیٹ

رہے گی زندگی اپنے لیے بارِ گراں کب تک ۔ رہے گا چارہ گر کا منتظر دردِ نہاں کب تک

رہے گا ہمنشینو! باغباں نامہرباں کب تک ۔ اسیرانِ قفس خاموش یہ منہ میں زباں کب تک

بنانا ہے ہمیں اس شاخ پر ہی آشیاں اپنا ۔ جلاتا ہے نشیمن دیکھیے دورِ زماں کب تک

تعجب ہے ترے گلشن میں پتے روز جھڑتے ہیں ۔ چلے گی اس طرح بے وقت یہ بادِ خزاں کب تک

کمربستہ ہو میدانِ عمل ہے منتظر تیرا ۔ دعائیں مانگ کر دیکھے گا سوئے آسماں کب تک

اسی کا نام ہے کیا بس نظامِ گلشنِ ہستی
ہمیں اے باغباں یہ وعدۂ حفظ واماں کب تک

غزل

از جناب مقصود اللہ مقصود بڑودہ

رگ جاں میں جو [illegible] وفا ہے تہ غم کی دل میں چبھن رہے ؎ یونہی شکلِ خلد ہرا بھرا مری حسرتوں کا چمن رہے

شب و روز اکثر و بیشتر ترے ذکر سے رہے تر بہ تر ؎ یہ زبانِ خشک بھی جب تلک بہ کنارِ کام و دہن رہے

یہ شعاعِ مہرِ غمِ جہاں جو ہو جاں گداز تو مہرباں ؎ مرے سر پہ اس کڑی دھوپ میں تری یاد سایہ فگن رہے

ہو وفورِ شوق سے سینہ شق کہ ہو ختم میری فنا کی حق ؎ مرے اختیار میں جاں رہے نہ تو بس میں جسم و بدن رہے

میں ہوائے عنبر و مشک سے رکھوں پاک صحنِ خیال کو ؎ جو رہِ حیات میں رو برو تری قربتوں کا ختن رہے

یہی کلکِ دل کی ہے آرزو کہ بیانِ وصفِ حبیب میں
بہ نشاطِ احترام و وقار سے یوں ہی محوِ مشقِ سخن رہے

مطبوعات جدیدہ

اُردو پر فارسی کے لسانی اثرات، تصرف کے آئینہ میں از ڈاکٹر عصمت جاوید، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۳۶، قیمت ۵۵ روپے، پتہ: ۱۰۲۲۔۲۷، پھولن کباڑی پورہ اورنگ آباد، مہاراشٹر۔

یہ قابل قدر کتاب دراصل فاضل مصنف کے اس تحقیقی مقالہ کی تلخیص ہے جس پر قریباً ۲۰ برس پہلے ان کو پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی گئی تھی، اردو میں عربی، فارسی اور دوسری زبانوں کے دخیل الفاظ اور ان کی صوتی، صرفی اور معنوی تبدیلیوں کی تاریخ، علم لسانیات کا دلچسپ موضوع ہے، اس پر بہت لکھا جا چکا ہے، اس سلسلہ کی اہم تحریروں کا جائزہ لے کر فاضل مولف نے دکھایا ہے کہ اردو کی زبردست قوت تصرف اب مزید وسعت و تفصیل کی متقاضی ہے، انھوں نے محنت و کاوش اور دقت نظر سے پوری بحث کا احاطہ کر کے اشتقاقی اور تصریفی لاحقوں اور مشتقات و مرکبات کے فرق کو واضح کیا ہے اور الفاظ کی درجہ بندی کر کے ان کے معنوی تصرفات و تغیرات بیان کیے ہیں، اس سلسلہ میں اردو کے ہندوی مزاج کی خصوصیات واضح کر کے بتایا ہے کہ گو فارسی اسماء و صفات اس میں بکثرت رواج پا چکے ہیں تاہم جن الفاظ کا تعلق بنیادی اسماء، افعال اور شخصی ضمائر و حروف سے ہے وہ اردو میں بہت کم مروج ہیں، اس کے صرف بالائی ڈھانچہ کی تعمیر میں ایرانی مسالہ سے کام لیا گیا ہے، یہ بحث تحقیق سے لکھی گئی ہے اور دلچسپ ہے، کتاب کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ اثنائے بحث میں اردو پر کیے جانے والے بعض اعتراضات کا

جواب بھی اس میں آگیا ہے، مثلاً اس پر فارسی زبان کے اثر کے سلسلہ میں بتایا ہے کہ یہ کسی سازش اور منظم تحریک کے بجائے مخصوص تہذیبی حالات کا نتیجہ ہے، جن اردو فارسی مرکبات کے آخر میں فارسی امر ترکیبی مستعمل ہیں جیسے داز، باز، پوش، بند، بردار، فروش اور گیر وغیرہ ان کو عام طور سے لاحقوں سے تعبیر کیا گیا ہے، فاضل محقق نے اس کو غلط قرار دیا ہے، ایک جگہ ایسے عربی اور فارسی الفاظ کی فہرست دی گئی ہے جن کا پہلا حرف مفتوح بتایا ہے لیکن اردو میں وہ عموماً بالکسر مستعمل ہیں، ان میں لفظ شہاب بھی ہے جو ان کے نزدیک اصل عربی میں بفتح اول ہے حالانکہ یہ عربی میں بالکسر ہی ہے اور قرآن مجید میں بھی بالکسر ہی آیا ہے۔ ادب و لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

الانصار

از ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتحپوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۰، قیمت ۶۵ روپے، پتہ: ۱۳۰۔ مہاجری، فتحپور یوپی۔

اردو میں نعت گوئی کے مبارک موضوع پر دو مفید کتابوں کے بعد اب لائق مولف نے آنحضورؐ کے بے مثال فدائیوں اور جاں نثاروں انصارؓ کے گروہ کی تاریخ، انکے حسب نسب اور مناقب و خصوصیات کو بیان کیا ہے، شعرائے انصارؓ کی نعت گوئی اور بعض ممتاز انصاری صحابیات کے واقعات بھی دلکش اور موثر پیرایہ میں نقل کیے گئے ہیں، مصنف نے اس کتاب کی تالیف کا محرک موجودہ دور میں ہندوستان کے انصاریوں کے متعلق بعض نامحمود باتوں کے رواج پانے، انکے پیشہ نوربافی کے بارے میں حقارت کے تصور اور سماجی زندگی میں ان کے

استخفاف کے غیر دینی اور غیر انسانی معاملہ کو بتایا ہے' ان کے خیال میں لفظ جولاہہ کا تعلق قبیلہ خزرج کے جلاح کے خانوادہ سے ہے جو عزم و شجاعت اور عزت نفس کے لیے مشہور تھا، چھٹی صدی ہجری تک یہ لفظ عزت و شرف کا مظہر تھا چنانچہ خاقانی نے اسی لفظ سے اپنی نسبت پر فخر کیا تھا، لیکن انصار سے دیرینہ عداوت کی وجہ سے سبائی طاقتوں نے ان کی تحقیر و تذلیل کی سازش کی اور آٹھویں صدی ہجری میں اس لفظ کا تعلق نسب کے بجائے پیشہ سے ہوگیا، بہتر ہوتا کہ اس خیال کی تائید و وضاحت مستند حوالوں سے اسی طرح کردی جاتی جس طرح لائق مولف نے غزوۂ بدر میں عتبہ و شیبہ کی مبارزت طلبی کے واقعہ کی غلط ترجمانی واضح کی ہے' اس کو بھی مدلل طور پر ثابت کرنے کی ضرورت تھی کہ کیا ہندوستان کی موجودہ انصاری برادری کا تعلق واقعتاً انصار مدینہ سے ہے۔ ایک جگہ نوربافی کے پیشہ کو اختیار کرنے کی وجہ سیاسی چپقلش سے گریز اور دوری بتائی گئی ہے' لیکن اس کی کوئی مضبوط دلیل پیش نہیں کی گئی ہے صفحہ پر ایک اقتباس' الفاظ کے معنوی تغیرات کے متعلق ہے وہ بھی بلا حوالہ ہے۔ ایک جگہ موروثوں کا لفظ غلط استعمال ہوا ہے، حضرت قیس رضی کی صفات میں ہوشیاری کے علاوہ چالاکی کا مذموم لفظ بھی لکھا ہے جو ایک صحابی کے شایان شان نہیں' المدینہ خیر من المکہ میں نقل عبارت کی غلطی ظاہر ہے۔

انوار نظر از منشی نوبت رائے نظر، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت' مجلد مع گرد پوش' صفحات ۲۰۲' قیمت ۱۹ روپے' پتہ: اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ۔ یوپی۔

منشی نوبت رائے نظر اردو کے مشہور ادیب اور ممتاز صحافی تھے' اہل نظر

ان کے رسالہ خدنگ نظر کے قدرشناس تھے، شعر گوئی میں بھی وہ بہت ممتاز تھے ۱۹۲۳ء میں ان کے انتقال کے بعد زمانہ کے اڈیٹر منشی دیانرائن نگم نے ان کے مجموعۂ کلام کی ترتیب و اشاعت کے خیال سے اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا جس میں انکے شعری محاسن کو اس خوبی سے روشن کیا کہ اس سے انوار نظر کی تجلیاں اور خیرہ کن ہوگئیں، مگر بعض حالات کے سبب یہ مجموعہ اور مقدمہ دونوں وقت کے غبار میں چھپے رہے اور چھپ نہ سکے، خوش قسمتی سے اردو اکیڈمی کے سابق سکریٹری جناب صباح الدین عمر مرحوم نے اسکے مسودہ کو حاصل کیا اور پھر بڑی نفاست اور سلیقہ سے مرتب کرکے اکاڈمی سے اس کو شایع کرایا مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ قصیدے اور نظمیں بھی ہیں، ایک نظم جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے حال پر ۱۹۰۹ء میں کہی گئی تھی، جناب نظر ایک پختہ مشق شاعر تھے، انکے شاعرانہ کمالات و خصوصیات کا بخوبی اندازہ اس مجموعہ کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

نوائے فطرت از جناب محمد فضل الرحمٰن، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت بہتر، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۰، قیمت ۱۰ روپے، پتہ: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کلا بھون، سیف آباد، حیدرآباد ۴۰۰۰۰۵۔

زیر نظر مجموعہ اشعار شاعر کے متعدد شعری مجموعوں کا انتخاب ہے، ان میں طبع زاد نظموں کے علاوہ متعدد انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے بھی شامل ہیں جن سے صاحب کلام کی شعر گوئی کی اچھی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، عصری ماحول کی صدائے بازگشت کے علاوہ نظموں میں عقل و فلسفہ کی وہی چنگاریاں ملتی ہیں جن سے شاعر مشرق علامہ اقبال کا کلام روشن ہے مثلاً ایک نظم کے یہ اشعار:

حسن جانِ زندگی ہے عشق ارمانِ حیات　　سازِ ہستی حسن سوزِ عشق سامانِ حیات

حسن روحِ گلستاں ہے حسن باغِ بے خزاں　　عشق کے دم سے ہے دنیا میں بہار جاوداں

اور آدم و حوا اور فرشتہ و شیطان کے مکالموں پر مشتمل ایک طویل نظم "نیا انسان" ذہن کو ابلیس کی مجلس شوریٰ کی جانب منعطف کر دیتی ہے۔

ع۔ ص۔

جلد ۱۵۴ ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۹۴ء عدد ۶

مضامین

شذرات

آزادی کے بعد مختلف تعمیری وفلاحی منصوبے تشکیل دیے گئے، جن سے ملک میں خوشحالی اور مادی ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں اور اس نے سائنس وٹکنالوجی میں برتری حاصل کی لیکن اجتماعی واخلاقی زندگی کا شیرازہ بکھرتا جارہا ہے، اعمال وکردار میں بڑا پستی آتی جارہی ہے، زندگی کے تمام شعبوں میں لوٹ کھسوٹ بڑھتا جارہا ہے، شرافت، دیانت، حق، انصاف اور اصول پسندی کا نام ونشان مٹتا جارہا ہے، ہر طرف خود غرضی اور غیر ذمہ داری وبائی بیماریوں کی طرح پھیلتی جارہی ہیں، جن لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور آئی انھوں نے سیاست وحکومت کو خدمت کے بجائے زر اندوزی اور جلب منفعت کا وسیلہ بنالیا، ارباب سیاست ہی پر موقوف نہیں ہے ملی ومذہبی رہنماؤں میں بھی اخلاص، بے غرضی اور اعلیٰ وبرتر مقصد زندگی کا تصور مفقود ہوگیا ہے ۔

خانۂ شرع خرابست کہ ارباب صلاح در عمارت گری گنبد دستار خود اند

آزادی سے پہلے محکمۂ تعلیم کا حال بہتر تھا، اس سے وابستہ لوگوں کو معزز وبرتر خیال کیا جاتا تھا اور وہ سوسائٹی میں بہت باوقار اور قابل احترام سمجھے جاتے تھے، درسگاہوں کی پاکیزہ خوشگوار [illegible] فضا میں جو لائق وقابل افراد تیار ہوتے تھے وہ آیندہ ملک معمار اور قوم کے راہبر ہوتے تھے لیکن اب ان میں بھی ہر طرح کے مفاسد آگئے ہیں اور یہ داخلوں اور امتحانات کی بے ضابطگی اور دھاندلی سے لیکر جعلی ڈگریاں فراہم کرنے کے اڈے بن گئے ہیں، اچھے لائق اور ہونہار طلبہ پر نالائق طلبہ کو ترجیح دی جاتی ہے، اساتذہ کی علمی وتعلیمی استعداد اور اخلاقی سطح بہت گرگئی ہے، علمی وتعلیمی ذوق نہ رکھنے کے باوجود وہ اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر اس منصب پر فائز ہوگئے ہیں، تعلیم کا مقصد لائق وقابل افراد [illegible] اور اچھے

انسان بنانا نہیں رہا، تعلیمی اداروں میں جرائم پیشہ لوگ پرورش پا رہے ہیں مسلمانوں کے زیر انتظام درسگاہوں کا حال بھی کم و بیش ایسا ہی ہے ان کی بہتم بالشان دانشگاہ علی گڑھ کی تصویر طلبہ اساتذہ اور انتظامیہ نے نہایت بدنما کر دی ہے عربی مدارس اسلام کے قلعے تھے اور یہاں ہر کام خالصاً لوجہ اللہ ہوتا تھا اب وہ علمی جاہ و منفعت کے حصول کے وسیلے بن گئے ہیں ہر درسگاہ میں دو متحارب گروہوں کی چپقلش انہیں مقدمہ بازی سے کم پر راضی نہیں ہونے دیتی، اسلام کے قلعے اسکی صداقت وحقانیت کے بجائے اسکی رسوائی و جگ ہنسائی کا سامان بن گئے ہیں۔

اس علمی و تعلیمی تنزل کو ختم کرنے اور اخلاقی بحران سے ملک کو نکالنے کا کام مسلمان ہی انجام دے سکتے تھے جن کا توحید و آخرت پر ایمان ہے اور جنھوں نے اپنے رسول عربی ؐ کی تعلیم "مہد سے لحد تک علم حاصل کرو" پر عمل پیرا ہو کر علم و فن کو عروج و ارتقا کی آخری حد پر پہنچا دیا تھا ان کی تحقیق و دریافت نے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور سیرت و کردار کی بلندی کے معترف انکے دشمن بھی تھے، جن کا وجود دنیا کے لیے باعث خیر و برکت تھا اور جو خلق خدا کو حق کی گواہی دینے کے لیے مامور کیے گئے تھے مگر یہ عجیب انقلاب روزگار ہے کہ اب وہ در بدر کی ٹھوکر کھا رہے ہیں، نہ ان میں کوئی خوبی و صلاحیت ہے اور نہ سیرت و کردار کا جوہر، وہ امانت، دیانت، راستبازی اور حق پسندی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، ان کا ماحول، ان کے ادارے اور ان کی تعلیم گاہیں بے روح اور شورشوں کی آماجگاہ ہو گئی ہیں، نہ توحید کی امانت ان کے سینوں میں رہی اور نہ آخرت پر ایمان۔ جو خود گم کردہ راہ ہو وہ دوسروں کی رہبری کیا کرے گا اور کس طرح انہیں تعلیمی و اخلاقی بحران سے نکالے گا، اگر مسلمان اپنی حقیقت پہچان لیتے تو اپنا اور ساری دنیا کا بھلا کرتے

؎ معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

اترپردیش میں اقلیتوں اور پس ماندہ طبقوں کی تائید وحمایت سے بننے والی سماج وادی اور بہوجن سماج پارٹی کی حکومت کی عمر زیادہ نہیں ہے اور اس قلیل عرصہ میں اسے بہت ناساعد حالات سے گزرنا پڑا، رجعت پسند اور فرقہ پرست جماعتوں اور ان لوگوں کو جو کمزوروں اور مظلوموں کا استحصال کرتے رہے ہیں، یہ حکومت ایک آنکھ نہیں بھارہی ہے وہ اس کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کر رہے ہیں اور اسے گرا دینے کا موقع اور بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں تاہم ابھی تک یہ اپنے وجود کو باقی رکھے ہوئے ہے بلکہ اس نے گوناگوں دقتوں اور مشکلات کے باوجود اپنے اہم انتخابی وعدوں کو پورا کرنے کے لیے اقدامات بھی شروع کر دیے ہیں، ضمنی انتخابات کے نتائج نے بھی حکومت کی اچھی کارکردگی اور عوامی مقبولیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

اترپردیش حکومت نے عام لوگوں کی راحت رسانی کے لیے بعض اقدامات کیے ہیں، امن فورس کا قیام، اسکولوں میں اردو ٹیچروں اور سرکاری دفتروں میں اردو مترجمین مقرر کیے جانے کا فیصلہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس کی بنا پر اقلیت نوازی کا الزام لگا کر وزیر اعلیٰ کے خلاف ناحق پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے، امن وامان کا قیام کسی حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے اور اردو کی تعمیر وتشکیل میں ہندو مسلمانوں نے مل کر حصہ لیا تھا اور وہ اس ملک کا قیمتی سرمایہ اور گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ ہے، اسے اس کا جائز اور جمہوری حق دینا مراعات نہیں ہے بلکہ انصاف کا تقاضا ہے، پچھلے تجربات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ان فیصلوں کے نفاذ میں بڑی دشواریاں حائل ہوں گی، اردو والوں کا فرض ہے کہ انہیں دور کرکے اس موقع سے فائدہ اٹھائیں، مسلم جماعتوں کو بھی اپنے ہنگامہ واحتجاج پسند مزاج کو تبدیل کرکے ان فیصلوں کے نفاذ میں اپنی توانائیاں صرف کرنی چاہیے۔

مقالات

رسول اکرمؐ کی فصاحت و بلاغت اور آپؐ کے بعض مؤثر اسلوب
صحیح بخاری کی بعض احادیث کی روشنی میں[1]

از ضیاء الدین اصلاحی

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پیغام و ہدایت دے کر دنیا میں بھیجا تھا، آپؐ نے عرب و عجم، اسود و احمر اور آبی و خاکی سب کو خدا کا یہ پیغام واضح اور دو ٹوک انداز میں پہنچا دیا۔ جیسا کہ آپؐ نے فرمایا:۔

الا هل بلغت، اللهم اشهد، فليبلغ الشاهد الغائب

آپؐ کا یہ پیغام حق و صداقت پر مبنی تھا، سچائی میں خود یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیتی اور ان سے اپنا لوہا منوا لیتی ہے، اسی لیے آپؐ کے شدید مخالفین کو بھی بالآخر حق و صداقت کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا، لیکن صداقت ہی کی طرح اسے پیش کرنے کے انداز اور طریقہ کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ صحیح اور سچی بات بھی اگر بدنما طریقہ پر کہی اور پیش کی جائے تو وہ بے اثر اور بے وزن ہو جاتی ہے اور اس کی جانب سے طبیعتوں میں انقباض اور بیزاری پیدا ہو جاتی ہے اور

---

[1] یہ مضمون "حدیث نبوی شریف کی ادبی و فنی خصوصیات" پر رابطہ ادب اسلامی کے سیمینار منعقدہ ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی موجودگی میں جامعہ سلفیہ بنارس میں پڑھا گیا، اب کسی قدر اضافہ کے بعد اسے معارف میں شائع کیا جاتا ہے۔ (ض)

لوگ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، بلند مضمون اور برتر خیال اگر دلکش اسلوب اور موثر پیرایۂ بیان میں ادا نہ کیا جائے تو وہ بے کیف اور لذت و اثر سے خالی رہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زبان و بیان پر مکمل قدرت تھی اور آپؐ اپنے مافی الضمیر کو خوبصورت الفاظ میں عمدہ طریقے پر پیش کرتے تھے۔ آپؐ کی پرورش قبیلہ بنو سعد میں ہوئی تھی جو اپنی زبان کی صحت و فصاحت کے لیے مشہور تھا اور آپؐ کا تعلق قریش کے خاندان اور بنو عبد مناف کے گھرانے سے تھا جو زبان دانی اور فصاحت و بلاغت میں سب سے ممتاز تھے۔

عرب کے قبائل کے لغات مختلف تھے، ان کے اسالیب اور لہجے جدا تھے لیکن خدا نے پیغمبر آخر الزماںؐ کو تمام لغات اور لہجوں سے واقف کر دیا تھا چنانچہ آپؐ ہر ہر قبیلہ سے اس کے مخصوص لب و لہجہ میں منفرد انداز میں نہ صرف گفتگو فرماتے تھے بلکہ فصاحت اور الفاظ کے صحیح انتخاب اور برمحل استعمال اور عبارت کی وضاحت میں سب پر فائق رہتے تھے۔ اس سلسلہ کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپؐ پر قرآن مجید نازل ہوا تھا جس سے زیادہ فصیح و بلیغ کلام کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اس کی زبان و اسلوب اور طرز ادا کا اثر بھی آپؐ کے کلام پر پڑا تھا، ان واضح اسباب کے علاوہ فصاحت، بلاغت اور زبان دانی کا ملکہ آپؐ میں فطری اور خداداد تھا چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:-

ادبنی ربی فاحسن تادیبی[1] — میرے خداوند نے مجھے اچھی طرح سکھایا۔

آپؐ سے یہ بھی منقول ہے کہ:

انا افصح العرب — میں فصیح ترین عرب ہوں۔

---

[1] ابن السمعانی فی ادب الاملاء عن ابن مسعود بحوالہ الجامع الصغیر للسیوطی جلد اول ص۲۲۔

آپؐ کو خدا نے جوامع الکلم عطا کیا تھا۔

بُعثت بجوامع الکلم[1] میں جامع کلمات دیکر بھیجا گیا ہوں۔

اس لیے آپؐ کی فصاحت و بلاغت مسلم ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

فصیح کلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ، سلیس، آسان اور سریع الفہم ہوتا ہے، سُننے والے کو اسے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، اس کے الفاظ نہ خشک، ثقیل اور نامانوس ہوتے ہیں اور نہ بولنے والے کو اس کے ادا کرنے میں دشواری ہوتی ہے، سُننے والے کو بھی یہ ناگوار نہیں معلوم ہوتے، یعنی وہ کلام صوتی و سماعی تنافر سے پاک ہوتا ہے، اس کی عبارت اور ترکیب میں اغلاق، تعقید اور پیچیدگی نہیں ہوتی اسی لیے حضرت موسیٰؑ نے خدا سے دعا کی تھی۔

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي	اے میرے رب میرے سینے کو میرے
أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي	لیے کھول دے اور میری مہم کو آسان
يَفْقَهُوا قَوْلِي	کر اور میری زبان کی گرہ کھول دے
(طٰہٰ: ۲۰-۲۵-۲۸)	کہ لوگ میری بات سمجھیں۔

بلیغ کلام کا رتبہ اس سے بھی سوا ہوتا ہے، وہ فصیح کلام کی خوبیوں کا متضمن ہونے کے علاوہ اپنے مقصود و مدعا کے لحاظ سے بالکل عیاں اور مقتضائے حال کے مطابق ہوتا ہے، اس میں کہیں سے نہ کوئی جھول ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی گوشہ مخفی و مستور ہوتا ہے کہ یہ کہا جا سکے کہ المعنی فی بطن الشاعر۔ اگر کسی کلام میں دور از کار

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر

تخیلات اور غیر ضروری محذوفات ہوں تو وہ تاثیر اور دل نشینی سے خالی ہوگا اور سننے والا اس سے اچھی طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ نپا تلا اور حشو و زوائد سے پاک کلام ہی بلیغ ہوتا ہے۔

اس حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سرور دو عالم کا کلام فصاحت و بلاغت کا درخشاں نمونہ اور ادبی حلاوت اور چاشنی سے معمور ہے آپ کی زبان مبارک سے جو لفظ اور جو فقرہ بھی ادا ہوتا تھا وہ ادب و انشا کی لطافت، رعنائی بیان اور حسن تعبیر کا ضامن اور بلاغت کی جان ہوتا تھا، اس کی تاثیر، دل نشینی، دل کشی اور دل آویزی حد بیان سے باہر ہے، آپ کے مکتوبات، خطبے، احادیث مبارکہ ارشادات عالیہ یہاں تک کہ آپ کی روزمرہ گفتگو بھی حشو و زوائد اور تکلف و تصنع سے پاک اور ماقل و دال ہوتی تھی، روانی، برجستگی، سلاست، شگفتگی اور سادگی و پرکاری اس کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور سوانح نگار قاضی عیاض نے لکھا ہے:

"زبان کی فصاحت اور کلام کی بلاغت میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا، اسکے ساتھ ہی آپ میں سلاست و جودت طبع، انوکھا انداز اور ایجاز بھی تھا، الفاظ کی فصاحت اور معانی کی صحت میں بھی آپ حد کمال پر فائز تھے آپ کی گفتگو میں تکلف اور لفظوں میں تنافر نہیں ہوتا تھا، آپ کو جوامع الکلم اور بدائع حکم عطا کیے گئے تھے، آپ عرب کی مختلف زبانوں سے واقف تھے اور ہر قوم و قبیلہ سے اس کی زبان میں گفتگو فرماتے اور سب سے ممتاز اور

فائق رہتے ہیں[1]

عربی زبان و ادب کا مشہور ادیب اور نامور انشا پرداز جاحظ رقمطراز ہے:۔

"آپ کے کلام میں حروف کم اور معانی زیادہ ہوتے ہیں، وہ تکلف اور بناوٹ سے پاک ہوتا ہے، جہاں بسط و تفصیل کا موقع ہوتا ہے وہاں آپ شرح و بسط سے کام لیتے تھے اور جہاں اختصار کا اقتضا ہوتا تھا وہاں مختصر بات کرتے تھے، اجنبی، نامانوس، مبتذل اور بازاری الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے، جو کچھ بھی فرماتے تھے وہ حکمت کا انمول خزانہ ہوتا تھا اور عصمت و پاکیزگی اس پر چھائی ہوئی ہوتی تھی، ایسے ہی کلام کو اللہ محبوبیت و مقبولیت بخشتا ہے اور وہ وقار و ہیبت کا حامل ہوتا ہے، مختصر اور قلیل ہونے کے باوجود وہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے، سننے والے کے سامنے اسے دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ اس میں کوئی لفظ ساقط نہیں ہوتا ہے[2]

ذیل میں صحیح بخاری سے جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اسالیب کی مدد سے آپ کے فصیح و بلیغ کلام کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں:۔

استفہام | استفہام عربی زبان کا ایک خاص اسلوب ہے جس کا مقصد محض استفہام اور کسی سے کوئی بات دریافت کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ مختلف اغراض و مقاصد کیلئے

---

[1] شفاء قاضی عیاض مع شرح نسیم الریاض للخفاجی ج ۱ ص ۳۷۷ تا ۳۷۹ مطبع عثمانیہ ترکی ۱۳۱۲ھ

[2] بحوالہ مصطفیٰ صادق رافعی اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویہ ص ۲۹۴ و ۲۹۵ مطبع رحمانیہ مصر ۱۹۲۶ء/ ۱۳۴۰ھ۔

آتا ہے اور متعدد اور گوناگوں پہلوؤں کا متضمن ہوتا ہے۔ یہ کبھی استبعاد و تحقیر، زجر، تنبیہ، استعجاب، اثبات، نفی، امر و تاکید کے لیے آتا ہے تو کبھی اقرار و استدلال نیز کسی امر پر مزید غور و فکر کی دعوت دینے کے لیے بھی آتا ہے جس کا پتہ سیاق و سباق اور موقع و قرینہ سے چلتا ہے۔ استفہام کے اسلوب سے کلام میں زور و قوت کا اضافہ ہوتا ہے، اس کی تاثیر اور جاذبیت بڑھ جاتی ہے اور بلاغت و لطافت دو چند ہو جاتی ہے، اس روشنی میں آگے کی بحث اور مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

یہ بات بداہتاً ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی اور آپؐ کے زریں ارشادات دراصل قرآن مجید کی تشریح و تفسیر ہیں، نماز اسلام کا عظیم الشان رکن ہے، جس کی حقیقت ذکر الٰہی ہے، قرآن مجید میں کہا گیا ہے:۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ: ۲۰: ۱۴) اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

اللہ کو یاد کرنے والا کبھی معصیت، بیہودگی، فحشا اور منکر کا مرتکب نہیں ہو سکتا، اسی حقیقت کو زیر نظر آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے:۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ	اور نماز قائم کرو بے شک نماز بے حیائی
تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ	اور منکر سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد
وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (عنکبوت ۲۹: ۴۵)	بہت بڑی چیز ہے۔

آنحضرت صلعم نے اس کی جو عمدہ، بلیغ اور موثر تشریح فرمائی ہے اس پر طبیعت وجد کرنے لگتی ہے، ملاحظہ ہو:۔

ارأیتم لو ان نھرا بباب احدکم	غور کرو اگر کسی کے دروازے کے
یغتسل فیہ کل یوم خمسا	پاس کوئی دریا ہو جس میں وہ روزانہ

ماتقول ذلک یبقی من درنه	پانچ مرتبہ غسل کرے تو کیا اس کا میل
قالوالا یبقی من درنه شیأً	کچیل باقی رہے گا، لوگوں نے کہا
قال فذلک مثل الصلوٰت	نہیں اس کا میل باقی نہیں رہے گا
الخمس یمحواللّٰہ به الخطایا	تو آپؐ نے فرمایا ٹھیک یہی حال پنجوقتہ
دیکھو بخاری ج ۱ ص ۷۶، کتاب مواقیت	نمازوں کا ہے جن کی وجہ سے اللہ
الصلوٰۃ مطبع کرزن دہلی ۱۳۲۲ھ)	خطاؤں کو محو اور زائل کر دیتا ہے۔

غور کیجیے کتنی واضح، مدلل، موثر اور دلنشین بات فرمائی گئی ہے جس میں کہیں سے اغلاق اور پیچیدگی نہیں ہے، استفہام اور تشبیہ و تمثیل نے کلام میں جو عظمت، تاثیر، دلآویزی، لطافت، خوبی اور زور و اثر پیدا کر دیا ہے اس کو بیان کرنا مشکل ہے۔ اس سے بلیغ و موثر انداز بیان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

جب یہ آیت نازل ہوئی کہ :۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ	اور اپنے قریبی خاندان والوں کو
(شعراء - ۲۶: ۲۱۴)	ڈراؤ!

تو اس کی تعمیل میں آپؐ نے قریش کو جو آپؐ کے ہم خاندان تھے اکٹھا کرنے کے لیے کوہ صفا پر چڑھ کر پکارا یا صباحاہ۔ یہ لفظ عرب میں اس وقت بولا جاتا تھا جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ پر دفعتاً غارت گری کے لیے ٹوٹ پڑتا تھا، چنانچہ جب لوگوں نے یہ آواز سنی تو چونک اٹھے اور آپؐ کے گرد جمع ہو گئے، آپؐ نے ارشاد فرمایا :۔

ارأیتم ان اخبرتکم ان	تمہیں بتاؤ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ

خیلاً تخرج من سفح هذا الجبل اکنتم مصدقی	اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے تو کیا تم میری تصدیق کروگے۔

سب نے بیک زبان ہوکر کہا ماجربنا علیک کذبا (ابھی تک آپؐ کی نسبت ہمیں کسی دروغ گوئی کا تجربہ نہیں) لوگوں کے اس اقرار کے بعد آپؐ نے اپنا مقصد بالکل غیر مبہم انداز میں اس طرح بیان کیا:۔

انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید[1]	میں تمہیں ایک ایسے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے۔

کیا اس سے بڑھ کر موثر اور دلکش کوئی پیرایۂ بیان ہو سکتا ہے، گو ابولہب کی شقاوت نے آپؐ کی بات مکمل نہیں ہونے دی، تاہم اس موقع پر آپؐ نے جو ادھوری بات فرمائی اس کے زور بیان اور بلاغت کی داد نہیں دی جاسکتی پھر اپنی بات کو پیش کرنے کے لیے آپؐ نے جو اسلوب و انداز اختیار کیا وہ کتنا خوبصورت اور انوکھا تھا۔ کلام کے اس زور اور اثر آفرینی میں بڑا دخل آپؐ کے حسن تعبیر، جدت ادا اور پیرایۂ استفہام کو ہے، جاحظ کا خیال ہے کہ آپؐ اپنے فریق کو خاموش کرنے کے لیے وہ طریقہ اختیار کرتے تھے جو خود اس کے نزدیک معروف اور تسلیم شدہ ہو اور سچائی سے اس پر حجت قائم کرتے تھے اور حق کے ذریعہ اس پر فتح و غلبہ حاصل کرتے تھے۔[2]

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر تبت یدا ابی لہب ج ۲ ص ۷۴۳، مطبع کرزن پریس دہلی ۱۳۲۵ھ [2] بحوالہ اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویہ مصطفیٰ صادق رافعی ص ۲۹۵ مطبع رحمانیہ مصر ۱۹۲۶/۱۳۴۰ھ۔

اس گفتگو سے جاحظ کے خیال کی مکمل تصدیق ہوتی ہے، اس کے خیال کی تائید کے لیے ہم ایک دوسرا واقعہ نقل کرتے ہیں اس میں بھی حسن تعبیر، جدت ادا اور استفہام نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

غزوۂ حنین میں آپؐ نے مولفۃ القلوب کو تمام مال غنیمت دے دیا اور انصار محروم رہ گئے اس کی وجہ سے انہیں شکایت پیدا ہوئی کہ پیغمبر قریش کو دیتے ہیں اور ہم کو چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو انصار کو ایک خیمہ میں جمع کرکے اصل حقیقت دریافت فرمائی، انھوں نے تسلیم کیا کہ آپ کو صحیح معلوم ہوا ہے۔ انصار کے بعض لوگوں نے کہا کہ یہ بات چند نوجوانوں نے کہی ہے، معمر اور صائب الرائے لوگوں نے نہیں کہی ہے، آپؐ نے فرمایا،

یا معشر الانصار الم اجدکم	اے انصار کے گروہ! کیا میں نے
ضُلّالاً فهداکم الله بی و	تم کو گمراہ نہیں پایا پس خدا نے
کنتم متفرقین فالفکم الله	میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی،
بی وعالة فاغناکم الله بی	تم متفرق تھے، خدا نے میری وجہ سے تم کو مجتمع کر دیا، تم محتاج تھے، خدا نے میری وجہ سے تم کو غنی کر دیا۔

دیکھئے یہاں استفہام سے سوال و جواب مقصود نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ثابتہ اور تسلیم شدہ امر کا اقرار و اعتراف کرایا جا رہا ہے اور انصار کے رویے پر تعجب کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ وہ ہر بات اور ہر سوال پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اور

اس کا رسولؐ بہت امین ہے، آپؐ نے فرمایا یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے محمدؐ تم اس حالت میں آئے تھے کہ لوگ تمہاری تکذیب کرتے تھے، ہم نے تمہاری تصدیق کی، تمہارا کوئی مددگار نہ تھا، ہم نے تمہاری مدد کی، تم گھر سے نکالے گئے تھے، ہم نے تم کو گھر دیا، تم محتاج تھے، ہم نے تمہاری غمخواری کی، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

اترضون ان یذھب الناس	کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ لوگ
بالشاۃ والبعیر وتذھبون	اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور
بالنبی الی رحالکم فواللہ لما	تم اپنے گھروں میں خود پیغمبرؐ لیکر
تنقلبون بہ خیر مما ینقلبون	جاؤ، خدا کی قسم تم لوگ جو لیکر واپس جاتے ہو وہ اس سے بہتر ہے جسے تمام لوگ لے کر جاتے ہیں۔

اس پر تمام انصار کے لوگ پکار اٹھے رضینا (ہم سب راضی ہیں)

اس ارشاد گرامی کے وجوہ بلاغت حد بیان سے باہر ہیں، یہاں بھی استفہام اور طرز ادا کی بداعت نے کلام میں جو لطف و اثر پیدا کر دیا ہے اس کی داد علمائے بلاغت و معانی ہی دے سکتے ہیں۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے مہتم بالشان خطبہ حجۃ الوداع کا بھی ذکر ہے جو دراصل انسانیت کا منشور، اسلام اور اسلامی شریعت کے احکام و ہدایات کا مجموعہ ہے، اس میں بھی استفہام کے اسلوب اور پیرایہ نے جو زور، اثر، روانی اور سلاست پیدا کر دی ہے وہ افصح العرب کی فصاحت و بلاغت

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی غزوۂ حنین ج ۲ صفحہ ۶۲۰۔

اور قدرت بیان کا معجزہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے منیٰ میں ارشاد فرمایا:

أتدرون اى يوم هذا قالوا	کیا جانتے ہو یہ کون سا دن ہے؟
الله ورسوله اعلم قال فان	لوگوں نے جواب دیا کہ اللہ و رسولؐ
هذا يوم حرام أفتدرون	کو اس کا بہتر علم ہے آپؐ نے فرمایا
اى بلد هذا قالوا الله ورسوله	یہ یوم الحرام ہے پھر دریافت فرمایا
اعلم قال بلد حرام قال أتدرون	کیا معلوم ہے کہ یہ کون سا شہر ہے
اى شهر هذا قالوا الله و	لوگوں نے کہا اللہ و رسولؐ کو زیادہ
رسوله اعلم قال شهر حرام	علم ہے، ارشاد ہوا کہ یہ بلد الحرام
	ہے۔ پھر سوال کیا کیا جانتے ہو کہ
	یہ کون سا مہینہ ہے لوگوں نے کہا
	اللہ اور اس کے رسولؐ کو اس کا علم
	ہے ارشاد ہوا شہر حرام۔

اس سوال و جواب کے بعد اسی مفہوم کو نہایت [illegible] اور بلیغ اسلوب میں یوں ادا کیا:

فان الله حرم عليكم دماءكم	خدا نے تمہارا خون، تمہارا مال،
واموالكم واعراضكم كحرمة	تمہاری آبرو تم پر اس مہینہ میں
يومكم هذا فى شهركم هذا	اس شہر میں اس دن کی حرمت
فى بلدكم هذا۔	کی طرح حرام کیا۔

آپؐ خدا کے آخری نبی تھے اور آپؐ کو دیا جانے والا دین مکمل ہو چکا تھا اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ آپؐ امت کو یہ بتا دیں کہ آپؐ نے خدا کے دین کو اس تک بے کم و کاست پہنچا دیا ہے اور آپؐ سے ہدایت ربانی کو لوگوں تک پہنچانے میں کوئی کمی اور کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ اسی مقصد سے آپؐ اپنی ایک ایک تعلیم و ہدایت بیان کرنے کے بعد لوگوں سے اس کا اقرار بھی کراتے جاتے تھے اور انہیں اس امر سے آگاہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ دیکھو! اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ میں نے خدا کے دین کو اور اس کے پیغام کو پہنچا دیا، اس پر خود اللہ تعالیٰ شاہد ہے، اس کے بعد میں بری الذمہ ہو گیا ہوں، اب یہ تم لوگوں کا کام ہے کہ جو لوگ میری باتیں نہیں سن رہے ہیں اور جو یہاں موجود نہیں ہیں، انہیں بھی میری باتیں بتا اور سنا دو۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے آپؐ نے اس قدر بلیغ اور موثر پیرایۂ بیان اختیار فرمایا کہ:

الا ھل بلّغت، اللھم اشھد فلیبلغ الشاھد الغائب[1]	خبردار! (کان کھول کر سن لو کہ) میں نے (خدا کا پیغام) پہنچا دیا اور (بری الذمہ ہو گیا) خداوند! تو گواہ رہنا (کہ میں نے تیرا پیغام لوگوں کو پہنچا دیا ہے) موجود لوگوں کو چاہیئے کہ وہ غیر حاضر لوگوں کو (بھی خدا کا پیغام) پہنچا دیں۔

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۹۲ کرزن پریس دہلی ۱۳۲۵ھ۔

اس زورِ کلام اور خوبصورت پیرایۂ بیان کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ اس طرح کی مثالیں کلامِ نبویؐ میں متعدد اور گوناگوں ہیں، آگے صحیح بخاری سے آپؐ کے اسلوب اور طریقۂ بیان کے بعض اور پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تشبیہ و تمثیل | استعارہ، تشبیہ اور تمثیل فصیح و بلیغ کلام کا ضروری عنصر ہے جو اس کے عوارض و مستحسنات میں خیال کیے جاتے ہیں، زبان و بیان کے لیے ان کی حیثیت خط و خال یا زیور جیسی ہوتی ہے جس کے بغیر ان کا حسن و جمال قائم نہیں رہ سکتا۔ ان کی وجہ سے مفہوم و معنی قریب الفہم ہو جاتا ہے اور نازک تشبیہ و تمثیل اور لطیف استعارے سے کلام میں جو زور، قوت، اثر اور وسعت پیدا ہوتی ہے وہ کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں ہوتی، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں بھی اس کا اہتمام کیا گیا ہے اور اس میں تشبیہ و تمثیل کا اسلوب جا بجا ملتا ہے، یہاں صحیح بخاری سے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

صدقہ کرنا یا کسی کو کوئی چیز ہدیتہً دے دینا یا ہبہ کر دینا انسان کا ایک ممتاز وصف اور اس کی نمایاں اخلاقی خوبی ہے، لیکن اگر کوئی چیز صدقہ کرنے یا ہدیہ اور ہبہ کرنے کے بعد واپس لے لی جائے تو یہ نہایت ہی قبیح اور مذموم فعل بن جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شناعت و قباحت کو اس مختصر فقرے میں تشبیہ کا پیرایہ اختیار کر کے اس طرح واضح کیا ہے:

فان العائد فی صدقتہ	صدقہ کر کے اسے واپس لینے والا
کالعائد فی قیئہ [1]	اس شخص کے مانند ہے جو قے کر کے

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰۲، کتاب الزکوٰۃ باب ہل یشتری صدقتہ۔

اسے دوبارہ کھائے۔

گویا صدقہ و خیرات کو واپس لینا تھوک کر چاٹنا یاقے کرکے اسے دوبارہ نگل جاتا ہے، ایسے کریہہ اور گھناؤنے فعل کو کوئی سلیم الطبع شخص پسند نہیں کرتا۔

دنیا سرائے فانی ہے لیکن ہر شخص اس کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے اور اس کے مال و اسباب کو حاصل کرنے کے لیے جائز ناجائز، گھٹیا اور پست طریقے اختیار کرتا ہے۔ انسان کی حرص و آز نے اسے اندھا بہرا بنا دیا ہے، دنیا کی محبت میں اس کی یہ وارفتگی ظاہر کرتی ہے کہ انسان کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے جبکہ روزآنہ کا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ نہ کوئی ہمیشہ یہاں رہتا ہے اور نہ مرنے کے بعد اپنا ساز و سامان یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔ اس ناپائدار، عارضی اور غیر مستقل دنیا میں آدمی کو جس طرح رہنا چاہیے اسے رسول اللہؐ نے بڑی موثر اور بلیغ تشبیہ کے پیرائے میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

کن فی الدنیا کانک غریب   دنیا میں مسافر بلکہ راہ گیر کے مانند

او عابر سبیل[1]   رہو۔

جس طرح کوئی مسافر اور راہ گیر راستے اور غربت کو اپنی اصلی منزل سمجھ کر وہاں اپنے لیے آرام دہ اور آسائشوں اور راحتوں سے پر مکان نہیں بناتا بلکہ تھوڑے سے مختصر زادِ راہ پر قناعت کرتا اور بے سر و سامانی کے عالم میں ہر لمحہ بے چین اور بے قرار رہتا ہے، دنیا کی منزل فانی میں رہنے والوں کا حال بھی یہی ہونا چاہیے' انہیں دنیا کو اپنا ملجا و ماوی نہیں سمجھنا چاہیے یہاں بقدر کفاف پر گزر بسر کرکے

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۴۹ کتاب الرقاق باب قول النبیؐ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔

اصلی منزل کی طرف رواں دواں رہنا چاہیئے۔

غور کیجئے تشبیہ نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور ایک مختصر کلام کو کس درجہ بلیغ، موثر اور پُر معنی بنا دیا جس سے دنیا کی بے ثباتی ناپائداری اور بے قیمتی کی حقیقت بھی ظاہر ہوگئی اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ یہاں رہنے سہنے کا کیا انداز ہونا چاہیئے۔

یہ ایک عام اور پامال مضمون ہے کہ آدمی کو اچھے اور نیک لوگوں کی صحبت میں رہنا اور برے اور بد لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشبیہ و تمثیل کا انوکھا اسلوب اختیار کرکے اس میں ایک ندرت پیدا کی اور اس میں تازگی اور دلکشی پیدا کر دی ہے، تشبیہ و تمثیل دلیل کے طور پر بھی لائی جاتی ہے چنانچہ یہ بات کہ آدمی کو صالح شخص کی صحبت میں رہنا اور طالح کی صحبت سے باز رہنا چاہیئے۔ بظاہر ایک مجرد دعویٰ ہے لیکن اگر اس کی دلیل بھی بیان کر دی جائے تو یہ عام بات مدلل ہونے کی بنا پر نہایت موثر، بلیغ اور پُر زور ہو جاتی ہے۔ اس روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی پر غور کیجئے:

مثل الجليس الصالح والجليس	نیک اور بد ہم نشیں کی مثال مشک
السوء كمثل صاحب المسك	والے اور بھٹی والے لوہار کی ہے
وكير الحداد لا يعدمك	مشک بیچنے والے کے پاس سے
من صاحب المسك اما	تم محروم و معدوم نہیں رہو گے
تشتريه واما تجد ريحه	یا تو تم مشک خرید لوگے یا تمھیں
وكير الحداد يحرق بدنك	اس کی خوشبو ملے گی اور لوہار کی
او ثوبك او تجد منه ريحا	بھٹی تمہارا جسم یا کپڑا جلا دے گی
خبيثة[1]	یا تمہیں اس کی بدبو سونگھنے کو ملے گی۔

(حاشیہ صفحہ ۴۲۰ پر)

آپؐ نے اچھے اور بُرے آدمیوں کی صحبت کے فوائد اور نقصانات مدلل طور پر اس تشبیہ کے ذریعہ بیان کرکے اسے بہت معنی خیز اور موثر بنادیا ہے جس سے ان صحبتوں کی خوبی و خرابی مجسم ہوکر سامنے آگئی ہے۔

رسول اکرمؐ دنیا کو جو دعوت و پیغام دینے کے لیے تشریف لائے تھے، اسکے معاملے میں مختلف لوگوں کی روش مختلف تھی، کسی نے اسے قبول کیا اور آپؐ کی ہدایت پر عمل کرکے دونوں جہاں کی سعادت و کامرانی حاصل کی لیکن کچھ لوگوں نے اسے ٹھکرا کر ہلاکت و بربادی مول لی اور انکار و تکذیب کا رویہ اختیار کرکے ہر قسم کی ذلت و رسوائی سے دوچار ہوئے، اسی حقیقت کو آپؐ نے تشبیہ و تمثیل کے پیرایہ میں بیان کرکے ماننے اور نہ ماننے والوں کے انجام کی پوری تصویر کھینچ دی ہے، ملاحظہ ہو:

انما مثلی ومثل ما بعثنی اللہ	میری اور اس چیز کی جسے دے کر اللہ
بہ کمثل رجل اتی قوما فقال	نے مجھے بھیجا ہے مثال ایسے شخص
یا قوم انی رأیت الجیش	کی ہے جو کسی قوم کے پاس آکر یہ
بعینی وانی انا النذیر العریان	کہے کہ اے میری قوم کے لوگو میں
فالنجاء النجاء فاطاعہ طائفۃ	نے اپنی آنکھوں سے (دشمنوں کی)
من قومہ فادلجوا وانطلقوا	فوج دیکھی ہے اس لیے میں تمہیں
علی مہلہم فنجوا وکذبت	خبردار کرتا ہوں اس لیے تم اپنے

(حاشیہ صفحہ ۴۱۹) لہ بخاری ج ۱ صفحہ ۲۸۲ کتاب البیوع باب فی العطار وبیع المسک ۔ یہ روایت امام صاحب نے ایک اور جگہ بھی نقل کی ہے گو اسکے الفاظ قدرے مختلف ہیں تاہم دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے (بخاری ج ۲ صفحہ ۸۳۰ کتاب الذبائح باب المسک)

طائفة منهم فاصبحوا مكانهم فصبحهم الجيش فاهلكهم واجتاحهم فذلك مثل من اطاعني فاتبع ما جئت به ومثل من عصاني وكذب بما جئت به من الحق[1]

بچنے کا سامان کر لو اور بھاگ جاؤ، چنانچہ ایک جماعت نے اس کی بات مان لی اور مہلت کے اندر رات ہی میں وہ چل پڑی، اس طرح دشمنوں کی زد سے محفوظ رہی لیکن دوسری جماعت نے اسے جھٹلا دیا اور وہ اپنی جگہ پڑی رہ گئی۔ چنانچہ فوج نے اس پر صبح تڑکے حملہ کر کے اس کا قلع قمع کر دیا، بعینہ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنھوں نے میری بات مان لی اور اس ہدایت کی پیروی کی جو میں لے کر آیا ہوں اور جنھوں نے میری بات نہیں مانی اور میری ہدایت کی تکذیب کی۔

اسی طرح کی بات ایک دوسری حدیث میں قدرے مختلف انداز سے بیان کی گئی ہے لیکن وہاں بھی تشبیہ و تمثیل نے کلام میں جان ڈال دی ہے ارشاد ہے:

مثل ما بعثني الله به من الهدى والعلم كمثل الغيث

اس علم و ہدایت کی مثال جسے کہ اللہ نے مجھے مبعوث کیا ہے بارش

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۱۰۸۰ کتاب الاعتصام باب الاقتداء بسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

الکثیر اصاب ارضا فکان
فیھا نقیۃ قبلت الماء فانبتت
الکلاء والعشب الکثیر وکانت
منھا اجادب امسکت الماء
فنفع اللہ بھا الناس فشربوا
وسقوا وزرعوا واصاب
منھا طائفۃ اخری انما ھی
قیعان لا تمسک ماء ولا
تنبت کلاء فذلک مثل من
فقہ فی دین اللہ ونفعہ
بما بعثنی اللہ بہ فعلم وعلم و
مثل من لم یرفع بذلک
راساً ولم یقبل ھدی اللہ
الذی ارسلت بہ[1]

جیسی ہے جو صاف زمین پر ہوتی
ہے تو وہ پانی کو جذب کر لیتی ہے اور
گھاس و سبزہ اگاتی ہے اور [illegible]
سخت ہوتی ہے وہ پانی کو روک
لیتی ہے جس سے اللہ لوگوں کو نفع
پہنچاتا ہے یعنی وہ پانی خود پیتے ہیں
(مویشیوں کو) پلاتے ہیں اور کھیتی
کی سینچائی کرتے ہیں کچھ بارش سنگلاخ
زمین اور چٹیل میدان میں ہوتی ہے
یہ نہ پانی کو روکتی ہے اور نہ سبزہ
اگاتی ہے۔ پس یہی مثال ہے شخص کی
ہے جو اللہ کے دین میں فقہ و بصیرت
حاصل کرتا ہے اور اللہ اسے میری
دعوت سے نفع بخشتا ہے پس وہ
خود علم حاصل کرتا ہے اور دوسروں
کو بھی علم سکھاتا ہے اور یہی اس شخص کی
مثال بھی ہے جو نہ اس کی طرف مطلق
توجہ کرتا ہے اور نہ اللہ کی اس ہدایت

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۱۸ کتاب العلم باب فضل من علم و علم۔

کو قبول کرتا ہے جسے دے کر میں

بھیجا گیا ہوں ۔

گویا خدا کے دین اور نبیؐ کی تعلیم و ہدایت کا حال بارش جیسا ہے جو لوگوں کی ضرورت کے وقت ہوتی ہے اور مردہ زمینوں کو سیراب کرکے اسے گل و گلزار بنا دیتی ہے بعینہ یہی حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت لوگوں کا تھا آپؐ کی تشریف آوری سے لوگوں کو ہدایت ملی اور ان کی پژمردہ طبیعتیں شگفتہ ہوگئیں لیکن جس طرح بارش کے اثرات مختلف زمینوں پر مختلف قسم کے ہوتے ہیں اسی طرح خدا کی ہدایت کے اثرات بھی مختلف قلوب پر مختلف طرح کے ہوتے ہیں ۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم و خس

ایک جگہ قرآن مجید کے قاریوں کے فرق و تفاوت کا ذکر بھی اسی موثر و بلیغ پیرائے میں کیا گیا ہے ملاحظہ ہو :

مثل المومن الذی یقرأ	جو مسلمان قرآن پڑھتا ہے اس کی
القرآن مثل الاترجۃ ریحہا	مثال اس پھل کی ہے جس کی بو
طیب و طعمہا طیب ومثل	اور مزہ دونوں پاکیزہ ہوتے ہیں
المومن الذی لا یقرأ القرآن	اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا
مثل التمرۃ لا ریح لہا و	وہ کھجور کے مانند ہے جس میں کوئی
طعمہا حلو ومثل المنافق	خوشبو نہیں ہوتی مگر اس کا ذائقہ
الذی لا یقرأ القرآن	میٹھا ہوتا ہے اور قرآن نہ پڑھنے
کمثل الحنظلۃ لیس لہا ریح	والے منافق کی مثال حنظل جیسی

وطعمها مر و مثل المنافق — ہے جس میں خوشبو نہیں ہوتی
الذی یقرأ القرآن مثل — اور جس کا مزہ کڑوا ہوتا ہے
الریحانۃ ریحھا طیب و — اور قرآن پڑھنے والا منافق اس
طعمها مر[1] — خوشبودار پودے جیسا ہے جس کی
بو پاکیزہ مگر مزہ تلخ ہوتا ہے۔

غرض ان حدیثوں میں تمثیل و تشبیہ نے کلام کے لطف و اثر میں غیر معمولی عظمت و شکوہ پیدا کر دیا ہے اس طرح کی متعدد حدیثیں ہیں، یہاں انھی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۸۱۶ کتاب الاطعمۃ باب ذکر الطعام۔

امتیاز علی عرشی اور بعض علمی مباحث

از جناب عتیق جیلانی صاحب سالک

مولانا امتیاز علیخاں عرشی رامپوری (ولادت ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء وفات ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء) علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ عربی فارسی اور اردو کے وہ ممتاز عالم و محقق تھے، وہ ماہر غالبیات بھی تھے۔ رضا لائبریری کے ناظم کی حیثیت سے بھی انھوں نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ مولانا کی ان گوناگوں خدمات کے باعث انہیں متعدد انعامات سے نوازا گیا۔ جس سے ان کی قدر بلند تھی تاہم ان کا جیسا اعتراف ہونا چاہیے تھا وہ ابھی تک نہیں ہوا۔

تدوین و تحقیق کو مغرب کا دین منت خیال کیا جاتا ہے حالانکہ اس نے خود اس کے اصول و ضوابط عربی سے مستعار لیے ہیں، مسلمانوں نے احادیث کی تدوین و تحقیق میں کاوش و دیدہ ریزی کی ہے۔ مغرب نے اسی کو مشعل راہ بنا کر اسے اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ اردو کے اکثر محققین نے ان اصولوں کو براہ راست مغرب سے اخذ کیا ہے مگر مولانا عرشی مرحوم نے براہ راست عربی ہی کے توسط سے یہ اصول اخذ کیے ہیں اور حسب ضرورت انگریزی سے بھی استفادہ کیا ہے اور وہ اردو میں متنی تنقید کے بڑے ماہر خیال کیے جاتے ہیں جس کا بہت بہتر نمونہ ان کی کتابیں "مکاتیب غالب" اور "دیوان غالب نسخہ عرشی" ہیں، اس مضمون میں غالبیات سے قطع نظر ان کی تحقیق

کے دوسرے نمونے زیر بحث آئیں گے۔

دستور الفصاحت | علمی حلقوں میں انشاء اللہ خاں انشاء کی دریائے لطافت کو بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ لیکن احمد علی یکتا کی دستور الفصاحت کا مخطوطہ پہلی مرتبہ مولانا عرشی نے دریافت کر کے کتب خانہ رامپور کے لیے حاصل کیا اور اس پر سیر حاصل دیباچہ اور حواشی بھی تحریر کیے اور ۱۹۴۳ء میں اس کا تنقیدی ایڈیشن شائع کیا۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے جو اس وقت ایک نوآموز محققہ تھیں دیدہ ریزی سے اس پر ایک تنقیدی مضمون سپرد قلم کر کے عرشی صاحب کو بھیجا۔ یہ ایک مکتوب کی شکل میں تھا جسے نہایت فراخ دلی کے ساتھ مولانا نے 'برہان' دہلی فروری ۱۹۴۷ء میں شایع کرایا۔

ڈاکٹر آمنہ کی تنقید نفس مضمون سے زیادہ کتاب کی ماہیت و کتابت کے بارے میں ہے اور اسی سے انھوں نے نتائج برآمد کیے ہیں لیکن نفس مضمون اور نتائج کے بارے میں دونوں میں اختلاف نہیں ہے، ان کو مولانا کے واقعات کو ترتیب و تسلسل کے ساتھ بیان کرنے اور یکتا کے حالات زندگی کو دستیاب نہ کر سکنے کی شکایت ہے، حالانکہ موصوفہ کو بھی حالات نہیں مل سکے ہیں۔

ظہور الاسرار نامی اور مطہر کڑہ | مثنوی نظامی گنجوی' مخزن الاسرار مطبوعہ نولکشور پریس کے شارح ظہور الحسن بھٹوری تھے۔ ان کا پورا نام کیا تھا، یہ بات بحث طلب ہے۔ مگر بقول مولانا عرشی " بدر الدین مطہر بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود البلخی المعروف بکری" اور بقول حافظ محمود شیرانی " محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ البلخی الکرئی تھا[1]۔

---

[1] معارف جولائی اگست ۱۹۴۱ء۔

پروفیسر نذیر احمد نے اپنے مضمون "ظہور الاسرار اور مظہر کردہ" — ایک گذارش" میں لکھا ہے کہ:

"شرح مخزن پر انھوں (محمود شیرانی) نے بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نولکشور پریس میں یہ شرح غلط نام سے شایع ہوئی۔ اس طرح عرشی صاحب اور شیرانی دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے۔ لیکن عرشی صاحب شیرانی کا حوالہ اس لیے نہ دے سکے کہ محمود شیرانی کا مقالہ ان کی نظر سے نہ گزر سکا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ شیرانی نے ظہور الحسن بشوری کی بحر الفضائل کا حوالہ دیا ہے اور عرشی صاحب کا مقالہ اس کے تذکرہ سے خالی ہے جس کی وجہ سے ان کے نزدیک شارح مخزن اسرار عہد فیروز شاہی کا مشہور کردہ ہے۔ جب کہ بحر الفضائل میں شارح کا نام محمد بن رستم بن احمد بدر خزانہ بلخی کرئی رقم ہوا ہے۔
اس طرح دونوں مصنف الگ الگ ہیں۔ عہد فیروز شاہی کا مظہر کردہ دوسرا شخص ہے۔ بقول شیرانی سال تصنیف کے درمیان ۴۴ سال کا فرق ہے"[1]

امام ابن حزم ظاہری — اور ان کی کتاب الانساب جمہرۃ النسب

مولانا عرشی نے اس مقالہ[2] میں ابن حزم ظاہری کی حیات و خدمات سے نہ صرف واقف کرایا ہے بلکہ ان کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن سے عام طور پر لوگ ناواقف تھے۔ چنانچہ اس مقالے سے پہلی مرتبہ ان کی شاعرانہ حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا عرشی نے "قاعدہ کلیہ" کے زیر عنوان عربی اسماء الرجال کے

---

[1] نذیر احمد پروفیسر، مضمون ظہور الاسرار، بحوالہ غالب نامہ عرشی نمبر جنوری ۱۹۹۲ء و مقالات عرشی۔

[2] مقالہ مطبوعہ روئداد معارف اسلامیہ لاہور ۱۹۳۸ء بحوالہ مقالات عرشی مطبوعہ لاہور۔

کچھ ملفوظات کے ضمن کیلئے پیش کیے ہیں۔ ضرب الامثال میں تمثیلاً عربی کہاوتوں کے متعلق
"جمہرۃ" کی عبارتوں اور دوسرے عالموں کے خیالات پر بھی تجزیاتی بحث کی ہے۔
اس کے علاوہ مولانا نے شیعہ سنی اختلافات کے بارے میں دلچسپ بحث کی ہے
وہ لکھتے ہیں:

"آخر میں دل چاہتا ہے کہ آپ حضرات کی توجہ اسلام کے ان دو خاندانوں کے معاشرتی تعلقات کی طرف منعطف کر دوں جن کے اختلاف پر آج تک اسلام کے دو سب سے پرانے فرقوں کے اختلاف کی بنیاد قائم ہے۔ ان سے میری مراد امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور بنی امیہ ہیں۔ ہمارے علماء میں آج بھی یہ مسئلہ نظری ہے کہ شیعہ سنی کے ازدواجی تعلقات مذہبی نقطہ نگاہ سے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خالص مذہبی جماعت سنی ہوں یا شیعہ اسے کم از کم بنظر استحسان نہیں دیکھتی لیکن "جمہرۃ النسب" کے ابواب "اولاد ابی طالب اور اولاد امیہ" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ان خاندانوں کا اختلاف تمام تر سیاسی تھا۔ مذہبی اعتبار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد رضی اللہ عنہم بنی امیہ کو بھی دائرۂ اسلام سے باہر نہیں خیال کرتے تھے۔ "تا بہ دیگراں چہ رسد" چنانچہ ان دونوں خاندانوں کے ازدواج باہمی کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں سے صرف ایک کا تذکرہ کافی ہوگا۔
ابن حزم یزید بن معاویہ کے پوتے عبداللہ بن خالد کے تذکرے میں جو کچھ لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباس علمدار کی پوتی اور حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب کی پڑپوتی حضرت نفیسہ بنت عبیداللہ کی شادی یزید کے

چہیتے عبداللہ بن خالد سے ہوئی تھی۔ جن سے علی بن عبداللہ اور عباس بن عبداللہ
پیدا ہوئے"۔

مولانا عرشی نے بعض روایات و مسلمات کی اصلیت سے بھی واقف کرایا ہے
ان میں سے چند کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

۱۔ عورت مرد کے حصص | بنی بکر بن وائل کے ماتحت عامر بن جشم بن کعب کا ذکر کیا
جو ذوالمجاسد کہلاتا تھا۔ اور لکھا ہے کہ "یہ پہلا شخص ہے جس نے مرد کے دو حصے اور
عورت کا ایک حصہ مقرر کیا۔ (ورق ۲۴ ب)

ابن درید کتاب الاشتقاق (ص ۲۰۶) میں اس اولیہ کو چھوڑ گیا لیکن سیوطی نے
کتاب الوسائل (۴۶) میں تذکرہ کیا ہے۔

۲۔ کعبہ کی طرف منہ کرنے والے | البراء بن معرور الخزرجی کے متعلق لکھا ہے کہ یہ لیلۃ العقبہ
کی بیعت کرنے والوں میں سے تھے اور پہلے شخص ہیں جن کا منہ دفن کے وقت کعبے
کی طرف کیا گیا۔ (ورق ۱۰۸، ۱ الف)

ابن درید نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایک
تہائی مال کی وصیت کی تھی اور یہی پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے سب سے پہلے کعبے
کی طرف نماز میں منھ پھیرا اور کعبے کی طرف منھ کرکے دفن کیے گئے۔

عسکری نے بیان کیا ہے کہ یہ پہلے مسلم ہیں جنھوں نے کعبے کی طرف رخ کیا۔
بعد ازاں بحکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے لگے۔
لیکن انتقال سے پہلے لوگوں سے کہہ کر کعبے کی طرف منہ پھیر لیا نیز سب سے پہلے

---

[1] بحوالہ مقالات عرشی ص ۲۲۰۔

انہیں نے لیلۃ العقبہ میں بیعت کے لیے رسول اللہ صلعم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

۳۔ واضع النحو | جمہرہ کے حوالہ سے ابوالاسود ظالم بن عمرو الدؤلی کے متعلق مولانا عرشی نے لکھا ہے کہ "تابعی، بصری، اول من وضع فی النحو (ورق ۵۸) عسکری، صاحب اغانی، القالی، ابن عساکر، اور ابو طاہر صاحب اخبار النحو یین نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ لیکن ابو القاسم الزجاجی اور صاحب اغانی نے دوسری روایات کے مطابق امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو واضع نحو قرار دیا ہے۔ السیرافی نے طبقات النحاۃ میں ابن عاصم کو اور ابن لہیعہ نے عبد الرحمٰن بن ہرمز کو یہ شرف عطا کیا ہے۔ لیکن اکثر تذکرہ نگاروں نے ابن حزم کے قول کو اختیار کیا ہے"[1]

۴۔ قاتل عثمان غنی ذوالنورینؓ | مولانا عرشی نے "جمہرہ" کے حوالے سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور "عمرو بن الحمق" کا ذکر بنی سعد بن کعب کے سلسلہ میں درج ہے:

"یہ صحابی تھے۔ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر چڑھائی کرنے والوں میں سے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفدار تھے"[2]

---

[1] محمد الجنیدی جمعہ اور احمد محمد الامام نے اپنی تصنیف "المنہل العذب" میں حضرت علیؓ اور ابوالاسود دؤلی کے واضع نحو ہونے کا خیال ظاہر کیا ہے [3] لیکن اس کے متعلق دوسری روایتیں بھی ہیں۔

(الف) امام طبری نے مالک ابن حارث معروف بہ اشتر نخعی کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا اصل قاتل بتایا ہے یہ اپنے ایک ذاتی مفاد کی وجہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے قریب بھی تھے۔ انھوں نے ان کے ہاتھ پر سب سے پہلے بیعت کی۔ اس لیے

(بقیہ حاشیہ ص۴۳۱ پر)

آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:

" حضرت معاویہؓ کے زمانے میں انھیں قتل کر دیا گیا۔ خدا کی ان پر رحمت ہو۔

ان کا سر کسی مسلمان کا پہلا سر تھا جو ایک شہر سے دوسرے شہر کو لے جایا گیا۔

عسکری نے اس واقعہ کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ " پہلا سر جو ایک شہر سے دوسرے شہر کو بھیجا گیا" محمد بن ابی بکر کا تھا۔ ابن درید کی رائے میں عمرو بن الحمق کا سر پہلا ہے جو لٹکایا گیا۔ (ص ۲۱۹)

مولانا فضل حق خیرآبادی | مولانا عرشی کا مقالہ "کیا مولانا فضل حق خیرآبادی کا ۱۸۵۷ء کے فتوائے جہاد سے تعلق تھا" اس عام رائے کے بر خلاف ہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی ۱۸۵۷ء کے جہاد اور اس سے متعلقہ فتوے میں پیش پیش تھے انھوں نے عبدالشاہد خاں شیروانی کی تردید کرتے ہوئے خود ان کی تحریر ہی سے ثبوت فراہم کیے ہیں اور بتایا ہے کہ یہ مقدمہ دراصل مولانا سید فضل حق رام پوری ثم شاہ جہاں پوری سے متعلق تھا۔ مگر کسی غلط فہمی کی بنیاد پر مولانا فضل حق خیرآبادی

(حاشیہ ص ۴۳۰) یہ کہنا کہ عمرو بن حمق حضرت عثمان غنیؓ کے اصل قاتل ہیں اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں تاریخ کی روشنی میں شاید صحیح نہ ہو۔

(ب) قاتلین عثمان غنیؓ میں کنانہ ابن بشیر تھے۔ جو سب سے پہلے حملہ آور ہوئے (ابن اثیر)

(ج) سب سے پہلے غافقی ابن حرب حملہ آور ہوئے (ابن کثیر) البتہ ابن حمق نے آخر میں حملہ کر کے حضرت عثمان غنیؓ کا کام تمام کیا (بحوالہ۔ محمد سید الوکیل ڈاکٹر۔ جولۃ تاریخیۃ فی عصر الخلفاء الراشدین مطبوعہ جدہ مطبع دار المجتمع ۱۹۸۶ء)

سے منسوب ہوگیا۔ خاں صاحب نے مولوی ذکاءاللہ دہلوی کی "تاریخ عروج سلطنت مغلیہ جلد ۵ کا حوالہ دیا ہے مگر اس میں ۳۲ اصحاب کے فتاویٰ کا تذکرہ ہے جن میں زیادہ تر جعلی ثابت ہوئے۔ لیکن ان میں بھی مولانا فضل حق خیرآبادی کا نام شامل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مولانا اس واقعہ کے بیس[2] روز بعد دہلی تشریف لائے تھے۔ اس وقت تک فتویٰ شایع ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں وہ نواب رامپور یوسف علی خاں کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"واضح شد کہ فدوی را بعلت نوکری خان بہادر خاں و نظامت پیلی بھیت و چکلہ داری مرادآباد و افسری باغی ماخوذ کردہ اند، حال آنکہ فدوی ازیں ہر سہ امر محض بری است و منشا مواخذہ آنست کہ شخصے بر فضل حق نام از سادات شاہجہانپور کہ قبل ازیں سرکار بدر قرار بندگان عالی ملازم ماندہ ارتکاب[1]

اس موقف کی تائید و تردید میں متعدد مضامین لکھے گئے۔ جن میں مالک رام[2] کا نام بھی آتا ہے۔ عبدالشاہد خاں شیروانی نے "باغی ہندستان" کی دوسری اشاعت میں جواباً تحریر کیا:

"اس دور کے تاریخی روزناموں سے ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کو علامہ کی بہادر شاہ ظفر کے دربار میں موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے یہ یقین کیسے پیدا ہوگیا کہ علامہ اس سے پہلے دہلی میں نہیں تھے۔ پھر اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے مخالفین کو

---

[1] بحوالہ مولانا عرشی مضمون۔ کیا مولانا فضل حق خیرآبادی کا ۱۸۵۷ء کے فتوائے جہاد سے تعلق تھا؟" مشمولہ نیا دور لکھنؤ۔ جنوری فروری ۱۹۷۰ میں۔ [2] مالک رام کا مضمون تحریک دہلی۔ جون ۱۹۷۰ء میں شایع ہوا۔

یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ دہلی سے صرف ایک ہی فتویٰ جاری ہوا تھا جس کی نقل صادق الاخبار میں چھپی تھی؟[1]

خود مولانا خیرآبادی نے اپنی قید و بند کی دو وجہیں بیان کی ہیں۔

۱۔ انگریزوں کو اس بات کا علم تھا کہ میں ایمان و اسلام میں راسخ العقیدہ ہوں اور علامہ وقت ہونے کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہوں۔ مجھے سزا دینے کا مقصد یہ تھا کہ علم دین کے آثار کو صفحات کتب سے بھی مٹا دیا جائے۔

۲۔ حاکم نصرانی کے سامنے دو مرتد، سخت دل دشمنوں (عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین) نے چغلی کھائی۔ وہ دونوں میرے ساتھ قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ کے بارے میں جھگڑا کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے اور ان دونوں کو نصاریٰ کی دوستی پر اصرار تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایمان کے بدلے کفر کو اپنا لیا۔[2]

اسی طرح پاکستان کے ڈاکٹر محمود ریاض اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مولوی فضل حق اتنا مسکین آدمی نہیں تھا کہ اسے کسی دوسرے شخص کے بدلے میں عمر قید کی سزا دی جاتی اور اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ شاید انہیں (مالک رام وغیرہ کو) یہ معلوم نہیں کہ اس کا چھوٹا بھائی سردار

---

[1] عبدالشاہد شیروانی۔ باغی ہندوستان طبع دوم۔ اردو ڈائجسٹ پریس لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۳۲ [2] عبدالشاہد شیروانی، مولانا: باغی ہندوستان، اردو ڈائجسٹ پبلشرز لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۲۷۔

فضل الرحمن، ریاست پٹیالہ کا وزیر تھا اور نواب والا جاہ بہادر آف
کرناٹک اس کا عزیز قریب تھا اور نواب سید برکت علی خاں بہادر جو انگریز
سرکار میں بڑا مقتدر تھا۔ اس کا بھانجہ تھا۔ کیا یہ سب حضرات اتنے سنگدل
ہوتے تھے کہ اپنے خاص اثرات خاندان کے ایک بزرگ کو بے گناہ ثابت
کرنے کے لیے استعمال نہیں کر سکتے تھے؟[1]

مذکورہ استدلال کم زور معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ انگریزوں نے معمولی شکوک کی بنیادوں پر بھی پھانسی اور کالے پانی کی سزائیں دی ہیں۔ نیز ریاست رامپور نے اس وقت کے اکثر مورد عتاب افراد کو بچانے کی کوششیں کی تھیں۔ ممکن ہے مولانا فضل حق خیرآبادی کے بارے میں کامیابی نہ مل سکی ہو۔ بہرحال یہ بحث طلب موضوع مزید تحقیق چاہتا ہے۔

استناد نہج البلاغہ | اثنا عشریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ نہج البلاغہ میں شامل تمام تحریریں حضرت علیؑ کی تصنیف ہیں۔ لیکن محققین نے بعض شواہد کی روشنی میں ایک شیعی عالم سید شریف رضی یا ان کے بھائی سید شریف مرتضیٰ کو ان کا مولف قرار دیا ہے۔[2]

عرشی صاحب کی پہلی دلیل علامہ نجاشی کی کتاب الرجال کے حوالے سے ہے۔ داخلی ثبوت میں محی الدین عبدالحمید کے نسخہ نہج البلاغہ مطبوعہ قاہرہ کا ذکر ہے جیسے "قال الرضی" یا "قال الرضی ابوالحسن" سے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ خارجی شواہد میں

---

[1] محمد ریاض، ڈاکٹر، جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء مشمولہ ماہ نو کراچی ۱۹۶۹ء ص ۳۸ [2] صابر سنبھلی
ڈاکٹر۔ مقالہ "مقالات عرشی۔ ایک جائزہ" مشمولہ غالب نامہ جنوری ۱۹۹۲ء

"خصائص الائمہ" میں شریف رضی نے اسے اپنی تصنیف قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا عرشی نے "حقائق التنزیل" اور "مجازات الآثار النبویۃ" نیز تفسیر کی بعض شرحوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کتابوں میں نہج البلاغہ کا تذکرہ اپنی تصنیف کے طور پر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صابر سنبھلی نے مولوی سید علی نقی النقوی کی مرتبہ "استناد نہج البلاغہ" کا ذکر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں اس طرح کیا ہے کہ مولانا علی نقی اور مولانا عرشی کے اکثر مندرجات و نتائج یکساں ہیں۔ مگر عرشی صاحب نے اس کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ دراصل ان کے اور سید علی نقی صاحب کے نتائج میں یکسانیت نہیں۔ اس لیے حوالہ دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مناظرانہ رنگ اور کمزور دلیلوں کی وجہ سے اسے قابل التفات نہیں سمجھا گیا۔ مولانا علی نقی نے اپنے مسلک کی مکمل ترجمانی کی ہے۔ اور صرف عقائد کی بنیاد پر نظریاتی حصار قایم کیا ہے۔ بعد میں صحیح ثابت کرنے کے لیے دلیلیں دیتے چلے گئے ہیں۔ جب کہ مولانا عرشی کسی طے شدہ نظریہ کے اثبات کے لیے نہیں، تحقیقی بنیادوں پر نقد و نظر سے کام لیتے ہیں۔

خود راقم الحروف نے دونوں کتابوں کا موازنہ کیا اور سوائے اعتراف والے حصے کے جو دونوں عالموں نے دوسری جگہ سے نقل کیے ہیں، مندرجات دلائل اور نتائج کسی میں بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی، ظاہر ہے کہ دونوں کتابوں کا موضوع ایک ہی ہے، اس لیے عنوان بھی ملتا جلتا ہے۔ ایک کا عنوان استناد نہج البلاغہ اور دوسرے کا "نہج البلاغہ کا استناد" یہ بالکل ویسی ہی صورت ہے جیسے نقد غالب نام کی دو کتابیں ہیں، دونوں کتابوں کا موضوع ایک ہے۔

لیکن مندرجات الگ الگ ہیں۔

مولانا عرشی نے نہج البلاغہ کو حضرت علیؓ کا کلام ماننے کے بجائے کتاب کے دوسرے حصے میں اس کو جانچنے کا اعلان کیا ہے۔ البتہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نہج البلاغہ کے جو مضامین مرتب کے زمانے سے پہلے کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ اس کی جعل سازی نہیں بلکہ صرف مرتبہ مضامین ہیں۔ لیکن یہ بات پھر بھی رہ جاتی ہے کہ جہاں سے مرتب نے نقل کیے اس میں تو جعل سازی ہوسکتی ہے ان تمام دلائل کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا عرشی اور مولانا علی نقی دونوں کے مباحث اور نتائج ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کے مقاصد بھی الگ الگ ہیں۔

مولانا عبدالسلام خاں کا مسلکی اختلاف | مولانا عبدالسلام خاں، سابق پرنسپل مدرسۃ العالیہ رام پور، ایک جید عالم ہیں اور خصوصاً فن منطق میں عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ انھوں نے "مولانا عرشی کو جیسا پایا اور جانا" اسے اپنے ایک مضمون میں قلم بند کر دیا ہے۔ یہاں اس کا وہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے، جس سے مولانا عرشی کے معتقدات اور مسلک کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"مولانا عرشی کے نزدیک قرآن مجید کی آیتوں، جملوں، فقروں اور لفظوں کا وہی مفہوم ہے، جو صحابہ یا تابعین نے سمجھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن مجید میں ضمنی طور پر طبیعیاتی، ارضیاتی، فلکیاتی اور جغرافیائی بیانات اور قصص و واقعات کو کسی اور طرح سمجھنا جس سے جدید سائنسی و اثری معلومات سے تصادم نہ پیدا ہو۔ اس کی کچھ تاویل نہیں۔ اس کا مقصد نزول لوگوں کو ہدایت ہے۔

اس عہد کے عربوں کا فہم ان عربوں کے مقبولات و مسلمات سے مقصد نزول پورا ہو جاتا ہے۔ ان واقعات کی صداقت قرآن مجید کے اصل موضوع یعنی ہدایت سے خارج ہے اور باوجود لغت و قواعد اور محاورۂ عرب کے ساتھ دینے کے ان کی ایسی تاویل جو عصری معلومات سے متصادم نہ ہو، قابل قبول نہیں"۔

مولانا عبدالسلام خاں فرماتے ہیں کہ "اس کے برعکس میں قرآن مجید میں ایسے لوچ کا قائل تھا کہ اس کی بنا پر ہر عہد کے معلومات سے قرآنی بیانات کی مطابقت قائم رہے، کیونکہ " لاتنقص عجائبہٗ " کے تحت جس طرح اس کے بیانات کی تکذیب اس عہد کے عرب نہیں کر سکے۔ اسی طرح یونانی طبیعات و الہیات کی تکذیب آج کے علماء نہیں کر سکے۔

مولانا عرشی کے فقہی مسلک کے بارے میں مولانا عبدالسلام خاں لکھتے ہیں:

"عرشی صاحب بغیر تحزب اور تعصب کے حنفی مسلک کے پیرو اور امام ابوحنیفہؒ کے تفقہ اور ان کی معرفت حدیث کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ ایک اہل حدیث عالم سے بحث کے دوران عرشی صاحب نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کے استخراج کیے ہوئے مسائل تخمیناً کتنے فی صدا احادیث صحیحہ کے خلاف ہیں۔ انھوں نے غالباً پچیس تیس فی صدی کے قریب بتائے۔ عرشی صاحب نے کہا کہ ذرا سوچیے تو وہ کتنا بڑا آدمی ہوگا جو نبی نہ ہونے کے باوجود ایک نبی کے ملہمات سے تقریباً پچھتر فی صد مسائل میں مطابقت رکھتا ہے"۔

لیکن مولانا عرشی اندھی تقلید کے حامی نہ تھے۔ وہ صدقاتِ فقراء میں صدقات کے عام ہونے کی بنا پر نافلہ صدقات کے کھانے کو ناجائز جانتے تھے۔ جب کہ مولانا

عبدالسلام خاں کے نزدیک صدقات کا وہ حصہ جو اغنیا کو کھلایا جائے صدقہ سے خارج ہو کر دعوت و ہدیہ ہو جاتا ہے

ایک مرتبہ مولانا عبدالسلام خاں نے کہا کہ جن اصحاب نے پنج وقتہ حضور صلعم کی امامت میں نماز پڑھی ان کی نماز کی جزئیات میں اختلاف کی توجیہ ہو سکتی ہے کہ قرن اول میں نماز کے غیراہم فروع میں جزوی اختلاف قابل لحاظ نہ تھے اور کوئی لازمی طریقہ نہ تھا۔ کوئی سینہ پر ہاتھ باندھتا، کوئی ناف پر یا اس کے نیچے۔ چنانچہ یہ اختلاف فقہا کے طبعی میلان سے تعلق رکھتا ہے اور سب ہی طریقے مسنون ہیں۔ عرشی صاحب نے اس توجیہ کو پسند کیا۔

علم حدیث ہندوستان میں کب پہونچا؟ ڈاکٹر نذیر احمد نے مولانا عرشی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"۱۹۲۹ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا حبیب الرحمن شروانی کے ایک مقالہ پر ایک یادداشت درج کی تھی، جس کا ماحصل یہ تھا کہ ہندوستان میں علم حدیث کا چرچا بہت پرانا نہیں اور احادیث کے مہتم بالشان مجموعے ہندوستان میں عام طور پر روشناس نہ تھے۔ نویں صدی ہجری میں رضی الدین صغانی کی "مشارق الانوار" کا زیادہ رواج ملتا ہے۔ دسویں صدی ہجری میں کتب حدیث میں "شمایل" کا نسخہ پہنچ چکا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی بدولت مشکوٰۃ، موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے ہندوستان پہنچے"[1]

عرشی صاحب نے بہ تحقیق ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں ارباب حدیث کی آمد تبع تابعین کے دور ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ حسن بصری کے دو شاگردوں

[1] (حاشیہ ص ۴۳۹ پر ملاحظہ ہو)

کے نام تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ یہ دونوں بزرگ ہندوستان آئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کا نام ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ البصری اور دوسرے بزرگ کا نام ابو حفص ربیع بن صبیح البصری تھا۔ ان حضرات کی برکت سے علم الحدیث کا رواج ہندوستان میں بڑھا۔ چنانچہ چوتھی یا پانچویں صدی ہجری کے کئی سندی محدثین کے نام ہمیں ملتے ہیں۔ ان میں متعدد حضرات کا تعلق دابیل سے تھا اور وہ اسی نسبت سے مذکور ہیں۔ عرشی صاحب نے قدیم عہد کے آٹھ محدثین کے نام درج کیے ہیں۔ چھٹی صدی کے ۱۳ ساتویں کے ۵، آٹھویں کے ۱۰، نویں کے ۸، دسویں صدی میں یہ تعداد ۵۶ ہوجاتی ہے۔

لہ نذیر احمد ڈاکٹر (روئداد مولانا امتیاز علی عرشی سیمینار۔ شمولہ غالب نامہ جنوری ۱۹۹۲ء

شعر العجم (علامہ شبلی نعمانیؒ)

شعرائے فارسی کا یہ تذکرہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے

اس کی پہلی جلد میں فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بہ عہد کی ترقیوں اور ان کے اسباب و خصوصیات پر بحث اور مشہور شعرا از عباس مروزی سے نظامی تک کے تذکرے اور کلام پر تنقید و تبصرہ ہے، دوسری اور تیسری جلد میں شعرائے متوسطین و متاخرین کا تذکرہ مع تنقید کلام ہے، چوتھی میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر ڈالا اور شاعری کی صنف مثنوی پر بسیط تبصرہ اور پانچویں میں قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔

شعر العجم قیمت اول ۴۰/۰۰ دوم ۲۵/۰۰ سوم ۲۵/۰۰ چہارم ۳۵ روپے اور پنجم تینتیس روپے۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی اور انکی فارسی اردو مثنویات کا تقابلی جائزہ

از ڈاکٹر شمیم اختر صاحبہ

پیدائش اور خاندان | مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی ولادت میرٹھ میں ۱۸۴۴ء میں ہوئی وہ نجیب الطرفین تھے۔ والد کی طرف سے آٹھویں پشت میں مولانا قاضی حمید الدین خجندی الصدیقیؒ سے ان کا سلسلۂ نسب ملتا ہے اور والدہ کی جانب سے حضرت مخدوم شیخ فریدالدین اصفہانی چشتیؒ تک پہنچتا ہے۔ ان کے خاندان میں جہاں اصحابِ ورع و تقویٰ پیدا ہوئے وہاں صاحبانِ سیف و قلم بھی گزرے ہیں۔ مولانا کے والد بزرگوار سلیم الطبع حلیم، بردبار، علم دوست اور صاحب ذوق شخص تھے۔ مولانا ان کی سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ اس لیے وہ شفقت پدری کے خاص طور سے مورد بنے۔

تعلیم | والد نے اپنے لائق و فائق پسر کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مولانا میں ذہانت اور قوت حافظہ خداداد تھا۔ ان کا یہ وصف صغر سنی سے ہی نمایاں تھا۔ چنانچہ پانچ ماہ کے قلیل عرصہ میں کلام پاک ناظرہ ختم کرلیا[1]۔ اسکے بعد باقاعدہ طور پر ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز ہوا۔

انیسویں صدی کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی بحران کا تھا۔ اس وقت

---

[1] حیات وکلیات اسمٰعیل ص۳ مصنفہ و مرتبہ محمد اسلم سیفی۔

گو ہندوستان میں فارسی زبان و ادب پر زوال کے بادل چھا چکے تھے۔ تاہم فارسی کا رواج باقی تھا اور تحصیل کمال کے لیے اس کی تعلیم اب بھی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے مولانا نے بھی ابتدا ہی میں اس کی تحصیل شروع کی ان کے والد نے ان کو مرزا رحیم بیگ کی شاگردی میں دے دیا۔ جنھیں فارسی زبان و ادب سے خاص ربط تھا[1] اس عرصہ میں مولانا کو لغات کے مطالعہ کا بہترین موقع فراہم ہوا اور مشق تحریر بھی۔ مولانا نے مرزا رحیم بیگ کی خدمت میں رہکر جلد ہی فارسی زبان و ادب کی اچھی استعداد پیدا کرلی۔ گلستان و بوستان سعدی اور شاہنامہ فردوسی کے علاوہ دوسری کتب فارسی کا مطالعہ بھی کیا اور اساتذہ کے کلام کو بغور پڑھا۔ اس ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا کا داخلہ نارمل اسکول میں ہوا جہاں پر علم ہندسہ، علم ہیئت، فزیکل سائنس اور ریاضی وغیرہ مختلف علوم کی تعلیم حاصل کی۔ اسکے ساتھ ہی فارسی ادب کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ نارمل اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا نے رڑکی کالج میں داخلہ لیا۔

تدریس اور فارسی زبان کی خدمت رڑکی سے واپس آنے کے بعد وہ نارمل اسکول میں مدرس ہوگئے اور فارسی ادب کی خدمت انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ فارسی زبان و ادب کی نمایاں خدمت انجام دینے کے باوجود بھی مولانا کی فارسی دانی کی طرف اہل علم حضرات کی توجہ نہیں ہو سکی۔

فارسی سے شغف گو اردو ادب میں بچوں کے شاعر کی حیثیت سے ان کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی تاہم فارسی ادب اور شاعری سے بھی ان کی دلچسپی اور لگاؤ کم نہیں تھا۔

---

[1] حیات و کلیات اسمٰعیل۔ اسلم سیفی ص ۲۰۔

جس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوگا۔

"میرٹھ میں منشی نجم الدین صاحب کے دولت کدہ پر اہل کمال کا اجتماع ہوا کرتا تھا ایک دن کسی صاحب نے فرمائش کی کہ حاضرین میں سے ہر شخص اپنی پسند کا بہترین شعر سنائے۔ مگر یہ اتفاق تھا کہ جب مولانا کی باری آئی تو چمنستان اردو ادب کے خوشنوا بلبل کو اردو کا ایک شعر بھی یاد نہ رہا اور بالآخر حاضرین محفل سے اجازت لیکر انھوں نے فارسی کا حسب ذیل شعر سنایا۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد[1]

مولانا کا اردو کلام بھی فارسی کے اثر سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں انھوں نے مثنوی "فکر حکیم" لکھ کر سر سید احمد خاں کی خدمت میں بغرض ریویو پیش کی تو انھوں نے فرمایا اس میں فارسی ترکیبوں کی بھرمار ہے[2]

مولانا نے فارسی زبان کے فروغ میں بھی حصہ لیا اور کئی درسی کتابیں اس زبان میں لکھیں اور ان کی طباعت و اشاعت کے مصارف بھی برداشت کیے[3]

فارسی ریڈروں کا یہ سلسلہ انگریزی اسکولوں کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔ مولانا چونکہ قادر الکلام شاعر تھے اس لیے ان ریڈروں میں انھوں نے منثور کی طرح اپنا منظوم کلام بھی شامل کیا۔

مولانا کی نثری تصانیف کی تعداد کم نہیں ہے، مگر وہ طبع نہیں ہو سکیں، دراصل فارسی نثر نگاری میں بھی انھیں مہارت تامہ حاصل تھی۔ بعض جگہ تو ان کی تحریر پر گلستان سعدی کی کسی عبارت کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ان کی زبان میں جو سلاست

---

[1] حیات و کلیات اسمٰعیل، اسلم سیفی ص ۲۳۳ [2] ایضاً ص ۵۵ [3] ایضاً ص ۲۹۔

روانی اور اثر ہے وہ کسی اہل زبان سے کم نہیں اس لیے انہیں "سعدی ہند" کا لقب دینا بیجا نہیں ہے۔ یہاں بطور نمونہ چند سطور پیش کی جاتی ہیں:۔

آوردہ اند کہ عبدالقادر جیلانی در
عنفوان شباب جہت تحصیل علوم
عزیمت بغداد کردہ۔ مادر مہربان
چہل دینار زاد سفر داد و عہد
گرفت کہ جز سخن راست بہ زبان
نیارد و با چشم پر آب وداع نمود
چون از منزل ہمدان گذشتند
رہزنان کاروان را زدند و دست
بغارت کشادند ..... امیر دزدان
را با استماع این سخن حال متغیر شد۔
گفت ای جوان تو کہ ہنگام مخافت
عہد مادر را نقض نہ کنی ما چرا بدون
آفت پیمان خداوندی را بشکنیم۔۔۔
چو تیغ راستی توانی لشکری کشتن
ولیکن تیغ فولادی نہ ہر جای بکار آید

حضرت عبدالقادر جیلانی کے بارے
میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایام شباب
میں تحصیل علم کے مقصد سے بغداد
تشریف لے جا رہے تھے۔ مادر مہربان
نے زاد سفر کے لیے چالیس دینار
دیے اور یہ قول لیا کہ ہمیشہ سچ بولیں گے
یہ کہہ کر پر نم آنکھوں سے وداع کیا
مگر جس قافلہ میں وہ شامل تھے اس
پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور قتل
و غارتگری شروع کر دی....
ڈاکوؤں کے سردار کو سخت حیرت
ہوئی اور اس نے کہا کہ اس قدر
خوفناک حالات میں بھی تم نے
ماں کے دیے گئے قول کو نہیں توڑا
اور ہم بنا کسی آفت و پریشانی کے
خدا کے عہد کو توڑ دیتے ہیں، اگر
تیرے پاس سچائی کی تیغ ہے تو تو

اس سے لشکر کا بھی مقابلہ کر سکتا ہے

کیونکہ تیغ فولادی ہر جگہ کام نہیں آتی۔[1]

. . . .

مولانا کے غیر مطبوعہ ذخیرہ میں ایک مسودہ "قند پارسی" کے نام سے بھی دستیاب ہوا ہے جو غالباً ہائی اسکول کے نصاب کے لیے لکھا گیا تھا مگر زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ مولانا اساتذہ کے کلام کا مطالعہ نہایت ذوق و شوق سے کرتے تھے اور اس سے محظوظ ہوتے تھے انکا یہ ذوق تا دم حیات باقی رہا۔ انتقال سے چند ماہ قبل بعض اصحاب علم و فن جن میں مولانا ابو الحسن جوہر اور میر ابو آکولا لکھنوی بھی شامل تھے اور جن کی فارسی دانی بھی مسلم ہے ان کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے درمیان گفتگو حضرت امیر خسرو کے کلام پر بحث شروع ہوئی اور دیگر اساتذہ کا بھی ذکر ہوا۔ مولانا نے خسرو سے نیز دیگر اساتذہ کے اشعار حسب موقع اس روانی کے ساتھ سنائے کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

امیر خسرو سے دلچسپی مولانا صاحب طریقت شخص تھے۔ اس لیے بھی انہیں حضرت امیر خسرو کے کلام سے دلچسپی رہی ہوگی چنانچہ شمس العلماء نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی خواہش پر جب حضرت امیر خسرو کے کلام کی تصحیح اور اس پر تبصرہ کے لیے کسی موزوں شخص کی تلاش ہوئی تو قرعۂ فال مولانا ہی کے نام نکلا۔

مولانا نے اپنی عمر کے دو سال کا قیمتی وقت اس خدمت میں نہایت انہماک سے گذارا اور کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا مولانا کی یہ خدمت فارسی ادب میں بڑی اہمیت کی

---

[1] حیات و کلیات اسمٰعیل میرٹھی۔ اسلم سیفی صفحہ ۲۸۔

حاصل ہے چونکہ مولانا نے یہ خدمت بر بنائے خلوص انجام دی تھی لہذا انھوں نے خود کہا :-

ساختہ ام ہرزہ براہِ دراز برا ثرِ حکم نہ از روی آز

اب اصل موضوع یعنی مولانا کی مثنویات اردو فارسی کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔

فارسی شاعری کا مذاق | مولانا کی اردو شاعری سے تو اہل ادب اچھی طرح سے واقف ہیں مگر یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انھوں نے فارسی میں بھی تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن قصائد، مقطعات، غزلیات اور رباعیوں کے مقابلہ میں انکے کلیات میں مثنویات کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔

مولانا اپنے گرد و پیش کے حالات کا مشاہدہ بنظرِ غائر کرتے تھے اور ان سے پیدا شدہ تاثرات کو الفاظ کا جامہ عطا کرتے تھے۔ مولانا کا دور قدما یا متوسطین کا دور نہ تھا بلکہ ان کا تعلق ایسے دور سے تھا جس میں جدت اور حقیقت پسندی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ انھوں نے فارسی شاعری کی عام روش یعنی داستان گل و بلبل یا زلف و کاکل بتاں سے ہٹ کر اشعار کہے جو وقت کی ضرورت تھی۔ وہ عام لوگوں کی زندگی کے نشیب و فراز اور ان کو در پیش مسائل کا ذکر کر کے وہ انکا حل پیش کرتے تھے۔ اخلاقی قدروں کی حفاظت اور ان کی جانب لوگوں کو متوجہ کرنے کو اپنا ایمان سمجھتے تھے اپنے اس مقصد اور پیغام کو پہنچانے کے لیے انھوں نے سادگی، سلاست و روانی کو بہتر سمجھا اور ایسی تشبیہات، استعارات اور محاروں کا استعمال کیا جو مقبول عام و خاص ہوں۔ ہلکے پھلکے الفاظ میں تیر و نشتر کا اثر پیدا کیا۔ بھاری بھرکم اور پیچیدہ انداز کے بجائے آسان اور دلکش مگر موثر طرزِ سخن کو اپنایا۔

اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ کہیں ناصح بنے تو کہیں پر مناقشانہ اور کہیں مکالماتی انداز اختیار کیا اور یہ انداز ان کے اردو اور فارسی دونوں کلام میں یکساں طور پر نمایاں ہے۔ اخلاقی قدروں کی پستی سے انکا دل لہولہان تھا۔ دل میں سوز تھا ناصح ہونے کے باوجود انداز کو غیر دلچسپ نہیں ہونے دیا۔ مولانا سماجی اور معاشرتی اصلاح چاہتے تھے مگر انہیں تیز و تند لہجہ قطعی پسند نہ تھا۔ وہ زاہد تھے مگر زاہد خشک نہیں۔ تصوف کے بھی اعلیٰ مقام سے بخوبی واقف تھے مگر زندگی کی سخت ترین جدو جہد سے فرار انکا پیشہ نہ تھا اور نہ گوشہ نشینی کی زندگی انہیں پسند تھی۔

مثنوی نگاری سے دلچسپی کے اسباب ان کی یہ خصوصیات فقط اردو شاعری تک ہی محدود نہ تھی بلکہ فارسی کلام میں بھی ان کے یہ افکار و مقاصد نمایاں ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے مثنوی کو اس لیے زیادہ اہمیت دی کہ اس کا میدان نہایت وسیع ہے اور انسانی جذبات کے مختلف پہلوؤں عشق و محبت، رنج و غم، غیظ و غضب، کینہ و انتقام وغیرہ غرض ہر قسم کے موضوع کو بخوبی سمیٹ لینے کی قوت اس میں موجود ہے۔ انسانی جذبات کی طرح مناظر قدرت، بہار و خزاں، گرمی و سردی، صبح و شام، جنگل و بیاباں، کوہ و صحرا وغیرہ کی تصویر کھینچنے کی صلاحیت بھی اس صنف سخن میں پائی جاتی ہے، اخلاقیات، فلسفہ اور تصوف جیسے دقیق اور غامض مضامین کو بھی یہ ادا کر سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنی فارسی مثنوی نگاری میں اردو کے مقابلے میں کہاں تک کامیاب ہو سکے ہیں۔ اس کے لیے مولانا کے چند ہم مضمون اردو اور فارسی مثنویات کا تقابلی جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کلیات اسمٰعیل مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۳۹ء میں تقریباً دس ہم مضمون

مثنویات موجود ہیں جن میں سے چند کا مختصر جائزہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

۱:۔ مثنوی بادو آفتاب:۔ مذکورہ مضمون کو مولانا نے اردو زبان میں "مناقشہ ہوا و آفتاب" کے نام سے نظم کیا ہے اس میں مولانا نے تیزی و تندی کے مقابلہ میں نرمی و آہستگی کو ترجیح دیا ہے جو ان کی صلح پسند طبیعت کا اقتضا بھی تھا اور اخلاقی حیثیت سے بھی اس کو برتری حاصل ہے۔ فارسی کی مثنوی "باد و آفتاب" کے اشعار کی کل تعداد ستر ہ ہے اور اردو مثنوی مناقشہ ہوا و آفتاب تقریباً تیس اشعار پر مشتمل ہے۔ دونوں میں خیالات کی یکسانیت ہے اور دونوں کا انداز بیان بھی ملتا جلتا ہے۔ مولانا کی قادر الکلامی نے موضوع کے اعتبار سے دونوں مثنویوں میں بندش و چستی میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے دی ہے یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ مولانا کی مادری زبان فارسی نہ تھی۔ چنانچہ باعتبار تعداد اشعار اور روانی و سلاست کے اردو مثنوی میں جو خوبی موجود ہے اسکی بہ نسبت فارسی مثنوی "باد و آفتاب" میں مولانا سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہیں۔ مگر سلاست ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور نہ بھاری بھرکم اور مشکل الفاظ و محاروں کے استعمال سے معنی کو پُر پیچ اور بے لطف بناتے ہیں۔ مثال کے لیے چند اشعار اردو و فارسی دونوں مثنویات کے ملاحظہ ہوں:۔

فارسی	اردو
باد با آفتاب عربدہ جست	باد صحرا نے کہا یوں ایک روز
کہ ز ما ہر دو کیست چابک و چست	مہر تاباں سے کہ اے گیتی فروز
کیست پُر فن و کدام بے ہنر ست	تو ہے کلوی اور میں سفلی مگر

از من و تو کہ زورمند تر ست	زور بازو میں ہوں تجھ سے زبر
باید از بہر امتحان محکی	نیر اعظم نے فرمایا کہ ہاں
تا نہ ماند دگر مجال شکی	ہو اگر ثابت زروی امتحان

بولی جو یوں ہے تو اچھا یوں سہی
ہاتھ کنگن کے لیے کیا آرسی
آیئے زور آزمائی کیجئے
اس بکھیڑے کی صفائی کیجئے

چونکہ بات نزاع کی تھی اس لیے کلام میں زور پیدا کرنا بھی لازم تھا۔ اردو میں کہی گئی مثنوی کے اشعار کی تعداد زیادہ ہے اور زبان بھی بامحاورہ ہے تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فارسی مثنوی میں کوئی خامی ہے۔ کم سے کم الفاظ کا سہارا لے کر دل نشیں انداز میں بات واضح کی گئی ہے جو ان کا خاص انداز ہے۔ سادگی اور روانی بھی باقی ہے اور دلکشی بھی اردو کے اشعار سے کم نہیں۔

مولانا جہاں پر اصل مقصد بیان کرتے ہیں دونوں ہی مثنویاں ایک دوسرے کا ترجمہ معلوم ہوتی ہیں :-

در بیاباں مسافری دیدند	اک مسافر اپنی دھن میں تھا رواں
از بہائے نشانہ بگزیدند	اسکو ان دونوں نے تاکا ناگہاں
شرط کردند تا بقوتِ خویش	ہوگئے آپس میں طے قول و قرار
بکند ہر کہ جامۂ درویش	جو لبادہ لے مسافر کا اتار
لب بہ دعویٔ فضل بکشاید	بس اسی کے نام کا ڈنکا بجے

ورنہ بیہودہ زر اثر کم خاید	سر پہ دستار فضیلت دہ بجے

آگے اشعار میں مناقشہ کا بہترین انداز دیکھنے کو ملتا ہے :۔

مرد چون موج تیز صرصر دید	جب ہوا لیتی تھی چکر میں لپیٹ
دامن و آستین سبک برچید	بیٹھ جاتا تھا وہ دامن کو سمیٹ
بر بدو دوش چست کرد عبا	باندھ لی کس کر مسافر نے کمر
گشت ایمن ز صرصر و ز صبا	تا ہوا کا ہو نہ کپڑوں میں گذر
باد چندان کہ شور و شر انگند	تھک گئی آخر نہ اس کا بس چلا
نتوانست جامہ اش برکند	ٹل گئی سر سے مسافر کی بلا

جہاں پر مولانا اس مناقشہ کے ہیرو "آفتاب" کا ذکر کرتے ہیں انکا انداز دونوں میں ہی ایک ایسے صاحب فن کا ہو جاتا ہے جو اپنے ہیرو کی فتح پر جی کھولکر خوش ہوتا ہے چنانچہ ذیل کے اشعار میں مولانا کا زور کلام قابل دید ہے :۔

فارسی	اردو
آفتاب آمدہ بنوبت کار	تمکنت چہرے سے اسکے آشکار
کرد آغاز تافتن بہ وقار	چال میں ایک بردباری اور وقار
اندک اندک حرارتی افزود	جب چڑھا خورشید سمت الراس پر
مرد ناچار بند جامہ کشود	بیٹھ کر سایہ میں پھر تو گھاس پر
از بن موی خوے بجوش آمد	دور پھینکا اس لبادہ کو اتار
تا عبایش و بال دوش آمد	واہ رے سورج لیا میدان مار

اگر چہ اردو مثنوی کے بعد کے اشعار میں مولانا نے جس با محاورہ زبان کا

استعمال کیا ہے وہ فارسی میں نہیں ہے تاہم معنی میں فرق نہیں آنے دیتے۔ ذیل کے
اشعار میں انھوں نے ناصحانہ انداز اپناتے ہوئے کہا :۔

بعد از آن آفتاب با تپ و تاب	تیزی و تندی کے گردیدہ ہیں سب
نیز با باد تند کرد خطاب	کامیابی کا گر ہے اور ڈھب
کہ بآہستگی بر آید کام	اس کا گرُ ہے نرمی و آہستگی
نہ بہ تندی و تیزی و ابرام	سرکشی کی رگ اس سے ہے دبی

۳۔ کشفی و خرگوشی :۔ اس مثنوی کو مولانا نے اردو میں "ایک کچھوا اور
خرگوش" کے نام سے نظم کیا ہے۔ فارسی مثنوی کے اشعار کی تعداد سولہ[۱۶] ہے۔
اور اردو مثنوی اڑتیس اشعار پر مشتمل ہے۔ علاوہ بریں ایک نمایاں فرق یہ ہے
کہ دونوں کا انداز بیان جدا ہے۔ تاہم موضوع کے اعتبار سے یہ نہیں کہا
جا سکتا کہ فارسی مثنوی اردو مثنوی سے کسی طرح کم ہے۔ دونوں مثنویات میں
ہمیشہ کی طرح صبر و تحمل، ہمت و پامردی کی ترغیب دیتے ہیں اور خرگوش کے
تکبر کو کچھوے کی ناتوانی اور بیچارگی کے مقابلے میں ذلیل ٹھہراتے ہیں اور یہ واضح
کرتے ہیں کہ کبر و غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے اور پیہم جد و جہد وقتی جوش و
خروش سے بہتر ہے کیونکہ خود نمائی اور خوش فہمی خرگوش کے مانند انسان
کو بھی خواب غفلت میں ڈال دیتی ہے چنانچہ کہتے ہیں :۔

فارسی	اردو
دور تر نقطۂ نشان دادہ	الغرض اک مقام ٹھیرا کر
رو بآن نقطہ ہر دو افتادہ	ہوئے دونوں حریف گرم سفر

کشفِ آہستہ تر قدم بہ قدم	لگے زوروں پہ تھا چڑھا خرگوش
بے درنگی ہمی رود پیہم	تیزی پھرتی سے یوں بڑھا خرگوش
باز خرگوش تند گشتہ رواں	جس طرح جائے توپ کا گولا
تیز تر ہم چو باد و برق دواں	یا گرے آسمان سے اولا
سیر و گردش کنان یمین و یسار	ایک دو کھیت چوکڑی بھر کے
باز گہ دیدہ بر خط رفتار	اپنی چستی پہ آفرین کر کے
یک دو میدان دویدہ در نفسی	کسی گوشہ میں سو گیا جاکر
خویشتن را ہمی ستودہ بسے	فکر کیا ہے چلیں گے ستا کر

مذکورہ بالا اشعار کے مطالعہ سے یہ واضح ہے کہ اردو مثنوی کے تمہید کے اشعار میں فارسی مثنوی کے نسبت زورِ کلام، چستی، دلکشی اور اثر زیادہ ہے۔ خرگوش کے ذریعہ کیے گئے طعن و تشنیع کو مولانا نے اصل حکایت سے قبل کئی اشعار میں نظم کیے ہیں مگر فارسی میں انہیں افکار کو انھوں نے فقط ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ پھر بھی مولانا کا یہی ایک شعر اردو مثنوی کے کئی اشعار پر فوقیت رکھتا ہے۔ شعر حسب ذیل ہے:۔

خندہ بر سستی حریف زدہ	طعن و تشنیع بر ضعیف زدہ

مصرعہ دوم میں لفظ ضعیف کا استعمال کر کے مولانا نے خرگوش کی مغرور طبیعت اور اس کی دون ہمتی کو واضح کر دیا ہے۔ نیز خرگوش کی غفلت اور بے پروائی کو بھی بڑے سادہ اور سلیس انداز میں بیان کیا ہے:۔

فارسی	اردو
چون حریفش بگہ داو نرسید	ایک دو کھیت چوکڑی بھر کے

پا ز رفتار باز پس بکشید
گفت حالا دمی بیا سایم
خود چرا زود راہ پیمایم
ہمہ را دور دوش بداد از یاد
دیدہ بربست و سر بخواب نہاد

اپنی چستی پہ آفریں کر کے
کسی گوشہ میں سو گیا جا کر
فکر کیا ہے چلیں گے سستا کر

اہلِ نظر اردو، فارسی دونوں مثنویوں کے اشعار کے مطالعہ سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مولانا کے فارسی اشعار اردو کے اشعار پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ اردو مثنوی کے آغاز میں مولانا نے بڑی جولانی دکھائی ہے اور اس امر میں قطعی کلام نہیں کہ مذکورہ اشعار میں کمال کی روانی اور دلکشی ہے، محاوروں کے استعمال سے حسن دوبالا ہو جاتا ہے مگر اصل مدعا جہاں پر بیان کرنا چاہتے ہیں وہاں پر اردو کے مقابلے میں فارسی مثنوی اشعار میں زور زیادہ ہے۔ الفاظ کا استعمال جس سلیقہ سے کیا ہے وہ اردو میں نہیں ملتا اور یہ مولانا کی فارسی گوئی کا کمال ہے۔

چونکہ حکایت مناقشانہ ہے، خرگوش کو اپنی تیزیٔ رفتار پہ جو کبر و غرور ہے یہی اس کی کامیابی میں سدِ راہ ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ذیل کے شعر میں وہ تمام چیزیں یکجا ملتی ہیں:۔

چوں حریفش بگرد و در رسید پا ز رفتار باز پس بکشید

اردو اور فارسی دونوں مثنویوں کے آخری اشعار سے کچھوے کی لاچاری اور بےچارگی کے باوجود اس کی شجاعت اور محنت کش ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

مولانا کا ناصحانہ انداز یہاں بھی موجود ہے۔ ساتھ ہی ان اشعار میں محنت اور مشقت کی ترغیب بھی ملتی ہے جو اس مثنوی کی جان ہے۔ اشعار حسب ذیل ہیں:۔

رہ بریدہ بزحمت بسیار — کام کرتا رہا جو پے در پے
پیشتر آمدہ بجای قرار — کر گیا رفتہ رفتہ منزل طے

اور خرگوش کے عبرتناک انجام کو مولانا نے اردو میں اس طرح بیان کیا ہے۔

حیف خرگوش رہ گیا سوتا — ثمرہ غفلت کا اور کیا ہوتا
صبر و محنت میں ہے سرفرازی — سست کچھوئے نے جیت لی بازی

مگر فارسی مثنوی میں مناقشہ کا فیصلہ خود قاری کے اوپر چھوڑ دیا ہے:۔

خود بدانید تا کہ برد کہ باخت — رخشِ فرزانگی بجا باید تاخت

دوسری مثنویاں | ایسی ہی ہم مضمون مثنویات میں ایک مثنوی بہ عنوان "سیر" بھی ہے۔ مولانا کی دقیق النظری کا کمال ہے کہ انھوں نے ایک درندہ کی دونوں صفتوں خوبی اور خامی کو دیکھا اور الفاظ کے جامے میں پیش کیا اس میں شیر اپنی قوت کی بنا پر اور ظلم و تشدد کے سبب دیگر تمام جنگلی جانوروں پر حکومت کرتا ہے اور سب جانور اس کے جبر و تشدد سے مجبور ہوکر ڈرتے سہمے اس کی بادشاہت قبول کرتے ہیں، مگر ایسی بادشاہت لعنت کا سبب بنتی ہے اور تمام جانور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ بغض و عناد رکھتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے "شیر" کو ایک حاکم کی شکل میں پیش کرکے بادشاہوں کے ستودہ اوصاف اور ظلم و تشدد کے برے نتائج کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اور یہ واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ جبر و تشدد پر حکومت کی بنیاد قائم تو کیجا سکتی ہے مگر

یہ بنیاد پائدار نہیں ہوتی۔ اپنے اس مقصد کو مولانا نے اپنی فارسی مثنوی میں نہایت سادگی اور پُرکاری سے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ شیر کی شجاعت خود اس کی زبان حال سے ادا کر کے اس کے کبر و غرور اور خود نمائی اور خود ستائی کو واضح کیا ہے جو بظاہر بہت دلچسپ اور خوبصورت ہے مگر در پردہ ان اوصاف کی خامی بھی ظاہر کی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں :-

شیر بگوید کہ منم پادشاہ   نیست مرا حاجتِ تاج و کلاہ
ناخن و سرپنجہ و دندانِ من   بس بود این دبدبۂ شانِ من
بانگ زنم تند چو بر دام و دد   زلزلہ در کوہ و بیاباں فتد
بر سرِ صیدے کہ کنم پنجہ تیز   پوست بدرم کنمش ریزہ ریز

- - - - - -   - - - - - -

- - - - - -   - - - - - -

مگر یہ بہادری یہ کر و فر یہ شان و شوکت انصاف پسند شاعر کو یہ کہنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے کہ :-

حیف بریں خوئے تو اے شرزہ شیر   از چہ بخون و گرانی دلیر
چون تو نخواہم کہ شوم پادشاہ   پادشہ ظالم و کم خیر خواہ

مولانا نے فارسی مثنوی میں جہاں "شیر" کی فطرت کو اس کی خامی کی شکل میں پیش کیا ہے وہیں اپنی اردو مثنوی بعنوان "شیر" میں اس کی شجاعت، ایک شاہانہ جاہ و جلال، جوش و خروش، رعب و دبدبہ کو بڑے حسین انداز میں پیش کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں :-

اے شیر تیرے تن پہ ہے طاقت کا پوستیں | شاہی کے حق میں کوئی بھی ساجھی ترا نہیں
پیدا ہے تیرے رخ سے تری شوکت او جلال | ظاہر ہے تیری شکل سے باطن کا تیرے حال
تیرا حریف کون ہے جو تو ہٹے بچے | جھپکے نہ تیری آنکھ نہ گردن تری لچے

. . . .

. . . .

ان اشعار کے بعد مولانا نے شیر کی فولادی قوت کے فائدوں کا بھی بڑے دلکش اور دلنشین انداز میں ذکر کیا ہے :-

اے شیر گرم خطہ ہے تیرے لیے وطن | بیہڑ ہو نیستاں ہو جھاڑی ہو یا ہو بن
لو ہو کہ گرم دھوپ ہو یا ریگزار ہو | تینوں غضب ہیں کیوں نہ مسافر شکار ہو
اے شیر تو ہے شاہ سرا تخت ہے کچھار | ہے کس کو تیرے ملک میں دعویٰ گیر و دار

اس طرح تمثیلی انداز میں پادشاہی کے ستودہ اوصاف کو بیان کرکے مولانا نے اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے

رب العالمین کی تمام مخلوقات خواہ ہیبت ناک درندہ شیر ہو یا مور ناتواں، شجر و حجر ہوں یا کوہ و دشت مولانا نے سب کا بنظر غائر مشاہدہ کیا اور ہر ایک کے اندر موجود خوبی و خامی کو اپنے انداز میں پیش کیا یہ مولانا کی فہم و ذکا اور ان کا ادراک تھا جس نے مور ناتواں سے بھی بہترین سبق حاصل کیا اور نیرنگی طاؤس کے کبر و غرور کو اشرف المخلوقات کے لیے درس عبرت بنا کر پیش کیا۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان میں ایک مثنوی "مور و کلنگ کی کہانی" کے عنوان سے ایک مناقشہ کی صورت میں پیش کیا ہے اور فارسی میں "فلسفۂ طاؤس" کے نام سے مثنوی کہی ہے۔ مذکورہ دونوں

مثنویوں کا مقصد ایک ہے مگر انداز جدا ہیں۔ بطور نمونہ چند اشعار پیش ہیں :۔

نہ بینی کہ طاؤس گردن فراز　　کشاید ہمی بال و پر ہا بناز

ز قوس قزح رنگہایش فزوں　　تو گوئی کہ از جنت آمد بروں

ولی بانگ ناخوش کند متصل　　چو شب بشنوم ہولم آید بدل

سخن برگزیدم ازین جانور　　کہ دانش بہ است از قبا ہای زر

شرف آدمی را نبخشد لباس　　چہ دیبائے معلم چہ کہنہ پلاس

. . . .　　. . . . .

و خود بینی و عجب و کبر و غرور　　نہ راحت میسر شود نے سرور

مور کے حسن و جمال کو بیان کرنے کے بعد مولانا کی توجہ اس خوبصورت پرندہ کی خود نمائی اور اس کے کبر و غرور کی طرف جب جاتی ہے تو ان کو اس حسن میں بھی قباحت نظر آنے لگتی ہے اور کہتے ہیں :۔

ولی بانگ ناخوش کند متصل　　چو شب بشنوم ہولم آید بدل

اسنے پر ہی موقوف نہیں کرتے بلکہ ایک نصیحت پیش کرتے ہیں کہ آدمی کو شرف اس کے لباس زریں سے نہیں بلکہ علم و عقل و دانش سے حاصل ہے۔

اس عنوان کو مولانا نے اردو میں بڑی روانی اور سادگی کے ساتھ ایک مور اور کلنگ کی کہانی کے عنوان سے نظم کیا ہے۔ آغاز مثنوی میں تو مولانا مور کے حسن و جمال کو بڑے پر جوش انداز میں بیان کرتے ہیں مگر اسی ضمن میں مولانا کی مقصدیت غالب آجاتی ہے اور جب کلنگ سے مور کہتا ہے :۔

میری سی کہاں ہے آپکی دم　　کر سکتے نہیں مقابلہ تم

تو مولانا کی انکساری میں جوش پیدا ہو جاتا ہے اور کلنگ کی زبانی مور کی خامیوں پر اس کی توجہ مبذول کرانے لگتے ہیں چنانچہ منکسرالمزاجی کے باوجود کلنگ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے :-

لیکن نہیں کچھ بھی کام آتے بچوں ہی کے دل کو ہیں لبھاتے

مناقشہ کا خاتمہ بھی بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔

منھ اپنا سا لے کے رہ گیا مور تھا اسمیں کہاں اڑان کا زور

بھاتا ہے جنھیں نرا دکھاوا وہ لوگ ہیں مور کے بھی باوا

بس ان کو ہے ٹیپ ٹاپ کی دھن شیخی کے سوا نہیں کوئی گن

مولانا نے اپنے فصیح محاوروں سے اردو مثنوی میں حلاوت اور چاشنی پیدا کر دی ہے، دیکھکر دنگ رہ جانا، دل لبھانا، منھ اپنا سا لے کر رہ جانا وغیرہ۔ مگر فارسی مثنوی بھی الفاظ کی چستی اور خوبصورت تشبیہات کے لحاظ سے اچھی [illegible] اندر رکھم دلکشی نہیں رکھتی۔

اسی طرح سے مولانا نے اور بھی کئی ہم مضمون مثنویات اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نظم کی ہیں، مثلاً سگ، مادر و طفلکی جسے اردو میں ماں اور بچہ کے نام سے نظم کیا ہے۔

ہم مضمون اردو فارسی مثنویات کے علاوہ دیگر فارسی مثنویات بھی ان کے کلیات میں موجود ہیں جو موضوع اور بیان دونوں اعتبار سے نہایت [illegible] اگرچہ وہ مضامین مولانا کی اردو مثنویات میں نہیں ملتے تاہم دیگر اصناف سخن میں موجود ہیں۔ وفاشعاری، راست بازی، عدل وانصاف غرض تمام [illegible] ناصحانہ مضامین گو اپنے اندر دلکشی نہیں رکھتے اور خشک ہوتے ہیں مگر یہ مولانا کا کمال ہے کہ

انھوں نے ایسے خشک مضامین میں بھی کیف و حلاوت اور چاشنی پیدا کر دی ہے۔
ایسی ہی مثنویات میں ایک مثنوی "کاخ ویرانہ" ہے جس میں مولانا نے ایوان شاہی
کے عبرتناک انجام کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ مثنوی مذکور کے اشعار
کی تعداد کل سولہ ہے اور یہ مولانا کی قادرالکلامی ہے کہ ہر شعر میں انتہائی درد
و اثر موجود ہے اس کے ہر لفظ سے حسرت و یاس نمایاں ہے۔ تمام اشعار کا
نقل کرنا تو ممکن نہیں تاہم چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

بگشتیم روزی بہ ویرانۂ — کہ بودہ ست ایوان شاہانۂ
ندا آمد از تودۂ سنگ و خشت — کو بودیم وقتی چو خرم بہشت

. . . . — . . . .

. . . . — . . . .

بزرگانِ با شوکت و ارجمند — نشستہ درین بارگاہ بلند
بیک ناگہان گردشِ روزگار — ببرد از چمن رونقِ نوبہار

. . . . — . . . .

. . . . — . . . .

تمام جاہ و حشم و رونقِ بہار چشم زدن میں نابود ہوگئی اور پہلے کی رونق
کی جگہ ویرانے نے لے لی۔

ز دنیا بر این بقعہ یک تن نماند — شب آمد ولی شمع روشن نماند
بجا ہای ایوانِ آراستہ — گیا رستہ و خار بن خاستہ

. . . . — . . . .

. . . .

نام و نشان مٹ گیا طاق و ایوان باقی نہ رہے حتیٰ کہ اس بربادی پر آنسو بہانے والا بھی کوئی باقی نہ رہا۔ ہاں اگر کچھ باقی رہ گیا تو وہ ہے عدل و انصاف کی داستان:۔

نکو یادگاری کہ عدل ست و داد ازایشان ہمی خلق دارد بیاد

یہ تو مولانا کا وہ عام انداز ہے جو ان کی اردو و فارسی شاعری میں جابجا ملتا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا کا ایک اور رنگ ہمیں ان کی فارسی شاعری میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے وہ ہے تصوف مولانا چونکہ صاحب طریقت تھے اور مقامات تصوف سے اچھی طرح واقف بھی، چنانچہ اپنے اردو کلام میں ایک جگہ کہتے ہیں:۔

"اگر پوچھے کوئی مجھ سے سنیں ہجری و فصلی

مقامات طریقت ہے مقالات طریقت ہے"

ان کا یہ رنگ ان کی شاعری میں ہر جگہ غالب ہے۔ مولانا کا تصوف سے قلبی تعلق تھا اور یہ تعلق خاطر ہمیں ان کی ایک فارسی مثنوی میں جو انھوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا سید غوث علی شاہ پانی پتی کے وصال پر کہی تھی..... جس آب و تاب اور پورے سوز و گداز کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے ان کے کلام میں کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا۔ مولانا تصوف کے رموز سے خوب واقف تھے چنانچہ مثنوی مذکور میں عشق کے تمام مدارج کے ساتھ ضبطِ نفس، ترکِ دنیا، صبر و قناعت، فقر و استغنا، راضی برضائے الٰہی اور فنا فی البقاء، غرض تمام چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مقالۂ ہذا میں مولانا کے متصوفانہ کلام پر تفصیلی بحث ممکن نہیں چنانچہ اس رنگ کے چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

۱۔ تو بری از اقتران و افتراق
از خیالات است این ہجر و فراق

۲۔ چند رد مدّ بحر و ہم موج و حباب
گر ببینی جملہ یک آب است آب
(فنا)

۳۔ نیست مردانِ خدا را ہیچ بند
برترست از جسم و جاں بیچون و چند
(آزاد نفسی)

۴۔ ایں حیات و ایں ممات از شرک ہست
وحدتِ مطلق بود در خویش مست
(وحدت الوجود)

۵۔ آنکہ او زندہ است حی و قائم است
لایموت ولا یزال و دائم ست
(بقا)

۶۔ نقد درویشاں تہیدستی بود
دست منزدِ شاں ہمی مستی بود
(فقر)

صاحب المثنوی

(قاضی تلمذ حسین مرحوم گورکھپوری)

مشہور صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومیؒ کی شہرۂ آفاق مثنوی میں جس دلنشین طریقہ سے اسلامی عقائد واعمال اور تصوف کے مسائل کو سمجھایا گیا ہے اسکی نظیر کسی دوسری کتاب میں مشکل سے مل سکتی ہے قاضی تلمذ حسین صاحب نے اس کتاب میں انکی مفصل و محققانہ سوانح لکھی ہے۔

اردو میں سب سے پہلے مولانا شبلیؒ نے مولانا رومؒ کی سوانح عمری لکھی تھی لیکن اس میں سوانح کا حصہ بہت مختصر ہے زیادہ زور مثنوی کی خصوصیات دکھانے میں صرف کیا گیا ہے جو مصنف کا اصل مقصود تھا۔ سوانح کی اس کمی کو اس کتاب میں پورا کیا گیا ہے۔ قیمت ۷/۵ روپے۔

سنسکرت سے ماخوذ عربی۔ فارسی اور اردو ادب

از جناب رام لعل نابھوی۔

(۳)

مختلف کتب اردو

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مؤلف	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱	تتوا پدیش					۴۴			اردو ترجمہ ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیکھئے مقالات گارساں دتاسی جلد اول ص ۶
۲	پرابودھ چندرادے								"پرابودھ چندرادے" مشہور سنسکرت ڈراما کا اردو ترجمہ شایع کیا ہے۔ دیکھئے مقالات گارساں ص ۲۲۔
۳	پرابودھ چندرادے								قبل جگل بی داس دہلوی اردو میں لکھ چکے ہیں " " "
۴	الکھ پرکاش					۴۰۸			اپنشد کا ترجمہ اردو۔ منشی کنہیالال ۴۰۸ صفحات " " " ص ۳۴
۵	سنسکرت کے شلوکوں کا ترجمہ	راگوبیندر راؤ جذبؔ							دیکھئے داستانِ حیدرآباد صفحہ ۱۸۳۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مخطوطہ مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۶	کلیلہ و دمنہ								ڈاکٹر رشید علی نے ۱۸۹۱ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ششم میں علی گڑھ میں پڑھا اور ۱۸۹۲ء میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوایا۔ دیکھئے [illegible] صفحہ ۱۰۔
۷	اپنشد								[illegible] اپنشد کا سلسلہ اکتوبر ۱۹۰۵ء کے رسالہ مخزن میں چھپوایا۔ دیکھئے تمدن عرب صفحہ ۱۲۔
۸	مجموعہ اپنشد								موہن سنگھ وئید کا کلکشن پنجابی یونیورسٹی۔ پٹیالہ
۹	سانکھیہ فلاسفی								ایضاً
۱۰	اپنشد ترجمہ								ایضاً
۱۱	بھگت مال				مطبع منشی ۱۹۲۵ء	[illegible]	بڑا	منثور	نابھوی کتب خانہ۔ یہ دوبارہ چھپی تھی۔ پہلے گروند مطبع میں ۱۹۱۲ء میں چھپی تھی۔
۱۲	آتما پوجن	سیوا لال تاجر	مطبوعہ	×	نولکشور ۱۸۹۸ء	۶	بڑا	منثور	نابھوی کے پاس ہے۔
۱۳	کتھا ست نرائن	لالہ نگا میر	″	×	نولکشور ۱۹۰۳ء	۱۲	″	منظوم	″ ″
۱۴	حکمت چالیسی	شنکر دیال فرحت	″	×	نولکشور ۱۹۲۴ء	۱۶	چھوٹا	″	″ اسکا ایک اور نسخہ ۱۹۰۶ء کا نابھوی کے پاس ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مولف	مطبوعہ / غیر مطبوعہ	یا قلمی	سال طباعت / نام پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱۵	سداماں چرتر	شنکر دیال فرحت	مطبوعہ	×	نولکشور ۱۹۱۸ء	۱۸	ڈیمائی	نظم	ناجوی کے پاس ہے
۱۶	گجیندر موکش	جگموہن [illegible]	[illegible]	×	نولکشور ۱۸۹۹ء	۸	-	”	” ”
۱۷	جرنیٹ بنجر یکا سنسکرت کا ترجمہ اور صوت کا ترانہ	منور لکھنوی	”	×	مجمع المطابع ۱۹۵۰ء	۱۶	چھوٹا	”	” ”
۱۸	بشن سہسر نام	×	”	×	مطبع افتخاری	۸۸	بڑا	منثور	” سنسکرت متن ساتھ ہے۔
۱۹	پتنجلی کرت یوگ درشن کا ترجمہ	جگدیش چندر واچسپتی	”	×	راجپال اینڈ سنز ۱۹۲۲ء	۲۸۸	چھوٹا	”	ناجوی کے پاس ہے۔
۲۰	پتنجلی کرت یوگ درشن کا ترجمہ مع سنسکرت	×	”	×	ودیا ساگر پریس ۱۹۰۰ء	۹۵	بڑا	”	” ”
۲۱	اردو دوست انکر	کیول کشن خالص	”	×	نولکشور ۱۸۸۱ء	۱۲۱	”	”	” ”
۲۲	بشن سہسر نام	رائے چندن لعل	”	×	گیان پریس	۸۹	ڈیمائی	”	” ”
۲۳	اشٹاوکر گیتا	نرسنگھ داس	”	×	×	۸۰	چھوٹا	”	” ”
۲۴	مجموعہ اپنشد	پیارے لال	”		۱۹۰۰ء ودیا ساگر پریس				جلد اول دیکھئے زبان وادب اپریل ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۹۔
۲۵	اپنشد مع شرح	سدیو نرائن مہر	”						چار جلدوں میں۔ جلد اول ۱۹۱۲۔ جلد سوم ۱۹۱۵ء۔ جلد دوم، چہارم ۱۹۱۷ء۔ دیکھئے زبان وادب اپریل ۱۹۶۲ء۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۲۶	اپشاواسیہ اپنشد کے آٹھ منتر پیام راحت کے نام سے	بھاگ مل سینی			۱۹۲۹ء الیکٹرک پریس جالندھر				دیکھئے زبان و ادب اپریل ۱۹۴۶ء
۲۷	جھاندگیہ اپنشد معہ اماالکاشفہ	باوا گلمیدہ سنگھ بیدی	مطبوعہ		آنند پریس لاہور				،، ،،
۲۸	کٹھ ۔ کین ۔ ایش اپنشد	درشنانند سرسوتی	،،		۱۹۳۷ء مفید عام پریس لاہور				،، ،،
۲۹	منوسمرتی	ایشرداس مترجم							دیکھئے صفحہ ۱، فہرست کتب عربی و فارسی سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر۔
۳۰	لیلاوتی فیضی	دیبی چند			سیالکوٹ ۱۲۷۱ ہجری				دیکھئے فہرست کتب پنجاب پبلک لائبریری لاہور ۱۹۳۶ء صفحہ ۷۰۔
۳۱	سنگھاسن تبیسی	رنگ لال			لکھنؤ ۱۸۷۱ء				،، ،، ۱۰۴
۳۲	شکنتلا	کالیداس			سیالکوٹ ۱۹۲۵ء				،، ،، ،، ۱۴۱ یہ نمبر ۹۲ پہ پھر درج ہوئی
۳۳	وکرم اروسی	مرتبہ محمد عزیز مرزا	،،		لکھنؤ [illegible]				،، ،، ۱۴۱
۳۴	پربودھ چندرادے ناٹک کا ترجمہ رسالہ تہذیب نسواں	آغا حسن			گوجرانوالہ				،، ،، ۱۳۷
۳۵	الکھ پرکاش ترجمہ اپنشد	کنھیا لال الکھ دھاری			سیالکوٹ			،،	،، ۱۷۸

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	مستعمل شدہ	کیفیت
۳۶	اپ مکند پرکاش	مہا دیو داس المعروف غریب منشی	مطبوعہ	×	لاہور ۱۹۰۰ء				دیکھئے فہرست کتب اردو پبلک لائبریری لاہور صفحہ ۱۷۸
۳۷	کرپال بھی اپ دنت مہن اسو نتر	رام سہائے			لکھنؤ				〃 〃 ۱۸۰
۳۸	کتھا ست نرائن	بختاور سنگھ			لکھنؤ ۱۸۸۸ء				〃 〃 〃
۳۹	ست نرائن کتھا	جگن ناتھ			لکھنؤ ۱۸۸۰ء				〃 〃 〃
۴۰	پاراسر سمرتی				گوجرانوالہ				〃 〃 〃
۴۱	رام بلاس ترجمہ پنڈت وسنت سہائے	رام بہروس			〃				〃 〃 〃
۴۲	دھرم ساگر ترجمہ منو سمرتی				سیالکوٹ				〃 〃 〃
۴۳	ترجمہ جاگولک سمرتی				گوجرانوالہ				〃 〃 〃
۴۴	بھگت پال	تلسی رام			لکھنؤ ۱۹۲۷ء				〃 〃 ۱۸۴
۴۵	دیرم درپن ترجمہ سمرتی	محل سنگھ			گوجرانوالہ				〃 〃 〃
۴۶	لال چندر رکھا ترجمہ				لکھنؤ				〃 〃 〃
۴۷	نائیک نتی اور بھرتری ہری شنکر نمائے درشن گوتم	ودیشانند			لاہور ۱۹۱۰ء				〃 〃 ۱۸۷
۴۸	ویسسک درشن	〃			〃				〃 〃 〃
۴۹	سانکھ درشن	〃			〃				〃 〃 〃

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	نام پریس سال	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۵۰	راج یوگ (یوگ درشن کا ترجمہ)	سوامی وویکانند مترجم شیوبرت لال	مطبوعہ						دیکھئے فہرست کتب اردو پبلک لائبریری لاہور ۱۹۳۷ء صفحہ ۱۸۸
۵۱	در نیتی	منی رام فارغ			میرٹھ ۱۸۹۸				فہرست کتب اردو سکھ ریفرنس لائبریری شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی ۱۹۵۰ء صفحہ ۱
۵۲	راج ترنگنی	جوہر شاہ پنڈت							بشرح صدر
۵۳	سانکھیہ درشن	دیوان چند			آتمارام لاہور				بشرح صدر صفحہ ۲۵
۵۴	پیام راحت (ایسادرسیدہ اپنشد کا ترجمہ)				ہوشیارپور				" ۴۲
۵۵	گیت گووند	گلاب رائے پنڈت			فیض عام مطبع ۱۹۳۹ء				" ۵۴
۵۶	منوسمرتی		مطبوعہ		۱۸۸۳ء				فہرست کتب آصفیہ لائبریری حیدرآباد صفحہ ۵۴۷
۵۷	ویشیشک شاستر	پیارے لال	"		۱۹۰۰ء				" " "
۵۸	یوگ شاستر	"	"		"				" " "
۵۹	ایشا اپنشد	×	"	×	ستمبر ۱۹۳۷ء سوامی جیون	۸۰	چھوٹا	منثور	کتب خانہ ناہوری
۶۰	منوسمرتی اردو ترجمہ	×	"	×	علی گڑھ	۳۴۴	"	"	" "
۶۱	معیار المکاشفہ (چھاندوگیہ اپنشد کا ترجمہ)	باوا گمینہ سنگھ	"	×	ابراہیم پریس لکھنؤ	۲۲۹	"	"	" "

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	نام پریس سال	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۶۲	آتم سکشات کار ترجمہ شنکراچاریہ	پرکاش منوہر [illegible]	مطبوعہ	×	نولی آرٹ پریس الہ آباد	۱۲۸	چھوٹا	منثور	کتب خانہ نابھوی
۶۳	چھاندوگیہ اپنشد	سورج نرائن مہر	〃	×	سادھو پریس ۱۹۱۷ء	۲۲۰	〃	〃	〃 〃
۶۴	تتو بودھ اردو ترجمہ شنکراچاریہ کرت	نرسنگھ داس	〃	×	ڈیرہ دون	۳۲	〃	〃	〃 〃
۶۵	بھگوت سنگیت ترجمہ اپنشاد اسیل اپنشد	بابو بھگمن سنگھ بیدی	〃	×	لکھنؤ گلشن [illegible] ۱۹۲۳	۸۰	ڈیمائی	〃	〃 〃
۶۶	منوسمرتی	بھگوان ڈیل ناقل	〃						جو کہ مع تصویر ایک صفحہ کی دھرم لیگ ۵ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء
۶۷	طراز حکمت ترجمہ کلیلہ و دمنہ	دیبی پرشاد بشاش	〃					منظوم	راجستھان میں غیر مسلم حضرات کی فارسی خدمات ۔ عربک انسٹی ٹیوٹ ٹونک صفحہ ۳۴۴
۶۸	نل و من	بھگونت رائے کاکوری			۱۲۲۴ ہجری	۴۸	ڈیمائی	〃	نابھوی کتب خانہ
۶۹	اپنشد یجروید برہمانند ولی	شیو پرشاد ناقل	قلمی		سنہ ۱۹۱۶ء		〃	〃	〃 〃
۷۰	ایشاداس اپنشد	〃	〃		۱۹۱۶	۸	〃	〃	〃 〃
۷۱	اپنشد بورگ ولی	〃	〃		〃	۱۱	〃	〃	〃 〃
۷۲	گربھ اپنشد	〃	〃		〃	-	〃	〃	〃 〃
۷۳	اپنشد رگ وید	〃	مطبوعہ		〃	۱۳	〃	〃	〃 〃
۷۴	شبت اپنشد	〃	قلمی		〃	۳۱	〃	〃	〃 〃

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مؤلف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	نام پبلشر سال	صفحے	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۷۵	شکنتلا	کالیداس پریم پال اشک	مطبوعہ					منظوم	"سہرشا ایک مطالعہ" کتاب میں درج ہے۔
۷۶	شکنتلا	کالیداس ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	"		۱۹۴۳				نابھا ڈسٹرکٹ لائبریری میں ہے۔
۷۷	"	ساغر نظامی	"		۱۹۶۱	۲۰۶		منظوم	اسٹیٹ لائبریری چنڈی گڑھ میں ہے۔
۷۸	ترجمہ پوتھی جاتکابون	لالہ جگیوپال							اشتہار شو پران نولکشور
۷۹	ہت اپدیش	لال جی							" "
۸۰	اردو ترجمہ								اشتہار کتاب دیباچہ الکہ پرکاش کیدار ناتھ اینڈ سنز بک ایجنٹ میرٹھ شہر۔
۸۱	نیائے درشن	اردو							" "
۸۲	یوگ درشن اردو								" "
۸۳	اتو سنگھار کا منظوم ترجمہ اکسیر سخن	اردو پیارے لال کی	مطبوعہ		۱۹۱۳				پریم چند۔ کچھ نئے مباحث از مانک ٹالا۔ صفحہ ۲۳۔ مقدمہ منشی پریم چند کا ہے۔
۸۴	شکنتلا کالیداس کا ترجمہ	راجہ شیو پرشاد							دیکھئے پریم چند۔ کچھ نئے مباحث صفحہ ۲۲۔
۸۵	وکرم اروسی	مولوی محمد							" اردو معارف نمبر ۱
	کالیداس کا ترجمہ	عزیز مرزا							جلد ۱ سیکرٹریٹ لائبریری [illegible]
۸۶	اتو سنگھار کالیداس ترجمہ	عبدالحلیم شرر							" ۲۴۶ دو تین اتوں کا ترجمہ نثر میں کیا تھا۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ قلمی	سال کتابت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۸۷	سرچشمہ امرت یعنی گیان	اکتس اپنشد کانشی رام پشنر			۱۹۲۴ء کریمی پریس لاہور	۲۸	کتابی		پنجاب یونیورسٹی لائبریری
۸۸	میگھ دوت کالیداس	ششم پرتی			یونیورسٹی پریس علی گڑھ	۷۰	۲۱×۲۶		دیکھئے نیشنل ببلوگرافی آف انڈین لٹریچر ساہتیہ اکادمی صفحہ ۵۱۴
۸۹	شرون کمار	کشن چند زیبا			۱۹۱۸ء آزاد بکڈپو امرتسر	۳۹	۱۸×۲۲		" " "
۹۰	ودیا بھیمنو	"			"	۲۰۰	"		" " "
۹۱	ناٹک کتھا سنسکرت ڈراموں سے	نور الٰہی محمد عمر			محمد برادرز جموں ۱۹۲۹ء	۱۰۴			" " ۵۴۷
۹۲	نل دمینتی	رام سروپ کوشل	مطبوعہ		لاجپت رائے اینڈ سنز	۱۷۸	۱۸×۲۲		" " ۵۵۰
۹۳	انوار سہیل	واصف اکبرآبادی	"						اردو کے ہندو مثنوی نگار از عطا پالوی صفحہ ۳۷۹
۹۴	ایکادشی مہاتم	عامل لاہوری	"						" " "
۹۵	وشنو سہسر نام	نزہت لکھنوی	"						" " "
۹۶	بندرابن	شعلہ حسامی	"						" " "
۹۷	پدم پران	نزہت لکھنوی							" " "
۹۸	پدم پوتھی	نوشتر لکھنوی							" " "

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مؤلف	مطبوعہ غیر مطبوعہ	مادۂ تاریخ قلمی	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۹۹	پریم ساگر	فرحت لکھنوی	مطبوعہ						اردو کے ہندو مثنوی نگار از عطا کاکوی صفحہ ۳۷۹
۱۰۰	سداما (ملک گہری)	صدر لکھنوی	"						" " ۳۸۱
۱۰۱	سنگھاسن بتیسی	آرام شاہجہاں پوری	"						" " "
۱۰۲	" "	چمن دہلوی	"						" " "
۱۰۳	" "	رنگین لکھنوی	"						" " "
۱۰۴	" "	ناتواں بہاری	"						" " "
۱۰۵	شکنتلا	اشک دہلوی	"						" " "
۱۰۶	کلیلہ دمنہ	بشاش بھوپالی	"						" " ۳۸۲
۱۰۷	انکو امواج	کنہیا لال الکھ دھاری		قلمی		۱۳۹			دیکھیے فہرست نسخہ قلمی سبحان اللہ اورینٹل لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
۱۰۸	شکنتلا	ساغر نظامی	مطبوعہ					منظوم	ناچیز کے پاس ہے۔
۱۰۹	دشینت و شکنتلا	اقبال ورما سحر	"					"	دیکھیے ادبی تلمیحات از ویریندر پرشاد سکسینہ صفحہ ۸۲۔

اخبار علمیہ

حیدر آباد دکن کے آصف جاہی عہد کی یادگاروں میں ادارہ دی اسلامک کلچر بورڈ کا علمی ترجمان انگریزی مجلہ "اسلامک کلچر" بھی ہے، یہ تقریباً ۶۰ سال سے علوم اسلامیہ کی خدمت میں مصروف ہے، ادھر چند برسوں سے بعض دشواریوں کی وجہ سے وہ پابندی سے شایع نہیں ہو رہا تھا، لیکن اب اس کے تازہ شمارہ سے معلوم ہوا کہ دشواریوں پر قابو پا لیا گیا ہے جس کا اندازہ اسکی خوبصورت طباعت سے بھی ہوتا ہے، مضامین دیرینہ روایت کے مطابق ہیں، سید حسین نصر کی تحریر کے علاوہ بون یونیورسٹی کے جمال ملک کا ایک پُر از معلومات مضمون تحریک ندوۃ العلماء پر ہے، نائجیریا میں اسلام کے اثرات کے متعلق بھی ایک عمدہ مقالہ ہے اور ابو عبدالرحمٰن اسمٰعیل نیشاپوری کی کفایت التفسیر کے ایک نایاب نسخہ کا تعارف بھی ہے، جدید کتابوں کے تعارف میں امریکا سے شایع ہونے والی بروس بی لارنس کی کتاب "نظام الدین اولیاء مورالس فار دی ہارٹ" کا ذکر ہے جو فوائد الفواد کا ترجمہ ہے اور بقول تبصرہ نگار نہایت شاندار ترجمہ ہے۔

کچھ عرصہ پہلے اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو نے دنیا کی مختلف زبانوں کے متعلق اعداد و شمار پیش کیے تو معلوم ہوا کہ چینی اور انگریزی زبانوں کے بعد سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو ہے، ہندوستان میں اردو زبان کی موجودہ حالت کے پیش نظر ممکن ہے یہ انکشاف باعث حیرت ہو لیکن اردو کے بعض شیدائیوں نے

اس کے بعض دلچسپ اور اہم اسباب پیش کیے شلاً "دنیا کی بیشتر زبانوں کے مقابلہ میں اردو تحریر کم سے کم جگہ اور وقت لیتی ہے" اور یہ کہ "اس وقت اردو زبان ہی میں سب سے زیادہ اصوات کے حروف کا نظام مستعمل ہے، اس کے مقابلہ میں اطالوی زبان میں محض ۲۰ حروف رائج ہیں، فرانسیسی میں ۲۳، یونانی میں ۲۴، لاطینی میں ۲۵، انگریزی، جرمن اور ہسپانوی میں ۲۶، عربی میں ۲۸، فارسی میں ۳۲، روسی میں ۴۱ اور ہندی و سنسکرت میں ۴۹ حروف ابجد ہیں جبکہ اردو میں ۵۵ حروف رائج ہیں" یہ بھی لکھا گیا کہ مشہور ماہر لسانیات ولیم جانس نے مکمل زبان کی جو تعریف بیان کی ہے وہ صرف اردو پر صادق آتی ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ اس زبان میں دنیا کی ساری زبانوں کی آوازوں کے لیے حروف موجود ہیں، ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ مختلف زبانوں کے الفاظ و حروف اپنے لہجہ اور مخارج کے فرق کے باوجود اردو میں بآسانی جزو زبان ہو جاتے ہیں، اردو میں عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہے، اصطلاحی الفاظ کی تعداد اس کے علاوہ ہے، الفاظ کی اتنی بڑی تعداد بجز انگریزی کے دنیا کی اور کسی زبان میں نہیں، فاضل مضمون نگار ڈاکٹر محمد علی خاں نے ان خصوصیات کے علاوہ مصدر سازی کے عمدہ اصول، افعال معاون کے استعمال کی آسان صورتوں، ہم معنی الفاظ، مترادفات اور متضاد الفاظ کی کثرت اور اردو کے بین الاقوامی مزاج وغیرہ کو بھی اس زبان کے امتیاز و شرف کا سبب قرار دیا ہے۔

اردو کی جہاں گیری کی خوش کن خبروں کے باوجود ہندوستان میں اس کے حال و مستقبل کے متعلق فکر و تشویش کا اظہار اردو کے علاوہ انگریزی صحافت میں بھی

ہوتا رہتا ہے، حال ہی میں ایک اہم انگریزی ہفتہ وار اکانومک اینڈ پولیٹکل ویکلی کے مضمون میں بعض حقایق کا جائزہ لیا گیا، مثلاً "اب اردو عملاً مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے، بہار، مغربی بنگال، آندھرا پردیش اور مہاراشٹر کے ایک مفصل سروے سے معلوم ہوا کہ ان ریاستوں میں اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنے والوں میں ایک بھی غیر مسلم نہیں ہے، یہاں تک کہ اختیاری مضمون کی حیثیت سے بھی کسی غیر مسلم طالب علم نے اردو کو پسند نہیں کیا، اس کے علاوہ اردو زبان کی تعلیم کے متعلق حکومت یا کسی نجی تعلیمی ادارہ کی جانب سے کوئی مستند اور تحقیقی روداد آج تک نہیں تیار ہو سکی، بلکہ آزادی کے بعد ہر حکومت نے اردو کو مٹانے والے ہی فیصلے کیے اور اب یہ عالم ہے کہ مہاراشٹر کے سوا اور تمام صوبوں میں اردو تعلیم جہاں بہ لب ہے، متوسط اور کم آمدنی والے اور پست درمیانی طبقہ کے لوگ اردو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگر ثانوی درجات تک اردو تعلیم کا انتظام ہو بھی جاتا ہے تو بعد کے درجات میں انگریزی یا علاقائی زبانوں کے علاوہ تعلیم چھوٹنے کی وجہ سے یہ طلبہ بہت پیچھے رہ جاتے ہیں، یوپی میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ نازک اور دردناک بنا ہوا ہے، پورے صوبہ میں اردو ذریعہ تعلیم کا ایک بھی پرائمری یا جونیر ہائی اسکول نہیں ہے، صرف دو اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے مگر ان کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہے، مضمون نگار نے افسوس ظاہر کیا ہے کہ اس صوبہ میں آزادی کے بعد کی نسل عام طور سے اردو سے ناواقف ہے، سہ لسانی فارمولے نے شمالی ہند میں اردو کی تباہی میں سب سے بڑا کردار ادا کیا سیاست دانوں کے کید و مکر نے اس ہندوستانی زبان کو صرف مسلمانوں کی زبان تک محدود کر دیا اور خود مسلمانوں کی بے حسی اور تغافل سے یہ جاں کنی کے مرحلہ میں ہے"۔

مذکورہ مضمون کے بعد ہندوستان ٹائمز میں خوشونت سنگھ کی ایک تحریر اس عنوان سے نظر آئی

کہ اردو کبھی مر نہیں سکتی' دلی کی ایک خاتون شاعرہ گیتا ٹھاکر روشنی کے پہلے مجموعہ کلام کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ "ہندوستان میں اردو کی بربادی کا نوحہ مسلسل کیا جا رہا ہے۔ جو دسی طور پر یہ صحیح بھی ہے طلبہ کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی ہے اور یہ خالص مسلمانوں کی زبان بنتی جا رہی ہے، لیکن ایسے حالات میں عوامی سطح پر اسے فلمی نغموں اور مکالموں نے زندگی بخشی اور ایک ایسی نئی نسل سامنے آئی جس کی زبان اردو نہیں ہے لیکن اردو کی دلکشی اسکے الفاظ کی موسیقیت اور شاعری کی لطافت سے مسحور ہو کر اس نئی نسل نے پہلا تو دیوناگری رسم الخط میں اردو کا مطالعہ شروع کیا اور پھر اردو کے مزاج سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہونے کے لیے اردو کو اسکے اصل رسم الخط میں سیکھ لیا، گیتا ٹھاکر کا شمار اسی نئی نسل میں ہے' انھوں نے اپنے شوہر دیپک کی نسبت سے اپنا تخلص روشنی رکھا۔

اپنی زبان سے محبت کرنے اور دوسروں کی زبان کی برتری اور اسکے اثرات سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے فرانسیسی قوم مشہور ہے' وقتاً فوقتاً وہاں ایسے قوانین بھی بنتے رہے' مثلاً ۱۹۷۵ء میں یہ طے ہوا کہ تمام سرکاری عمارتوں کے نام صرف فرانسیسی میں لکھے جائیں۔ اب اس میں عام مقامات مثلاً ریلوے اسٹیشن، کیفے اور ریستوران کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اور ایک خبر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت نے نشریات' اشتہارات اور دفتری مواصلات میں مناسب فرانسیسی الفاظ کے باوجود ان کی جگہ انگریزی الفاظ کے استعمال پر جرمانہ کی سزا تجویز کی ہے۔
ایک اخبار نے یہ خبر اس سرخی کے ساتھ شایع کی کہ "ثروت مند تو میری فرانسیسی زبان ہے"۔
ایک اخبار نے فرانس کے وزیر ثقافت کی اس خواہش کو نمایاں طور پر شایع کیا کہ انگریزی زبان کا ایک ایک لفظ ملک سے باہر کر دیا جائے، یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ فرانس میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمناروں کی زبان بھی فرانسیسی ہی ہوگی' انگریزی کے شیدائی اب منتظر ہیں کہ فرانسیسی اس تبدیلی کو کس حد تک پسند کرتے ہیں کیونکہ مشہور ہے کہ فرانسیسی اپنی عادت مشکل ہی سے ترک کرتے ہیں۔

ع۔ ص۔

مطبوعات جدیدہ

فقہ اسلامی کی نظریہ سازی از جناب ڈاکٹر جمال الدین عطیہ، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۵۴، قیمت ۸۵ روپے، پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، ریتج بلڈنگ، حضرت نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳۔

یہ کتاب فاضل مولف کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے قطر یونیورسٹی کے شریعت کالج میں فقہ اسلامی کے نظریات کے موضوع پر پیش کیے تھے، انھوں نے متقدمین فقہاء کے اصول وضوابط، ان کے اختلافات کا تفصیلی جائزہ لینے کے ساتھ دور حاضر کی قابل ذکر فقہی تحریروں کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی ذکر کیا ہے اور آخر میں اس کے متعلق بعض مشورے اور تجویزیں بھی دی ہیں۔ فاضل مولف نے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ شریعت محض فروعی احکام کے مجموعہ کا نام ہے، ان کے خیال میں فقہی کتابوں میں بنیادی اور اصولی فقہی نظریات بہت کم ہیں اور یہ بھی بکھرے ہوئے ہیں جنکی جمع و تدوین سے اس کمی کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن یہ بڑی ریاضت و محنت کا کام ہے، اس سلسلہ میں ان کے خیالات دو حصوں یعنی اصول فقہ اور دیگر علوم شرعیہ میں منقسم ہیں، پہلے تو اصول فقہ میں تصنیف و تالیف کے طریقوں پر بحث کی ہے اور خاص طور پر حنفی اور شافعی اصولوں کی خصوصیات بیان کی ہیں اور ان کی اہم کتابوں کی نشاندہی کی ہے اور پھر دیگر علوم شرعیہ کا جائزہ لیا ہے، اس سلسلہ میں

بعض مباحث مثلاً "قواعد کا تجزیاتی مطالعہ" "فروق" "اختلاف فقہاء" وغیرہ سے فاضل مولف کے وسیع مطالعہ اور گہرے غور و فکر کا اندازہ ہوتا ہے، دورِ حاضر کی نقہی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ اب اپنے مسلک کی ترجیح و دفاع کے لیے تعصب کا رجحان کم ہو رہا ہے، غالباً ان کی یہ رائے عالم عرب کے فقہی ملاحم کی بنیاد پر ہے کیونکہ ایک اور باب میں انھوں نے موجودہ زمانہ کی جن ۱۰ قابلِ ذکر کتابوں کا انتخاب کیا ہے ان میں غیر عربوں کی تصنیفات دو چار سے زیادہ نہیں ہیں، اس مفید کتاب کا ترجمہ اور زیادہ سلیس، رواں اور بہتر ہونا چاہیے تھا تاکہ اس کا فائدہ وسیع ہوتا۔

غالب کی بعض تصانیف

از جناب کالیداس رضا گپتا،

متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۸۳، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: ساکار پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، جولی بھون ۱،

۱۰ نیو مرین لائنز بمبئی ۲۰۰۰۰۴۔

غالبیات کی تلاش و تحقیق اور تدوین میں جناب کالی داس رضا گپتا کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، اب تک وہ اس موضوع پر ایک درجن سے زائد کتابیں شایع کر چکے ہیں، زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں دیوانِ غالب اور اس کی ایک شرح کنز المطالب کے علاوہ چند اور مصنفات و رسائلِ غالب پر مضامین ہیں، ایک مختصر مضمون میں غالب کی زندگی میں ان کی طبع ہونے والی کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے، مثنوی بیانِ نمودارِ شاہی کے سلسلہ میں ان کی یہ تحریر اس کا بھی ثبوت ہے کہ وہ سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں ہیں،

لکھتے ہیں "غالب نے خود یا کسی کے کہنے پر اس مثنوی پر نظر ثانی کی اور تین شعر حذف کرکے اور تیس شعر بڑھا کر پوری مثنوی ہتھیا لی پھر کسی توضیح کے بغیر اپنے کلیات فارسی مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں شامل کر لی، فاضل مولف کا یہ خیال بیجا نہیں معلوم ہوتا کہ "غالب اور غالبیات کے مشتاق اس میں کام کی بعض باتیں تلاش کر ہی لیں گے"۔

سیرۃ نبوی اور مستشرقین

از ڈاکٹر عبد العلیم مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۱۶۴، قیمت ۶۰ روپے

پتہ: نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ، یوپی۔

ڈاکٹر عبد العلیم مرحوم کی یہ مختصر تصنیف تقریباً ۶۰ سال پہلے ۱۹۳۰ء میں شایع ہوئی تھی جو مشہور مستشرق ولہاوزن کے ایک مضمون بہ عنوان "محمدؐ ازم" کے رد و ابطال میں تھی، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں چھپے اس مضمون میں اس نے آنحضورؐ کی ذات گرامی کے متعلق وہ تمام اعتراضات جمع کر دیے تھے جو مغرب کے مستشرقین عام طور پر سیرت نبویؐ پر وارد کرتے ہیں، اب ان اعتراضوں کا لغو محض ہونا ثابت ہو چکا ہے اور خود موجودہ زمانہ کے مستشرقین کے لیے بھی یہ زیادہ کارآمد ہتھیار نہیں رہ گئے ہیں، مگر نصف صدی پہلے ان کی تلخی اور زہرناکی سخت اور شدید تھی جس کے پیش نظر ڈاکٹر عبد العلیم مرحوم نے ۲۰-۲۲ برس کی عمر میں اس مضمون کا ترجمہ کیا اور اس پر مفید تردیدی حواشی اور ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس کی تلبیس و تدلیس اچھی طرح کر دیا تھا۔ کتاب کے طبع اول کا سرورق مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپا تھا، اس کا عکس زیر نظر طبع جدید میں بھی موجود ہے، اس مفید

کتاب کی اشاعت کے لیے جناب عابد سہیل شکریہ کے مستحق ہیں، ان کے قلم سے ایک تحریر بھی ہے، افسوس ہے کہ آیتوں کی کتابت میں اعراب کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔

مکاتیب سر محمد اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی مرتبہ جناب سید شفقت رضوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور طباعت، مجلد، صفحات ۱۴۳، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: مکتبہ شاہد ۱/۹ علی گڑھ کالونی، کراچی ۸۰۰۵۰، پاکستان۔

اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کے نام علامہ اقبال کے وہ تمام منتشر خطوط جمع کر دیے گئے ہیں جو پہلے معارف میں شایع ہوئے تھے اور چند سال پہلے دارالمصنفین کی شایع کردہ کتاب "مشاہیر کے خطوط" میں بھی جمع کر دیے گئے ہیں، لایق مرتب نے دونوں اکابر کے مختصر سوانح اور ایک دوسرے کے متعلق ان کی تحریروں اور تاثرات کو بھی سلیقہ سے یکجا کر دیا ہے، آخر میں کتاب میں مذکور ممتاز اشخاص پر مختصر معلوماتی نوٹ بھی دیے گئے ہیں۔

خطبات دہلی حصہ اول از جناب مولانا اخلاق حسین قاسمی، متوسط تقطیع بہتر کاغذ، کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۸۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ رحمت عالم، شیخ چاند لال کنواں، دہلی۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی وقتاً فوقتاً دینی، علمی اور ملی مسائل پر تحریر و تقریر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں، زیر نظر کتاب کا زیادہ حصہ ان کے سوانح پر مشتمل ہے جو خود ان کے اور کچھ دوسروں کے قلم سے ہیں، اسمیں ان کے مضامین و تصنیفات کی فہرست کے علاوہ ان کی ملی سرگرمیوں کا ایک خاکہ بھی درج ہے، گو خطبات یا مضامین کم ہیں لیکن دو مضمون آنحضورؐ کی عبدیت کاملہ

اور غلبۂ حال اور حضرات انبیائے کرامؑ خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔

مسلمان سائنسداں اور انکی خدمات

از جناب مولانا ابراہیم عمادی ندوی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۵۶، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: مکتبہ الحسنات ۲۲۴۱، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

مسلمانوں کے زمانۂ عروج کی داستان پارینہ میں فلسفہ و حکمت اور سائنسی علوم میں ان کی شاندار خدمات بھی شامل ہیں، جن کو وقتاً فوقتاً ملت کے مردہ جسم میں نئی روح پھونکنے اور قومی سربلندی کے جذبہ کو ابھارنے کی غرض سے سنایا جاتا رہا ہے، یہ کتاب بھی اسی نیک مقصد کی خاطر لکھی گئی ہے، اس میں ۵۰ سے زائد مسلمان سائنسدانوں اور ان کے ایجادات و اختراعات کا ذکر ہے، مرحوم مصنف کو تعلیم و تدریس کا طویل تجربہ تھا اس لیے وہ قارئین کے ذوق اور نفسیات سے پوری طرح واقف تھے چنانچہ یہ کتاب سہل اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے البیرونی کی کتاب کا ترجمہ ہر زبان میں بتانا مبالغہ سے خالی نہیں۔ یہ مفید کتاب دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہونے کے لائق ہے۔

ہندوستان اور مسلمان

از جناب مولوی محمد الیاس بھٹکلی ندوی چھوٹی تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۱۸۴، قیمت ۲۰ روپے پتہ مکتبہ الحسنات، نئی دہلی۔

لائق مولف نے مدارس کے طلبہ کے لیے ایک کتاب "بین الاقوامی و اسلامی جغرافیہ" کے نام سے مرتب کی تھی جسے مقبولیت حاصل ہوئی، زیر نظر کتاب گویا

اس کا دوسرا حصہ ہے، اس میں ہندوستان کی جغرافیائی تفصیل کے ساتھ یہاں کے مسلمانوں کی آبادی، صنعت و تعلیم، حکومت اور انتظامی اداروں میں انکی شمولیت و شرکت کے متعلق معلومات درج ہیں، یہانتک کہ جن مسلمانوں پر ڈاک ٹکٹ جاری ہوئے ان کی تفصیل بھی ہے، اس طرح یہ کتاب خاص طور پر طلبہ کے لیے مفید ہوگئی ہے۔

زندگی اے زندگی از جناب سید شکیل دسنوی، متوسط تقطیع کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۱۲، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

بہار کے خطہ دیسنہ کی خاک میں علم و ادب کا خمیر کچھ اس طرح شامل ہے کہ اسکے گلہائے تازہ سے اردو کے چمن کی رونق میں اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے، نئے دسنوی شاعر کا زیر نظر پہلا مجموعہ صرف غزلوں پر مشتمل ہے، لیکن شاعر کے لہجہ کی سنجیدگی اور احتیاط و سلیقہ نے تازہ خیالات کو باوقار اور دلکش بنا دیا ہے۔

نالۂ نیم شبی از محترمہ ام ہانی، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۸، قیمت ۱۲ روپے، پتہ: مکتبہ اسلام کچہری روڈ، امین آباد لکھنؤ، یوپی۔

حمد و نعت، سلام و مناجات اور دوسری پُر تاثر نظموں کا یہ مبارک مجموعہ ایک مشرقی شریف زادی کے حسن ذوق کی مثال ہے، اللہ و رسول سے والہانہ تعلق و محبت اور ملت کی دردمندی کے اظہار کے لیے نالۂ نیم شبی سے بہتر عنوان اور کیا ہوسکتا ہے۔

(ع - ص)

جلد ۱۵۴ ماہ محرم الحرام وصفر المظفر ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۴ء عدد ۱

مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

مسلمان اپنے مسائل کے حل کے لیے حکمت، تدبر اور دور اندیشی کے بجائے اُن طریقوں کو اختیار کیے ہوئے ہیں جن سے انکے مسائل اور زیادہ الجھتے اور پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں، شور ہنگامہ اور احتجاج کو انھوں نے اپنی طبیعت ثانیہ بنا لیا ہے، اس سے اس ملک میں انکے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کا خاتمہ نہیں ہوسکتا، ہمیشہ سے کمزوروں اور مجبوروں کو تختۂ مشق بنانا اور ان پر ظلم و تشدد روا رکھنا زبردست اور جفاشعار لوگوں کا شیوہ رہا ہے، اس کے ازالے کے لیے گلہ، شکوہ اور جزع و فزع کبھی سودمند نہیں رہا ہے، ظلم و تشدد کا سدِّباب اسی وقت ہوتا ہے، جب مظلوموں اور زیردستوں میں قوت و طاقت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنی کمزوری اور کمی کی تلافی کرکے اپنے حالات کی اصلاح کرلیتے ہیں لیکن مسلمانوں نے نصف صدی کا طویل عرصہ بے عملی، تعطل، نالہ و شیون اور واویلا میں گزارا ہے، یہ بڑا المیہ ہے کہ دنیا کو آزادی، مساوات اور انصاف عطا کرنے والے آج ذلت، محکومی، ناانصافی اور تفریق و امتیاز کا شکار ہیں، جو ساری دنیا کے لیے چراغِ راہ تھے وہ تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور انہیں راستہ نہیں مل رہا ہے، لوگوں کے مصائب و آلام کو دور کرکے انہیں سہولت و آسانی فراہم کرنے والے خود ایسے دلدل میں جا پھنسے ہیں جن سے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔

شکست خوردہ قوموں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنی ہزیمت اور تباہی کا ذمہ دار دوسروں کو سمجھتی ہیں اور خود اپنی غفلت و کوتاہی سے چشم پوشی کرلیتی ہیں، مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے کہ وہ اپنی موجودہ زبوں حالی اور بربادی کا ذمہ دار دوسروں کو سمجھتے ہیں، اس لیے انکے خلاف غصہ اور نفرت میں مبتلا رہتے ہیں اور انہیں اپنی غلطی اور بے تدبیری کا احساس نہیں ہوتا، اپنے باہمی اختلافات کو رفع کرنے کے بجائے ایک دوسرے کی کردارکشی ان کا وطیرہ ہوگئی ہے، جس سے انکے اختلاف

ونزاع کی خلیج مزید بڑھتی جارہی ہے ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہی یونیورسٹی ہے جو انکا سب سے بڑا قومی سرمایہ ہے لیکن گزشتہ کئی برس سے اس کے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں' ان کو درست کرنے کے بجائے ہر فریق دوسرے کی ہوا خیزی' اسے نیچا دکھانے اور اس پر جا و بیجا الزام عائد کرنے میں لگا ہوا ہے اور خود اپنے طرز عمل کا محاسبہ کرنے کے لیے کوئی بھی آمادہ نہیں ہے' اس وقت جو طفلانہ حرکتیں ہو رہی ہیں ان سے یونیورسٹی کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو جائے گا، اگر واقعی تڑپ سے چینی اور اخلاص ہے تو سب کو مل جل کر اس پر ہمدردی اور دلسوزی سے غور کرنا چاہیے۔

اب اترپردیش میں اردو کا مسئلہ جس موڑ پر آگیا ہے اس میں اردو والوں کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں، عرصۂ دراز سے اردو کے لیے جو مطالبات کیے جارہے تھے اور جن کو ابتک کی تمام ریاستی حکومتیں سراسر نظر انداز کرتی رہی ہیں' موجودہ ریاستی حکومت نے اردو کے جائز اور جمہوری حقوق دینے کے لیے جو جرأت مندانہ فیصلے کیے ہیں' اس کے بعد بھی اگر اترپردیش میں اردو کا رواج نہیں ہوتا تو اس کے اصل ذمہ دار خود اردو کے حامی اور بہی خواہ ہی ہونگے، جن کا مزاج صرف باتیں بنانے اور کام نہ کرنے کا بن گیا ہے' وہ اردو کے لیے چیخ و پکار تو بہت مچاتے رہے ہیں لیکن اس کے استحصال میں وہ بھی برابر کے شریک رہے ہیں' اب انہیں اپنی روش بدل کر اپنی جدوجہد تیز کرنی اور اردو کے لیے بڑی سی بڑی قربانی دینی ہوگی، اگر اردو والوں نے یہ سنہرا موقع بھی اپنی غفلت و بے پروائی سے ضایع کر دیا تو یہ ان کی نہایت بدبختی اور ایسا قومی جرم ہوگا جس کے لیے اردو کی آیندہ نسلیں انہیں معاف نہیں کریں گی۔ اردو والوں کو اب کچھ کر دکھانا پڑیگا ؎

جہاں میں عمل کی عملداریاں ہیں سخن پروری کا زمانہ نہیں ہے

اتر پردیش اور اڑیسہ کے سابق گورنر میر اکبر علی خاں کی وفات ملک و ملت کا اہم حادثہ ہے، وہ تحریک خلافت اور آزادی کی جدوجہد میں شریک رہے، اسی زمانے سے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ان کے تعلقات تھے، وہ علامہ شبلیؒ اور سید صاحبؒ کے قدرداں اور دارالمصنفین سے بڑا اخلاص رکھتے تھے، جب اتر پردیش کے گورنر ہوئے تو اسے میزبانی کا شرف بھی بخشا اور ایک بڑی رقم موجمت کی جس سے ایک بڑا ہال تعمیر ہوا، مرحوم ہماری پرانی تہذیب و شرافت کا نمونہ اور سچے مسلمان تھے، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، دارالمصنفین میں ان کی تشریف آوری جمعہ کے دن ہوئی تھی، یہیں کی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی، جب وہ اڑیسہ کے گورنر تھے تو اسی زمانے میں ایک دفعہ میں کلکتہ گیا، گورنر ہاؤس میں عصرانہ تھا، جس میں وہ بھی شریک تھے، میں ملا تو بڑی شفقت و محبت سے پیش آئے اور دارالمصنفین کا ذکر خیر فرماتے رہے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔

افسوس ہے کہ اردو کی ایک عاشق و فدائی اور اتر پردیش میں اردو تحریک کی قائد بیگم سلطانہ حیات صاحبہ، جون کو رحلت فرما گئیں، وہ تقریباً نصف صدی تک اردو کے فروغ کے لیے سرگرم عمل رہیں، ۱۹۵۵ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے اردو کو اتر پردیش میں علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لیے دستخطی مہم چلائی جس کو کامیاب بنانے میں انھوں نے اور ان کے شوہر جناب حیات اللہ انصاری نے غیر معمولی دلچسپی لی اور اتر پردیش کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا، وہ اس وفد میں بھی شامل تھیں جو ۲۲ لاکھ دستخطوں کے ساتھ میمورنڈم لے کر اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے پاس گیا تھا، انھوں نے "تعلیم گھر" کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا، اس نے اتر پردیش میں اردو کے کئی اسکول قائم کیے جن سے ہر سال سینکڑوں طلبہ فیضیاب ہوتے تھے، وہ طبعاً نیک، شریف اور دردمند خاتون تھیں، اللہ تعالیٰ اردو کی اس مجاہدہ اور خادمہ کی مغفرت فرمائے آمین۔

مقالات

رسول اکرمؐ کی فصاحت و بلاغت اور آپؐ کے بعض مؤثر اسلوب
صحیح بخاری کی بعض احادیث کی روشنی میں

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

قسم کا اسلوب عربی زبان میں قسم کا استعمال بہت عام ہے، اس کا مقصد اپنی بات کو موکد کرنا اور اس میں جاذبیت، کشش، دل نشینی اور زور و اثر پیدا کرنا ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی قسموں کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے اور اس اسلوب کی وجہ سے آپؐ کے کلام کی عظمت، بلندی، قوت، اثر، دل نشینی، شیرینی اور دلکشی و دلآویزی اضعافاً مضاعفۃ ہوگئی ہے، یہاں صحیح بخاری سے قسموں کے استعمال کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں، ان سے اندازہ ہوگا کہ قسم کے اسلوب نے کلام کو کس قدر جاندار، بلیغ اور رفیع الشان بنادیا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی، اس کا تعلق ایک معزز اور برتر خاندان سے تھا اس بنا پر قریش کے نزدیک یہ معاملہ بڑی اہمیت کا حامل ہوگیا تھا اور وہ اس پر حد جاری کرنے میں سخت متردد تھے، بڑے غور و خوض کے بعد طے پایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کرائی جائے جس کے لیے ان کی نظر انتخاب حضرت اسامہؓ پر پڑی کیونکہ وہ اپنے باپ حضرت زیدؓ ہی کی طرح آپؐ کے بہت چہیتے تھے، حضرت اسامہؓ جب سفارش

کی غرض سے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کیا تم اللہ کے حدود کے بارے میں سفارش کرنے آئے ہو؟ پھر آپؐ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا کہ پچھلی قومیں اسی لیے ہلاک اور گمراہ ہوئیں کہ جب کوئی شریف آدمی اور معزز خاندان سے تعلق رکھنے والا چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتیں اور اس پر حد نہ جاری کرتیں لیکن اگر معمولی حیثیت اور کمتر درجہ والا چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتیں، اس قسم کی تفریق میں ہرگز نہیں کرسکتا، چنانچہ اپنے محبوب حضرت اسامہؓ کی سفارش کو مسترد کرتے ہوئے آپؐ نے ببانگ دہل یہ اعلان فرمایا کہ:

والذی نفسی بیدہ لو فاطمۃ فعلت ذلک لقطعت یدھا[1]	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر (میری بیٹی) فاطمہ بھی اس حرکت کی مرتکب ہوگی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لوں گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ معاملہ خواہ کیسے ہی اہم آدمی کا ہو حدود اللہ میں کسی قسم کی نرمی، مداہنت اور چشم پوشی روا نہیں رکھی جاسکتی کیونکہ اس کے نتیجہ میں قوم و امت کی تباہی اور گمراہی لابدی ہے۔

قسم کی تعبیر اور حضرت فاطمہؓ کے ذکر نے کلام میں بلاغت کی روح پھونک دی ہے اور وہ اتنا موثر، زوردار اور دل کو چھونے والا ہوگیا ہے کہ کئی صفحے بھی لکھے جائیں تو نہ یہ زور و اثر پیدا ہوگا اور نہ کلام میں بلاغت کی روح اور حسنِ بیان کی یہ کیفیت پیدا ہوگی۔

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۳۰۰۔ کتاب الحدود باب اقامۃ الحدود علی الشریف والوضیع۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ اقامت صلوٰۃ کا حکم وارد ہوا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ نماز کا مکمل اہتمام اور اس کی باقاعدہ مداومت ہونی چاہیے اور اسے وقت پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اسی کی شرح و تفسیر کی ہے، آپؐ خود بھی جماعت کا اہتمام کرتے تھے اور دوسروں کو بھی خاص طور پر اس کی ہدایت و تاکید فرماتے تھے، صحیح بخاری کی درج ذیل حدیث میں آپؐ نے جماعت کی اہمیت بڑے بلیغ اور مؤثر انداز میں بیان کی ہے جس کی لطافت، اثر انگیزی اور دل نشینی کو قسم کے اسلوب نے بہت بڑھا دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

والذی نفسی بیدہ لقد ھممت
ان آمر بحطب لیحطب ثم آمر
بالصلوٰۃ فیؤذن لہا ثم آمر
رجلا فیؤم الناس ثم اخالف
الی رجال فاحرق علیہم بیوتہم
والذی نفسی بیدہ لو یعلم احدہم
انہ یجد عرقا سمینا او مرماتین
حسنتین لشہد العشاء[1]

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں
میری جان ہے، مجھے خیال ہوتا ہے کہ
لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں پھر نماز
کے لیے اذان کا حکم دوں اور کسی شخص
کو لوگوں کو نماز پڑھانے کا حکم دوں
اور خود ان لوگوں کے پاس جاؤں
جو جماعت میں نہیں آئے تو ان کے
گھروں میں آگ لگا دوں، خدا کی قسم
اگر ان میں سے کسی کو یہ معلوم ہو جائے
کہ وہ کوئی فربہ ہڈی یا دو عمدہ گوشت

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۸۹ کتاب الصلوٰۃ باب وجوب صلوٰۃ الجماعۃ و ج ۲ ص ۱۰۷۰ کتاب الاحکام باب اخراج الخصوم و اہل الریب من البیوت بعد المعرفۃ۔

والی ہڈیاں پائے گا تو وہ عشا کی نماز
میں ضرور آئے گا۔

اس میں جماعت کا اہتمام نہ کرنے پر کیسی سخت وعید کی گئی ہے، یہ پورا کلام بلاغت زور بیان اور حسنِ تعبیر کا دلکش نمونہ ہے اور قسم کے اسلوب سے اس میں جو جان اور زور پیدا ہوگئی ہے وہ حدِ بیان سے باہر ہے۔

نماز ہی کی طرح زکوٰۃ بھی اسلام کا عظیم الشان رکن ہے اور قرآن مجید نے اس کا ذکر ہر جگہ نماز کے ساتھ ہی کیا ہے، اس سے اس کی اہمیت اور دین میں اس کے درجہ کا اندازہ ہوتا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زکوٰۃ کی اہمیت اور درجہ کو اچھی طرح واضح کیا ہے اور اس کے ترک پر سخت وعید فرمائی ہے، درج ذیل حدیث میں جانوروں کی زکوٰۃ نہ نکالنے والے کی کیسی شدید مذمت کی گئی ہے جس کو قسم کے اسلوب نے مزید کریہہ اور شنیع بنا دیا ہے، فرمایا:

والذی نفسی بیدہ او والذی	قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے
لا الٰہ غیرہ او کما حلف ما من	میں میری جان ہے یا فرمایا ارادی
رجل تکون لہ ابل او بقر او غنم	کا شک، قسم ہے اس ہستی کی جس کے
لا یودی حقہا الا اُتی بہا یوم	سوا کوئی معبود نہیں یا اسی طرح کی
القیامۃ اعظم ما تکون واسمنہ	کوئی اور قسم کھائی کہ جس کے پاس
تطئوہ باخفافہا وتنطحہ بقرونہا	اونٹ یا گائے یا بکری ہو اور وہ
کلما جازت علیہ اخراہا ردت	اس کا حق (زکوٰۃ) نہ ادا کرے تو
علیہ اولاہا حتی یقضی	قیامت کے دن یہ جانور اس حال

بین الناس [۱]۔

میں آئے گا کہ پہلے سے بڑا اور فربہ
ہوگا اور وہ اپنی کھروں سے اس کو
روندے گا اور سینگوں سے مارے گا،
جب دوسرے سب جانور گزر چکیں گے
تو پھر پہلا جانور لوٹا کر لایا جائے گا،
یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ
کر دیا جائے گا۔

حدیث کا انداز بیان خود ہی نہایت بلیغ اور موثر طور پر بتا رہا ہے کہ جانوروں کی زکوٰۃ نہ دینے کا انجام کتنا بھیانک ہوگا جس کو قسم کے اسلوب نے اور زیادہ موکد اور دردناک بنا دیا ہے۔

سوال اور گداگری ذلت و رسوائی کا دوسرا نام ہے، ایسے مذموم اور قبیح عمل پر سخت ناپسندیدگی ظاہر کی گئی ہے، رسول اللہؐ نے دینے والے ہاتھ کو لینے والے سے بہتر قرار دیا ہے، ذیل کی حدیث میں بھی نہایت خوبصورت پیرایے میں گداگری اور دریوزہ گری کی مذمت کی گئی ہے، ارشاد ہے:

والذی نفسی بیدہ لأن	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں
یاخذ احدکم حبلہ فیحتطب	میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی
علی ظہرہ خیرلہ من ان	شخص رسی لے کر اپنی پیٹھ پہ لکڑی
یاتی رجلا فیسألہ اعطاہ	لائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ

[۱] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۹۰ کتاب الزکوٰۃ باب زکوٰۃ البقر۔

اومنعوہ[1] کسی کے آگے دست سوال دراز کرے اور وہ اسے دے یا نہ دے۔

گداگری کی مذمت جس بلیغ و موثر پیرایہ میں کی گئی ہے وہ خود بڑا خوبصورت انداز بیان تھا لیکن قسم کے استعمال نے اس میں جادو جیسا اثر پیدا کر دیا ہے۔

روزے دار کے منھ کی بو کی پاکیزگی کو بیان کرنے کے لیے بھی یہی موثر اسلوب اختیار کیا گیا ہے، فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ لخلوف فم الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک[2] قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے روزہ دار کے منھ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ بہتر ہے۔

اور یہ انداز بلاغت بھی دیکھئے:

والذی نفسی بیدہ لاذودن عن حوضی کما تذاد الغریبۃ من الابل عن الحوض[3] قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں اپنے حوض سے قیامت کے دن کچھ لوگوں کو اس طرح ہٹاؤں گا جیسے اجنبی اونٹ حوض پر سے ہنکائے جاتے ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۹۹ کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسألۃ [2] ایضاً ص ۲۵۵ کتاب الصیام باب ہل یقول انی صائم اذا شتم [3] ایضاً ص ۳۱۸ کتاب المساقاۃ باب من رأی ان صاحب الحوض والقربۃ احق بمائہ۔

رسول اللہؐ نے اپنی محبت کی اہمیت اس موثر انداز میں بیان کی ہے:

والذی نفسی بیدہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ[1]	خدائے ذوالجلال کی قسم تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

کبھی کبھی آپؐ نے قسم کے اسلوب میں مزید زور اور تاکید پیدا کرنے کے لیے اسے مکرر استعمال کیا۔

واللہ لا یومن واللہ لا یومن واللہ لا یومن قیل ومن یا رسول اللہ قال الذی لا یامن جارہ بوائقہ[2]	خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتا، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتا، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتا، دریافت کیا گیا کہ اے اللہ کے رسولؐ کون؟ فرمایا جس کا پڑوسی اس کی اذیتوں سے مامون نہ ہو۔

اس سے بڑھ کر پڑوسی کے حقوق کی تاکید کا بلیغ اور موثر انداز بیان کیا ہو سکتا ہے۔

تنبیہ کے موقع پر عام خطاب اصولِ دعوت میں حکمت اہم اور مقدم شرط ہے جس کو مدنظر رکھنا داعی و مبلغ اور مصلح و ہادی کے لیے نہایت ضروری امر ہے۔ تاکہ وہ خود اور اس کے اصلاح و ہدایت کا کام لوگوں کی مخالفتوں اور بدگمانیوں سے محفوظ رہے اور

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۷ کتاب الایمان باب حب الرسول من الایمان [2] ایضاً ج ۲ ص ۸۸۹ کتاب الادب باب الوصایۃ بالجار۔

اس کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ نہ بھڑک اٹھے اگر کسی خاص شخص یا جماعت کے بعض افراد کے اندر کوئی مخصوص قسم کی خرابی اور خامی پائی جائے جس کی نشاندہی کرکے براہِ راست ان سے اصلاح کا مطالبہ کیا جائے تو اس کا الٹا اثر ہوگا اور جن لوگوں کی اصلاح مقصود ہے ان کے اندر خواہ مخواہ کی ضد، مخالفت اور عناد پیدا ہوگا اور وہ اپنی اصلاح و ہدایت پر کوئی توجہ نہیں دیں گے، حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ خرابیوں کی جانب اس طرح توجہ دلائی جائے جس سے معلوم ہو کہ یہ کسی مخصوص و متعین شخص کی خرابی کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ اصل مقصد عام لوگوں کی اصلاح ہے اور داعی و مصلح کے دل میں سب کی ہمدردی و اصلاح کا جذبہ موجزن ہے اور اسی نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ اس خرابی کی جانب متوجہ کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہی تھا کہ اگر کسی خاص شخص کی غلطی کی اصلاح مقصود ہوتی تو آپؐ براہ راست اسے مخاطب کرکے اس کی جانب متوجہ نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے اس کے اندر نفرت و بیزاری پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، چنانچہ ایسے موقع پر آپؐ کا خطاب عام ہوتا تھا گویا آپؐ کو پوری قوم کی اصلاح و ہدایت مطلوب و مقصود ہے اور جس خرابی کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ کسی خاص شخص میں نہیں پائی جاتی بلکہ عام افراد میں موجود ہے۔ خطاب کے اس طریقہ سے بات زیادہ موثر اور کارگر ہوتی ہے، یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

نماز میں خشوع و خضوع اور تمکین و وقار ضروری ہے لیکن ابتدا میں یہ ارکان و آداب لازمی نہیں قرار دیے گئے تھے بلکہ بتدریج ان کی تکمیل کی گئی، اس کے بعد بھی جب کچھ لوگ نماز میں آنکھ اٹھاکر آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے تو آپؐ نے ان کی

اصلاح کی ضرورت محسوس کی مگر انہیں اس سے باز رہنے کی ہدایت ایسے عام انداز میں کی کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ محض انہی کو پیش نظر رکھ کر بات کہی گئی ہے، فرمایا:

ما بال اقوام یرفعون ابصارہم	یہ کیسے لوگ ہیں کہ نماز میں آسمان
الی السماء فی صلوٰتہم[1]	کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کرتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ بریرہؓ اپنی کتابت کے بارے میں ان سے دریافت کرنے آئیں تو حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا اگر تم چاہو تو میں تمہاری قیمت تمہارے مالکوں کو دے کر تمہیں آزاد کرا دوں لیکن ولا کا حق مجھے ہوگا، بریرہؓ کے مالکوں نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آپ ان کی قیمت دینا چاہیں تو دیجیے وہ آزاد ہو جائیں گی لیکن ولاء کا حق ہم کو ہوگا، حضرت عائشہؓ نے جب اس مہمل بات کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم انہیں خرید لو پھر آزاد کر دو، ولا تو اسی کا ہوگا جس نے آزاد کیا ہے پھر آپؐ اس غلطی کا تدارک کرنے کے لیے ممبر پر کھڑے ہوئے لیکن آپؐ کے خطاب کا پیرایہ عام رہا، ارشاد ہوا:

ما بال اناس یشترطون	یہ کون سے لوگ ہیں جو ایسی شرطیں
شروطا لیست فی کتاب اللہ	عائد کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں
من اشترط شرطا لیس	ہیں، جو شخص ایسی شرط لگائے جو کتاب اللہ
فی کتاب اللہ فلیس لہ وان	میں نہیں ہے تو اس کو اس کا کوئی حق
شرط مأتہ مرۃ شرط اللہ	نہیں خواہ وہ سو بار شرط لگائے
احق واوثق[2]	اللہ کی شرط زیادہ مستحق اور مضبوط ہے۔

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۴ کتاب الصلوٰۃ باب رفع البصر الی السماء فی الصلوٰۃ [2] (بقیہ حاشیہ ص ۱۵ پر)

امام بخاریؒ نے کئی ابواب میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے، بعض میں ما بال رجال کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

تشدد اور غلو پسند لوگ شریعت کی بیان کردہ ہدایت پر قناعت نہیں کرتے اور اللہ کی دی ہوئی رخصتوں سے فائدہ اٹھانا پسند نہیں کرتے اس لیے وہ اپنے اوپر ایسے قیود اور بندشیں عائد کر لیتے ہیں جو خدا اور رسولؐ کی جانب سے ان پر عائد نہیں کی گئی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے لوگوں کی مذمت کی ہے حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آپؐ جن رخصتوں پر عمل پیرا تھے بعض لوگوں کو انہیں کرنے میں تکلف ہوتا تھا، جب آپؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے حمد و ثنا کے بعد عام انداز میں ان لوگوں کو اس طرح تنبیہ فرمائی:

ما بال اقوام یتنزھون عن الشئ اصنعه فواللّٰہ انی لاعلمھم باللّٰہ واشدھم له خشیة[1]

لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس چیز سے بھی احتراز کرتے ہیں جس کو میں کرتا ہوں، خدا کی قسم مجھے اللہ کے بارے میں ان سے زیادہ واقفیت ہے اور میں ان سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں۔

کسی تعیین و صراحت کے بغیر اصلاح و ہدایت اور تلقین و ارشاد کا یہی عام انداز

(حاشیہ ص۱۳) دیکھو بخاری ج ۱ ص ۳۴۴ کتاب المکاتب باب ما یجوز من شروط المکاتب ومن اشترط شرطاً لیس فی کتاب اللّٰہ (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ایضاً ج ۲ ص ۱۰۸۴ کتاب الاعتصام باب ما یکرہ من التعمق والتنازع والغلو فی الدین والبدع۔

اور موثر و بلیغ اسلوب ان حدیثوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں احدکم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں گو اس طرح کی حدیثوں میں کسی ایک شخص کی غلطی پر تنبیہ مقصود ہوتی ہے لیکن خطاب کا رخ عام لوگوں کی طرف کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کی زد براہ راست کسی ایک ہی شخص پر نہ پڑے بلکہ اس کے عموم کی وجہ سے ہر شخص کو تنبیہ ہو جائے اور اس شخص کو بھی برا نہ لگے جو واقعی اس فعل کا مرتکب ہو۔ اس طرح کی حدیثیں متعدد ہیں یہاں چند نقل کی جاتی ہیں:

ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں قبلہ کی جانب تھوک دیکھکر بڑی ناگواری ہوئی جس کا اثر چہرے پر بھی دکھائی دینے لگا، پھر آپؐ ... خود رگڑ کر اسے صاف کیا اور یہ عام ہدایت دی کہ:

اذا قام احدکم الی الصلوٰۃ	جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا
فلا یبصق امامہ فانما	ہو تو وہ اپنے آگے نہ تھوکے کیونکہ وہ
یناجی اللہ ما دام فی مصلاہ	جب تک اپنی نماز پڑھنے کی جگہ میں ہوتا
ولا عن یمینہ فان عن یمینہ	ہے تو اس وقت اپنے رب سے مناجات
ملکا ولیبصق عن یسارہ او	کرتا ہے، اسی طرح اپنے داہنے بھی
تحت قدمہ فیدفنہا[1]	نہ تھوکے کیونکہ اس جانب ایک فرشتہ
	ہوتا ہے، بلکہ وہ اپنے بائیں جانب
	یا پیر کے نیچے تھوک لے پھر اسے دفن کر دے۔

آپؐ نے کسی کو تحیۃ المسجد پڑھتے نہیں دیکھا تو اس کی تاکید اس عام انداز سے کی:

اذا دخل احدکم المسجد فلا	تم میں سے کوئی جب مسجد میں داخل ہو

[1] صحیح بخاری ج ۱ کتاب الصلوٰۃ باب دفن النخامۃ فی المسجد۔

يجلس حتى يصلي ركعتين[1] — تو اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک کہ دو رکعت نماز نہ پڑھ لے۔

نیند کے غلبہ کے باوجود کچھ لوگ نماز پڑھا کرتے تھے تو اس کی ممانعت عام خطاب کے ذریعہ کی گئی۔

اذا نعس احدکم وهو يصلي فليرقد حتى يذهب عنه النوم فان احدکم اذا صلى وهو ناعس لا يدري لعله يستغفر فيسب نفسه[2] — جب تم میں کسی شخص کو نماز کی حالت میں اونگھ آجائے تو اسے سو جانا چاہیے اس لیے کہ جب کوئی نیند کی حالت میں نماز پڑھے گا تو نہیں سمجھ سکتا کہ وہ استغفار کر رہا ہے یا اپنے کو بددعا کر رہا ہے۔

جمعہ کے دن کسی شخص نے غسل نہیں کیا اور جمعہ پڑھنے چلا آیا تو آپ نے یہ عام ہدایت کی کہ:

اذا جاء احدکم الجمعة فليغتسل[3] — جب تم سے کوئی شخص جمعہ کی نماز کے لیے آئے تو اسے غسل کر لینا چاہیے۔

جماعت میں شرکت کے لیے دوڑ کر آنے کی ممانعت بھی اسی اسلوب میں کی گئی ہے۔

اذا اقيمت الصلوٰة فلا تأتوها تسعون وأتوها تمشون وعليكم — جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم لوگ اس میں شامل ہونے کے لیے دوڑتے

---

[1] صحیح بخاری ج ا ص ۱۵۶ کتاب التہجد باب ما جاء فی التطوع مثنیٰ مثنیٰ [2] ایضاً ص ۳۴ کتاب الوضوء باب الوضوء من النوم [3] ایضاً ص ۱۲۰ کتاب الجمعہ باب فضل الغسل یوم الجمعۃ۔

السکینۃ فما ادرکتم فصلوا	ہوئے نہ جاؤ بلکہ آہستہ سے چلتے ہوئے
وما فاتکم فاتموا[1]	آؤ، سکون و اطمینان تم پر لازم ہے جتنی
	رکعتیں مل جائیں انھیں پڑھ لو اور جو
	فوت ہو جائیں ان کو پورا کر لو۔

درج ذیل حدیثوں میں بھی یہی اسلوب مدنظر رکھ کر کسی متعین شخص کو مخاطب نہیں کیا گیا ہے:

اذا اتی احدکم الغائط فلا یستقبل	جب کوئی فراغت کے لیے جائے تو
القبلۃ ولا یولھا ظہرہ، شرقوا	قبلہ کی طرف منھ یا پشت نہ کرے بلکہ
او غربوا[2]	مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرے۔
اذا شرب احدکم فلا یتنفس	جب تم میں سے کوئی شخص پانی پیے تو
فی الاناء[3]	برتن میں سانس نہ لے۔
اذا توضأ احدکم فلیجعل فی	جب کوئی شخص وضو کرے تو اسے
انفہ ماء ثم لینتثر ومن استجمر	اپنی ناک میں پانی ڈال کر صاف
فلیوتر واذا استیقظ احدکم	کر لینا چاہیے اور جو کوئی پتھر سے استنجا
من نومہ فلیغسل یدہ قبل ان	کرے تو طاق کا خیال رکھے اور جب تم
یدخلھا فی وضوئہ فان	میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو
احدکم لا یدری این باتت	تو اسے اپنا ہاتھ برتن میں ڈالنے سے

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۲۴ کتاب الجمعہ باب المشی الی الجمعۃ [2] ایضاً ص ۲۶ کتاب الوضوء باب لا یستقبل القبلۃ بغائط او بول [3] ایضاً ص ۲۶ کتاب الوضوء باب النہی عن الاستنجاء بالیمین۔

یں ڈالے پہلے دھو لینا چاہیے کیونکہ وہ نہیں جانتا
کہ رات میں اس کا ہاتھ کہاں رہا۔

کسی چیز کی تاکید اور اس کی فضیلت واہمیت بیان کرنے کا بلیغ اسلوب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بعض امور بڑے اہم اور قابل توجہ ہوتے تھے اور آپؐ چاہتے تھے کہ لوگ بھی ان کی اہمیت کو محسوس کر کے ان کا اہتمام کریں اور ان کے مستقل طور پر پابند ہو جائیں لیکن عام لوگوں کی سہولت اور آسانی بھی آپؐ کو عزیز تھی اس لیے خود اس پر مداومت نہیں کرتے تھے اور نہ ایسا طریقہ اختیار کرتے تھے جس سے لوگ ان امور کو لازمی سمجھ لیں اور ان کا باقاعدہ اہتمام کر کے مشقت اور دشواری میں پڑ جائیں۔ تاہم اس طرح کی بعض باتوں کی تاکید آپؐ نے جس انداز اور اسلوب میں کی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کے نزدیک ان چیزوں کی کس قدر اہمیت و فضیلت ہے، اس طرح کی حدیثوں میں آپؐ کے بیان کا زور، اور اسلوب کی دل نشینی و دل آویزی بہت بڑھی ہوئی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صفائی اور نظافت بہت پسند تھی اور آپؐ اس کا بڑا خیال رکھتے تھے، آپؐ نے اسے نصف ایمان کہا ہے اور ناپاکی کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، اس کی بھی سخت تاکید کی ہے کہ نمازی کا جسم اور لباس پاک صاف ہونا چاہیے، ہر نماز کے لیے وضو کی تعلیم بھی اسی لیے دی گئی ہے، جس میں منہ اور ناک کی صفائی پر خاص طور سے زور دیا ہے، وضو میں مسواک کرنے اور بدبودار چیز کھا کر مسجد میں نہ جانے کی ہدایت بھی آپؐ کی نظافت پسندی کا ثبوت ہے علاوہ ازیں آدمی کے گندہ رہنے یا منھ سے بدبو آنے کی صورت میں دوسرے نمازیوں کو تکلیف بھی ہوتی ہے، مسواک کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے آپؐ نے جو موثر اور بلیغ پیرایۂ بیان اختیار

لہ صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۸ کتاب الوضو باب الاستجمار وترا۔

کیا ہے اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوگا :

لولا ان اشق علی امتی او لولا ان	اگر مجھے اپنی امت یا (راوی کا شک)
اشق علی الناس لامرتھم	لوگوں کی مشقت کا خیال نہ ہوتا تو میں
بالسواک مع کل صلوٰۃ[1]	انہیں ہر نماز کے لیے مسواک کرنے
	کا حکم دیتا ۔

بعض روایتوں میں عند کل وضوء (ہر وضو کے وقت) کے الفاظ آئے ہیں[2]۔

تہجد کی نماز کی بڑی تاکید خود قرآن مجید میں کی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بڑے موثر اور بلیغ انداز میں اس کی فضیلت و اہمیت بیان کی ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی، کچھ لوگ بھی آپؐ کے ساتھ نماز میں شریک ہوئے، جب دوسری رات آئی اور آپؐ نماز کے لیے اٹھے تو نمازیوں کی تعداد پہلی رات سے زیادہ ہوگئی تیسری یا چوتھی رات میں پھر اسی طرح لوگ جمع ہوئے لیکن آپؐ نہیں تشریف لائے۔ جب صبح ہوئی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا :

قد رأیت الذی صنعتم ولم	تم لوگوں نے جو کیا میں نے اسے دیکھا
یمنعنی من الخروج الیکم الا	مگر میں اس اندیشہ سے نہیں نکلا کہ
انی خشیت ان تفرض علیکم[3]	کہیں تم پر یہ فرض نہ ہو جائے ۔

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۲۲ کتاب الجمعہ باب السواک یوم الجمعۃ [2] ایضاً ص ۲۵۹ کتاب الصوم باب السواک الرطب والیابس للصائم [3] ایضاً ص ۱۵۲ کتاب التہجد باب تحریض النبیؐ علی قیام اللیل والنوافل من غیر ایجاب ۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے تہجد کی اہمیت دوسرے نہایت موثر و بلیغ پیرایہ میں بیان کی ہے، حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات آپؐ بیدار ہوئے اور ارشاد فرمایا:

سبحان اللّٰہ ماذا انزل اللیلۃ	سبحان اللہ! (آج کی) رات کو کیسے
من الفتنۃ ماذا انزل من	کیسے فتنے اور کیا کیا خزانے اتارے
الخزائن من یوقظ صواحب	گئے، کون ہے جو ان کمرے والیوں کو
الحجرات یارب کاسیۃ فی الدنیا	جگائے، ہائے بہت سی عورتیں دنیا
عاریۃ فی الآخرۃ[1]	میں خوب کپڑے پہنے ہوئے ہیں لیکن
	آخرت میں ننگی ہوں گی۔

پوری حدیث ادب و بلاغت کا نمونہ ہے اور آخری فقرہ جس قدر موثر، بلیغ اور پُرزور ہے اس کی خوبی بیان نہیں کی جا سکتی۔ یہ ضرب المثل بن گیا ہے اسی طرح کا معنی خیز اور بلیغ فقرہ یہ بھی ہے:

ان المکثرین ھم المقلون	بیشک دولت والے ہی قیامت کے
یوم القیامۃ[2]	دن کم اجر و ثواب والے ہوں گے۔

بعض نہایت بلیغ تعبیریں | دین میں صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ کی بڑی اہمیت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کسی سائل کو واپس نہیں کرتے تھے آپؐ کا دریائے فیض ہمیشہ [illegible] رہتا تھا، کبھی آپؐ کے پاس مال و دولت کا ڈھیر اکٹھا نہیں ہوتا

---

[1] صحیح بخاری [illegible] [2] ایضاً ج ۲ کتاب الرقاق باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما یسرنی

[illegible]

تھا، اگر کبھی کوئی چیز اتفاق سے آجاتی تو جب تک وہ خرچ نہ ہو جاتی آپؐ کو چین نہیں ملتا تھا ازواج مطہرات کو سخت تاکید تھی کہ کوئی سامان گھر میں رہنے نہ پائے، آپؐ کو سکون اور راحت اسی وقت میسر آتی جب محتاجوں اور ضرورتمندوں میں ہر چیز تقسیم کر دیتے، آپؐ نے اپنے اس جذبۂ خیر و انفاق کی تعبیر جس قدر موثر اور بلیغ انداز میں کی ہے اس کی قدر و عظمت کا اندازہ ادب و بلاغت شناس ہی کر سکتے ہیں ملاحظہ ہو:

لو کان عندی احد ذھبا	اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا
لاحببت ان لایاتی ثلث	کا انبار لگ جائے تو میں یہی پسند کرونگا
وعندی منہ دینار[1]	کہ میں دو تین دن گزرنے سے پہلے میرے پاس ایک
	دینار بھی نہ رہ جائے۔

صدقہ و خیرات میں اخفا کی سخت تاکید کی گئی ہے اور ریا، نمود و نمائش اور احسان جتانے کو نہایت معیوب قرار دیا گیا ہے، اخفا کی جس قدر موثر و بلیغ تعبیر آپؐ کی فصاحت و بلاغت خیز زبان نے کی ہے ناممکن ہے کہ کوئی صاحب ذوق اس سے متاثر اور کیف اندوز نہ ہو۔ ملاحظہ ہو:

ایک مشہور حدیث ہے کہ قیامت میں اللہ تعالی سات آدمیوں پر سایہ فگن ہوگا ان میں سے ایک شخص وہ ہوگا جو صدقہ میں نہایت اخفا سے کام لیتا ہے، اس غیر معمولی اخفا کی تعبیر آپؐ نے اس طرح فرمائی:

ورجل تصدق اخفاء حتی لا	اور ایک وہ شخص (قیامت میں اللہ
تعلم شمالہ ما تنفق یمینہ[2]	کے سایہ تلے ہوگا) جس نے اس قدر مخفی

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۳۰، کتاب التمنی باب تمنی الخیر و قول النبیؐ لو کان لی احد ذہبا (بقیہ حاشیہ ص ۲۲ پر)

طور سے صدقہ کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ
کو بھی اس کا پتہ نہ ہو کہ داہنے ہاتھ نے
کیا خرچ کیا۔

حلال و حرام کا معاملہ واضح ہوتا ہے لیکن جو چیزیں ان دونوں کے درمیان معلق ہوتی ہیں اور ان کی حلت و حرمت کا معاملہ مشتبہ ہوتا ہے ان کے بارے میں کیا موقف اختیار کرنا چاہیے اس کو آپ نے نہایت بلیغ اور بڑے موثر انداز سے تشبیہ کے پیرایے میں واضح کیا ہے جس سے تعبیر و بیان پر آپ کی مکمل قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

الحلال بین والحرام بین وبینہما	حلال ظاہر و واضح ہے اور حرام بھی،
مشتبہات لا یعلمہا کثیر	ان دونوں کے درمیان میں شبہ کی
من الناس فمن اتقی الشبہات	ایسی چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ
استبرأ لدینہ وعرضہ ومن	نہیں جانتے پس جو شخص ان سے بچا
وقع فی الشبہات کراع یرعی	اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچا لیا
حول الحمیٰ یوشک ان یواقعہ	اور جو شبہوں میں پڑ گیا اس کی مثال
الا وان لکل ملک حمی الا ان	اس چرواہے کی ہے جس کے جانور
حمی اللہ فی ارضہ محارمہ	چراگاہ کے آس پاس چرتے ہیں،
الا وان فی الجسد مضغۃ اذا	احتمال ہے کہ وہ اس میں چرنے لگے،
صلحت صلح الجسد کلہ واذا	خبردار ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱) ۵؎ صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۱ کتاب الصلوٰۃ باب فضل من جلس فی المسجد ینتظر الصلوٰۃ وفضل المساجد۔

فسدت فسد الجسد کله الا	ہوتی ہے اور اللہ کی چراگاہ اسکی
وھی القلب [1]	زمین میں وہ چیزیں ہیں جن کو اس
	نے حرام کیا ہے سُن لو بدن میں گوشت
	کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے اگر وہ درست
	ہو جاتا ہے تو سارا جسم درست ہو جاتا
	ہے اور اگر وہ خراب ہو گیا تو سارا جسم
	خراب ہو گیا، یہ ٹکڑا آدمی کا دل ہے۔

اس حدیث کا اسلوب نہایت موثر و بلیغ ہے، علاوہ ازیں حدیث کے آخر میں جو اہم حقیقت بیان کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ ایک بڑے حکیم معلم اخلاق اور انسان کی نفسیات و طبائع سے مکمل طور پر واقف تھے۔

امام بخاریؒ نے یہ حدیث دوسری جگہ اس طرح نقل کی ہے:

الحلال بین والحرام بین وبینھما	حلال و حرام بالکل واضح ہے مگر انکے
امور مشتبھۃ فمن ترک ما شبہ	درمیان بعض مشتبہ امور ہیں جس نے
علیہ من الاثم کان لما استبان	ان مشتبہ گناہوں کو چھوڑ دیا تو وہ واضح
لہ اترک ومن اجترأ علی ما یشک	گناہوں کو بدرجہ اولیٰ چھوڑ دے گا
فیہ من الاثم اوشک ان	اور جو مشتبہ گناہوں کو کرنے کی جسارت
یواقع ما استبان والمعاصی	کر بیٹھا تو وہ کھلے گناہ بھی کر بیٹھے گا،
حمی اللہ من یرتع حول الحمی	اور گناہ اللہ تعالیٰ کی چراگاہ ہے جو

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۳ کتاب الایمان باب فضل من استبرأ لدینہ۔

یوشک ان یواقعہ[1] — شخص اس کے اردگرد اپنے جانور چرائے گا وہ قریب ہے کہ انہیں چراگاہ میں ڈال دے۔

ضرب الامثال آخر میں ہم ان حدیثوں کا ذکر کرتے ہیں جو ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکی ہیں، یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کا بڑا ثبوت ہیں، کیونکہ کوئی فقرہ اسی وقت ضرب المثل بنتا اور عام رواج پاتا ہے جب وہ فصاحت و بلاغت کی حد کمال پر پہنچا ہوا ہو، احادیث کا دفتر ان سے بھرا ہوا ہے لیکن اس مضمون میں ہم نے صحیح بخاری ہی سے مثالیں پیش کرنے کا التزام کیا ہے اس لیے ضرب الامثال بھی اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہی سے پیش کیے جاتے ہیں۔

انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی[2] — اعمال نیتوں پر موقوف ہیں اور ہر آدمی کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔

یہ صحیح بخاری کے پہلے باب کی پہلی حدیث ہے جس سے امام صاحب کی نیک نیتی اور حسن عمل کا ثبوت ملتا ہے۔ یہی حدیث کتاب الایمان میں معمولی فرق کے ساتھ اس طرح وارد ہے:

الاعمال بالنیۃ ولکل امرئ مانوی[3] — اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵، ۲ کتاب البیوع باب الحلال بین والحرام بین وبینھما مشتبھات [2] ایضاً کتاب الوحی باب کیف کان بدو الوحی الی رسول اللہ [3] ایضاً کتاب الایمان باب ما جاء ان الاعمال بالنیۃ والحسبۃ ولکل امرئ مانوی۔

معارف اعظم گڈھ
کی
۱۵۳ ویں جلد
ماہ جنوری ۱۹۹۴ء تا ماہ جون ۱۹۹۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۵۳

ماہ جنوری ۱۹۹۴ء تا ماہ جون ۱۹۹۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

یوشک ان یواقعہ[۱]	شخص اس کے ارد گرد اپنے جانور چرائے گا وہ قریب ہے کہ انہیں چراگاہ میں ڈال دے۔

ضرب الامثال آخر میں ہم ان حدیثوں کا ذکر کرتے ہیں جو ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکی ہیں، یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کا بڑا ثبوت ہیں، کیونکہ کوئی فقرہ اسی وقت ضرب المثل بنتا اور عام رواج پاتا ہے جب وہ فصاحت و بلاغت کی حد کمال پر پہنچا ہوا ہو، احادیث کا دفتر ان سے بھرا ہوا ہے لیکن اس مضمون میں ہم نے صحیح بخاری ہی سے مثالیں پیش کرنے کا التزام کیا ہے اس لیے ضرب الامثال بھی اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہی سے پیش کیے جاتے ہیں۔

انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی[۲]	اعمال نیتوں پر موقوف ہیں اور ہر آدمی کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔

یہ صحیح بخاری کے پہلے باب کی پہلی حدیث ہے جس سے امام صاحب کی نیک نیتی اور حسن عمل کا ثبوت ملتا ہے۔ یہی حدیث کتاب الایمان میں معمولی فرق کے ساتھ اس طرح وارد ہے:

الاعمال بالنیۃ ولکل امرئ مانوی[۳]	اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر

[۱] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۷۵ کتاب البیوع باب الحلال بین والحرام بین وبینھما مشتبہات [۲] ایضاً کتاب الوحی باب کیف کان بدوالوحی الی رسول اللہ [۳] ایضاً کتاب الایمان باب ماجاء ان الاعمال بالنیۃ والحسبۃ ولکل امرئ مانوی۔

شخص کے لیے وہ ہے جس کی اس نے
نیت کی۔

حدیث میں عمل میں اخلاص اور حسن نیت پر زور دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ خیر و صلاح اور بر و تقویٰ کا کام بھی اسی وقت مقبول اور باعث اجر ہوگا جب اس کی غرض رضائے الٰہی کا حصول ہو اور وہ کام نمود و نمائش اور ریاکاری کے شائبہ سے پاک ہو۔ دوسرے فقرہ کا لب لباب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق ہی پھل اور ثواب ملتا ہے:

ان من الشعر حکمۃ و ان من البیان لسحرا[1]	بعض اشعار حکمت سے پُر ہوتے ہیں اور بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دفعہ قبیلہ تمیم کا وفد آیا، آپؐ نے عمرو بن اہتم سے زبرقان بن بدر کے بارے میں دریافت کیا، عمرو نے ان کی تعریف و توصیف میں جو کچھ کہا زبرقان کو وہ پسند نہیں آیا وہ اس سے زیادہ اپنی تعریف و توصیف چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول خدا کی قسم ان کو معلوم ہے کہ انھوں نے میری نسبت جو کچھ کہا ہے میں اس سے کہیں فائق اور برتر ہوں مگر انہیں مجھ سے حسد ہے، اس پر عمرو بن اہتم نے زبرقان کی مذمت و ہجو شروع کی اور کہا اے اللہ کے رسولؐ! پہلی دفعہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی تھی اور دوسری بار میں نے بالکل صحیح بات عرض کی ہے، چنانچہ آپؐ نے اس وقت مذکورۂ صدر فقرہ کہا جو ضرب المثل بن گیا ہے، اس سے آپؐ کا مدعا یہ تھا کہ بلیغ شخص اپنے زور بیان اور

---

[1] حدیث کا پہلا جز صحیح بخاری کتاب الادب باب مایجوز من الشعر والرجز والحداء ومایکرہ میں اور آخری حصہ کتاب الطب باب ان من البیان سحرا میں مذکور ہے۔

طلاقت لسانی سے اپنی بات کو اس حد پر پہنچا دیتا ہے جہاں ساحر اپنے لطیف حیلہ و کرتب سے پہنچایا کرتا ہے[1]

لا یلدغ المومن من جحر مرتین[2] مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔

غزوۂ بدر میں خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب غلبہ و کامرانی عطا کی تو مشرکین میں سے بہت سے قیدی آپؐ کے ہاتھ لگے، انہی میں ایک شخص ابو عزہ بھی تھا جو شاعر تھا اس نے اپنے نقر و فاقہ اور اولاد کی کثرت وغیرہ کا ذکر کر کے رسول اللہؐ سے احسان فرمانے اور رہا کر دینے کی درخواست کی، آپؐ نے اس پر فضل و احسان کیا اور اسے رہا کر دیا اور اس سے یہ عہد لیا کہ آئندہ وہ آپؐ کی ہجو اور آپؐ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے سے باز رہے گا، ابو عزہ عہد کر کے مکہ واپس آیا، صفوان بن امیہ نے اسے پھر گمراہ کر دیا اور اس کے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری لینے کا وعدہ بھی کیا چنانچہ وہ پھر قریش کے ساتھ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کے لیے نکلا اور آپؐ کے خلاف یاوہ گوئی اور پروپگنڈہ کرنا شروع کیا، اتفاق سے وہ پھر دوبارہ گرفتار ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عفو و احسان کا طالب ہوا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "مسلمان ایک ہی سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا، اب ہم تمھیں پھر چھوڑ کر اس کا موقع نہ دیں گے کہ تم مکہ جا کر یہ کہو کہ میں نے دوبار محمدؐ کا تمسخر کیا"[3]

---

[1] ابن درید: المجتنیٰ ص ۲۲ و ابن رشیق قیروانی: کتاب العمدہ ج اول ص ۱۲۵ و ۱۲۶۔

[2] صحیح بخاری کتاب الادب باب لا یلدغ المومن من جحر مرتین [3] ابن درید، المجتنیٰ ص ۱۴ و ابن حجر۔ فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۴۰۔

الحرب خدعۃ[1] جنگ دھوکا اور حیلہ ہے۔

غزوۂ احزاب میں قریش اور تمام قبائل عرب اسلام کا استیصال کرنے کے لیے مجتمع ہو گئے تھے، قبیلہ غطفان کو یہود نے خیبر کا نصف محاصل دینے کا لالچ دیا تھا اس لیے وہ مزید جوش و خروش کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہوئے، نعیم بن مسعود اشجعی ایک غطفانی رئیس تھے، قریش اور یہود دونوں ان کو مانتے تھے، وہ اسلام قبول کر چکے تھے جس کا علم ان لوگوں کو نہیں تھا۔ انھوں نے ایسی باتیں کیں جن سے قریش و یہود اور خود قبیلہ غطفان میں تفرقہ پیدا ہو گیا اس پر آپؐ نے فرمایا کہ جنگ دھوکہ ہے، آپؐ کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ جنگ میں مکر و حیلہ کثرت تعداد اور دلاوری کے اقدام سے زیادہ مفید اور کارگر ہے[2]

الید العلیا خیر من السفلی[3] اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے زیادہ بہتر ہے۔

یہ ارشاد مبارک صدقہ کی ترغیب دلانے اور گداگری کی مذمت میں وارد ہوا ہے علیا سے مراد صدقہ دینے والا ہاتھ ہے اور سفلی سے سائل کا ہاتھ مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ دینے والے کو دیے جانے والے شخص پر فوقیت اور برتری حاصل ہے یعنی فضل و انعام کرنا عمدہ اور بہتر بات ہے[4]

انما الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ[5] صبر ابتدائے صدمہ میں ہوتا ہے۔

---

[1] کتاب الجہاد باب الحرب خدعۃ و کتاب الاستتابۃ باب قتل الخوارج والملحدین بعد اقامۃ الحجۃ علیہم [2] المجتنیٰ ص ۵۰۱ [3] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی [4] المجتنیٰ ص ۱۹ [5] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب زیارۃ القبور۔

دوسری روایت میں ہے :

الصبر عند الصدمۃ الاولی[1] صبر تو وہی ہے جو صدمہ کے شروع میں ہو۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لیجا رہے تھے، ایک عورت قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی آپ رک گئے اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا صبر کرو' وہ آپ کو پہچانتی نہ تھی، گستاخی کے ساتھ بولی ہٹو' تم کیا جان سکتے ہو مجھ پر کیا کیفیت ہے آپ چلے آئے تو لوگوں نے عورت سے کہا تم نے نہیں پہچانا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، وہ دوڑی ہوئی آئی اور کہا میں حضورؐ کو پہچانتی نہ تھی، ارشاد فرمایا صبر وہی معتبر ہے جو عین مصیبت کے وقت کیا جائے[2]

انک ان تدع ورثتک اغنیاءً — تمہارا وارثوں کو غنی چھوڑ کر مرنا اس سے

خیر من ان تدعھم عالۃ — اچھا ہے کہ انہیں ایسا محتاج چھوڑو

یتکففون الناس فی ایدیھم[3] — کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں'

حضرت سعد بن وقاصؓ مکہ میں جا کر سخت بیمار ہو گئے، وہ چونکہ مہاجرین میں سے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مکہ میں جہاں سے ہجرت کر چکے ہیں ان کی وفات ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا اللہ تم پر رحم فرمائے، حضرت سعدؓ نے اپنی اس خواہش کا ذکر آپ سے کیا کہ میں اپنے سارے مال کی وصیت کرنا چاہتا ہوں آپ نے انہیں اس سے منع کیا تو انھوں نے کہا اچھا نصف مال کی

---

[1] صحیح بخاری باب الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ [2] ایضاً باب زیارۃ القبور [3] ایضاً کتاب الوصایا باب ان یترک ورثتہ اغنیاء خیر من ان یتکففون الناس۔

وصیت کر دوں آپؐ نے اس سے بھی منع کیا تب انھوں نے ثلث کے بارے میں عرض کیا، آپؐ نے اس کی اجازت تو دی مگر یہ فرمایا کہ یہ بھی بہت ہے اور اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ مال وارثوں کا حق ہوتا ہے انہیں خوش حال چھوڑنا بہتر ہے۔[1]

انصر اخاک ظالما او مظلوما۔[2] اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

یہ فقرہ بھی ضرب المثل ہے، جب آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا تو صحابۂ کرامؓ نے دریافت کیا اے اللہ کے رسولؐ، مظلوم کی مدد تو ہم کریں گے لیکن ظالم کی مدد کس طرح کریں فرمایا کہ اسے اس کے ظلم سے روک دو۔[3]

اتق دعوۃ المظلوم۔[4] مظلوم کی بد دعا سے بچو۔

یہ حضرت معاذؓ کی وصیت کے الفاظ ہیں جو آپؐ نے ان کو یمن بھیجتے ہوئے فرمائے تھے۔ اس میں ان کو ارکان اسلام کی تعلیم دینے کی تلقین کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء و اغنیا سے زکوٰۃ لے کر فقرا و مساکین میں تقسیم کرنے کی ہدایت فرمائی تھی اور زکوٰۃ لینے میں اس کی ممانعت کی تھی کہ :

فایاک وکرائم اموالھم۔[5] انکے اچھے اور عمدہ مال لینے سے بچو۔

کیونکہ اچھا مال لے کر خراب مال چھوڑ دینے سے انہیں تکلیف ہوگی اور یہ ان پر ظلم بھی ہوگا جس کے بعد وہ بد دعا کر سکتے ہیں اس سے آپؐ نے بچنے کی تاکید کی[1] اور وجہ یہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الوصایا باب ان یترک ورثتہ اغنیاء ص ۳۸۳ [2] ایضاً کتاب المظالم باب اعن اخاک ظالما او مظلوما ص ۳۳۰ [3] ایضاً [4] ایضاً کتاب الزکوٰۃ باب اخذ الصدقۃ من الاغنیاء وترد فی الفقراء حیث کانوا و کتاب المظالم باب الاتقاء والحذر من دعوۃ المظلوم۔

بتائی کہ مظلوم کی فریاد اللہ سُن لیتا ہے، اس کی بد دعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہتا۔ یہ بات بجائے خود نہایت اہم اور معنی خیز ہے جو اپنے بلیغ الفاظ اور خوبصورت اندازِ بیان کی وجہ سے ضرب المثل بن گئی ہے۔

المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ [1]	مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ظلم و ستم کا نشانہ بننے دیتا ہے۔

یہ فقرہ بھی ضرب المثل ہے، مفہوم یہ ہے کہ کوئی مسلمان خود اپنے مسلمان بھائی پر ظلم و ستم نہیں کرتا اور نہ دوسروں کو اس کا موقع دیتا ہے کہ وہ اس پر ظلم و ستم ڈھائیں یا وہ اپنے مسلمان بھائی کو کسی اذیت اور مصیبت میں دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔

لیس الشدید بالصرعۃ، انما الشدید یملک نفسہ عند الغضب [2]	پچھاڑنے والا شدید اور بہادر نہیں ہے بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے۔

یہ فقرہ بھی ضرب المثل اور بڑا معنیٰ خیز ہے۔

الحیاء شعبۃ من الایمان [3]	حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔

رسول اللہؐ نے ایک انصاری کو اپنے بھائی کو حیا کی نصیحت کرتے ہوئے سُنا تو فرمایا دعہ فان الحیاء من الایمان [4] (انہیں چھوڑ دو کیونکہ حیا ایمان کا حصہ ہے)

المسلم من سلم المسلمون من	مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ

---

[1] صحیح بخاری کتاب المظالم باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلم [2] ایضاً کتاب الادب باب الحذر من الغضب [3] ایضاً کتاب الایمان باب امور الایمان الخ [4] ایضاً باب الحیاء من الایمان۔

لسانہ و یدہ و المہاجر من ہجر ما نہی اللہ عنہ[1]	سے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔
ان المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا[2]	ایک مسلمان دوسرے کیلئے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔

راوی کا بیان ہے کہ آپؐ جب یہ بات فرما رہے تھے تو آپؐ نے اپنی انگلیوں کو ایک ایک دوسرے کے اندر ڈال دیا تھا۔

فرب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی الآخرۃ[3]	دنیا میں بہت سی خوب اوڑھنے پہننے والی عورتیں آخرت میں برہنہ ہوں گی۔
لیس الغنی عن کثرۃ العرض ولکن الغنی غنی النفس[4]	دولت و ثروت غنی نہیں ہے بلکہ نفس کا غنی اصل غنی ہے۔

ایک مرتبہ آپؐ نے حضرت ابوذرؓ سے دریافت کیا کہ کیا تم مال کی کثرت کو غنی اور قلت کو فقر سمجھتے ہو؟ انھوں نے کہا ہاں، آپؐ نے فرمایا غنی اور فقر تو قلب کا غنی و فقر ہوتا ہے۔[5]

الولد للفراش وللعاھر الحجر[6]	لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا

---

[1] صحیح بخاری باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ [2] ایضاً کتاب الصلوٰۃ باب تشبیک الاصابع فی المسجد وغیرہ [3] ایضاً کتاب العلم باب العلم والعظۃ باللیل [4] ایضاً کتاب الرقاق باب الغنی عن النفس [5] فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۳۲ [6] صحیح بخاری کتاب المحاربین باب للعاہر الحجر۔

زناکار کے لیے پتھر ہے۔

الحلف منفقة للسلعة محقة للبرکة [1]	(جھوٹی) قسم سے مال بک جاتا ہے لیکن برکت ختم ہو جاتی ہے۔
من سرہ ان یبسط له فی رزقه او ینساء له فی اثره فلیصل رحمه [2]	جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کے رزق میں وسعت ہو یا اس کی عمر دراز ہو تو اسے صلہ رحمی کرنی چاہیے۔
کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته [3]	تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے متعلق بازپرس ہوگی۔
نعمتان مغبون فیهما کثیر من الناس الصحة والفراغ [4]	دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگوں کے ساتھ غبن ہوتا ہے یعنی نہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے تندرستی اور خوشحالی۔

شارحین حدیث نے اس کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ ان نعمتوں کو پانے کے بعد اگر بندہ اللہ کا شکر گزار ہے تو وہ مغبون نہیں رہے گا۔ لیکن اکثر لوگوں کو اس کی توفیق میسر نہیں آتی اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ وہ مغبون رہتے ہیں، حافظ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو

---

[1] ایضاً کتاب البیوع باب یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات واللہ لا یحب کل کفار اثیم [2] ایضاً باب من احب البسط فی الرزق [3] ایضاً کتاب الجمعہ باب الجمعۃ فی القریٰ والمدن وکتاب الجنائز باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعذب المیت ببعض بکاء اہله وکتاب الاحکام باب قول اللہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم [4] ایضاً کتاب الرقاق الصحۃ والفراغ۔

یہ دونوں چیزیں مل جاتی ہیں تو اس میں کسل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اطاعت الٰہی میں سستی کرتا ہے۔ مغبون فیہما کثیر من الناس کو وقلیل من عبادی الشکور کے ہم معنی بتایا گیا ہے[۱]

من یرد اللہ بہ خیرا یفقہ	اللہ کو جس کی بھلائی منظور ہوتی ہے
فی الدین[۲]	اس کو دین میں سمجھ عطا کرتا ہے۔
انما انا قاسم واللہ یعطی[۳]	میں تو صرف بانٹنے والا ہوں اور اللہ دینے والا ہے۔
ویحک یا انجشۃ رویدک	اے انجشہ آہستہ سے عورتوں کی
سوقا بالقواریر[۴]	سواری ہانکو۔

آگے باب المعاریض میں رفقا یا انجشہ ویحک بالقواریر کے الفاظ آئے ہیں، قواریر عورتوں سے کنایہ ہے کیونکہ وہ بھی شیشوں کی طرح نرم و نازک اور خلقتاً کمزور ہوتی ہیں، انجشہ ایک حبشی شخص تھے جن کی آواز بہت بلند تھی اور وہ بہت خوش گلو بھی تھے۔ رسول اللہؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو سواری پر لے کر چلو تو آہستہ اور نرمی سے اونٹ ہانکو تیزی اور جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔

بخاری شریف میں یہ اور اس طرح کے دوسرے متعدد اسالیب موجود ہیں جو آپ کی فصاحت وبلاغت اور قادر الکلامی کا ثبوت ہیں یہاں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱؎ فتح الباری ج ۱۱ ص ۱۹۶ ۲؎ و ۳؎ بخاری کتاب العلم باب من یرد اللہ خیرا یفقہ فی الدین ۴؎ بخاری کتاب الادب باب ما یجوز من الشعر والرجز والحداء۔

کتاب السرد والفرد فی صحائف الاخبار

لابی الخیر احمد بن اسمٰعیل القزوینی

ترتیب و تعلیق مع انگریزی ترجمہ: ڈاکٹر محمد حمید اللہ

از پروفیسر عبدالرحمٰن مومن، بمبئی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، سیرت و سوانح اور حالات و معاملات سے متعلق جو مواد مسلمانوں کے یہاں پایا جاتا ہے وہ نہ صرف کیفیت و کمیت کے لحاظ سے حیرت انگیز ہے بلکہ اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ اس مواد میں کتب حدیث کی ضخیم مجلدات، اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ اور سیرت نبوی پر لاتعداد کتابیں شامل ہیں۔ علامہ محمد یوسف شامی کی کتاب "سبل الهدیٰ والرشاد فی سیرة خیر العباد" جس کی پانچ چھ جلدیں چھپ چکی ہیں اور شاید ۱۵ سے زائد جلدیں ہنوز تشنۂ طباعت ہیں، دنیا میں اپنی نوعیت کی منفرد اور ضخیم ترین کتاب ہے۔

بعض حلقوں کی طرف سے یہ لغویات کہی جاتی ہے کہ بخاری و مسلم جیسی حدیث کی کتابیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے دو ڈھائی سو برس بعد لکھی گئیں لہٰذا ان پر کلیتاً اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ گمان علم حدیث کی تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے قبل ہی اسلام جزیرۂ عرب میں پھیل چکا تھا اور تقریباً پانچ لاکھ افراد مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چالیس ہزار

صحابۂ کرام موجود تھے۔ صحابۂ کرام کو آنحضورؐ سے جو عقیدت و ارادت تھی اور آپؐ کے ارشادات و تعلیمات کے تحفظ اور ترسیل و ابلاغ کے ساتھ جو اعتنا انھوں نے اور ان کے بعد آنے والی نسلوں نے کیا اس کی نظیر انسانی تاریخ میں ناپید ہے۔ تواتر اور اسناد کے التزام کے ساتھ حدیث کا جو عظیم الشان ذخیرہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوا اس میں نہ صرف یادداشت بلکہ تحریر کو بھی دخل تھا۔ چنانچہ عہد نبویؐ ہی میں سیکڑوں وثائق و فرامین ضبط تحریر میں لائے گئے تھے۔ ان وثائق و فرامین کو جن میں ۳۰۰ سے زائد خطوط بھی شامل ہیں، فاضل محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب 'الوثائق السیاسیۃ فی العھد النبوی والخلافۃ الراشدۃ' میں بڑے سلیقہ سے جمع کر دیا ہے[1]۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے حکمرانوں کو جو تبلیغی خطوط لکھے تھے ان میں سے پانچ اپنی اصل شکل میں آج بھی محفوظ ہیں[2]۔ یہ خطوط ہرقل روم، مقوقس، منذر بن ساوی، نجاشی اور کسریٰ کے نام لکھے گئے تھے۔ ان خطوط کے متون میں جو حدیث و سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور اصل خطوط میں کوئی تفاوت نہیں پایا جاتا۔ یہ کتب حدیث کے معتبر ہونے کا ایک بڑا ثبوت ہے۔

متعدد صحابۂ کرام نے حدیث کو ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام کیا تھا۔ ان میں کبار صحابہ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت عبداللہ

---

[1] طبع بیروت (چھٹا ایڈیشن) [2] ملاحظہ ہو: ڈاکٹر محمد حمید اللہ: الوثائق السیاسیہ نیز ڈاکٹر صاحب کی اردو کتاب رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی (طبع کراچی ۱۹۸۳ء) حال میں ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر فرانسیسی زبان میں SIX ORIGINAUX DES LETTRES DIPLOMATIQUES DU PROPHETE DE L'ISLAM کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے (طبع پیرس ۱۹۸۶ء)

بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت سمرہ بن جندبؓ اور حضرت سعد بن عبادہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نام شامل ہیں۔ بالفاظ دیگر علم حدیث کی تدوین صحابۂ کرامؓ کے زمانہ ہی میں شروع ہو چکی تھی۔ حدیث کا ایک قدیم ترین مجموعہ صحیفہ ہمام بن منبہ ہے۔ ہمام بن منبہ (متوفی ۱۰۱ ہجری) حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد تھے۔ صحیفہ ہمام بن منبہ کی تمام مرویات صحاح ستہ میں موجود ہیں۔ نیز اس کا پورا متن مسند احمد بن حنبل میں موجود ہے۔ صحیفہ ہمام بن منبہ کے قلمی نسخے دمشق، قاہرہ اور برلن میں پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے ان تمام مخطوطوں کا مقابلہ کر کے تعلیق و تقدیم کے ساتھ اسے دمشق سے شائع کرایا۔[1] حدیث کی دیگر قدیم کتابوں میں جواب زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، مسند حمیدی، سنن سعید بن منصور، مصنف عبدالرزاق اور امام عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقائق شامل ہیں۔

۱۹۸۴ء میں پاکستان ہجرت کاونسل نے اسلامی نظریۂ حیات، تہذیب اور معاشرت پر سو اہم ترین کتابیں از سر نو شایع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ کتابیں بارہ خانوں میں تقسیم کی گئیں (۱) مذہب و اخلاقیات (۲) تعلیم (۳) فلسفہ (۴) سیاسیات (۵) قانون (۶) تاریخ (۷) تہذیب و معاشرت (۸) فلکیات (۹) علوم طبیعیہ (۱۰) ریاضیات (۱۱) طب و معالجہ (۱۲) اطلاقی علوم اور ٹکنالوجی۔

ابو الخیر احمد بن اسمٰعیل القزوینی کی کتاب السرد والفرد فی صحائف الاخبار ونسخها المنقولة عن سید المرسلین اسی منصوبہ کے تحت اسلام آباد سے ۱۴۱۱ھ میں شایع کی گئی۔ اس کتاب کا خطی نسخہ وزیر شہید علی پاشا کے ذخیرۂ کتب واقع سلیمانیہ

---

[1] صحیفہ ہمام بن منبہ (مع اردو ترجمہ طبع حیدرآباد، مع انگریزی ترجمہ دسواں ایڈیشن طبع حیدرآباد)

لائبریری استانبول میں موجود ہے۔ مخطوطہ کی تاریخ، صفر ۵۹۹ ہجری ہے ۔
اس کتاب میں ۴۳۶ روایات پر مشتمل گیارہ صحائف ہیں جو دراصل عہد صحابہؓ کے
قدیم ترین مجموعہ ہائے حدیث کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کتاب کی تمام مرویات میں اسناد
کا التزام کیا گیا ہے۔ ان میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی تین صحائف ہیں۔ ایک ان کے
شاگرد ہمام بن منبہ کا مرتب کردہ ہے، دوسرا کلثوم بن محمد کا اور تیسرا عبدالرزاق کا
ترتیب دیا ہوا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ کی روایت کردہ حدیثوں کے دو صحیفے ہیں۔
ایک ان کے شاگرد حمید الطویل کا ترتیب کردہ ہے اور دوسرا خراش کا۔ حضرت علیؓ
کی مرویات کے دو صحیفے ہیں۔ ایک ان کے اہل خانہ کی زبانی اور دوسرا شیخ کا روایت
کردہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرویات کے دو صحیفے ہیں۔ ان میں ایک عبدالرزاق
کا روایت کردہ ہے اور دوسرا جویریہ بن اسماء کا۔ ایک صحیفہ جعفر بن نسطور رومی کا
ہے جو صحابیؓ میں سے ہیں (؟)۔ ایک صحیفہ حضرت خضر اور حضرت الیاس علیہما السلام
کی مرویات پر مشتمل ہے۔

بدقسمتی سے کتاب السرد والفرد کے جامع و مرتب ابوالخیر احمد بن اسمٰعیل القزوینی
کے بارہ میں معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ ان کے بیٹے ابوبکر محمد بن احمد قزوینی نے
ان کی کتابوں کو روایت کیا ہے۔ کتاب السرد والفرد کے گیارہ صحائف کی مرویات
اس طرح ہیں :

صحیفہ ہمام بن منبہ	۱۱۸	صحیفہ کلثوم	۶۶
صحیفہ عبدالرزاق	۴۷	صحیفہ حمید الطویل	۱۰
صحیفہ اہل البیت	۱۹	صحیفہ خضر و الیاس	۲۱

صحیفہ اشج	۲۰	صحیفہ جعفر بن نسطور رومی	۱۱
صحیفہ خراش	۱۴	صحیفہ عبدالرزاق	۲۷
صحیفہ جویریہ	۸۳	کل مرویات	۴۳۶

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے، جن کے سر اس مخطوطہ کی دریافت کا سہرا ہے تمام مرویات کی تخریج کی ہے اور صحاح ستہ نیز مسند احمد بن حنبل میں پائی جانے والی مرویات کی نشاندہی کی ہے۔ ہر صحیفہ کے آخر میں اہم رواۃ کے بارہ میں ڈاکٹر صاحب نے معلومات فراہم کی ہیں۔ ان میں ایک راوی ابو محمد عبداللہ بن محمد بن زیاد السندی ہیں جو چوتھی صدی ہجری کے آدمی ہیں۔ ان گیارہ صحائف میں سب سے اہم صحیفہ ہمام بن منبہ ہے جس کو حدیث کی قدیم ترین کتابوں میں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ صحیفہ علی کی بیس مرویات میں سے جو ان کے اہل بیت سے نقل کی گئی ہیں صرف دو روایتیں صحاح ستہ میں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک مجمع بخاری میں ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے رسول اللہ کو فرماتے سُنا کہ جو
یقول من احسن الی احد من	میرے بعد میرے کسی اہل بیت سے اچھا
اهل بيتي بعدی شفعت له	برتاؤ کرے گا میں اس کے لیے قیامت
یوم القیامة ویکون فی الجنة	کے دن شفاعت کروں گا اور وہ میرے
معی۔	ساتھ جنت میں ہوگا۔

دوسری روایت ابن ماجہ میں ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ	میں نے رسول اللہ سے سُنا کہ آپ نے
وسلم یقول ان الدین قبل الوصية	فرمایا قرض (کی ادائیگی) وصیت سے
وانتم تقرؤن من بعد وصية	پہلے ہے تم لوگ (یہ آیت) تلاوت کرتے ہو

یوصیٰ بھا او دین۔ من بعد وصیۃ یوصیٰ بہا او دین[1]

اسلامی روایات میں حضرت خضر اور حضرت الیاسؑ کی شخصیت کچھ پُراسرار سی ہے۔ ان کے بارہ میں عام طور سے یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ کتاب السرد والفرد کے صحیفہ خضر والیاس میں ہے کہ راوی ایک غار میں داخل ہوئے اور راستہ بھول گئے۔ اتنے میں اچانک ان کو حضرت خضر علیہ السلام نظر آئے۔ ان کے ساتھ حضرت الیاسؑ بھی تھے۔ راوی نے ان سے پوچھا، ھل رأیتما محمداً صلی اللہ علیہ وسلم (کیا تم نے آنحضورؐ کو دیکھا ہے؟) انھوں نے جواب دیا ہاں۔ راوی نے ان سے درخواست کی کہ آپ مجھ سے آنحضورؐ کی چند حدیثیں روایت کریں تاکہ میں آپ کی سند سے ان کو روایت کروں۔ اس صحیفہ میں حضرت خضر اور حضرت الیاسؑ سے روایت کردہ ۲۱ مرویات ہیں۔ ان میں سے صرف ایک روایت صحاح ستہ میں اور ایک مسند احمد بن حنبل میں ہے۔

صحیفہ خضر والیاسؑ میں مروی روایت نمبر ۲: سمعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لوان العباد لم یذنبوا لخلق اللہ تعالیٰ خلقاً یذنبون ثم یغفر لھم انہ ھو الغفور الرحیم۔ مسلم اور ترمذی میں ہے۔ روایت نمبر ۸: سمعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما علی الارض رجل یقول لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر وسبحان اللہ والحمد للہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم الا غفرت ذنوبہ ولو کانت مثل زبد البحر مسند احمد بن حنبل میں ہے۔

صحیفہ جعفر بن نسطور رومی میں ۱۲ مرویات ہیں ان میں سے کوئی روایت صحاح ستہ میں نہیں پائی جاتی۔ اس صحیفہ میں جعفر بن نسطور رومی کو صحابی بتایا گیا ہے لیکن اس

---

[1] سورۃ النساء ۴: ۱۲۔

بارہ میں تاریخ اور اسماء الرجال کی کتابوں میں کوئی معلومات نہیں ملتی، شیخ ابی الفضل محمد بن علی الخراسانی المقتدری کی ملکیت میں صحیفہ جعفر بن نسطور رومی کا جو نسخہ تھا اس کے اخیر میں یہ لکھا ہوا تھا: ابوالحسن علی بن الحسین سے اس نسخہ کی صداقت کے بارہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ ان کے استاد ابوداؤد نے اپنے استاد ابوالقاسم منصور کی زبانی یہ سنا کہ جعفر بن نسطور غزوۂ تبوک میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ اتفاق سے آنحضورؐ کا کوڑا نیچے گر پڑا۔ جعفر بن نسطور نے کوڑا اٹھا کر آپ کو دیا۔ آنحضورؐ نے ان کے لیے درازیٔ عمر کی دعا فرمائی۔ چنانچہ جعفر بن نسطور کی عمر ۳۲۰ برس کی ہوئی اور انھوں نے بصرہ میں وفات پائی۔ یہ روایت رتن ہندی والی روایت سے ملتی جلتی ہے۔ جس کے بارہ میں محدثین اور اصحاب جرح وتعدیل لکھتے ہیں کہ یہ باطل ہے [1]

صحیفہ جعفر بن نسطور میں یہ روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یاکل ما یسقط من القصعۃ والخوان رفع عنہ الجنون والمرض والحمق وعن اولادہ تغیر اللون والحمی والجنون۔	جس نے رکابی یا خوان سے گرا ہوا دانہ اٹھا کر کھا لیا وہ جنون اور بیماری اور حماقت سے محفوظ رہے گا اور اس کی اولاد بھی بخار اور جنون سے محفوظ رہے گی۔

(روایت نمبر ۴)

---

[1] ذہبی: میزان الاعتدال جلد ا ص ۱۰۹؛ ابن حجر: لسان المیزان جلد ۲ ص ۴۵۰۔

یہ روایت موضوع معلوم ہوتی ہے۔ محدثین عظام نے موضوع روایتوں کی جو صفتیں بتلائی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں معنوی رکاکت پائی جاتی ہو نیز یہ کہ وہ عقل انسانی یا مشاہدہ کے خلاف ہو۔ علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں:

ما احسن قول القائل اذا رأیت	کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جب
الحدیث یا ابن المعقول ا د	کسی حدیث کو عقل و نقل کے خلاف
یخالف المنقول او یناقض	دیکھو یا اصول کے خلاف پاؤ تو جان
الاصول فاعلم انه موضوع[1]	لو کہ وہ موضوع ہے۔

کتاب السرد والفرد کی اشاعت بلاشبہ ایک اہم علمی و دینی خدمت ہے جس کے لیے فاضل مرتب و مترجم اور پاکستان ہجرت کاونسل دونوں مبارکباد اور اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ فجزاهم الله خیرا الجزاء۔

---

[1] جلال الدین سیوطی: تدریب الراوی ص ۱۰۰۔

اقبال کے کلام میں قرآنی آیات کے منظوم ترجموں کے اشاریے

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب

موقر مجلہ "معارف" کے جنوری کے شمارہ میں میرا ایک مضمون بہ عنوان "اقبال کے کلام کی قرآنی تلمیحات کے اشاریے" قارئین کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ اس مضمون میں اقبال کے کلام کے ایسے اشعار کے اشاریے دیے گئے تھے جن میں قرآن کے الفاظ یا کسی آیت کا فقرہ، بطور تلمیح، عربی متن میں اشعار میں لائے گئے ہیں جن میں تلمیحات کی تعداد ۳۴۱ اور اشعار کی قریب ۵۰ تھی۔ مگر جیسا میں نے اسی مضمون میں کہا ہے کہ قرآنی آیات کو ذہن نشین کرانے کے لیے اقبال نے یہ طریقہ بھی اختیار کیا کہ انھوں نے قریب دو سو اشعار میں پورے شعر یا شعر کے کسی مصرعہ میں پوری آیت یا کئی ہم معنی آیات کی ہو بہو منظوم ترجمانی کر دی ہے۔ ایسے ہی ستر اشعار جن میں آیات کی اسطرح منظوم ترجمانی کی گئی ہے کہ اشاریے، قرآن کی سورہ اور آیت کے حوالوں کے ساتھ اس مضمون میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ خدا کرے کہ خدا کے کلام کو اقبال کی منظوم ترجمانی کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچانے سے اقبال کی یہ دعا مستجاب ہو کہ ؎

الٰہی آرزو میری یہی ہے مرا نور بصیرت عام کر دے

ذیل میں سب سے پہلے داہنی طرف اقبال کے کلام کے ہر مجموعہ کی نظم کا نام یا

غزل کا نمبر شمار درج کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان نظموں اور غزلوں کی ترتیب مجموعوں کی ترتیب کے مطابق رکھی گئی ہے تاکہ اشعار کی تلاش آسانی سے کی جا سکے۔

بانگِ درا

ماہِ نو: دوسرا بند، دوسرا شعر، پہلا مصرعہ۔ سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۵

تصویرِ درد: پانچواں بند، آٹھواں شعر، دوسرا مصرعہ۔ سورۃ النساء ۴۔ آیت ۳۶۔ آخری فقرہ۔

سرگزشتِ آدم: پانچواں شعر، پہلا مصرعہ۔ سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۲۶، دوسرا مصرعہ۔ سورۃ النجم ۵۳۔ آیات ۱۹ اور ۲۰۔

چھٹا شعر۔ سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۷، سورۃ النساء ۴۔ آیت ۱۶۴، سورۃ القصص ۲۸۔ رکوع ۴، سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۱۔

ساتواں شعر۔ سورۃ النساء ۴۔ آیات ۱۵۷ تا ۱۵۸، سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیات ۵۴ اور ۵۵۔

آٹھواں شعر۔ سورۃ العلق ۹۶۔ آیت ۱، سورۃ القدر ۹۷۔ آیت ۱۔

غزلیات حصہ اول: ساتویں غزل۔ ساتواں شعر۔ سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۱۴۳

گیارہویں غزل۔ دوسرا شعر۔ دوسرا مصرعہ۔ سورۃ سبا ۳۴۔ آیت ۵۰، آخری فقرہ، سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۲۷۔ آخری فقرہ، سورۃ ق ۵۰۔ آیت ۱۶۔

آخری غزل۔ گیارہواں شعر۔ سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۱۴۳۔

عبدالقادر کے نام: چوتھا شعر۔ پہلا مصرعہ۔ سورۃ یوسف ۱۲، رکوع ۲، دوسرا مصرعہ، سورۃ یوسف ۱۲۔ رکوع ۴۔

غزلیات حصہ دوم : پہلی غزل۔ پہلا شعر۔ پہلا مصرعہ : سورۃ المومنون ۲۳۔ آیات ۱۱۲ تا ۱۱۵، سورۃ الروم ۳۰۔ آیت ۵۵۔

گورستانِ شاہی : آٹھواں بند۔ آخری شعر۔ سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۵۱ آخری فقرہ

وطنیت : تیسرا بند۔ دوسرا شعر۔ پہلا مصرعہ۔ سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۹۵، سورۃ النساء ۴۔ آیات ۹۷ تا ۹۹، سورۃ الانفال ۸۔ آیات ۷۴ اور ۷۵، سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۵۸۔

شکوہ : پندرھواں بند۔ آخری شعر۔ پہلا مصرعہ، سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۱۲، سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۸۶

سترھواں بند۔ آخری شعر۔ سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۱۲، سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۸۶، سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۲۰، سورۃ الفجر ۸۹۔ آیات ۱۵ تا ۲۰۔

شمع اور شاعر۔ شمع : پہلا بند۔ ساتواں شعر۔ پہلا مصرعہ، سورۃ المائدۃ ۵۔ آیت ۲۔ پہلا فقرہ، سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۳۲۔

حضور رسالت مآب میں : پہلا بند۔ آخری شعر۔ دوسرا مصرعہ: سورۃ الانبیاء ۲۱۔ آیت ۱۰۷۔

جوابِ شکوہ : چھٹا بند۔ پہلا شعر۔ پہلا مصرعہ: سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیت ۷۷، سورۃ الرعد ۱۳۔ آیت ۲۷۔ آخری فقرہ۔ دوسرا مصرعہ: سورۃ النساء ۴۔ آیات ۶۶ تا ۶۸ اور آیت ۱۷۵، سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۱۹ آخری فقرہ، سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۹، سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۶۹، سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۳۔ آخری فقرہ سورۃ الیل ۹۲۔ آیات ۱۲ تا ۱۴۔

نواں بند۔ پہلا شعر۔ پہلا مصرعہ؛ سورۃ البقرہ ۲۔ آیات ۴۳ تا ۴۶، سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۸۰، سورۃ الماعون ۱۰۷۔ آیت ۵۔ دوسرا مصرعہ:
سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۶۵۔

اکیسواں بند۔ پہلا شعر۔ پہلا مصرعہ۔ دوسرا ٹکڑا "وہ آپس میں رحیم" سورۃ الفتح ۴۸۔ آیت ۲۹۔ آخری فقرہ۔ سورۃ الحجرات ۴۹۔ آیت ۱۰۔

چھبیسواں بند۔ پہلا شعر؛ سورۃ الضحیٰ ۹۳۔ آیات ۳ تا ۵، سورۃ الم نشرح ۹۴۔ آیات ۵ اور ۶۔

دعا: دوسرا شعر۔ دوسرا مصرعہ؛ سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۷۔

تضمین بر شعرِ ابوطالب کلیم: پہلا شعر؛ سورۃ المائدہ ۵۔ آیت ۲۔ پہلا فقرہ، سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۳۲۔

دوسرا شعر۔ دوسرا مصرعہ؛ سورۃ ص ۳۸۔ آیت ۴۳۔

چھٹا شعر۔ دوسرا مصرعہ: سورۃ القصص ۲۸۔ رکوع ۳ اور ۴، سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۱۔

صدیقؓ: پہلا شعر۔ دوسرا مصرعہ: سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۶۱، سورۃ التوبہ ۹۔ آیات ۳۴ اور ۳۵، سورۃ سبا ۳۴۔ آیت ۳۷، سورۃ الحدید ۵۷۔ آیات ۷ اور ۱۰ (پہلا فقرہ)

دوسرا بند۔ پہلا شعر۔ پہلا مصرعہ: "رفیقِ نبوت" سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۴۰۔

چوتھا شعر۔ دوسرا مصرعہ: سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۴۰۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں: آٹھواں بند۔ تیسرا شعر۔ دوسرا مصرعہ:
سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۶۰۔

کفر و اسلام : چھٹا شعر۔ پہلا مصرعہ ، سورۃ الکھف ۱۸۔ آیات ۱۰۳ تا ۱۰۸، سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۶۴

مذھب (بعد از نظم جنگ یرموک کا واقعہ) : پہلا شعر۔ دوسرا مصرعہ : سورۃ البقرہ ۲۔ آیات ۱۲۷ تا ۱۲۹، سورۃ آل عمران ۳۔ آیات ۶۷ اور ۶۸۔

شب معراج : دوسرا شعر ، سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۱۔

خضر راہ۔ زندگی : پہلا بند۔ چوتھا شعر پہلا مصرعہ : سورۃ البلد ۹۰۔ آیت ۴۔ پہلا بند۔ ساتواں شعر۔ دوسرا مصرعہ ، سورۃ ہود ۱۱۔ آیت ۷۔ پہلا فقرہ ، سورۃ الملک ۶۷۔ آیات ۱ اور ۲، سورۃ الدہر ۷۶۔ آیت ۲۔

خضر راہ۔ دنیائے اسلام : دوسرا بند۔ دوسرا شعر۔ دوسرا مصرعہ : سورۃ النمل ۲۷۔ آیات ۱۸ اور ۱۹۔

طلوع اسلام : آٹھواں بند۔ پانچواں شعر۔ پہلا مصرعہ ، سورۃ البقرہ ۲۔ آیات ۸۱، ۸۲ اور ۱۲۴، سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۱۲۷، سورۃ ہود ۱۱۔ رکوع ۲ ، سورۃ مریم ۱۹۔ آیت ۶۰، سورۃ القصص ۲۸۔ آیت ۸۴، سورۃ الروم ۳۰۔ آیات ۴۴ اور ۴۵، سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۴، سورۃ فاطر ۳۵۔ آیت ۱۰، سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷۔ آیات ۳۸ اور ۳۹۔ دوسرا مصرعہ ، سورۃ التغابن ۶۴۔ آیت ۲۔

غزلیات حصہ سوئم : تیسری غزل۔ تیسرا شعر۔ پہلا مصرعہ ، سورۃ الانبیا ۲۱۔ آیات ۶۸ تا ۷۰، سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷۔ آیات ۹۷ اور ۹۸، سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۲۴۔

چوتھی غزل۔ چوتھا شعر پہلا مصرعہ : سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۱۴۳۔

بالِ جبریل

غزل ۱۶ (اول) : آٹھواں شعر۔ دوسرا مصرعہ: سورۃ الاعراف ۷۔ آیات ۱۷۵ اور ۱۷۶، سورۃ التوبہ ۹۔ آیات ۳۸ اور ۳۹۔

تیرھواں شعر: سورۃ الانبیاء ۲۱۔ آیات ۶۸ تا ۷۰، سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۲۴، سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷۔ آیات ۹۷ اور ۹۸۔

غزل ۵ (دوم) : دوسرا شعر۔ دوسرا مصرعہ: سورۃ الرحمٰن ۵۵۔ آیت ۲۷، سورۃ الدہر ۷۶۔ آیات ۱۵ اور ۲۱ (آخری فقرہ) سورۃ المطففین ۸۳۔ آیت ۲۵

غزل ۳۶ : پہلا شعر: سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۶۵۔

غزل ۵۷ : دوسرا شعر۔ دوسرا مصرعہ: سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۷، سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۱، سورۃ القصص ۲۸۔ رکوع ۳ اور ۴۔

رباعی : "یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی": سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۴ (آخری فقرہ) سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۷۵، سورۃ الانبیاء ۲۱۔ آیات ۶۸ تا ۷۰۔ سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۲۴، سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷۔ آیات ۹۷ اور ۹۸۔

رباعی : "شبانی سے کلیمی دو قدم ہے": سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۷، سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۱، سورۃ القصص ۲۸۔ رکوع ۳ اور ۴۔

رباعی : "خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے"۔ "خدائے زندہ": سورۃ آل عمران ۳۔ آیت ۲، سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۵۵ (پہلے دو فقرے) سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیت ۵۸، سورۃ المومن ۴۰۔ آیت ۶۵ "زندوں کا خدا ہے": سورۃ یٰسین ۳۶۔ آیات ۶۹ اور ۷۰۔

مسجدِ قرطبہ : تیسرا بند۔ ساتواں شعر۔ دوسرا مصرعہ: سورۃ الاحزاب ۳۳۔ آیت ۵۶۔

پہلا بند۔ آخری شعر، سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۷، آخری فقرہ، سورۃ القصص ۲۸۔ آیت ۸۸۔

آخری بند۔ ساتواں شعر۔ سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۵۳، سورۃ الرعد ۱۳۔ آیت ۱۱، سورۃ فاطر ۳۵۔ آیات ۴۳ تا ۴۵۔

الارض للہ : پہلا شعر۔ پہلا مصرعہ : سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۹۵، سورۃ الواقعہ ۵۶۔ آیات ۶۳ تا ۶۷۔ دوسرا مصرعہ : سورۃ الرعد ۱۳۔ آیات ۱۲ اور ۱۷، سورۃ النحل ۱۶۔ آیات ۱۰ اور ۱۱، سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۶۳، سورۃ النبا ۷۸۔ آیات ۱۴ اور ۱۵۔

دوسرا شعر۔ پہلا مصرعہ : سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۵۷، سورۃ الرعد ۱۳۔ آیات ۱۴ تا ۱۶، سورۃ الحجر ۱۵۔ آیت ۲۲، سورۃ المومنون ۲۳۔ آیات ۱۸ تا ۲۰، سورۃ الروم ۳۰۔ آیات ۴۸ تا ۵۱، سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیات ۴۸ اور ۴۹، سورۃ فاطر ۳۵۔ آیت ۹۔

دوسرا مصرعہ۔ پہلا ٹکڑہ : سورۃ الرعد ۱۳۔ آیت ۳، سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۶۳۔

دوسرا ٹکڑہ : سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیت ۵۴، سورۃ المومن ۴۰۔ آیت ۶۱، سورۃ النبا ۷۸۔ آیت ۱۳۔

تیسرا شعر۔ سورۃ الانعام ۶۔ آیات ۹۹ اور ۱۴۱، سورۃ النمل ۲۷۔ آیت ۶۰، سورۃ الرحمٰن ۵۵۔ آیات ۱۰ تا ۱۳۔

آخری شعر۔ سورۃ البقرہ ۲۔ آیات ۱۱۶ پہلا فقرہ اور ۲۵۵، سورۃ آل عمران ۳۔ آیت ۱۲۹، سورۃ النساء ۴۔ آیت ۱۳۱ آخری فقرہ، سورۃ المائدۃ ۵۔ آیت ۱۷ آخری فقرہ اور آیت ۱۸ آخری فقرہ، سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۱۲، سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۶۴، سورۃ الشعراء ۲۶۔ آیات ۲۳ اور ۲۴، سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۴، سورۃ الدخان

۴۴۔ آیت ۷، سورۃ الجاثیہ ۴۵۔ آیت ۳۶۔

فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں : تیسرا شعر، سورۃ المومن ۴۰۔ آیت ۶۴، سورۃ التغابن ۶۴۔ آیت ۳، سورۃ التین ۹۵۔ آیت ۴۔

جبریل وابلیس : آخری بند "ابلیس"۔ تیسرا شعر۔ دوسرا مصرعہ، سورۃ الاعراف ۷۔ آیات ۱۶ اور ۱۷، سورۃ الحجر ۱۵۔ آیت ۳۹۔

اذان : پانچواں شعر۔ سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیات ۶۳ تا ۶۵، سورۃ المزمل ۷۳۔ رکوع ۱ اور آیت ۲۰۔ سورۃ الدہر ۷۶۔ آیات ۲۵ اور ۲۶۔

پرواز : چوتھا شعر۔ دوسرا مصرعہ، سورۃ التوبہ ۹۔ آیات ۳۸ اور ۳۹۔ سورۃ الاعراف ۷۔ آیات ۱۷۵ اور ۱۷۶۔

آزادیٔ افکار : دوسرا شعر۔ پہلا مصرعہ، سورۃ التکویر ۸۱۔ آیت ۱۹ اور ۲۱۔

چیونٹی اور عقاب۔ عقاب : آخری شعر۔ پہلا مصرعہ، سورۃ الاعراف ۷۔ آیات ۱۷۵ اور ۱۷۶، سورۃ التوبہ ۹۔ آیات ۳۸ اور ۳۹۔

ضرب کلیم

لا الٰہ الا اللہ : چوتھا شعر۔ پہلا مصرعہ، سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۲۸۔ سورۃ الکہف ۱۸۔ آیت ۴۶، سورۃ المنٰفقون ۶۳۔ آیت ۹، سورۃ الذٰریٰت ۵۱۔ آیات ۱۰ اور ۱۱۔ دوسرا مصرعہ، سورۃ التوبہ ۹۔ آیات ۵۵ اور ۶۹، سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۳۶، سورۃ الذٰریٰت ۵۱۔ آیات ۱۰ اور ۱۱۔

تقدیر : آخری شعر۔ پہلا مصرعہ، سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۶، سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۳۴، سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۵۳، سورۃ التوبہ ۹۔ آیات ۳۸ اور ۳۹، سورۃ

الرعد ۱۳۔ آیت ۱۱، سورۃ ہود ۱۱۔ آیات ۷۵ اور ۱۱۷، سورۃ الحجر ۱۵۔ آیات ۱۴ اور ۵، سورۃ المومنون ۲۳۔ آیات ۴۲ تا ۴۴۔ سورۃ فاطر ۳۵۔ آیت ۱۶۔

علم اور دین : پہلا شعر: سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۵۵، سورۃ الرعد ۱۳۔ آیت ۳۷، سورۃ القصص ۲۸۔ رکوع ۸، سورۃ الروم ۳۰۔ آیت ۵۹، سورۃ لقمٰن ۳۱۔ آیت ۲۰، سورۃ فاطر ۳۵۔ آیت ۲۸، سورۃ الزمر ۳۹۔ آیت ۹، سورۃ المجادلۃ ۵۸، آیت ۱۱، سورۃ العلق ۹۶۔ آیات ۵ اور ۶۔

غزل بعد از نظم "ہندی اسلام" : پہلا شعر۔ پہلا مصرعہ: "دلِ مردہ" سورۃ البقرہ ۲۔ آیات ۷ اور ۱۰، سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۱۲۵، سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۴۲، سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۴۶، سورۃ الزمر ۳۹۔ آیت ۲۲۔ "دلِ مردہ": سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۲، سورۃ یٰسین ۳۶۔ آیات ۶۹ اور ۷۰۔

مستی کردار : آخری شعر: سورۃ النساء ۴۔ آیات ۹۵ اور ۹۶، سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۶۔

مدنیتِ اسلام : پہلا شعر: سورۃ آل عمران ۳۔ آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵۔

خودی کی تربیت: دوسرا شعر: سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱، سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۱، سورۃ القصص ۲۸۔ رکوع ۳ الہام۔

شاعر: آخری شعر: سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۷۔

محراب گل افغان کے افکار: گیارہواں بند۔ دوسرا شعر: سورۃ النساء ۴۔ آیت ۷۹، سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۵۱، سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۱۰۷، سورۃ التغابن ۶۴۔ آیت ۱۱ پہلا نظر۔ چودہواں بند۔ پہلا شعر۔ پہلا مصرعہ: سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۱۶، سورۃ آل عمران ۳۔ آیات ۱۴۶ تا ۱۴۸۔ دوسرا مصرعہ: سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۱۷، سورۃ الفتح ۴۸۔ آیت ۱۰۔ سولہواں بند۔ پہلا شعر: سورۃ آل عمران ۳۔ آیت ۱۰۳، سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۴۔

مولانا سعید حسرت عظیم آبادی

از جناب حقانی القاسمی، علی گڑھ

صوبہ بہار عہد قدیم سے ممتاز اور مردم خیز خطہ رہا ہے۔[1] بودھ مت کے بانی گوتم بدھا اور جین دھرم کے مہاویر نے بھی یہاں اپنی زندگی کے دن گزارے ہیں۔ ان مذاہب کا اثر جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق بعید کے ممالک پر بہت گہرا رہا ہے۔ بعض محققین کی رائے میں عباسی دور کا مشہور برمکی خاندان بھی بودھ مت کا پیرو تھا۔[2] تعلیمی اعتبار سے دیکھا جائے تو نالندہ کی یونیورسٹی عہد قدیم میں بہت ہی نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ شاہان اشوکا اور شیر شاہ کے علاوہ یہ صوفیہ، صلحا، اتقیا اور بزرگان دین کی بھی سرزمین رہی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ء - ۱۷۶۲ء) اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کے بقول "بلدۂ بہار مجمع علما ہے"۔[3] عالمگیر کے استاد ملا موہن بہاری، شاہ عالم کے استاد مولانا سراج الدین اور علامہ محب اللہ بہاری (م ۱۱۱۹ھ) مصنف "سلم العلوم" اسی سرزمین کے لعل و گہر اور عالمگیر شہرت کے حامل تھے۔ شعر و ادب کی دنیا میں عبد القادر بیدل کی عظمت مسلم ہے۔ بہار میں عظیم آباد خصوصاً شعر و ادب کا مرکز تھا۔ یہاں کے مشاہیر ادبا، اور علما میں عبد القادر بیدل عظیم آبادی (۱۰۵ھ - ۱۱۳۳ھ)، ملا محمد تحقیق عظیم آبادی (۱۰۷۰ھ - ۱۱۶۲ھ)، شیخ غلام یحییٰ حضور (م ۱۲۰۶ھ) ہیبت قلی خاں حسرت (م ۱۲۰۰ھ)، شیخ محمد روشن جوشش (۱۱۵۰ھ - ۱۲۱۶ھ)، خواجہ امین الدین امین، مولانا امین اللہ عظیم آبادی

(م ۱۲۳۲ھ)، غلام حسین شورش (م ۱۱۹۳ھ)، نواب علی ابراہیم خاں خلیل (م ۱۲۰۸ھ) اور وجیہ الدین عشق وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، مولانا سعید حسرت عظیم آبادی (م ۱۳۰۴ھ) نے عظیم آباد کی علمی مرکزیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

فراہم ست درعلم و فضل و عقل و ہنر — بہ ب کعبہ کہ ہست انجمن عظیم آباد

دریں چمن ہمہ سو بلبلان نواسنجد — تہی مباد ز اہل سخن عظیم آباد

زمین او ست ز خاک جود حق طلباں — بود ز شوق خدا نعرہ زن عظیم آباد[۵]

اسی عظیم آباد کے ایک ممتاز خانوادہ سے سعید حسرت عظیم آبادی کا بھی تعلق تھا، ان کے جد امجد شیخ عمر دراز (م ۱۲۲۲ھ) عظیم آباد کے ایک رئیس تھے، ان کے والد ماجد منشی واعظ علی جید عالم تھے، حرمین شریفین کی زیارت ۱۲۶۵ھ میں کی تھی، ۱۲۷۴ھ میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

مختصر حالات | مولانا محمد سعید حسرت ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے، والد ماجد کی طرف سے ان کا سلسلۂ نسب جعفر طیار اور ماں کی طرف سے عبداللہ بن عباس تک پہنچتا ہے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، عربی نحو و صرف اور منطق و فلسفہ کی کتابیں اپنے وطن کے بعض علماء سے پڑھیں، مزید علوم کی تحصیل کے لیے تیرہ[۱۳] سال کی عمر میں کانپور کے لیے رخت سفر باندھا، مولانا شاہ سلامت اللہ کشفی (م ۱۲۸۱ھ) کی خدمت میں حاضری دے کر میر زاہد اور بقیہ درسیات کی تکمیل کی۔ اسی دوران لکھنؤ بھی گئے اور مفتی ظہور اللہ (م ۱۲۵۶ھ) سے تبرک اور تیمن کے طور پر "صدرا" کے چند اسباق لیے، وہاں سے فراغت کے بعد ۱۲۵۵ھ میں اپنے وطن عظیم آباد واپس آکر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، ۱۲۶۴ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہوئے اور سید محمد عطوشی مدنی، سید محمد سنوسی مغربی، شیخ عبد الغنی

دمیاطی اور مولوی یعقوب سے اجازت حدیث لے کر ۴ شعبان ۱۲۶۴ھ کو وطن واپس آئے، جس کی تاریخ "بیمن و سعادت معاودت نمود" سے نکالی ہے۔ (۱۲۶۴)

مولانا بہ دیا، متواضع انسان تھے، سخی اور مہمان نواز تھے، مدۃ العمر درس و تدریس اور خدمتِ علم میں مشغول رہے، انھوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جو "مدرسہ سعیدیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں بیروت و مصر کی مطبوعہ کتابیں تھیں۔ ۴۰ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے اور اپنے تعمیر کردہ مدرسہ کے احاطہ میں مدفون ہیں۔ "رضی اللہ ربہ بجود" (۱۳۰۴ھ) قطعۂ تاریخ وفات ہے۔[1]

مولانا کی زندگی اچھے حال میں گزری، لیکن ایک دفعہ وہ ایک عجیب پریشانی میں پڑ گئے تھے، وہ کشتی میں سفر کر رہے تھے کہ اس کے سوراخ میں پیر چلا گیا اور بڑی کوشش کے بعد جب نکلا تو بائیں پاؤں کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ کر دو حصوں میں ہو گئی، اس کی وجہ سے اس سفر میں بہت تکدر اور عجیب ذہنی کوفت اور جسمانی اذیت میں مبتلا رہے، خیر خدا خدا کر کے ایک ماہ میں ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑ گئی اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔

شاعری | مولانا اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے، لیکن اردو شاعری کی جانب ان کی توجہ کم رہی، چند شعر نمونتاً پیش کیے جاتے ہیں۔

زخمِ دل پہ مرے ہنس ہنس کے چھڑکتے ہو نمک — پھر راہِ عشق کا سلسلہ نہ ہوا بند دوبارا

پوچھ مت ہجراں نے مرے کیا کیا — اے میری جان نیم جاں ہوں کیا کہوں

تو مجھ کو اپنی عینِ عنایت سے مت گرا — ہر چند چشمِ خلق میں کھٹکا بگاہ ہوں

نگہ سے تیری کیوں جاتی ہیں جانیں — نگاہوں میں تیرے ستم نہیں ہے

نہیں وہ دل دہو جس میں غمِ عشق — نہیں ہے وہ چشم جو پُرنم نہیں ہے

عربی زبان وادب سے ان کو گہری دلچسپی تھی۔ اس میں انھوں نے شعر بھی کہے ہیں اور بہت سے تاریخی قطعات بھی لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ ملاحظہ ہو:

بلیت یا سمر دحسن ملیح	نیا اسفا علی قلبی الجریح
بسیف اللحظ یقتلنی ویحیی	باذن اللہ من قول نصیح
ففی عینیہ سحر ای سحر	وفی شفتیہ اعجاز المسیح
وانکر حبہ ویقوم دمعی	یعارضنی بتکذیب صریح
فان کان الھوی شیئا قبیحا	نکتم الحب اقبح من قبیح
اذا مامت فی شوق وتوق	فزر یا مھجتی یوما ضریحی
من الرحمٰن للرحماء رحم	کما قد جاء فی الخبر الصحیح

انھوں نے عربی میں ایک طویل قصیدہ کہا ہے جس کے چند شعر پیش ہیں:

قل لنا ما الطرف الفتیک	کل لحظ یقتلنا یفتیک
ان قتل المحب عدوانا	لضلال فربنا یھدیک
یا صنی القلب لا اجنابہ لی	غیر ان الفؤاد یطمع فیک
اضحک اللہ فاک من طرب	لا ابالی ھموم مشتا فیک
فی الھوی طال ما بکیت دما	انت ماقلت قط ما یبلیک
تقطع الھجر والنوی کبدی	صل محبا بروحہ یفدیک
صادنی شادن وفی قلبی	حبہ ساکن بغیر شریک
نقطۃ الخال فوق بسمتہ	کسواد یزین عین الدیک
ارتی بانۃ کقامتہ	ان تکن یا حمام فی وادیک

یا لقد کانہ غصن	من نسیم الصبا لہ تحریک
جاء بعد البعاد معتذرا	قال یا مستہام ما یرضیک
قال لقیاک نور ناظر تی	وعفات و قبلۃ فی فیک
قال قم وا عتنق وخذ یا من	کان زمالنا تصار ملیاتک
قال تمت عانقتہ اقبلہ	قال ذر فی نقلت لا وابیک
قال لی یا مقل لا تکثر	او ما کان واحد یکفیک[1]

چند قطعات کے نمونے دیکھئے:

(۱) مولانا فضل حق خیرآبادی (م ۱۲۷۸ھ) کی تاریخ رحلت کا درج ذیل قطعہ کہا ہے۔

قد توفی الالٰہ فضل الحق	عالما جیدا بلا ریب
ان نفاہ الولاۃ من بلدہ	بجفاء فلیس من عیب
ان تاریخہ لادرکہ	فضل حق ہواتف الغیب[1]

۱۲

(۲) مولانا حسن علی ہاشمی لکھنوی کا قطعہ تاریخ رحلت بھی کہا ہے۔

شیخنا المستند العلامۃ	من خطایا عصم اللہ الشیخ
رمت فی رحلتہ تاریخا	قال قلبی رحم اللہ الشیخ

۱۲۵۵ھ

دوسرے مشاہیر ادبا و علما کے قطعات تاریخ رحلت بھی لکھے ہیں۔

بنیادی طور پر وہ فارسی کے شاعر تھے۔ اس زبان میں انھوں نے حافظ کے رنگ میں بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ وزیر علی عبرتی مصنف "ریاض الافکار" و "معراج الخیال" نے نثر و نظم دونوں میں ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، دوسرے اصحاب علم و ادب بھی فارسی شعر و ادب میں ان کی مہارت کے قائل رہے ہیں، ذیل میں ان کی فارسی شاعری

کا نمونہ پیش ہے :

یک جام شراب آسان تمانی کرد مشکلہا　　الا یا ایہا الساقی ادر کاسا وناولہا

ماہ کجا آں رخ زیبا کجا　　ہست تفاوت بمیان تا کجا

از شوق لبت در تب و تابست دل ما　　بر آتش لعل تو کبابست دل ما

ہم ساقی و ہم ساغر و ہم بادہ و ہم مست　　از شیوۂ چشم تو خرابست دل ما

از اشک گرم سوخت تنم سر بسر چو شمع　　گلہائے داغ دیدہ ترمی دہد مرا

قسمت نگر کہ شانہ بزلف تو جا گرفت　　بخت خاک کہ بوسہ اندست و پا گرفت

یک بوسہ از لبش بدو عالم گرفتہ ایم　　ما عاشقیم و نیست کسی را بہا گرفت

تا خنجر نگاہ تو شد آشنائے دل　　جز التفات تو نبود مدعائے دل

دیدم بآب دیدۂ خود پارہای دل　　ایں است سرگزشت من و ماجرائے دل

زلف سیاہ بر رخ چوں ماہ آں صنم　　دام بلاست بار الہا برائے دل

ابرو کمان و چشم سیاہی کہ آہ ازو　　زد بہ دلم خدنگ نگاہے کہ آہ ازو

دل گرم زلیخایم ز عشق یوسفی داغم　　دماغ پیر کنعانم نبوی پیرہن بستم

تجلی دیدہ یارم چو کوہ طور در رقصم　　سر شوریدہ منصورم ز دار و رسن مستم

مولانا حسرت عظیم آبادی کا یہ بھی کمال ہے کہ ایک ہی شعر میں عربی اور فارسی مصرعے جمع کر دیتے ہیں، اس سے انکی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً :

اُطیق صبرا علی البلایا و منک لا استطیع صبرا　　ہر آنچہ خواہی بکن و لیکن جدا از خویشتم مکن خدارا

ز خلق راز ترا نہفتم حدیث جور تو بکس نہ گفتم　　قتلت نفسی بغیر حق و لیس منی علیک دعوی

شربت من حبہ مدامًا و زال عقلی و زاد عشقی　　منم ز قید دو کون فارغ سرے ندارم بدین و دنیا

بے جام و بے صراحی یا ایہا السکاری — انی سقیت خمرا من عینہا مرارا
موئے سفید قدرم در عاشقان بے فرود — شیب الراسی قد زادنی وقارا
از عاشقاں بہجراں صبرے بتاں چہ امکاں — من یستطیع منا فی ھجرکم قرارا
تا سرمہ سا نمودی چشمان خواب آلود — لا نوم فی جفونی لیلا ولا نہارا
حضور زدوست چوں حافظ ببین درسوی تا حسرت — متی ما تلق من تھوی اللہ نیا واھملہا
اے لب لعل تو شفائے علیل — ھل لنا منک رخصۃ التقبیل
گر جفا بینیم از تو بدن برم — کل شئی من الجمیل جمیل
پارہ کردی دلم بہ تیغ وہنوز — کل جزء الیک منہ یمیل[۱۴]

تصنیفات | مولانا کثیر التصانیف تھے مگر صرف ایک دو کتابیں ہی منظر عام پر آسکیں اہم مصنفات میں درج ذیل کتب ہیں (۱) قسطاس البلاغۃ (۲) تحفۃ الاخوان در مناظرہ بصاحبان صادق پور در منع بسملہ بجہر (۳) زاد الفقیر فی الحج متوکلا علی اللطیف الخبیر (۴) شمام العطر فی احکام عید الفطر (۵) الحلاوۃ العلیہ فی الرد علی من احدث من الحلو والرطب موجبہ کلیہ (۶) حاشیہ بر شرح جامی (۷) شرح میزان المنطق بزبان فارسی (۸) حواشی بر حاشیہ غلام یحییٰ بر میر زاہد[۱۵]

ان تمام کتابوں میں سے صرف "قسطاس البلاغہ" ہی دستیاب ہے، یہ کتاب ۱۲۹۰ ہجری میں احسن المطابع عظیم آباد سے شایع ہوئی ہے۔ ۱۵۱+۹ = ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، حصہ اول میں ردیف کے اعتبار سے فارسی کی غزلیں اور رباعیات ہیں۔ حصہ دوم میں قطعات و رباعیات سنین کی ترتیب سے ہیں۔ یہ حصہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں بہت سے مشاہیر اور سلاطین علم و ادب کی رحلت کے تاریخی قطعات

بھی درج ہیں، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے خدابخش لائبریری پٹنہ سے اس حصہ کو الگ کرکے کتابی شکل میں شایع کر دیا ہے، حصہ سوم میں عربی اور فارسی کی نثری تحریریں ہیں، عربی میں مولانا عبدالرحمٰن جامی اور ان کے تلمیذ رشید مولانا عبدالغفور لاری کے سوانح و حالات درج ہیں، اس کے علاوہ بعض اساتذہ ادب کے نام مولانا کے عربی مکاتیب بھی ہیں جن میں مولوی محمد فاضل، مولوی سعداللہ لکھنوی، یوسف بن احمد بن معیضہ، شیخ محمد عطوشی، شیخ محمد درویش، مولوی عبدالکریم کے نام قابل ذکر ہیں، فارسی میں بھی ممتاز علماء و ادباء کے نام خطوط لکھے ہیں، ان میں سے مولوی انور علی یاس، مولوی امان علی، مولوی غلام امام شہید، مولوی سعداللہ، مولوی سید عبداللہ بلگرامی، نواب امیر علی خاں بہادر، مولوی محی الدین، خلف الرشید مولوی حکیم الدین خاں، مولوی محمد نعیم فاضل لکھنوی، مولوی محمد شاہ مغفور، میر محبوب شیر مرحوم، مولوی محمد شاہ، خواجہ عزیز الدین کشمیری، مولوی سید امداد علی خاں، مولوی فخرالدین لکھنوی فرنگی محلی کے نام لائق ذکر ہیں، ان مکاتیب سے مولانا کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں اور ان سے انکی علم دوستی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

معاصرین کا اعتراف کمال مولانا کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف ان کے معاصرین نے بھی کیاہے، چند حضرات کے نام ملاحظہ ہوں :

۱۔ مولانا حکیم عبدالحمید پریشان[۱۶] بن مولانا احمد اللہ صادق پوری (۱۲۴۵ھ - ۱۳۲۳ھ) ایک متبحر عالم تھے، ان کو عربی زبان و ادب میں بڑی مہارت و قدرت تھی، حضرت سید احمد کی مدح میں ایک عربی قصیدہ لکھا تھا جو بہت مقبول ہوا، حکیم صاحب کلیم الدین احمد کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے نانا تھے، انہوں نے قسطاس البلاغہ پر ایک طویل عربی تقریظ لکھی تھی جس میں مولانا سعید حسرت عظیم آبادی کی بڑی مدح و ستائش

کی ہے[۱۷]

۲۔ مولوی محمد ظہیر احسن شوق نیموی صاحب آثار السنن (م ۱۹۰۴ء) ایک یکتائے روزگار عالم، مشہور ادیب اور مولانا سعید کے شاگرد رشید تھے، یہ مولانا کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جناب حسرت ذی جاہ و تمکین ۔۔۔ نظام کشور علم و فضیلت
رئیس شہر علم و زہد و تقوی ۔۔۔ شہ اقلیم عرفان و طریقت
سخن را فخر شد از نسبت او ۔۔۔ نمک پرور دہ اش حسن بلاغت
عظیم آباد را نازد از وجودش ۔۔۔ غلط کردم ہمہ شہر و ولایت[۱۸]

۳۔ مولوی محمد فصیح اللہ دنا لکھنوی فرنگی محلی تلمیذ میر وزیر علی صبا نے مولانا کی فنی بلندی کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے:۔

حضرت حسرت کہ در شعر و سخن ۔۔۔ ہست با عرفی و صائب ہم قدم
مدح ذات پاک آں قدسی صفات ۔۔۔ گر تمام عمر سازم ہست کم
فاضل یکتا جناب حسرت شیریں سخن ۔۔۔ مقتدای سالکان و پیشوای عارفاں
سکۂ استادیش رائج میان ہر دیار ۔۔۔ ہست زیبا گر بگویم پادشاہ شاعراں[۱۹]

۴۔ مولوی محمد عبد الحق جنون خلف الرشید مولوی واعظ الحق نے مولانا کے کلام کی شیرینی و سلاست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے:۔

جناب حسرت دام ظلہ ۔۔۔ بجان پروانہ شمع رسالت
ندیدش کس ندید از چشم انصاف ۔۔۔ نہ در علم و نہ در فہم و فراست
کلامش جملہ پاک و شستہ و صاف ۔۔۔ چو آب نہر جنت در لطافت[۲۰]

ان کے علاوہ کئی اور اصحاب علم و کمال نے مولانا کی علمی و ادبی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

حواشی

[1] صوبہ بہار کی تاریخی، ادبی اور علمی اہمیت کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور کچھ مجلات نے خصوصی شمارے بھی شایع کیے ہیں [2] علامہ سید سلیمان ندویؒ (م ۱۹۵۳ء): عرب و ہند کے تعلقات (اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء) ص ۱۱۱-۱۳۳ [3] عربی، فارسی اور علوم اسلامیہ میں بہار کا حصہ (مرتبہ سید اطہر شیر ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ بہار ۱۹۸۳ء) ص ۱۰۸ [4] ان فخر روزگار لوگوں کے حالات کے لیے قدیم و جدید تذکرے ملاحظہ ہوں [5] سید حسرت عظیم آبادی: قسطاس البلاغۃ (احسن المطابع عظیم آباد، ۱۲۹۹ھ) ص ۸۱-۸۲ [6] دیکھیے عبدالحئی الحسنی: نزہۃ الخواطر، (دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۹۷۰ء) ص ۴۳۰-۴۳۱ جلد ۸، لالہ سری رام: خمخانۂ جاوید، (دہلی ۱۹۱۱ء) جلد دوم ص ۴۲۵-۴۲۶ [7] قسطاس البلاغہ صفحات ۳۰۶-۳۱۱ [8] ایضاً ص ۶۳-۶۴ [9] ایضاً ص ۱۰۰-۱۰۱ [10] ایضاً ص ۲۱۰ [11] ایضاً ص ۱۷۰ [12] ایضاً ص ۱۲۲-۲۶ [13] ایضاً ص ۲۰۲، ۳۰۶، ۱۰۳ [14] حکیم احمد اللہ ندوی: مسلم شعرائے بہار، ص ۲۴۶ عبدالحئی الحسنی: نزہۃ الخواطر: جلد ۸ ص ۴۳۰، ۴۳۱ [15] عظیم الدین احمد حیات اور کارنامے (بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۸۸ء) ص ۲۹-۳۰ [16] قسطاس البلاغۃ: ص ۴۳۶-۴۳۷ [17] ایضاً ص ۴۳۳ [18] ایضاً ص ۴۳۱ [19] ایضاً ص ۴۲۸-۴۲۹۔

مرغوب دل

اردو کا ایک نودریافت غیر مطبوعہ نسخہ

از ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی

مرغوب دل کا ایک نایاب اور غیر مطبوعہ نسخہ نوادر فروش جناب توفیق احمد قادری چشتی امروہوی پروپرائٹر انٹرنیشنل بک ڈپو امروہہ کو دستیاب ہوا ہے، ان کی مہربانی سے راقم کو اس کے مطالعہ کا موقع ملا جس کے لیے ان کا شکرگذار ہوں، سطور ذیل میں ان کا تعارف مقصود ہے۔

مخطوطہ کے مصنف | اس غیر مطبوعہ نسخہ کے مصنف کا نام سید محمد علی موسوی صفوی شاہجہاں آبادی عرف نواب دولہا ہے، وہ اپنے سنہ پیدائش کے بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس ننگ سید محمد علی موسوی صفوی شاہجہاں آبادی عرف نواب دولہ اعطاہ اللہ مطالبہ المسئولہ پیدایش شنبہ انتیسویں شعبان سنہ بارہ سو بائیس ہجری مطابق سنہ احد جلوسی اکبر شاہ بادشاہ (۱۸۰۷ء) دہلی کی ہے۔"

محمد علی دہلی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں بھی کافی عرصے تک رہے۔ پھر شمس آباد میں سکونت اختیار کرلی۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"راقم آثم سید محمد علی شاہجہاں آبادی عرف نواب دولہ بھی پہلے سبب انقلاب نصیری (نصیرالدین حیدر) کے سنہ بارہ سو اکاون ہجری میں لکھنؤ سے آکر

چند دن رہکر جاکر پھر بارہ سو چون ہجری میں مع احمال و اثقال و عیال آکر اس
سال تالیف تک یہیں رہتا ہے اور بعلاقہ مال گزاری و تجارت مکانات بھی بنوائے
ہیں۔ اللہ انجام بخیر کرے چہاردہ معصومین کے صدقے سے۔"

عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرے 'سخن شعرا' میں صفحہ ۵۵ پر ان کو شمس آباد
کا لکھا ہے:

"انور تخلص۔ سید محمد علی خاں عرف نواب دولہا۔ شمس آباد"۔

نسخہ کی حالت | اس مخطوطہ کی لمبائی ۱ فٹ اور چوڑائی ۷ انچ ہے۔ ہر صفحے پر ستمری سطریں ہیں۔ کاغذ برٹش گورنمنٹ کا مہر شدہ ہے۔ کتاب کے شروع میں فہرست ۴ صفحات کی ہے۔ کتاب کا مواد ۴۸۹ صفحات پر تحریر کیا گیا ہے۔ آخر کے صفحات ۱۶ ہیں۔ کل کتاب ۷۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ تحریر خط نستعلیق میں ہے۔ کہیں کہیں خط شکست بھی ہے۔ متن سیاہ روشنائی میں تحریر کیا گیا ہے۔ سرخیاں شنگرنی ہیں کاغذ اور چمڑے کی جلد بہت کہنہ ہو چکی ہے۔

۷ جولائی ۱۸۶۶ء کو یہ نسخہ بعد تصحیح مکمل ہوا ہے۔ اس طرح دسمبر ۱۹۹۳ء میں اس کو ۱۲۷ سال ہو چکے ہیں۔ کتاب کے سبب تصنیف کے بارے میں مصنف رقمطراز ہیں:

"بعد شکر و درود اصل مقصود یہ ہے کہ ان دنوں اس ننگ آبا سید محمد علی
عرف نواب دولہ کو یہ خیال آیا کہ دنیا سراپا خواب اور ہستی مانند حباب ہے
پس احباب کے لیے چند باتیں ایسی جمع کر لی جائیں کہ ان کے اکثر کام آئیں۔
لہذا یہ رسالہ مسمی بہ مرغوب دل سات فصلوں اور ایک اختتام پر مشتمل ہے

تحریر کیا ہے کہ اس نام سے تاریخ تالیف نکلتی ہے مگر دل کی دال کو کم کرنا چاہیے تا دال ہو، ہماری شکستگیٔ دل پر اور امید جناب الٰہی سے یہ ہے کہ اسے قبولیت بخشے"

موضوع اور نسخہ کے اجزا | یہ ضخیم کتاب کسی ایک موضوع پر نہیں لکھی گئی بلکہ یہ ایک کشکول ہے جو سات فصلوں پر مشتمل ہے۔

پہلی فصل : اس میں ان کتابوں کی فہرست درج ہے جن کا حوالہ 'مرغوب دل' میں آیا ہے مثلاً سیر ہفت اقلیم۔ تاریخ بدایونی۔ سیر المتاخرین۔ تاریخ سکندری۔ مآثر الامرا۔ جلاء العیون۔ رقعات عالمگیری۔ گلستاں۔ بوستاں۔ انشائے دلکشا۔ تذکرۂ سرخوش۔ تذکرۂ ریاض الشعرا۔ تذکرۂ سراپا سخن۔ دیوان مرتضوی۔ کلیات انشا۔ دیوان درد۔ دیوان آتش۔ دیوان ناسخ۔ مثنوی مولانا روم۔ کلیات جعفر زٹلی۔ کلیات نواب یوسف علی خاں وغیرہ۔ کل ۱۲۳ کتابوں کی فہرست مندرج ہے۔

دوسری فصل : تمہید کے بعد پیدائش عالم کے احوال انبیاء و اولیاء کے علاوہ بادشاہوں اور رئیسوں کے حالات ہیں۔ انبیاء کے بعد ائمہ اثنا عشر کے حالات بھی لکھے ہیں، اسی ضمن میں واقعات کربلا کو بہت تفصیل سے پیش کیا گیا ہے اور امیر المومنین حضرت علیؑ کے بارے میں اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا ہے :

"حضرت علی ابن ابی طالب ابن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد المناف علیہ السلام مشہور بہ مرتضیٰ علی و شیر خدا و جناب امیر و مشکل کشا و حیدر کرار و شاہ مرداں و شاہ ولایت۔ یہ چچیرے بھائی اور ہم قوم و داماد و مددگار و وصی و خلیفہ بلا فصل ظاہر و باطنی حضرت پیغمبر خدا محمد مصطفیٰؐ کے اور پہلے امام شیعوں کے تھے اور آج تک ان کی صفتیں مانند زہد و اتقا و معجزہ و قدرت و سخاوت و شجاعت و علم و

علم و عدل و ہدایت کی سارے جہاں میں معروف و عیاں ہیں"

اسی فصل میں بادشاہوں اور رئیسوں کے ذکر میں ملوک یمن۔ ملوک عرب ملوک گلبرگہ دکن۔ نظام شاہیہ ملوک احمد نگر دکن۔ قطب شاہیہ ملوک تلنگانہ دکن وگولکنڈہ دکن۔ عماد شاہیہ بیجاپور و گلبرگہ دکن۔ ذکر سلاطین گجرات بسلسلۂ غوریہ۔ سلسلۂ خلجیہ۔ ذکر ملوک سیستان یعنی ملک نیم روز۔ ذکر بادشاہان دہلی۔ سلاطین لودی پٹھان بسلسلۂ تیموریہ۔ ذکر روسائی رامپور قوم پٹھان۔ سلسلۂ پیشوا۔ سلسلۂ راجپوت۔ حکام و سلاطین لکھنؤ مضاف صوبۂ اودھ۔ ذکر ریاست سادات بارہہ۔ ذکر ریاست بندیل کھنڈ۔ ذکر حکومت راجگان بنارس۔ خاندان مغل و تاتار۔ ذکر سلاطین فرنگ۔ ذکر سلاطین ملک فرانس کہ نام قدیم اس کا گال ہے۔ ذکر راجگان ہندوستان۔ ذکر حکام سلاطین شام دمشق۔ ذکر سلاطین کشمیر۔ ذکر سلاطین ایران وغیرہ تحریر ہے۔

ذکر سلاطین فرنگ میں ملکۂ وکٹوریہ کے حال میں ان کے انتظام سلطنت کو بہت سراہا ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار و تسلط کا تھا۔ مصنف نے حاکم وقت کو اس طرح دعاؤں سے نوازا ہے۔

"الغرض آج مالک الملک حقیقی نے ان کو شہنشاہ وقت کیا ہے۔ جس گدا کو چاہیں بادشاہ اور جس بادشاہ کو چاہیں گدا کر دیں۔ پروردگار انکو صدہا سال باحشمت و اقبال کامراں اور رعایا پر مہربان رکھے۔"

اس دور میں ہندوستان کے باشندوں کے لیے انگریزوں کے ذریعہ جو سہولتیں فراہم ہوئیں ان کا تذکرہ مصنف نے حاشیہ میں کیا ہے، مثلاً

"تقویم بالگو ہند سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجشنبہ یکم فروری ۱۸۵۵ء کو دفتر تار برقی ہندوستان میں مقرر ہوا۔"

"تقویم بالگو ہند میں ہے کہ شنبہ دوسری جون ۱۸۰۲ء کو چیچک کا ٹیکہ لگانے کی دوا اور ترکیب دریافت ہوئی۔"

تیسری فصل : تیسری فصل میں حکماء و علماء و فضلاء و امراء و فقراء و اہل انشاء و شعرا کا تذکرہ ہے جس کو حروف تہجی کے اعتبار سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ۳۹۲ اشخاص کا ذکر ان کے مسلک شیعہ یا سُنی کی صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ فصل اس لیے اہم ہے کہ مصنف نے اپنے بعض معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ چند اسمائے گرامی یہ ہیں :

افلاطون۔ ارسطالیس۔ اویس قرنی۔ ابوایوب انصاری۔ ابوذر۔ ابو جعفر صدوق۔ امام محمد غزالی۔ آقا محمد باقر اصفہانی۔ انشاء اللہ خاں انشا۔ آتش۔ انیس۔ دلگیر۔ ضمیر۔ خلیق۔ دبیر۔ ذوق۔ سید مرتضیٰ، مجتہد۔ سید رضی۔ سودا۔ سوز۔ فصیح۔ ملا باقر مجلسی۔ مولوی سید محمد۔ مصحفی۔ غالب۔ مجنوں۔ مومن۔ مولوی دلدار علی۔ حسن بصری۔ ملا حسین واعظ کاشفی۔ راجہ ٹوڈرمل۔ کبیر داس۔ گرونانک۔ نعمت خاں عالی۔ شیخ علی حزیں۔ مولانا عبدالعلی۔ شاہ ولی اللہ۔ میر علی تبریزی۔ مولانا سلطان علی۔ شیخ مفید وغیرہ۔

ناموں کے نیچے مخصوص صفات یعنی عالم۔ صوفی۔ شاعر۔ خوشنویس وغیرہ بھی لکھا ہے۔ جن اشخاص کے بارے میں مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں سے چند کا حال ملاحظہ ہو۔

مولوی دلدار علی اعلی اللہ مقامہ کے بارے میں رقمطراز ہیں :

"مغفور نقوی نصیرآبادی لکھنوی۔ مجتہد شیعہ۔ تعریف ان کے علم و کمال کے

امکان سے باہر ہے اور کم سے کم یہ ہے کہ سارے لکھنؤ بلکہ ہندوستان میں ان ہی
کا احسان ہے کہ ہر ایک اپنے مذہب حق سے آگاہ ہوا اور جمعہ و جماعت کا جا بجا چرچا
پھیلا۔ حسن رضا خاں نے واسطے ترویج دین کے ایک مجلس آراستہ کی اور حکم
آقا کو لوگوں نے منبر پر پڑھا اور جمعہ و جماعت نے اس روز سے ان حدود میں
رونق پکڑی ہے"

اپنے استاد مولوی سید حسین صاحب کے بارے میں نذرانۂ عقیدت اس طرح
پیش کرتے ہیں :

"مولوی سید حسین صاحب عرف میرن صاحب قبلہ مخاطب بسید العلماء یہ بھائی جناب مجتہد
سید محمد صاحب قبلہ دامت برکاتہم کے اور استاد مخدوم راقم الحروف کے تھے کہ اپنی
زندگی میں اجتہاد کرتے رہے اور علم و حلم و زہد و اتقا و خلق و فہم و حافظہ و مروت
و انتظام اور معیشت میں سارے خاندان بلکہ اہل جہان پر ترجیح رکھتے تھے اور
بے شک اگر میرے مذہب میں پیری مریدی ہوتی تو میں انہیں کا مرید ہوتا۔ انکا
انتقال لکھنؤ شب یکشنبہ ہجدہم صفر سنہ بارہ سو تہتر ہجری میں ہوا۔"

غالب کا تذکرہ اس طرح کیا ہے :

"مرزا نوشہ۔ مرزا اسد اللہ خاں نام۔ شاہجہاں آبادی کہ پہلے ان کا اسد تخلص تھا
اور اب غالب ہیں۔ بن عبداللہ بیگ خاں۔ قوم ترک۔ نسل افراسیاب۔ پیدائش
اکبرآباد۔ باشندۂ دہلی۔ شیعہ۔ نازک خیال۔ پختہ رنگ۔ دریش دراز و دراز قد۔
آزاد وضع و درویش طبع۔ دمے نوش و تیز ہوش۔ آج ہمارے زمانے میں نظم
و نثر فارسی و ہندی میں بے مثل ہیں۔"

فارسی کلام کی کچھ مثالیں دے کر اردو کی یہ مشہور غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے

ہوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

آخر میں لکھتے ہیں :

"ان کی تصنیفات سے ہے دیوان فارسی و ہندی اور کتاب پنج آہنگ اور مثنوی

غزوات جناب سرور کائنات اور مہر نیم روز وغیرہ"

مومن غالب کے ہم عصر تھے اور اپنے دور کے بلند پایہ مشہور شاعر تھے۔ لیکن مصنف نے ان کا تذکرہ اس قدر اختصار سے کیا ہے کہ صرف ایک جملہ لکھکر چھوڑ دیا ہے۔ ممکن ہے اس کا کوئی سبب ہو۔ وہ لکھتے ہیں :

"حکیم محمد مومن خاں نام۔ شاعر مشہور شاہجہاں آباد کا ہے :

چل پری ہٹ نہ مجھ کو منھ دکھلا اے شب ہجر تیرا کالا منھ

جب کہا یار کو دکھا صورت ہنس کے بولا کہ دیکھ اپنا منھ

ان کا دیوان فارسی و دیوان ریختہ اور کئی مثنویاں قصۂ غم و شکایتِ ستم و قول غمیں و تف آتشیں یادگار ہیں۔"

چوتھی فصل : اقسام نظم یعنی کلام با وزن اور قافیہ میں ہے۔ اس میں متفرق عنوانات ہیں۔ ہر عنوان کی تعریف کی گئی ہے اور اس کے تحت فارسی اور اردو اشعار اس کی تائید میں پیش کیے گئے ہیں۔ عنوانات حسب ذیل ہیں :

توحید و تحمید۔ ذکر الٰہی۔ نعت۔ مناجات۔ عبادت۔ شکریہ۔ عذر تقصیر۔ اعتراف گناہ۔ توبہ۔ تعریف سادات۔ تعریف خاک کربلا۔ مرثیہ۔ سلام و نوحہ و رباعی۔ مذہب و اعتقاد۔ تسلیم و رضا۔ توکل۔ تقدیر۔ تصوف۔ گوشہ نشینی۔ عزت۔ خوشامد۔

دعائیہ۔ صلح۔ جنگ۔ شجاعت۔ ہمت۔ عصمت۔ سخاوت۔ اقبال۔ سعادتمندی۔
استقلال۔ تواضع۔ سخن سازی۔ تلون مزاجی۔ حسرتِ امید۔ نا امیدی۔ شہرت۔ انتظار۔
شکایت زمانہ۔ ملاقات۔ حسرت۔ دیدار۔ نزاکت۔ معشوق۔ ضعف باہ۔ مرگ۔
ریختی یعنی زنانی بولی۔ اشعار مہمل۔ تاریخ۔ معما پہیلی۔ مکری۔ کٹرکہ۔ سہرہ۔ ہجو۔
صنائع شعر وغیرہ۔

اکثر اشعار فارسی کے نقل پر ہی اکتفا کی ہے اور تعریف نہیں لکھی مثلاً عدل کے
تحت سعدی کا یہ شعر لکھا ہے ؎

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل　　　گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نہ ماند

ہر عنوان پر فارسی کے مختلف شعرا کے کئی کئی اشعار درج ہیں۔ عربی کے شعر اور
رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ دیوان مرتضوی کے اشعار بھی جگہ جگہ نقل کیے گئے ہیں۔ زلف
کے بارے میں منجملہ دیگر شاعروں کے میر تقی میر کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

زلف سیاہ کی یاد میں آنسو ٹپکتے ہیں　　　اندھیری رات ہے برسات کی جگنو چمکتے ہیں

مکری کی تعریف اس طرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
بات کہکر مکر جانے کا مضمون بوزن خاص ہوتا ہے۔ مکری چراغ کی۔ جناب
واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی فرمائی

باراتو سب کو بھایا　　　بڑھ گیا تو کام نہ آیا
اجیالا اوس سے سارا و پاگ　　　اے سکھی ساجن نہیں سکھی چراک

یہ فصل ۳۳۹ سرخیوں پر مشتمل ہے۔

پانچویں فصل نثر : یعنی اس کلام میں کہ جس میں وزن و قافیہ اکٹھے نہ ہوں۔

...ہ اردو ہو جسے ریختہ بھی کہتے ہیں۔ خواہ عربی و فارسی وغیرہ"۔ اسکی ستائیس قسمیں لکھی ہیں اور اس کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ان میں ایک عنوان فقرات و عبارات سے ہے جس میں طرز عالمگیر، طرز ...، طرز غالب شاہجہان آبادی، طرز لچھمی نرائن کے نمونے دیے گئے ہیں۔ ایک عنوان "تاریخ وفات" پر ہے جس میں مختلف اشخاص کی تاریخ وفات نکالی گئی ہے۔ ایک عنوان صنائع نثر کا قائم کیا گیا ہے جس میں منجملہ دیگر صنائع کے رقعہ کی شکل میں صنعت منقوطہ اور غیر منقوطہ تحریر کیے گئے ہیں۔ ایک رقعہ میں نقطے محض حروف ... پر آئے ہیں۔

"ہمدم دوستان سلامت۔ نوازش نامہ حضرت کا نازل ہوا۔ تحفۂ اثنا عشریہ موافق ارشاد ملازمان ارسال کرتا ہوں اور سکندر نامہ خوشخط نہ ملا اگر ملتا تو ضرور روانہ کرتا۔ تھوڑا سا عطر حنا اگر ممکن ہو تو مرحمت ہو۔"

ایک سرخی اقوال و نصائح پر مبنی ہے۔ ایک ترکیب نحوی پر ہے۔ ایک فارسی اور اردو کی ضرب الامثال اور کہاوتوں پر ہے۔ ایک تحریرات معاملات پر ہے جس میں ضمانت نامہ۔ اشتہار۔ اجازت نامہ۔ اجارہ۔ اخبار۔ انکار نامہ۔ دستاویز۔ رہن نامہ نکاح نامہ۔ طلاق نامہ۔ سمن۔ وکالت نامہ۔ وثیقہ۔ کرایہ نامہ حویلی۔ کاغذ حویلی وغیرہ کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ ایک عنوان نادر خطوط متفرق و عبارات و تحریرات پر مشتمل ہے جس میں چار مکتوب ہیں۔ ایک رسول اللہؐ کا خط جو خسرو پرویز بادشاہ عجم کو لکھا تھا۔ ایک رقعہ جعفر زٹلی کا۔ ایک رقعہ امیر علی شیر اور ایک مکتوب بوعلی شاہ قلندر کا شامل ہے۔ اس کے علاوہ تقریر مرزا ... خط مضحک۔ مرزا جعفر زٹلی اور حکایات و لطائف مضحکہ تحریر کیے گئے ہیں۔ حکایات و لطائف کی تعداد ۶۹۴ ہے۔

چھٹی فصل : اس میں مصنف نے اقالیم کا ذکر کیا ہے اور سات اقالیم کو سات ستاروں سے منسوب کیا ہے جیسے اقلیم اول منسوب بہ زحل۔ اقلیم دوم منسوب بہ مشتری۔ اقلیم سوم منسوب بہ مریخ۔ اقلیم چہارم منسوب بہ آفتاب۔ اقلیم پنجم منسوب بہ زہرہ۔ اقلیم ششم منسوب بہ عطارد۔ اقلیم ہفتم منسوب بہ قمر۔ اس کے بعد زمین کو "بطور انگریزی" کے چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اشیہ (ایشیا) یوروپ۔ افریقہ۔ اسطرل (اسٹریلیا) امریکہ۔ پولیشیا۔ اس میں ایک عنوان فوائد اقلیم مطابق تقسیم قدیم اور موافق تقسیم انگریزی کے تحریر کیا ہے۔ اس میں جغرافیائی لحاظ سے ہر ملک کا حدود اربعہ پیش کیا گیا ہے اور وہاں کے عجائبات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ان ممالک کے شہروں اور وہاں کی صنعتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ کہیں کہیں اس شہر کے لوگوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، مثلاً لکھنؤ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ پہلے گاؤں تھا پھر نواب آصف الدولہ مغفور نے دارالامارہ کیا۔ پھر نواب غازی الدین مرحوم وغیرہ نے دارالسلطنت و بیت السلطنت بنایا۔ چنانچہ اب تک بڑا شہر ہے شیعوں کا۔ کہ جس میں جہاں کی چیزیں اور سب شہروں کے لوگ موجود ہیں اور از بسکہ عدد لکھنؤ کے بغیر ہمزہ ایک سو گیارہ مطابق عدد کھنے کے ہیں۔ اکثر لوگ یہاں کے بے وفا ہوتے ہیں اور یہاں کا گوٹہ وغیرہ گٹھیلا جوتا۔ زردوزی نامی ہے۔"

جونپور کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ ایک بڑا شہر ہے۔ دریا رکھتا اور ایسا بہت بڑا پل پختہ خان خاناں کا بنا ہوا کہ جس کا نظیر کسی جگہ ہندوستان میں نہیں ہے اور تیل اور عطر وہاں کا نامی اور مشہور

ہے اور ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ وہیں کا تھا"

امروہہ کے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں:

"شہر ہے۔ عبادت گاہ شیخ سدو کہ وہاں کا پاسی گل بہت باریک اور بے مثل ہے کہ اور کہیں نہیں ہوتا"

ساتویں فصل : یہ فصل ہندوستان سے متعلق ہے جس میں حسب ذیل سرخیاں قائم کی ہیں۔ نقشہ سمت ہندوستان اور حال تقسیم صوبہ جات وغیرہ کا۔ عقائد۔ اقوام ہندو مسلمان۔ اولیائے ہند یا سلسلۂ خانوادہ۔ ایام متبرکہ ہندو مسلمان۔ رسمیات مسائل زنان۔ اصطلاحات۔ خطابت و نام۔ کیفیت دربار بادشاہاں۔ اقسام علوم و فنون۔ حروف مروجہ۔ صنائع۔ اشیائے تواضع۔ سوداگری۔ تحائف۔ کھانوں کے نام۔ میووں کے نام۔ کپڑوں کے نام۔ پوشاک کے نام۔ زیوروں کے نام۔ جواہرات کے نام۔ پھولوں کے نام۔ باجوں کے نام۔ ہتھیاروں کے نام۔ سواریوں کے نام۔ رنگوں کے نام۔ کارخانہ جات بادشاہی کے نام۔ عہدوں کے نام۔

اس فصل میں فرنگیوں کے حال کے ذکر میں وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

"ماہ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں غدر عظیم نمونۂ قیامت چند اضلاع متعلق بنگالہ داخل ہندوستان میں مثل میرٹھ کے پہلے یہیں سے شروع ہوا اور آگرہ و فرخ آباد و شمس آباد و مئو و لکھنؤ و بریلی و شاہجہاں آباد کے چربی کے کارتوس فوج انگریزی میں تقسیم ہونے کے سبب سے کہ مسلمان سور کی چربی اور ہندو گائے کی چربی سمجھے۔ نام نہاد جہاد انگریزوں کے قتل کے لیے شروع ہو کر تھوڑے عرصے میں پھیل گیا

اس اختتامیہ باب کی پہلی فصل میں فارسی کلام کے تحت حضرت علیؑ کی شان میں
ایک قصیدہ لکھا ہے "مدح جناب امیر علیہ السلام میں کہ بفضلہ ۱۲۴۷ھ میں عرض کیا اور
باعث کامیابی و دافع خفقان ہوا" جس کا مقطع یہ ہے ؎

چگونہ مدح تو اے مہر دیں کند ذرہ
معرّف تو خدا یست و احمد مختار

پھر رسالت مآبؐ کی مدح میں ایک قصیدہ پیش کیا ہے۔ اسکے بعد متفرق اشعار
فارسی میں تحریر کیے ہیں۔ فارسی کے بعد اردو میں اپنی سخنگوئی کے نمونے غزل۔ رباعی قطعہ
اور تاریخ کی شکل میں پیش کیے ہیں۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

وہ گلرخ جس جگہ اور جہاں ہے
رجوع اسکی طرف سارا جہاں ہے

یقیں ہے وہ صنم جانِ جہاں ہے
جو اسکو چاہتا ہر انس و جاں ہے

مرا قاتل جو وہ عیسیٰ زباں ہے
دوبارہ مجھکو جینے کا گماں ہے

نزاکت کیا کہوں اس اشک گل کی
حنا کا رنگ ہاتھوں پر گراں ہے

غزل میں اور کہتا اس زمیں میں
مگر مجرمؔ مجھے فرصت کہاں ہے

اپنے فارسی کلام میں مصنف نے مجرمؔ تخلص اختیار کیا ہے اور اردو میں انورؔ۔ لیکن
مندرجہ بالا اردو غزل میں مجرمؔ ہی تخلص استعمال کیا ہے۔ انورؔ تخلص کے تحت چند غزلوں
کے مقطعے پیش خدمت ہیں :

مزا اس غزل کا ہے اوس روز انورؔ
کہ جس روز ہم اپنے ہمدم کو دیکھیں

ہجر میں مضطرب ہو کیوں انورؔ
جس کا مرہم نہ ہو وہ داغ نہیں

رباعی: نازاں نہ ہو مال پر کہ یہ فانی ہے
ظلم نہ کر کہ پھل پشیمانی ہے

گو علم و ہنر خدا دے لیکن انورؔ
دعویٰ نہ کبھی کرنا کہ نادانی ہے

قطعہ: سب کو معلوم ہے تفنن میں کیا طبیعت کا حال ہوتا ہے
ایک گر علم کیجئے حاصل دوسرے کا زوال ہوتا ہے

قطعۂ تاریخ: جب ہوا طیار شمس آباد میں یہ چار باغ ایک نئی تاریخ انور نے کہی اوس حال میں
جیم کے جو تین تھے چھ کر کے پھر بارہ کیے حاصل تضعیف کو لکھا عدد کے چال میں (۱۲۶۳ھ)

تضمین: شیطاں سے نہیں کسی کو ایک لمحہ پناہ بہکانے سے اس کے ہوا عالم گمراہ
اللہ بچائے تو بچیں ہم اس سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ

اختتام کی دوسری فصل نثر سے متعلق ہے جس میں کچھ تقریظیں۔ خطوط فارسی۔ رقعہ شادی۔ اقوال فارسی۔ اردو میں اپنے اقوال و تجربات بترتیب حروف تہجی ضرب المثل۔ لطائف مضحکہ تحریر کیے ہیں۔ ایک تقریظ جس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"عبارت بطور تقریظ سہ شنبہ ربیع الاول بارہ سو تراسی ہجری میں برادر صاحب والا مناقب مرزا کلب حسین خاں کو لکھ کر بھیجی تھی۔"

تقریظ کی عبارت کے ٹکڑے ملاحظہ ہوں:

..."بندش کے جوڑے بہت درست ہیں۔ محاورات کے قاعدے نہایت چست ہیں۔ فصاحت جہاں دیکھو دم بدم تیز زبان ہے۔ بلاغت حد بلوغ کو پہنچ کر حسن گلو سوز پہ نازاں ہے.... اور کیوں کر نہ ہو کہ جناب معلی القاب برادر صاحب والا مناقب فخر الامرا ملک الشعرا شیعہ غالی اعتصام الدولہ سحبان زماں نواب ڈپٹی مرزا کلب حسین خاں بہادر مبارز جنگ المتخلص بہ نادر مد مجدہم نے کہ فی زمانا تنا علم وعلم شجاعت میں طاق اور نظم ونثر وصنائع وبدائع میں شہرۂ آفاق ہیں۔ چنانچہ بزم مشاعرہ

اس ضلع میں انھیں کی رنگینیٔ طبع سے گلزار اور شاعری ان ہی کی آبیاری
توجہ سے عالم بہار ہے۔ وضعداری اہل دہلی اور لکھنؤ کی جو سُنتے تھے
ان میں دیکھی ... ان کے سامنے شاعرانِ سحر بیان ابجد خواں ہیں ...
اگر آج پر اسنے شاعر ہوستے نئی نئی طرح سے اپنا فروغ کھوتے۔
خاقانی خفقانی ہو جاتا۔ نظامی کے انتظام میں خلل آتا۔ سعدی
سادہ لوح ٹھہرتا۔"

جہاں انھوں نے اقوال ہندی تحریر کیے ہیں ان کی زبان بڑی سادہ اور سلیس ہے۔ یہ اصل میں اخلاقی و آفاقی قدریں اور زندگی کی حقیقتیں ہیں جنھیں اپنے تجربات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ مثلاً:

"انتہائی قرابت اور دوستی یہ ہے کہ ایک دوسرے کو آنکھ بند ہوتے ہی گڑھے میں دبا دے اور چند روز رو پیٹ کر بدستور سابق امور دنیا میں مصروف ہو اور اسے بھول جائے۔"

"اگر بری بات اچھی ہوتی تو آدمی اپنے بیٹے کو سکھاتا۔"

"دشنام دشمن کو بھی نہ دو اور قسم کو سم سمجھ کر نہ کھاؤ نہ لو۔"

مخطوطے کے آخری صفحہ پر محمد علی دولہ کی دیگر تصنیفات کے نام درج ہیں۔ اس کے بعد یہ عبارت لکھی ہے:

"والحمد اللہ اولاً و آخراً کہ شکر خدا رسالہ من اختتام یافت۔ زاں صورتے کہ خواست دلم انتظام یافت۔ الحمد اللہ علی ذلک الانعام کہ ایں کتاب بلاغت انتساب رشک حور خاں فصاحت منزل مسمی بہ مرغوب دل

بتاریخ بست و دوم ماہ رجب ۱۲۸۲ھ ہجری قدسی بہ بنیان بے بنیان بندۂ گنہ گار مرتکب خطایائی جلی محمد عرفان علی ختم اللہ الحسنی حلیہ اختتام در برکشید۔

ہرکہ خواند دعا طمع دارم زانکہ من بندۂ گنہ گارم

اسی صفحہ پر ایک جانب یہ عبارت بھی درج ہے :

"بفضلہ شب شنبہ ۲۳ صفر ۱۲۸۳ھ ہجری مطابق، جولائی ۱۸۶۶ء از تصحیح ایں کتاب الفراغ حاصل گردید۔ الحمد اللہ علی ذلک الانعام۔"

مخطوطہ میں ہر جگہ مصنف کی حیثیت سے محمد علی دولہ نام ملتا ہے لیکن اختتام میں محمد عرفان علی کی تحریر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخطوطہ کی تصحیح اور نقل محمد عرفان علی نے کی ہے۔ محمد عرفان علی بھی محمد علی کے ہم عصر تھے۔ شمس آباد میں سکونت پذیر تھے اور باہم موانست تھی۔ مخطوطہ میں ایک لطیفہ بیان کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے " میں نے مولوی عرفان علی سے کہا۔ عرفان علی بھی شاعر تھے جن کا تذکرہ عبدالغفور نساخ نے 'سخن شعرا' میں صرف اتنا کیا ہے :

"عرفان تخلص۔ مولوی سید عرفان علی خلف سید قربان علی متوطن بریلی مقیم شمس آباد۔"

(صفحہ ۳۲۴)

بہر حال یہ کشکول ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسکی ہر فصل اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک اہم کتاب ہے۔ ادب۔ تاریخ۔ تذکرہ ہر فن پر کارآمد مواد دستیاب ہو سکتا ہے۔ کلاسیکی ادب میں اسکو شمار کیا جا سکتا ہے۔

معارف کی ڈاک

مکتوب پاریس

پاریس ۱۱ مئی ۱۹۴۳ء

مخدوم و محترم اڈیٹر صاحب رسالۂ معارف زاد مجدکم۔ سلام مسنون

ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ بمبئی کے فضیلت مآب پروفیسر عبدالرحمن مومن صاحب نے آپ کو کتاب السرد والفرد مولفہ ابوالخیر قزوینی پر ایک مضمون بھیجا ہے۔ اگر وہ مضمون چھپ رہا ہے تو معارف کے اسی شمارے میں مناسب معلوم ہو تو منسلکہ تحریر بھی شامل فرما دیں۔ ممنون ہوں گا۔ "ح"

پاریس میں ایک فاضل ایرانی رہتے ہیں۔ انھوں نے زحمت فرماکر میرے ایک خط کے جواب میں مندرجۂ ذیل اطلاع دی ہے۔ خدا انھیں جزائے خیر دے:

"ابوالخیر احمد بن اسماعیل بن یوسف الطالقانی القزوینی۔ طالقان ایک بہت چھوٹا شہر ہے جو تہران کے قریب ہے۔ اس مولف کا لقب رضی الدین ہے یہ ایک جلیل القدر شافعی عالم تھے بہت بڑے حفاظ قرآن میں سے تھے، زبردست خطیب بھی تھے۔ سنہ ۵۹۰ھ قمری میں وفات پائی۔ حنبلی فقیہ عبدالرحمن بن علی بن الجوزی التیمی جمال الدین ابوالفرج کے معاصر تھے۔ بعض وقت بغداد جاکر مجلس وعظ منعقد کرتے جس میں خلیفۂ وقت بھی (جو بظاہر ابوالعباس الناصر لدین اللہ احمد بن مستضئ تھا) ان کی مجلس وعظ میں آتا اور پس پردہ بیٹھا کرتا۔ اس میں عوام کا بڑا

اثر دوام ہوا کرتا۔ بہت جلیل القدر عالم تھے۔ حدیث، تفسیر، قراءت اور دیگر علوم منقولہ میں بہت بلند درجہ رکھتے تھے اور صاحب تالیفات تھے۔

"مخفی نہ رہے کہ ہمارے ہاں ابوالخیر نامی گیارہ فاضل گزرے ہیں۔

۱۔ احمد ابوالخیر بن علی معروف بہ نجاشی

۲۔ ابوالخیر جواد معروف بہ ابوالخیر حماد

۳۔ ابوالخیر حسن معروف بہ ابن ختار

۴۔ ابوالخیر عاشق معروف بہ ابوالخیر عاشق

۵۔ ابوالخیر عبد معروف بہ بیضاوی

۶۔ ابوالخیر فضل اللہ معروف بہ ابوسعید فضل اللہ

۷۔ ابوالخیر محمد بن عبدالرحمٰن معروف بہ سخاوی

۸۔ ابوالخیر محمد بن عبداللہ معروف بہ مروزی

۹۔ ابوالخیر محمد بن محمد بن علی معروف بہ جزری

۱۰۔ ابوالخیر بن مصطفیٰ طاش کوبری زادہ

۱۱۔ زیر بحث کتاب السرد والفرد کا مولف

"ضرورت پر مزید تفصیل دے سکتا ہوں۔"

خادم

"ح"

مطبوعات جدیدہ

کاروانِ زندگی (حصہ پنجم) از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۵۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت تحریر نہیں، پتہ:

مکتبۂ اسلام ۲/۵۴ ۱۷، محمد علی لین، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے "کاروانِ زندگی" کے نام سے مفید و معلومات افزا اپنی داستانِ حیات قلم بند کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کے چار حصے مختلف زبانوں میں پہلے شایع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں اور ان کا ان صفحات میں ذکر بھی آچکا ہے، اب یہ پانچواں حصہ شایع ہوا ہے جو دسمبر ۱۹۹۰ء تا دسمبر ۱۹۹۳ء کے حالات، اہم واقعات اور مولانا کے تجربات و مشاہدات پر مشتمل ہے، پہلے حصوں کی طرح یہ حصہ بھی پچھلے تین برسوں کے گوناگوں مسائل خصوصاً ملت اسلامیہ کو درپیش حالات و امور نیز قومی، ملی، دینی اور دعوتی سرگرمیوں کا خاکہ ہے، مولانا ہندوستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے ممتاز اور نامور عالم اور معتمد دینی رہنما ہیں، ان کا غلغلہ عرب و عجم ہر جگہ گونج رہا ہے البیت یعرفہ والحل والحرم اس لیے ان کی تگ و تاز کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ اصلاً ایک داعی و مصلح ہیں، جو اپنی مشغولیت، معذوری اور صحت کی کمزوری کے باوجود اسلام کی دعوت، تعلیم محمدیؐ کی اشاعت اور خلقِ خدا کی رہبری کے لیے ملک کے مختلف حصوں اور دور دراز ملکوں کے پیہم سفر کرتے رہتے ہیں، ایشیا، یورپ اور امریکہ ان کی دینی و تبلیغی جد و جہد کی جولان گاہ ہیں، یہ کتاب ان سب ملکوں کے ان کے سفر و وہاں کی مشغولیتوں اور علمی، دینی و دعوتی مساعی کی روداد اور مختلف اجتماعات میں کی گئی تقریروں اور پڑھے گئے مقالوں کا ریکارڈ ہے، اس طرح یہ آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں ہے جس سے ہندوستان اور

مسلمانانِ عالم کے موجودہ حالات کا مکمل مرقع سامنے آجاتا ہے، کتاب میں جن تین برسوں کے حالات و واقعات قلم بند کیے گئے ہیں وہ مسلمانوں کے لیے نہایت پُر آشوب تھے، ان برسوں میں ہندوستان، اسلامی ممالک اور دنیا کے کئی حصوں میں انہیں بڑے نشیب و فراز اور سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے، مولانا جیسے حساس اور درد مند دل رکھنے والے شخص پر ان اندوہناک واقعات و حوادث کا غیر معمولی اثر ہے، انکے سحر طراز قلم نے انکی منظر کشی کرکے ہر قلب کو تڑپا اور ہر روح کو مضطرب کر دیا ہے، خلیج کی جنگ، بابری مسجد کی شہادت، اسکے بعد کے وحشیانہ فسادات، بم دھماکے، اشتراکیت کے زوال کے بعد امریکہ کی عالمی مہم اور یہود و نصاریٰ کی مسلم دشمنی کا مشترکہ منصوبہ، ہندوستانی معاشرہ کا کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہونا وغیرہ کا تجزیہ ایک دیدہ ور مورخ کی طرح کیا ہے، انہوں نے مسلمانوں اور عالم انسانیت کے موجودہ زیاں کے ذکر ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ایک ہوشمند مبصر اور بیدار مغز رہبر کی طرح اسکا مداوا بھی پیش کیا ہے اور خصوصیت سے مسلمانوں کو لاحق خطرات اور انکے تشخص کو معدوم کرنیوالی صورتوں اور کوششوں کے تدارک کی تدبیریں بتائی ہیں گویا یہ غم دوراں کی حکایت ہی نہیں ہے بلکہ علاج غم دوراں بھی ہے، پچھلے تین برسوں میں اہم اشخاص سے اپنی ملاقات یا خط و کتابت، ملک اور اتر پردیش میں ہونیوالی سیاسی تبدیلیوں، ممتاز اشخاص اور اپنے حلقہ تعلق کے افراد کی وفات کا تذکرہ بھی کیا ہے، متعدد اہم واقعات کی رپورٹ اور اپنی اہم تقریروں اور مضامین کو اکٹھا کر دینے سے اس کتاب کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے، مولانا کے ادب و انشا کی لطافت و رعنائی اور انکے طرز بیان کی اثر انگیزی و دلنشینی بھی اہل ذوق کیلئے پُر کیف و باعث کشش ہے، البتہ اس میں بعض غیر معمولی واقعات کا تذکرہ، پتہ نہیں کیوں نہیں آسکا ہے، ایک تو افغانستان میں حکمت یار اور برہان الدین ربانی کی معرکہ آرائی جس نے افغانستان کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا ہے اور جس سے اسلام پسند طبقے کی بڑی مضحک تصویر سامنے آتی ہے، دوسرے فلسطین کا قضیہ نامرضیہ خصوصاً یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیراعظم کا موجودہ سمجھوتہ تیسرے بوسنیا میں مسلمانوں پر ہونیوالے مظالم۔ دنیائے اسلام کے حالات و مسائل سے مولانا کی باخبری اور غیر معمولی واقفیت کی بنا پر انکے عقیدتمندوں کو یقیناً ان ملکوں کے بارے میں بھی انکا تاثر جاننے کی خواہش ہوگی۔ (ض)

جلد ۱۵۴ ماہ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۴ء عدد ۲

مضامین

مقالات

استفسار و جواب

معارف کی ڈاک

ادبیات

شذرات

جو قومیں فیضانِ سماوی سے محروم اور توحید و آخرت کے تصور سے ناآشنا ہیں، انکی تگ ودو اور ساری سرگرمی و جولانی بس دنیا اور اس کے عیش و عشرت ہی کے لیے ہوتی ہے، اسی کا سود و زیاں ان کے پیش نظر ہوتا ہے اور وہ تمام حقائق اور عظیم و برتر مقاصد سے آنکھیں بند کر لیتی ہیں، ان کی خود غرضی اور جلبِ منفعت کا جنون انہیں دوسروں پر ظلم و تشدد اور کمزور و مجبور لوگوں کے استحصال سے کم پر راضی ہی نہیں ہوتے دیتا، جاہ و منصب اور عزّ و اقتدار کی طلب انہیں دیوانہ بنا دیتی ہے اور وہ دوسروں کا رہنا اور جینا دشوار کر دیتی ہیں، آج آزادی، مساوات اور جمہوریت کا دم بھرنے والے پس ماندہ قوموں کے لہو سے اپنے تن و توش کو فربہ بنا رہے ہیں، انہی کی وجہ سے فساد فی الارض، وحشت و درندگی، قتل و غارتگری، خون خرابہ، مار دھاڑ اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے، انھوں نے اور انکے ایجنٹوں نے اپنی شیطنت سے تمدن و معاشرت، علوم و فنون، فلسفہ و سائنس، سیاست و معیشت غرض سارا نظامِ عالم درہم برہم کر ڈالا ہے۔

مسلمان دنیا کی عام قوموں اور ملتوں سے اس اعتبار سے مختلف، ممتاز اور برتر تھے کہ توحید و آخرت پر ان کا ایمان و اعتقاد تھا اور وہ فیضان سماوی سے بہرہ ور تھے، انکے پاس خدا کی کتاب اور اس کے رسول کا اسوہ و نمونہ تھا، خدا ترسی اور آخرت کی جواب دہی کے احساس نے ان کی نظر میں دنیا کو بے قیمت اور اس کے عیش و تنعم سے انہیں بے پروا کر دیا تھا، ان کے سود و زیاں کا معیار خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح تھا، اس لیے انکا وجود دنیا کے لیے موجب رحمت تھا، خیر و خوبی کی دعوت ان کا مشن تھا، دوسروں کی ہمدردی و خیر خواہی سے ان کا دل معمور رہتا تھا، کسی کو مصیبت اور زحمت میں دیکھ کر

وہ تڑپ اٹھتے تھے، خود رنج والم برداشت کرکے دوسروں کو آرام و راحت پہنچانا اپنا فرض سمجھتے تھے، مالِ غنیمت اور کشورکشائی سے بے نیاز ہو کر سروری و سربراہی کو خلقِ خدا کی خدمت اور نفع رسانی کا وسیلہ سمجھتے تھے، ان کے حسنِ عمل اور حسنِ کردار سے دنیا امن و آسایش کا گہوارہ ہوگئی تھی اور روئے زمین پر ایک نئی امت، نئی قوم، نیا معاشرہ، نیا تمدن، نیا قانون اور نئی حکومت قائم ہوگئی تھی۔

یہ دنیا کی بدنصیبی بھی ہے اور مسلمانوں کی بدبختی بھی ہے کہ اب نہ انکا امتیاز و تفوق باقی رہا اور نہ توحید و آخرت پر انکا پختہ ایمان رہا، کتاب الٰہی کو حریر و ریشم کے جزدانوں میں رکھکر طاقوں اور الماریوں کو سجایا جاتا ہے مگر اس کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ اس کی کوئی صدا کانوں تک نہ پہنچنے پائے، اسوۂ رسولؐ کے ہوتے ہوئے بھی مسلمان جاہلانہ اوہام و خرافات اور طاغوتی افکار و خیالات اپنے دل و دماغ میں بسا رہے ہیں، دوسری قوموں کی نقالی پر فخر کرتے ہیں اور اپنے اسلاف کے ورثے سے بے نیاز ہوکر مغرب کے تمدن و معاشرت، اسکے فکر و فلسفہ اور اس کی سیاست و قانون کے گرویدہ ہو رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج انکا نظام حیات بے کیف اور پراگندہ ہوگیا ہے اور ان کی وہ تمام خوبیاں اور خصوصیات ختم ہوگئی ہیں جن سے عالم کی زلف گرہ گیر سنور سکتی ہے اور وہ ساری خرابیاں ان میں جڑ پکڑتی جارہی ہیں جو خدا بیزار اور آخرت فراموش قوموں کا شیوہ ہیں اور جن کے انسداد پر مسلمان مامور کیے گئے تھے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کا حال بھی نہایت زبوں ہے، انھوں نے دوسری قوموں کے عادات و اطوار اور رسم و رواج اختیار کر لیے ہیں اور اللہ کے احکام و قوانین پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے، انکے دل و دماغ میں مشرکانہ افکار و اعمال اور باطل خیالات و نظریات رچ بس گئے ہیں اور

وہ غیر اسلامی تہذیب و معاشرت میں رنگتے جا رہے ہیں، دعوتوں، تقریبوں اور تہواروں میں فضول خرچی اور اسراف عام ہوگیا ہے، شادی بیاہ اور بے سود کاموں میں محض نام و نمود کے لیے بے دریغ روپے خرچ کرتے ہیں، اس کے لیے سود پر قرض لیتے ہیں اور جائداد کو رہن رکھتے ہیں، اہم اور ضروری دینی، ملی اور قومی کاموں میں ایک حبہ بھی خرچ کرنا انکو گراں معلوم ہوتا ہے، نوجوان نوش، منکرات، منشیات اور جرائم کے عادی ہو رہے ہیں، انہیں شراب، جوئے اور لاٹری کا چسکا لگتا جا رہا ہے، وہ اپنا سارا قیمتی وقت لہو و لعب، رقص و سرود، سینما، ٹی۔ وی اور ریڈیو کے گانے سننے میں گنوا رہے ہیں، اسکے بعد بھی یہ گلہ ہے کہ دوسرے انکے تشخص کو مٹا دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود ہی اپنی تہذیب و روایت سے دستکش ہوکر اپنے معاشرہ کی روحانیت و پاکیزگی ختم کر رہے ہیں اور اپنے عائلی و سماجی نظام کو درہم برہم کر رہے ہیں۔

اسی صورتحال کے پیش نظر مسلمانوں کے سب سے باوقار اور ذمہ دار ادارہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں ۳۰،۳۱ جولائی کو "اصلاح معاشرہ" کانفرنس منعقد کی تھی اصلاح معاشرت ندوہ کے مقاصد میں بھی شامل ہے اور یہ وقت کا اہم تقاضا بھی ہے، الحمد للہ کانفرنس توقع سے زیادہ کامیاب رہی لیکن مسلمانوں کی معاشرتی خرابیاں اتنی بڑھ چکی ہیں کہ ایک دو کانفرنسوں سے انکی اصلاح ممکن نہیں ہے، اسکے لیے منصوبے کے تحت ملک گیر پیمانے پر جدوجہد ضروری ہے، مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور تنظیموں کو اپنے ہر طرح کے اختلافات کو نظر انداز کرکے مل جل کر یہ ضروری کام کرنا چاہیے اور ائمہ مساجد، دعاۃ و مبلغین اور تعلیمی، تربیتی اور سماجی کام کرنے والوں کو بھی اس میں پیش پیش رہنا چاہیے موصولہ خبروں کے مطابق کانفرنس میں ان بنیادی امور کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کیا گیا ہے، یہ کام ہمارے ملک کی بھی اہم ضرورت ہے، ملک میں بہتر سماج قائم کرنے اور اسکے بدتر نظام کو ختم کرنے کیلئے ناگزیر ہے کہ مسلمان اپنے معاشرہ کی اصلاح کرکے ملک میں بہتر سماج قائم کرنے کی راہ ہموار کریں، یہ انکا دینی فریضہ ہے۔

مقالات

نظم جماعت اور مولانا ابوالکلام آزادؒ

از

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

الہلال اور تذکرہ کے عہد میں اور اس کے بعد بھی مولانا ابوالکلام آزاد کو مسلمانوں کی اصلاح و جماعتی استحکام سے خاص دلچسپی تھی، ان کے شب و روز اسی دھن میں گزرتے تھے اور اسے وہ قومی سیاست کے فریم ورک میں اپنے سیاسی پروگرام کی بنیاد تصور کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نظم جماعت کا یہ تصور ان کے برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے، ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی کوئی دینی و سیاسی تنظیم نظم جماعت اور امارت شرعیہ کے قیام کے بغیر ممکن نہیں[1]

نظم جماعت سے مولانا آزاد کی مراد یہ تھی کہ ایک امیر کی اطاعت و قیادت میں ہندوستان کے مسلمان شریعت اسلامی کے مطابق ایک منظم اجتماعی زندگی گزاریں اور اسی نہج پر اپنی تنظیم کریں۔ اسی نظم پر جیسا کہ انھوں نے بار بار کہا بھی اور لکھا بھی، مسلمانوں کی مذہبی و معاشرتی زندگی میں کسی بھی اصلاحی پروگرام کی کامیابی کا انحصار ہے، اسی کے نتیجے کے طور پر امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آئے گا اور قضا کے قدیم

---

[1] ابوالکلام آزاد، خطبات آزاد "خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ العلماء ہند، نومبر ۱۹۲۱ء" ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء، صفحہ ۱۲۹

ادارہ کا احیاء ہو گا۔ اس سلسلے میں ان کی ساری امیدیں طبقۂ علماء سے وابستہ تھیں بشرطیکہ وہ ان کے بتائے ہوئے خطوط پر اصلاح و تجدید کے لیے آمادہ ہوں لیکن اس طبقے نے عام طور پر انہیں مایوس کیا، اس لیے کہ زندگی کے روایتی طور طریقے کی سہل پسندی اور تن آسانی ہی میں وہ اپنے مفاد کو محفوظ سمجھتا تھا اور جہاں تک جدید تعلیم یافتہ طبقے کا تعلق ہے اسے انھوں نے جدوجہد کے اس کام کے لیے پہلے ہی سے ناکارہ سمجھ لیا تھا۔ مولانا آزاد کے نظم جماعت کے تخیل کا سرچشمہ امام ابن تیمیہؒ کی ذات گرامی تھی جنھوں نے منگولوں کی یلغار کے زمانے میں ان علاقوں کے مسلمانوں اور خاص طور پر علماء سے جن پر منگول قابض ہو گئے تھے زور دے کر کہا تھا کہ وہ حملہ آوروں کی اطاعت قبول نہ کریں اور ایک متحرک، فعال اور منظم جماعت بن کر ان کے سیاسی غلبہ کی پوری قوت سے مزاحمت کریں۔

طبقۂ علماء میں دیوبند کے شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے بعض رفقاء کو مستثنیٰ کرتے ہوئے دیکھا جائے تو مولانا آزاد کی دعوت اصلاح و تجدید اور سیاسی اقدام کا جواب علماء نے عام طور پر اپنی بے پروائی اور بے رُخی کی صورت میں دیا۔ اس لیے انھوں نے خود اقدام کیا اور ۱۹۱۳ء میں مخلص کارکنوں کی ایک انقلابی جماعت حزب اللہ کی بنا ڈالی۔ ۱۹۱۴ء کے اوائل میں انھوں نے شیخ الہند سے ملاقات کی، اپنے مقصد و منہاج سے متعلق ان سے تبادلۂ خیال کیا اور انہیں اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ امیر جماعت بن جائیں، اب ایسا لگتا تھا کہ نظم جماعت کی کوئی نہ کوئی شکل نکل آئے گی اور جلد ہی اس کا اعلان کر دیا جائے گا لیکن بدقسمتی سے چند زود رائے اشخاص کے مشورہ پر شیخ الہند نے یکایک حجاز جانے کا فیصلہ کر لیا اور جیسا کہ مولانا

لکھا ہے کہ ان کی کوئی بھی "منت سماجت" انہیں حجاز کے "سفر سے باز نہ رکھ سکی"۔[1]

پھر جنگ عظیم شروع ہوگئی اور حکومت ہند نے انگریز دشمن عناصر کی سرگرمیوں کی نگرانی کڑی اور تیز کر دی۔ لامحالہ حکومت کے محکمۂ سراغ رسانی کی نظریں مولانا آزاد کے ہفتہ وار اخبار اور ہر اس چیز اور کام پر جس کا تعلق ان سے تھا گہرے شبہہ کے ساتھ پڑنے لگیں اور یہ ناممکن ہوگیا کہ حزب اللہ کا پروگرام چل سکے۔ انجام کار ۱۹۱۶ء میں رانچی میں ان کی نظربندی کے ساتھ حزب اللہ کا کام تمام ہوگیا۔

مولانا آزاد بہرحال ان لوگوں میں نہ تھے جن کی رہنمائی وقت کے حالات کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور جو ہار مان کر خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ بنگال سے نکل جانے کا حکم جب صادر ہوا اور وہ بہار چلے گئے تو کوئی ساٹھ ہزار مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر ایک میمورنڈم کے ذریعہ حکومت سے مطالبہ کیا کہ بنگال سے ان کے اخراج کا آرڈر منسوخ کر دیا جائے۔ "بعض ارکان حکومتِ بنگال کے خطوط بھی پچھلے مہینے آتے رہے اور معلوم ہوا کہ غلط فہمیوں کا اعتراف ہے۔۔۔ ابتدا میں ان واقعات کا دل پر کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور پڑا لیکن پھر دیکھا تو دل کی آسودگی اور طبیعت کی وارستگی پر یہ تاثر یکسر ثانوی تھا:

دانم کہ نصیحت اند طبیبان ہمگی لیک
مرہم کہ ز محبوب نہد دشمن ریش ست

بظاہر حالات مشیت الٰہی کچھ اور ہی نظر آتی ہے اور شاید تکمیل کار کی ایک منزل ابھی باقی ہے۔"[2]

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۳۷۔ [2] ابوالکلام آزاد، تذکرہ، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی ایڈیشن، نئی دہلی، صفحہ ۳۳۔

رانچی کی جامع مسجد میں مولانا جب پہلی بار جمعہ کی نماز کے لیے گئے تو وہاں محبت واخلاص کے گہرے جذبے کے ساتھ ان کا استقبال کیا گیا اور وہ اس اظہار عقیدت ومحبت سے بہت متاثر ہوئے۔ نمازیوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ اس وقت رانچی کی مسلم آبادی تعداد کے لحاظ سے ایسی کم بھی نہ تھی کہ نظر انداز کر دی جائے لیکن دور پڑی ہوئی الگ تھلگ انسانوں کی ایک ایسی آبادی ضرور تھی جو تعلیمی ومعاشی اعتبار سے پسماندہ اور صد درجہ تباہی وبدحالی میں مبتلا تھی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ "نماز جمعہ کے بعد سے ایک قوی داعیہ قلب میں محسوس ہو رہا ہے کہ اگر حالات طول قیام کا باعث ہوئے تو یہاں بھی اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ دنیا نے فراغ وآزادی کے زمانے کے کاموں کا کچھ نہ کچھ نمونہ دیکھ لیا ہے، بہتر ہے کہ جلاوطنی ونظر بندی کے بند وقید میں کام کرنے کا ایک نمونہ دکھلا دیا جائے کہ اصلی آزمائش گاہ عمل یہیں ہے:

کچھ ہو رہے گا عشق وہوس میں بھی امتیاز

آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر"[1]

نظر بندی کی ایک شرط کے مطابق مولانا کو ہر روز رانچی پولیس کے دفتر میں اپنی حاضری کا اندراج کرانا ہوتا تھا۔ رہائش گاہ ان کی مورابادی میں تھی جو رانچی کے مضافات میں ایک گاؤں تھا۔ دفتر پولیس سے واپس ہوتے ہوئے وہ شہر کی مسجد میں عصر اور مغرب کی نماز ادا کرتے اور قرآن مجید کا درس دیتے۔ جامع مسجد میں جمعہ کے دن ان کے خطبات ومواعظ مقامی مسلمانوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے، بہت سی زندگیوں میں ان کے مواعظ کے اثرات ظاہر ہونے

---

[1] ایضاً، صفحہ ۳۳۶۔

لگے اور کتنے ہی مسلمانوں نے جو غیر شرعی کاروبار میں لگے ہوئے تھے' ایسے کاروبار سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔

رانچی ہی میں مولانا آزاد کو یہ خبر ملی کہ آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھانند نے مسلمانوں کی دعوت پر جامع مسجد کے ممبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی' یقیناً وہ ہندو مسلم اتحاد کے اس غیر معمولی مظاہرہ کی خبر سے کہ یہ اتحاد ان کی قومی سیاست کا اصول اساسی تھا، خوش ہوئے ہوں گے لیکن جلد ہی انہیں یہ خبر بھی ملی کہ حکومت کے وفاداران ازلی کے اشارہ پر ملک میں یہ شور و غوغا بھی ہے کہ ایک ہندو کو مسجد میں کیوں آنے دیا گیا۔ ادھر اس سے پہلے خود رانچی کے مسلمانوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ جامع مسجد میں مولانا کے درس قرآن سے استفادہ کے لیے غیر مسلم کیوں آتے ہیں' مسجد میں تو ان کا داخلہ شرعاً ممنوع ہے۔ اس بات سے مولانا پہلے ہی سے متاثر تھے۔ اب جو جامع مسجد دہلی میں سوامی جی کی تقریر کی بنا پر ملکی سطح پر ایک شور پیدا کیا گیا تو انھوں نے ایک مقالہ احادیث صحیحہ کی روشنی میں قلم بند کیا اور یہ ثابت کیا کہ شریعت میں مسجد میں غیر مسلموں کے داخلہ پر کوئی پابندی نہیں ہے' انھوں نے یہ بھی لکھا کہ غیر مسلم نہ صرف یہ کہ مسجد میں آ سکتے ہیں بلکہ وہ وہاں کے مواعظ سے استفادہ اور مدعو کیے جانے پر مسجد میں منعقد ہونے والے جلسوں اور مجلسوں میں شرکت بھی کر سکتے ہیں۔[1]

---

[1] معارف (اعظم گڑھ) مئی و جون ۱۹۱۹ء علی الترتیب صفحات ۹۲ - ۵۶ء اور ۵۷ - ۴۲۵۔ مطبع معارف سے یہ مقالہ جامع الشواہد فی دخول غیر مسلم فی المساجد کے نام سے ۱۹۲۰ء شایع ہوا۔ اب اس رسالے کا نیا ایڈیشن مسیح الحسن کی ترتیب و تقدیم کے ساتھ خدا بخش لائبریری' پٹنہ (۱۹۹۳ء) سے شایع ہوا ہے۔ اسی میں مولانا آزاد کا نظر ثانی شدہ نسخہ بھی شامل ہے اور نئے ایڈیشن کی یہی خصوصیت ہے۔

مولانا جب رانچی میں تھے تو ان کے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ ضابطہ کے مطابق حکومت انہیں کچھ الاؤنس دینا چاہتی تھی لیکن وہ ان کے اخراجات سے بہت کم تھا۔ انھوں نے صوبۂ بہار و اڑیسہ کے چیف سکریٹری سے خط و کتابت کی کہ حکومت کو ان کی حیثیت اور اخراجات کے مطابق الاؤنس کی رقم مقرر کرنی چاہیے اس لیے کہ انہیں بغیر تحقیقات اور مقدمہ کے نظر بند کیا گیا ہے۔ حکومت اس کے لیے تیار نہیں ہوئی اور مولانا نے حکومت کا مقرر کردہ الاؤنس لینے سے انکار کر دیا[1] اور توکل علی اللہ کے سہارے اپنے صاحب عزیمت اسلاف کی طرح کمال صبر و استقامت سے سخت حالات کا مقابلہ کیا اور کسی کی مالی اعانت کا رہین منت ہونا پسند نہ کیا۔

رانچی میں مولانا آزاد نے ایک مدرسہ کی بنا ڈالی اور اشاعت اسلام کے لیے مقامی مسلمانوں کی ایک تنظیم انجمن اسلامیہ کے نام سے قائم کی۔ انجمن کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہاں کے مسلمانوں میں بدیسی حکومت کے خلاف جہاد کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔ اپنی جمعہ کی تقریروں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کی تشریح و تفسیر کے ساتھ وہ اس بات پر ہمیشہ زور دیتے تھے کہ اسلام مسلمانوں سے مکمل اطاعت الٰہی کا طالب ہے اور دنیوی حکمرانوں کی مطلق فرمانروائی کے ہر تصور کو یکسر رد کرتا ہے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے رانچی میں مولانا آزاد سے ملاقات کی اور مولانا دریابادی کو اپنے تاثر سے مطلع کیا:

---

[1] جمشید قمر، مولانا ابوالکلام آزاد کا قیام رانچی۔ احوال و آثار، مولانا آزاد سنٹرل سرکل، رانچی، ۱۹۹۴ء، صفحات ۱۳- ۲۱۱ اور صفحہ ۹۴

مکرم السلام علیکم

"یکم اپریل ۱۹۱۹ء والا نامہ ملا، میں پورا ایک عشرہ اپنے مرکز سے غائب رہا، رانچی پہونچا، تین برس کے بعد ابو الکلام کی زیارت ہوئی، بڑے تپاک سے ملے، بڑی مسرت ظاہر کی، خوب خوب صحبتیں رہیں۔ وہ بھی تطبیق معقول و منقول کے دیرینہ ذائقے سے گھبرا گئے ہیں۔ آج کل ابن تیمیہ اور ابن قیم کا رنگ غالب ہے۔ فقہ و فقہائ میں ہر چیز میں ٹھیک ظاہریت مسلک ہے۔ رانچی کی شوروسنگستانی زمین انکے سحر زبان اور جادوئے بیان سے پانی ہوگئی ہے، وہ بھی میٹھا، مدرسہ کی عمارت چھوٹی لیکن خوبصورت اور شاندار بنی ہے، لوگ بہت مانتے ہیں۔"[1]

بہار، بنگال کا پڑوسی صوبہ تھا اور کلکتے میں بہار کے علماء اور دانشوروں سے رابطہ قائم کرنے کے بڑے مواقع تھے، اسی لیے بہار پر تحریکِ الہلال کا گہرا اثر پڑا تھا۔ بعد میں مولانا جب رانچی میں تھے، مولانا محمد سجاد سے ان کا تعلق قائم ہوا۔ مولانا آزاد نے ان کی ہمت افزائی کی اور انہیں آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی اصلاح تحریک اور دینی ضرورتوں کی کاربراری کے لیے ایک جماعت کی حیثیت سے علماء کو منظم کریں۔[2]

دسمبر ۱۹۱۹ء کی آخری تاریخوں میں مولانا آزاد کو نظربندی کی قید سے رہائی ملی اور ۱۳ جنوری ۱۹۲۰ء کو جب وہ کلکتہ پہونچے تو انھوں نے ملک میں سیاسی بیداری کی ایک ایسی فضا دیکھی جس کا پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ گاندھی جی سے ابھی تک کبھی ان کی

---

[1] عبد الماجد دریابادی، مکتوبات سلیمانی، جلد اول، لکھنؤ، ۱۹۶۳، صفحات ۱۱۵-۱۱۶۔

[2] مسعود عالم ندوی، محاسن سجاد، پٹنہ ۱۹۴۱ء صفحات ۷-۳۸، نیز دیکھیے ابو الکلام آزاد، خطبات آزاد، صفحہ ۱۳۷۔

ملاقات نہیں ہوئی تھی، گاندھی جی نے جو ان کے والد مولانا خیرالدین سے اپنے قیام افریقہ ہی کے زمانے سے واقف تھے، چاہا تھا کہ رانچی پہونچ کر ان سے ملیں، لیکن گورنمنٹ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بہر حال مولانا نے پہلے ہی سے ایک اسکیم اور لائحہ عمل سوچ رکھا تھا کہ جب وہ نظربندی کی قید سے آزاد ہوں گے تو اس پر عمل کریں گے لیکن جنگِ عظیم کے بعد کے سیاسی حالات اور تحریک خلافت کی ہماہمی کا سیلاب انہیں اپنے ساتھ بہا لے گیا۔

ہفتہ وار اخبار پیغام (جلد ۱، نمبر ۱، ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء، صفحہ ۲) کے افتتاحیہ میں مولانا آزاد نے لکھا تھا:

"جنوری ۱۹۲۰ء میں جب میں نظربندی کے گوشۂ قید و بند سے نکلا تو دو سال پیشتر کا یہ نقشۂ عمل میرے سامنے تھا اور اس لیے نہ تو مجھے واقعات کی رفتار کا انتظار تھا، نہ مزید غور و فکر کا، بلکہ صرف شغل و عمل شروع کر دینا تھا۔ میں نے آئندہ کے لیے جن امور کا ارادہ کیا تھا ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ رانچی سے نکلتے ہی کسی گوشۂ عزلت میں ایک معتقد طالبین کی ایک جماعت لے کر بیٹھ رہوں گا اور اپنی زبان و قلم کی خدمات میں مشغول ہو جاؤں گا۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ جو جماعتی اعمال پیشِ نظر تھے ان کے لیے بھی سیر و گردش اور نقل و حرکت کی ضرورت نہ تھی۔ قیام و استقرار ہی مطلوب تھا۔"

مولانا آزاد کا یہ منصوبہ شرمندۂ عمل نہ ہو سکا پھر بھی تحریک خلافت کی تیز رفتاری کے ساتھ نظم جماعت کے سلسلے میں ان کی کوششیں جاری رہیں اور گو عارضی طور پر ہی سہی ان کے کچھ حوصلہ افزا نتیجے بھی نکلے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۲۰ء کو انھوں نے عبدالرزاق

ملیح آبادی کو لکھا:

"گزشتہ ماہ کے اواخر میں بمبئی گیا تھا تاکہ تمام معاملات ایک قطعی اور مختتم صورت اختیار کرلیں... بحمد اللہ معاملۂ تنظیم و جماعت من کل الوجوہ اتمام کو پہنچا، جزئیات و تفصیلات بھی طے پاگئیں۔ اب بجز توسیع دائرۂ عمل کے کوئی مرحلہ باقی نہیں ہے اور وہ توفیق الٰہی پر موقوف ہے۔

"حسرت صاحب سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ رائے و فکر کے آدمی نہیں ہیں، ان کا اصلی جوہر استقامت عمل ہے، پس ان امور میں ان کی رائے پر اعتماد بے سود ہوگا...

"آپ نے لکھنؤ کے جو حالات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر سخت قلق ہوا۔ افسوس بہتر سے بہتر نیکی کو بھی یہ لوگ بلا آمیزش بدی کے انجام نہیں دے سکتے۔ ان لوگوں میں ایک شخص بھی نہیں جو اس مسئلے کی اہمیت و حقیقت اور منصب ریاست کے فرائض و مہمات اور پھر موجودہ حالات کی بنا پر مشکلات و صعوبات راہ کا نکتہ شناس ہو۔ مع ہذا، اگر یہ لوگ اصول کو تسلیم کرلیں اور کسی نہ کسی شخص کو متفقہ طور پر منتخب کرلیں تو بہر حال موجودہ طوائف الملوکی سے تو بہتر ہوگا۔ بہر حال ہمارا دائرۂ عمل منظم ہوچکا ہے، پنجاب، سندھ، بنگال بالکل متفق و متحد ہے اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہوگیا ہے۔ ان لوگوں کے فیصلے کا انتظار بے سود تھا اور بے سود ہے...."[1]

اس سے قبل بنگال خلافت کانفرنس (منعقدہ ۲۸، ۲۹ فروری سنہ ۱۹۲۰ء) میں

[1] عبدالرزاق ملیح آبادی، ذکر آزاد، کلکتہ، ۱۹۶۰ء، صفحات ۳۰-۳۹۔

اپنے خطبۂ صدارت میں مولانا آزاد نے ایک امام کی قیادت میں نظم جماعت کے قیام کی فوری ضرورت و اہمیت پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی تھی۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ وہ اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آ جائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔ 'جماعتی زندگی کی معصیت' سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک جماعت بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔[1] اتحاد و یکجہتی کی برکتوں کا احساس دلاتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ کانفرنسوں اور کمیٹیوں کی اجتماعی نمائشیں شریعت کی نظروں میں 'بھیڑ' اور 'انبوہ' کا حکم رکھتی ہیں، 'جماعت' کا حکم نہیں رکھتیں۔ 'بھیڑ' اور 'جماعت' میں فرق ہے۔ پہلی چیز بازاروں میں نظر آ جاتی ہے جب کوئی تماشہ ہو رہا ہو، دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جا سکتی ہے کہ جب ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں... ایک ہی کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔[2] نظم جماعت اور نظام شرعی کو اختیار کرنے کے لیے مسلمانوں کو جلد از جلد کسی صاحب نظر و اجتہاد کی امامت و اطاعت پر متفق و متحد ہو جانے کی دعوت دیتے ہوئے مولانا نے اپنے خاص اسلوب میں فرمایا کہ اگر ایسا نہیں ہے تو ایک بھیڑ ہے... جانوروں کا ایک جنگل ہے، کنکر پتھر کا ایک ڈھیر ہے، مگر نہ تو 'جماعت' ہے نہ 'امت' نہ 'قوم' نہ 'اجتماع'۔ اینٹیں ہیں مگر دیوار نہیں، کنکر ہیں مگر پہاڑ نہیں، قطرے ہیں مگر دریا نہیں، کڑیاں ہیں جو ٹکڑے ٹکڑے کر دی جا سکتی ہیں، مگر زنجیر نہیں ہے جو بڑے بڑے جہازوں کو گرفتار

---

[1] ابوالکلام آزاد، مسئلہ خلافت و جزیرۂ عرب، البلاغ پریس کلکتہ، اکتوبر ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۰۶
[2] ایضاً۔

کرلے سکتی ہے"[1]

کانفرنس نے مولانا آزاد کی ایک امام (امام الہند) کے فوری انتخاب کی تجویز پر کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا، لیکن اس عدم توجہی سے وہ دل برداشتہ نہیں ہوئے' انھوں نے اپنا کام جاری رکھا اور جیسا کہ ابھی کہا گیا انہیں پنجاب' سندھ' صوبہ آگرہ واودھ' بنگال اور بہار میں ایسے ذمہ دار افراد مل گئے (ان میں سے کچھ نے انکے ہاتھ پر بیعت بھی کی) جنھوں نے اسلام کے کاز کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دینے کا عہد کیا۔[2]

عبدالرزاق ملیح آبادی فروری ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتہ میں مولانا آزاد کے مشن سے واقف ہوئے اور مولانا کے ہاتھ پر نہ صرف بیعت کی بلکہ ان کی طرف سے یو۔ پی کے مسلمانوں میں کام کرنے اور جو لوگ ان کے مشن میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوں' ان سے خلیفۂ مجاز کی حیثیت سے بیعت لینے کے لیے مقرر ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد سے ان کی ملاقات ہوئی اور فوراً ہی انہیں مولانا کا اعتماد حاصل ہوگیا، مولانا نے ملیح آبادی صاحب کو اپنی اسکیم سمجھائی کہ ملک کی آزادی کے لیے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ مولانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے متحد و منظم کیا جائے'

---

[1] ایضاً، صفحہ ۷۰۔ [2] ابوسلمان شاہجہانپوری کی کتاب 'تحریک نظم جماعت' (دہلی ۱۹۸۸ء) میں مسلمانوں کی تنظیم اور انکے ملّی استحکام کے سلسلے میں مولانا آزاد کی کوششوں کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ کتاب میں کچھ لوگوں کے نام بھی دیے گئے ہیں جنھوں نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ یہ سب لوگ مخلص ضرور تھے، لیکن کسی لحاظ سے صفِ اول کے اور قائدانہ صلاحیت کے حامل نہیں کہے جا سکتے تھے

انہیں اس پر آمادہ کیا جائے کہ ان کا ایک امام ہو اور وہ امام کی اطاعت کو ایک مذہبی فریضہ سمجھیں۔ انہیں یقین تھا کہ مسلمان اس تجویز پر عمل کے لیے آمادہ ہو جائیں گے، اگر ان پر قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ واضح کر دیا جائے کہ بغیر امام کے ان کی زندگی غیر اسلامی زندگی ہے اور ان کی موت 'جاہلیت' کی موت ہوگی۔ جب مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد امام کو [illegible] لے گی تو پھر امام ہندوؤں سے معاہدہ کر کے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دے گا۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ طاقت انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دے گی۔" مگر امام کون ہو؟ اس منصب کے لیے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چننا ہوگا، ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھ نہ بک سکے۔ ساتھ ہی امام کو ہوشمند اور حالات زمانہ سے کما حقہ، واقف ہونا چاہیے۔[1]

یہاں اس بات کا ذکر ضروری اور اہم ہے کہ ملیح آبادی اور دوسرے صوبوں میں مولانا کے خلفاء جو بیعت لیتے تھے، وہ 'بیعت جہاد' تھی، نہ کہ وہ بیعت جس سے لوگ عام طور پر تصوف اور صوفی سلسلوں کے تعلق سے واقف ہیں۔ ذکر آزاد میں ملیح آبادی

---

[1] ذکر آزاد، صفحات ۲۴-۲۳۔ مولانا آزاد نے منصب امامت کے خصائص و شرائط ایک اور مقام پر اس طرح بیان کیے تھے "ایک صاحب نظر و اجتہاد دماغ کی ضرورت ہے جس کا قلب کتاب و سنت کے معارف و غوامض سے معمور ہو، وہ اصول شرعیہ کو مسلمانان ہند کی موجودہ حالت پر، ان کے وطن ہند کو حدیث العہد نوعیت پر، ایک ایک لمحے کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادث جنگ و صلح پر ٹھیک ٹھیک منطبق کرنے اور پھر تمام مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فتوے صادر کرتا رہے" دیکھیے ماہنامہ برہان، جلد ۶۵، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۷۰ء، صفحات ۵۹-۱۵۸۔

نے بیعت کا متن بھی دیا ہے۔[1]

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جون ۱۹۲۰ء میں نظر بندی کی مدت گزار کر مالٹا سے ہندوستان آئے۔ ان کی صحت نہایت کمزور تھی، اس کے باوجود انھوں نے ملک کی سیاسی صورت حال کے تقاضوں کا مثبت جواب دیا۔ لیکن جب ان سے مسلمانوں کی امامت کا عہدہ قبول کرنے کی درخواست کی گئی تو انھوں نے کمال انکساری سے اس اعزاز سے معذرت کر دی، دیوبند کے بعض علما کی خواہش تھی کہ وہ اس عہدے کو منظور کر لیں اور انھوں نے اس کے لیے مخلصانہ کوشش بھی کی، لیکن شیخ الہند اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ جب ان سے مولانا آزاد کے متعلق استفسار کیا گیا تو رضامندی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ یقیناً اس عہدہ کے اہل ہیں۔ شیخ الہندؒ فرنگی محل کے مولانا عبدالباریؒ[2] کے امام الہند بنائے جانے کی تجویز سے متفق نہ تھے۔ ان کی رائے میں اگرچہ مولانا عبدالباری بہت سی خوبیوں کے حامل تھے اور ایک بڑے عالم کی حیثیت سے مسلمانوں میں ان کو بڑا احترام، وقار اور اعتبار حاصل تھا، لیکن امامت کے عہدے کے لیے وہ موزوں نہ تھے کہ اس کے لیے کچھ مزید اور مختلف خصوصیات کے حامل فرد کی ضرورت تھی۔[3]

عہدۂ امامت کے لیے مولانا آزاد کے بارے میں مولانا عبدالباری کا ردعمل گول مول اور ٹال مٹول والا تھا۔ ملیح آبادی جب ان سے ملے اور اس موضوع پر انہیں شیخ الہند کی رائے بتائی تو انھوں نے پہلے شیخ الاسلام/امام کے عہدے پر تقرر کے

---

[1] ذکر آزاد، صفحات ۲۵-۲۴ [2] مولانا عبدالباریؒ جمعیۃ العلماء ہند کے پہلے صدر تھے
[3] ذکر آزاد، صفحات ۳۶-۳۵۔

سلسلے میں بعض لوگوں کے اس خیال کا تذکرہ کیا کہ انہیں خود یہ عہدہ قبول کر لینا چاہیے اور پھر ایسا ظاہر کیا کہ انہیں شیخ الہند کی رائے سے اتفاق ہے۔ ملیح آبادی اس گفتگو سے مطمئن نہیں ہوئے اور انھوں نے مولانا عبدالباری سے عرض کیا کہ وہ اپنا خیال قلم بند فرما دیں۔ مولانا نے لکھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً مُصَلّیاً وَّ مُسلِماً، مکرمی دام مجدہٗ السلام علیکم

مسئلہ امامت یا شیخ الاسلامی کے متعلق مجھے جمہور کی موافقت کے سوائے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ جو اندیشہ ہے وہ بار بار اہل الرائے سے ظاہر کر چکا ہوں، باوجود اس کے پھر بھی مسلمانوں کی تجویز کو بسر و چشم قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ خود مجھ سے بارہا اس منصب کے قبول کرنے کی بعض اہل الرائے نے خواہش کی مگر میں نے اپنی عدم اہلیت کے باعث اس امانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا، نہ آیندہ قبول کرنے کا ارادہ ہے۔ مولانا محمود حسن صاحب سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بار کے متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اسبق و آمادہ ہیں۔ ان کی امامت سے بھی مجھے استنکاف نہیں ہے، بسر و چشم قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں بشرطیکہ تفریق جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں، اگر کسی نا اہل کو تمام یا اکثر اہل اسلام قبول کر لیں گے تو مجھے وہ لوگ سب سے زیادہ اطاعت گزار و فرمانبردار پائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ میں یہ تحریک دیا تھا اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا، نہ کسی کو منتخب کرکے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی

جماعت کا تابع ہوں۔ اس سے زائد مجھے اس تحریک سے تعرض نہیں ہے۔

والسلام بندہ فقیر محمد عبدالباری[1]

مولانا آزاد اس نے جب مولانا عبدالباری کی یہ تحریر دیکھی تو وہ خاصے بد حظ ہوئے اور یہ لکھا:

"یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

سردست اس قصے کو تہ کیجئے اور کام کئے جائیے۔ پنجاب، سندھ، بنگال میں تنظیم مکمل ہے۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء"[2]

ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ یکایک ایسا محسوس ہوا کہ مولانا کے نزدیک امامت کا مسئلہ اب پہلے جیسی اہمیت کا حامل نہیں رہا، مولانا نے انہیں کبھی اس کی وجہ نہیں بتائی[3]۔ یہ سب باتیں ستمبر ۱۹۲۰ء کے اواخر کی ہیں۔ اس کے بعد خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں میں وہ اور زیادہ مصروف ہو گئے، اور کلکتہ اور رانچی کے مدرسوں کے انتظام میں بھی ان کا کچھ وقت صرف ہونے لگا[4]۔

علماء کے مختلف حلقوں کے مابین اختلاف کے سبب مولانا آزاد کی یہ آرزو کہ وہ امام کی حیثیت سے مسلمانوں کی قیادت کا مشکل اور اہم کام انجام دیں[5]، پوری

---

[1] ذکر آزاد، صفحہ ۳۸ [2] ایضاً [3] ایضاً ص۲ [4] ایضاً، صفحات ۶۳-۶۴، نیز دیکھیے مولانا آزاد کا خط عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۰ء، (مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ ابو سلمان شاہجہاں پوری، اردو اکادمی سندھ، کراچی ۱۹۶۸ء صفحات ۱۳-۱۱۱) [5] برہان (دہلی)، جلد ۶۵، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۷۰ء صفحات ۱۶۹-۱۷۲۔

نہ ہو سکی، لیکن علماء کے مختلف مکتبۂ خیال کی نمایندہ جماعت جمعیۃ العلماء ہند کے منتخب کیے ہوئے ایک امیر ہند کی رہنمائی میں کل ہند پیمانے پر امارت شرعیہ کے قیام کی ضرورت پر وہ مسلسل زور دیتے رہے مگر علماء یہاں بھی اپنے گروہی تعصبات پر قابو نہ پا سکے اور وہ اس عہدہ کے لیے ایک ایسے موزوں شخص کی تلاش میں ناکام رہے جس پر سب کا اتفاق ہو۔

امارت شرعیہ کا تخیل کوئی نیا نہیں تھا، دراصل مولانا آزاد کی نظم جماعت کی اسکیم میں اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا محمد سجاد بہاری جو مولانا آزاد سے پہلے ہی رانچی میں مل چکے تھے، ان کے اس خیال سے کہ ہر ضلع میں ایک امیر کے تحت شرعی عدالتیں قائم ہوں، پورے طور پر متفق تھے۔ اضلاع کی یہ شرعی عدالتیں صوبائی امیروں کے کنٹرول میں ہوں اور پھر مرکز میں ایک امیر ہو جو علماء کی مشاورتی کونسل کی مدد سے صوبوں کے امیروں کی رہنمائی اور ان کے کام کی نگرانی کا ذمہ دار ہو۔ اس اسکیم کے بلند اور انقلابی مقاصد کو افسوس ہے کہ مسلمان سمجھ نہ سکے، ان کے رہنماؤں اور خاص طور پر ان کے علماء نے گروہی طمع نظرات، ذاتی مفادات اور انانیت امیال کا صید زبوں بن جانا اور وقت کے اس ایک نادر موقع سے جب وہ مضبوط بنیاد پر نظم جماعت کا ایک مستحکم نظام قائم کر سکتے تھے، محروم ہو جانا گوارا کر لیا۔

---

[1] برہان (حوالہ سابق فٹ نوٹ حاشیہ)، تقریباً اسی زمانے میں بدایوں (یوپی) میں جو ایک خاص خیال کا مرکز تھا، نظام شیخ الاسلامی کے قیام کی ایک الگ تحریک چلانے کی آواز اٹھائی گئی اور کانپور اور لکھنؤ کے ہم خیال علماء کی جانب سے اس آواز کی پرجوش تائید کی گئی۔

مولانا آزاد نے جب یہ محسوس کیا کہ کل ہند پیمانے پر امارت شرعیہ کے قیام میں بڑی دشواریاں ہیں تو انھوں نے مولانا سجاد سے کہا کہ وہ بہار میں جہاں علمار کی ایک بڑی تعداد میں اتحاد فکر و عمل تھا اور جہاں ان کا اثر بھی نسبتاً زیادہ تھا، امارت شرعیہ کے تصور کو عملی شکل دینے کے لیے اقدام کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا محمد سجاد مرحوم کی انتھک کوششوں سے جن کے پیچھے ان کے خلوص و جاں سوزی کی ایک قوت تھی، جمعیۃ العلمار بہار میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی اور جب ۲۶-۲۵ جون ۱۹۲۱ء کو پٹنہ میں مولانا آزاد کی صدارت میں اس صوبائی جمعیۃ کی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں صوبائی امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا۔[1] جس کے صدر پھلواری شریف کے مولانا شاہ بدرالدین منتخب ہوئے اور مولانا محمد سجاد صاحب کو انکا نائب یعنی نائب امیر شریعت مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا کہ صوبۂ بہار اور اڑیسہ کے علماء کا یہ اقدام کہ امارت شرعیہ کو قائم کرکے اس علاقے کے مسلمانوں کی تنظیم و اصلاح کا کام شروع کریں نہایت مستحسن اور خوش آیند ہے۔ لیکن یہ جان لینا چاہیے کہ ہمارا اصل مسئلہ یقین محکم اور مضبوط ارادوں کے ایسے افراد کو پیدا کرنا ہے جو موجودہ صورتحال کو بدل دینے کی جدوجہد میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں۔ ایسے افراد کے بغیر ہر منصوبہ خواہ وہ کتنا ہی مہتم بالشان کیوں نہ ہو، آخر میں چل کر ناکامی ہی پر منتج ہوتا ہے۔[2]

کئی لحاظ سے مذکورہ پٹنہ کانفرنس سے متعلق حکومت ہند کی انٹیلیجنس رپورٹ

---

[1] ابوالکلام آزاد، خطبات آزاد، صفحہ ۱۳۰ [2] پٹنہ کانفرنس کی مفصل روداد کے لیے دیکھیے شان محمد کی ترتیب دی ہوئی کتاب "دی انڈین مسلمز"، صفحات ۲۷۸، ۲۸۰، ۲۸۱، جلد ۷، شائع کردہ میناکشی پرکاشن میرٹھ ۱۹۹۳ء۔

دلچسپ تھی۔ اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

"... کانفرنس میں جو خاص بات طے ہوئی وہ یہ تھی (۱) بہار اور اڑیسہ کے تمام اضلاع میں "دارالقضا عدالتیں" قائم کی جائیں (۲) ہر ضلع کا ایک امیر ہو (۳) ایک امیر شریعت یا صوبائی لیڈر منتخب کیا جائے۔

"خیال ہے کہ اس پوری اسکیم کے مصنف ابوالکلام آزاد ہیں اور اس بات کی تائید میں شہادتیں ہیں کہ انھیں یہ امید ہے کہ اسی طرح کی تنظیم ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی قائم ہو جائے گی اور پھر انھیں شیخ الہند (امیرالہند) کے ممتاز عہدے کے لیے منتخب کر لیا جائے گا۔

"... مولانا عبدالباری اور علی برادران اس کے مخالف تھے، اس لیے کہ وہ مولانا آزاد کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے ان سے غالباً رشک و حسد کرتے تھے اور مولانا عبدالباری نے تو پریس کو ایک خط بھی لکھ دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر مولانا اپنی اسکیم پر عمل کرانا چاہتے ہیں تو انھیں ہجرت کرنی اور ہندوستانی شدت پسند متعصبین کی چمرخند پارٹی میں شامل ہو جانا چاہیے۔[1]"

---

[1] حکومت کی انٹیلیجنس رپورٹ پر مکمل اعتماد خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن اگر مولانا نے واقعی یہ خط لکھا تو یقیناً اس میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سرحدی علاقوں میں "وہابی" مجاہدین کے مرکزوں سے مولانا آزاد کا رابطہ قائم تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا عبدالباری "وہابیوں" کے سخت مخالف تھے اور اسے بھی نہ بھولنا چاہیے کہ ۱۹۲۰-۲۱ء تک مولانا آزاد ہندوستان کی انگریزی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت ہی کے قائل تھے۔ یہ تو رفتہ رفتہ بعد میں ان کے طرز فکر میں تبدیلی آئی اور انھوں نے ہندوستان جیسے ملکوں کی تحریکات آزادی (بقیہ حاشیہ

"چند مہینے بعد جمعیۃ العلماء کی ایک میٹنگ میں یہ طے کیا گیا کہ امیر افغانستان اور انگورہ گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ وہ امیر ہند کے عہدہ کے لیے ایسے افراد کو نامزد کردیں جن کے ناموں کی منظوری ان سے مل گئی ہو، جبکہ ایک دوسری تجویز یہ بھی تھی کہ سردست صرف صوبائی امیروں کا تقرر ہو اور امیر الہند کا عہدہ خالی رکھا جائے۔"[1]

جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس لاہور (نومبر ۱۹۲۱ء) میں مولانا آزاد کے خطبۂ صدارت کا پہلے ہی حوالہ دیا جا چکا ہے۔ اس خطبہ کے ذریعہ انھوں نے ایک بار پھر علماء کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ "میں کامل بارہ سال کے مسلسل غور و فکر کے بعد علی وجہ البصیرۃ اس نتیجہ پر پہونچا ہوں" کہ نظم جماعت اور قیام امارت شرعیہ مسلمانوں کے لیے وقت کی سب سے اہم پکار ہے، انھوں نے "تحدیث نعمت" کے طور پر "دعوت الہلال" کا تذکرہ کیا اور حضرات علماء کو یاد دلایا کہ "آج آپ کی یہ مقدس و مبارک جمعیۃ العلماء جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے... تو یہ وہی مقصود ہے جس کے فراق میں، میں ۱۹۱۱ء[2] سے مسلسل "وااسفا علی یوسف" کی فغاں سنجی کر رہا ہوں اور جس کے لیے میں نے الہلال مرحوم کے صفحوں کو کبھی اپنے چشم خونیں کے آنسوؤں سے رنگا ہے اور کبھی اس کے سواد حروف کے اندر اپنے

(باقی حاشیہ ص ۱۰۲) میں عدم تشدد کی پالیسی کی افادیت کو تسلیم کیا، لیکن انھوں نے گاندھی جی کی طرح عدم تشدد کے نظریے کو عقیدے کے طور پر کبھی نہیں مانا۔ [1] ہمفری ٹ بسٹر، دی آف خلافت اینڈ نون کوآپریشن موومنٹس، دہلی ۱۹۸۵ء صفحات ۷۶-۱۶۸ [2] یہاں مولانا کی مراد غالباً ۱۹۱۲ء سے ہے جو الہلال کے اجراء کا سال ہے۔

دل وجگر کے ٹکڑے بچھا دیے ہیں۔ ۱۹۱۱ء سے لے کر آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلوب اور میری روح کے عشق وشیفتگی کا محبوب رہا ہے . . . میں نے اپنی آزادی کی تمام فرصت اسی کے عشق میں بسر کی اور نظر بندی وقید کے چار سال بھی اسی کے فراق میں کاٹے . . .[1] انھوں نے کہا کہ ہندوستان بہرحال آزاد ہوکر رہے گا، مسلمانوں اور بالخصوص علماء کا فرض ہے کہ وہ راہ کی مشکلوں اور آزمائشوں سے نہ گھبرائیں اور آگے بڑھ کر فرائض شرعیہ کی تنظیم کے ساتھ آزادی ملک وملت کا گوہر مقصود حاصل کریں۔ اس اجلاس میں امارت شرعیہ فی الہند کے قیام کی تجویز منظور کی گئی اور علماء نے مولانا کے اس خیال سے پورا اتفاق کیا کہ ایک مستحکم نظم جماعت کے لیے جدوجہد ادائے فرض ملت ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں مولانا آزاد کی پُرجوش اور دردبھری ساری اپیلیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں اور علماء شریعت ادائے فرائض شرعیہ کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کی حیات اجتماعی کے کسی نظم کو قائم نہ کر سکے۔ اگر آج سے ستر بہتر سال پہلے جبکہ ہمارے نزدیک آج کے مقابلہ میں اس طرح کی تنظیم کا کام نسبتاً آسان تھا، یہ کام ہوگیا ہوتا تو آج آزاد اور جمہوری ہندوستان میں (اگرچہ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے) مسلمان اپنی مذہبی وثقافتی شناخت کے لیے اندیشہ ہائے دور ودراز میں مبتلا نہ ہوتے اور انہیں ایک مسلسل جدوجہد نہ کرنی پڑتی۔

بعض لوگوں نے مولانا آزاد کے امام کے تقرر کے لیے بار بار کے اصرار کی بنا پر ان کی نیت پر شبہ کیا ہے اور بڑے آڑے ترچھے جملے لکھے ہیں۔ اس کی وجہ بظاہر

---

[1] ابوالکلام آزاد، خطبات آزاد، صفحات ۱۱۲-۱۱۵۔

یہی معلوم ہوتی ہے کہ ایسے حضرات کے ذہنی افق پر داخلیت کی دھند چھاگئی اور وہ مسئلہ کو اس کے صحیح تناظر میں نہ دیکھ سکے۔ مولانا پر خاص الزام یہ رہا ہے کہ عہدۂ امامت کے سلسلے میں وہ خاصے حریص اور اپنے آپ کو امام منتخب کرانے کے سخت آرزومند تھے۔

مولانا نے برسوں ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری کے لیے زبان و قلم سے جدوجہد کی تھی اور اس راہ میں قید و نظربندی کی سختیاں بھی جھیلی تھیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں میں وقت کے فکری، تہذیبی اور سیاسی چیلنجوں کا خود اعتمادی اور ہمت سے مقابلہ کرنے کے احساس و جذبے کو قوی و فعال بنانے میں ان کی مسلسل کوششوں کا بہت دخل تھا۔ اب اگر وہ چاہتے تھے کہ اپنی کوششوں کے نتائج کو نظم جماعت کی کسی شکل میں، بشمول امارت شرعیہ جو نظم جماعت کا ایک اہم جزو تھا، منظم اور مستحکم کر دیں تو اس میں کیا قباحت تھی؟ کیا ہم ان کی اس خواہش کو کسی بے جا اور بے محل حوصلہ مندی سے تعبیر کریں گے؟ کیا ملت کے لیے ان کے سارے کام اور ان کی شب و روز کی بیتابیوں کو ہم امتیاز و منصب کے لیے ان کی حرص و طمع پر محمول کریں گے؟ کیا وقت کے مدارس کے سند یافتہ علماء کی جماعت کی قیادت کے لیے جس علمی صلاحیت کی ضرورت تھی وہ ان میں نہ تھی؟ مدارس میں جن دینی اور سیکولر علوم کی تعلیم ہوتی تھی (اور ہے) ان سب میں ان کی فضیلت کا مشکل ہی سے کوئی انکار کرسکتا تھا۔ شیخ الہند کی رائے میں تو مولانا میں وہ تمام اہلیتیں تھیں جو امام کے عہدے کے لیے ضروری اور مطلوب تھیں۔ وہ انھیں ملت اسلامیۂ ہند کا واحد لیڈر ماننے کے لیے آمادہ بھی تھے۔ اس سلسلہ میں شیخ الہند کے لیے خود مولانا کی پسند و ترجیح معلوم و مشہور ہے۔ وہ تو یہ بھی کہتے تھے کہ اگر شیخ الہند کسی وجہ سے

تیار نہیں ہیں تو "موجودہ طوائف الملوکی" سے بچنے کے لیے کسی کو بھی متفقہ طور پر امام منتخب کر لیا جائے۔[۱] مالٹا سے واپسی کے بعد کوئی چھ مہینے کے اندر شیخ الہند کا انتقال ہو گیا، اسکے بعد علماء کسی بھی عالم کو اپنا امام مقرر کر سکتے تھے، لیکن وہ یہ نہ کر سکے، شاید :

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی

آخر کیا وجہ تھی کہ وقت کے ایک عظیم اور اہم اسلامی نصب العین کی خاطر علماء امام الہند/امیر الہند کے عہدے پر مولانا آزاد کے تقرر کے لیے رضامند نہ ہو سکے! اور ان میں سے بعض حضرات نے تو کھل کر انکی مخالفت کی۔[۲]

مذکورہ بالا سوالات سے متعلق ہمارے نزدیک درج ذیل نکات ایسے ہیں کہ ان پر غور کیا جائے :

۱۔ مولانا آزاد عہد وسطیٰ کی ذہنیت اور طرز فکر (میڈیولزم medievalism) کے باغی تھے۔ عنفوان شباب ہی میں ان پر سلفیہ تحریک کا اثر پڑ چکا تھا۔ انھوں نے تقلید کے خلاف مسلسل لکھا تھا اور طبقۂ علماء کے قدیم طرز فکر پر جو عہد وسطیٰ کا پروردہ تھا، سخت تنقیدیں کی تھیں ـــــ اسلیے علماء کے مختلف الخیال گروپ جو تقلید سے متعلق عہد وسطیٰ کے طرز فکر کی بے لچک تائید کے حق میں تقریباً متحد اور متفق تھے کیونکر عہدۂ امامت کے لیے مولانا آزاد کی تائید کر سکتے تھے۔

۲۔ مولانا آزاد نے تصوف کی موجودہ شکل کو جو اپنی مبتدعانہ رسم و روش کے ساتھ تصور احسان کی جس کی نشاندہی قرآن و حدیث میں کی گئی ہے، علیحدہ کر گئے

۱؎ ذکر آزاد، صفحہ ۳۰۹۔ ۲؎ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جمعیۃ العلماء ہند کے ۱۹۲۱ء کے اجلاس لا
کے زمانے سے بے ضابطہ طور پر انکے نام کے ساتھ امام الہند کا لقب لکھا جانے لگا۔

تھی، تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا تھا (دلچسپ بات یہ ہے کہ معاصر "تصوف" خود بھی نظری طور پر "احسان کو اپنی بنیاد قرار دیتا ہے) ــــ پھر کیسے علماء جو کسی نہ کسی صوفی سلسلے سے وابستہ تھے، اس پر تیار ہو سکتے تھے کہ مولانا آزاد جیسے عالم کو اپنا امام بنا لیں؟

۳۔ عہد وسطیٰ کی صدیوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی و علمی دانشوری امام غزالیؒ کے مذہبی و علمی فکر و طرز فکر کی روایت سے وابستہ و پیوستہ رہی تھی جسے ہم اس راسخ العقیدگی سے تعبیر کرتے ہیں جو فکری سطح پر ایک عرصہ کی کشمکش کے بعد شریعت و طریقت کی باہمی مفاہمت کا نتیجہ تھی، اور جو صدیوں علمی و دینی حلقے میں مقلدانہ مذہبی عمل و رد عمل کا معیار تسلیم کی جاتی رہی۔ امام ابن تیمیہؒ رائج مذہبی فکر و عمل کے کئی پہلوؤں سے متعلق اپنے مجتہدانہ موقف کے ساتھ سامنے آئے تو ہندوستان میں ان کا اثر نہایت محدود رہا اور بعد میں جب انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں لوگ ان سے زیادہ متعارف ہوئے تو انکے بعض مجتہدانہ خیالات کو ہندوستانی "وہابیت" کا سرچشمہ قرار دیا گیا اور اسی لیے خانقاہوں نے جو حالات کے جمود میں کسی حرکت کی قائل نہ تھیں، انکے غیر روایتی خیالات کی سخت تردید اور پرزور مذمت کی۔ اس لیے اب جب کہ امام ابن تیمیہ کی شخصیت (امام غزالی کی نہیں) مولانا آزاد کے لیے دینی و روحانی فیوض کا منبع تھی، کس طرح علماء، جن کی بڑی تعداد "وہابیت" کی مخالف تھی، مولانا کو اپنا امام تسلیم کر سکتے تھے؟

۴۔ مولانا آزاد، ندامت اور انابت کے گہرے جذبے کے ساتھ اعتراف گناہ کر چکے تھے کہ عہد شباب کے ابتدائی ایام میں ان کا دامن معصیت سے آلودہ

رہ چکا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ تاثر عام ہوگیا تھا کہ ان کی زندگی ایک متقی اور دیندار مسلمان کی زندگی نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بات علماء کے نزدیک ایسی نہ تھی کہ وہ اس سے صرف نظر کرتے ہوئے مولانا آزاد کی امامت کے لیے تیار ہوجاتے۔ لیکن یہ خیال کچھ صحیح اور معقول نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ علماء سے زیادہ اور کون اس حقیقت سے زیادہ واقف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیر رحمت توبہ و ندامت کو پسند کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس گنہگار بندے سے بہت خوش اور راضی ہوتے ہیں جو اس کے پاس لوٹ کر آتا ہے۔[1] رہی یہ بات کہ کون کتنا دیندار اور متقی ہے تو حضرات علماء خود اسے مانتے ہیں کہ دلوں کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے، ہمیں یہ بات زیب نہیں دیتی کہ ہم کسی کی دینداری اور ریاکاری کی بابت کچھ کہیں۔ اِنَّہٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ؀

---

[1] صحیح مسلم، ج ۲، کتاب التوبہ، نولکشور پریس، لکھنؤ، ص ۳۵۵۔

مولانا ابوالجلال ندوی کی یاد میں

از ضیاء الدین اصلاحی

"مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم دار المصنفین کے بڑے فاضل رفقا میں تھے، انکا انتقال ۱۰ محرم ۱۴۰۵ھ کو ہوا تھا، یہ مضمون گزشتہ ماہ میں شایع کرنے کا خیال تھا مگر گنجایش نہ نکلنے کی بنا پر اب اسے دیا جارہا ہے۔" (ض)

مولانا ابوالجلال ندوی ایک متبحر عالم اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے دور کمال کی پیداوار تھے، ان کا تعلق اعظم گڈھ کی مردم خیز سرزمین سے تھا مگر اب ان کا گاؤں محی الدین پور ضلع مئو کی تحصیل گھوسی میں واقع ہے۔ ان کے گھرانے میں ان سے پہلے بھی علم و تعلیم کا رواج تھا، ان کے والد بزرگوار مولوی محمد ابراہیم صاحب کو مولانا عنایت رسول چریا کوٹی سے شرف تلمذ حاصل تھا، وہ عبرانی سے واقف تھے لیکن عدم ممارست کی وجہ سے بعد میں اسے بھول گئے تھے، ان کے بڑے بھائی مولوی ابوالحسنات مرحوم بھی باقاعدہ عالم تھے جن کی تعلیم مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں ہوئی تھی، مولانا ابوالجلال صاحب کی دونوں بہنیں بھی تعلیم یافتہ تھیں، ان کے ایک بھانجے محمود اعظم فاروقی پاکستان میں وزیر رہ چکے ہیں، مولانا کی تین صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادے بھی علم و تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں، صاحبزادے جنید صغیر صاحب کراچی یونیورسٹی کے کسی شعبے میں استاد ہیں۔

ماں کی طرف سے انکا سلسلۂ نسب مشاہیر چریا کوٹ سے ملتا ہے جن کے گل سرسبد

مولانا عنایت رسول اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد فاروق صاحب تھے، اول الذکر سے سرسید احمد خاں مرحوم نے عبرانی زبان سیکھی تھی اور موخر الذکر سے علامہ شبلیؒ نے معقولات وادبیاتِ فارسی کا درس لیا تھا۔

مولانا ابوالجلال صاحب کی پیدائش ۱۸۹۱ء میں اپنے ننہال چریاکوٹ میں ہوئی، انکے نانا شیخ محمود صاحب کا انتقال ان کی پیدائش سے قبل ہی ہوگیا تھا اور والدہ کا انتقال اس وقت ہوا جب ان کی عمر بارہ[۱۲]، تیرہ[۱۳] برس کی تھی، مولانا کی پرورش و پرداخت ان کی نانی صاحبہ نے کی تھی۔

ایک زمانے میں چریاکوٹ علمی حیثیت سے بہت ممتاز تھا، یہاں کے عباسی شیوخ کو مسلمانوں کے عہد حکومت میں قضا کی خدمت سپرد تھی، مولانا ابوالجلال صاحب کے بچپن تک چریاکوٹ کی علمی رونق قائم تھی، ان کی بسم اللہ مولانا عنایت رسول چریاکوٹی نے کرائی تھی، صرف و نحو کی کتابیں مولوی الیاس صاحب چریاکوٹی سے پڑھیں، اس کے بعد اپنے والد سے بھی تعلیم پائی۔

مولانا ابوالجلال صاحب کے والد کی خواہش تھی کہ وہ میٹرک پاس کرکے کوئی سرکاری ملازمت کرلیں تاکہ گزر بسر کا سامان ہوجائے اسی لیے انھوں نے گورکھپور کے ایک اسکول کے آٹھویں درجہ میں انکا داخلہ کرادیا، گورکھپور میں وہ مولوی محمد محسن عباسی مرحوم وکیل کے گھر پر رہتے تھے، ان کا وطن بھی چریاکوٹ ہی تھا مگر اسکول کی تعلیم میں مولانا کا جی نہ لگا اور وہ چند ماہ بعد ہی لکھنؤ چلے آئے، سردی کے موسم میں ایک شب جب مولوی محمد محسن صاحب کے گھر کے سب لوگ سارے دروازے بند کرکے سوگئے تو یہ چپکے سے اپنے کمرے سے نکل کر سڑک کی طرف واقع چھت پہ گئے اور پہلے اپنا

لحاف نیچے گرایا پھر خود چھت سے کود کر سیدھے ریلوے اسٹیشن گئے اور بلا ٹکٹ گاڑی پر بیٹھ کر لکھنؤ آگئے۔ یہاں کئی دنوں تک ادھر ادھر بھوکے پیاسے چکر کاٹتے رہے، بالآخر کسی طرح افتاں و خیزاں دارالعلوم ندوۃ العلماء پہنچے اور عربی تعلیم شروع کی۔[1]

ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے کے بعد ان کے والد نے چاہا کہ کسی اسکول میں عربی ٹیچر ہو جائیں اسی لیے الٰہ آباد بورڈ سے عالم کا امتحان دلایا جس کے بعد شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں مدرس ہو گئے، یہاں لکھنے پڑھنے کی ان کی اچھی صلاحیت اور محنت و مطالعہ کا ذوق دیکھ کر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے انہیں ۱۹۲۳ء میں دارالمصنفین کی رفاقت میں لے لیا۔

مولانا ابوالجلال مرحوم کو لسانیات (فیلالوجی) اور علم الاشتقاق سے بڑا شغف تھا اور وہ بڑی دلچسپی اور خاص توجہ سے زبانوں کا باہمی رشتہ و تعلق اور الفاظ کی وسعت اور شاخ در شاخ کو ثابت کرتے تھے، اس لیے دارالمصنفین میں انہیں یہی موضوع دیا گیا، لیکن ان کا ذوق کسی ایک فن تک محدود نہ تھا، بلکہ مختلف موضوعات سے انہیں دلچسپی تھی، چنانچہ لسانیات اور دوسرے موضوعات پر ان کے محققانہ مضامین شائع ہوئے تو اہلِ علم کی نظریں ان کی طرف اٹھنے لگیں اور ملک کے سنجیدہ علمی حلقوں میں ان کی شہرت ہو گئی۔ مختلف فنون سے متعلق بعض اہم کتابوں پر انھوں نے بڑی محنت، عرق ریزی اور دقتِ نظر سے جو ریویو لکھے ان کا علمی وزن بھی پوری طرح محسوس کیا گیا۔ معارف کے مستقل کالم اخبار علمیہ اور مطبوعات جدیدہ

---

[1] مولانا کے خاندانی حالات اور ابتدائی تعلیم کے متعلق معلومات انکے ایک انٹرویو سے لیے گئے ہیں جو ہفت روزہ "جسارت" کراچی میں انکے انتقال سے برس ڈیڑھ برس قبل شائع ہوا تھا۔

میں بھی ان کی تحریریں چھپتی رہیں۔

پانچ چھ برس دارالمصنفین میں رہنے کے بعد ۱۹۲۶ء کے اواخر میں وہ مدرسہ جمالیہ کے پرنسپل ہوکر مدراس چلے گئے، یہ مدرسہ ایک ساہوکار جمال محی الدین صاحب مرحوم نے قائم کیا تھا، ان کے بعد ان کے صاحبزادے جمال محمد صاحب نے اس میں مزید توسیع و اضافہ کیا، مدرسہ پہلے پرانی طرز کا تھا پھر نئی طرز پر تجدید اور اصلاح کی گئی اور اس کا نیا نصاب بھی وضع کیا گیا، جس میں قرآن پاک، حدیث شریف، فقہ و ادب عربی کے ساتھ ساتھ حساب، جغرافیہ اور تاریخ کی کتابیں بھی داخل درس تھیں اور انگریزی کی تعلیم لازمی تھی۔ ابتدائی درجوں میں تامل اور اردو تعلیم بھی ہوتی تھی[1] یہ مدرسہ ابھی تک قائم ہے، مولانا ابوالجلال صاحب کے بعد کسی وقت دارالمصنفین کے ایک اور سابق رفیق و رکن مجلس انتظامی افضل العلماء مولانا حافظ محمد یوسف کوکن مدراسی بھی اس کے پرنسپل رہے۔

مولانا ابوالجلال صاحب کے دور میں ایک دفعہ دستاربندی کے جلسے میں اعلیٰ حضور نظام کو بھی یہاں مدعو کیا گیا تھا، وہ معائنہ کی غرض سے دونوجوان لڑکیوں کے ہمراہ ہر ہر درجہ میں تشریف لے گئے، جس درجہ میں پہنچتے سب لوگ ان کے احترام میں ایستادہ ہوجاتے، مولانا ابوالجلال صاحب کے درجہ میں تشریف لائے تو وہ نہ خود کھڑے ہوئے اور نہ طلبہ کو کھڑے ہونے دیا بلکہ اپنا رُخ بھی پھیر لیا، نواب صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کیوں نہیں اٹھے، کیا میں ظل اللہ نہیں ہوں اور آپ نے رُخ پھیر کر میری توہین کی، مولانا ابوالجلال صاحب نے فرمایا کہ میں آپ سے زیادہ بہتر کتاب حدیث شریف کا

---

[1] معارف نومبر ۱۹۲۶ء شذرات۔

درس دے رہا تھا اور آپ کے ساتھ ناکتخدا لڑکیاں تھیں اس لیے رُخ پھیر لیا،
نواب صاحب کو اس موقع پر گیارہ تولہ سونا کا ایک ہار پہنایا گیا تھا، انھوں نے
اسے اتار کر مولانا کو دیا اور مولانا نے اسے مدرسہ کے چندہ میں جمال صاحب کے
حوالہ کر دیا۔

نواب صاحب نے مولانا سے یہ بھی فرمایا تھا کہ آپ کو ضرورت ہو تو میرے پاس
حیدرآباد تشریف لائیں، یہ جب وہاں گئے تو نواب صاحب نے کوئی کتاب انہیں ترجمہ
کے لیے دی، مولانا نے دو ماہ میں ترجمہ کر کے ان کے حوالہ کر دیا، نواب صاحب کو ترجمہ
بہت پسند آیا اور مولانا کی تنخواہ کے حساب سے نو سو روپے بھی مرحمت فرمائے جسے لیکر
یہ واپس چلے آئے۔[1]

مولانا ابوالجلال صاحب کو تقریر و بیان پر بھی اچھی قدرت تھی اس کی وجہ سے انکے
درس کی دھاک بیٹھ گئی تھی اور پورے مدراس میں انکا علمی سکہ جم گیا تھا چنانچہ جب یہ
مدراس سے واپس آئے تو لوگوں نے انہیں اصرار سے وہاں دوبارہ بلایا۔ مدراس سے
انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا تھا مگر اس سے بھی زیادہ عرصہ تک تعلق
نہیں رہا۔ وہاں کچھ اور متفرق علمی کام بھی انجام دیے، اس کے بعد وطن واپس آ گئے۔

مولانا ابوالجلال صاحب کی علمی جولانیوں کے لیے دارالمصنفین ہی کی فضا سازگار تھی
اور یہاں کے لوگ ان کے فضل و کمال کے معترف بھی تھے، اس لیے دوبارہ ۱۹۴۶ء
میں وہ پھر دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے، مولانا سید سلیمان ندویؒ ۲۲ اپریل ۱۹۴۶ء کو
بھوپال سے اپنے ایک گرامی نامہ میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کو

---

[1] یہ واقعہ بھی مولانا کے انٹرویو سے ماخوذ ہے۔

لکھتے ہیں:

"مولوی ابو الجلال صاحب کے متعلق مولوی مسعود علی صاحب کا بھی خط آیا ہے، بہتر ہے کہ آپ انہیں رکھ لیں، میں ارکان کو لکھوں گا۔"[1]

اس دفعہ انھوں نے "اعلام القرآن" کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی، مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے ۲۸ مئی ۴۴ء کے ایک گرامی نامہ میں شاہ صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

"مولوی ابو الجلال صاحب اعلام القرآن کے نام سے ایک کتاب شروع کریں، اللہ تعالیٰ اور آدم سے لے کر یا تک سب اعلام قرآن جمع کریں اور ان کی لغوی و تاریخی تحقیق کریں، سارے انبیا، ملائکہ، اصنام، کفار، صحابہ، مقامات، کتب غرض سب اعلام آجائیں۔"[2]

مستقل کتاب کے علاوہ وہ دوسرے متفرق کام اور رفقاء کی تربیت کا کام بھی انجام دیتے رہے، مولانا سید ریاست علی ندوی مرحوم نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا ہے:

"خوشی کی بات ہے کہ ہمارے پرانے رفیق کار مولانا ابو الجلال ندوی مدراس میں چند سال علمی و تعلیمی زندگی گزارنے کے بعد اب پھر ہمارے درمیان آگئے ہیں اور اپنے علمی مشاغل میں مصروف ہیں خصوصاً نوجوان رفقائے دار المصنفین کی علمی رہنمائی کرنے میں انکے مفید خدمات انجام پا رہے ہیں۔"[3]

اعلام القرآن کے متفرق حصے جب معارف میں شایع ہوئے تو علمی حلقوں میں انکی بڑی پذیرائی ہوئی اور بے اختیار اصحاب علم ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے مجبور ہوگئے

---

[1] معارف مئی ۱۹۸۵ء مکاتیب مولانا سید سلیمان ندویؒ بنام شاہ معین الدین احمد ندوی [2] ایضاً جون ۱۹۸۵ء [3] ایضاً مئی ۱۹۴۲ء، شذرات۔

ان کا ایک مضمون "الروم" مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے اس نوٹ کے ساتھ شایع ہوا ہے:

"ہمارے پرانے رفیق مولانا ابوالجلال صاحب ندوی کی نگاہ قدیم سامی اقوام اور ان کے مذاہب پر بہت گہری اور وسیع ہے اور وہ کلام مجید کی مذکورہ اقوام، اشخاص اور مقامات وغیرہ اسماء و اعلام قرآنی کی تاریخ و تحقیق پر اعلام القرآن کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں، یہ موضوع اصحاب نظر علماء کے ذوق کا ہے اسلیے وقتاً فوقتاً اسکے مختلف ٹکڑے ہدیۂ ناظرین کیے جائیں گے"[1]

ان کے یہ مضامین علمی حلقوں میں بہت پسند کیے گئے اور انکی طرف سے اس سلسلہ کو برابر جاری رکھنے کی فرمایش کی جاتی تھی، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالجلال صاحب ندوی اعلام القرآن کے نام سے جو کتاب لکھ رہے ہیں اسکے بعض ٹکڑے معارف میں چھپ چکے ہیں، ان کو اہل علم نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اس لیے آج ایک اور قسط ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے"[2]

مولانا کے ایک اور مضمون کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

"اس (اعلام القرآن) کے متفرق اجزاء میں سے بعض معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جن کو اہل علم نے بہت پسند کیا اور ان کو جاری رکھنے کی فرمایش کی، اسلیے وقتاً فوقتاً اسکے مختلف ٹکڑے ہم شایع کرتے رہیں گے"[3]

اعلام قرآن پر مولانا کے جو متفرق مضامین شایع ہوئے ہیں، ان سے قرآن مجید،

---

[1] معارف جنوری ۱۹۵۷ء مضمون الروم [2] ایضاً اگست ۱۹۵۷ء مضمون حضرت ایوب علیہ السلام [3] ایضاً جولائی ۱۹۵۸ء مضمون تاریخ بابل۔

صحف بنی اسرائیل اور سامی اقوام پہ ان کی گہری نظر اور عربی کے علاوہ عبرانی پر انکے عبور کا اندازہ ہوتا ہے، یہ زبان ان کے ننہال کی خاص چیز تھی، مولانا نے خود اسکی تحصیل کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے :

"ایک دفعہ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے جو عبرانی زبان کے اچھے عالم تھے مجھ سے دریافت کیا کہ "عبرانی جانتے ہو" میں نے نفی میں جواب دیا تو فرمایا کہ یہ تو چریاکوٹ والوں کا خاندانی علم ہے، تعجب ہے کہ تم نہیں جانتے، میں نے کہا کہ میرے والد کو اس کا علم تھا، لیکن وہ بھی اب بھول گئے ہیں، مولانا فاروق چریاکوٹی کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد امین عباسی کو اس کا علم ہے مگر وہ گورکھپور میں مقیم ہیں، ان سے استفادہ کی کوئی صورت نہیں، اب اس علم کا بتانے والا کوئی نہیں۔ مولانا فراہیؒ نے اس زبان کے حروف کی شکلیں لکھ کر دیں، پھر ان پر اعراب دیئے کہا جاؤ پہلے تم زبور پڑھو اور اس میں ڈکشنری سے نکالو، پہلے خود ترجمہ کرو، اگر سمجھ میں نہ آئے تو بائبل کا اردو ترجمہ دیکھ لو تم خود سمجھ لوگے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کہا کہ گرامر یعنی اس کی صرف و نحو سمجھے بغیر کیسے سمجھ لیں گے تو مولانا فراہیؒ نے فرمایا کہ گرامر کی ضرورت نہیں ہے، اگر ہوگی بھی تو یہ خود بنا لیں گے۔ مختلف زبانوں کے درمیان تعلقات پیدا کرنے کی میری کوششوں سے وہ واقف تھے، اس سے انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں خود انشاء اللہ اس کی گرامر بنالوں گا۔ بہر حال میں نے اس طرح عبرانی زبان حاصل کر لی اور اس کا مطالعہ میرے لیے آسان ہو گیا اور میں برابر اس کو پڑھتا رہا"[1]

---

[1] انٹرویو شائع شدہ ہفت روزہ جہان کراچی۔

مولانا کو عبرانی پر اس قدر عبور ہوگیا تھا کہ اعلام القرآن میں عبرانی مآخذ کے براہ راست حوالے اور جابجا عبرانی بائبل اور صحف بنی اسرائیل کے اقتباسات درج کیے ہیں۔

اس صدی میں آثار قدیمہ کی کھدائی کے نتیجہ میں وادی سندھ، موہن جوڈارو کی تہذیب، زبان اور دوسری خصوصیات کے متعلق جو قدیم کتبے اور مہریں دریافت ہوئی ہیں، مولانا نے اپنی عبرانی دانی کی وجہ سے ان کا بھی مطالعہ کرلیا تھا، خود فرماتے ہیں:

"موہن جوڈارو کی زبان قریب قریب عبرانی تھی لیکن وہ اس وقت کسی اور نام سے موسوم تھی، میں نے عبری کی، وسے وہاں کی کھدائی سے نکلے ہوئے دو ہزار کے قریب کتبوں اور مہروں کو پڑھ ڈالا ہے اور میرا مطالعہ ابھی تک جاری ہے اور انشاء اللہ میں تمام مہروں کو پڑھ ڈالوں گا"[1]

اس کے متعلق ان کے مضامین ماہ نو کراچی وغیرہ میں شایع ہوئے تو اہل علم انگشت بدنداں رہ گئے۔

مولانا عبرانی کے علاوہ اردو، عربی، انگریزی، ہندی اور سنسکرت میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، اسلامی علوم میں مہارت کے ساتھ انہیں وید، گیتا، اپنشد اور ہندوؤں کی دوسری مذہبی کتابوں پر بھی بڑی دسترس حاصل تھی۔ اس زمانے میں متعدد زبانیں جاننے والے ایسے اہل علم کہاں ملیں گے، مولانا کو کتبات اور مہریں پڑھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا، کتبہ کسی زبان کا اور کتنا ہی گنجلک اور پیچیدہ ہوتا وہ اس کو پڑھ لیتے تھے۔

مولانا ابوالجلال صاحب فنافی العلم تھے، ہمہ وقت مطالعہ و تحقیق میں [illegible]

---

[1] ہفت روزہ جہان کراچی (انسر ٹیلر)۔

رہتے، لکھنے پڑھنے میں ایسا محو و مستغرق ہو جاتے تھے کہ انھیں کسی اور چیز کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا، کھانے پینے، رہنے سہنے، ملنے جلنے، لباس، پوشاک، وضع قطع، نہانے دھونے، صفائی ستھرائی یہانتک کہ نماز کا بھی خیال نہ ہوتا، اگر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جاتے تو پوری رات اور پورا دن اسی میں گزر جاتا اور کسی اور چیز کی جانب ان کی توجہ ہی نہیں ہوتی، دوسرے انکی طبیعت میں استقلال نہیں تھا اس لیے دار المصنفین میں جو ان کے علمی ذوق کے لیے ہر طرح مناسب جگہ تھی جم کر نہیں رہے تاہم وہ برابر تحریر و تسوید ہی میں مشغول رہتے، اور انکے قلم سے جو کچھ نکلتا تھا وہ ان کے علمی تبحر اور غواصی کا نتیجہ اور بڑی کد و کاوش اور تحقیق و تدقیق پر مبنی ہوتا تھا مگر پھیلے ہوئے مواد کو سمیٹ کر لکھنا اور محفوظ رکھنا ان کے لیے مشکل ہوتا تھا اور اپنے انہماک اور بے خبری کی وجہ سے ان کو اپنے لکھے ہوئے مسودے اور نوٹس کے ادھر اُدھر ہو جانے اور بکھر جانے کا پتہ نہیں چلتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی محنت و تحقیق کا نتیجہ کتابی صورت میں سامنے آنے سے رہ گیا اور علم الاشتقاق و اعلام القرآن پر ان کی کتابیں مکمل نہ ہو سکیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۵ مارچ ۱۹۵۰ء میں اسی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کو لکھتے ہیں :

"ابوالجلال صاحب کی کتاب کی گمشدگی کا جو واقعہ پیش آیا وہ نیا نہیں، وہ توان کی قسمت کا نوشتہ ہے کہ ان کا نوشتہ باقی نہ رہے یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَ یُثْبِتُ وَ عِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ" [1]

یہاں معارف میں شایع شدہ مولانا ابوالجلال صاحب کے مضامین کی پہلے ایک فہرست پھر دوسری تحریروں کی فہرست ماہ و سن کی صراحت کے ساتھ درج کیجاتی ہے۔

---

[1] معارف فروری ۱۹۸۵ء مکاتیب مولانا سید سلیمان ندویؒ بنام مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔

۱۹۲۳ء: عربی زبان کا فلسفہ لغت (ستمبر)

۱۹۲۴ء و ۱۹۲۵ء: ستر اکبر یا اپنشد (دسمبر ۱۹۲۴ء و جنوری ۱۹۲۵ء)

۱۹۲۶ء: دروزیوں کا مذہب (اپریل)، مستدرک حاکم کا مطبوعہ نسخہ (جولائی، اگست)

۱۹۲۷ء: اسلامی شمسی قمری سال (نومبر)

۱۹۲۸ء: ذوالکفل (جولائی)، بکہ مبارکہ (اگست)

۱۹۲۹ء: الدم (جنوری)، السامری (جولائی)، ایوب علیہ السلام (اگست، ستمبر) سنگ ہشام۔ یہود و حمیر کی تاریخ کا ایک مشترکہ ورق (اکتوبر، نومبر) تاریخ یمن کی ایک سطر (دسمبر)

۱۹۵۰ء: تاریخ یمن کی ایک سطر۔ عمرو بن عامر عرف مزیقیا کے عہد کا سیل عرم (مارچ) کتبات حصن غراب (مئی)، تاریخ بابل (جولائی) ہاروت و ماروت (اگست) تاریخ یمن کا ایک ورق (اکتوبر و نومبر)

۱۹۵۱ء: داستان خلیل۔ بائبل سے قدیم ایک صحیفہ کی روایت (مارچ)، اصحاب الاخدود (جولائی) اصحاب الفیل کا واقعہ اور اس کی تاریخ۔

باب التقریظ والانتقاد کے زیر عنوان مولانا نے متعدد اہم کتابوں پر بڑے فاضلانہ تبصرے بھی لکھے ہیں جن کی فہرست ماہ و سال اور مصنفین کے ناموں کی صراحت کے ساتھ ملاحظہ ہو۔

۱۹۲۳ء: سرگزشت الفاظ از جناب احمد دین صاحب (اپریل)، الوراثۃ فی الاسلام از مولانا حافظ اسلم جیراجپوری (جولائی)

۱۹۲۴ء: ینابیع المسیحیۃ از خواجہ کمال الدین صاحب (مئی) جدید دنیا سے

اسلام از ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ مترجمہ جناب محمد جمیل بدایونی (جون) اخبار الاندلس از مسٹر ایس۔ پی اسکاٹ مترجمہ منشی خلیل الرحمن صاحب (جولائی، اگست)

۱۹۲۶ء : تاریخ اسلام از مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی (جنوری) نظریہ اضافیت از منہاج الدین صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور (مئی) دین کامل مصنفہ مولوی مفتی سید عبدالقیوم صاحب وکیل (جولائی) مرآۃ الشعر از مولوی عبدالرحمن صاحب افسر شعبۂ ادبیات اردو، فارسی، عربی دہلی یونیورسٹی۔

۱۹۲۷ء : نبراس الساری فی اطراف البخاری از مولانا ابو سعید محمد عبدالعزیز خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ (مارچ) ادب العرب از ڈاکٹر زبید احمد (جون) مشرقی کتب خانہ پٹنہ کی فارسی کتابوں کی آٹھویں فہرست (نومبر)

۱۹۲۸ء : تخمیس اللغات از گیا پرشاد (جنوری) مشرقی کتب خانہ بانکی پور کی بارہویں جلد از مولوی حاجی معین الدین ندوی (فروری) بیداری ہند از مہاتما گاندھی مترجمہ لالہ متصدی لال صاحب میرٹھی (مارچ)

۱۹۲۹ء : ترجمان السنۃ از مولانا بدر عالم میرٹھی (اکتوبر) مشکلات القرآن از مولانا داؤد اکبر اصلاحی (نومبر)

دو استفسارات کے بڑے عالمانہ جواب لکھے تھے جو یہ ہیں :

شق القمر کا ذکر قرآن مجید میں (نومبر ۱۹۴۶ء) احادیث عاشورا (اگست ۱۹۴۰ء)

معلوم نہیں پھر موقع ملے یا نہ ملے اس لیے ان کے بعض مضامین کی طرف دوبارہ اہل علم کی توجہ مبذول کرانے کے لیے ان کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے ع کہ تاقی نہیں فصل گل روز روز

عربی ہی ایک زبان ہے جو انسان کی فطری زبان کہی جاسکتی ہے، دنیا میں صدہا زبانیں

بولی جاتی ہیں، ان زبانوں کو ہم مختلف گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک گروہ کی زبانوں کا اجمالی نام "انڈو یوروپین" ہے، ان زبانوں میں سب سے قدیم تر زبان سنسکرت ہے، دوسرے گروہ کی زبانوں کا نام "السنہ سامیہ" فرض کیا جاتا ہے، ان میں سب سے قدیم زبان سریانی ہے مگر وہ سریانی نہیں جو آج سے چند ہزار سال قبل بولی جاتی تھی بلکہ وہ سریانی جسے نوحؑ یا سامی قبائل کے آبائے اولین بولتے تھے۔

وہ عربی جس میں قرآن مجید اترا ہے قدیم عربی نہیں، قرآن مجید تو عربی مبین میں اترا ہے جو قبیلہ قریش کی زبان کا نام ہے، یہ زبان قبائل مضر کی فصیح ترین زبانوں کے چیدہ الفاظ اور ترکیبوں کا مجموعہ ہے، چونکہ یہ زبان تمام قبائل عرب کی سمجھ میں بوضاحت آجاتی تھی اس کا نام "مبین" تھا، ہم جس عربی سے واقف ہیں وہ مضر کے سات قبائل کی زبانوں سے منقول ہے، یہ قبائل ہمیشہ خانہ بدوش اور غیر شہری رہے، شہریت کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ قوموں کی دماغی حالت روز بروز ترقی پذیر ہوتی رہتی ہے معلومات، احساسات، ضروریات اور اغراض میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے، شہریت کے باعث الفاظ میں تراش خراش پیدا ہوتی ہے لیکن بداوت کا طبعی اقتضا یہ ہے کہ اقوام کی دماغی حالت ساکن ہوتی ہے، ضروریات اور معلومات محدود ہوتی ہیں، بہت زیادہ تراش خراش کی ضرورت نہیں پڑتی نہ دوسری اقوام کی زبانوں کا اثر قبول کرنے کی حاجت ہوتی ہے، اس بنا پر بدویوں کی زبانیں بہت کم تغیر پذیر ہوتی ہیں اور جلد جلد اپنی نوعیت نہیں بدلتی رہتیں، اس قاعدہ کے مطابق قبائلِ مضر کی زبانیں اپنی اصل سے بہت زیادہ مشابہ ہونگی۔

خالص قحطانی زبانوں میں سے صرف حمیری زبان کا حال معلوم ہے، عرب کے علمائے لغت کی روایتیں ظاہر کرتی ہیں کہ حمیری زبان میں اعراب نہ تھا، قدیم عربی میں بھی

اعراب نہ تھا، اعراب کا استعمال اہل عرب کو اسماعیلی نسل کے مستعرب عربوں نے سکھایا۔ خالص عربی تو طسم جدیس اور عمالقہ وغیرہ تباہ شدہ قبائل کی عربی تھی۔

عربی مبین (۱) قدیم عربی (۲) عہد قحطان کی سریانی (۳) عہد اسماعیل کی عبری الفاظ اور ترکیبوں سے مرکب ہے، چونکہ یہ تینوں زبانیں ایک اصل کی شاخیں اور ایک ماں کی بیٹیاں ہیں، ان کے میل سے جو زبان پیدا ہوئی وہ پھر بھی قدیم سریانی سے بہت مشابہ رہی،

بہرحال عربی مبین باوجودیکہ نہ توام الالسنہ ہے، نہ دنیا کی قدیم ترین زبان لیکن دنیا کی زبانوں میں سب سے زیادہ فطرت کے مطابق ہے۔ عربی زبان کے الفاظ اپنے معانی پر محض فرض واصطلاح اور بخت واتفاق سے دلالت نہیں کرتے بلکہ ہر لفظ اپنے معنی کو چند خاص نوامیس قدرت کے مطابق ظاہر کرتا ہے۔ الفاظ اور معانی میں ربط پیدا ہونے کی وجہیں عربی علم الاشتقاق کے اصول پر غامض نظر ڈالنے کے بعد اس قدر واضح ہو سکتی ہیں کہ ہم غیر زبانوں کے الفاظ کو بھی عقلی طور پر سمجھ لینے کی قوت اور ملکہ پیدا کر سکتے ہیں۔

الفاظ اپنے اندر تین قسم کے معانی رکھتے ہیں (۱) نفسی کیفیات (۲) حسی امور (۳) ذہنی اور اختراعی معلومات۔

چنانچہ خیال، علم، عام (جرس) ادراک وغیرہ الفاظ پر غور کرو۔ خیال کی اصل خیالہ (نگرانی) ہے چونکہ شے کی نگرانی کے لیے شے کا خیال ضروری ہے اس لیے خیالہ سے خیال بنا خود خیالہ بھی کوئی حسی مفہوم نہیں ہے، خیالہ کا اصلی ترجمہ گھوڑوں کی رکھوالی ہے جس طرح ابل سے ایالہ بنا اسی طرح خیل سے خیالہ بنا، خیل اگرچہ حسی چیز کا نام ہے مگر یہ بھی اصلی لفظ نہیں ہے، اشیاء کے نام عموماً وصفی نام ہوتے ہیں، جن میں سے وصفیت فنا ہو جاتی ہے، خیل کی اصل "خال" ہے، خال ایک قسم کی چال کا نام ہے، یہی لفظ اصل ہے کیونکہ عربی

علم الاشتقاق کی رو سے حرف حلقی اور حرف مکرر (ر۔ل) کا وہ مجموعہ ہے جس میں کوئی حرف شدید نہ ہو حرکت ظاہر کرتا ہے۔

حسی معانی کی پانچ قسمیں ہیں (۱) مسموع یعنی آوازیں (۲) مرئی جیسے لمبائی، چوڑائی، موٹائی، رنگ، حرکت، فصل، فاصلہ وغیرہ (۳) مشموم جیسے بدبو، خوشبو، سونگھنا یا سونگھنے کی چیزیں (۴) ملموس جیسے لمس، چپکنا، ملنا وغیرہ معانی جن کا تعلق مساس سے ہے۔ (۵) مذوق یعنی زبان سے محسوس کی جانے والی چیزیں اور کیفیتیں، دیلمی نے مسند فردوس میں روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ میری امت مجھے آب وگل کی حالت میں دکھائی گئی اور آدم کی طرح اس کو بھی تمام اسمار کی تعلیم دی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ خدا نے الہام طبعی کے ذریعہ انسان کو بولنا سکھایا۔

عربی زبان کے الفاظ کی ۴ قسمیں ہیں (۱) ایک حرفی (۲) دو حرفی (۳) سہ حرفی (۴) زائد از سہ حروف، چوتھی قسم کے الفاظ دو قسم کے ہیں، بعض تو وہ ہیں جو سہ حرفی لفظوں میں چند حروف کے اضافہ یا کسی حرف کی تضعیف سے پیدا ہوئے جیسے قاتل مقتول وغیرہ بعض وہ ہیں جو دو ثلاثی کے باہم مل کر ایک ہو جانے سے پیدا ہوئے ہیں، ایک قسم کے الفاظ کو منحوت کہتے ہیں رباعی اور خماسی الفاظ عموماً منحوت ہیں۔

سہ حرفی لفظوں کو عربی زبان کی بنیادی اصلیت قرار دیا جاتا ہے مگر عربی زبان پہ غور کرو تو اس کی صدہا مثالیں ملیں گی، مضاعف، اجوف، معتل اور وہ سہ حرفی الفاظ جو لام کلمہ کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد مضاعف کی آواز کے مشابہ ہوں، ذرا ذرا سے فرقوں کے ساتھ تقریباً یکساں معنیٰ ظاہر کرتے ہیں مثلاً غط (غوطہ دینا) غوط (ڈوبنا) تغطّی (ڈھانپ لینا، ڈوبا لینا) غطم (ڈبو دینا) وغیرہ، قط، قطع، قطف، قطم سب کاٹنا ظاہر کرتے ہیں،

قص، قصل، قصم، قصب سب تقریباً ہم معنی ہیں، اس قسم کی بہتیری مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ثلاثی الفاظ بھی اصل میں دو حرفی آوازوں سے پیدا ہوتے ہیں، یک حرفی الفاظ کے متعلق بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ دو حرفی لفظوں کا مخفف ہے۔ انسان سب سے پہلے دو حرفی آوازیں پیدا کر سکتا ہے اور سب سے پہلے انسان کو چیزوں کی طلب ظاہر کرنی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کی قدیم زبانوں میں طلب کے صیغے یعنی امر کے الفاظ دو حرفی ہوتے ہیں۔ عربی میں اجوف کا امر ہمیشہ دو حرفی ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ الفاظ کی ابتدائی اصل دو حرفی آوازیں ہیں جو کسی چیز سے سنائی دینے والی آوازوں یا انسان کی بعض غیر اضطراری آوازوں کی پے بہ پے نقل سے معرض وجود میں آئی تھیں، ان آوازوں کو ہم چند قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں (۱) ہم مخرج حرفوں کا مجموعہ (۲) باہم متشابہ حرفوں سے بنا ہوا لفظ (۳) دو متبائن جنس کے حروف سے بنا ہوا لفظ، چونکہ حروف کی پانچ قسمیں ہیں حلقی[۱]، حنکی[۲] (تالو کے حروف) شفی[۳] (ر۔ ل۔ ن)، سنی[۴] (دندانی) شفوی (لب کے حروف)۔

خلاصہ یہ کہ ہماری زبانوں کی ابتدا صرف گیارہ[۱۱] قسم کے معانی اور بارہ[۱۲] قسم کے الفاظ سے ہوئی ہے اور انہیں ۱۲ قسم کے الفاظ سے صدہا زبانیں پیدا ہوئیں۔

دنیا بھر کی زبانوں کے بسیط حروف کو اپنے دماغ میں حاضر کرو تو تم سب کو پانچ جنسوں میں تقسیم کر سکتے ہو، ان پانچ جنسوں میں سے ہر جنس کے تمام حروف اصلی نہیں اکثر حروف تو ایسے ہوں گے جن کو صرف لہجوں کے اختلاف نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا ورنہ حقیقت ان کی ایک ہے، اصلی حروف وہ ہیں جو دنیا بھر کی زبانوں میں ادا کیے جا سکتے ہوں، اس قسم کے حروف صرف ۱۴ ہیں، ہمزہ[۱]، ب[۲]، م[۳]، ک[۴]، ج[۵]،

ر، ہ[6]، ل[7]، ن[8]، س[9]، و[10]، ی[11]، الف[12]، د یا (ڈ)[13]، ت (یا ٹ)[14]

ان ۱۴ حرفوں کے علاوہ جتنے حروف ہیں وہ فرع ہیں، اصل نہیں۔ ان ۱۴ حرفوں کو باہم ضرب دو تو ۱۹۶ الفاظ پیدا ہونگے۔

ابتدا میں انسان کی زبان کوئی مستقل نوعیت نہ رکھتی تھی نہ تو الفاظ کے اوزان، صیغے اور شکلیں کوئی خاص آواز کی مالک. بنی تعین اور نہ الفاظ اور معانی کے ربط میں کوئی استقلال پیدا ہوا تھا ــــ اسی طرح الفاظ کی آوازیں بھی ابتدائی عہد میں کچھ مستقل نہ ہونگی۔ انسان کو اپنی زبان پر کافی قابو نہ ہوگا۔ لیکن جب دنیا میں بنی نوع آدم مختلف قوموں کی شکل میں پھیل گئے تو آہستہ آہستہ ہر قوم نے مستقل لہجے، مستقل صیغے اور مستقل شکلوں کے الفاظ استعمال کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ لفظ اور معنی میں مستقل ربط پیدا ہونے لگا۔ دنیا کی موجودہ زبانوں کی اصلیں وہی مستقل زبانیں ہیں، جو بالکل ابتدائی عہد میں آدم کی غیر مستقل زبان سے پیدا ہوئیں۔

ابتدا میں دنیا کی تمام زبانیں باہم مشابہ ہوں گی، ان میں فرق یہ ہوگا، ایک قوم میں کسی معنی کے لیے ایک لفظ استعمال کیا جاتا ہوگا تو دوسری قوم میں اس لفظ کا الٹا۔

ہندوستان میں دیوتا کا وجود نہایت مقدس ہے، ایران میں دیو تا نہایت خطرناک چیز ہے، عرب ابر کو غیم بولتے ہیں تو فارس والے میغ، ہندوستانی زبان میں میگھا اوتار بارش کا دیوتا ہے۔ عربی کا اباب فارسی میں آب ہے، ہندوستانی زبان میں اپ چپاچھاپ یا ترم آبخورہ کو کہتے ہیں، انگریزی میں بھی اباب (ھا ءا ع) بن کر پانی کی ایک خاص کیفیت (جزر) کو ظاہر کرتا ہے، تقریباً ہم صورت الفاظ کسی زمانہ میں باہم مرادف تھے مگر جس تدریج کے ساتھ انسانی معلومات میں اضافہ ہوتا رہا، ہر لفظ نیا، مگر اصلی مفہوم

سے قریب تر) معنیٰ اختیار کرتا رہا تا آنکہ اب دنیا میں کوئی دو لفظ ایسے نہیں جو ایک زبان میں مرادف ہوں، عربی زبان میں اب بھی تشابہ الصوت الفاظ کثرت کے ساتھ باہم شبیہ ہوتے ہیں مثلاً قتل (مار ڈالنا) قطل (درخت کاٹنا) قطم (دانت سے کھانا) تقدیر (اندازہ کرنا، جدا جدا کرنا وغیرہ الفاظ کا مفہوم مشترک ایک جز کا ٹوٹ کر دو ہونا یا دو چیزوں کے درمیان فصل پیدا ہونا ہوتا ہے۔ شکست کی حالت میں چیزوں سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسے لفظ کی اصل شکل سے کس قدر مشابہت ہے۔

حروف کی ترتیب بدلنے پر بھی الفاظ کے معانی تقریباً یکساں رہتے ہیں مثلاً دلک (ملنا) لدک (چپکنا) تکلید (تلے اوپر جمع کرنا) تلکد (چپکنا) ذکل (مٹی سانتا) یہ الفاظ درحقیقت ایک مفہوم یعنی دو جسم کا ایک دوسرے سے امتساس ظاہر کرتے ہیں۔

عربی زبان اور دوسری زبانوں میں ایک فرق یہ ہے کہ اس زبان کے الفاظ اپنے معانی کو بھی وجوہ اور اسباب کے ماتحت ظاہر کرتے ہیں وہ تشابہ الاصوات کے مطالعہ سے بہ تشریح معلوم ہو سکتے ہیں۔

چونکہ حلقی اور شفوی آوازوں پر انسان کو سب سے پہلے قدرت حاصل ہوتی ہے اسلیے ہماری فطری زبان کے قدیم ترین الفاظ وہی ہیں جو حلقی اور شفوی حروف سے مرکب ہوں، چونکہ پہلا نفسی ادراک جس کے اظہار کی خواہش انسان کو ابتدا ہی میں ہونے لگتی ہے "محبت" ہے اور چونکہ پہلا احساس جو بچوں کو ہو سکتا ہے ہوا اور پانی کی حرکت ہے اور سب سے پہلے جس چیز کے ساتھ بچوں کی خواہش وابستہ ہو سکتی ہے پانی اور دودھ ہے، اس لیے حلقی شفوی الفاظ کا خاصہ ہے کہ پانی، دودھ، ہوا اور ان چیزوں کے لوازم یا محبت اور لوازم محبت پر دلالت کرتے ہیں۔

دنیا بھر کی زبانوں میں عربی ہی ایک زبان ہے جو ابتک تقاضائے فطرت کے مطابق ہے،

عربی زبان کے الفاظ کا غائر مطالعہ کیا جائے تو انسان کی ادبی اور دماغی ترقیوں کی تدریجی رفتار کا غالباً بالکل صحیح نقشہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

اعلام القرآن پر مولانا کے مضامین اتنے دقیق اور عبرانی حوالوں سے بوجھل ہیں کہ ان کو سمجھنا اور سمجھانا یا ان کی تشریح و خلاصہ پیش کرنا مشکل ہے تاہم ان کی نکتہ آفرینی اور دیدہ دری کو سمجھنے کے لیے صرف ایک مضمون کے جائزہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہاروت و ماروت | گو قرآن مجید میں ان کے لیے "اَلْمَلَکَیْن" کا لفظ وارد ہے، مگر مولانا کے نزدیک یہ دو فرشتے نہیں بلکہ بابل کے دو معلم تھے جن سے بنو اسرائیل نے میاں بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالنے کا ہنر سیکھا تھا جس کے سیکھنے سکھانے کو خدا نے بنی اسرائیل کے کافر ہونے کی دلیل قرار دیا ہے، انکا خیال ہے کہ بعض دفعہ بولنے والے کسی لفظ کو اپنے عقیدہ و تصور کے برخلاف مخالف اور فریق بحث کے عقیدہ و تصور کے مطابق بولتے ہیں، لغات میں اس کی نظیریں بہت ہیں، یہود نہ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح مانتے تھے اور نہ رسول اللہ، مگر نزول قرآن کے ایام میں انھوں نے یہ کہہ کر ناز کیا تھا کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ۔ مولانا فرماتے ہیں کہ بعینہ اسی طرح چونکہ یہود ہاروت و ماروت کو اَلْمَلَکَیْن کہتے تھے اس لیے قرآن میں بھی بطریق طنز ان کو اَلْمَلَکَیْن کہا گیا ہے۔

ھاروت : بابل میں دو قوموں کے آثار پائے جاتے ہیں (۱) بنو سام (۲) سمیری۔

سمیری قوم کا اہم ترین مرکز شہر اُور تھا جو بعد میں شہر کا مرادف بن گیا تھا لیکن اس کا اصل ترجمہ روشنی ہے، یہ قوم روشن اجرام کی پجاری تھی اور یہ شہر ایک روشن

جرم فلک کا معبد ہونے کی وجہ سے اُور کہلایا، اس لفظ کو سمیریوں کے یہاں اس قدر اہمیت حاصل ہوئی کہ ان کے اکثر بادشاہوں کے ناموں میں یہ لفظ پایا جاتا ہے۔ سمیریوں کے بے نام ونشان ہو جانے کے بعد بھی بعض غیر سمیریوں کے ناموں میں بھی اُور کا لفظ پایا جاتا ہے، مولانا اس کے بعض مرکبات کا ذکر کر کے بتاتے ہیں کہ اُورتا کے معنی اُور کی قوم ہیں اس کا دوسرا تلفظ آرتو ہے، جس پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی رُکی تھی اس کا تورانی نام ارارا طہے جو اورارتو کی بدلی ہوئی شکل ہے، یہ آرمینیہ کا کلدانی اوراشوری نام ہے۔ اورارتو کے معنی ہیں آرتو کی بستی بابل کے سمیری جہاں سے بھی اس دیار میں آئے ہوں مگر آرمینیہ ہوتے ہوئے آئے تھے۔ اس اورتا اورآرتو کا نام عربی لب ولہجہ میں ہاروت بنا، قرآن میں جس ہاروت کا ذکر ہے اگر وہ نسلی حیثیت سے نہیں تو مذہبی اور ثقافتی حیثیت سے اسی قوم کا ایک فرد تھا۔

ماروت: فرماتے ہیں کہ اشوری بادشاہ اشوربنی بال (۶۶۸ء) ق م کے زمانے میں عیلام کا بادشاہ اورتاکی (حاکم ہاروت) تھا، یہ پہلے اشوربنی بال کا حلیف تھا بعد میں مخالف ہوگیا اور اس کے مقبوضہ علاقہ بابل پر حملہ کر کے شکست دے دی، اس کے بعد تی امان عیلام کا بادشاہ ہوا جسے اشوری تحریر اس کے دو پیش رو بادشاہوں کی طرح مثیلِ شیطان بتاتی ہے اس کے بعد اورتاکی کا فرزند ہم مارتو عیلام کا حاکم ہوا۔

یہ نام دو لفظوں کا مجموعہ ہے، ہم کو عربی لب ولہجہ میں ہام پڑھ سکتے ہیں، بائبل کے عبرانی نسخوں میں یہ عموماً مردِ کامل یعنی ہمیشہ نیکی اور راستی میں باکمال کے معنی میں آیا ہے، دوسرا جزو مارتو عربی لب ولہجہ میں ماروت بنا لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن

میں اسی ماروت کا ذکر ہے جو اپنے خیال میں مردِ کامل اور جس کا باپ اورتا کی اشوریوں کی نظر میں مثیلِ شیطان تھا بلکہ مارتوکے لغوی معنی ہیں "انسان کی نسل" اسی معنی میں سفرتکوین (۶: ۱تا۴) میں آیا ہے۔

مولانا کے نزدیک اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں دو قومیں ایک ساتھ رہتی تھیں ایک کو خداؤں کی اولاد ہونے کا ادعا تھا اور دوسری خود کو معمولی آدم زاد کہتی تھی اسی کا نام مارتو تھا، اطراف بابل میں جو بنو سام تھے وہ خود کو امورو کہتے تھے، یہ نام عربی لفظ اِمْرَءٌ (انسان) کی قدیم شکل میں ہے، اسی قوم کا ذکر توراۃ میں آموری قوم کے نام سے آیا ہے، بابل کے سامی بولنے والے اس قوم کو مارتو کہتے تھے، یہی نام عبرانی لب ولہجہ میں مرّوت اور عربی لب ولہجہ میں ماروت ہو گیا، فلسطین میں بھی چونکہ ایک وقت مارتو، ماروت، مرّوت اور امورو کہلانے والی قوم بستی تھی اس لیے ایک زمانہ میں اطرافِ بیت المقدس کو بھی مرّوت کہتے تھے جیسا کہ صحیفۂ میکاہ میں ہے۔

مولانا کا خیال ہے کہ قرآن کریم میں جس شخص کا ماروت کے نام سے ذکر ہے وہ اسی ارتو کہلانے والی قوم کا ایک فرد تھا۔

مولانا کے نزدیک قرآن مجید نے ہاروت و ماروت کو طنزاً فرشتے کہا تھا لیکن مفسرین نے اس کو عجیب افسانوی شکل دیدی ہے، ان کی نقل کردہ روایتوں کا ماحصل یہ بتایا ہے:

"یہ دونوں واقعی فرشتے تھے، فرشتوں نے بنی آدم کی خطاکاریاں دیکھ کر خدا سے کہا کہ ہم ہوتے تو ہم سے یہ گناہ نہ ہوتے، خدا نے کہا اچھا اپنے درمیان سے دو کو امتحان کے لیے چنو، چنانچہ ہاروت اور ماروت چنے گئے اور انسان بن کر زمین میں اترے اور ایک خوبصورت عورت پر ریجھ گئے، اس عورت کو انھوں نے

اسم اعظم سکھانے کے بعد اس کے کہنے سے شراب پی، بت پوجا اور بہت سے گناہ کیے
پھر اس نے ان کو تمتع کی اجازت دی، وہ عورت اس کے بعد اسم اعظم کے زور سے
آسمان پر اُڑ گئی، خدا نے اسے ستارۂ زہرہ کی صورت میں مسخ کر دیا اور ان فرشتوں سے
کہا گیا کہ عذاب دنیا اور عذابِ آخرت میں سے ایک کو پسند کریں، دونوں نے عذابِ دنیا
کو پسند کیا، چنانچہ وہ دونوں ایک تاریک کوئیں میں قیامت تک کیلئے لٹکا دیے گئے۔[1]

مجموعی روایتوں کا یہ ملخص بیان کرنے کے بعد مولانا ان کے اختلاف و تضاد کی نشاندہی کرکے ان کی نوعیت واضح کرتے ہیں اور مکمل احتیاط اور ہر طرح روایات کو مسترد نہ کرنے کی خواہش کے باوجود انہیں انکو ساقط الاعتبار کہنا اور یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ "قرآن مجید کی آیت کو ہاروت و ماروت اور زہرہ کی کہانی سے کوئی واسطہ نہیں ہے"۔[2]

چونکہ اس افسانہ کی وجہ سے قرآن پاک پر اعتراضات کیے جاتے ہیں، اس لیے وہ اس کی پوری حقیقت کھولنے کے لیے اس کے سرچشمے کی نشاندہی کرتے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی طرف منسوب ایک روایت کے حوالے سے بتلاتے ہیں کہ ہاروت و ماروت کا افسانہ مسلمانوں میں کعب احبار کے ذریعہ آیا جو یمنی اور مذہباً یہودی تھے، وہ نصرانی لٹریچر سے بھی واقف اور ایک حد تک متاثر تھے۔ مولانا اس ضمن میں دو بڑی اہم باتیں بیان کرتے ہیں کہ موجودہ دور کے نصرانی علماء اب تو ہاروت و ماروت کے قرآن میں مذکور ہونے پر معترض ہیں، لیکن اس کے ناپسندیدہ عناصر جن کو تفسیر قرآن سمجھ کر اعتراض کیا جاتا ہے، خود نصرانی اور یہودی لٹریچر سے آئے۔

دوسری قابلِ غور بات یہ بھی بتلاتے ہیں کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور قرآن مجید میں

---

[1] معارف، اگست ۱۹۴۵ء ص ۱۰۴ [2] ایضاً ص ۱۱۱۔

اس کی بابت صریحاً یہ ارشاد بھی ہے کہ فرشتے اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتے اور وہ وہی کر سکتے ہیں جو ان کو خداوند عالم کی طرف سے فرمایا جاتا ہے' یہ تصور تو خود نصاریٰ کا ہے کہ ایسے فرشتے بھی ہیں جنھوں نے گناہ کیا، لیکن یہ تصور ان کی اپنی ایجاد نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے تصور میں فرشتے دُو قسم کے تھے نیک اور بد۔ جس کی تفصیل مولانا نے نہایت کدوکاوش اور تحقیق سے ان گروہوں کی کتابوں اور ان کی روایات کے حوالوں سے قلم بند کی ہے۔

اور آخر میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں :۔

"قرآن مجید میں یقیناً ہاروت و ماروت کو طنزاً دُو فرشتے کہا گیا ہے، لیکن یہ دونوں یہودی لٹریچر کے گھڑے ہوئے فرشتوں میں سے نہ تھے کیونکہ ان کے اسماء میں انکے نام نہیں ملتے، یہ دونوں درحقیقت تاریخی اشخاص اور بابلی استادوں میں سے دُو استاد تھے جن کو ان کے ماننے والے حسن اعتقاد کی بنا پر فرشتے کہتے تھے، قرآن نے طنزاً ان کو فرشتے کہا، ان کے معتقدین بھی ان کو حقیقی معنوں میں فرشتے نہیں کہتے تھے بلکہ اپنے گمان کے مطابق ان کے حسن سیرت اور تقدس کے سبب سے ان کو تشبیہاً اسی طرح فرشتے کہتے تھے جس طرح زنان مصر نے حضرت یوسفؑ کی بابت کہا تھا، إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ[1]

مولانا نے کتابوں پر باب التقریظ والانتقاد کے تحت جو ریویو لکھے ہیں وہ بھی اس لائق تھے کہ ان سے بعض مثالیں اور نمونے پیش کیے جاتے مگر طوالت کی وجہ سے اس کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

اپنی افتاد طبع کی وجہ سے وہ اس بار بھی دارالمصنفین سے دل برداشتہ ہو گئے

[1] معارف، اگست ۱۹۵۰ء ص ۳ ۱۱۔

اور تھوڑے عرصہ تک مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں درس وتدریس کی خدمت پر مامور رہے، اسی زمانے میں راقم کو ان سے عربی ادب کی ایک کتاب جمہرۃ خطب العرب پڑھنے کی سعادت میسر آئی، مولانا جامع کمالات تھے اور ان کا علم بھی مستحضر تھا اس لیے انہیں جو کتاب بھی پڑھانے کے لیے دی جاتی وہ اسے بڑے شوق و ذوق سے پڑھاتے تھے۔ مدرسۃ الاصلاح میں بیک وقت عربی ادب، فقہ، اصول فقہ، فرائض، منطق و فلسفہ کی کتابیں ان کے زیر درس تھیں، طلبہ کو ان کے درس سے پورا اطمینان اور تشفی بھی ہوجاتی تھی۔

استحضار کی وجہ سے مولانا کو مطالعہ کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، جمہرۃ خطب العرب کی ابتدا میں زمانۂ جاہلیت کے خطبے درج ہیں، جن میں مشکل الفاظ بھرے ہوئے ہیں، پوری تیاری اور لغت دیکھے بغیر ان کو پڑھانا مشکل ہے، مولانا نے ایک روز فرمایا کہ مجھے کتاب دے جایا کرو تاکہ ایک نظر ڈال لوں، میں جب کتاب لے کر جاتا اور انہیں مشغول دیکھ کر کتاب رکھ کر آنے لگتا تو فرماتے سبق کہاں سے ہے، ایک دو منٹ میں وہ پورے خطبہ پر نظر ڈال کر فرماتے کوئی خاص مشکل لفظ نہیں ہے، پھر فوراً ہی کتاب واپس کر دیتے۔

مولانا کا ادبی ذوق اچھا اور بلند تھا، کتاب پڑھاتے وقت وہ شعر و ادب کے نکتے اور بلاغت و معانی کی خوبیاں مستی و سرشاری کے ساتھ بیان کرتے جاتے اور جب کوئی فصیح و بلیغ عبارت آتی تو ان پر وجد و اہتزاز کی کیفیت طاری ہوجاتی، ایک روز درس میں یہ شعر آیا۔

وظل احدهن حتى يوما بكفه الى الشمس فى مجرى النجوم يراعيها

(ترجمہ) اگر کوئی شخص سورج پکڑنے کے لیے آسمان کی طرف اپنی مٹھی بڑھائے (تو کیا وہ اسے پائے گا)

مولانا شعر کا مطلب سمجھاتے ہوئے فرش پر بیٹھے اپنا ہاتھ اوپر کی طرف اٹھاتے ہوئے بے اختیار کود پڑے۔

وہ مسلسل لکھتے رہتے تھے، بیٹھے بیٹھے لکھتے ہوئے تھک جاتے تو لیٹ کر اور ٹیک لگا کر لکھنے لگتے، محویت و استغراق کی وجہ سے اوقات کی پابندی ان کے لیے بڑی مشکل تھی، درجے میں پہنچنے میں ان کو تاخیر ہو جاتی مگر پہنچنے کے بعد ان کو اس کا خیال نہ رہتا کہ اب دوسری جماعت کے لڑکوں کو پڑھانے کا وقت ہو گیا ہے، چھٹی ہونے کے بعد بھی ان کا درس ہوتا رہتا تھا، عصر کی نماز پڑھنے کے لیے ہم لوگ جاتے تو وہ لکھنے پڑھنے میں محو رہتے، میں کبھی کبھی جا کر کہتا' مولانا اذان ہو گئی ہے' وہ ہوں ہاں کر کے رہ جاتے یا فرماتے لوٹے میں پانی لا کر رکھ دو، بعض دفعہ ہم لوگ نماز پڑھ کر آ جاتے اور یہ لکھنے ہی میں مشغول رہتے، نماز پڑھنے کے بعد پھر یہ شغل جاری ہو جاتا۔ عصر بعد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کے ساتھ چائے پینے کا معمول تھا، مگر یہ کبھی وقت سے نہیں پہنچتے، آدمی پر آدمی بھیجا جاتا کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے تب جا کر یہ چائے پینے جاتے۔

دسترخوان پر کوئی علمی گفتگو شروع ہو جاتی تو نہ خاموش ہونے کا نام لیتے اور نہ دسترخوان سے اٹھنے کا۔ حکیم محمد اسحاق صاحب[1] بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ کسی دعوت میں مولانا شریک ہوئے، روٹیوں پر روٹیاں کھاتے رہے اور گفتگو فرماتے جاتے تھے، سارے لوگ دسترخوان سے اٹھ گئے مگر ان کی نہ گفتگو کا سلسلہ موقوف ہوا اور نہ

---

[1] یہ اعظم گڑھ کے بڑے حاذق طبیب اور حکیم اجمل خاں مرحوم کے شاگرد تھے، دارالمصنفین بہت پابندی سے آتے تھے۔

روٹیوں کی طلب میں کمی آئی، جب بتایا گیا کہ سب لوگ اٹھ چکے ہیں تو وہ بھی دسترخوان کی اور چیزیں کھائے بغیر ہی اٹھ گئے۔

مولانا بڑی مرتب و مدلل گفتگو کرتے تھے، علمی مسائل پر گھنٹوں بے تکان مسلسل بولتے رہتے تھے، کوئی موضوع ہو اس میں وہ عاجز و قاصر نہیں رہتے، الفاظ اور معلومات کا خزانہ تھا جو ختم ہی نہ ہوتا تھا، افسوس کہ یہ سارا خزانہ وہ اپنے ساتھ ہی لیتے گئے، مولانا اختر احسن مرحوم کے یہاں جب وہ قرآن مجید اور اس سے متعلق مباحث پر گفتگو کرتے تو انکی گل افشانی گفتار دیکھنے کے لائق ہوتی تھی، مولانا اصلاحی کو اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ سے قرآن فہمی اور عربی زبان و ادب کا ذوق ورثے میں ملا تھا وہ مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم کے گہرے علم اور وسیع معلومات سے فائدہ اٹھانے کے لیے مختلف النوع سوالات کرتے، کبھی قرآن مجید کے الفاظ کے معانی دریافت کرتے، کبھی کسی آیت کا مفہوم معلوم کرتے، کبھی کسی جاہلی شاعر کے کسی شعر کا مطلب پوچھتے، کبھی کسی حدیث یا فقہی مسئلہ کے بارے میں استفسار کرتے، مولانا ابوالجلال صاحب جب ان متنوع سوالات کا جواب دیتے تو نہ معلوم علم و فن کے کتنے نکتے اور گوشے بے نقاب کرتے جاتے تھے، مولانا اختر احسن صاحب نے ان سے خواہش کی کہ وہ عبرانی زبان انہیں سکھا دیں، مولانا ابوالجلال صاحب بے تکلف اس کے لیے تیار ہو گئے۔

مولانا ابوالجلال صاحب کو شعر و سخن کا اچھا ذوق تھا، وہ کبھی کبھی مشق سخن بھی کرتے تھے، معارف میں خود شاعری اور بعض اردو شعرا کے دواوین پر انھوں نے تبصرے بھی لکھے ہیں، ان کو اردو کے علاوہ عربی اور فارسی کے بھی بے شمار اشعار یاد تھے، مولانا اختر احسن صاحب کے یہاں کی نشستوں میں عرب شعرا کے اشعار سنا کر انکے

ادبی نکتے بیان کرتے اور فردوسی کے شاہنامہ اور حافظ کی غزلوں کی خوبیاں واضح کرتے، اردو شعرا کا کلام بھی زیر بحث آتا، جگر مرادآبادی مرحوم کے اشعار کو بہت لطف ولذت لے کر پڑھتے تھے۔

اعظم گڈھ کے شعرا میں مولانا اقبال احمد خاں سہیل مرحوم سے بڑا تعلق رکھتے تھے، ان کی ذہانت، طباعی اور بذلہ سنجی کے بڑے معترف تھے، ایک روز کہنے لگے کہ سہیل مرحوم نے ایک مرتبہ جگر مرادآبادی کے کسی شعر کا مفہوم بیان کیا، جگر صاحب بھی موجود تھے ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کے شعر کا یہی مطلب ہے، انھوں نے کہا ابھی تک تو نہیں تھا مگر اب یہی ہے۔ مولانا سہیل کو بھی مولانا ابوالجلال صاحب سے بڑی دلچسپی تھی ان پر بعض نظمیں بھی کہی تھیں، جن کے بعض اشعار مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لطف ولذت کے ساتھ سناتے تھے، اپنی وضع قطع لباس اور غذا کی کوئی پروا نہ تھی جو موٹا جھوٹا مل جاتا پہن لیتے اور کھا لیتے۔

مولانا کو نہانے دھونے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی، جو کپڑا پہن لیتے کئی کئی دن پہنے رہتے اور جس حال میں ہوتے اسی میں جہاں جانا ہوتا تھا چلے جاتے تھے، کپڑے پھٹ جاتے تب بھی انہیں پتہ نہ چلتا۔

ایک دفعہ پروفیسر خورشید احمد نے اسلامی قانون کے موضوع پر کسی مذاکرہ کا اہتمام کیا تھا، اپنے عزیز شاگرد جناب افتخار اعظمی[1] کے اصرار پر مولانا بھی مذاکرہ میں

---

[1] یہ مولانا سہیل کے عزیز اور تربیت یافتہ تھے اور انھوں کے ایما سے مولانا ابوالجلال صاحب سے مقدمہ ابن خلدون اور دوسری کتابیں پڑھیں، ابتدائی تعلیم مدرستہ الاصلاح میں پائی تھی، ان کا ایک مضمون معارف میں شاہ صاحب کے اس نوٹ کے ساتھ چھپا تھا " لسانیات یعنی فیلالوجی اگرچہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۶ پر)

شرکت کے لیے تشریف لے گئے، مگر وہی کپڑے، جو کئی دنوں سے پہنے ہوئے تھے ان کو اور کھڑاؤں پہن کر گئے، ان کی یہ وضع قطع دیکھ کر کسی نے ان کی جانب توجہ نہیں کی لیکن جب بحث و گفتگو میں حصہ لیا تو اپنی مرتب، پُراز معلومات اور عالمانہ گفتگو کی وجہ سے پورے مجمع پر چھا گئے، ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور تمام حاضرین انکی دقت نظر، استحضار اور علم و مطالعہ کی وسعت سے مرعوب ہو گئے۔

مولانا خلافت تحریک کے دور کے آدمی تھے، کانگریس سے ذہنی طور پر برابر وابستہ رہے، ہمیشہ کھدر کا کرتا پائجامہ پہنتے تھے، خلافت اور نان کوآپریشن کے زمانے کے بعض مشاہیر زعما سے ان کے تعلقات بھی تھے، پنڈت جواہر لال نہرو انھیں مولانا ابوالجلول کہا کرتے تھے، ایک دفعہ پنڈت جی نے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے دارالمصنفین کے لوگوں کی خیریت دریافت کی تو کہا مولانا ابوالجلول کا کیا حال ہے۔

تحریک پاکستان کے وہ مخالف رہے مگر یہ اتفاق ہے کہ انکی تینوں صاحبزادیاں اپنے شوہروں کے ساتھ اور غالباً اکلوتے صاحبزادے وہیں چلے گئے، جس کے بعد انکی اہلیہ بھی وہیں چلی گئیں، ان سب نے ان کو بھی پاکستان آنے کی دعوت دی مگر یہ کسی طرح

(بقیہ حاشیہ ص۱۳۵) ایک خشک علم ہے، مگر جن لوگوں کو اس سے ذوق ہے، ان کے لیے بہت دلچسپ ہے، انتصار اعظمی ایک ہونہار نوجوان ہیں، ان میں فیلالوجی اور شعر و ادب کا اجتماع ِ قدرتی ہے، فیلالوجی سے ذوق ہمارے سابق رفیق مولانا ابوالجلال صاحب ندوی کے فیض صحبت کا نتیجہ ہے، اور ذوق شعری مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل کی تربیت کا ...." (معارف نومبر ۱۹۵۳ء) افسوس انھوں نے اپنی استعداد و صلاحیت کی قدر نہیں کی اور ابھی چند ماہ پہلے لندن میں انتقال کر گئے۔

ہندوستان چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے آخر وہ جب تھک گئے تو انھوں نے موہن جوڈارو کے کتبے اور مہریں پڑھنے کا لالچ دلایا اس کی وجہ سے وہ تیار ہوگئے، بالآخر ۱۰ محرم ۱۴۰۵ھ /۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو داعی اجل کا پیام آگیا اور مولانا کراچی کی خاک کا پیوند ہوگئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

مولانا ابو الجلال صاحب صرف علمی آدمی تھے، ان کا اوڑھنا بچھونا علم تھا، مطالعہ، تحقیق اور تصنیف و تحریر میں ہمیشہ منہمک رہتے تھے، دنیا کے بکھیڑوں اور جھمیلوں سے ان کو کوئی واسطہ نہیں رہتا تھا اس لیے وہ ان بہت سی برائیوں اور خرابیوں سے محفوظ رہے جن میں اکثر لوگ پڑ جاتے ہیں، غیبت، بدخواہی، دوسروں کی شکایت اور عیب جوئی سے ہمیشہ دور رہے، ضرر رسانی کا مادہ ہی ان میں نہ تھا، غرور و تمکنت کا شائبہ بھی ان میں نہ تھا، کبھی اپنی علمی فضیلت و برتری کا احساس نہ ہوا، نہ کبھی کسی عہدہ و منصب کے طالب ہوئے اور نہ مال و زر کی ہوس کی، ہمیشہ اپنے حال میں مست اور علمی مجذوب بنے رہے، طبعاً نیک، شریف اور بامروت تھے، سادگی، قناعت اور تواضع کا مجسم نمونہ تھے، بناوٹ اور تصنع سے ان کی زندگی بری تھی۔ علمی اشتغال نے آرائش و نمایش اور شان و شوکت وغیرہ سے انہیں بالکل بے نیاز کر دیا تھا۔

اپنی افتاد طبع کی بنا پر وہ کوئی کتاب تو نہیں مکمل کر سکے لیکن معارف اور بعض دوسرے رسالوں میں ان کے جو مضامین چھپے ہیں اگر ان کو یکجا کر دیا جائے تو علمی ذخیرہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔

تاریخ گوئی کی روایت کا آغاز

از ڈاکٹر عبدالرب عرفان ۔ ناگپور

تاریخ گوئی بصورت مادہ، جسے اصطلاح میں معنوی تاریخ کہتے ہیں، ایک دماغ سوز فن ہے جو مختلف النوع واقعات کے سالہائے سنوح کو صحت کے ساتھ محفوظ رکھنے کا ایک معتبر اور دلچسپ وسیلہ ہے۔ نوعیت کے لحاظ سے اس کا شمار تفننات ادبی میں کیا جاتا ہے، لیکن اس کی تاریخی اور تحقیقی افادیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہ فن صرف ان مشرقی زبانوں کا طرۂ امتیاز ہے جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں کیونکہ اس کی بنیاد عربی کے حروف ابجد کی عددی قدروں پر استوار ہے۔ اس فن کا ظہور کب اور کن عوامل کے تحت ہوا؟ اولین معنوی تاریخ (بصورت مادہ) کس نے اور کس واقعے کا سال بیان کرنے کی غرض سے کہی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو اب تک تشفی بخش اور قابل قبول جوابات سے محروم ہیں۔ مورخین ادب اور ارباب تذکرہ اس باب میں خاموش ہیں۔ دور حاضر کے بعض محققین کا خیال ہے کہ اس فن کے نقطۂ آغاز کی جستجو سلجوقی دور (۴۲۸ھ تا ۶۲۲ھ) کے سرمایۂ سخن میں کرنی چاہیے۔

بنیادی طور پر مادۂ تاریخ رقم یا بیان کرنے کے حسب ذیل چار طریقے ہیں جن میں سے ہر ایک کا ظہور ایران کی تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوا۔

(۱) مطلوبہ سال کے عدد کو صریحاً ہندسوں میں ثبت کرنا۔

(۲) سال کے عدد کو لفظوں میں رقم کرنا۔ اسے ملفوظی یا صوری تاریخ کہتے ہیں۔

(۳) سال کے عدد میں اکائی، دہائی، سیکڑے (اور سال کا عدد ایک ہزار یا اس سے متجاوز ہو تو) ہزار کی حیثیت سے آنے ہوئے ہندسوں کو ان حروف ابجد سے بدل دینا جن کی عددی قدریں ان ہندسوں سے عبارت ہیں۔ اسے حرفی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔

(۴) ایک یا ایک سے زائد ایسے بامعنی لفظوں کو شعر یا عبارت کا جزو بنانا کہ وہ جن مکتوبی حروف سے متشکل ہیں ان تمام کی عددی قدروں کا میزان مطلوبہ سال کے عدد کے برابر ہو اور اس لفظ یا مجموعۂ الفاظ سے متعلقہ واقعے کی نوعیت بھی واضح ہو جائے۔ ایسے لفظ یا مجموعہ الفاظ کو فن تاریخ گوئی کی اصطلاح میں مادۂ تاریخ کہا جاتا ہے۔ مادۂ تاریخ کبھی ایک لفظ سے متشکل ہوتا ہے، کبھی چند الفاظ سے، کبھی ایک مکمل مصرعے پر محیط ہوتا ہے اور شاذ و نادر ایک پورے شعر پر بھی۔ اصطلاح میں اسے معنوی تاریخ کہا جاتا ہے۔

پہلا طریقہ صرف نثر میں اختیار کیا جاتا ہے۔ بادی النظر میں اس کا تاریخ گوئی کے فن سے کوئی تعلق نہیں لیکن امعان نظر سے دیکھا جائے تو یہی طریقہ تاریخ بیان کرنے کے منقولہ بالا دوسرے اور تیسرے طریقوں کی بنیاد ہے۔ دوسرے طریقے میں ہندسوں کے نام تحریر کیے جاتے ہیں جبکہ تیسرے طریقے میں ہندسوں کے بجائے وہ حروف ابجد لکھے جاتے ہیں جن کی عددی قدریں ان ہندسوں سے عبارت ہوتی ہیں۔

گوناگوں واقعات کی تاریخیں بیان کرنے کا موخر الذکر طریقہ فارسی میں اس قدر مقبول خاص و عام ہوا اور ایجاد پسند طبائع نے نئے نئے اسالیب اور انداز پیدا کر کے اس فن کو اس قدر وسعت اور ترقی دی کہ اب صرف اسی طریقے پر فن تاریخ گوئی کا اطلاق

ہوتا ہے۔

صوری تاریخ کی قدامت فارسی میں واقعات کے سالہائے سنوح بیان کرنے کی روایت بہت قدیم ہے۔ تاریخ ضبط کرنے کے اس سیدھے سادے ملفوظی طریقے کے کاربرد کی قدیم ترین مثال ابوشکور بلخی کے ہاں پائی جاتی ہے۔ ابوشکور ایران کے سامانی دور (۲۶۱ھ۔ ۳۸۹ھ) کے اواسط میں گزرا ہے۔ وہ سامانی فرمانروا امیر حمید نوح بن نصر (متوفی ۳۴۳ھ) کے دربار سے وابستہ تھا۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق اسے مثنوی کا اولین شاعر تسلیم کرتے ہیں[۱۵]۔ عوفی اس کی مثنوی کا نام "آفرین نامہ" اور اس کا سال تکمیل ۳۳۶ھ بیان کرتا ہے[۱۶]۔ اس کے آغاز کا سال خود ابوشکور اس طرح بیان کرتا ہے:

مر این داستان کش بگفت از خیال[۱۷] ابر سی صد و سی و سه بود سال[۱۸]
۳۳۳

نظم میں سال بیان کرنے کی یہ قدیم ترین مثال ہے جو دست برد ایام سے محفوظ رہ سکی ہے۔ ممکن ہے اس سے پہلے بھی کسی نے تاریخ نظم کی ہو لیکن ایسی کسی مثال کے دریافت کیے جانے تک منقولہ بالا بیت ہی اس سلسلے کی اولین کڑی تسلیم کی جاتی رہے گی۔

"آفرین نامہ" کے سال آغاز کے کم و بیش اٹھاون[۵۸] سال بعد کسائی مروزی نے اپنی شرح حال میں ایک قصیدہ کہا اس کے افتتاحی دو شعروں میں وہ اپنی ولادت کا واقعہ، دن تاریخ اور ماہ و سال کی صراحت کے ساتھ اس طرح بیان کرتا ہے:

بسیصد و چهل و یک رسید نوبت سال چهار شنبه و سه روز باقی از شوال
۳۴۱

بیامدم بجهان تا چه گویم و چه کنم سرود گویم و شادی کنم بنعمت و مال[۱۹]

کسائی نے یہ قصیدہ نصف خود پچاس[۵۰] برس کی عمر میں کہا تھا۔ کہتا ہے:

ایا کسائی! پنجاه[۵۰] بر تو پنجه گذاشت بکند بال ترا زخم پنجه و چنگال[۲۰]

اس حساب سے اس قصیدے کی وضع کا سال ۳۹۱ھ قرار پاتا ہے۔ اس کے مطلع کے مصرع ثانی میں کسائی نے اپنی ولادت کی تاریخ "بیست و ہفتم شوال" (یا انتیس[29] دن کا مہینہ ہونے کی صورت میں "بیست و ششم شوال") کو بیان کرنے کے لیے صراحت الفاظ سے کام لینے کے بجائے ایک دلچسپ شاعرانہ انداز اختیار کیا ہے۔ اگرچہ "سہ روز باقی از شوال" کہہ کر مطلوبہ تاریخ کی نشاندہی کرنے میں یہ قباحت ضرور ہے کہ سال ۳۹۱ھ کے ماہ شوال کے دنوں کی تعداد معلوم کیے بغیر وثوق کے ساتھ درست تاریخ کا جاننا ہرگز ممکن نہیں لیکن بیان کے اس سلیقے نے پہلی بار تاریخ گوئی میں حساب کے قاعدوں سے کام لیے جانے اور مستقبل میں انھیں اس فن کا ایک مستقل جزو بنائے جانے کے امکانات روشن کیے۔ ملفوظی تاریخ میں حساب کے کسی قاعدے سے مدد لینے کی یہ اولین کوشش ہے۔ اس کی قدرے ترقی یافتہ اور خاص دلآویز صورت شاہنامۂ فردوسی میں پائی جاتی ہے۔ وہ فارسی ادب کے اس عظیم ترین رزمیے کا سال تکمیل یوں بیان کرتا ہے:

زہجرت شدہ پنج ہشتاد بار   کہ گفتم من ایں نامۂ شاہوار

۵ × ۸۰ = ۴۰۰ھ

فردوسی جیسے قادر الکلام استاد کے لیے "چہار صد" کا شاہنامے کی بحر (متقارب مثمن محذوف / مقصور) میں آنا ہی نہیں "چہار صد" لانا قطعی دشوار نہیں تھا مگر اسے تو اپنی جدت پسند فطرت کی تسکین منظور تھا۔ چنانچہ اس نے شاہنامے کی تکمیل کا سال بیان کرنے میں ریاضی کے قاعدۂ ضرب کو اس حسن و خوبی کے ساتھ برتا کہ ضبط تاریخ کا یہ اسلوب مستقبل کے فنکاروں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ ثابت ہوا۔ انھوں نے اس فن میں ریاضی کے دیگر قاعدوں (جمع، تفریق، تقسیم وغیرہ) کو بھی داخل کر کے اس کے کینوس کو وسعت بخشی۔ ضبط تاریخ کا یہ طریقہ اتنا مقبول ہوا کہ صرف ملفوظی ہی نہیں بلکہ

معنوی تاریخ کا بھی ایک اہم شعبہ قرار پایا اور صنعت ریاضی کے نام سے موسوم کیا گیا۔

شاہنامہ فردوسی کی تکمیل سے چھے سال پہلے حکیم ناصر خسرو کی ولادت ہوئی تھی۔

یہ بات خود اسی کے ایک قصیدے سے معلوم ہوتی ہے جس میں اس نے ابتدائے حال سے خلفائے فاطمی کے دربار تک پہنچنے تک کے اپنے سفر حیات کے اہم حالات بیان کیے ہیں۔

اس قصیدے کی تصنیف کے وقت وہ اپنی عمر کی صراحت اس طرح کرتا ہے:

بیہودہ شد از گنبد بر من چہل و دو[۴۲] جویای خرد گشت مرا نفس سخنور[۸]

اسی میں وہ اپنی ولادت کا سال بھی بیان کرتا ہے:

بگذشت ز ہجرت پس سیصد نود و چار بگذاشت مرا مادر بر مرکز اغبر[۹]
۳۰۰ + ۹۴ = ۳۹۴

اس ملفوظی تاریخ میں حسابی داؤ پیچ کا ایک پہلو موجود ہے جو عبارت ہے،

"پس سیصد نود و چار" (تین سو کے بعد چورانوے : ۳۰۰ + ۹۴ = ۳۹۴) سے

لیکن فردوسی کی سی بات اس میں نہیں۔

ناصر خسرو کے اس قصیدے کے سال تصنیف کے قریباً بائیس[۲۲] سال بعد ۴۵۸ھ

میں اسدی طوسی کی مثنوی گرشاسپ نامہ پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ اس کا سال اتمام بیان کرنے

کے لیے اس نے وہی ابتدائی طریقہ اختیار کیا جو ابوشکور بلخی اور کسائی مروزی کے ہاں پایا

جاتا ہے۔ اسدی کہتا ہے:

شد این داستان بزرگ اسپری به پیروزی روز و نیک اختری
ز ہجرت بدو بر سپہری کہ گشت شدہ چارصد سال و پنجاہ و ہشت[۱۰]
۴۵۸

چھٹی صدی ہجری کی چوتھی دہائی تک اشعار میں واقعات کے سال بیان کرنے کا یہی

ملفوظی طریقہ رائج رہا۔ چنانچہ حکیم سنائی اپنے مہتم بالشان صوفیانہ کارنامے حدیقۃ الحقیقۃ

و شریعۃ الطریقۃ" کے سالہائے آغاز و اختتام (۵۲۴-۵۲۵ھ) اس طرح نظم فرماتے ہیں:

شد تمام این کتاب در مہ دی کہ در آغاز فگندم این را پی

پانصد و بیست و چار رفتہ زمام پانصد و بیست و پنج گشت تمام[۱۱]

اس روایت کی پابندی کرتے ہوئے انوری ابیوردی نے بھی جیسے آئندہ صفحات میں تاریخ گوئی کے مجتہد کی حیثیت میں دیکھیں گے، چند لفظی تاریخیں بیان کی ہیں۔ اسکی اولین تاریخ عصمۃ الدین رضیۃ الملوک کی علالت کے موقعے پر ایک طویل مدح آمیز دعائیہ قطعے میں شامل ہے۔ اس کے آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعہ ۵۳۰ھ میں کہا گیا ہے:

عدد سالہای مدت تو ہمچو تاریخ پانصد و سی وانہ[۱۲]

دوسری تاریخ اس واقعے کا سال بیان کرتی ہے جو عبارت ہے ۵۳۳ھ میں عمادالدین فیروز شاہ احمد کی دعوت پر انوری کے لبیک کہنے اور اس کے پائے تخت کی جانب رہ سپار ہونے سے:

سال بر پانصد و سی و سہ ز تاریخ عرب گفت: برخیز کہ از شہر برون شد بہر او[۱۳]

ایک قصیدے میں اپنے ممدوح ابوالحسن عمرانی کے محل کی صفت بیان کرتے ہوئے اسے دعا دیتا ہے کہ اس کی عمر کے سال اس وقت کے جاری سال (۵۴۰ھ) کے مانند (برابر) ہوں:

عدد سالہای عمرش باد ہمچو تاریخ پانصد و چل واند[۱۴]

حرفی تاریخ کا نقش اول عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مشہور داستان سرا نظامی گنجوی حرفی تاریخ گوئی کا موجد ہے اور اس کی مثنوی لیلیٰ و مجنوں کے درج ذیل اشعار اس

سلسلے کے اولین نقش ہیں :

آراستہ شد بہ بہترین حال در سلخ رجب بہ ثی و فی دال
۵۸۴ = ۴ + ۸۰ + ۵۰۰

تاریخ عیاں کہ داشت با خود ہشتاد و چہار بعد پانصد فلہ
۵۸۴ = ۵۰۰ + ۸۴

پہلے شعر میں حروف مجرد ثی (ث)، فی (ف) اور دال (د) کی عددی قدریں علی الترتیب ۵۰۰، ۸۰ اور ۴ ہیں جن کا میزان ۵۸۴ مطلوبہ ہجری سال ہے۔ چونکہ نظامی نے دوسرے شعر میں ملفوظی طریقے سے "تاریخ عیاں" (ہشتاد و چہار بعد پانصد) بیان کر کے اپنی حرفی تاریخ کی صراحت بھی کر دی ہے، اس لیے گمان ہوتا ہے کہ خود نظامی کو اپنی اس تاریخ پر نقش اول ہونے کا یقین اور اس خصوص میں اپنی اولیت کا شعوری احساس رہا ہوگا۔ ڈاکٹر یعقوب عمر شاید اسی وجہ سے غلط فہمی کے شکار ہو کر نظامی کو سلسلۂ تاریخ گوئی کی "سب سے پہلی کڑی" قرار دیتے ہیں[۱۶]۔ اپنے مضمون "تاریخ گوئی فارسی اور اردو میں" میں تحریر فرماتے ہیں :

"نظامی سے مجد ہمگر تک تقریباً سو سال بعد بھی بے معنی حروف ابجد اپنے حقیقی تلفظ کے ساتھ استعمال ہوتے رہے ہیں"[۱۷]

اس سے ڈاکٹر صاحب کی مراد غالباً یہ ہے کہ نظامی سے مجد ہمگر تک ملفوظی تاریخوں کے ساتھ صرف حرفی تاریخیں ضبط کرنے کا رواج رہا ہے، نیز معنوی تاریخ مجد ہمگر سے پہلے اور حرفی تاریخ نظامی سے قبل دریافت نہیں کی گئی تھی۔ یہ دونوں ہی باتیں جو منقولہ بالا بیان سے مستنبط ہوتی ہیں، قرین صحت نہیں۔ موصوف اپنی ناکافی اطلاعات کی بنیاد پر خواجوی کرمانی کو معنوی تاریخ کا مخترع تسلیم فرماتے ہیں۔ محولہ بالا مضمون میں رقمطراز ہیں :

"..... خواجوی کرمانی کے زمانے میں کچھ انقلاب نظر آتا ہے۔ انھوں نے دو طریقوں سے تاریخ نکالی ہے..... مثنوی روضۃ الانوار کی تاریخ یوں نظم کرتے ہیں: جیم زیادت شدہ بر میم دال (ج + م + د) ۷۴۳ھ۔ جبکہ ۷۳۲ھ میں تحریر کردہ مثنوی ہمای وہمایوں کی تاریخ با معنی لفظ "بذل" سے نکالتے ہیں:

کنم بذل بر ہر کہ دارد ہوس　　کہ تاریخ این نامہ بذل ست و بس"

جہاں تک حرفی تاریخ گوئی کی روایت کا تعلق ہے، نظامی اس سلسلے کی پہلی نہیں تیسری کڑی ہے۔

اس سلسلے کی دوسری کڑی خاقانی ہے جس نے نظامی کی لیلیٰ ومجنوں کے سال تکمیل ۵۸۴ھ سے تینتیس سال پہلے ایک حرفی تاریخ (ثا نون الف) بیان کی ہے۔ اس کی نشاندہی ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے فرمائی ہے۔ وہ اپنے مضمون "صنادید تاریخ گوئی" میں رقمطراز ہیں:

"ایسی تاریخیں جن میں اعداد کی جگہ حروف جمل کا استعمال کیا جاتا ہے، غالباً چھٹی صدی ہجری/ بارہویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں لکھی گئی تھیں۔ مشہور شاعر خاقانی نے اپنے قصیدے میں جو اس نے جمال الدین اصفہانی وزیر موصل کی مدح میں کہا تھا، یہ شعر شامل کیا ہے:

در سنہ ثانون الف بحضرت موصل　　ماندم ثانون الف سزای صفاہان

اس میں "ثانون" "الف" جز حروف ہیں۔ شاعر نے ان کو ملا کر با معنی کلمہ "ثنا" نظم نہیں کیا ہے..... ثانون الف سے کوئی مطلب مستفاد نہیں ہوتا"

راقم السطور کو اس سے سخت اختلاف ہے کہ "ثانون الف" سے کوئی مطلب مستفاد نہیں ہوتا۔ اگر چہ یہاں حروف کے نام علاحدہ علاحدہ لکھے گئے ہیں لیکن خاقانی نے ان سے

با معنی اور برمحل لفظ "ثنا" کے متشکل ہونے کی جہت میں واضح اشارات کیے ہیں۔ زیر بحث شعر کے ساتھ اس سے پہلے کے دو[۲] اور شعر ملاحظہ فرمائیں:

اینک ختم الغرائب[۲۸] آخر دیدند — تا چه ثنا رانده ام برای صفاہان
مدح دو فاروق دین چگونہ کنم من — صدر و جمال[۲۹] آن دو مقتدای صفاہان
در سنہ ثا نون الف بحضرت موصل — ماندم ثا نون الف ثنای صفاہان[۳۰]

ملحوظ خاطر رہے کہ خاقانی نے "ثنا راندن" (یعنی مدح کرنا) پہلے شعر میں کلمہ "ثنا" کے ساتھ اور تیسرے شعر میں اس کے منفصل حروف کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ بادی النظر میں تیسرے شعر کے مصرع اول میں حروف منفصل "ثا نون الف" سے محض سال ۵۵۱ھ بیان کیا گیا ہے لیکن اس کے مصرع ثانی میں "ماندم ثا نون الف" سے شاعر کی مراد "راندم ثنا" (یعنی میں نے ثنا کی) کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟ راقم السطور کے خیال میں یہ حرفی تاریخ معنوی تاریخ کی حدوں میں داخل ہو چکی ہے۔

اس کے باوجود حرفی اور معنوی تاریخوں کے آغاز کے سلسلے میں خاقانی کی منقولہ[۱] تاریخ کو اولیت کا مقام حاصل نہیں۔ اس تاریخ کی دریافت سے گیارہ[۱۱] سال پہلے انوری نے حروف ابجد سے سال بیان کرنے کی روایت کا آغاز کیا۔ انوری اپنے قصیدے "در مدح خواجہ ناصر الدین ابو الفتح طاہر" کا آغاز ان اشعار سے کرتا ہے:

بحکم دعوی زیج و گواہی تقویم — شب چہارم ذوالحجہ سنہ ثامیم
شبی کہ بود شب ہفدہم ز آیا نماہ — شبی کہ بود نہم شب ز تیر ماہ قدیم
شمار دیگر یکشنبہ از مہ بہمن — کہ تا ذوائل اسفندار ندید از تقویم

خاقانی کا "ثا نون الف" انوری کے "ثا میم" کی تقلید ہونے کی صاف غمازی کر رہا ہے

مگر اس فرق کے ساتھ کہ "نانون الف" کو باہم ملانے سے ایک بامعنی لفظ "ثنا" بنتا ہے اور اس کا شعوری احساس خاقانی کو یقیناً رہا ہوگا ورنہ وہ اسے اس کی اصل مکتوبی شکل میں بھی استعمال نہ کرتا۔

معنوی تاریخ کا ظہور | تاریخ گوئی کے اس طرز کی اختراع کے صرف دو[2] سال بعد انوری نے اجتہاد کی راہ میں ایک اور قدم بڑھایا اور اس کی فنی صلاحیتوں کی بدولت معنوی تاریخ کا نقش اول صورت پذیر ہوا جسے نقش ثانی سے بدرجہا بہتر اور مکمل تر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ ناصرالدین داؤد کے نو تعمیر شدہ محل کی تعریف کرتے ہوئے وہ اس کی تکمیل کی تاریخ دو[2] بامعنی اور برمحل لفظوں میں دریافت کر کے اس طرح نظم کرتا ہے:

بود در نقش فرح نمودش بکام　　تا "فرح" تاریخ این نقشست و "نمود"[26]

۵۴۲ھ = ۲۵۴

اس تاریخ کو اتفاقات کی دین نہیں کہا جا سکتا۔ خاقانی کو حسن اتفاق سے ۵۰۰، ۵۰ اور ۱، کی عددی قدروں کے حامل حروف علی الترتیب "ش، ن، ا" مل گئے تھے مگر انوری کو اپنے ممدوح کی محلسرا کے کار تعمیر کی تکمیل کا سال بیان کرنے کے لیے "فرح" اور "نمود" جیسے بامعنی اور برمحل الفاظ آسانی سے نہیں ملے ہوں گے۔ ان کی تلاش کیلئے اسے اپنی ذہنی قوتوں اور فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑا ہوگا۔ ان لفظوں کی دریافت اور ان کے حسن استعمال میں انوری کی ریاضی دانی اور حساب جمل میں اس کی مہارت بھی کارفرما رہی ہوگی۔ اس خیال کی تائید و توثیق ان معموں سے ہوتی ہے جن سے اس نے سلطان سنجر اور دیگر ممدوحین کی مدح و ستایش کا کام لے کر انتہائی ذہانت و فطانت کا ثبوت دیا ہے۔ چونکہ انوری کے بیشتر معموں کی بنیاد حساب جمل کی زمین پر استوار ہے اس لیے قوی احتمال ہے کہ تاریخ گوئی کی حرفی اور معنوی ہر دو روایت

کے چشمے اسی زمین سے پھوٹے ہوں گے۔ انوری کے معموں کا ہمارے موضوع سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس اعتبار سے، مثال کے طور پر دو علاحدہ نوعیتوں کے معموں کا ایراد ان صفحات میں بے محل نہ ہوگا۔ وہ اپنے کسی ولی نعمت سے کوئی چیز طلب کرتا ہے۔ وہ کون سی چیز ہے؟ ملاحظہ فرمائیں:

مالِ[۲۶] چہار بنگر و جذرش برو فزای　　پس ضرب کن تمامت این مال در چہار
اینک دو حرف گفتہ شد اندر دو نیم بیت　　چون رای تو متین و چو حزم تو استوار
یک حرف دیگر است کہ بی آن تمام نیست　　معنی آن دو خواہ نہان خواہ آشکار
مجموع این حساب کہ این ہر دو حرف راست　　چون در سہ ضرب شد بود آن کار چون نگار
اینست التماس، دگر نا روا بود　　از تو روا ندارد، ہم تو روا مدار[۲۸]

اس کا حل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) چار کے مال یعنی مجذور میں اس کے جذر یعنی چار کا اضافہ کیا جائے: ۴×۴ = ۱۶ + ۴ = ۲۰ ــــ یہ عددی قدر ہے حرف کاف کی۔

(۲) پھر اس تمام مال یعنی مجذور اور جذر کے مجموعے (۱۶+۴ = ۲۰) کو چار سے ضرب دیا جائے: ۲۰×۴ = ۸۰ ــــ یہ عددی قدر ہے حرف فے کی۔

(۳) ان دو حروف کی عددی قدروں کے مجموعے (۲۰ + ۸۰ = ۱۰۰) کو تین سے ضرب دیا جائے: ۱۰۰×۳ = ۳۰۰ ــــ یہ عددی قدر ہے حرف شین کی۔
ان تینوں حروف (ک، ف، ش) سے تشکیل پاتا ہے لفظ کفش یعنی پاپوش۔

ایک مدحیہ قطعے میں اعداد ابجد اور حساب کے قاعدوں کے امتزاج سے سلطان سنجر کی مدح کا ایک اچھوتا اور چونکا دینے والا گوشہ[۲۹] ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس کی مثال

فارسی ادب کی تاریخ میں انوری سے پہلے نایاب ہے اور جہاں داری اور فرماں روائی میں سلطان سنجر کی دیگر فرماں رواؤں پر برتری کی دلیل پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

سیصد و سیزدہ (۳۱۳) پیغمبر مرسل بودند　　کہ فرستاد بہر وقت یکی را یزدان

نام سلطان بجمل چون عدد ایشانست　　پس بود قاعدۂ نظم جہاں چون ایشان

فاد ہر کہ ببیند بہ انصاف کہ او　　پادشاہیست بحق، بر ہمہ معمور جہان

گر ترا شبہت و شکیست درین دانی چہ؟　　شبہت و شک ترا حل نکند جز قرآن

شو اولی الامر بخوان پس عدد آن بشمار　　بحساب جمل و مبلغ آن نیک بدان

تا بود راست حسابش چو حساب سنجر　　چونکہ داوی کہ نہ مقروست کنی ز دنقصان

گر کسی گوید: ما صد ہمہ سنجر تا میم　　گو بیش: نی نی "منکم" چو "اولی الامر" بخوان

زانکہ "منکم" ز شما باشد از روی لغت　　باز از روی حساب ار تو بدانی سلطان

پس یقین شد کہ پس از باری و پیغمبر حق　　نرسد بر ہمہ آفاق جز او را فرمان

اس مرصع معے کی پوری عمارت آیۂ کریمہ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" کے الفاظ کی عددی قدروں کی بنیاد پہ کھڑی کی گئی ہے۔ ان اشعار کا ماحصل اور ان میں بیان شدہ معے کا حل سطور ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

دنیا میں ۳۱۳ پیغمبر بھیجے گئے۔ از روے جمل سلطان کے نام "سنجر" کا عدد بھی ۳۱۳ ہے (س ۶۰ + ن ۵۰ + ج ۳ + ر ۲۰۰ = سنجر ۳۱۳)۔ اس دلیل سے وہ معمورۂ جہاں میں امن و امان قائم کرنے کے لیے خدا کی جانب سے بادشاہ بنایا گیا۔ اس امر میں کسی کو کوئی شک و شبہہ ہو تو اسے نص قرآنی سے رفع کیا جا سکتا ہے۔ پہلے "اولی الامر" کے حروف کی عددی قدروں کے میزان کو دیکھا جائے (ا ۱ + و ۶ + ل ۳۰ + ی ۱۰ + ا ۱ + ل ۳۰ +

ا/۱ + م/۴۰ + ر/۲۰۰ = اولی الامر (۳۱۹)۔ اس عدد کو سنجر کے عدد (۳۱۳) کے مساوی کرنے کے لیے "اولی الامر" کے واو غیر مقروء کے عدد (۶) کو خارج از حساب قرار دیا جائے (۳۱۹ - ۶ = ۳۱۳) گویا سنجر (۳۱۳) ہی اولی الامر (۳۱۳) ہے۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ "ما صد ہمہ سنجر نامیم" (ہم سیکڑوں افراد سنجر نام کے ہیں)۔ اسے چاہیے کہ "منکم" کو جس کے معنی از روے لغت "از شما" (یعنی تم میں سے) ہیں، "اولی الامر" کی طرح پڑھے۔ پھر حساب جمل کے طریقے سے منکم (م/۴۰ + ن/۵۰ + ک/۲۰ + م/۴۰ = منکم ۱۵۰) اور سلطان (س/۶۰ + ل/۳۰ + ط/۹ + ا/۱ + ن/۵۰ = سلطان ۱۵۰) کے اعداد نکالے اور دیکھ لے کہ دونوں برابر ہیں۔

انوری حساب جمل کی اس بازیگرانہ دلیل سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ سنجر سے مراد اس نام سے موسوم سیکڑوں عام آدمیوں میں سے کوئی نہیں بلکہ صرف اور صرف سلطان سنجر ہے جو صاحب امر ہے۔

اسی طرح ایک اور دلچسپ مدحیہ قصیدے میں کہتا ہے: رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک پہاڑ پر ہوں جس کی چٹانیں لعل، نبات اور عود کی ہیں اور خاک عنبر کی۔ آسمان کی طرف دیکھا تو مجھے زر و گوہر سے بنا ہوا ایک منبر دکھائی دیا۔ اس پر ایک سراپا روحانیت بزرگ نمودار ہوئے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا وہ کون ہو سکتا ہے کہ ہاتف نے میرے "گوش جاں" میں کہا: وہ پیغمبر ہیں۔ انھوں نے ایک خطبے کا آغاز کیا اور،

بعد توحید خدای این گفت: ای صاحبقران | شکر کن کند ہمہ کاری خدایت یاورست

بار دیگر گفت کای صاحبقران برخورز ملک | زانکہ ملکت ہیچ جای شخص جاوید را درخورست

باز نہی کرد کای صاحبقران راضی مباش | تا ترا گویند کو در ملک چون اسکندرست

حق تعالیٰ با سکندر ہرگز این احسان نکرد　　خسروا! تو دیگری کارِ تو کار دیگرست...

بر من و تو ختم شد پیغمبری و خسروی　　این سخن نزدیک ہر کو عقل دارد باورست

چون سخن اینجا رسید الحق مرا بر دل گذشت　　کین کدامین پادشاہ عادل دین پرورست

زیورِ این خطبہ ہر باری کہ: ای صاحبقران　　بر کری بندہ بہ کہ او شایستۂ این زیورست

گفت: بر سلطان دین سنجر کہ اندر وی حساب　　عقدِ ای صاحبقران چو عقد سلطان سنجرست [۳۱]

یعنی زیورِ خطبہ "ای صاحبقران" سے سلطان سنجر کی ذات مراد تھی کیونکہ "ای صاحبقران" اور "سلطان سنجر" کے اعداد حساب جمل کی رو سے مساوی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

ا/۱ + ی/۱۰ + ص/۹۰ + ا/۱ + ح/۸ + ب/۲ + ق/۱۰۰ + ر/۲۰۰ + ا/۱ + ن/۵۰ = ای صاحبقران ۴۶۳

س/۶۰ + ل/۳۰ + ط/۹ + ا/۱ + ن/۵۰ + س/۶۰ + ن/۵۰ + ج/۳ + ر/۲۰۰ = سلطان سنجر ۴۶۳

انوری کے دیوان میں اس طرح کے اور بھی کئی معمے شامل ہیں جو حساب جمل اور ریاضی میں اس کی غیر معمولی مہارت اور انہیں شعروں میں نت نئے طریقوں سے برتنے کی وافر صلاحیت کا پتہ دیتے ہیں۔ اس قسم کے معمے نہ انوری سے پہلے کسی شاعر کے دستیاب کلام میں پائے جاتے ہیں اور نہ اس کے معاصرین کے سرمایۂ سخن میں۔ گمان غالب ہے کہ انوری کے ذہن کی رسائی انہی معموں کی راہ سے اس معنوی تاریخ تک ہوئی ہوگی جو اس نے ناصر الدین داؤد کی محلسرا کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کے موقعے پر کہی ہے اور جس میں "نرد" اور "فرح" کے اعداد (۲۵۴ + ۲۸۸ = ۵۴۲) سے اس موقعے کا سال برآمد کیا ہے۔ فارسی شاعری کے روز اول سے زمانۂ حاضر تک کی تمام دستیاب اسناد و اطلاعات کی روشنی میں اسی مادۂ تاریخ کو معنوی تاریخ گوئی کی عظیم الشان روایت کا نقطۂ آغاز تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اسے خواجوی کرمانی کی مثنوی ہمای و ہمایون

کی تاریخ اتمام "بذل" (۲۳۷ھ) پر نہ صرف فنی برتری حاصل ہے بلکہ ۱۹۰ سال کا زمانی تقدم بھی۔

حواشی

سلہ تاریخ ادبیات ایران دکتر رضا زادہ شفق (اردو ترجمہ از مبارز الدین رفعت) دہلی ۱۹۸۵ء، ص ۵۴ سلہ لباب الالباب جلد دوم، ص ۲۱ ــــ ملک الشعرا بہار خراسانی نے آفرین نامہ کا سال تکمیل اپنی تاریخ تطور شعر فارسی (ص ۱۴) میں ۳۳۶ھ ثبت فرمایا ہے۔ اس کتاب کے حاشیہ نگار (ت۔ ب۔) تحریر فرماتے ہیں کہ آقائے عباس اقبال مجلۂ دانشکدہ میں لباب الالباب کے حوالے سے آفرین نامہ کا سال اتمام ۳۳۵ھ بیان کرتے ہیں (تاریخ تطور شعر فارسی: ص ۱۴ ح ۲) سلہ نیال: ابتداء زمین کہ اول باید بکارند (لغت فرس اسدی، چاپ تہران: ص ۳۲۰) سلہ تاریخ ادبیات ایران شفق (اردو ترجمہ): ص ۶۱ سلہ تاریخ ادبیات در ایران، جلد اول، دکتر ذبیح اللہ صفا: ص ۳۴۴ سلہ ایضاً: ص ۳۴۵ سلہ شاہنامہ، فردوسی، جلد پنجم، بکوشش محمد دبیر سیاقی، تہران ۱۳۳۵ش، ص ۲۶۰۰ سلہ تاریخ ادبیات در ایران، جلد دوم، دکتر صفا: ص ۴۴۷ سلہ ایضاً: ص ۴۴۵ سلہ ایضاً: ص ۵۶۱ سلہ حدیقۃ الحقیقۃ، مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۷ء: ص ۸۵۵ سلہ دیوان انوری، بکوشش سعید نفیسی: ص ۳۸۳ (اند: چند، کچھ، تھوڑا ــ مراد چند ماہ و روز) سلہ ایضاً: ص ۲۷ سلہ ایضاً: ص ۹۲ سلہ تاریخ ادبیات در ایران، جلد دوم: ص ۸۰۳ سلہ ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۰ء: ص ۲۰ سلہ ایضاً، ص ۲۸ سلہ ایضاً سلہ مجلہ دانش، شمارہ ۷-۵، ۱۳۶۵ش / ۱۹۸۷م، ص ۲۱۰ تا ۲۹۰ سلہ یہ قصیدہ جمال الدین اصفہانی کی مدح میں نہیں، اصفہان کی ستائش میں ہے۔ اس میں موصوف کا ذکر صدر الدین

فاروقی کے نام کے ساتھ ضمناً ہوا ہے [۲۱] مجلۂ دانش، شمارہ ۷ - ۵ : ص ۲۲۶ [۲۲] ختم الغرایب: اصفہان کے ایک تجارت پیشہ قبیلے کا نام جس سے ۵۵۱ ھ میں خاقانی کی ملاقات ہوئی تھی۔ اسی موقع پر اس نے یہ قصیدہ کہا تھا اور اس ملاقات کی نسبت سے اسے ختم الغرایب کے نام سے موسوم کیا [۲۳] صدر: صدرالدین فاروقی جن کا شمار اس دور کے متبحر عالموں میں کیا جاتا تھا۔ جمال الدین ہمدانی۔ یہ بھی فاروقی تھے اور اصفہان کے عہدۂ صدارت پر فائز تھے [۲۴] دیوان خاقانی شروانی، تہران ۱۳۳۶ ش : ص ۳۱۹ [۲۵] ایضاً، ص ۲۲۹ [۲۶] ایضاً، ص ۸۰۴ [۲۷] جب کسی عدد کو خود اسی عدد سے ضرب دیتے ہیں تو حاصل ضرب ریاضی دانوں کی اصطلاح میں اس عدد کا مال کہلاتا ہے، مثلاً ۴ کو ۴ سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب "۱۶" کو "۴" کا مال کہا جائے گا۔ اسے مجذور بھی کہتے ہیں۔ (فرہنگ آنندراج، جلد ششم، زیر نظر محمد دبیر سیاقی، ص ۵۲، ۳۰) [۲۸] دیوان انوری تہران: ص ۴۰۸

[۲۹] دیوان انوری (چاپ تہران) کے متن میں "اولو الامر" ہے مگر متعلقہ آیت کی درست قرأت یہ ہے: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (قرآن کریم، سورۂ نساء آیت نمبر ۶۲) یہ معما بھی "اولی الامر" ہی کا متقاضی ہے کیونکہ اسی قرأت کے ساتھ انوری کا حساب درست ہوتا ہے۔ "غلط نامہ" میں اسے درست بھی نہیں کیا گیا [۳۰] شعر میں "منکم" کا فارسی ترجمہ "چو شما" (یعنی تم جیسا) طبع ہوا ہے، اسے "ز شما" (یعنی تم میں سے) ہونا چاہیے۔ کیا عجب کہ انوری نے "ز شما" ہی لکھا ہو جو کسی نسخے کے کاتب کے تصرف سے "چو شما" کی صورت اختیار کر گیا ہو [۳۱] دیوان انوری چاپ تہران، ص ۴۳۰ - ۳۹ [۳۲] دیوان کے متن میں "جہان" (بجائے جان) ہے جو قطعاً درست نہیں۔ اس ایک محل نظر لفظ کی وجہ سے مصرع ساقط الوزن اور اس کا مفہوم غارت ہو گیا۔ "غلط نامہ" میں اس کی تصحیح نہیں کی گئی ہے [۳۳] دیوان انوری، چاپ تہران، ص ۳۴۵۔

استفسار و جواب

"قرآن پڑھنے والا منافق" سے کیا مراد ہے

جناب کالی داس گپتا رضا ⎫ ماہ جون کا شمارہ کل ملا۔ ص ۴۴۴ پر "قرآن پڑھنے
۴۳۔ اے جل درشن ⎬ والا منافق" کا ذکر ہے۔ یہاں منافق سے کیا مراد
نیپن سی روڈ بمبئی ۳۶۔ ⎭ ہے؟ میں نے قرآن (ترجمے کی مدد سے) ایک سے زیادہ

بار پڑھا ہے اور اسلیے پڑھا ہے کہ یہ مقدس کتاب مجھے پسند ہے۔ اپنی آگہی کے لیے جاننا چاہتا ہوں۔

معارف:۔ معارف ماہ جون ۹۴ء کے شمارہ میں صحیح بخاری کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس میں قرآن پڑھنے والے منافق سے دراصل بے عمل اور فاجر مومن مراد ہے، اسی تشبیہ کے ساتھ یہ روایت خود صحیح بخاری میں باب فضل القرآن علی سائر الکلام میں ان لفظوں میں نقل کی گئی ہے

ومثل الفاجر الذی یقرأ القرآن	قرآن پڑھنے والے بدکار شخص کی مثال اس خوشبودار
کمثل الریحانة ریحہا طیب وطعمہا مر	پودے جیسی ہے جسکی بو پاکیزہ مگر مزہ تلخ ہوتا ہے اور
ومثل الفاجر الذی لایقرأ القرآن	قرآن نہ پڑھنے والا بدکار حنظل جیسا ہے جس میں
کمثل الحنظلة طعمہا مر ولاریح لھا۔	خوشبو بھی نہیں ہوتی اور مزہ بھی کڑوا ہوتا ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی تشریح میں لکھا ہے کہ حدیث میں مذکورہ چاروں اقسام غیر منافقین ہی میں ممکن ہیں۔ کیونکہ کوئی شخص اگر عقیدہ کے نفاق میں مبتلا ہو تو اس کا کوئی عمل قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ (فتح الباری، جلد ۹۔ ص ۵۹ مطبوعہ مصر)

ع۔ ع۔

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

لاہور ۵ جولائی ۱۹۹۴ء

مکرمی و محترمی جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ پچھلے ماہ ہمیں ترکیہ کے محکمۂ اوقاف کی طرف سے ترکی انسائیکلوپیڈیا آن اسلام (اسلام انسیکلوپیدیسی) کی نویں جلد موصول ہوئی۔ یہ جلد حرف "د" سے شروع ہونے والے مقامات، مشاہیر، اہم کتب کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات ترکی کے رومن رسم الخط میں ہیں۔ اتفاق سے عنوانات عربی حروف میں ہیں جن سے مشمولات اور مندرجات کا پتہ چل سکتا ہے۔

دینی موضوعات پر مقالات حسب ذیل ہیں؛

دجال، دعوت، داؤد (علیہ السلام)، دین، درایۃ الحدیث اور دیت پر ہیں مشاہیر علماء میں داؤد الطائی۔ داؤد الظاہری، امام دبوسی اور تاریخ الخمیس کے مصنف پر مضامین ہیں؛

اہم اور مشہور کتب، مثلاً الضوء اللامع (السخاوی)، دلائل الاعجاز (عبدالقاہر الجرجانی)، دبستان مذاہب، کتب دلائل النبوۃ اور کتب دلائل الخیرات کا مفصل تذکرہ ہے۔ ان کے علاوہ دیوان کبیر (رومی) اور دیوان لغات الترک پر بھی مفصل تبصرہ ہے۔

اسلامی ہند کے مندرجہ ذیل مقالات کی تاریخ پر مضامین ہیں۔ (دہلی) (سیاسی تاریخ)

جامع مسجد دہلی، دولت آباد، دکن اور دیبل اور دہار۔

اسلامی ہند کے مندرجہ ذیل مشاہیر اور ارباب علم کا تذکرہ ہے۔

دبیر (مرزا سلامت علی)، درد دہلوی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی، شاہ عبدالحق دہلوی، شاہ عبدالقادر دہلوی اور دلدار علی مجتہد۔

قدرتی طور پر اس میں ترک مشاہیر، ترک ارباب سیاست اور ترکی کے حکمرانوں کا زیادہ تذکرہ ہے۔ ان میں سے بیشتر کا تلفظ ہمارے لیے مشکل ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اسلامی ہند سے متعلقہ مضامین جناب خلیق احمد نظامی (علی گڑھ) اور جناب ابو سعید بزمی (کراچی) نے لکھے ہیں۔

مساجد، مقابر اور قلمی نسخوں کی تصویریں نہایت دیدہ زیب ہیں۔

لادینیت کے اس دور میں ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی اشاعت مستحق تبریک و تحسین ہے۔

میں نے ایک چھوٹی سی کتاب "سیاحت نامہ روس" پرسوں بذریعہ ڈاک بھیجی ہے۔ صفحہ ۵۰ سے آخر تک اس کا ضرور مطالعہ کریں اور فرصت کے وقت اس پر تبصرہ کر دیں۔ فقط والسلام ——— نیازمند

(شیخ) نذیر حسین،

غزل

(مولانا غلام محمد مرحوم کی روح کے نام)

از ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب کراچی

خلوت پسندیوں نے کیا سرخرو مجھے
دنیا تلاش کرتی رہی کو بکو مجھے

ہر سو دکھائی دیتا ہے وہ خوبرو مجھے
جس کی تمام عمر رہی جستجو مجھے

کب تک یہ [illegible] رلائے گا آخر لہو مجھے
اب کتنا آزمائیگا وہ حیلہ جو مجھے

منظر مری نگاہ میں کرب و بلا کا تھا
یادِ فرات لے کے پھری جوبجو مجھے

جو پھول کھل سکے وہ عقیدت کے پھول تھے
کلیاں اگر ملیں تو ملیں باوضو مجھے

اکبر تیرے غم میں دامنِ دل تار تار ہے
کرنا ہے اب تو چاکِ جگر بھی رفو مجھے

مطبوعات جدیدہ

حقیقتِ رجم از مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی اصلاحی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۰۰، قیمت ۳٫۵ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۳۵۳، چتلی قبر، دہلی ۶۔

اس کتاب میں زانی و زانیہ کی صرف ایک ہی سزا سَو کوڑے بتائی گئی ہے جس کا ذکر سورۂ نور آیت ۲ میں صراحتاً اور دوسری آیتوں میں اشارۃً اور دلالتاً ہے، مصنف کے نزدیک، اس حکم میں نہ نسخ ہوا ہے اور نہ کسی طرح کی تخصیص، بلکہ یہ اسی طرح عام ہے جس طرح سورۂ مائدہ میں سارق و سارقہ کے قطعِ ید کا حکم عام ہے۔ ان کے خیال میں اس حدِ زنا کو غیر شادی شدہ زانی وزانیہ ہی سے مختص کر دینا اور شادی شدہ زانی و زانیہ کی سزا رجم بنانا غیر محقق و غیر صحیح ہے، عہدِ رسالت میں رجم کے جو واقعات پیش آئے وہ سورۂ نور کے نازل ہونے سے پہلے کے ہیں، ان میں تورات کے حکم کے مطابق زانی کو رجم کی سزا دی گئی تھی لیکن سورۂ نور کی آیت سے تورات کا حکم منسوخ ہو گیا اور اب محصن و غیر محصن، شادی شدہ و غیر شادی شدہ زانی و زانیہ کی سزا صرف سَو کوڑے متعین ہو گئی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفانے جن زانیوں کو جلد (سَو کوڑے) کی سزا دی ہے ان کے غیر شادی شدہ زانی و زانیہ ہونے کی کوئی صراحت و ثبوت نہیں ہے اس لیے بھی اس سزا کو عام ہی سمجھا جائے گا۔ رہے ماعز اسلمی وغیرہ تو انہیں زناکاری کی وجہ سے نہیں بلکہ عادی مجرم اور بار بار زنا کے مرتکب ہونے کی وجہ سے رجم کیا گیا تھا، مصنف نے رجم کے لفظ کی تحقیق کرکے بتایا ہے کہ یہ لعنت و اہانت کے

علامت ہے اس لیے عہد نبوت میں رجم صرف زناکاروں اور فواحش کے مرتکبین ہی کو نہیں کیا گیا بلکہ لعنت واہانت کے قابل تمام مجرمین کو بھی یہی سزا دی گئی، جیسے غنڈے، جرائم پیشہ، عادی مجرم، فساد فی الارض پر آمادہ لوگ، محاربین اور امن و قانون کو درہم برہم کرنے کیلئے کو بھی سنگسار کیا گیا۔ رہے وہ لوگ جو اتفاقاً زنا کر بیٹھے ان کی سزا جلد ہے اور اس میں شادی شدہ و غیر شادی شدہ کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ کتاب کی نو فصلوں میں قرآن مجید احادیث، آثار اور بعض محققین کے اقوال سے انہی باتوں کو وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس میں غلطی کے عام ہونے کا سبب صحابیت کی تعریف میں توسع، اصول جرح و تعدیل سے بے پروائی اور قرآن مجید میں قلت تدبر کو بتایا گیا ہے، قرآن مجید کی حد تک مصنف کا نقطہ نظر باوزن ہے انھوں نے اس کے متعارض احادیث کا محل متعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے مگر روایات مزید بحث و تنقید کی متقاضی تھیں تاکہ ان سے بھی مصنف کا موقف منقح ہو جاتا، کہیں کہیں تکرار، بیجا طوالت، خطابت اور لفاظی بھی ہے، انہیں تصنیف و تالیف اور قرآن مجید و احادیث کے مطالعہ کا اچھا ذوق ہے اور برسوں سے وہ انکی تدریس کی خدمت پر مامور ہیں، یہ کتاب محنت و تحقیق اور مطالعہ قرآن و حدیث کا نتیجہ ہے جو اہل علم کو مسئلہ رجم پر خالی الذہن ہو کر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ "ض"

سوویت یونین کا زوال از جناب عطاء الرحمن، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور طباعت، مجلد صفحات ۲۶۰، قیمت ۹۰ روپے، پتہ: بک پروموٹرز جناح سپر مارکیٹ، مرکز ایف/۷، اسلام آباد۔ پاکستان،

موجودہ صدی میں مارکس کے فلسفہ کے طلسم نے ایک عالم کو گرفتار کیا اور سوویت یونین کی قیادت نے سیاسی، معاشی اور عسکری میدانوں میں غیر معمولی اور حیرت انگیز

اثر ڈالا لیکن جس سرعت سے سوویت یونین اور دوسری اشتراکی حکومتوں کا خاتمہ ہوا وہ اور زیادہ حیران کن ہے اب اہلِ قلم حضرات اشتراکی عروج و زوال کی اس داستان کا جائزہ لے رہے ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے اس کے لائق مولف پاکستان کے ایک نمایاں صحافی ہیں، سوویت یونین کے سقوط سے کچھ پہلے ان کو وہاں کے حالات کے براہِ راست مشاہدہ کا موقع ملا، یہ کتاب اسی مطالعہ و مشاہدہ کے تاثرات کا نتیجہ ہے جن کو عمل، ردعمل اور زوال کے عنوانوں کے تحت تقسیم کیا گیا ہے اور کمیونزم کی بعض قابلِ تعریف مساعی مثلاً صحتِ عامہ، بنیادی تعلیم اور زندگی کی ضروری سہولتوں کی مساوی بنیادوں پر فراہمی کا فراخ دلی سے اعتراف بھی کیا گیا ہے، لیکن ماسکو کی غربت کے مناظر نے اس کے مادی فلسفہ کی شکست کی کہانی بھی بیان کر دی ہے، جس کی اصل وجہ اس کے معاشی نظام کی نا عاقبت اندیشی، جبر و تشدد پر مبنی سیاسی نظام اور اسکی مذہب دشمن ذہنیت ہے، مولف نے اس کے علاوہ کمیونسٹ حلیف ممالک کی سرپرستی، دنیا کی مختلف کمیونسٹ پارٹیوں کے اخراجات کی ذمہ داری، سرمایہ دار ممالک سے مسلسل فوجی رقابت و مسابقت اور سب سے بڑھ کر افغانستان کی جنگ کو سوویت یونین کے زوال کے اہم اسباب میں شمار کیا ہے، ایک اور باب میں لائق مولف نے باشکریا، چیچن انگشتیا، کبار ڈینو بلکاریہ کراشائی چیرکیس ادسیٹیا اور انجازیہ جیسی مسلم آبادیوں اور علاقوں کا ذکر کیا ہے جو آج بھی دیگر چھ آزاد ریاستوں کے برخلاف روس ہی کے قبضہ و تسلط میں ہیں ان علاقوں کے متعلق عام اردو داں طبقہ کی واقفیت بہت کم ہے، اس لحاظ سے یہ باب بہت مفید اور معلومات افزا ہے ایک اور باب میں ابن خلدون اور دوسرے علمائے تاریخ و عمرانیات اور خود قرآن حکیم کے نظریۂ تاریخ کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

ع ۔ ص ۔

جلد ۱۵۴ ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۴ء عدد ۳

مضامین

مقالات

استفسار و جواب

تلخیص و تبصرہ

معارف کی ڈاک

وفیات

ادبیات

شذرات

انگریزوں کے زمانے ہی میں بہار واڑیسہ میں امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آگیا تھا اور اسکے دارالقضا سے شرعی قوانین کے مطابق مسلمانوں کے مقدمات طے ہوتے تھے، اب بھی امارت شرعیہ کا یہ نظام قائم ہے اور اس سے مسلمانوں کو بڑی راحت و سہولت ہے کیونکہ سرکاری عدالتوں میں انصاف بکتا ہے اور معمولی مقدمات کے تصفیہ ہونے تک عدالت سے رجوع کرنے والا مرچکا ہوتا ہے اور اس طویل عرصہ میں وقت اور روپے کے ضیاع کے علاوہ ذہنی اذیت اور ناقابلِ بیان پریشانیاں پیش آتی ہیں، ابھی تک امارت شرعیہ کے دارالقضا کے خلاف کوئی آواز سننے میں نہیں آئی تھی اور نہ اسے کوئی متوازی نظام کہا گیا تھا بلکہ چند برس پہلے امارت کے زیرِ انتظام قائم ہونے والے "سبھی واسپتال" کی افتتاحی تقریب میں اس وقت کے وزیرِ اعلا بہار مسٹر بھگوت جھا آزاد نے کہا "ہمیں تعجب ہے کہ پھلواری شریف کے دارالقضا نے ستر ہزار سے زائد فتوے اور فیصلے کیے ہیں اور ہماری ٹریجڈی ہے کہ لوور کورٹ، ڈسٹرکٹ کورٹ، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ کے فیصلے تک انصاف پانے والا جاتے جاتے مرجاتا ہے" یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بہار کی سرکاری عدالتیں دارالقضا کے فیصلوں کو اہمیت دیتی ہیں اور انکا احترام کرتی ہیں۔

بہار میں دارالقضا کے کامیاب تجربہ کی بنا پر گزشتہ سال آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے اجلاس منعقدہ جے پور میں فیصلہ کیا کہ پورے ملک میں مسلمان دارالقضا قائم کریں جس کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا مگر مسلم پرسنل لا کے فیصلہ کے خلاف شور وغوغا برپا کرنے والوں نے گاؤں پنچایت، لوک عدالت اور پنچایتی راج پر کبھی ہنگامہ و احتجاج نہیں کیا اور نہ اسے عدلیہ کے خلاف متوازی نظام کہا جب کہ ان سب کا مقصد و منشا بھی یہی ہے کہ عام لوگوں کے لیے انصاف سستا اور آسان ہوجائے اور گاؤں والے اپنے جھگڑے کسی پریشانی اور زیر باری کے بغیر خود ہی چکالیں اگر پنچایتی راج سے کسی متوازی نظام کے قائم ہونے اور لوگوں کے قومی دھارے سے الگ ہوجانے کا اندیشہ نہیں ہے

تو مسلمانوں کے دار القضا کے قیام سے کون سی قیامت برپا ہو جائے گی۔

ہم کو نہ اسباب سے بحث ہے اور نہ ہم پنچایتی راج کو غیر مفید اور غیر مناسب کہتے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے بطن سے گوناگوں خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، یہ گاؤں رزم گاہ میں تبدیل ہو گیا ہے، لوگوں کے جھگڑے کم ہونے کے بجائے بڑھ گئے ہیں، ہر جگہ ٹکراؤ، تصادم، محاذ آرائی اور خون خرابہ ہو رہا ہے، اس کے برخلاف دار القضا کے قیام سے معاشرہ میں انتشار و فساد کم ہوا ہے، امن و امان کو فروغ ملا ہے، انصاف کا حصول سستا اور آسان ہوا ہے، مقدمات کے فیصلے جلد ہوئے ہیں، وقت اور پیسے کی بربادی نہیں ہوئی اور لوگ زیر بار ہونے سے بچ گئے، کیا یہ ساری چیزیں ملک کے مفاد کے خلاف اور اسکی جمہوریت کے لیے ضرر رساں ہیں، یا ملک کی بھلائی اور ترقی کی ضامن اور جمہوریت کی شہرت و نیک نامی کا باعث ہیں۔

حق کی پامالی، عدل کی بربادی اور انصاف کی نایابی عام ہو گئی ہے اور خدا کی زمین شر و فساد سے معمور ہو گئی ہے، شریف اور معزز لوگوں کا رہنا اور جینا دو بھر ہو گیا ہے، غنڈے بدمعاش اور جرائم پیشہ لوگ ہر جگہ دندناتے پھر رہے ہیں، افراد تو افراد جماعتوں کا قتل دن دھاڑے ہوتا ہے اور امن و قانون کے ذمہ دار مجرموں کا پتہ لگانے میں ناکام رہتے ہیں، ان کی موجودگی میں مال و اسباب لوٹا جاتا ہے، اجتماعی عصمت دری ہوتی ہے، مساجد و معابد مسمار کر دیے جاتے ہیں اور یہ خود بلوائیوں اور عادی مجرموں کے ساتھ لوٹ مار اور بدکاری میں شریک ہو جاتے ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک ظلم ہوتا ہے مگر مظلوموں کی دادرسی تو درکنار پولیس نہ ان کی رپورٹ درج کرتی ہے اور نہ انہیں کوئی گواہ ملتا ہے، کہ سچ کہنے پر زبان کٹتی ہے، دوسری طرف بے گناہوں اور بے خطا لوگوں کو جھوٹے اور فرضی مقدمات میں پھانس دینا اور انہیں طرح طرح سے دق کرنا پولیس کا شعار بن گیا ہے، سرکاری دفاتر اور عدالتیں رشوت اور بدعنوانی کا اڈہ ہیں، وہاں سے عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہونے کی توقع ہی اٹھ گئی ہے، کرپشن، چوری، بلیک مارکٹنگ، گھپلے اور اسکینڈل میں ذمہ دار لوگ یا تو خود ملوث

ہوتے ہیں یا ملوث لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنے میں بے بس رہتے ہیں، ان حالات میں عدل وانصاف کو فروغ دینے والے قابل تحسین ہیں یا نہ کہ لائق سرزنش وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً۔

اس کی بھی صفائی اور وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان اللہ کی طرف سے عدل وانصاف کے قیام، حقوق کی حفاظت اور ظلم وطغیان اور شر وفساد کے انسداد پر مامور ہیں، ان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ حق وقسط پر خود بھی جمے رہیں اور ساری دنیا کے سامنے اس کی گواہی دیں، چاہے وہ خود انکے اور انکے رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے، کسی قوم کی عداوت انہیں عدل کا شیوہ اختیار کرنے سے باز نہ رکھے، اگر انکے ہاتھوں میں زمام کار ہو تو وہ لوگوں کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے کریں، انکی نگاہ میں امیر وغریب اور شریف ووضیع کا فرق نہ رہے، انصاف کی خرید وفروخت نہ ہونے دیں، زور وزر اثر، خوف وطمع اور دباؤ میں نہ آئیں، انکے ایمان کا اعتبار اسی وقت ہوگا جب وہ خدا کے رسولؐ کو اپنی نزاعات میں حَکَم بنالیں اور اسکے فیصلے کو بے چون وچرا مان لیں، جاہلیت کے فیصلوں کے طالب نہ بنیں اور خدا کو چھوڑکر کسی اور کے پاس اپنے معاملات نہ لے جائیں کیونکہ اللہ کے فیصلے سے زیادہ بہتر اور اچھا کسی کا فیصلہ نہیں ہے، مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے قانون کو نافذ وجاری کرنے ہی سے حق وانصاف کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور شرعی نظام قضا ہی سے مسلمانوں کی زندگی اسلامی بنیادوں پر منظم ومستحکم ہو سکتی ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں دارالقضاء کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا تاکہ مسلمانوں کی زندگی، معاشرت اور رہن سہن میں شرعی قانون کی پابندی ہو سکے اور شاہ بانو وغیرہ کے واقعات کا اعادہ نہ ہو، مسلمان اپنے ملک کے وفادار اور اس کے آئین وقانون کے پابند ہیں لیکن وہ اپنے عقیدے میں اپنی عبادات میں، پرسنل لامیں، معاشرت اور معیشت میں خدا کے قانون اور ضابطہ کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں تاکہ انکا وجود ان کے لیے بھی اور انکے ملک کے لیے بھی موجب خیر وبرکت ہو۔

مقالات

چند قومی مرثیے

از پروفیسر نذیر احمد۔ علی گڑھ

[حال ہی میں راقم الحروف نے فارسی قصیدہ نگاری پر ایک کتابچہ غالب انسٹی ٹیوٹ سے شایع کیا ہے، اس میں فارسی قصیدہ کی حمایت میں گفتگو کی گئی ہے، مجھے فارسی قصیدہ گوئی کافی پسند ہے، اس پسند کی بنیاد قصیدہ گوئی کی وہ خصوصیات ہیں جو فارسی کے دوسرے اصناف سخن میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ البتہ اس کتابچہ میں فارسی قصیدہ گوئی کی ایک خصوصیت کا تذکرہ نہیں ہو سکا تھا اور وہ یہ ہے کہ یہی وہ صنف سخن ہے جس کے ذریعے قوموں میں نئی روح پھونکی جاسکتی ہے اور حق یہ ہے کہ فارسی شاعروں نے یہ حق بجا طور پہ ادا کر دیا ہے، جب قوموں پر بڑے حادثات پیش آتے ہیں اور وہ مصائب سے دوچار ہوتی ہیں تو شاعر چونکا دینے والے قصائد لکھ کر لوگوں میں بیداری کی لہر پیدا کر دیتے ہیں۔ فارسی شاعروں نے قصیدوں کے ذریعے عوامی مصائب کا تذکرہ متاثر انداز میں کیا ہے، وہ قومی مرثیے ہیں، جن پر صدیاں گزر چکی ہیں، پھر بھی انکی افادیت باقی ہے۔

میں نے قصیدے سے طویل اقتباس نقل کر دیے ہیں، جو شاید مستحسن نظروں سے نہ دیکھے جاسکیں، اس ضمن میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہماری آنکھیں غزل کے ایک آدھ شعر کی مثالیں دیکھنے کی عادی ہیں، قصیدے کے اشعار ان کی طبع پر گراں گزرتے ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ قصیدے کے اقتباس کے بغیر وہ کیفیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی

جو قصیدے کا اصل مقصود ہے۔] نذیر احمد

قومیں جب بڑے واقعات و حادثات سے دوچار ہوتی ہیں تو قدرتی بات ہے کہ ان کے افراد بہت متاثر ہوتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ شاعر اثر قبول کرتے ہیں اس لیے کہ وہ بہت حساس واقع ہوئے ہیں اور وہ اپنے اشعار میں اسی احساس کا رنگ بھرتے ہیں۔ آج کل کی بھی شاعری خصوصاً اردو شاعری اسی طرح کے جذبات و احساسات سے پُر ہوتی ہے۔ اس مختصر مقالے میں تاریخ کے دو بڑے واقعات کے تعلق سے چند نظموں کے بارے میں ایک گزارش پیش کی جا رہی ہے۔ ان میں ایک خراسان کے زبردست حادثے سے متعلق اور دوسرے کا تعلق ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی سے ہے۔ خراسان کے واقعہ کا خلاصہ یہ ہے۔

سلطان سنجر سلجوقی سلجوقی خاندان کا بڑا فرمانروا گذرا، ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء میں تخت نشین ہوا، ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء میں ۴۰۔۴۱ سال کی حکومت کے بعد فوت ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ۱۹ لڑائیوں میں فتح حاصل کی، لیکن اس نے قراختائیوں[1] سے ایک زبردست جنگ میں شکست کھائی جس میں اس کے ایک لاکھ آدمی مارے گئے، سنجر نے علاء الدین جہاں سوز غوری کو شکست دی اور اس کو اسیر کر لیا۔ اسی دوران ترکوں کے ایک خانہ بدوش خانوادے یعنی غزوں نے دو دریاؤں کو پار کر لیا اور سنجر نے انہیں درۂ زمّ کے نواحی میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دیدی، اس شرط کے ساتھ چالیس ہزار بھیڑ ہر سال بطور خراج حکومت کو دیا کریں گے، لیکن کچھ دنوں بعد اس میں[2] بدنہ

---

[1] صفا کے بقول (تاریخ ادبیات ۲: ۱۴) ۵۳۶ میں قراختائیوں سے سنجر نے بمقام قطوان شکست کھائی۔ یمینی نے قطوان کی جنگ غزوں سے ۵۴۸ میں بتائی ہے، جو صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

خلاف ہوا، حاکم بلخ اس کو حل نہ کر سکا تو سنجر اُن کی سرکوبی کے لیے ۵۴۸ھ
میں ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ ہوا، غزوں نے بڑی بے جگری سے سنجر کے
لشکر سے لڑائی کی اور آخر کار سنجر کو شکست ہوئی اور سلطان اسیر ہو گیا، ۴ سال
غزوں کی قید میں رہا۔ پھر ایک حیلہ سے نکل بھاگا۔ یہ ۵۵۱ھ کا واقعہ ہے، جب
دارالخلافہ مرو پہنچا تو شہر کو ویران پایا، اس سے وہ ایسا دل شکستہ ہوا کہ زندگی سے
بیزار ہو گیا اور ۵۵۲ھ[1] میں ۷۳ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

سنجر نہایت علم دوست حکمراں تھا، اس کا دربار علماء و فضلاء اور شعرا کا ملجا
و ماویٰ تھا۔ فارسی کا مشہور قصیدہ گو شاعر انوری خراسانی (۵۸۳) اس کے دربار
سے وابستہ تھا۔ غزوں کے ہاتھوں جب سنجر کو شکست ہوئی تو سارا خراسان زبردست مصیبت
سے دوچار ہوا، غزوں کے مظالم کی داستان بہت غمناک ہے، شہر، آبادی، مساجد،
معابد سارے ویران کر ڈالے گئے اور ویرانی کا حال یہ تھا کہ سنجر جب قید سے نکلا
تو اس ویرانی کی تاب نہ لا کر فوت ہو گیا، خراسان کی بربادی عالم اسلام کا دل سوز
واقعہ تھا، اس لیے کہ خود خراسان عالم اسلام کا دل تھا، خاقانی نے اس کی مدح میں
ایک طویل قصیدہ لکھا ہے جس میں اس کی بربادی کا ذکر ہے، اس حملہ میں جو اہل علم
شہید ہوئے ان میں امام محمد یحییٰ بھی تھے، ان کے لیے خاقانی نے متعدد قصیدے کہے

---

[1] مصنف نے تاریخ وفات یہی دی ہے اور مدت حکومت ۶۱ سال (ایضاً ۱۵) بتائی ہے
جس میں ۱۱ سالہ اس کی امارت خراسان بھی شامل ہے۔ سنجر کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے،
۵۴۸ھ، میں ۵۵۱ھ، زبدۃ النصرۃ ۵۵۲ھ ربیع الاول ۵۵۲ھ اور یہی ابن اثیر نے دی ہے، ۴۷۹ھ
میں پیدائش ۷۳، مدت عمر ۷۲، سال چند ماہ، مدت بادشاہی ۶۱ سال ۲۰ سال ملک خراسان ۴۱ سال سلطنت جہاں۔

(دیکھیے مقدمہ ۴۵ - ۴۶)

اسی صورتِ حال میں انوری نے ایک منظومہ خاقان سمرقند رکن الدین قلیچ طمغاج خاں کے نام پر لکھا۔ یہ نظم ایک دل سوز مرثیہ ہے جو اہل خراسان کی زبان سے خاقان سمرقند کی خدمت میں پیش ہوا تھا، قلیچ طمغاج خاں سلطان سنجر کا بھانجا تھا، اس کا لقب محمود خاں بن ارسلان خاں محمد بن سلیمان خاں تھا، وہ سنجر کی طرف سے ماوراء النہر کا حکمراں تھا، جب ۵۴۸ میں سلطان سنجر غزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا تو امرائے سنجری نے ملک شاہ کے پوتے سلیمان شاہ کو تخت پر بٹھایا، لیکن ایک ہی سال کے اندر اس نے حکومت سے استعفا دے دیا تو پھر قلیچ طمغاج خاں کو تخت نشین کرایا، اس نے سنجر کے زمانۂ اسیری (۵۴۸ - ۵۵۱) میں حکومت کی، ۵۵۲ میں سنجر کی وفات پر تخت نشین ہوا، لیکن غزوں کے مقابلے میں وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سلجوقی امیر موید ای ابہ نے اس کی اور اس کے بیٹے کی آنکھ میں سلائی پھروادی اور ۵۵۷ میں قلیچ طمغاج کا انتقال ہوگیا۔ سلجوقی حکومت کی کمزوری سے غزوں کا دباؤ پورے خراسان اور کرمان تک پھیل گیا۔

غز بھی سلجوقیوں کی طرح ترک تھے۔ جن کے اکثر قبیلے خانہ بدوش تھے، مگر باقی ان کا پیشہ تھا۔ سلجوقیوں کے زمانے میں دوسرے قبائل کے دباؤ کی وجہ سے یہ خراسان کے علاقہ میں پھیل گئے اور بلخ کے نواح میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سلطان سنجر کے مقرر کردہ حاکم بلخ امیر قماج سے انکا اختلاف ہوا تو انھوں نے قتل و غارت اور عورتوں اور بچوں کا اغوا شروع کر دیا اور علما اور فضلا کے ایک گروہ کو قتل کر ڈالا، اس کے نتیجے میں سلطان سنجر نے ان پر حملہ کیا

شکست کھائی اور قید ہوگیا۔ اس کے بعد تو پورا خراسان ان کی غارتگری اور بہیمیت کا شکار ہوگیا۔ شہر نیشاپور کو جلاکر ویران کر دیا، طوس بھی اسی طرح کی بربادی کا شکار ہوا، سیکڑوں علماء و فضلاء، شعرا قتل ہوئے، مساجد، معابد ویران ہوئے، عورتوں کا اغوا ہوا، یہ تو نہ ہوا کہ غز غارتگر اپنی الگ حکومت قائم کر سکتے، لیکن ان کی غارتگری خراسان سے لے کر کرمان اور مکران تک پھیل گئی۔ ساتویں صدی کے ایک شاعر نے مکران کے دو[2] فرمانرواؤں تاج الدین ابوالمکارم خسرو اور سلطان نصرت الدین ابوالخطاب خسرو کے غزوں سے معرکہ کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے۔

بہ پیش لشکر تو سنگ پست آمد چو حرف جر — سپہ چون سپاہ تو چنین جرار کی باشد
حصار سنگ را قومی ہمی کردند حصاری — حصار عنکبوتی را مگس حصار کی باشد
مبارکباد فتح سنگ و غز مقہور پیش تو — کہ قہر لشکر غز را چو تو قہار کی باشد (دیوان سراج ص ۹۸)
بہ پیش لشکرت شاہا حصار سنگ پست آمد — بلشکر قلعہ گردان اگر حصن حصین استی
حصارش کی شدی کندہ سپاہش کی شدہ کشتہ — زن و فرزند او ہم کہ با بست آن دامنستی
مبارکباد فتح سنگ و غز مقہور پیش تو — دعای بیگمانست این کہ آمینش یقین ستی (ص ۲۸۶)

غزوں کا فتنہ خوارزمشاہیوں کے تسلط سے کرمان اور مکران کے سلاطین کے اثر سے بھی رفع ہوا۔

اب انوری کے مرثیہ کے اشعار ذیل میں درج کیے جارہے ہیں، ساتھ ہی سہولت کی خاطر ان کا ترجمہ بھی دیا جارہا ہے۔

بسمرقند اگر بگذری ای باد سحر — ای باد سحر اگر تیرا گذر سمرقند سے ہو تو

---

[1] طبع مدرس رضوی ص ۲۰۱ بعد۔

نامۂ اہل خراسان بسر خاقان بر

خاقان سمرقند کی خدمت میں اہل خراسان کا یہ خط پہنچا دے۔

نامۂ مطلع آن رنج تن و آفت جاں
نامۂ مقطع آن درد دل و سوز جگر

ایسا درد بھرا خط ہے جس کا مطلع رنجِ تن اور آفتِ جاں ایسا خط جس کا مقطع دردِ دل اور سوزِ جگر ہے۔

نامۂ بر رقمش آہ عزیزان پیدا
نامہ در شکنش خون شہیدان مضمر

ایسا خط جس کی تحریر عزیزوں کی آہ سے پُر ہے، ایسا خط جس کی شکن شہیدوں کے خون سے آلودہ ہے۔

نقش تحریرش از سینۂ مظلومان خشک
سطر عنوانش از دیدۂ محزونان تر

تحریر کا نقش مظلوموں کے سینہ کی گرمی سے خشک ہوا ہے، اور عنوان کی سطر محروموں کے آنسوؤں سے تر ہوئی ہے۔

ریش گردد ممر صوت از و گاہ سماع
خون شود مردمک دیدہ از و وقت نظر

(دردناک واقعات) سنتے وقت آواز کی گذرگاہ زخمی ہو جاتی ہے، المناک منظر دیکھنے سے آنکھ کی پتلی خون ہو جاتی ہے۔

تاکنوں حال خراساں و رعایا بودست
بر خداوند جہاں خاقان پوشیدہ مگر

شاید اب تک خراسان اور وہاں کے شہریوں کے حالات خداوند جہاں خاقان پر پوشیدہ ہیں۔

نی نبودست کہ پوشیدہ نباشد بر وی
ذرۂ نیک و بد زیر فلک و ہفت اختر

نہیں نہیں ان پر کیوں یہ حالات پوشیدہ ہونگے، وہ تو ایسے ہیں کہ خراسان اور

ساتوں سیاروں کے تعلق سے کوئی اچھی بری
چیز نہاں نہیں۔

کار ہا بستہ بود بیشک در وقت و کنون
وقت آنست کہ راند سوی ایران لشکر

اس وقت بیشک کام رُکے ہونگے۔ اب
وقت آگیا کہ خاقان معظم ایران کی طرف
لشکر بھیجیں۔

خسرو عادل خاقان معظم کز جد
پادشاہست و جہاندار بہ ہفتاد پدر

وہ خسرو عادل ستر پشت سے بادشاہ
رہے ہیں۔

وایمش فخر بآنست کہ در پیش ملوک
پسرش خواندہی سلطان سلاطین سنجر

وہ ہمیشہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ
باشاہوں کے سامنے سلطان سلاطین سنجر
نے ان کو منہ بولا بیٹا کہا ہے۔

باز خواہد ز غزان کینہ کہ واجب باشد
خواستن کین پدر بر پسر خوب سیر

وہ غزوں سے ضرور ہی بدلا لیں اس لیے
کہ باپ کے دشمن سے بدلہ لینا ہے بیٹے پر
واجب ہوتا ہے۔

چون شد از عدلش سرتاسر توران آباد
کی روا دارد ایران را ویران یکسر

جب اپنے فرمانروا کے عدل کی بدولت پورا
توران آباد و سرسبز ہوگیا، وہ ایران کو
تباہ و برباد کیونکر دیکھ سکتے ہیں۔

ای کیومرث بقا پادشہ کسری عدل
وی منوچہر لقا خسرو افریدون فر

اے بادشاہ جس کی حکومت کیومرث
کی طرح باقی رہنے والی اور جو اپنے عدل
کے اعتبار سے نوشیرواں ہے اور اے منوچہر

جیسی دلکشی رکھنے والے اے فریدون کی
طرح شان و شوکت رکھنے والے خسرو۔

قصۂ اہل خراساں بشنو از سر لطف
چوں شنیدی ز سر رحم بایشاں بنگر
این دل افگار جگر سوختگان می گویند
کای دل و دولت و دین را بتو شادی و ظفر

از راہ کرم اہل خراسان کے واقعات سُنیے
اور جب سُن لے تو رحمت کی ان پر نگاہ ڈالے۔
یہ دل خستہ اور جگر سوختہ لوگ تجھ سے اس
طرح مخاطب ہیں کہ اے بادشاہ کہ تیرے
وجہ سے دل، دولت اور دین سب خوش
ہیں اور اپنے کو شکست خوردہ نہیں سمجھتے۔

خبرت ہست کہ از ہر چہ در و چیزی بود
در ہمہ ایران امروز نماندہ است اثر

کیا آپ کو کچھ خبر ہے کہ سارے ایران کی جو
عزیز چیز تھی اسکا کوئی نشان باقی نہیں۔

خبرت ہست کزین زیر و زبر شوم غزان
نیست یک پی ز خراساں کہ نشد زیر و زبر

کیا تجھے خبر ہے کہ ان بدذات غزوں کی
بربادی سے ایک چیز ایسی نہیں جو برباد
نہیں ہوئی۔

بر بزرگان زمانہ شدہ خردان سالار
بر کریمان جہان گشتہ لئیمان مہتر

بڑوں پر چھوٹے سردار ہوئے اور جو خیر
اور ممتاز تھے ان پر بدذات لوگ حاکم
اور سردار مقرر ہوئے۔

بر در دوناں احرار حزین و حیراں
در کف رنداں ابرار اسیر و مضطر

کمینوں کے دروازوں پر سردار اور عزیز
لوگ غمگین اور حیران پریشان کھڑے ہیں،
ذی وقار حضرات کمینوں کے ہاتھوں

پریشان اور مقید ہیں،

شاد الا بدر مرگ نہ بینی مردم بکر جز در شکم مام نیابی دختر	کوئی شخص سوائے موت کے دروازے پر شاد نظر نہیں آتا، کوئی دختر بجز وہ جو ماں کے پیٹ میں ہے، بکر باقی نہیں۔
مسجد جامع ہر شہر ستورانشان را پایگاہی شدہ نہ سقفش پیداو نہ در	ہر شہر کی جامع مسجد ان کے گھوڑوں کی اصطبل ہو گئی ہے، نہ اس میں چھت باقی ہے اور نہ دروازے۔
خطبہ نکنند بہر خطہ بنام غز از آنک در خراسان نہ خطیب است کنون نہ منبر	غزوں کے نام کا خطبہ اس لیے نہیں پڑھا جا رہا ہے کہ پورے خراسان میں نہ مسجد کا منبر باقی ہے اور نہ خطیب ہی رہ گئے۔
کشتہ فرزند گرامی را گر ناگاہ بان بیند از بیم خروشید نیارد مادر	اگر کوئی ماں اپنے بیٹے کو ناگہاں مقتول دیکھے تو وہ اس پر رو پیٹ نہیں سکتی۔
بر مسلمانان زان نوع کنند استخفاف کہ مسلمان نکند صد یک ازان با کافر	مسلمانوں کو ایسا ذلیل و خوار کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے کافروں پر اس کا سواں حصہ بھی نہ ہوا ہوگا۔
ہست در روم و خطا امن مسلمانان را نیست یک ذرہ سلامت بہ مسلمانی در	روم اور خطا کے علاقوں میں مسلمان امن چین سے ہیں، لیکن ایران جو اسلامی ملک ہے اس میں سلامتی کا نام و نشان نہیں۔
خلق را زین غم فریاد رس ای شاہ نژاد ملک را زین ستم آزاد کن ای پاک سیر	اے بادشاہ نژاد فرمانروا، اس غم سے مخلوق کو نجات دلا، ان کی فریاد رسی کر،

اور اسے پاک سیرہ ملک کو اس ستم سے
آزادی دلا،

بخدائی کہ بیاراست بنامت دینار
بخدائی کہ بیفراخت بفرقت افسر

اس ذات پاک کا واسطہ جس نے دینار
کو تیرے نام سے منقش کرایا اور جس نے تاج
سے تیرے سر کو مزین کیا۔

کہ کنی فارغ و آسودہ دل خلق خدا
زین فرومایہ غز شوم پی غارتگر

ان بدذات اور کمینے غزوں سے جو غارتگری پر
کمربستہ ہیں، خلقِ خدا کے دلوں کو آسودہ اور
مطمئن کر دے۔

وقت آنست کہ یابند ز رمحت پاداش
گاہ آنست کہ گیرند ز تیغت کیفر

وقت آگیا ہے کہ تیرے نیزے سے انہیں
اپنے کیے کا بدلہ مل جائے اور وہ دن دور
نہیں کہ تیری تیغ سے وہ اپنے کیے کا مزہ چکھیں۔

آخر ایران کہ ازو بودی فردوس برشک
وقف خواہد شد تا حشر بدین شوم حشر

کیا وہ ایران جس پہ فردوس کو رشک تھا،
قیامت تک ان بدذات غزوں کے لیے
وقف ہو جائے گا؟

رحم کن رحم بر آن قوم کہ نبود شب و روز
در مصیبتشان جز نوحہ گری کار دگر

اس قوم پہ رحم کر جن کا کام مصیبت میں
شب و روز بجز نوحہ گری اور کچھ نہیں۔

رحم کن رحم بر آن قوم کہ جویند جوین
از پس آنکہ نخوردندی از ناز شکر

اس قوم پہ رحم کر جو آج نانِ جویں کو محتاج
ہیں جبکہ کل تک انکی حالت ایسی تھی کہ مارے
نازکے وہ شکر بھی نہیں کھاتے۔

رحم کن رحم بر آنہا کہ نیابند نمد
از پس آنکہ ز اطلسشان بودی بستر

اس قوم کی حالت زار پر رحم کر جنکو آج لیٹنے بیٹھنے کے لیے نمدہ بھی میسر نہیں، حالانکہ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ ریشم کے بستر پر لیٹتے تھے۔

رحم کن رحم بر آن قوم کہ رسوا گشتند
از پس آنکہ بمستوری بودند سمر

اس قوم پر رحم کر جس کے لوگ رسوا ہو کر بازار بازار پھر رہے ہیں، حالانکہ عزت و وقار کی وجہ سے وہ گھر سے نہیں نکلتے تھے، اور اس لحاظ سے وہ بہت مشہور تھے۔

از تو رزم ای شہ و از بخت موافق نصرت
از تو عزم ای ملک و از ملک العرش ظفر

اے بادشاہ! آپ جنگ پر آمادہ ہو جائیں، قسمت آپ کا ساتھ دے گی اور آپ منصور و فاتح ہوں گے، آپ بس ارادہ کر دیں، ملک العرش آپ کو ظفر دے گا۔

خراسان مشرقی عالم اسلام کے دل کی حیثیت رکھتا تھا، وہ اسلامی علوم و فنون کا بڑا مرکز تھا، اس کی بربادی اسلامی علوم کی بربادی کے مترادف تھی، خراسان کے سب سے بڑے مفتی و عالم محمد بن یحییٰ تھے، وہ بھی غزوں کی بربریت کے شکار ہوئے، خاقانی نے ایک طویل قصیدہ میں جو ۱۱۱ بیت پر مشتمل ہے، خراسان کی اہمیت اور مرکزیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہاں ان کو اجمالاً سب کچھ نظر آتا تھا جو عالم اسلام میں تفصیل سے ملتا۔ اس قصیدے میں امام محمد بن یحییٰ کے علم و فضل کا ذکر اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، یہاں اسکے صرف چند شعر نقل کیے جا رہے ہیں، قصیدہ کا

عنوان یہ ہے:

ستایش خراسان و تمنای وصول بآن و مدح امام محمد بن یحییٰ (۴؍۳۹)

رہ‌جوم مقصد امکان بخراسان یابم
تشنہ ام مشرب احسان بخراسان یابم

میں حصول مقصد کے لیے جا رہا ہوں، ممکن ہے میرا مقصد خراسان میں حاصل ہو۔ میں پیاسا ہوں، احسان کا مشرب خراسان میں ملے گا۔

دل کنم مجمر سوزان و جگر عود سیاہ
دم آن مجمر سوزان بخراسان یابم

دل جلتی ہوئی بھٹی ہے اور جگر جل کر عود سیاہ ہو گیا، اس جلتی ہوئی بھٹی کی آگ تیز کرنے کی پھونک خراسان میں ملے گی۔

بر کنم شمع وفا را بخراسان طلبم
کان کلید در رضوان بخراسان یابم

شمع جلا رہا ہوں، وفا کی طلب خراسان میں ہو گی، وہ در رضوان کی کنجی ہے جو خراسان میں ملے گی۔

در جہاں بوی وفا نیست وگر ہست آنجاست
کاین گل از خار مغیلان بخراسان یابم...

دنیا میں بوئے وفا نہیں، اگر کہیں ہے تو خراسان میں ہے، خار مغیلان سے اگر پھول کہیں مل سکتا ہے تو وہ خراسان ہی ہے۔

بسر خاک محمد پسر یحییٰ پاک
روم و رتبت حسان بخراسان یابم

میں امام محمد بن یحییٰ کی خاک پر جاؤں گا اور اس طرح خراسان میں مجھے حسانؓ کا مرتبہ حاصل ہو جائے گا۔

محی الدین کہ سلیمان صفت است و خدمش

محی الدین جو حضرت سلیمانؑ کی صفات

دیو وانس و ملک و جان بخراسان یابم	کے حامل ہیں، اسی وجہ سے دیو، انس، ملک، جن سب ان کے خادم خراسان میں ملیں گے۔
شافعی بینم در دست و ہر انگشتی از او مالک و احمد و نعمان بخراسان یابم	وہ امام شافعیؒ کے مانند ہیں اور ہاتھ کی ہر انگلی میں امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام اعظم خراسان میں ملیں گے۔
ہادی امت و مہدی زمان کز قلمش قمع دجال صفاہان بخراسان یابم	وہ ہادی امت اور مہدی زمان ہیں، ان کے قلم سے صفاہان کے دجال کا قلع قمع خراسان میں ہو گا۔
گوہر افسر اسلام کہ از خاک درش افسر گوہر سامان بخراسان یابم	وہ اسلام کے تاج کے گوہر ہیں، ان کے دروازہ کی خاک سے جواہرات سے مرصع تاج خراسان میں مجھے ملے گا (میرے قلم سے نئے مضامین جو مشک کی خوشبو سے معطر ہیں، نکلیں گے)
دستم از نامۂ او نافہ گشای سخن است کا ہوی تبت توران بخراسان یابم	ان کے خط کی وجہ سے میرا ہاتھ سخن کا نافہ کشا ہے، توران کے تبت کا آہو خراسان میں مل سکے گا۔

غزوں کے حملۂ نیشاپور میں شوال ۵۴۹ھ میں ان وحشیوں نے ایسے نابغۂ روزگار کو بڑے دردناک انداز میں شہید کیا، ان کے منھ میں مٹی ٹھونس کر ہلاک کیا، ان کی وفات عالم اسلام کا بڑا سانحہ تھا، اس موقع پر شعرا نے مراثی[1] لکھے اور اس طرح اپنے کرب والم

---

[1] ۷۶۰ھ میں ترشیز (طریثیت) میں پیدا ہوئے، بقول ابن خلکان امام ابو حامد محمد غزالی کے (بقیہ حاشیہ ص ۱۷۸ پر)

کا اظہار کیا۔ خود خاقانی جو امام صاحب کا بڑا قدرداں تھا، ان کی شہادت سے بہت متاثر تھا، اس نے چند مرثیے نظم کیے، ایک مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں؛ یہ مرثیہ اپنی جگہ پر قومی مرثیہ ہے جس کو انوری کے مرثیے کے بالمقابل رکھا جا سکتا ہے۔

در مرثیہ امام محمد بن یحییٰ و حادثہ عہد سنجر در فتنۂ غز

آں مصر مملکت کہ تو دیدی خراب شد وآن نیل مکرمت کہ شنیدی سراب شد	حکومت کا وہ شہر جو تو نے دیکھا تھا، اجڑ گیا، اور جو دو سخا کا نیل جس کے بارے میں تم نے سُنا تھا وہ خشک ہو کر سراب میں تبدیل ہو گیا ہے۔
سرو سعادت از تف خذلان زگال گشت اکنون برآن زگال جگر ہا کباب شد	نیک بختی کا سرو بربادی کے تف سے جل کر کوئلہ ہو چکا ہے اور اب اس کوئلے پر لوگوں کے جگر کباب ہو گئے ہیں۔
چہل گز سرشک خون ز بر خاک درگذشت لا بل چہل قدم ز بر ماہتاب شد	چالیس گز خون زمین کے اوپر بہ گیا، بلکہ یوں کہیے کہ چالیس قدم خون ماہتاب کے اوپر جم گیا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۷) شاگرد تھے، کچھ دنوں نظامیہ بغداد میں درس دیتے رہے، ۵۴۹ میں منگولوں کے ہاتھوں بڑے دردناک انداز میں شہید کر دیے گئے، شاعر بھی تھے، عربی و فارسی دونوں میں شعر کہتے، فارسی کے اشعار لباب الالباب عوفی (چاپ نفیسی، ۱۹۰) میں درج ہیں۔ انکی وفات پر خاقانی کے علاوہ متعدد شعراء نے مراثی لکھے ہیں، جن میں ابو الحسن بیہقی کا ایک عربی قطعہ ابن خلکان چاپ تہران ۲ : ۲۰۰ نے درج کیا ہے۔ دیکھئے مقدمۂ دیوان خاقانی چاپ سجادی، ص ۴۵۔

ہم پیکرِ سلامت و ہم نقشِ عافیت
در دیدۂ نظارگیان در نقاب شد

عافیت اور سلامتی کے نقش و نگار دیکھنے والوں کی نظر سے پوشیدہ ہو گئے۔

عاقل کجا رود کہ جہاں دارِ ظلم گشت
نحل از کجا چرد کہ گیا زہرِ ناب شد

دنیا ظلم کا گھر بن چکی ہے، عقلمند کے لیے اب کوئی جگہ باقی نہیں (انسان تو انسان) شہد کی مکھی کے لیے رس چوسنے کے لیے پھل پھول زہرِ ناب ہو گئے ہیں، ان کے لیے اب کوئی چیز باقی نہیں۔

در تیرگی ز فتنہ زعکسِ خیالِ خون
کیوان بشکلِ ہندوی اطلس نقاب شد

فتنہ و فساد میں جو خون بہا ہے، اس کے خیال کا عکس کیوان پر پڑا تو وہ ایک ہندو کے مانند اطلس نقاب ہو گیا (یعنی اس نے سرخ رنگ کا نقاب پہن لیا۔)

افلاک را پلاسِ مصیبت بساط گشت
اجرام را وقایۂ ظلمت حجاب شد

مصیبت کے پلاس افلاک پر بساط کی طرح بچھ گئے اور ظلمت کے اجرام فلکی کے لیے حجاب بن گئے۔

ماتم سرای گشت سپہرِ چہارمین
روح الامین بہ تعزیتِ آفتاب شد

چوتھا آسمان ماتم سرا بن گیا اور روح الامین آفتاب کی تعزیت میں گئے۔

وز بہر آنکہ نامہ بر تعزیت شود
شام و سحر دو پیک کبوتر شتاب شد

شام و سحر جو دو پیک کبوتر ہوئے تاکہ تعزیت کے پیغام کے نامہ بر بنیں۔

دیدم صفِ ملائکہ بر چرخ نوحہ گر

جتنا کہ صبح کے خطیب نے خطاب کیا،

چندانکہ آں خطیب سحر در خطاب شد	تو دیکھا کہ آسمان پر ملائکہ صف بہ صف نوحہ گر ہیں۔
گفتم بگوش صبح کہ این چشم زخم چیست کاشکال و حال چرخ چنین ناصواب شد	میں نے صبح کے کان میں یہ بات کہی کہ یہ کس چشم بد کا نتیجہ ہے کہ آسمان کے حالات ایسے ناگفتہ بہ ہوگئے۔
صبح آہ آتشین ز جگر برکشید و گفت دردا کہ کارہای خراسان ز آب شد	صبح نے سوزناک آہ کھینچی اور کہا حیف صد حیف کہ خراسان کے کاروبار کی آب تاب جاتی رہی۔
گردوں سر محمد یحییٰ بہ باد داد محنت رقیب سنجر مالک رقاب شد	آسمان نے امام محمد یحییٰ کو برباد کر ڈالا، اور مصیبت سلطان سنجر فرمانروا کے ساتھ چمٹ گئی۔
از جبس این خدیو خلیفہ دریغ خورد وز قتل آن امام پیمبر مصاب شد	سلطان سنجر کے حبس میں ڈالے جانے پر خلیفہ کو بڑا صدمہ ہوا اور امام محمد یحییٰ کی شہادت پر حضور اکرمؐ غمزدہ ہوئے۔
بدعت ز روی حادثہ پشت ہدی شکست شیطان خلاف قاعدہ رجم شہاب شد	بدعت نے ایسا حادثہ ڈالا کہ ہدایت کی پشت ٹوٹ گئی اور شیطان جو شہاب ثاقب کے تیروں کا نشانہ تھا، وہ خود شہاب کا تیر ہوکر انسانوں کو اپنا نشانہ بنا رہا ہے۔
ای آفتاب خنجر زرین مکش کہ باز	اے سورج اپنی زریں شعاعوں کے (خنجر)

شمشیر سنجری ز قضا در قراب شد

کے ساتھ نہ نکلی اس لیے کہ قضا و قدر نے
سنجر کی شمشیر کو غلاف کے اندر بند کر رکھا ہے۔

ای مشتری ردا بنه از سر که طیلسان
در گردن محمد یحییٰ طناب شد

اے مشتری تو سر سے چادر گرا دے
اس لیے کہ امام محمد یحییٰ کی گردن میں انکی
چادر پھانسی کا پھندا ہو گئی (امام کے منہ
میں خاک ٹھونس کر ان کی چادر کا پھندا لگایا
اور بڑی اذیت ناک طریقے سے انکو غزوں
نے مار ڈالا، لعنہم اللہ)

ای عندلیب گلبن دین زار نالِ زار
کز شاخ شرع طوطی حاضر جواب شد

اے دین کے گلشن کے بلبل زار زار نالی کر اسلیے
کہ شاخ شرع کا حاضر جواب طوطی باقی نہیں رہا۔

ای ذوالفقار دست هدی زنگ گیر زنگ
کان بوتراب علم بزیر تراب شد

اے ہدایت کے ہاتھ کی ذوالفقار کُھٹّل ہو جا
اس لیے کہ علم کا بوتراب مٹی میں دفن ہو چکا ہے۔

خاقانیا وفا مطلب از اهل عصر زانک
در تنگنای دهر وفا تنگیاب شد

اے خاقانی اہل زمانہ سے وفا طلب نہ کر
اسلیے کہ زمانے کے تنگنا میں وفا نایاب ہے۔

آن کعبه وفا که خراسانش نام بود
اکنون بپای پیل حوادث خراب شد

خراسان جس کا نام تھا وہ وفا کا کعبہ تھا،
اب حوادث کے پیل نے اسے کچل کر برباد کر دیا ہے۔

عمری است که عزم جناب خراسان درست بود
بر هم شکن که بوی امان زان جناب شد

(اے خاقانی) تیرا ارادہ خراسان جانے کا
مصمم ہو چکا تھا، یہ ارادہ ترک کر دے
اس لیے کہ اب وہاں وفا کا نام و نشان تک نہیں رہا؟

برطاق نہ حدیث سفر زانکہ روزگار
چون طالع تو نامزد انقلاب شد

سفر کی بات چھوڑ اس لیے کہ جس طرح تیری قسمت نامزد انقلاب ہے، زمانہ بھی انقلاب پذیر ہے۔

در حبسگاہ شروان با درد دل بساز
کان درد راہ توشۂ یوم الحساب شد

شروان کے قید خانے میں درد دل دسوز جگر کے ساتھ سازگاری پیدا کر، یہی درد و سوز سفر آخرت کے لیے توشۂ راہ کا کام دے گا۔

امام محمد یحییٰ کے ایک مرثیے میں "خاک" ردیف اس نسبت سے قرار دیا ہے کہ ملعون غزوں نے اس امام عالی مقام کے منہ میں مٹی ٹھونس کر شہید کیا تھا، اس منظومہ کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

تا ورد محنت است درین تنگنای خاک
محنت برای مردم و مردم برای خاک

خاک کی اس تنگ جگہ میں محنت ہی محنت ہے آدمیوں کے لیے محنت و مصیبت اور آدمی خاک کے لیے ہے۔

جز حادثات حاصل این تنگنای چیست
ای تنگ حوصلہ چہ کنی تنگنای خاک

اس تنگنائے دنیا کا حاصل حادثات کے علاوہ کچھ نہیں اے پست حوصلہ اس خاکی تنگنائی کے کھودنے سے کیا فائدہ۔

این عالمی است جافی و زجیفہ موج زن
صحرای جان طلب کہ عفن شد ہوای خاک

دنیا جفا جو ہے اور بدبودار لاشوں سے بھری پڑی ہے، جان کا لق و دق میدان ڈھونڈنا چاہیے کہ زمین کی ہوا متعفن ہو چکی ہے۔

خواہی کہ جان بہ شط سعادت برون بری

اگر تیری آرزو ہے کہ سعادت کے دریا تک

بگریز ازین جزیرهٔ وحشت فزای خاک

پہنچے تو دنیا (زمین) کے وحشت افزا جزیرہ
سے بھاگ۔

خواہی کہ در خورنگہ دولت کنی طواف
برخیز ازین خرابهٔ نادلکشای خاک

اگر تو چاہتا ہے کہ دولت کے محل سرا میں
طواف کرے تو خاک کے اس ناپسندیدہ جگہ
سے اٹھ جا۔

دوران آفت است چہ جوئی سواد دہر
ایام صرصر است چہ سازی سرائے خاک

زمانہ آفت ہی آفت ہے، اس میں دہر کی
سرسبزی کی تلاش بے سود ہے، ایام تیز
آندھی کے مشابہ ہیں، یہاں مٹی کے مکان کیوں
بنا رہے ہے۔

ہرگز وفا ز عالم خاکی نیافت کس
نہ بود دیو را کہ نشد آشنای خاک

عالم خاکی سے کسی کو وفا نہیں ملی، اچھا ہوا کہ
شیطان خاک سے بے تعلق رہا۔

خود را بدست عشوهٔ ایام وا مدہ
کز باد کس امید ندارد وفای خاک

زمانے کے فریب میں اپنے کو مبتلا نہ کر،
کہیں باد وفای خاک کی امید کی جا سکتی ہے۔

خاقانیا جنیبت جان را عدم فرست
کان چرب آخرش بہ ازین سبزچای خاک

اے خاقانی تو اپنی جان کے گھوڑے کو عدم
میں بھیج دے، وہاں کا چکنا اصطبل زمین کی
سبز چراگاہ سے بہتر ہے۔

نیلی بہر بہا بخر و در دو دیدہ کش
باری نہ بینی این گہری بہای خاک

سلائی جس قیمت میں ملے اسے خرید لو اور
دونوں آنکھوں میں سرمہ لگاؤ، مٹی کا یہ
بیش قیمت گہر کہیں اور نہیں۔

خاصه که بر دریغ خراسان سیاه گشت
خورشید زیر سایهٔ ظلمت فزای خاک
گفتی پی محمد یحییٰ بماتم اند
از قبهٔ ثوابت تا منتهای خاک

خراسان کی مصیبت کی بنا پر خورشید خاص طور پر زمین کے تاریک سایہ کے نیچے سیاہ ہو گیا گویا کہ ستاروں کی بلندی سے خاک کی انتہائی نیچے حصے تک سب کے سب امام محمد بن یحییٰ کے ماتم میں ہیں۔

او کوه علم بود که برخاست از جهان
بی کوه کی قرار پذیرد بنای خاک
تب لرزه یافت پیکر خاک از فراق او
هم مرقد مقدس او شد شفای خاک

وہ علم کے پہاڑ تھے جو دنیا سے اٹھ گئے بغیر پہاڑ کے بنای خاک کو قرار نہیں۔ پیکر زمیں ان کے فراق میں تب لرزہ میں مبتلا ہے، ان کا مرقد مقدس خاکِ شفا فراہم کرتا ہے۔

بر دست خاکیان خفه گشت آن فرشته خلق
ای کائنات واحسرتا از جفای خاک

دنیا والوں نے اس فرشتہ خصلت امام کا گلا گھونٹ دیا، اے کائنات دنیا کے ظلم پر افسوس صد افسوس ہے۔

دید آسمان که در دهنش خاک می کنند
و آگاه بد که نیست دهانش سزای خاک

آسمان نے دیکھا کہ ان کے منہ میں خاک ٹھونسی جا رہی ہے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ان کا منہ خاک ٹھونسے جانے کے لائق نہیں۔

ای خاک بر سر فلک آخر چرا نگفت
کاین چشمهٔ حیات مسازید جای خاک

اسے خاک آسمان آخر کس لئے کیوں نہیں کہا کہ اس چشمۂ حیات کی جگہ خاک کو نہ بناؤ (یعنی ایسا شخص زمین میں دفن ہونے کے لائق نہیں)

بلکہ اس سے بالاتر مقام کا حامل ہے۔

در ملت محمد مرسل نداشت کس
فاضل تر از محمد یحییٰ قبای خاک[عـه]

اسلام میں محمد یحییٰ سے بڑا کوئی فاضل نہیں گزرا جس نے مٹی کی قبا پہنی ہو۔

آن شد کہ در روز تہلکہ دندان فدای سنگ
واین کرد گاہ فتنہ دہان را فدای خاک

حضور اکرمؐ کا جنگ میں دندان مبارک شہید ہوا اور امام محمد یحییٰ کا فتنۂ غز میں منہ خاک پہ فدا ہوا، یعنی منہ میں اتنی خاک ٹھونسی گئی کہ اسی کی وجہ سے امام نے جان دیدی۔

عـه در دیوان خاقانی ص ۷۴ (مقدمہ) و ص متن: قبای خاک، اور یہ غلط ہے۔ راحۃ الصدور ۱۸۰ قبای خاک صحیح ہے۔ ان قصائد کے علاوہ دو قطعات میں خاقانی نے امام محمد یحییٰ کی شہادت پر اپنے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ وہ قطعے اس طرح پر ہیں:

خاقانیاں بسوگ خراسان سیاہ پوش
کایام فتنہ گرد سوادش سیاہ برد

عیسیٰ بحکم رنگرزی بر مصیبتش
نزدیک آفتاب لباس سیاہ برد

دهر انداز سر محمد یحییٰ رد افگند
گردون ز فرق دولت سنجر کلاہ برد

ہاں خاقانی تراجای شکر یزد است شکر
گر وہانت را بآب زہرناک آگندہ اند

محی الدین کو دہان دین بہ دُر آگندہ بود
کافران غود ہانش را بخاک آگندہ اند

راحۃ الصدور راوندی ص ۱۸۱-۱۸۲ نے غزوں کے قتل وغارت کے بیان میں خاقانی کے اشعار نقل کیے ہیں۔ یہاں اس کا بیان مختصراً درج کیا جاتا ہے:

غزان مرو را کہ دار الملک بودہ بود سہ روز متواتر می غارتیدند و اغلب مردم شہر را اسیر کردند و بعد از غارتہا عذاب ہا کردند و بر ہر دی کہ ازمیں و زیر زمین ہیچ نگذاشتند پس روی بہ نیشاپور

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۵) نہادند مردم نیشاپور اول کوششی بکردند و قومی را از ایشان در شہر کشتند چون ایشان را خبر شد حشر آوردند و اغلب خلق زن و مرد و اطفال در مسجد جامع منیعی گریختند غزان تیغ در نہادند و چندان خلق را در مسجد کشتند کہ کشتگان در میان خون ناپیدا شدند ــ آتش در آن مسجد زدند و شعلہا چندان ارتفاع گرفت کہ جملہ شہر روشن شد تا روز ہمان روشنی غارت می کردند و اسیرہا می بردند ــ و اسیران را شکنجہ می کردند و خاک در دہان می آگندند تا اگر چیزی دفین کردہ بودند می نمودند.. و در شمار نیاید کہ درین چند روز چند ہزار آدمی بقتل آمد و جای کہ شیخ محمد اکاف کہ مقتدا و پیشوای مشائخ عالم و خلف سلف صالحین بود و مثل محمد یحیی کہ سرور ائمہ عراق و خراسان بود و پیشوای علماء ایشان را بشکنجہ بکشتند و بدبانی کہ چندین سال مطلع علوم شرعی و منبع احکام دین بودہ باشد چنین کنند بر کسی دیگر چہ ابقا رود و خاقانی در مرثیہ می گوید، قصیدہ:

در دولت محمد مرسل نداشت کس — فاضل تر از محمد یحیی قبای خاک

آن کرد روز تہلکہ الخ

خاقانیا بہ سوک خوراسان سیاہ پوش — کایام فتنہ گرد سوادش سیاہ بود الخ

و چون غزان بر نشستند مردم شہر را بسبب اختلاف مذاہب عقاید قدیم بود ہر شب فرقی از محلتی حشری کردند و آتش در محلت مخالفان می زدند تا خرابہا کہ از آثار غز ماندہ بود اطلال شد و قحط و وبا بدیشان پیوست تا ہر کہ از تیغ شکنجہ جستہ بود بنیاز بمرد (ص ۱۸۰-۱۸۲)

سرسید احمد خاں اور انکی تفسیر القرآن

از

محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دار المصنفین

سرسید احمد خاں مرحوم کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے، ان کا سب سے اہم اور نہایت قابل فخر کارنامہ مدرستہ العلوم علی گڑھ کی تاسیس ہے جو اب مسلم یونیورسٹی کے نام سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہے، ان کا دوسرا کارنامہ قدیم تاریخی کتابوں کی اشاعت اور مذہبی کتب و رسائل کی تصنیف ہے جو خاص اہمیت کی حامل ہیں، ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ متنازعہ انکی کتاب تفسیر القرآن ہے، یہ ان کی آخری نامکمل تصنیف ہے، اصلاً اس مضمون میں اسی پر بحث و تبصرہ مقصود ہے مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کے حالات و سوانح کا اجمالی خاکہ پیش کر دیا جائے۔

مختصر حالات و سوانح | سرسید احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، انکا خاندان مغل فرمانروا شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہرات سے ہندوستان آیا اور سلطنت کے اہم عہدوں پر فائز ہوا، سرسید کے خاندان کے لوگوں کا تعلق سلطنتِ مغلیہ سے اس کے آخری دور تک قائم رہا، ان کے والد شیخ متقی بھی جو مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ شاہ غلام علی سے بیعت تھے، دربار سے وابستہ تھے اور ان کو وہاں سے باقاعدہ وظیفہ ملتا تھا۔

سرسید کی والدہ نے ان کی پرورش کی، وہ بڑی منتظم اور نوعی صلاحیت خاتون تھیں، سرسید کو تعلیم کی تکمیل کا موقع نہیں ملا۔ ایک عرصہ کے بعد جب وہ ملازمت کے سلسلہ میں دہلی آئے تو انھوں نے مولوی نوازش علی مرحوم سے فقہ اصول فقہ کی کچھ کتابیں پڑھیں اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے ادب کی کچھ تعلیم حاصل کی اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے تھے، علم حدیث میں مشکوٰۃ اور ایک خاص حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔[1]

۱۸۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد سرسید نے ملازمت کے لیے تگ و دو شروع کی، چنانچہ بائیس ۲۲ برس کی عمر میں اپنے خالو خلیل اللہ خاں صدر امین دہلی کے پاس عدالت کا کام سیکھ کر سررشتہ دار ہو گئے، اس کے بعد آگرہ کے کمشنر کے دفتر میں نائب منشی مقرر ہوئے، پھر منصفی کا امتحان پاس کر کے دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کے منصف ہو گئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے جج کے عہدے پر فائز ہوئے اور اس حیثیت سے انہیں فتح پور سیکری، دہلی، رہتک، بجنور، مرادآباد، غازیپور اور بنارس میں قیام کرنے کا موقع ملا، بالآخر ۱۸۷۶ء میں انھوں نے پنشن لی اور مدرسۃ العلوم کے کاموں میں لگ گئے۔

ملازمت کے زمانہ ہی ۱۸۶۹ء میں انھوں نے انگلستان کا سفر کیا، جو انکی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اسی سفر میں انھوں نے ولیم میور کے جواب میں اپنی مشہور کتاب خطبات احمدیہ لکھی۔

۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی داغ بیل ڈالی، جس کے بعد وہ اسی کی

---

[1] مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مقالات شیروانی، علی گڑھ ۱۹۴۶ء صفحہ ۵۳۔

تعمیر و ترقی کے لیے وقف ہو گئے اور علی گڑھ میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

۵ ذی القعدہ ۱۳۱۵ھ/ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی اور دوسرے روز مدرسۃ العلوم کی مسجد کے احاطہ میں تدفین ہوئی۔[1]

تصنیفات: سرسید کا علمی ذوق بہت اچھا تھا اور ان میں تصنیف و تالیف کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی، ملازمت اور مدرسۃ العلوم کی گوناگوں مشغولیتوں کے باوجود انھوں نے متعدد اہم علمی کتابیں لکھیں، مولانا حالی نے ان کی تصانیف کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، ۱۔ مذہبی ۲۔ تاریخی ۳۔ علمی۔[2]

ان کی تصنیفات کی بنیاد پر مستشرق بلجون نے ان کے مذہبی خیالات کے تین دور قائم کیے ہیں، ۱۔ ۱۸۴۳ء تا ۱۸۵۷ء ۲۔ ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء (سال سفر انگلستان) اور ۳۔ ۱۸۷۰ء تا ۱۸۹۸ء، بلجون کے بیان کے مطابق ان کی مذہبی روشن خیالی کا اصل سبب انکا سفر انگلستان تھا۔[3] ڈاکٹر سید عبد اللہ بھی بلجون کی اس رائے سے متفق ہیں، ان کے خیال میں سرسید کے پہلے دور کی تصنیفات پر گو نئے اثرات بھی مترتب ہوئے تاہم ان میں قدیم رنگ ہی زیادہ نمایاں ہے، دوسرے دور میں انھوں نے غدر سے پیدا شدہ حالات کے نتیجہ میں کتابیں اور رسالے لکھے، البتہ ان کا دور سوم بہت نتیجہ خیز ہے۔[4] انکی بعض اہم کتابوں کے نام یہ ہیں۔

---

[1] سرسید احمد خاں کی مفصل سوانحعمری کیلئے ملاحظہ فرمائیں، مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید [2] ایضاً ضمیمہ ۲

[3] ڈاکٹر سید معین الحق، "سرسید کے علمی و ادبی کارنامے" برگ گل سرسید نمبر ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء ص ۱۰۰، ۱۰۱ حاشیہ

[4] ڈاکٹر سید عبداللہ، احمد خاں، اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد دوم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۶ء ص ۸۶، ۱۱۷۔

۱۔ آثار الصنادید، مطبوعہ ۱۸۴۷ء ۲۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور مطبوعہ ۱۸۵۸ء ۳۔ اسباب بغاوت ہند، مطبوعہ ۱۸۵۸ء ۴۔ تبیین الکلام فی تفسیر التورات والانجیل علی ملۃ الاسلام، مطبوعہ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء ۵۔ رسالہ طعام اہل کتاب، مطبوعہ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء ۶۔ خطبات احمدیہ، مطبوعہ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء[1]

تفسیر القرآن | تفسیر القرآن کے متفرق اجزا ابتدا میں رسالہ تہذیب الاخلاق[2] میں طبع ہوتے رہے، پھر جب وہ علی گڑھ میں مستقل قیام پذیر ہوئے تو اس کام کا باقاعدہ آغاز کیا، اس کی پہلی جلد ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی، اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس کی جلدیں شایع ہوتی رہیں، سرسید کی زندگی میں سورۂ بنی اسرائیل کے اختتام تک اس کی چھ[6] جلدیں شایع ہو چکی تھیں، ان کی وفات کے بعد ان کی ساتویں جلد جو سورۂ کہف تا سورۂ طٰہٰ کی تفسیر پر مشتمل ہے چھپی، یہ تمام جلدیں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوئیں۔

اہم خصوصیات | مولانا حالی مرحوم نے تفسیر القرآن کی مندرجۂ ذیل پانچ[5] خصوصیات بتائی ہیں۔

۱۔ اخبار ماضیہ کی تنقیح ۲۔ احکام اسلام پر اعتراضات کا جواب ۳۔ موضوع وضعیف احادیث سے اجتناب ۴۔ تعدد اقوال اور مفسرین کی متضاد آرا کے بجائے محض مرجح قول کے ذکر پر اکتفا ۵۔ علوم جدیدہ کی وجہ سے پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ اور جدید علم کلام کی تاسیس۔[3]

مولانا حالی مرحوم نے بجا طور پر آخری خصوصیت کو خاص اہمیت کا حامل بتایا ہے۔

۱۔ مولانا حالی: حوالہ سابق ۲۔ ایضاً .... جلد دوم، ص ۱۹۱ تا ۲۱۴۔

ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے بعد یہ موضوع نہایت اہم ہوگیا تھا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ سرسید نے اپنی بساط کے مطابق اپنے دور کے اس اہم اور ضروری کام کو انجام دینے کی کوشش بھی کی مگر چونکہ وہ باقاعدہ اور مستند عالم نہیں تھے اسلیے ان سے تفسیر میں غلطیاں بھی ہوئیں اور وہ دور از کار تاویلات میں بھی جا پڑے۔

اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ سرسید نے علماء کے طبقہ میں ایک ہلچل پیدا کردی تھی اور اپنی تحریروں کے ذریعہ انھوں نے ان کے جمود و تعطل کو توڑنے کی سعی بھی کی، مگر اس کا ردعمل بہت سخت ہوا اور جس شخص کے جو جی میں آیا کہنا شروع کیا، تاہم اسی اثنا میں اہلِ علم کی ایک معتدل اور روحانی جماعت بھی پیدا ہوئی جس نے عقل و نقل کے درمیان تطبیق و ہم آہنگی پر زور دیا، یہ نقطۂ نظر مناسب اور موزوں بھی تھا، چنانچہ سنجیدہ علمی حلقوں میں اس کو قبولیت نصیب ہوئی، اس متوازن طرزِ فکر کی ایجاد کا سہرا علامہ شبلی نعمانیؒ کے سر بندھتا ہے، انھوں نے خود اور ان کے تلامذہ نے ان کی اس تحریک کو پروان چڑھایا۔

نظریۂ عقل و فطرت | تفسیر القرآن کا مرکزی محور نظریۂ عقل و فطرت کے گرد گردش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اسی نظریہ سے سرسید نے قرآن مجید کے احکام کی تشریح و توجیہ کی ہے اور اس کی تعلیمات و ہدایات کو عقل و فطرت سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی ہے،

اسلامی تاریخ میں تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں فلسفۂ یونان کے زیر اثر معتزلہ نے یہی انداز فکر اختیار کیا تھا، چنانچہ سرسید کو معتزلہ کے طریقۂ تعبیر سے خاص مناسبت ہے، وہ ان کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"تمام مفسرین کی سوائے معتزلہ کے یہ عادت ہے کہ اپنی تفسیروں میں محض بے سند

اور افواہی روایتوں کو بلا تحقیق لکھتے چلے جاتے ہیں اور ذرا بھی تحقیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں[1]

در اصل سرسید کا نظریۂ عقل و فطرت ہو یا معتزلہ کا انداز فکر و تحقیق دونوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور کی تحقیقات اور ان کے نتائج کو قطعی مان کر مذہب کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ مذہب کی باتوں کو قطعی و یقینی تسلیم کر کے ان کی روشنی میں حکماء و فلاسفہ کے اقوال و نتائج کا تجزیہ کرنا چاہیے تھا، جو صحیح طریقۂ کار تھا اور جس پر معتزلہ کے مقابلے میں اس عہد کے علمائے اہلِ سنت گامزن تھے البتہ اس معاملہ میں اشاعرہ کے غلو سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تفسیر القرآن کے بعض اقتباسات | سرسید کے نظریۂ عقل و فطرت کے مطابق خرق عادت کا ظہور غیر ممکن اور قانون قدرت کے منافی ہے، اس لیے انھوں نے قرآن مجید میں مذکور انبیائے سابقین کے معجزات کی بھی تاویلیں کی ہیں، مولانا حالی نے انہی تاویلات کو اخبار ماضیہ کی تنقیح کا نام دیا ہے اور اس کو تفسیر القران کی اہم خصوصیتوں میں شمار کیا ہے۔

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے واقعات بالتفصیل بیان ہوئے ہیں جن میں متعدد خرق عادت واقعات کا ذکر ہوا ہے، ان میں سے بعض واقعات کے سلسلہ میں سرسید کی تاویلات پیش کی جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں تاریخ بنی اسرائیل کے ایک اہم واقعہ عبور بحر کا ذکر ہے جو ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کے ضمن میں کیا گیا ہے، اس کے متعلق سرسید مرحوم لکھتے ہیں:

"پس صاف معنی یہ ہیں کہ خدا نے حضرت موسیٰ کو کہا کہ اپنی لاٹھی کے سہارے سے

---

[1] سرسید احمد خاں، تفسیر القرآن ج ۱، ص ۲۱۔

سمندر میں چل دیے وہ پھٹا ہوا یا کھلا ہوا ہے یعنی پایاب ہو رہا ہے، سورۂ طٰہٰ میں جو آیت ہے اس میں صاف بیان ہوا ہے کہ میرے بندوں کو رات کو سمندر میں سوکھے رستے سے نکل چل؛ پس جو معجزہ تھا وہ یہی تھا کہ ایسے مشکل وقت میں سمندر کے پایاب ہونے سے خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے بچا دیا اور جب فرعون نے پایاب اترنا چاہا تو پانی بڑھ گیا، وہ مع اپنے لشکر کے ڈوب گیا۔[1]

انھوں نے مذکورہ بالا توجیہ کی تائید میں دلائل پیش کرنے کے بجائے علمائے اسلام کی علمی بے بضاعتی پر اشک ریزی کی ہے، لکھتے ہیں:

"علمائے اسلام کا زمانہ گیارہ بارہ سو برس سے سمجھنا چاہیے، ان بزرگوں نے اپنے ہوش سے بحرِ احمر اور اس کی شاخ کو جس میں سے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے عبور کیا تھا نہایت عمیق اور ایک تند سمندر دیکھا ہے اور ان کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کیا ہی بڑا جوار بھاٹا آوے وہ جگہ کبھی پایاب نہیں ہو سکتی اس لیے انھوں نے قرآن مجید کی صاف صاف عبارت اور الفاظ کو جو صریح جوار بھاٹے اور خشک زمین کے نکل آنے پر دلالت کرتی تھی الٹ پلٹ کر اس واقعہ کو بطور ایک عجیب واقعہ کے بنایا اور ایسا معجزہ جو قانونِ قدرت کو بھی توڑ دے ٹھہرایا، مگر حقیقتِ حال یہ نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جب بنی اسرائیل نے عبور کیا بحرِ احمر ایسا تھا اور سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ہے"۔[2]

بنی اسرائیل کے سروں پر اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور کو بلند کر کے ان سے عہد و پیمان لیا تھا جس کا ذکر قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں ہے سرسید اس واقعہ کی توجیہ یوں

---

[1] سرسید احمد خاں، حوالہ سابق، ج ۱ ص ۹۸ تا ۹۹ [2] ایضاً ص ۱۰۰۔

کرتے ہیں :

"بنی اسرائیل جو خدا کے دیکھنے کو گئے تھے طور یا طور سینین کے نیچے کھڑے تھے پہاڑ ان کے سر پر نہایت اونچا اٹھا ہوا تھا وہ اس کے سایہ تلے تھے اور طور بہ سبب آتش فشانی کے شدید حرکت و زلزلہ میں تھا جس کے سبب وہ گمان کرتے تھے کہ ان کے اوپر گر پڑے گا پس اس حالت کو خدائے تعالیٰ نے ان لفظوں میں یاد دلایا ہے ورفعنا فوقکم الطور' واذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة وظنوا انه واقع بهم، پس ان الفاظ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عجیب ہو یا مطابق واقع اور موافق قانون قدرت نہ ہو، ہاں مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعہ کو عجیب وغریب واقعہ بنا دیا ہے"[1]

قرآن مجید میں مذکور انبیائے سابقین کے معجزات کے بارہ میں تقریباً ہر جگہ یہی طرز فکر سرسید نے اختیار کیا ہے، جنکو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

علامہ شبلی اور ان کے مکتب فکر کا موقف | علمائے اسلام نے سرسید کے نظریۂ اسباب وعلل کی تردید میں بہت کچھ لکھا ہے، لیکن انھوں نے علت و معلول کی بحث کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، افراط وتفریط پر مبنی ان نظریات کے درمیان ایک تیسرا نظریہ بھی ہے جس کے حاملین نے زیر بحث مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ایک معتدل و متوازن موقف اختیار کیا ہے جس سے قدیم وجدید دونوں ذہن کے شکوک رفع ہوئے، اس کی وضاحت کے لیے علامہ شبلیؒ کی مندرجۂ ذیل تحریر ملاحظہ ہو :

"خرقِ عادت تمام مذاہب کا ایک ضروری عنصر ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا

---

[1] سید احمد خاں، حوالہ سابق، ج ۱، ص ۱۱۶۔

کہ اسلام میں بھی کچھ نہ کچھ اس کی جھلک موجود ہے۔ اس لیے اس عقیدہ کا عمل کرنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات منقول ہیں، فرقۂ جدیدہ ان کی عموماً تاویل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات کے مذکور ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا، بے شبہ ان واقعات کی تعداد یہاں تک جو مشہور ہے اس حد تک پہنچ گئی ہے، لیکن انکار محض کرنا بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں ہے، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں ہم اس سے بخوبی واقف ہیں، بے شبہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے کافی ہیں جو عربی زبان اور اس کے طرز و اسلوب سے ناآشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلمیع کیا کام دے سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید فرقہ چونکہ وہم پرست مسلمانوں کا طرف مقابل ہے اس لیے ضرور تھا کہ وہ اعتدال سے متجاوز ہو جائے۔ ایک طرف جب یہ افراط ہے کہ ہر قسم کے ناممکن اور محال واقعات ہر کس و ناکس سے سرزد ہو سکتے ہیں اور کرامات الاولیاء حق کے دائرہ کی وسعت کی کوئی حد نہیں قرار پائی تو اس کے مقابلہ میں یہ تفریط ہے کہ ممکن نہیں کہ کوئی واقعہ جو بظاہر خلاف ہو ہرگز وقوع میں نہیں آسکتا، لیکن ہم کو افراط و تفریط سے الگ ہو کر خود حقیقت حال پر غور کرنا چاہیے۔[1]

اس کی مزید تشریح کے لیے جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کا حسب ذیل اقتباس بھی پیش نظر رکھا جائے جس میں انھوں نے مسئلہ اسباب و علل کی تشریح کی ہے، وہ لکھتے ہیں :

---

[1] علامہ شبلی، الکلام، ص ۱۱۵ - ۱۱۷۔

"مسئلہ اسباب و علل نے دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی دو فرقے پیدا کر دیئے ہیں ایک فرقہ وہ ہے جو دنیا میں صرف اسباب و علل کے اختیارات کو تسلیم کرتا ہے اور ان اختیارات کو ناقابل نسخ و تغیر مانتا ہے، اس کے نزدیک اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ انہی مادی علل و اسباب کے ماتحت ہوتا ہے اور ان میں کسی قسم کا رد و بدل اور نسخ و تغیر نہیں ہوتا اور اس لیے وہ خرق عادت کو ممتنع اور محال یقین کرتا ہے۔ کیونکہ یہ اسباب و علل اور عالم کا یہ نظام کارسنت الٰہی ہے اور سنن الٰہی میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا..... دوسرا فریق اللہ تعالیٰ کو نظام خاص قوانین فطرت اور اسباب و علل کا پابند ٹھہرانا اس کی شان قدرت کے منافی سمجھتا ہے اور وہ ان بیچ کے وسائط کے بغیر اس کو فرمانروائے مطلق یقین کرتا ہے.....

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فریق افراط و تفریط کے دو کناروں پر ہیں.... قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اشیاء اسباب و علل سے پیدا ہوتی ہیں اور ان میں طبائع و خواص ہیں لیکن یہ اسباب و علل اور طبائع و خواص خود خلاق عالم کے پیدا کردہ اور مقرر کردہ ہیں اور وہ ان ہی پر عموماً کاربند رہتا ہے، لیکن وہ اس درجہ ان کا مجبور اور پابند نہیں کہ وہ ان میں تغیر نہ کر سکتا ہو اور کبھی اپنے خاص حکم و ارادہ سے بھی وہ ان کو شکست نہ کر سکتا ہو، کیونکہ اس عقیدہ سے کفر پرورش پاتا ہے اور خدا کی قدرت و عظمت میں فرق آجاتا ہے، اسی لیے ہر موقع پر قرآن مجید نے اپنی تعلیم میں اس نقطہ کو ملحوظ رکھا ہے کہ اسباب و علل کے ساتھ خدا کی مشیئت اور ارادہ کو پیش نظر رکھتا ہے، تاکہ انسانوں میں خدا کی مجبوری، معذوری اور عدم قدرت کا تصور نہ پیدا ہو... معجزہ کا سبب اور علت براہ راست اسکی

مشیئت اور ارادہ ہے، کبھی یہ مشیئت اور ارادہ عادات جاریہ اور ظاہری علل و اسباب کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً قوم نوحؑ کے لیے طوفان کا آنا، قوم ہودؑ کے لیے کوہ آتش فشاں کا پھوٹنا یا زلزلہ آنا، حضرت ایوبؑ کا چشمہ کے پانی سے صحیح و تندرست ہو جانا، قوم صالحؑ کے لیے آندھی آنا، مکہ میں قحط عظیم کا رونما ہو جانا، غزوۂ خندق میں آندھی چلنا، یہ تمام نشانیاں ظاہری اسباب اور عادات جاریہ کے خلاف نہیں، لیکن ان اسباب کے ظاہر ہونے کا سبب جس میں حق کی فتح اور باطل کی شکست، نیکوکاروں کی نجات اور گنہگاروں کی ہلاکت ہوئی محض بخت و اتفاق نہیں بلکہ ارادہ و مشیئت الٰہی نے خاص ان قوموں کے لیے بطور نشانی کے ان کو پیدا کیا اور کبھی یہ مشیئت الٰہی عادات جاریہ اور اسباب ظاہری کا نقاب اوڑھ کر نہیں بلکہ بے پردہ نشان بن کر سامنے آتی ہے، مثلاً عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے چشمہ کا جاری ہونا، مردہ کا جی اٹھنا، چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، پتھر سے چشمہ کا ابلنا، درختوں کا اپنی جگہ سے حرکت کرنا، بے جان چیزوں میں آواز پیدا ہونا کہ ان چیزوں کی تشریح موجودہ علم اسباب و علل کی بنا پر نہیں کی جا سکتی اور ان کو عادات جاریہ کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔[1]

سرسید سے قبل حکمائے اسلام میں فارابی اور ابن سینا کا بھی یہ خیال تھا کہ معجزہ اسباب خفیہ کی بنا پر صادر ہوتا ہے اور وہ طبعی اسباب و علل سے معرا نہیں ہوتا، اس لیے اس پر خرق عادت کا اطلاق درست نہیں ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کے اس خیال کی کمزوری بھی ثابت کی ہے، جس سے سرسید کے نظریہ عقل و فطرت کی بے حقیقتی عیاں ہو جاتی ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

---

[1] مولانا سید سلیمان ندویؒ، سیرۃ النبیؐ، ج ۳، ص ۲۶۷ تا ۲۰۵۔

"حکمائے اسلام فارابی اور ابن سینا وغیرہ کہتے ہیں کہ معجزہ اسباب خفیہ کی بنا پر صادر ہوتا ہے ..... حضرت موسیٰؑ مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو راستہ میں بحر قلزم (ریڈ سی) حائل تھا، حکم ہوا کہ اپنی لکڑی سے دریا کو مارو دفعتہً دریا خشک ہوگیا اور راستہ پیدا ہوگیا، حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر اتر گئے لیکن جب فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ دریا میں قدم رکھا تو دریا پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا اور وہ اپنے لشکر کے ساتھ ڈوب کر مر گیا، وہ اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ دریا میں مدوجزر تھا، جب حضرت موسیٰؑ پہونچے تو جزر تھا اور جب فرعون آیا تو مد ہوگیا اور جس وقت فرعون دریا میں داخل ہوا مد شروع ہوگیا اور وہ ڈوب گیا، ہم ان اعتراضات کو جو نقلی حیثیت سے اس توجیہ پر وارد ہوتے ہیں کہ توراۃ اور قرآن مجید نے اس معجزہ کی جس طرح تشریح کی ہے اس کی یہ صحیح نقل نہیں ہے نظرانداز کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ پہونچے تو جزر تھا اور جب فرعون آیا تو مد ہوگیا، آیا یہ اتفاقی امر تھا اور ممکن تھا کہ اس کے برعکس ہوتا یعنی فرعون بچ جاتا اور حضرت موسیٰؑ ڈوب جاتے اور یا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے لیے جزر اور فرعون کے لیے مد خاص طور سے پیدا کیا گیا تھا یا ایسے اسباب بہم پہنچائے گئے کہ حضرت موسیٰؑ جزر کے وقت پہونچیں اور فرعون مد کے وقت پہونچے اور اسکے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ اس خطرناک دریا میں بے سمجھے بوجھے قدم رکھے پہلی صورت میں تو معجزہ کیا نبوت کی بھی تشکیک لازم آتی ہے اور دوسری صورت میں خرق عادت کی تسلیم سے چارہ نہیں اور خرق عادت کے تسلیم کر لینے کے بعد خدا کی قدرت مطلقہ پر بھی ایمان لانا ہوگا۔[1]

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی، حوالہ سابق، ص ۵۲۔

مستشرقین سے مرعوبیت

سر سید کے طریقہ تفسیر کی دوسری بڑی کمزوری مستشرقین سے ان کی مرعوبیت ہے، ان کی نگاہوں کے سامنے سلطنت مغلیہ کے کھنڈر پر برطانوی سامراج قائم ہوا تھا اس لیے وہ مسلمانوں کو ابتلا و آزمایش سے بچانے کے لیے یہ مشورہ دیتے تھے کہ انگریزوں کے ساتھ مقاومت اور ٹکراؤ کے بجائے مفاہمت کا رویہ اپنائیں، مولانا حالی سر سید کے اس طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سر سید کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کوئی برتاؤ انگریزوں کی طرف سے ایسا نہ ہو جو ہندوستانیوں کی ذلت کا باعث ہو خصوصاً مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کی بدگمانی رفع کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فرو گذاشت نہیں کیا"[1]

غرض سیاسی سطح سے لے کر علمی محاذ تک سر سید کا یہی طریقہ کار تھا جس پر وہ نہایت نیک نیتی سے قائم تھے، تفسیر القرآن کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ خود سر سید اپنی عقلی توجیہات سے مطمئن نہ تھے بلکہ وہ مخالفین کے پروپیگنڈہ سے متاثر تھے، مثلاً وہ اپنی تحقیق میں ملائکہ اور شیاطین کے وجود کی نفی کرتے ہوئے ان کو مجموعہ قوی ملکوتی و قوی بہیمی بتاتے ہیں جو ہر قسم کی نیکی و بدی میں ظاہر ہوتی ہیں[2]، مگر خود ان کے متعلق اپنا عقیدہ یہ بتلاتے ہیں :

"ملائکہ کے وجود سے ہم کو انکار نہیں، جس قدر اختلاف ہے وہ صرف انکی حقیقت و ماہیت کی نسبت ہے"[3]

داخلی ردعمل

سر سید کے نزدیک خرق عادت اور معجزات کی تاویل و توجیہ کا ایک اہم

---

[1] مولانا حالی، حوالہ سابق، ج ۲، ص ۴۶۲ [2] سید احمد خاں، تفسیر، ج ۱، ص ۴۹ [3] ایضاً جلد سوم، ص ۴۹

سبب یہ بھی تھا کہ ان کے دور میں پیر پرستی و گور پرستی کا کاروبار عروج پر تھا اور اس قسم کے لوگ کرامات کا سہارا لے کر لوگوں کو مرعوب کرتے تھے، چنانچہ معجزات اور کرامات کے درمیان فرق و امتیاز کیے بغیر سرسید نے اس گھناؤنے کاروبار کے ردعمل میں بھی سخت موقف اختیار کیا، جس کا اندازہ ان کی درج ذیل تحریر سے بخوبی ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ہماری سمجھ میں کسی شخص میں معجزے یا کرامت کے ہونے کا یقین کرنا ذات باری کی توحید فی الصفات پر ایمان کو ناقص اور نامکمل کر دینا ہے اور اس کا ثبوت پیر پرست دگور پرست لوگوں کے حالات سے جو اس وقت بھی موجود ہیں اور صرف معجزے اور کرامت کے خیال نے ان کو پیر پرستی و گور پرستی کی رغبت دلائی ہے اور خدائے قادر مطلق کے سوا دوسرے کی طرف ان کو رجوع کیا ہے اور منتیں ماننا، نذر و نیاز چڑھانا، ان کے نام کے نشانات بنانا اور جانوروں کی بھینٹ دینا سکھایا ہے بخوبی حاصل ہے اسی وجہ سے ہمارے سچے ہادی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے سچے خدا وحدہٗ لاشریک لہٗ نے صاف صاف معجزات کی نفی کر دی تاکہ توحید کامل بندوں کو حاصل ہو۔"[1]

احکام اسلام کی غلط ترجمانی تفسیر القرآن کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں متعدد اسلامی احکام کی تشریح صحیح نہیں کی گئی ہے، مثلاً سود کے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:

"بہت سے معاملات قرضہ کے ہیں جو تجارت کے کاروبار میں پیش آتے ہیں اور ایسے بینکوں کے قائم ہونے سے جو سود پر تجارت کے مقاصد کے لیے روپیہ قرض

---

[1] سید احمد خاں، حوالہ سابق ج ۳، ص ۳۸ - ۳۹۔

دیتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ روپیہ پہونچاتے ہیں اور ہر قسم کی آڑھتوں کا کام کرتے ہیں اور جن سے تجارت کو اور ترقی ملک کو اور افزونی آبادی کو نہایت امداد پہونچتی ہے، ان معاملات میں جو سود کہ لیا دیا جاتا ہے، مجھکو قرآن مجید کی رو سے اس کے ایسے ربا ہونے جس کو اس آیت میں حرام کیا ہے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، پس حکم ربا کا جو قرآن مجید میں ہے وہ نہایت اخلاق و نیکی پر مبنی ہے اور اسی طرح ترقی تجارت و ترقی ملک و دولت کا مانع نہیں ہے، فقہاء نے بلاشبہ اپنے اجتہاد اور قیاس سے ایسی قیدیں بڑھا دی ہیں جن سے ربا کا حکم تجارت کی ترقی کا مانع قوی ہو گیا ہے، مگر قرآن مجید سے ایسا نہیں پایا جاتا"[1]

اسی طرح قربانی جو ایک مذہبی حکم ہے اس کے بارہ میں وہ رقم طراز ہیں:

"انسان کے گناہوں کے کفارہ میں قربانی کرنا اور انسان کے جرم کے سبب ایک جانور مارنا اور یہ سمجھنا کہ انسان اس گناہ سے پاک ہو گیا ایک عجیب و غریب خیال ہے جو نہایت تاریکی اور جہالت کے زمانہ میں لوگوں کو پیدا ہوا تھا ..... کسی قربانی کا حکم بطور انسانی گناہ کے کفارہ کے قرآن مجید میں نہیں آیا ہے، حج کی قربانیاں درحقیقت مذہبی قربانیاں نہیں ہیں اور نہ انکی فرضیت قرآن مجید سے یا نص صریح سے پائی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ ہمارے علمائے مجتہدین نے کتب فقہ میں کسی قربانی کو فرض نہیں ٹھہرایا ہے، زیادہ سے زیادہ جو کوشش کی ہے تو واجب لکھا ہے اور ہم کو اس میں بھی کلام ہے"[2]

دراصل قرآن مجید کی تفسیر کا کام بڑا نازک اور اہم ہے، اسی لیے علمائے اسلام نے

---

[1] سید احمد خاں، حوالہ سابق، ج ۱، ص ۳۰۰، [2] ایضاً، ج ۱، ص ۹۴، ۹۵۔

ایک مفسر کے لیے بہت سے اوصاف و خصوصیات کا حامل ہونا ضروری قرار دیا ہے، سرسید احمد خاں مرحوم اپنی گوناگوں خوبیوں اور کمالات کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کے اہل نہ تھے، اسکا اعتراف ان کی تحریک سے متاثر اور ان کے خدمات و کمالات کے قدرداں لوگوں نے بھی کیا ہے۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"سرسید کی تصانیف ماقبل غدر سررشتہ و قانون، سیرت و تاریخ، تصوف اور مذہبی مناظرہ سے تعلق رکھتی ہیں، بعد غدر انہیں مباحث میں پالیٹکس اور تعلیم کا اضافہ اور ہوگیا، کوئی رسالہ یا کتاب تفسیر یا ادب سے تعلق نہیں رکھتی نہ حیات جاوید سے کہیں اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ سرسید نے تفسیر کا مطالعہ باقاعدہ کیا ہو، ہاں اسکا ثبوت ہے کہ انکی نظر اس فن میں نہایت محدود تھی"[1]

سرسید احمد خاں مرحوم کی تفسیر القرآن پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے بڑی جامع مثال دی ہے، اس کی حیثیت شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ اَهْلِهٖ[2] کی ہے، ہم اسی پر یہ مضمون ختم کرتے ہیں، نواب صاحب لکھتے ہیں:

"ہمارے خیال میں سرسید کی تفسیر نگاری کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ ایک طوفان خیز سمندر میں جہاز کو ایسا کپتان لے جائے جو نہ کسی بحری مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہو اور نہ کسی ماہر استاد کی صحبت میں اس نے جہازرانی سیکھی ہو، اور محض ضرورت وقت پر لحاظ اور اپنی عقل پر بھروسہ کرکے جہاز کو لے چل کھڑا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے جہاز کا انجام کیا ہوگا"[3]

---

[1] مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی حوالہ سابق، ص ۵۶ [2] قرآن مجید میں مِنْ اَهْلِهَا تھا لیکن موقع کے لحاظ سے یہاں مِنْ اَهْلِهٖ کر دیا گیا ہے [3] مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، حوالہ سابق، ص ۹۵۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کا ایک تاریخی قصیدہ

از

جناب کالی داس رضا گپتا، بمبئی۔

"جون ۱۹۹۴ء کے معارف میں جناب عتیق جیلانی سالک رام پور کا مضمون "امتیاز علی عرشی اور بعض علمی مباحث" کے عنوان سے شایع ہوا ہے، اس میں ۱۸۵۷ء کے جہاد اور اس سے متعلق مولانا فضل حق خیرآبادی کے فتوے کے بارے میں عرشی صاحب اور مالک رام صاحب کے "رائے عام" سے اختلاف کا ذکر تھا، جناب کالی داس رضا گپتا صاحب کا نقطۂ نظر رائے عام کے علاوہ ان دونوں حضرات کے موقف سے بھی مختلف ہے گو ان کا یہ مضمون مطبوعہ ہے تاہم سالک صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد اس کو شایع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ تیسرا پہلو بھی اصحاب علم و نظر کے سامنے رہے۔" (ض)

انیسویں صدی کے پہلے نصف میں بہ لحاظ علم و ادب جن مشاہیر کا سکہ چلتا تھا ان میں مولانا فضل حق خیرآبادی (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۱ء) سرفہرست ہیں، اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کے باعث وہ علما میں مقام بلند رکھتے ہیں اور ان کا جلایا ہوا چراغ علم و فضل آج بھی مجلسوں کو جگمگا رہا ہے۔

مگر جہاں وہ بلاشبہ معقولات میں اپنے وقت کے امام سمجھے گئے، وہاں کالے پانی کی سزا

کے پیش نظر انہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ہیرو بھی قرار دیا گیا اور ان کے اس پہلو سے متعلق ایسی ایسی باتیں گھڑلی گئیں کہ اہل تحقیق کی نظر میں ان باتوں کا کسوٹی پر کسا جانا ضروری ہوگیا چنانچہ اس کام کو پہلے مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مضمون "مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتوئ جہاد (تحریک، ۷ اگست ۱۹۵۷ء) کے ذریعہ اور پھر مالک رام صاحب نے اپنے مضمون "مولانا فضل حق خیرآبادی" (تحریک، جون ۱۹۶۰ء) کے ذریعہ پورا کیا اور ثابت کیا کہ نہ صرف مولانا فضل حق نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ وہ آخر تک اس سے اپنی بے تعلقی اور عائد کردہ الزامات سے بے گناہی ثابت کرنے کے لیے پوری تگ و دو کرتے رہے۔

یہ دونوں مضامین اپنی جگہ نہایت مدلل ہیں، پہلے مضمون کا انحصار مولانا کے اس خط پر ہے جو انھوں نے نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کو لکھا تھا اور دوسرے مضمون کی پختہ عمارت حکومت کے ان پرانے کاغذات پر کھڑی کی گئی ہے جن میں اصل مقدمے کے کوائف محفوظ ہیں۔

مالک رام صاحب نے مضمون بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور ہر مفروضے کے خدوخال حقیقت کی روشنی میں ظاہر کر دیے ہیں۔ آج تک یہ مانا جاتا رہا ہے کہ

۱۔ مولانا فضل حق مرحوم پر مقدمہ، جس میں انہیں بالآخر کالے پانی کی سزا ہوئی، سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتوئ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت کی بنا پر قائم ہوا تھا۔

۲۔ منصفِ عدالت مولانا کا شاگرد تھا اور وہ چاہتا تھا کہ مولانا بری ہوجائیں۔

۳۔ جیوری میں ایک اسیسر بھی مولانا کو بری کر دینے کے حق میں تھا۔

۴۔ مولانا خود استغاثہ کے بیانات اور دلائل کو "تار عنکبوت" کی طرح توڑ دیتے تھے

اور اس بنا پر وہ بری کر دیے جاتے مگر انھوں نے خود اقرار کیا کہ جس فتوے کی بنا پر مقدمہ قائم ہوا ہے وہ صحیح اور میرا لکھا ہوا ہے۔

۵۔ اس اقرار اور اقبال کے بعد عدالت نے "بیحد رنج و غم کے ساتھ" مولانا کے لیے کالے پانی کا حکم سنایا۔

۶۔ مولانا نے یہ حکم کمال خندہ پیشانی سے سُنا۔

مالک رام صاحب نے مندرجہ بالا تمام دعووں کا مقدمے کی اصل مِسل کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ:

۱۔ مولانا نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا جس میں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہو۔

۲۔ مقدمہ کپتان تھربرن اور اس کے بعد جارج کیمبل اور میجر بارو کی مشترکہ عدالت میں ہوا تھا اور ان تینوں کا مولانا سے شاگردی کا رابطہ ممکن نہیں۔

۳۔ یہ عدالت فوجی قسم کی تھی ایسی عدالتوں میں جیوری ہوا ہی نہیں کرتی لہذا اسیسر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ مولانا بار بار (مقدمے کے دوران) یہی کہتے ہیں کہ میں نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا اور فتوے جہاد پر جن علماء کے دستخط ہیں ان میں سب سے مولانا کا نام ہی نہیں۔

۵۔ جوڈیشل کمشنر لکھتا ہے کہ مولانا کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے اور انہیں جلا وطن کر دینا چاہیے عدالت یہ فیصلہ "بیحد رنج و غم کے ساتھ" کیوں سُناتی۔

۶۔ جب مولانا اپنی پیرانہ سالی اور اپنی اولاد کی صغر سنی اور رعیال الحالی کا دردناک قصہ بیان کر کے حکومت سے رحم کی التجا کرتے ہیں کہ مجھے رہا کر دیا جائے تو وہاں "خندہ پیشانی" سے فیصلہ سُننے کا کیا مقام ہو سکتا ہے۔

مالک رام صاحب ان تمام داستانی باتوں کی تغلیط کے بعد فرماتے ہیں:

"آج تک ان (مولانا) کی نسبت جو غلط باتیں مشہور رہی ہیں دراصل یہ نتیجہ تھیں ہماری اس خواہش کا کہ ہم انہیں ... جنگ آزادی میں بھی برابر کا شریک دیکھنا چاہتے تھے ..... اب کہ حقیقت واشگاف ہو کر ہمارے سامنے جلوہ فروز ہو گئی ہے ہمیں اپنی گذشتہ غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے ..... مرحوم کی صحیح عزت اسی میں ہے کہ ہم انہیں (مولانا کو) ان کے صحیح مقام پر بٹھائیں نہ کہ غلط باتیں ان سے منسوب کر کے ان کا ایک فرضی بت بنائے رکھیں جو ممکن ہے خوبصورت تو ہو لیکن اصل سے اس کا کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوگا۔" ۱؎

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مالک رام صاحب کا یہ مضمون نہایت مفصل ہے جسے پڑھے بغیر مقدمے کی تفصیلات اور مولانا کے عاجزانہ اور ملتجیانہ بیانات جن میں بار بار بے گناہی جتائی گئی ہے اور رہائی کی درخواست کی گئی ہے گرفت میں نہیں آ سکتے اور چونکہ یہ سب تحریریں حکام وقت اور مولانا یا ان کے وکیل کے دستخطی ہیں اس لیے ان کی صحت قطعی مشکوک نہیں۔

اب صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک مولانا فضل حق خیرآبادی اور ان کے مقدمے اور کالے پانی کی سزا کا تعلق ہے عام روایتیں نادرست ہیں۔ عرشی صاحب اور مالک رام صاحب

۱؎ مولانا ارل کیننگ وائسرائے اور گورنر جنرل کو ایک درخواست میں لکھتے ہیں: "اب میری عاجزانہ درخواست ہے کہ جو کچھ صدر میں اسپیشل کمشنروں کے فیصلے کے خلاف قانون ہونے سے متعلق لکھا گیا ہے اس پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ شاہی اعلان کے مطابق انصاف کیا جائے یا ایک پیرانہ سال بوڑھے اور اس کے متعدد بے بس افراد خاندان پر رحم کو مدنظر رکھا جائے۔ بہرحال میری رہائی اور جائداد کی بحالی کے احکام صادر فرمائے جائیں گے۔"

نے ایمانداری سے تحریری شہادتیں پیش کر کے ثابت کر دیا کہ مقدمے کے دوران اور اس کے بعد انتقال (سال ۱۸۶۱ء) تک مولانا نے صورتِ حال کا جیسا بھی مقابلہ کیا اسے ان کے مقام کو دیکھتے ہوئے کسی بھی حالت میں جرأت مندانہ نہیں کہا جا سکتا ــــــ اسی طرح اس عرصے میں انھوں نے جو بھی بیان دیے وہ متہورانہ بیانات میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔ تاہم میری ذاتی رائے ہے کہ مقدمے اور اس کے رویے سے قطع نظر جو میرے خیال میں مولانا نے اپنی جان بچانے اور رہائی حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا وہ "جنگ آزادی" سے پورے طور پر متاثر تھے۔ انھوں نے اس جنگ میں عملی طور پر حصہ لیا ہو کہ نہ لیا ہو وہ جذباتی طور پر جنگ آزادی سے قطعی طور پر ہم آہنگ تھے اور فرنگیوں کی مخالفت میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اس کا ثبوت مولانا کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ فراہم کرتا ہے۔ اس کے اقتباسات تو آگے چل کر پیش کیے جائیں گے۔ پہلے قصیدہ کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ضروری سنین کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

جب ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں "جنگ آزادی" کا آغاز ہوا تو مولانا فضل حق الور میں تھے۔ ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو الور میں مہاراجہ بنے سنگھ کا انتقال ہو گیا اور بقول مولانا وہ مہاراجہ کی وفات کے ایک ماہ بعد یعنی ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ جیون لال اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ مولانا ۱۶ اگست (عبداللطیف کے مطابق ۱۹ اگست) کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شامل تھے اور انھوں نے نذر پیش کی۔ اسی زمانے میں سر جان لارنس پنجاب سے کمک لے کر دلی پہنچا۔ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب انگریزی فوج فاتح ہو کر دلی شہر میں داخل ہوئی تو مولانا شہر ہی میں موجود تھے۔ پانچ دن تک شہر کے گلی کوچوں میں دست بدست مڈبھیڑ ہوتی رہی اور آخر کار ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر مکمل طور پر انگریزیا

فوج کے قبضے میں آ گیا۔ بقول مولانا پانچ دن بعد ۱۹؍ ستمبر یا ۲۴؍ ستمبر ۱۸۵۷ء کو میں خدا پر بھروسہ کرکے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر (الور کو) چل کھڑا ہوا۔ چونکہ بار برداری کا سامان مہیا نہیں تھا اس لیے سارا سامان اور کتابیں اور مال وغیرہ یہیں (دلی میں) چھوڑ دیا"

اہل و عیال کو الور میں چھوڑ کر مولانا نے دسمبر ۱۸۵۸ء میں خیرآباد کی راہ لی خیرآباد کے علاوہ چندے کھیری، ہرگاؤں، تنبولی، سمھور پور، دریہ وغیرہ میں رہے اور ۲۶؍ دسمبر ۱۸۵۸ء کو انھوں نے سیتا پور کے مقام پر کرنل کلارک سے ملاقات کی۔ جنھوں نے حکم دیا کہ مولانا کو ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مولانا ۳۰؍ دسمبر ۱۸۵۸ء کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے حاضر ہوئے اور اپنے مکان ہی پر ٹھہرے رہے۔ جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے انہیں لکھنؤ روانہ کر دیا۔ مقدمہ ۲۲؍ فروری ۱۸۵۹ء کو کپتان تھربرن (لکھنؤ) کی عدالت میں پیش ہوا۔ ۴؍ مارچ ۱۸۵۹ء کو مقدمے کا فیصلہ سنا یا گیا۔ مئی ۱۸۵۹ء میں انہیں لکھنؤ سے مختلف جیلوں میں رکھتے ہوئے کلکتہ پہنچایا گیا اور وہاں سے فایر کوئین (Fire Queen) نامی جہاز میں انڈمان بھیج دیا گیا۔ جہاز ۸؍ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیر پہنچا۔ ایک سال دس مہینے تیرہ دن بعد ۲۰؍ اگست ۱۸۶۱ء کو مولانا نے وہیں انتقال کیا۔

میرے کتب خانہ میں عربی کی ایک قلمی کتاب ہے جس میں سات چھوٹے بڑے رسائل شامل ہیں۔ جن کو اصلی خطی نسخے سے نقل کیا گیا ہے[2]۔ ان میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے چھوٹی بڑی بحروں کے ۱۶ قصیدے ہیں۔ تین قصائد نونیہ ہیں۔ ایک قصیدہ نونیہ کا موضوع انگریزوں کے ہاتھوں دلی کی تباہی و بربادی اور مصنف کا دلی سے نکلنا ہے اور یہاں

---

[1] دہلی میں مولانا کی ایک بیوی معزز بیگم اپنے دونوں صاحبزادوں شمس الحق اور علاء الحق کے ساتھ محلہ بلی ماران میں مقیم تھیں [2] کتاب کا مکمل تعارف آئندہ پیش کیا جائے گا۔

اسی قصیدے کا لب لباب پیش کرنا مقصود[1] ہے۔ چونکہ قصیدے میں دلی کی تاراجی کے بعد دلی سے نکل کر منزل پر پہنچنے کا حال درج ہے اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قصیدہ ستمبر ۱۸۵۷ء کے تیسرے یا چوتھے ہفتے اور دسمبر ۱۸۵۷ء (خیرآباد کو روانگی) کی درمیانی مدت میں کہا گیا ہوگا۔ اگر قصیدہ خیرآباد پہنچ کر کہا گیا ہوتا تو اس میں خیرآباد کے سفر کا حال بھی درج ہوتا۔ اس لیے قصیدے کی تاریخ فکر اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۷ء مقرر کی جا سکتی ہے۔

قصیدہ

میں اپنے معشوق کے ساتھ جس کے جمال و کمال کی توصیف ممکن نہیں بڑی پُرمسرت زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک ایسے حادثات گزرے جو میرے اس کے درمیان حائل ہو گئے اور وصل کے تمام اسباب منقطع اور راہیں مسدود ہو گئیں۔ محبت کی باتیں کہانی بن گئیں اور طوفان نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

وہ طوفان یہ ہے کہ نصاریٰ تمام دنیا کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں، وہ اپنے مدعا کو سینے میں چھپائے، حیلوں بہانوں سے دینِ عیسوی کو پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ ہر عہد کو توڑ دیتے ہیں اور فریب و ضلالت پر کمر بستہ ہیں، جس ملک کو غصب کرنے میں ظلم و طغیان میں حد سے گزر جاتے ہیں، کمینوں، ذلیلوں کو ابھارتے ہیں تاکہ شریعت ختم ہو جائیں اور مدرسے بناتے ہیں تاکہ بچے بگڑ جائیں، ان کے مدرسوں میں لغویات، مکروہات، بہتان، عیاری و مکاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انھوں نے تمام لوگوں کا رزق چھین رکھا ہے چاہے وہ صناع ہوں کہ کاشتکار، ان کا فیصلہ فریقین کا مال سلب کر لیتا ہے اور ان

---

[1] اس قصیدے کے صحیح مفہوم کے لیے ایک عربی عالم سے مدد لی گئی ہے اور وہی اس کی صحت کے ذمہ دار ہیں۔

بے چاروں کو حزن و ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، جب ان مکاروں نے شاہان ہند کو لہو ولعب میں مشغول اور کمزور و شکست پایا تو آہستہ آہستہ ملک پر چھا گئے اور جب یہ جان لیا کہ حالات موافق ہیں تو اپنے لشکریوں کو کھلم کھلا تثلیث کی طرف دعوت دینی شروع کر دی فوجیوں میں اکثر ہندو تھے اور تھوڑے مسلمان، لیکن دونوں کی حمیت نے نصاریٰ کے قدم روک دیے، ان انگریزوں نے ان ہندو مسلمانوں کو گائے اور سور کی چربی کھانے پر مجبور کیا تاکہ دونوں فرقوں کے لوگ بے دین ہو جائیں اور ہماری طرف آ جائیں، کیونکہ ایک فرقہ گائے کو پوجتا ہے اور قرآن شریف کے ماننے والوں کے یہاں سور نجس العین اور شیطان کی طرح مانا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ان لشکریوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا تو انگریزوں نے ان پر سختی و تشدد کے آلے کو آزمایا، لشکریوں نے جواب میں الٹا ان ہی کو دھر لیا اور ان کی طرف اسلحہ لے کر پلٹ پڑے، چنانچہ لشکر کے بہت سے سردار قتل کر دیے گئے یہی نہیں بلکہ ان کی عورتوں بچوں وغیرہ کسی کا لحاظ نہ کیا۔ سب کو مارا، زخمی کیا، اموال لوٹے، مکانات جلائے اور اس طرح ملک ہند میں افراتفری و انتشار عظیم پیدا ہو گیا۔ کوئی حاکم رہا نہ نگران، سب کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے، جان و مال، ناموس و آبرو کسی کے تحفظ کا سہارا نہ رہا، عجیب ہلڑ مچا اور امن و سکون تہ و بالا ہو گیا۔ غنی مفلس ہو گئے اور مفلس مالدار۔ عزت والے بے عزت اور کمینے معزز و بارعب، غرض کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ امن و امان کا خاتمہ ہو گیا۔ فتنہ پھیلتا گیا اور اب تمام لشکری ایک بزدل و کمزور شخص کے گرد جمع ہو گئے۔ جس کا نام بہادر شاہ تھا اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔ ان کے ارادے غیر مستقل، انداز سے غلط و بے سود۔ نہ ان میں دین نہ ایمان۔ جو نظر آیا اسے لوٹ کھایا۔ ایک بڑا گروہ زناکاری میں لگ گیا اور ہزاروں عورتوں کی عزت و ناموس پر ڈاکہ ڈال کے ان کو بدکار بنا دیا۔ پیشہ ور بدکار عورتوں کی چاندی ہو گئی، انکا

حکم چلنے لگا۔ کچھ صرف مال جمع کرنے پر ادھار کھائے ہوئے تھے۔ تو کچھ بھوکے پیاسے اور
تباہ حال بعض ان میں اسلحہ کا استعمال بھی اچھی طرح نہ جانتے تھے۔ ادھر یہ دھینگا مشتی مچی
ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنے میں مست تھا۔ دوسری جانب نصاریٰ خندق کھود رہے تھے اور فصیلیں
تیار کر رہے تھے۔ انھوں نے اونچی اونچی پہاڑیوں پر پہنچ کر دمدمے نصب کر دیے اور افواج
کثیر کو چاروں طرف پھیلا کر شہر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد آتشیں اسلحہ بندوق و توپ
و تفنگ کا کمال دکھلانے لگے۔ شہر دھوئیں سے بھر گیا۔ ہر طرف آگ آگ بھاگ بھاگ مچا
ہوا تھا۔ ہزاروں افراد بھسم ہوگئے، مارے گئے، زخمی و معذور لوگوں کا کچھ حساب نہ رہا۔
اگرچہ لشکر دہلی میں کچھ مخلص مجاہدین بھی تھے، لیکن ان غریبوں کے پاس تھا کیا؟ نہ
پاس جنگ، نہ رسد، نہ اسلحہ، بیچارے تلوار اور گھوڑے لے کر لپٹنے آئے تھے۔ انھوں نے
بہت سخت جہاد کیا اور اللہ کی رضا کے مستوجب ہوئے لیکن قدیم آلات جنگ کے باعث
ہزیمت اٹھائی۔ ان کے علاوہ باقی لشکر زیادہ دیر ٹک نہ سکا اور تتر بتر ہو گیا۔ فرار کی
صورتیں ڈھونڈنے لگا۔ انگریزوں نے یلغار شروع کر دی اور حال یہ تھا کہ جیسے پلتے
ہوت کے گھاٹ اتار دیتے۔ انگریزی فوج دندناتی چلی آتی تھی اور قتل و غارت کا بازار گرم
تھا۔ دہلی کے رہنے والوں نے یہ سماں دیکھا تو بھاگنا شروع کیا اور اس کے بعد لوٹ مار،
قتل و غارت، بے رحمی و شقاوت کا حال وہ ہوا جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ گھروں کو
ڈھا دیا گیا۔ عمارتیں توپوں سے اڑا دی گئیں۔ راستے ویران بنا دیے گئے۔ درخت تک
آگ میں جھلس گئے۔ وہی لوگ بچ گئے جو بھیس بدل کر چھپ چھپا کر راتوں رات بھاگ لیے
ورنہ پورے شہر دہلی کے باشندے دشمنوں کے قیدی بن گئے اور قبرستان جیسا خوف اور
سناٹا کئی روز تک طاری رہا۔ ہائے ہائے نصاریٰ پیر پٹکتے اور اکڑتے ناچتے چلتے تھے اور
ہر گلی کوچے میں گشت لگاتے تھے اور اہل دہلی حیران، سوختہ سامان نیم مردنی کے عالم میں

آسمان کو تکتے تھے، باپ بیٹے سے دور، بھائی بھائی سے الگ، بیوی کو شوہر کی خبر نہیں۔ بچے ماں کے لیے روتے پھرتے اور مائیں بھوک اور حزن سے گریاں۔ کھانے کو ماش، پینے کا پانی شور، ہر قسم کی ذلت و صعوبت کا اجتماع، شریف عورتوں کی عصمت اور عفت کا خدا ہی نگہبان تھا۔ یہ وہ خواتین کے جسم پر پھٹے ہوئے لباس تھے لیکن اپنی عریانی کا ہوش ہی نہ تھا۔ بے چاریاں ایک طرف منھ اٹھائے بھاگی جا رہی تھیں۔ کتنی تو راستے میں ہلاک ہوئیں اور نہ جانے کتنی کوئیں اور دریا میں کود پڑیں کیونکہ نصاریٰ کے لشکر ان کے پیچھے پڑے تھے اور جو بھی مل جاتا اس کے ساتھ شقاوت و بے رحمی کی انتہا کر دیتے تھے۔

بادشاہ قید کر لیا گیا۔ اس کے چار جوان بیٹوں کے سر کاٹ کر اس کے پاس بھیجے اور لاش کو سولی پر چڑھایا۔ ملکہ کو قصر کے بدلے قیدخانہ آباد کرنا پڑا۔ ان انگریزوں کے ظلم سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ یا تو وہ جس نے بھیس بدل لیا ہے یا کسی قریبی گاؤں میں بھاگ کے چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ آل تیمور اور جرجان کے بادشاہوں کی اولاد نے ہزاروں کی تعداد میں پھانسی کی سزا پائی۔ نہ کسی عالم کو چھوڑا۔ نہ قدیم نشان کو، نہ قرآن کو بخشا۔ تمام مسجدیں ڈھا دیں سوائے دو ایک کے اور اس میں بھی نماز کی مناہی کر دی۔ شہر کا اس طرح برباد کیا کہ قصر و ایوان ایک نہ بچا۔ جس نے نصرانیوں کی مدد کی اسے آسمان پر چڑھا دیا۔ یہ کمبخت لوگ بے رحمی اور درندگی میں وشیطنت میں ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ دشمن کسی کو معاف کرنے والا نہیں اور مقابلے کا کوئی سوال نہیں تو میں نے بھی دکھے ہوئے دل سے دہلی کو خیرباد کہا مگر ہر قدم پر خوف تھا کہ نصاریٰ کے جاسوس دھر دبائیں گے اس لیے میں نے دور دراز کا راستہ اختیار کیا۔ ناقابل عبور ندیوں کو پار کیا۔ خدا ہی میرا بچانے والا تھا۔ ورنہ جگہ جگہ مجھے دشمن کی آنکھیں گھورتی نظر آتی تھیں، جب میں اپنے اہل و عیال سے آملا تو لوگوں نے نذریں اتاریں اور کئی دن تک تہنیت کا سلسلہ چلتا رہا۔

اخبار علمیہ

انسان کا جدِ اعلیٰ سب سے پہلے دنیا کے کس خطہ میں آباد ہوا؟ اس سوال کی تحقیق میں سائنسداں عرصہ سے سرگرداں ہیں، حال ہی میں اس موضوع پر چند رائیں سامنے آئی ہیں، اسٹیٹ یونیورسٹی نیویارک کے ڈیان ویڈل اور ٹیکساس یونیورسٹی کے ایچ یوکاک نے اس نظریہ کی تائید میں چند ثبوت اکٹھے کیے ہیں کہ انسان افریقہ میں تقریباً دو لاکھ سال پہلے آباد ہوا، اسے وہ جدید انسان سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن دنیا کے دو ممتاز ترین سائنسی مجلوں 'سائنس' اور 'نیچر' میں شایع ہونے والی جدید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ملین سال سے بھی پہلے صرف افریقہ میں انسان کے جدِ اعلیٰ کا وجود تھا، سائنسدانوں نے اب اس مسئلہ کا سراغ بھی کسی حد تک پالیا ہے کہ آخر اس قدیم ترین انسان نے افریقہ سے باہر نکلنے میں ایک ملین سال کیوں لگائے؟ تازہ ترین تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم انسان اب تک کے مفروضہ کے برخلاف افریقہ سے اور زیادہ عرصہ پہلے نکلا، عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ تقریباً ایک ملین سال پہلے جب کھانے پینے کے پتھر کے برتن زیادہ اچھی شکل میں ایجاد کیے گئے تو یہ اولین انسان ایشیا اور دنیا کے دوسرے خطوں میں پھیل گئے اور حقیقتاً یہی افریقی HOMOERECTUS تھے جو منتشر ہوکر HOMO SAPIENS بنے یعنی "جدید انسان" کے مورث اعلیٰ ہوئے، لیکن اس رائے کی تائید میں کوئی دلیل نہیں تھی، اب رسالہ 'سائنس' میں بارکلے کے

انسٹی ٹیوٹ آف ہیومن اوریجنس (IHO) کے کارل سویشر اور گارنس کرٹس نے لکھا ہے کہ قدیم ترین انسان کے بعض آثار انڈونیشیا کے جزیرہ جاوا میں پائے گئے ہیں یہ ۱۸ء ۱ ملین سال پہلے کے ہیں یعنی یہ بھی اتنے ہی قدیم ہیں جتنے افریقی آثار، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم انسان نے اپنے افریقی وطن کو لاکھوں برس پہلے ہی خیرباد کہہ دیا تھا، اس تحقیق کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ چین کے تین سائنسدانوں نے "نیچر" میں انکشاف کیا کہ چین میں ایک مقام پر ایک سر برآمد ہوا ہے جو ۲۰۰۰۰۰ سال قدیم ہے، اس سے یہ نظریہ اور پختہ ہوا ہے کہ افریقہ کے علاوہ دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی یکساں طور پر قدیم ترین انسان کی نشانیاں ہیں اور یہ کہ شروع سے بنی نوع انسان میں نسلی فرق بڑھنے لگا اور آج کے انسانوں کی طرح ان میں مختلف علاقوں میں مختلف خصوصیات و امتیازات ظاہر ہونے لگے۔

علم معدومیات (PALEONTOLOGY) کا زیادہ اہم اور مشکل سوال یہ ہے کہ بنی نوع انسان کا قدیم ترین مورث اعلیٰ اول اول کہاں آباد ہوا؟ اس تلاش میں اب تک سائنسدانوں کو جو ۷۵ ڈھانچے اور جسم انسانی کے حصے ملے ان میں کوئی کاسۂ سر نہ تھا، ان پنجروں اور ڈھانچوں میں بظاہر اس قدر اختلاف ہے کہ چند سائنسداں اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ نمونے ایک کے بجائے دو انواع انسانی کی جانب اشارہ کرتے ہیں، اب حال ہی میں ایتھوپیا میں ایک کھوپڑی ملی تو یہ بحث بھی قدرے آسان ہوئی، یہ کھوپڑی ایک مضبوط ابن مانس جیسی مخلوق کی معلوم ہوتی ہے، اس میں دماغ کا خانہ چھوٹا ہے، جبڑے آگے کی جانب نکلے ہوئے ہیں اور بھنویں گھنی ہیں، اسے سن آف لوسی کا نام دیا گیا ہے (۱۹۷۴ء میں افریقہ میں ایک بے سر کا

ڈھانچہ برآمد ہوا تھا اسے لوسی نام دیا گیا تھا) اس دریافت سے سائنس دانوں کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ نوع انسانی ایک ہی ہے لیکن فرداً فرداً ہر آدمی کی اپنی امتیازی ساخت و شکل ہوتی ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ قدیم انسانوں کی انتہائی لوچ دار طبعی ساخت نے ان کو ایک ملین سال تک بغیر کسی تبدیلی کے محفوظ رہنے کے قابل بنائے رکھا، حالانکہ اس عرصہ میں افریقی آب و ہوا میں متعدد بڑی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

کوہ آلپس کی بلندیوں میں سال ۱۹۹۱ء میں ایک برفانی انسان کی لاش پائی گئی تھی، علم الانسان کے ماہرین نے ۵ ہزار سال پرانی اس لاش کو بڑی اہمیت دی، اس وقت ان سطروں میں اس کا ذکر کیا گیا تھا، اب معلوم ہوا ہے کہ اس لاش کے کپڑوں اور اس کے پاس پائے جانے والے اوزار اور برتنوں کا تجزیہ قریب قریب مکمل ہو چکا ہے اور اب اس لاش کے اندرونی اعضاء کا تجزیہ کیا جا رہا ہے آسٹریا کی انسبرک یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ قدیم و ماقبل تاریخ کے پروفیسر اسپنڈلر نے بتایا کہ اکسرے اور کمپیوٹر کے ذریعہ نسیجوں اور رگوں کا تجزیہ کیا جائے گا، برفانی آدمی کے بچے کھچے کپڑوں کو بھی مرتب کر لیا گیا ہے، حجری عہد کے آخری دور کے انسانی لباس کا یہ پہلا مکمل نمونہ ہے، برفانی انسان کی بے آستین قبا کو جس نزاکت و سبک دستی سے بنایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کا انسان زیادہ پُر تکلف لباس استعمال کرتا تھا، دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کپڑے بُنے ہوئے نہیں ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانسے کے عہد تک کپڑے بُننے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی، اس برفانی لاش کے تجزیہ میں دنیا کے مختلف ممالک کے ۶۰

سائنسداں اور متعدد تحقیقاتی جماعتیں مصروف عمل ہیں۔

قدیم انسان کی اولین بود و باش کی تحقیق میں مصروف سائنسدانوں کے علاوہ ماہرین آثار قدیمہ کی ایک جماعت یہ جاننے کی آرزومند ہے کہ انسان نے مویشیوں خاص طور پر گائے بیل وغیرہ کو پالتو بنانے کا عمل کب شروع کیا۔ ایک خیال یہ تھا کہ تقریباً نو ہزار سال پہلے اناطولیہ میں انسان نے مویشیوں کو اپنے گھر آنگن کا حصہ بنایا تھا، اس عمل سے انسانی تہذیب میں ایک انقلاب آیا اور بعد میں یہ ساری دنیا میں رائج ہوا لیکن اب جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اناطولیہ ہی کی طرح عین اسی زمانہ میں اس علاقہ میں بھی یہ عمل شروع ہو چکا تھا جو اب پاکستان میں واقع ہے، مشہور زیبو سانڈ اپنے نمایاں کوہان کے ساتھ ہڑپا کی تہذیب میں پایا گیا ہے، اس کے متعلق تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ یہ یوروپی نسل سے زیادہ ایشیائی نسل کا ہے، اس سے یہ تصور بھی غلط ہو گیا کہ تمام گھریلو جانوروں کا مورث اعلیٰ یوروپ کا ایک نا پید جنگلی بیل ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ گوز، کوری، بن ٹنگ اور یاک جیسے ایشیائی جانوروں کی نگہداشت کر کے ایشیا نے ثابت کیا ہے کہ پالتو جانوروں کی اپنی خود ایک نسل ہے۔

کرۂ ارض کے علاوہ کیا نظام شمسی کے اور سیاروں بلکہ ان سے بھی ماورا چند نئے دریافت شدہ سیاروں میں ہماری دنیا کی مانند زندگی کے آثار موجود ہیں؟ اس سوال کے جواب میں سائنسدانوں کا عام خیال ہے کہ ہماری کہکشاں میں ایک ملین سے زیادہ ایسی تہذیبوں کا وجود ہے جو زمین کے باشندوں کی ہم پلہ یا ان سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہیں؟ انکی دید و دریافت کیلئے ہبل اور امریکا کی سو کورو رصدگاہوں کے علاوہ چلی کی ESO رصدگاہ میں نئی طاقتور ترین دوربینیں نصب کی جا رہی ہیں جو عام ریڈیائی لہروں کی بہ نسبت اربوں گنا باریک و نازک ترین اشاروں کو اپنے پیمانہ میں دیکھ سکتی ہیں! اسکے باوجود خیال یہی ہے کہ ان تہذیبوں کی یافت میں شاید صدیاں لگ جائیں۔

ع۔ ص۔

استفسار و جواب

جودھ بائی سے اکبر کے عقد اور اسکی ناخواندگی کا افسانہ

جناب ریاض الحق صاحب (۱۔ کیا شہنشاہ اکبر نے جودھ بائی سے نکاح کیا تھا اور کیا نکاح کے بعد دونوں اپنے اپنے مذہب پر قائم تھے؟ گیا۔

۲۔ کیا اکبر ناخواندہ اور جاہل تھے؟ اگر خواندہ تھے تو کیا صاحب تصانیف بھی تھے، کتابوں کے نام سے مطلع فرمائیں!

۱۔ اکبر کی متعدد بیویوں کا ذکر ملتا ہے، ان میں جودھ بائی کا نام بھی لیا گیا ہے، منشی ذکاء اللہ نے صراحتاً لکھا ہے کہ جودھ بائی یعنی جودھ پور کی رانی جہانگیر کی ماں تھی لیکن یہ فاش غلطی ہے، تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ جہانگیر کی ماں راجہ بھارا مل کی بیٹی، راجہ بھگوان داس کی بہن اور راجہ مان سنگھ کی پھوپھی تھی مگر کسی نے ان کا اصل نام نہیں لکھا، صرف بلوکمین نے ایک جگہ اسے جودھ بائی باور کر لیا ہے، لیکن بعد میں دوسری جگہ اس کی تردید بھی کر دی (تاریخ جہانگیر، بینی پرشاد) شاہی حرم میں اسکا لقب مریم الزمانی بیگم تھا، اکبر سے اس کی شادی ۱۵۶۱ء میں بمقام سانبھر ہوئی، اسوقت اکبر بے دین تھا نہ اسلام بیزار بلکہ وہ ایک سنی اور خوش عقیدہ مسلمان کی حیثیت سے معروف تھا، نماز کا پابند، مساجد کی تعمیر کا شائق اور اولیاء و صلحاء کے مزارات کا پابندی سے زیارت کرنے والا تھا، مریم الزمانی بیگم کے دین و مذہب کے متعلق حتمی طور پر کچھ مذکور نہ ہونے کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا مذہب اکبر کے

سائنسداں اور متعدد تحقیقاتی جماعتیں مصروف عمل ہیں۔

قدیم انسان کی اولین بود و باش کی تحقیق میں مصروف سائنسدانوں کے علاوہ ماہرین آثار قدیمہ کی ایک جماعت یہ جاننے کی آرزومند ہے کہ انسان نے مویشیوں خاص طور پر گائے بیل وغیرہ کو پالتو بنانے کا عمل کب شروع کیا، ایک خیال یہ تھا کہ تقریباً نو ہزار سال پہلے اناطولیہ میں انسان نے مویشیوں کو اپنے گھر آنگن کا حصہ بنایا تھا، اس عمل سے انسانی تہذیب میں ایک انقلاب آیا اور بعد میں یہ ساری دنیا میں رائج ہوا لیکن اب جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اناطولیہ ہی کی طرح عین اسی زمانہ میں اس علاقہ میں بھی یہ عمل شروع ہو چکا تھا جو اب پاکستان میں واقع ہے، مشہور زیبو سانڈ اپنے نمایاں کوہان کے ساتھ ہڑپا کی تہذیب میں پایا گیا ہے، اس کے متعلق تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ یہ یوروپی نسل سے زیادہ ایشیائی نسل کا ہے، اس سے یہ تصور بھی غلط ہو گیا کہ تمام گھریلو جانوروں کا مورث اعلیٰ یورپ کا ایک ناپید جنگلی بیل ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ گوز کو یری، بن ٹنگ اور یاک جیسے ایشیائی جانوروں کی نگہداشت کر کے ایشیا نے ثابت کیا ہے کہ پالتو جانوروں کی اپنی خود ایک نسل ہے۔

کرۂ ارض کے علاوہ کیا نظام شمسی کے اور سیاروں بلکہ ان سے بھی باور اچند نئے دریافت شدہ سیاروں میں ہماری دنیا کی مانند زندگی کے آثار موجود ہیں؟ اس سوال کے جواب میں سائنسدانوں کا عام خیال ہے کہ ہماری کہکشاں میں ایک ملین سے زیادہ ایسی تہذیبوں کا وجود ہے جو زمین کے باشندوں کی ہم پلہ یا ان سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہیں؟ انکی دید و دریافت کیلئے ہبل اور امریکا کی سو کور و رصدگاہوں کے علاوہ چلی کی ESO رصدگاہ میں نئی طاقتور ترین دوربینیں نصب کی جا رہی ہیں جو عام ریڈیائی لہروں کی بہ نسبت اربوں گنا باریک و نازک ترین اشاروں کو اپنے پیمانہ میں دیکھ سکتی ہیں؟ اسکے باوجود خیال یہی ہے کہ ان تہذیبوں کی یافت میں شاید صدیاں لگ جائیں۔ ع۔ ص۔

استفسار و جواب

جودھ بائی سے اکبر کے عقد اور اسکی ناخواندگی کا افسانہ

جناب ریاض الحق صاحب م ا۔ کیا شہنشاہ اکبر نے جودھ بائی سے نکاح کیا تھا
گیا۔ اور کیا نکاح کے بعد دونوں اپنے اپنے مذہب پر قائم تھے؟

۲۔ کیا اکبر ناخواندہ اور جاہل تھے؟ اگر خواندہ تھے تو کیا صاحب تصانیف بھی تھے، کتابوں کے نام سے مطلع فرمائیں!

ا۔ اکبر کی متعدد بیویوں کا ذکر ملتا ہے، ان میں جودھ بائی کا نام بھی لیا گیا ہے، منشی ذکاء اللہ نے صراحتاً لکھا ہے کہ جودھ بائی یعنی جودھ پور کی رانی' جہانگیر کی ماں تھی لیکن یہ فاش غلطی ہے، تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ جہانگیر کی ماں' راجہ بھارامل کی بیٹی، راجہ بھگوان داس کی بہن اور راجہ مان سنگھ کی پھوپھی تھی مگر کسی نے ان کا اصل نام نہیں لکھا' صرف بلوکمین نے ایک جگہ اسے جودھ بائی باور کر لیا ہے، لیکن بعد میں دوسری جگہ اس کی تردید بھی کر دی (تاریخ جہانگیر، بینی پرشاد) شاہی حرم میں اسکا لقب مریم الزمانی بیگم تھا، اکبر سے اس کی شادی ۱۵۶۱ء میں بمقام سانبھر ہوئی' اسوقت اکبر نہ بے دین تھا نہ اسلام بیزار بلکہ وہ ایک سنی اور خوش عقیدہ مسلمان کی حیثیت سے معروف تھا، نماز کا پابند، مساجد کی تعمیر کا شائق اور اولیاؤ صلحاء کے مزارات کا پابندی سے زیارت کرنے والا تھا، مریم الزمانی بیگم کے دین و مذہب کے متعلق حتمی طور پر کچھ مذکور نہ ہونے کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا مذہب اکبر کے

مذہب سے مختلف تھا، بلکہ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان ہوگئی تھیں، چنانچہ انکا انتقال ہوا تو جہانگیر نے لکھا کہ "امید کہ اللہ تعالیٰ ایشاں را غریق بحر رحمت خویش گرداند" اعدمہونے کے بعد وہ اپنے مرحوم شوہر کے روضہ کے قریب دفن کی گئیں جو آج بھی سکندرا میں مقبرہ مریم الزمانی بیگم کے نام سے موسوم ہے' اسی لیے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے کہاہے کہ "اس بات کو نظر انداز کرنا آسان نہیں" (اکبر اینڈ ریلیجن ص ۱۷۰) جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی یہ رائے بھی قابل ذکر ہے کہ "مورخوں نے راجپوت رانیوں کے باضابطہ مشرف بہ اسلام ہونے کا ذکر وضاحت سے نہیں کیا ہے لیکن ان کی کوئی اولاد ہندو نہیں رہی' سب کی سب مسلمان رہیں (تمدنی جلوے ص ۱۲۸) اور مشہور مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے جب یہ لکھا کہ ۱۵۷۰ء میں اکبر نے بیکانیر اور جیسلمیر کی راجکماریوں سے شادی کی تو یہ بھی لکھا کہ "تمام راجپوت دوشیزائیں رسمی طور سے اسلام قبول کرتی تھیں لیکن ان کے رشتہ دار ہندو ہی رہتے، یہ بیگمات اسلام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں البتہ وہ اس ضرورت کو تسلیم کرتی تھیں کہ ان کے بچے مسلمانوں کی مانند پرورش پائیں (اکبر: آئی ایچ قریشی ص ۱۴۰) اس سلسلہ میں مرقع اکبرآباد کے مولف سعید احمد مارہروی کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ "جودھ بائی کو عام طور سے اکبر کی بیگم اور جہانگیر کی ماں سمجھتے ہیں حالانکہ وہ جہانگیر کی بیگم اور شاہجہاں کی ماں تھی، اصل نام مان متی، خطاب جگت گسائیں اور حرم شاہی میں اس کا لقب بلقیس مکانی تھا، اکبر خود سلیم کی بارات لے کر ان کے محل گیا تھا' مجلس عقد ہوئی، اسلامی طرز سے نکاح ہوا ساتھ ہی شادی کی ہندوستانی اور راجپوتی رسمیں بھی انجام پائیں' ان جودھ بائی نے آگرہ میں ایک محلہ سہاگ پورہ آباد کیا

اور اس میں اپنا مقبرہ بھی تعمیر کرایا (مرقع اکبرآباد ص ۱۸۹) ان کے محل میں مندر بھی تھا اور پوجا پاٹ کے لیے کچھ درخت بھی لگائے گئے تھے اس کے متعلق لکھا گیا ہے کہ "یہ مندر غالباً جہانگیر کی اس راجپوت رانی کی سہیلیوں اور کنیزوں کے لیے بنایا گیا تھا"۔ (تمدنی جلوے، ص ۱۲۸)

۲۔ اکبر کی تعلیم کے متعلق مورخین کا بیان مختلف و متضاد ہے، ایک طرف تو یہ کہا گیا کہ "اس نے مکتب معلم سے کچھ حاصل نہ کیا، امی ہی رہا" (تاریخ ہندوستان ج ۵، ص ۱۱) اور یہ کہ "اس نے لکھنا پڑھنا کچھ نہ سیکھا" (مغل رول ان انڈیا، ایڈورڈس اور اوگیرٹ) تو دوسری طرف یہ بھی لکھا گیا کہ "ہمایوں کو اکبر کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال تھا چنانچہ ایام طفلی میں کئی نامور اتالیق و معلم مقرر کیے گئے" اور یہ کہ (اکبر) بڑی عمر میں لکھنے پڑھنے سے ماہر ہوا، اس کی پڑھنے کی کتابیں مدۃ العمر اس کی اولاد نے تبرکاً اپنے پاس رکھیں" (تاریخ ہندوستان ج ۵، ص ۲۷۷) اس تضاد کے متعلق ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے لکھا کہ "اکبر کے امی محض ہونے کے نظریہ کی تشہیر اسلیے کی گئی کہ اس کی مذہبی روشن خیالی کے دعویٰ کو تقویت پہونچائی جائے"۔ پروفیسر نظامی نے اور وضاحت سے اس ابہام کو یوں آسان کیا کہ "ابوالفضل نے اپنے آقا کی پیغمبرانہ صفات کی تلاش میں اس کا امی ہونا بھی ثابت کرنا چاہا" حالانکہ خود ابوالفضل کی تحریر سے یہ قطعی ظاہر نہیں ہوتا کہ اکبر ناخواندہ اور امی محض تھا ہاں روایتی تعلیم سے اس کی بے اعتنائی ضرور ظاہر ہوتی ہے (اکبر، قریشی) ظاہر ہے محض اس بے اعتنائی کی وجہ سے اس کو بے پڑھا لکھا ثابت کرنا درست نہیں، اس سلسلہ میں پروفیسر نظامی کی یہ رائے بڑی متوازن ہے کہ "اکبر ہو سکتا ہے بہت زیادہ محنتی طالبعلم

نہ رہا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے اساتذہ کی توقعات پر وہ پورا نہ اترا ہو لیکن یہ سوچنا بھی قرین انصاف نہیں کہ اس کے سات معلموں کی کوششیں اس کو جہالت سے تعلیم تک لانے میں ناکام رہیں" (اکبر اینڈ ریلیجن' نظامی' ص ۱۸)

۳۔ اکبر کی خود کی کوئی تصنیف نہیں لیکن حصول علم میں اس کے غیر معمولی شوق اور تلاش و تحقیق اور علمی مباحث میں اس کی مکمل دلچسپی اور قابل لوگوں کی سرپرستی کے جو بہت بزم تیموریہ کی علمی رونق اور شان و شوکت میں جو اضافہ کیا وہ تاریخ اکبری کا نہایت روشن باب ہے' اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

(ع۔ ص)

بزم تیموریہ

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم

ہندوستان کے تیموری بادشاہوں یعنی بابر' ہمایوں' اکبر' جہانگیر' شاہجہاں' اورنگ زیب اور ان کے بعد کے بادشاہوں' شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی و ادبی ذوق، ان کی علم دوستی و علم پروری و علماء نوازی اور ان کے دربار کے شعراء و فضلاء اور دوسرے ارباب فضل و کمال کا مکمل تذکرہ تین جلدوں میں ہے' پہلی جلد میں بابر سے اکبر دوسری جلد میں جہانگیر و شاہجہاں اور تیسری میں اورنگزیب اور بقیہ کا ذکر ہے۔

جلد اول زیر طبع' جلد دوم' ۴۰/-- .. جلد سوم ۴۵/--

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

تحصیل طب کے وقت محمد بن زکریا رازی کی عمر

از

جناب محمد مشتاق تجاروی، علی گڑھ

"مورخین و ارباب تذکرہ محمد بن زکریا رازی کے فضل و کمال اور اس کے یگانہ روزگار طبیب و جالینوس وقت ہونے پر متفق ہیں، لیکن اس نے کس عمر میں علم طب کی تحصیل کی اس کے بارے میں اکثر محققین سے لغزش ہوئی ہے، ڈاکٹر البیرز کی اسکندر نے اس مضمون میں اس غلطی کی تصحیح کی ہے اور علم طب کی تحصیل کے وقت اس کی صحیح عمر کی تحقیق کی ہے، اس لیے قارئین معارف کے لیے اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔" (مشتاق)

محمد بن زکریا رازی کی کتابوں میں اس کے متعدد اشارات و شواہد موجود ہیں کہ اسے اپنے وطن رے میں طب سے مناسبت و واقفیت ہو گئی تھی، چنانچہ وہ کتاب الخواص میں لکھتا ہے:

"میں نے رے میں ناریل کے مشابہ ایک پتھر دیکھا ہے، اس میں متعدد سوراخ ہوتے ہیں اور اس کے اوپر کا حصہ چھال کے مانند ہوتا ہے، ناریل ہی کی طرح اس کے پتھر کے اندر بھی کوئی چیز ہلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ارسطاطالیس نے اپنی کتاب "الحیوان الناطق" میں لکھا ہے کہ اگر اس پتھر کو بچے کی ولادت کے وقت عورت کے سر پر لٹکا دیا جائے تو درد زہ نہیں ہوتا اور بچہ کی پیدائش آسانی سے ہو جاتی ہے۔"

لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ رازی نے کتاب الخواص کب لکھی تھی اور اس نے اپنا مشاہدہ کب اور کہاں تحریر کیا تھا؟

آکسفورڈ کے کتب خانہ بوڈلین کے ایک مخطوطہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رازی نے طب کی تعلیم نوجوانی میں بغداد میں حاصل کی تھی، اس امر کا امکان ہے کہ وہاں اسکا قیام طویل عرصہ تک رہا ہو کیونکہ اسکا بیان ہے کہ طبیب کو عملی مشق کے لیے کسی گھنی آبادی والے شہر میں رہنا لابد ہے، کیونکہ ایسے شہروں میں بیماریاں بکثرت ہوتی ہیں اس لیے وہاں اطبا کی تعداد بھی کثیر ہوتی ہے، کتاب المنصوری میں "محنتہ الطبیب" کے زیر عنوان لکھتا ہے:

"دیکھنا یہ چاہیے کہ طبیب نے جو کچھ پڑھا ہے اس کی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے یا نہیں اور اگر وہ اسے سمجھ لیتا ہے تو کیا اس نے مریض کے احوال کا مشاہدہ کیا ہے اور کیا وہ ایسی جگہ رہا ہے جہاں مریضوں اور طبیبوں کی کثرت ہو۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ رازی نے نوجوانی میں بغداد میں علم طب کی تحصیل کی تھی اور مورخین کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بغداد سے اس کی اپنے وطن میں واپسی حاکم رے ابو صالح منصور (۲۹۶ - ۲۹۰ھ / ۹۰۸ - ۹۰۲ء) کے معالج کی حیثیت سے ہوئی تھی، اس نے اپنی "کتاب الطب الروحانی" کے بارے میں بتایا ہے کہ اسے بھی کتاب المنصوری کی طرح حاکم رے کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

اس کا احتمال ہے کہ رازی بغداد سے اس وقت رے واپس آیا ہو جب اس نے اچھا تجربہ اور پوری مہارت حاصل کر لی ہو اور رے کے افسر الاطبا کے عہدہ پر فائز ہونے کے لائق ہو گیا ہو۔ اس وقت راجح قول کے مطابق اس کی عمر ۱۳ اور ۴۳

سال کے درمیان تھی، اس کے ایک عرصہ کے بعد وہ بغداد کے شفاخانے میں ملازم ہوا
گو دوبارہ بغداد میں اس کے قیام کے سلسلے میں معلومات نہیں ملتے تاہم اتنا ضرور
معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ دوبارہ رے آیا تو اس کی آنکھوں میں نزول الماء کی وجہ سے
بینائی ختم ہوگئی تھی اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔

مورخین نے رے چھوڑ کر بغداد جانے کے وقت رازی کی عمر تیس[۳] یا چالیس[۴]
سال بتائی ہے جس کے بعد ہی اس نے طب کی تعلیم حاصل کی۔ اس سے پہلے وہ
موسیقی، کیمیا اور علوم طبیعیہ کی تعلیم حاصل کر چکا تھا، لیکن ہمارے خیال میں رازی
نے نوعمری ہی میں طبی معلومات جمع کرنا شروع کر دیا تھا، اس کی تائید البیرونی کے
بیان کردہ اس کے سنین ولادت و وفات سے بھی ہوتی ہے گو بعض علماء کو اس میں
شک و تردد ہوا ہے۔

(۲) بوڈلین (آکسفورڈ) میں ایک خلاصہ موجود ہے جس میں رازی کے
نسخوں اور مجربات کا تذکرہ ہے، اس کا نام اس نے "تجارب المارستان" رکھا تھا
اس میں صراحت ہے کہ رازی نے اس کو بغداد میں اپنی نوعمری میں لکھا تھا، اس
سے اس متفق علیہ قول کی تردید ہوتی ہے کہ رازی نے مُسن ہونے کے بعد طب کی
طرف توجہ دی تھی لیکن اس کتاب کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ
اس کی ابتدائی دور کی تحریر ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"جوشاندہ زوفا" کو خشک کھانسی، ضیق النفس اور امراض صدر میں
پلایا جاتا ہے۔ اگر اجابت خشک ہو تو اس میں مغز خیار شنبر ملا دیتے ہیں
لیکن اگر اجابت نرم ہو تو اس دوا سے اجتناب کرنا چاہیے اور اس کی جگہ

لعوق لوز پلایا جائے اور بچوں کو اگر کھانسی ہو تو مقلیین پلاتے ہیں اور اگر ضیق النفس اور کھانسی کی شدت ہو تو گدھی کا دودھ پلایا جاتا ہے۔ حب الشیطرج معمولی مسہل ہے اسے بدن کو گرم کرنے اور مفاصل (جوڑوں) کے تنقیہ کے لیے پلایا جاتا ہے۔
حب الدیارج کو سر اور آنکھوں کے امراض کے لیے پلایا جاتا ہے۔ اگر پیشاب رنگین آرہا ہو تو اس کی جگہ جوشاندہ ہلیلہ یا حب ہلیلہ پلایا جاتا ہے اگر اسی کے ساتھ سینہ بھی جکڑا ہوا ہو تو سادہ جوشاندہ پلانا چاہیے جسمیں کسی چیز کی آمیزش نہ ہو اگر کسی شخص کے مزاج میں خشکی غالب ہو تو اس کو جو کا پانی اور معتدل مزاج والے کو معتدل شکر کے ساتھ پلاتے ہیں، جس کے پیٹ میں مروڑ اور ریاح ہو اور اس کو جو کے پانی کی ضرورت ہو تو اسکو ستو کا پکا ہوا پانی پلایا جائے تاکہ ریاح خارج ہو جائے۔"

رازی کی یادداشتیں جو اس کے انتقال کے بعد "الحاوی" کے نام سے منظر عام پر آئیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں اس نے قدیم کتب طب کے اقتباسات بکثرت دیے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رازی کے معلومات وسیع تھے اور اس نے بغداد کے کتب خانوں سے مکمل استفادہ کیا تھا جو اس وقت یونانی، ہندی اور سریانی زبان کے تراجم سے بھرے پڑے تھے، ان یادداشتوں کو لکھتے ہوئے رازی نے حوالہ دینے کا اہتمام کیا ہے اور دوسروں کے اقوال نقل کرنے کے بعد اسکی تائید یا تردید بھی کرتا ہے وہ ناقص اقوال کی تکمیل اور مفصل اقوال کا خلاصہ بھی بیان کرتا ہے، رازی کی یادداشتوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیشتر اس کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔ اپنی اور دوسروں کی آراء میں فرق و امتیاز کے لیے وہ اپنی بات لکھنے سے پہلے "لی" ضرور لکھ دیتا ہے جبکہ تجارب المارستان میں یہ لفظ سرے سے نہیں ملتا بلکہ اس میں ہر جگہ اطباء کا

حوالہ ہی دیا ہے، ایک مثال سے ہمارا مدعا پوری طرح واضح ہو جائے گا۔

رازی نے "تجارب المارستان" میں لکھا ہے گر جانے سے جہاں چوٹ آئی ہو وہاں اطباء فصد کھولتے ہیں جبکہ کتاب المنصوری میں جو ایک اہم علمی تصنیف ہے اور اس کی اہمیت ہی کی بنا پر اس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا ہے اس مسئلہ پر تفصیل سے اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

"اگر کسی سواری وغیرہ سے گر جانے کی وجہ سے چوٹ لگ جائے تو سب سے بہتر یہ ہے کہ مریض کے مخالف سمت میں فوراً فصد کھول دی جائے، شراب اور گوشت سے پرہیز کرایا جائے۔ چوٹ کی جگہ پہ مقوی ادویہ کا ضماد یا طلا رکوایا جائے، اگر چوٹ سر میں ہو تو قیفال کی فصد کھولی جائے اور اس کے بعد سر پہ سرکہ میں روغن گل ملا کر لگایا جائے اور عرق گلاب پلایا جائے اور اس کا طلار کیا جائے اور مریض کو تین دن صبح و شام ماء الشعیر پلایا جائے۔"

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رازی اپنی نوعمری میں طب کا طالب علم یا نوآموز طبیب تھا جو بغداد کے شفاخانے میں علاج و معالجہ کی مشق کرتا تھا اور اپنے خاص استعمال کے لیے معلومات جمع کرتا تھا۔ نیز ان نسخوں سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا جنھیں شفاخانے کے ماہر اطباء استعمال کیا کرتے تھے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ رازی نے ان کو ایسی کتاب سے نقل کیا ہے جو شفاخانہ کے اطباء کے پاس تھی۔

رازی کے جو مخطوطات دنیا کے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں اگر وہ دسترس میں آجائیں تو ممکن ہے اس کی شخصیت کے مزید نئے پہلو بھی سامنے آجائیں۔

(ماخوذ از مجلہ الشرق ج ۴ ۵، شمارہ دوم۔ ۱۹۶۰ء)

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

لاہور ۳ر اگست ۱۹۹۴ء

فاضل مکرم و محترم جناب اصلاحی صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا محبت نامہ ملا تھا۔ آپ نے جس شفقت آمیز پیرایے میں میرا ذکر کیا ہے اسکا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

آپ کے خط آنے سے بہت پہلے میں ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جلد نہم) پر تبصرہ لکھ کر بھیج چکا تھا جو امید ہے کہ آپ کو مل گیا ہوگا۔

متذکرہ تبصرہ میں دینی موضوعات کے تحت 'دین' دین القیم اور دعا وغیرہ الفاظ کا اضافہ کر دیجئے[1]

ترک فاضل فؤاد سزگین کی "تاریخ التراث العربی" سے آپ بخوبی متعارف ہوں گے۔ اس کی پہلی جلد (قرآن والحدیث)، دوسری جلد (تاریخ و ثقافت) اور تیسری (علم کلام و تصوف) کا میں نے عربی سے اردو میں ترجمہ کر رکھا ہے۔ عرب مترجمین کا ترجمہ اس قدر مختصر اور موجز ہے کہ بعض مطالب تشنۂ وضاحت رہ جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے جرمن سے عربی میں ترجمہ کرتے وقت "مکھی پر مکھی مارنے" کی مشق کی ہے۔ میں نے اردو عبارت کو سلیس اور مطلب خیز بنانے کی امکان بھر

---

[1] معارف چھپنے کے بعد وہ خط ملا تھا اس لیے اضافہ نہیں کیا جا سکا۔

کوشش کی ہے۔

مذکورہ بالا جلدوں کی طباعت اور اشاعت سے قبل جامعۂ امام محمد بن سعود الاسلامیہ (ریاض) کی اجازت ضروری ہے، لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آرہا ہے، میں دو ماہ سے جامعہ والوں کو لکھ رہا ہوں، لیکن وہاں خاموشی ہے ع

ہاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

والا معاملہ ہے، حالانکہ ہماری یونیورسٹی جامعہ امام محمد بن سعود (ریاض) کو ساڑھے سات فیصد ROYALTY (رائلٹی) بھی دینے کو تیار ہے۔

مولوی حبیب الرحمن اعظمی مرحوم کا ایک خط لف ہذا ہے۔ اسے معارف کی کسی اشاعت میں شامل کر دیں۔

فقط والسلام

نیاز مند (شیخ) نذیر حسین

وفیات

مولانا نجم الدین اصلاحی

۱۴؍ اگست کو حافظ مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی نے تقریباً ۹۴ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۰

انھوں نے اپنے جد بزرگوار ملا قدرت علی مرحوم سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اپنے گاؤں ہی کے ایک دوسرے بزرگ حافظ عبدالرحیم مرحوم کی خدمت میں رہکر قرآن مجید حفظ کیا، مزید تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں ہوئی، اس وقت مدرسہ میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تدبر قرآن اور مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم سابق مہتمم مدرسۃ الاصلاح بھی زیر تعلیم تھے۔ فارسی میں مولانا نجم الدین صاحب کی اچھی اور پختہ استعداد ان کے ہم وطن مولوی محمد مصطفےٰ صاحب کے فیض تلمذ کا نتیجہ تھی۔ جو مدرسۃ الاصلاح میں فارسی کے بہت اچھے اور لائق معلم تھے۔ اس زمانے میں مولانا شبلی متکلم ندوی مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے مہتمم تھے، وہ علامہ شبلیؒ کے تلمیذ رشید اور اس مجلس اخوان الصفا کے ایک رکن تھے جو علامہ مرحوم کی وفات کے بعد انکے ناتمام کاموں کی تکمیل کے لیے مولانا حمید الدین فراہیؒ کی سربراہی میں قائم ہوئی تھی مولانا شبلی متکلم معقولات اور اسرار شریعت کی کتابوں کا درس اس شان سے دیتے تھے کہ طلبہ کو مطالب بخوبی ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ مدرسہ کا معیار تعلیم بلند اور بہتر بنانے کے لیے ان کو دوبارہ مدرسہ کی خدمت کی زحمت دی گئی تو بڑھاپے میں بھی

ان کے درس کا وہی رنگ رہا، اس کی شہادت مولانا نجم الدین صاحب نے اس طرح دی کہ وہ چپکے سے جنگلے کے پاس جاکر درس سنا کرتے تھے۔ انکے علاوہ مولانا عبدالرحمن نگرامی ندوی، مولانا حکیم محمد احمد لہرادی اور دوسرے اساتذہ سے بھی درسیات کی تکمیل کی، ۱۹۱۷ء میں جب مولانا حمید الدین فراہیؒ دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی سے استعفا دے کر مدرسۃ الاصلاح کے بوریائے فقر پر فروکش ہوئے تو وہ اپنے نہج پر یہاں کے اساتذہ اور منتہی طلبہ کو قرآن مجید پڑھاتے تھے، مولانا نجم الدین صاحب ان کے درس میں شریک ہوتے اور حافظ ہونے کی بنا پر قرأت بھی کرتے تھے۔ اس وقت اس نواح کے ممتاز اور نامور عالم مولانا ماجد علی مانوی جونپوری کے درسِ حدیث کی بڑی شہرت تھی، مولانا نجم الدین صاحب اس سے بھی فیضیاب ہوئے۔

رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے مدرسۃ الاصلاح میں تدریس کی خدمت انجام دی، وہ ہونہار اور ذہین طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے، جماعتِ اسلامی کے مشہور اہل قلم مولانا صدرالدین اصلاحی کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی سابق امیر جماعتِ اسلامی ہند نے بھی ان سے بعض کتابیں پڑھی تھیں۔

۱۹۴۳ء میں وہ سدھاری اعظم گڈھ تشریف لائے اور یہیں کے ہو رہے، مگر ۱۹۷۱ء میں کبرسنی کیوجہ سے وہ اپنے گھر ہی پر رہنے لگے۔

مولانا نجم الدین صاحب کا گھرانہ دیندار تھا اور خود ان کا رجحان بھی شروع سے صلاح و تقویٰ کی جانب تھا، ان کے بچپن اور جوانی میں مولانا سید محمد امین نصیرآبادی اپنے اصلاحی و تبلیغی مشن کے سلسلے میں اعظم گڈھ تشریف لاتے تھے اور یہاں اس کے

قصبوں اور دیہاتوں میں انکا وعظ ہوتا تھا اس کی وجہ سے یہاں انکے ہزاروں معتقدین و مریدین تھے، ماجھ پور سکروان کا خاص تبلیغی مرکز تھا اور وہ یہاں کئی کئی روز قیام کرتے تھے، مولانا نجم الدین صاحب ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ "یادگار سلف" کے نام سے ان پر ایک کتاب تالیف کی جس کو پڑھنے سے آج بھی ایمانی حرارت پیدا ہوتی ہے، مولانا سید امین صاحب کی ذات گرامی ان کے لیے اس بنا پر بھی نہایت پرکشش تھی کہ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے دودمان عالی سے تعلق رکھتے تھے جس کے ہر ہر فرد سے وہ غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے، اپنی یہ کتاب اسی مقدس خانوادۂ علم و ارشاد کے ایک قابل احترام بزرگ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی ندوی سابق ناظم ندوۃ العلما کے نام سے معنون کی تھی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے جو ان سے سن و سال میں چھوٹے تھے عقیدت و احترام کا یہی معاملہ تھا، مولانا بھی ان کا بڑا اکرام کرتے تھے اور اعظم گڈھ تشریف لاتے تو ان کے گھر بھی جاتے۔

مولانا نجم الدین صاحب دارالمصنفین سے بھی بڑا تعلق رکھتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور تمام رفقائے دارالمصنفین سے ان کے اچھے تعلقات تھے، مولانا سید سلیمان ندوی کے علم و فضل کے بڑے معترف تھے، جب تک قوت رہی برابر دارالمصنفین تشریف لاتے رہے، انتقال سے چند برس پہلے مجھے خط لکھا کہ تم سے ملنے کا بہت جی چاہتا ہے لیکن میرے پیروں میں طاقت نہیں رہی، میں حاضر ہوا تو بڑی محبت و شفقت سے پیش آئے اور دو تین گھنٹوں کی صحبت میں ماضی کے اوراق الٹتے رہے۔

اس صدی کی چوتھی دہائی میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متکلمانہ

اور دل و دماغ کو جھنجھوڑ دینے والے موثر مضامین نے بھی ان کو اپنی جانب مائل کیا، مولانا نے انہی کی دعوت پر سرائمیر کا سفر کیا اور ان کے گھر بھی تشریف لے گئے، اسی زمانے میں انھوں نے دلائل السنن والآثار کے نام سے ایک اہم مضمون لکھا جو مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن کے کئی نمبروں میں شایع ہوا اور بعد میں کتابی صورت میں بھی چھپا۔ لیکن رفتہ رفتہ مولانا سے ان کے تعلقات کم ہوتے گئے اور وہ انکی جماعت کی مخالفت میں پیش پیش رہنے لگے۔

مولانا نجم الدین صاحب کی عقیدت و نیاز کا اصل مرکز مولانا حمید الدین فراہیؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تھے، جن کو تدین و تقویٰ اور سیرت و اخلاق میں وہ صحابہ کرام کا نمونہ کہتے تھے، اول الذکر انکے استاد تھے اور انکے زہد و اتقا کی طرح علم و فضل کے بھی بڑے معترف تھے اور موخر الذکر سے بیعت و ارشاد کا تعلق تھا، ان دونوں بزرگوں کا ذکر کرتے تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی، ایک مرتبہ کہنے لگے ان دونوں سے زیادہ پاکیزہ اور حسین زندگی نہیں دیکھی۔

مولانا مدنی پر ان کے متعدد مضامین شایع ہوئے اور انھوں نے کئی برسوں کی محنت شاقہ کے بعد انکے مکاتیب جمع کرکے اپنے مفید حواشی کے ساتھ چار جلدوں میں شایع کیا جو انکا بڑا کارنامہ ہے، چند برس پہلے ان کی آخری کتاب "سیرت شیخ الاسلام" چھپی تھی، مولانا مدنی کی یادگار میں دیوبند سے ماہنامہ تذکرہ کا اجرا ہوا تو اس کی ادارت انہی کو سپرد کی گئی۔

مولانا مدنیؒ بھی اپنے مسترشد کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی دعوت پر راجہ پور سکرور تشریف لاتے اور اہل قریہ اور قرب و جوار کے لوگوں کو مستفیض فرماتے، مولانا ہی کے ایما سے حکومت نے انکا ماہانہ وظیفہ جاری کر دیا تھا، وہ کہتے تھے کہ مجھے جب کبھی سدھاری چھوڑنے کا خیال ہوتا تو حضرت کا اشارہ نہ پاکر اپنا ارادہ تبدیل

کر دیتا تھا، یہ دعائے مدنی کا فیض ہے کہ اللہ نے اس اچھے حال میں کر دیا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بھی ان کو خاص تعلق رہا اور ان کے ایما سے مولانا روم کی رباعیات کا ایک انتخاب شایع کیا جس کے شروع میں ان کے حالات بھی فارسی میں لکھے تھے۔

ان کی بعض کتابیں وسائل و ذرایع کی کمی کی بنا پر تکمیل و اشاعت سے محروم رہیں! دلائل القرآن کے بعض حصے برہان دہلی میں شایع ہوئے، وہ تفسیر ابن جریر کا ملتقط بھی شایع کرنا چاہتے تھے، جس کا کچھ حصہ مجلہ الحج مکہ میں چھپا تھا، لیکن غالباً مکمل نہیں ہو سکا، ایک مرتبہ کہنے لگے کہ استاذ امام مولانا فراہیؒ نے فرمایا تھا کہ تفسیر ابن جریر سے اگر "اولی الاقوال عندی" کو جمع کر دیا جائے تو ایک بہترین تفسیر ہو جائے گی۔

مولانا نجم الدین صاحب مدۃ العمر علم و دین کی خدمت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، ان کی زندگی سادہ اور فقیرانہ تھی، صبر و قناعت کے خوگر اور حرص و طمع سے دور رہتے۔ دینی حمیت کی وجہ سے غیر مشروع اعمال و اشغال پر برہم ہو جاتے۔ جن چیزوں کو صحیح سمجھتے تھے انکا اظہار بے باکی سے کر دیتے اور حکمت و مصلحت اور موقع و محل کی پروا نہ کرتے، زود رنج تھے، اختلاف رائے کو انگیز نہیں کر سکتے تھے۔ مزاج میں شدت و انتہا پسندی اور طبیعت میں طیش و اشتعال تھا اس لیے غصے میں بے قابو ہو جاتے اور اعتدال پر قائم نہیں رہتے، جو کچھ زبان پر آتا یہاں تک کہ ناروا اور ناگفتنی بھی کہہ دیتے تھے، تحریر بھی بے اعتدالی سے خالی نہیں ہوتی تھی، اسی لیے اکثر لوگوں سے انکی ان بن ہو جاتی تھی مگر خود انکا غصہ دیرپا نہ ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے اور بشری لغزشوں کو معاف کرے۔

"ض"

ادبیات

بہ حضورِ رسالت مآبؐ

ازجناب مقصود احمد مقصودؔ بڑودہ

پختہ دلِ مراد کا سودائے خام ہو
صبح و مسا تصورِ خیرالانام ہو

تنہائیوں کے غار میں ہے معتکف خیال
موصول پھر کوئی مرے دل کو پیام ہو

بے سایہ ایک دشتِ لق و دق ہوں تشنہ
مجھ پر سحابِ چشمِ عنایت مدام ہو

ہوش و خرد کی محفلِ بے کیف میں مجھے
عرفان و آگہی کا عطا کوئی جام ہو

پژمردہ و خمیدہ ہیں پودے یقین کے
پھر کشتِ اعتقاد پہ بارانِ عام ہو

اے کاش میری چشمِ تمنائے انتظار
دیدارِ مصطفیٰؐ سے ذرا سیر کام ہو

شاہانِ وقت نے بھی یہی کی ہے آرزو
شاملِ درِ نبی کے غلاموں میں نام ہو

یعنی چراغِ مصطفوی کی شعاع سے
روشن شبِ حیات کا سارا نظام ہو

عمرِ رواں کا مہرِ درخشاں ہو جب غروب
رشکِ سحر وصال مقدس کی شام ہو

شانِ رسولؐ پاک کے شایاں کبھی ادا
کیونکر فریضۂ ادب و احترام ہو

ہے سرنگوں وجود نہایت ادب کے ساتھ
مقصودؔ کا قبول شہِ دیں سلام ہو

نعتِ پاکؐ

ازجناب فاخر جلال پوری۔

مجھے یہ مال و زر کیا تختِ دارا و سکندر کیا — شہ بطحا کا ادنیٰ امتی ہوں اس سے بڑھکر کیا

مقاماتِ شہِ لولاک کی رفعت کا اندازہ — لگا پائیں گے جبریلِ امیں کے بازوئے پر کیا

مرے آقا کا فیضانِ کرم سب کے لیے یکساں — نگاہِ رحمتِ عالم میں کمتر اور برتر کیا

حرم کی شام اور صبحِ مدینہ جس نے دیکھی ہو — بہارِ خلد کا اس کی نظر میں کوئی منظر کیا

شرف ان کی غلامی کا میسر ہو جسے فاخرؔ
نگاہوں میں پھر اسکی سطوتِ کسریٰ و قیصر کیا

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب مغربی چمپارن

گذرتے ہیں کیسے الم کے زمانے؟ — بجز صاحبِ غم، یہ کوئی نہ جانے

نہ ہوگا جہانِ محبت میں رسوا — تہہِ دل سے جو بھی مری بات مانے

زہے مہرباں! آپ تشریف لائے — دمِ واپسیں ظرفِ دل آزمانے

کلی کی حقیقت ہے میری حقیقت — گلوں کے فسانے ہیں میرے فسانے

ہمیں اس نے بھیجا ہے خلد بریں سے — علوم و معارف کی دنیا بسانے

تجھے پا کے پہلے سے بھی مضطرب ہوں — فزوں کر دیا غم کو غم کی دوا نے

غمِ زندگی کے خزانے کا مجھ کو — نگہباں بنایا ہے میرے خدا نے

وفا جنست در عالمِ بے مروت — صد افسوس بر دانشِ آں جوانے

وہاں کوئی امیدِ انصاف کیسی؟ — جہاں ضد میں سچ کو کوئی سچ نہ مانے

نہ مسجد رہے گی نہ مندر رہے گا!! — جو دل ٹوٹ جائے تو کیا ہو نہ جانے

حقائق سے صرفِ نظر کر کے وارثؔ
گزرتے جا رہے ہیں ہزاروں فسانے

مطبوعات جدیدہ

مآثر امام اعظم مرتبہ حکیم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۸۰، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ پر اردو میں متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور ابھی تک اس کا سلسلہ جاری ہے، ان کی مسلّمہ عظمت و بلند پائیگی کے باوجود شروع ہی سے محدثین کا ایک طبقہ ناواقفیت کی بنا پر امام صاحب پر بے جا نکتہ چینی کرتا رہا ہے، جس کا مدلل جواب دیا جاچکا ہے لیکن اب بھی بعض حلقوں سے وہی فرسودہ اور لغو اعتراضات دہرائے جارہے ہیں، اس لیے مصنف نے امام صاحب پر بیجا اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے اور ان کے سیاسی و کلامی نظریات، اخلاق و معاملات کی صفائی اور فقہ حنفی کے امتیازات بھی بیان کیے ہیں، آخر میں ان کے جلیل القدر اصحاب و تلامذہ اور مسند ابو حنیفہ پر اچھی بحث و گفتگو کی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب گوناگوں فوائد و معلومات پر مشتمل ہے، لیکن مصنف کے ذہن کے انتشار اور خیال کی بے ربطی کی وجہ سے کتاب میں بھی بے ترتیبی و بے ربطی پائی جاتی ہے۔ پھیلے ہوئے مواد و معلومات کو سمیٹ کر نہ لکھنے کی وجہ سے جا بجا طوالت، تکرار اور الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے، زبان و بیان میں بھی خامی و ناہمواری ہے، تشیع، اعتزال، ارجاء، جبر و قدر اور جہمیت سے امام صاحب کی برأت کے لیے ان فرقوں کی مکمل تاریخ بیان کرکے بلاضرورت کتاب کا حجم بڑھایا گیا ہے، زبان و بیان پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے حدود و مراتب کا لحاظ

بھی نہیں کیا گیا ہے مثلاً "جب حضرت عثمانؓ کو امیر المومنین بنایا گیا تو حضرت علیؓ، ان کے رفقا و اعوان بپھر پڑے، ان کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا" امام صاحب کی مدافعت کا حق دوسروں کی تنقیص کے بغیر بھی ادا ہو سکتا تھا مثلاً "آج کے وہابی اگرچہ تعلیمات کے اعتبار سے مختلف ہیں مگر سادگی میں انہیں (خوارج) جیسے ہیں"۔ عربی کے ادق الفاظ کے ساتھ ہیاؤ جیسے پوربی اور اردو ہی لفظ اور خواہ مخواہ انگریزی الفاظ کا استعمال معیوب ہے جیسے "امام اعظم کو چیف کنٹرولر وزارت مالیات چیف جسٹس جیسے گرامی عہدے پیش کیے" اور "امام صاحب احادیث کو اخبار کی خبر نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ ایڈیٹوریل نوٹ بنا کر دکھانا چاہتے تھے۔۔" "علقمہ گویا ابن مسعودؓ کی ٹرو کاپی تھے" بعض الفاظ کا مفہوم ہی دشوار ہے مثلاً 'کاجلوں کی کوٹھری' کہیں غرابت ہے جیسے خرافی نرم گوشگی، عیبناکی کہیں ثقاہت و شائستگی کا سررشتہ چھوٹ گیا ہے جیسے شیعیت اسلام کے لیے جذام، گرو گھنٹال، امام بخاری بھی پانچوں سواروں میں وغیرہ، بعض ذیلی سرخیاں پُر لطف اور شاعرانہ رنگ میں ہیں لیکن یہ رنگ کہیں چبھتا بھی ہے جیسے "عباسی دورِ حکومت کا وجود۔۔۔ اموی حکومت کا زوال بھی آپ کے نگہ نیم باز کا کرشمہ تھا" بعض جگہ حوالوں کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے جیسے "خوارج کی سب سے مضبوط اور محکم رائے یہ تھی کہ خلیفہ الیکشن کے ذریعہ ہونا چاہیے جو بالغ آزاد رائے دہندگی پر مشتمل ہو"، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "چنانچہ حافظ نے لکھا ہے" یہ حافظ کون ہیں؟ علمی و تحقیقی مباحث میں ظن و تخمین پر مبنی الفاظ "غالباً"، "اگر" اور "ظاہر" ہے کا عیب ظاہر ہے، خطیبانہ و مدرسانہ رنگ بھی نمایاں ہے مثلاً فقہ تقدیری کے جواز و عدم جواز کی بحث کرنے والے سن لیں۔۔۔" ان خامیوں کے باوجود کتاب سے

مصنف کی ذہانت، محنت، جانفشانی اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ قدر کے لائق ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اردو کے ذخیرہ میں ایک مفید اضافہ ہے۔

مہران نقش از جناب ڈاکٹر وفا راشدی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت وطباعت، مجلد مع خوبصورت گردپوش، صفحات ۲۴۲، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ اشاعت اردو، ایف/۲۷، ٹی اینڈ ٹی کالونی، ملیر ہالٹ، کراچی ۲۰۔

وادی سندھ صدیوں سے تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کے کاروانوں کی رہگذر اور منزل رہی ہے، باب الاسلام ہونے کی برکت سے یہ خطہ اسلام کے ابر کرم سے سب سے پہلے سیراب ہوا، وہاں کے آثار، تاریخ اور زبان وادب میں اب تک اسی کی سرسبزی وشادابی جھلکتی ہے، فاضل مولف نے اس کتاب میں سندھی، فارسی اور اردو ادب کے چند نقوش اس سلیقہ سے جمع کر دیے ہیں کہ سندھ کی پوری ادبی تاریخ کا احاطہ ہوگیا ہے، ایک حصہ میں طلوع اسلام سے انگریزی حکومت کے غروب آفتاب تک سندھی ادب کا تاریخی جائزہ ہے اور ایک مضمون میں خاص طور پر مشہور صوفی شاعر شاہ لطیف کے کلام معرفت اور پیام محبت کی ترجمانی کی گئی ہے جس کا مطالعہ سندھ کے نفرت وتشدد کے موجودہ حالات میں نہایت مفید اور ضروری ہے، اردو ادب کے سلسلہ میں وہاں کے چند نامور اردو شعراء پر تحقیقی مضامین ہیں، ایک مضمون میں فاضل مولف نے مولانا سید سلیمان ندوی کی اس تحقیق کو برحق بتایا ہے کہ اردو کا مولد سندھ ہی ہے، ایک اور باب میں لعل شہباز قلندر، سچل، فقیر بیدل اور خواجہ حسن جان سرہندی کے فارسی کلام کے جائزہ کے علاوہ سندھ کے چند ارباب فضل وکمال کا تذکرہ بھی ہے، فاضل مولف اس سے پہلے اپنی عمدہ تصنیف "بنگال میں اردو" کے ذریعہ اہل نظر سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں، مہران نقش ان کی علمی

فتوحات میں ایک اور قیمتی اضافہ ہے۔

ایرانی تصوف از جناب پروفیسر کبیر احمد جائسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۶، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، اے، ایم، یو علی گڑھ

پروفیسر کبیر احمد جائسی کی ایران شناسی اور ادبیات فارسی سے ان کی دلچسپی اب محتاجِ تعارف نہیں، فارسی کے دور جدید کے کئی متعدد ادیبوں اور شاعروں کا تعارف اردو میں ان ہی کے ذریعہ ہوا، اب انھوں نے ایران کے مشہور محقق اہل قلم اور علی گڑھ کے ادارہ علوم اسلامیہ کے سابق استاد سعید نفیسی مرحوم کی کتاب "سرچشمۂ تصوف در ایران" کی تلخیص پیش کی ہے اور اس مقبول کتاب کو کتاب دل کی ایک تفسیر شمار کرتے ہوئے اسکے مالہ وماعلیہ سے آگاہ کیا ہے، آج کل کی زبان میں تصوف ایک ایسا متنازعہ موضوع ہے جس کی جنم بھومی میں شدید اختلاف رائے ہے، اسلامی تصوف کی بنیاد احسان وتزکیہ کے واضح اصول پر بتائی جاتی ہے اور اس کے سلاسل کا تعلق قرن اول کے سرچشمہ صافی سے ثابت کیا جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ یہ سلاسل ایران وعراق کی راہ سے ہوکر گزرے ہیں اور قدرتاً وہاں کی آب وہوا سے متاثر بھی ہوئے ہیں، لیکن اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ایرانی تصوف کا سرچشمہ اسلام کے بجائے بودھ مت ہے اور یہ اصلاً عربوں کے اقتدار کے خلاف شعوبی تحریک کے نتیجہ میں سامنے آیا ہے، محلِ اختلاف کے باوجود نفیسی کے دلائل ونظریات میں غور وفکر کا سامان ہے اور ان کو صرف یہ کہہ کر نظر انداز کردینا آسان نہیں کہ وہ ایران گرد ہی یا ایران پرستی کی نفسیات کا شکار ہیں، فاضل تلخیص نگار نے تلخیص و ترجمانی کا فریضہ اس خوبی سے انجام دیا ہے کہ بیشتر مباحث کا احاطہ ہوگیا ہے بعض سخت

مقامات پر رائے ظاہر کی ہے لیکن احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اگر کتاب کا مکمل ترجمہ کردیا جاتا تو براہِ راست واقفیت، استفادہ اور استغنا دونوں کے لیے کارآمد ہوتی۔

ہندوستان میں فلسفہ خودی کا ارتقا از جناب نشور واحدی

مرحوم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۱۲۹، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: دانش محل، امین آباد لکھنؤ اور نیاز واحدی ۹۸/۱۳۳ ناظر باغ، کانپور۔

نشور واحدی مرحوم کی شہرت ان کی پاکیزہ اور بلند پایہ شاعری کے سبب ہے، معارف میں ایک عرصہ تک ان کا کلام "شور نشور" کے عنوان سے شایع ہوتا رہا، ان کا کلام صوفیانہ اور فلسفیانہ تجلیات سے گرم و منور ہے، تصوف سے انکا عملی تعلق تھا فلسفہ سے ان کے شغف کی دلیل ان کی کتاب تاریخ فلسفہ خودی ہے جس کی پذیرائی اہلِ نظر نے کی، زیرِ نظر کتاب بھی گویا اسی کا ایک اور حصہ ہے، اس میں ویدک عہد بلکہ اس سے بھی قبل سے علامہ اقبال تک ہندوستان کے مختلف مذاہب اور ارباب فکر و دانش کے فلسفہ خودی کی تعبیر و تشریح کی تاریخ بیان کردی گئی ہے، اختصار کے باوجود جامعیت کی خوبی کہیں کم نہیں ہے، مولف مرحوم کی نثر ان کی شاعری کی طرح دلکش ہے، ایک دو جگہ عبارتوں کی تصحیح رہ گئی ہے جیسے "موجودہ ہندو مذہب کل کا کل آرین تہذیب سے نکلی ہے" آتما کو ایک جگہ تذکیر کے ساتھ لائے ہیں تو چند سطروں کے بعد ہی اسے صیغہ تانیث میں بھی استعمال کیا ہے، مولانا حمید الدین پھریاوی کے بجائے معروف نسبت فراہی لکھنا بہتر تھا، کتاب میں مولف کے متعلق پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تحریریں بھی شامل ہیں۔

مکتوبات مہاجر مدینہ مولانا محمد عبدالملک جامعی مرحوم

مرتب: جناب افتخار احمد فریدی، صفحات ۸۹، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

مولانا جامعی صاحب دل بزرگ اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے جذبہ سے سرشار تھے ان کے یہ مکتوبات اسی تڑپ کے ترجمان ہیں اور دل پر خاص اثر کرتے ہیں۔

مشاہیر کے خطوط

بنام حضرت العلامہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرتب محمد یسین کوپر کانوی، صفحات ۸۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ۔

جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتابوں اور دوسرے اخبارات و رسائل میں ان کے نام مشاہیر ہند کے خطوط خاصی تعداد میں موجود ہیں، ان متفرق علمی و ادبی جواہر ریزوں کو مرتب نے سلیقہ سے جمع کر دیا ہے اور مکتوب نگاروں کے مختصر تعارف اور چند مفید حواشی سے بھی آراستہ کیا ہے۔

ہند اسلامی تہذیب

مترجم جناب لیاقت علی، صفحات ۸۴، قیمت و پتہ درج نہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے ثانوی درجات کے نصاب میں ایک انگریزی کتاب انڈو اسلامک کلچر بھی ہے، اس میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کو خوبی سے بیان کیا گیا ہے مذہبی منافرت کے اس دور میں طلبہ کے لیے یہ بڑی متوازن کتاب ہے، اب اردو داں طلبہ اور دوسرے قارئین کے لیے اسکا ترجمہ کر دیا گیا ہے جو سلیس و رواں ہے اور کتابت و طباعت بھی اعلیٰ معیار کی ہے۔

ع۔ ص۔

جلد ۱۵۴ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۴ء عدد ۴

مضامین

شذرات

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی زندگی قرآن مجید کی خدمت اور اس میں غور و فکر کیلئے وقف رہی انھوں نے اسکی فہم و معرفت کی راہ ہموار کرنے کیلئے اپنے خاص نہج کے مطابق بعض لوگوں کی تربیت بھی کی اور انکی یادگار مدرستہ الاصلاح سرائمیر کا مقصد بھی قرآن مجید کی محققانہ تعلیم ہے، یہاں جو دوسرے علوم پڑھائے جاتے ہیں انکا محور و مرکز قرآن مجید ہی کو بنایا گیا ہے، مولانا کے تلمیذ رشید مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے اپنے استاذ کے علوم و معارف کی شرح و ترجمانی کر کے ان سے اہل علم کو بڑی حد تک متعارف کرایا، ہندوستان میں انکے افکار و نظریات کی ترویج درس و تدریس کے ذریعہ انکے خاص شاگرد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم اور تصنیفات کی اشاعت کے ذریعہ انکا داشناس مولانا بدرالدین اصلاحی مدظلہ ناظم مدرسہ و دائرہ حمیدیہ نے کی، اور اب مدرسہ کے قدیم طلبہ کی انجمن کی حرکت و دلچسپی سے "فکر فراہیؒ" کا فروغ ہو رہا ہے، انجمن کی سرگرمیوں کا مرکز علی گڑھ ہے جہاں سے علوم القرآن کے نام سے ایک ششماہی رسالہ شایع ہو رہا ہے جو قرآنیات کے متعلق مفید اور بلند پایہ مضامین کے لیے مختص ہوتا ہے۔ انجمن نے مولانا کی تصنیفات کی اشاعت کا منصوبہ بھی بنایا ہے اور بعض کتابیں شایع بھی کی ہیں۔

تین برس پہلے انجمن کے زیر اہتمام مدرستہ الاصلاح سرائمیر میں ایک یادگار سیمینار ہوا جس میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ بھی شایع ہو گیا ہے، اس سال بھی ۶تا۸ اکتوبر کو انجمن نے مدرسہ میں "نظم قرآن" کے موضوع پر دوسرا سیمینار کرایا جس میں ملک میں دفعتاً پیدا ہو جانے والی ایک خاص صورتحال کی وجہ سے ملک و بیرون ملک کے بعض اصحاب علم شریک نہیں ہو سکے تاہم یہ اپنے مقصد، نظم و ضبط، حاضرین کی تعداد اور اس لحاظ سے بہت کامیاب رہا کہ اس میں ۲۱ مقالات پڑھے گئے، سیمینار کا افتتاح انجمن کے صدر اور ملک کے مشہور عالم و مصنف مولانا صدرالدین اصلاحی نے کیا اور افتتاحی جلسہ کی صدارت بھی کی، خطبۂ استقبالیہ مولانا انیس احمد اصلاحی نے اور کلیدی خطبہ ڈاکٹر مظفر احسن اصلاحی نے پڑھا، مقالات کے ۵ جلسے علی الترتیب پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی مولانا جلال الدین انصر عمری، مولانا محمد فاروق خاں، راقم الحروف اور مولانا عنایت اللہ سبحانی کی صدارت میں ہوئے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ، دہلی، لکھنؤ یونیورسٹی

تکمیل الطب کالج لکھنؤ، دار المصنفین اعظم گڈھ، جامعۃ الفلاح بلریاگنج اور مدرسۃ الاصلاح سے وابستہ حضرات نے مقالے پڑھے، ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی نے جلسوں کی کارروائی خوش اسلوبی سے چلائی اور مدرسہ و انجمن کے عہدیداروں، اساتذہ اور طلبہ نے مہمانوں کو آرام و راحت پہنچانے کے لیے غیر معمولی جدوجہد کی۔

نظم قرآن مولانا فراہیؒ کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے، وہ اس کو قرآن فہمی کا اہم وسیلہ اور بنیادی کلید سمجھتے تھے، انھوں نے اسکا جامع، وسیع اور ہمہ گیر تصور مدلل طور پر پیش کیا اور اپنی تصنیفات اور مختلف سورتوں کی تفسیروں سے عملاً برت کر بھی دکھایا اور یہ واقعی انکا عظیم الشان کارنامہ ہے تاہم متقدمین علماء کے یہاں بھی یہ تصور موجود ہے بلکہ بعض نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور بعض نے اپنی تفسیروں میں وجوہ نظم بیان کیے ہیں، اس سمینار میں نظم کی ضرورت و اہمیت اور مفہوم کی وضاحت کے علاوہ نظم قرآن کے متعلق مولانا فراہیؒ کے خیالات و تصورات کے ساتھ ہی دوسرے علماء کی تصنیفات اور تفسیروں کا جائزہ لیکر انکے تصورات نظم بھی واضح کیے گئے اور بعض مقالات میں کسی متعین یا کئی سورتوں کے نظم و ترتیب کو واضح کیا گیا، راقم نے امام رازیؒ کی تفسیر سے آیات کے ربط و نظم کی مثالیں پیش کیں، مولانا عنایت اللہ سبحانی کے عربی مقالے میں سورۂ قمر کے اعجاز و نظام کو اچھے انداز میں پیش کیا گیا تھا اور مولانا جلال الدین صاحب نے بعض سور مفصلات کے نظم پر گفتگو کی تھی۔ مقالات پر خوشگوار ماحول میں بحث و مباحثہ بھی ہوا، دعا ہے کہ یہ مفید سلسلہ جاری رہے تاکہ قرآن مجید میں تدبر کا مذاق پیدا ہو اور مدرسہ کے مقاصد اور مولانا فراہیؒ کے افکار کی اشاعت بھی ہو۔

کلکتہ کے بعض ذی شعور لوگوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے ۱۹۶۸ء میں مسلم پروگریسیو سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی تھی جس نے فری کوچنگ سنٹر، پروگریسیو ڈے اسکول، مقابلے کے امتحانات کیلئے تربیتی کلاس اور ایک لائبریری قائم کی ہے، سوسائٹی کے زیر اہتمام تعلیمی و ادبی پروگرام بھی ہوتے ہیں، ۲۵ ستمبر کو "مسلمانوں کے موجودہ تعلیمی و اقتصادی مسائل اور انکا حل" کے موضوع پر ایک کل ہند سمینار ہوا جس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خاں نے کی اور پروفیسر عبد المغنی نے اس کا افتتاح کیا، کلکتہ اور باہر سے آئے ہوئے حضرات نے

مقالات پڑھے اور تقریریں کیں۔ راقم نے بھی اس کے لیے مضمون لکھا تھا مگر تقریر ہی کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا ذکر کرتے ہوئے تعلیم کی ضرورت واہمیت واضح کی اور اس پر زور دیا کہ مسلمانوں کی دینی درسگاہوں میں جدید علوم پڑھائے جائیں تاکہ مسلمان وقت کے اقتضا، موجودہ معیار اور اسلوب کے مطابق اسلام کی دعوت واشاعت کا کام کرسکیں جوان کا اصلی فریضہ ہے، اسی طرح جدید تعلیم گاہوں میں قرآن مجید، احادیث نبوی اور تاریخ اسلام کے درس کا اہتمام کیا جائے تاکہ مسلمان اپنے دین اور اپنی تاریخ و تہذیب سے واقف ہوکر اپنے امتیاز و تشخص کو باقی رکھ سکیں، اس کی وجہ سے طلبہ پر بوجھ تو بڑھے گا مگر اسے اٹھانا ضروری ہے، معاشی مسئلہ بھی تعلیمی پسماندگی دور کرکے حل کیا جاسکتا ہے اور اسکے لیے ٹکنیکل اور ٹریکل اسکول اور کالج کھولے جائیں۔

وقت کم تھا، کلکتہ میں دارالمصنفین کے قدردانوں کا وسیع حلقہ ہے لیکن صرف حاجی منظور علی صاحب مالک اٹلانٹین ہوٹل سے ملاقات اور مولانا حکیم زماں حسینی صاحب کی عیادت کے لیے جاسکا، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے موقر رکن اور کلکتہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس خواجہ محمد یوسف صاحب، جناب احمد سعید ملیح آبادی اڈیٹر آزاد ہند اور جناب کلیم الدین شمس صاحب وزیر حکومت مغربی بنگال نے میری قیام گاہ پر تشریف لاکر ممنون کیا۔ موخر الذکر دونوں حضرات نے قوم و ملک کے حالات و مسائل پر بڑی دردمندانہ گفتگو کی اور دارالمصنفین تشریف لانے کا اشتیاق ظاہر کیا، سوسائٹی کے سکریٹری جناب زین العابدین صاحب سایہ کی طرح ساتھ رہے اور کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔

گذشتہ ماہ مولانا سید احمد ہاشمی ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند سے ملاقات ہوئی تو کسی فرصت کے وقت ہفتہ عشرہ کے لیے دارالمصنفین تشریف لانے کا وعدہ کیا، انکی معیت میں جناب الحاج سی۔کے جعفر شریف صاحب وزیر ریلوے حکومت ہند سے بھی ملنے گیا۔

مقالات

چند قومی مرثیے

از پروفیسر نذیر احمد، علی گڑھ

(۲)

خاقانی نے ۵۶۹ھ دوسرے حج سے واپسی کے موقع پر یہ منظومہ لکھا جو قصیدۂ مدائن کے نام سے مشہور ہے لیکن جو دراصل ساسانی دور کی علمی وثقافتی ترقی کا مرثیہ ہے۔ خاقانی کا یہ قصیدہ کافی مشہور ہوا اور کئی شاعروں نے اس کے جواب میں نظمیں لکھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی خاقانی کے قصیدے کے درجے کو نہیں پہنچ سکا۔ ذیل میں اس منظومہ کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ یہ دراصل ساسانی دور کے ایران کا قومی مرثیہ ہے

ہاں ای دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہان ایوان مدائن را آئینۂ عبرت دان	اے عبرت حاصل کرنے والے دل غور غور سے دیکھ تو تجھے معلوم ہوگا کہ مدائن کے محل آئینۂ عبرت ہیں۔
یک رہ ز لب دجلہ منزل بہ مدائن کن وز دیدہ دوم دجلہ بر خاک مدائن ران	دریائے دجلہ کے کنارے سے ایک مرتبہ مدائن کا رخ کر مدائن پہنچ کر شہر پر آنکھوں سے اتنا آنسو بہا کہ گویا دوسرا دجلہ بہنے لگے۔
خود دجلہ چنان گرید صد دجلۂ خون گوئی	خود دجلہ اس طرح رو رہی ہے گویا اس میں سیکڑوں

کز گرمی خونابش آتش چکد از مژگان

دجلہ خون بہ رہا ہے اور خون اندر پانی کی آمیزش میں اتنی گرمی ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھ سے آگ نکل رہی ہے۔

بینی کہ لب دجلہ چون کف بدہان آرد
گوئی ز تف آہش لب آبلہ زد چندان

تو دیکھے کہ دجلہ کے کنارے جیسے منہ میں کف جم گیا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ آہ کی گرمی سے ہونٹوں پر اتنے آبلے پیدا ہو گئے ہیں۔

از آتش حسرت بین بریان جگر دجلہ
خود آب شنیدستی کآتش کندش بریان

حسرت کی آگ سے جگر دجلہ بھن رہا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کیا کبھی سنا ہے کہ آگ پانی کو بھون دے۔

بر دجلہ گری نو نو ز دیدہ زکاتش دہ
گرچہ لب دریا ہست از دجلہ زکات استان

دجلہ پر تو طرح طرح سے آنسو بہا، یہ آنسو بہانا گویا تیری آنکھ کی زکات ہے، اگرچہ خود دریا کا کنارہ دجلہ سے زکات لے رہا ہے۔

گر دجلہ در آموزد باد لب و سوز دل
نیمی شود افسردہ نیمی شود آتشدان

دجلہ میں باد لب (آہ) اور سوز دل کی آمیزش ہے اس کا نصف ٹھنڈا ہے اور نصف دوم آتش دان۔

تا سلسلۂ ایوان بگسست مدائن را
در سلسلہ شد دجلہ چون سلسلہ شد پیچان

جب ایوان مدائن کا سلسلہ ٹوٹا تو دجلہ کا سلسلہ ایسا شروع ہوا جیسا کہ زنجیر پیچدار ہوتی ہے۔

گہ گہ بزبان اشک آواز دہ ایوان را

کبھی کبھی آنسوؤں کی زبان سے ایوان

تا بو کہ بگوش دل پاسخ شنوی ز ایوان

مدائن کو پکارا امید ہے کہ ایوان کا جواب
تو اپنے گوش دل سے سُن لے ۔

دندانۂ ہر قصری پندی دہدت نو نو
پند سر دندانہ بشنو ز بن دندان

ہر محل کے ٹوٹے ہوئے کنگورے میں جو دندانہ
پڑ گئے ہیں ان سے طرح طرح کی نصیحت
ملتی ہے اور تجھے چاہیے کہ ان نصیحتوں کو
تم بڑی توجہ اور خلوص سے سُنو ۔

گوید کہ تو از خاکی ما خاک تو ایم اکنون
گامی دو سہ بر ما نہ و اشکی دو سہ ہم بفشان

محل سے یہ نصیحت آتی ہے کہ تو خاک کی ہے
اور اب ہم تیرے پیروں کی خاک ہیں اور
چار قدم ہمارے کھنڈروں پہ دھرتا اور دو
چار آنسو بھی بہاتا جا ۔

از نوحۂ جغد الحق مائیم بہ درد سر
از دیدہ گلابی کن درد سر ما بنشان

کھنڈروں میں اتنے اُلّو بول رہے ہیں کہ اُنکی
چیخ پکار سے میرے سر میں درد ہونے لگا
ہے اے سیاح! اپنے آنکھوں سے آنسو بہا جو
میرے حق میں گلاب ہوگا اور وہ میرے
درد سر کو دور کر دے گا ۔

آری چہ عجب داری کاندر چمن گیتی
جغد است پی بلبل نوحہ است پی الحان

بھائی! تعجب کا کیا مقام ہے، اس لیے
کہ دنیا کے باغ میں بلبل کی دلکش آواز کے
ساتھ اُلّو کی نفرت انگیز آواز اور خوش الحانی
کے ساتھ نوحہ و فریاد کی آواز بھی ہے ۔

ما بارگہ دادیم این رفت ستم بر ما
بر قصر ستمکاران گوئی چہ رسد خذلان

ہم تو حق و انصاف کی بارگاہ تھے، ہم پر یہ ستم، تو ظالموں کے محلوں پر نہ جانے کیا کیا تباہی آئے گی۔

گوئی کہ نگون کردست ایوان فلک وش را
حکم فلک گردان، یا حکم فلک گردان

گویا پھرنے والے آسمان کے حکم و تاثیر سے مدائن کے فلک بوس محل گر چکے ہیں، اگر ممکن ہو تو آسمان کے حکم کو پھیر دے۔

بر دیدۂ من خندی کاینجا چہ می گرید
گریند بر آن دیدہ کاینجا نشود گریان

تو میرے رونے پر ہنس رہا ہے کہ تیری آنکھ کیوں گریہ و زاری میں مصروف ہے، دراصل یہ اس آنکھ پر رو رہی ہیں جو ایسی دردناک کہانی سے متاثر نہ ہوں اور نہ روئیں۔

این ہست ہمان ایوان کز نقش رخ مردم
خاک در او بودی دیوار نگارستان

یہ وہی محل ہے کہ جس پر آدمیوں کے چہروں کی تصویر سے وہ نگارستان — PICTURE GALLERY — کی دیوار معلوم ہوتا تھا۔

این ہست ہمان درگہ کو را ز شہان بودی
دیلم ملک بابل ہندو شہ ترکستان

یہ وہی دروازہ ہے جہاں ملک بابل دیلم (دیلم) تھا اور شاہ ترکستان کی حیثیت غلام کی تھی۔

این ہست ہمان صفہ کز ہیبت او بردی
بر شیر فلک حملہ شیر تن شادروان

یہ وہی ایوان ہے جس کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ سراپردے پر شیروں کی تصویر شیر فلک پر حملہ کر رہی تھی۔

پندار ہمان عہد است از دیدۂ فکرت بین در سلسلۂ درگہ در کوکبۂ میدان	اگر درگاہ کے تسلسل اور میدان میں نشانِ شہنشہی کو غور و فکر کی آنکھ سے دیکھے گا تو تو سمجھے گا کہ گویا وہی (زمانہ نظروں کے سامنے) ہے۔
از اسپ پیادہ شو بر نطع زمیں نہ رخ زیر پی پیلش بین شہ مات شدہ نعمان[1]	تو گھوڑے سے اتر اور فرش زمین پر اپنا سر رکھ تو تو دیکھے گا کہ نعمان جیسا بادشاہ ہاتھی کے پیر کے نیچے کچلا ہوا ہے گویا شطرنج کے کھیل میں مات کھا گیا ہے۔
ای بس شہ پیل افگن کافگند بہ شہ پیلی شطرنجی تقدیرش در ماتگہ حرمان	کتنے شہ زور اور ہاتھی افگن بادشاہوں کو تقدیر کے شطرنج باز نے بدنصیبی کی مات گاہ میں شکست دے دی۔
مست است زمین زیرا خوردہ ست بجای می در کاس سر ہرمز[2] خون دل نوشروان[3]	زمین مست ہے اس لیے کہ شراب کی جگہ اس نے ہرمز کے سر کے پیالے میں نوشرواں کے دل کا خون پیا ہے۔

---

[1] نعمان بن منذر حیرہ کے مشہور فرمانرواؤں میں تھا۔ ۵۹۲ میں نوشیروان کے حکم سے بادشاہ مقرر ہوا۔ ۲۲ سال حکمرانی کی خسرو پرویز کے زمانہ میں مورد عتاب ہوا، اور اسی بادشاہ کے حکم سے ہاتھی کے پیر کے نیچے کچلوا دیا گیا۔ بقول معین خاقانی کے مندرجۂ بالا شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ دیکھئے فرہنگ معین ج ۶، ص ۲۱۳۶ [2] ہرمز نام کے پانچ بادشاہ ساسانی دور میں گذرے ہیں ان میں سے یعنی چوتھا نوشیروان کا بیٹا تھا۔ ۵۷۹ میں تخت نشین ہوا (بقیہ حاشیہ ص ۲۵۰ پر)

بس پند کہ بود آنکہ در تاج سرش پیدا صد پند نو است اکنون در مغز سرش پنہاں	اس کے تاج سر میں جو شہنشہی کی نشانی اس وقت تھی ایسی کتنی واضح نصیحتیں موجود تھیں اور اب (بعد مرگ) اس کے سر کے اندر سینکڑوں نئی نصیحتیں پنہاں ہیں جو غور کرنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔
کسریٰ و ترنج زر، پرویز و تره زرین بر باد شده یکسر با خاک شده یکساں	نہ کسریٰ کا ترنج زر باقی ہے اور نہ خسرو پرویز کی سونے کی تره باقی رہ گئی، دونوں کل کی کل برباد ہو چکی ہیں اور زمین کا پیوند ہو گئی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۹) ۵۹۰ میں ایک سردار کے بدست مقید ہوا اور اندھا کر دیا گیا۔ پانچواں ہرمز خسرو پرویز کا بیٹا تھا ۶۳۱ء میں خود اس کے ایک محافظ نے قتل کر دیا (دیکھئے فرہنگ معین ج ۶، ص ۲۲۱۳) ۔ ساسانی خاندان کا ۲۱واں بادشاہ جس نے ۵۳۱ - ۵۷۸ء تک حکومت کی، اس نے فرمانروائے روم کو شکست دی اور حکومت کی بنیاد عدل پر قائم کی، نوشیروان عادل کی حیثیت سے اس کی شہرت عالمگیر ہے۔ حضرت سرور عالمؐ اسی بادشاہ کے زمانے میں مبعوث ہوئے، خاقانی کہتا ہے: پرویز بدی کہ در بلادش ـ صد نعمان مرزبان بینم [illegible] کسریٰ معرب خسرو۔ خسرو نام کے تین فرمانروا ساسانی خاندان (۲۲۴ - ۶۵۲) میں گزرے ہیں، ان میں خسرو اول انوشیرواں اور خسرو دوم خسرو پرویز ہے۔ خسرو پرویز نے ۵۹۱ تا ۶۲۸ء حکومت کی، نوشیرواں کے بعد ساسانی خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ تھا، اس نے بہت سی جنگوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی، اس نے اپنی فتوحات کے ذریعے بہت سے (بقیہ حاشیہ ص ۲۵۱ پر)

پرویز بهر بومی زرین تره آوردی
کردی ز بساط زر زرین تره را بستان
پرویز کنون گم شد زان گم شده کمتر گوی
زرین تره کو برخوان، روکم ترکوا برخوان

خسرو پرویز جہاں جاتا زرین ترہ لے جاتا
اور بساط زر سے زرین ترہ کو بوستان بنا دیتا
اب پرویز ختم ہوگیا اور گم شدہ کا ذکر بیکار
ہے، زرین ترہ کہاں ہے؟ اس کو حاصل کرنے
کے لیے پکارو تو جاؤ اور قرآن کی آیات پڑھو

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۰) ذخائر حاصل کیے، وہ اپنے حرم سرا کے تجملات کے لیے شہرت رکھتا ہے، اقبال نے اس کو شہنشاہیت کا نشان قرار دیا ہے۔ خاقانی کے شعر میں کسریٰ کو پرویز سے الگ کیا، کسریٰ کو صاحب ترنج زر اور پرویز کو صاحب ترہ زرین بتایا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، خسرو پرویز ہی صاحب زر دست افشار یا مشت افشار ہے۔ زر دست افشار کے لیے نظامی کا شعر ملاحظہ ہو:

ملک را دز زر دست افشار در مشت   کز افشردن بروں می شد ز انگشت (گنجینۂ گنجوی ۸۷)

زر مشت افشار کا ذکر بیرونی کے الجماہر ص ۲۳۴ میں آیا ہے اور مجمل التواریخ والقصص میں یہ جملہ ہے۔ [و خسرو پرویز را] بود زر مشت افشار کہ بر آن مہر نہادی و بر سان موم بود۔ کرستنسن، قطعہ زری بوزن ۲۰۰ مثقال (مشت افشار) بود کہ چون موم نرم بود و میتوانست آنرا باشکال مختلف در آوردند۔ زر مشت افشار بودی بوسہ اورا بہا سلت آورد و سراپہ زر مشت افشار شد۔ ترنج زر اور طلائی دست افشار کا ذکر غالب کے ان دو اشعار میں دیکھیے:

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس   رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر اک بار   پھینک دیتا طلائی دست افشار

دیوان مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ ص ۱۹۸۔

اور وہ لوگ (فرعون کا لشکر) ڈبو دیے
جاویں گے اور کتنے ہی باغ اور نہریں اور
کھیتیاں، عمدہ مکانات اور آرام کے سامان
جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے اور ہم
نے دوسری قوم کو ان کا وارث بنا دیا،
نہ تو ان پر آسمان و زمین کو رونا آیا اور نہ
انکو مہلت دی گئی۔ سورہ دخان (۲۵-۲۹)

گفتی کہ کجا رفتند آن تاجوران اینک
زیشان شکم خاک است آبستن جاویدان

تو نے پوچھا کہ بڑے نامور بادشاہ کہاں چلے
گئے، ان کو زمین کھا گئی اور ہمیشہ کے لیے
وہ ان کے پیٹ میں سما گئے۔

بس دیر ہمی زاید آبستن خاک آری
دشوار بود زادن نطفہ ستدن آسان

زمین تاجوروں سے حاملہ ہے، بچہ پیدا ہونے
میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے، لیکن نطفہ
آسانی سے ماں کے پیٹ میں پڑ جاتا ہے۔

خون دل شیریں[1] است آں می کہ دہد رزبن
ز آب و گل پرویز است آن خم کہ نہد دہقان

انگورستان سے جو شراب نکلتی ہے وہ
دراصل شیریں کے دل کا خون ہے اور

---

[1] شیریں خسرو پرویز کی محبوبہ اور بیوی تھی جس پر فرہاد عاشق ہو گیا تھا۔ یہ افسانہ
فارسی کی متعدد مثنویوں کا موضوع ہے، ان میں نظامی کی خسرو شیریں اور امیر خسرو
دہلوی کی شیریں و خسرو سب سے زیادہ مشہور ہوئیں۔ مثنویوں کے علاوہ فارسی
مشہور تلمیح ہے۔

وہاں وہ شراب کی خم تیار کرتا ہے دراصل وہ پرویز کی آب و گل سے بنتا ہے۔

چندین تن جباران کاین خاک فرو خوردست
این گرسنہ چشم آخر ہم سیر نشد زیشان

نہ جانے کتنے بڑے بڑے جابر لوگ یہ زمین کھا گئی ہے، لیکن اس کو بھوک کا ایسا ہوکا ہے جو اتنے لوگوں کے کھا جانے کے بعد بھی اس کا پیٹ نہ بھرا۔

از خون دل طفلان سرخاب رخ آمیزد
این زال سپید ابرو وین مام سیہ پستان

یہ سپید ابرو بڑھیا، وہ بڑھیا جس کی پستان ہے نہ جانے کتنے بچوں کی حاملہ ہونے سے سیاہ ہو چکی ہے، بچوں کے دل کے خون سے اپنے چہرہ کے لیے گلگونہ بناتی ہے۔

خاقانی ازین درگہ دریوزۂ عبرت کن
تا از در تو زین پس دریوزہ کند خاقان

اے خاقانی! تو ایوان مدائن کی عبرتناک حالت سے عبرت حاصل کر تاکہ تیرے اس بیان سے خاقان کو عبرت حاصل ہو۔

امروز گر از سلطان رندی طلبد توشہ
فردا ز در رندی توشہ طلبد سلطان

اگر آج کوئی رند سلطان سے توشے کا طلبگار ہے تو کل سلطان رند سے توشہ پائے گا۔

گر زاد رہ مکہ توشہ است بہر شہری
تو زاد مدائن بر تحفہ ز پی شروان

اگر مکہ کی زاد راہ ہر شہر کے لیے تحفہ ہے تو مدائن کا سازو سامان (یعنی یہ مرثیہ) اہل شروان کے لیے مناسب ہدیہ ہوگا۔

ہر کس برد از مکہ سبحہ ز گل حمزہ

ہر حاجی مکہ سے حمزہ کی قبر کی مٹی کی

پس توز مدائن بہ۔ تسبیح گل سلمان

تسبیح لاتا ہے تو تو اے خاقانی! مدائن سے سلمان پارسی کی قبر کی مٹی کی تسبیح (اہل شروان) کے لیے لے جا۔

این بحر بصیرت بین بی شربت از و مگذر
کز شط چنین بحری لب تشنہ شدن نتوان

اس بصیرت دیکھنے والے دریا سے بغیر اس کا پانی پیئے چلے جانا مناسب نہیں، کیونکہ اس بحر کے شط سے لب تشنہ نہیں جانا چاہیے۔

خوان کہ ز راہ آیند آرند رہ آوردی
این قطعہ رہ آورد است از بہر دل اخوان

جب کوئی دوست سفر سے آتا ہے تو تحفہ لاتا ہے میرا یہ قطعہ تحفہ ہے، دوستوں کے دلوں کے لیے۔

بنگر کہ درین قطعہ چہ سحر ہمی راند
مفتون مسیح دل دیوانہ عاشق جان

غور کرنے کا ہے کہ اس قطعے میں شاعر نے کیسی سحر طرازی کی ہے، یہ قصیدہ مسیح دل پر مفتون اور عاشق جان کا دیوانہ ہے۔

(مصرعۂ ثانی مشکوک سا ہے)

ایران پر جب بھی مصیبت پڑی، خواہ یہ مصیبت بیرونی حملہ آوروں کے ظلم و ستم کے نتیجہ کے طور پر آئی یا اندرونی خلفشار کی بنا پر، ملک جب مصائب سے دوچار ہوا تو ادیبوں، شاعروں کا قلم تیز تر ہو گیا اور انھوں نے ظلم و ستم کے خلاف موثر انداز میں آواز بلند کی، انوری اور خاقانی کے قصائد جن کو اوپر نقل کیا جا چکا ہے اسی خیال کے موید ہیں۔ اواخر چھٹی صدی ہجری میں عراق پر سلجوقی حکمرانوں کا تسلط ختم

ہوا، خوارزمشاہ کے حملے کے نتیجے میں آخری سلجوقی بادشاہ طغرل بن ارسلان کا اقتدار جاتا رہا اور ۵۹۰ھ میں اس کو قتل کر دیا گیا، اس کے بعد عراق پر خوارزمیوں کا قبضہ ہوگیا لیکن نظم و نسق نہایت ابتر ہوگیا، سارا خطہ اتنی بدامنی کا شکار رہا کہ لوگوں کے لیے پناہ کی جگہ نہیں ملتی تھی، معاصر مورخ راوندی نے دردناک انداز میں وہاں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے، وہ لکھتا ہے کہ ظالم اور بد دینوں کا غلبہ ہوا، وہ مسلمانوں اور ائمہ دین پر طرح طرح سے ظلم کرتے، انکا بے وجہ خون بہاتے اور زبردستی مال چھینتے، کوڑے مار مار کر مسلمانوں سے روپیہ وصول کرتے، شراب خانے اور قحبہ خانے کھل گئے شراب خواری اور دوسرے مناہی پر کسی قسم کی پابندی نہ رہی، علماء پر اتنی سختی ہوئی کہ کسی کو کچھ کہنے کی مجال نہ تھی اور ۵۹۸ھ میں پورے عراق میں علمی کتابیں، احادیث کے مجموعے، قرآن مجید کے نسخے ترازو میں تول کر فروخت ہوتے، نوبت یہاں تک پہونچی کہ ایک من وزن کی کتابیں "نیم دانگ" میں بکتیں، مساجد اور مدارس بھی ظلم سے محفوظ نہ رہے،

اس کے بعد لکھتا ہے کہ:

"وجمال الدین محمد بن عبد الرزاق اصفہانی نے زمانہ اور اہل زمانہ کے حالات پر مشتمل ایک عمدہ قصیدہ لکھا ہے۔"

یہ قصیدہ گویا قومی مرثیہ ہے، اس کے منتخب اشعار مع ان کے ترجمے کے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:۔

الحذار ای غافلان زین وحشت آباد الحذار
الفرار ای عاقلان زین دیو مردم الفرار

اے غافلو اس وحشت آباد دنیا سے پرہیز کرو (بچو)، اے عقلمندو، دنیا کے دیووں (ظالموں) سے بھاگو۔

ای عجب دلتان بنگرفت و نشد جانتان ملول
زین ہواہای عفن و زین آبہای ناگوار

اس بدبودار ہوا اور گندے پانی سے تمہارا دل پریشان نہ ہوا اور تمہاری جان ملول نہ ہوئی، بڑی حیرت کی بات ہے۔

مرگ در وی حاکم و آفات در وی بادشاہ
ظلم در وی قہرمان و فتنہ در وی پیشکار

موت یہاں حاکم ہے اور مصائب حکمران کی حیثیت رکھتے ہیں ظلم قہرمان ہے اور فتنہ و فساد پیشکار کا کام کرتے ہیں۔

سر در و ظرف صداع و دل در و قطع بلا
گل در و اصل زکام و مُل در و تخم خمار

اس دنیا میں آدمی کا سر درد سر کے لیے اور اس کا دل بلا کی جگہ ہے، یہاں کے پھول زکام کے سبب اور یہاں کی شراب خمار کی بنیاد ہے۔

ماہ را ننگ محاق و مہر را نقص کسوف
خاک را عیب زلازل چرخ را رنج دوار

چاند سیاہی کے ننگ سے دوچار اور سورج گرہن کے نقص کا حامل ہوتا ہے، زمین زلزلے کے رنج پر ہے اور آسمان گردش کی مصیبت میں مبتلا ہے (غرض دنیا کی کوئی چیز نقص سے خالی نہیں)

مہر را خفاش دشمن شمع را پروانہ خصم
جہل را در دست تیغ و عقل را در پای خار

سورج کا دشمن الّو اور شمع کا مخالف پروانہ، جہل کے ہاتھ میں تلوار اور عقل کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا ہے۔

باز را با این ہنر با دیدہ ہا بر دوختہ

دنیا کا عجیب و غریب دستور ہے کہ باز کی

کرگس حس طبع را بین از تنعم دیدہ خوار

آنکھیں باوجود اس کے ہنر دل کے اصل دی گئی ہیں اور کمینہ طبع گدھ کی آنکھیں نعمت سے خوار ہو رہی ہیں۔

شیر را از مور صد زخم ایست انصاف جہان
پیل را از پشہ صد رنج اینست عدل روزگار

کیا دنیا کا تیرا انصاف یہی ہے کہ چیونٹی شیر کو زخم پہنچائے، کیا زمانے کے عدل کا یہی تقاضا ہے کہ ہاتھی کو مچھر بری طرح ستائے۔

چند سختی با برادر ای برادر نرم شو
تا کی آزار مسلمان ای مسلمان شرم دار

بھائی کے ساتھ ایسی سختی، اے بھائی! سخت گیری چھوڑ دے، نرمی اختیار کر، تو اپنے کو مسلمان کہتا ہے، تجھے شرم نہیں آتی کہ تیرے ہاتھوں مسلمان کتنے مصائب کے شکار ہیں۔

قوت پشہ نداری جنگ با پیلان مکن
ہم دل موری نہ ای پیشانی شیران مخار

تجھ میں مچھر کی بھی قوت نہیں، ہاتھیوں سے ٹکر لینے کے خیال سے باز آ جا، چیونٹی کی برابری نہیں کر سکتے، شیر سے بھڑنے کا ارادہ ترک کر دے۔

روبہا گشتست بلعباس و دل ابولہب
زانکہ سر با ذوالخمار است و زبان ذوالفقار

تیری صورت تو عالم دین کی سی ہے لیکن تیرا دل ظلم اور کینے سے آگ کی طرح دہک رہا ہے، تیرے سر میں بغاوت کی آگ بھری ہے اور تیری زبان ذوالفقار کی طرح تیز ہے۔

ظلم صورت می بندد در قیامت گر نہ من

قیامت میں ظلم کی صورت نہ ہو گی ورنہ

گفتمی اینک قیامت نقد و دوزخ آشکار

میں یہ کہتا کہ یہی قیامت ہے اور اسی کا نام دوزخ ہے۔

آخر اندر عہد تو این قاعدت شد مستمر
در مساجد زخم چوب و در مدارس گیر و دار

بالآخر تیرے عہد میں یہ قاعدہ مستقل طور پر جاری ہے کہ مساجد میں لوگوں کے کوڑے لگوائے جائیں اور مدارس میں طلبا اور اساتذہ کی گیر و دار جاری رکھی جائے۔

دین چو رای تو ضعیف و ظلم چون دستت قوی
امن چون نانت عزیز و عدل چون عرض تو خوار

جس طرح تیری رائے ضعیف ہے اسی طرح دین ضعیف ہو چکا ہے اور اس دور میں روٹی ایسی ہی کمیاب ہے جیسا امن، انصاف بھی ایسا ہی ذلیل و خوار ہو رہا ہے جیسا کہ تیری عزت خوار ہے۔

جہد آن کن تا درین دہ روزہ عمر از بہر نام
صد ہزاران لعنت از تو باز کاند یادگار

کوشش کر کہ اس چند روزہ زندگی میں نام کے لیے ایسا نہ کر کہ ہزاروں لعنتیں تجھ پر باقی رہ جائیں۔

دین بدنیا می فروشی نیست بس سودی درین
باش تا تو در قیامت باز گیری این شمار

تو دین کو دنیا کے لیے بیچ رہا ہے لیکن یہ نفع کا سودا نہیں، ذرا انتظار کر، قیامت کے روز تیرے کیے کا بدلہ ملے گا۔

شیخ ابو یحییٰ چگونہ واماندت زد ہمچو زر
خواجہ مالک چو شمع واند سوخت چون عود قمار

ملک الموت سونے کی طرح کیونکر کوٹے گا (سختی موت کی طرف اشارہ ہے) اور مالک

جو دار و غۂ دوزخ ہے کو عود قماری کی طرح
کیونکر جلائے گا (جہنم کی آگ کی طرف اشارہ ہے)

وجہ مخفوری تو بہ بوریای مسجد است
وز مسلمانی خویش آنگہ نگردی شرمسار

تم مسلمان ہو، مسجد کی بوریا (فرش) بیچ کر
اپنے گھر کے لیے قالین خریدتے ہو اور اپنے
اس اسلام پر تم کو خجالت نہیں ہوتی، بڑی
شرم کی بات ہے۔

اطلس و معلم خری از ریسمان بیوہ زن
وانگہی ناید ترا از خواجگی خویش عار

بیوہ زن جو رسی بٹ کر گزر بسر کرتی تھی،
اس کو چھین کر اپنے لیے ریشم کے کپڑے خریدتے
ہو، یہ خواجگی و سرداری قابل نفرین ہے۔

گر بدیبا ہای رنگیں آدمی گردد کسی
پس درا طلس جست گرگ و در عتابی سوسمار

اگر دیبا پہننے سے آدمی آدمی ہو جاتا، تو پھر
اطلس کے لباس میں گرگ اور گوہ عتابی
کی پوست میں گوہ نہ رہتی۔

باش تا چون باز دارد صدمت یک نفخ صور
ہم زمین را از قرار و ہم فلک را از مدار

وہ دن دور نہیں جب صور کی ایک پھونک
سے زمین میں بھونچال آئے گا اور آسمان اپنی
جگہ سے ہٹ کر پھرنے لگے گا۔

خویشتن در صورت سگ باد آئی آن زمان
کز سر تو برکشد مرگ این لباس مستعار
شد دراز این ترہات ای خواجگو تہ باز کن
کز سخن آن بہ کہ باشد در لباس اختصار

جب موت یہ لباس مستعار چھین لے گی
تو اس وقت تو کتے کی صورت میں نمودار ہوگا۔
اے حضرت! بکواس بہت زیادہ ہوگئی اب
ختم کرو بات وہی بہتر ہے جو مختصر ہو۔

ای خدا پیوستہ دار امداد لطفت و کرم — اے خدا! اپنے لطف و کرم سے ہمیشہ
تازہ دار ارواح ما را ہمچو گل در نو بہار — ہماری روح کو اسی طرح تازہ رکھ جس طرح
بہار میں پھول ہوتا ہے۔

اس کے بعد راوندی اضافہ کرتا ہے۔ شاعر ایلدگزیوں کے دور میں ہمدان میں تھا اور عراق کی حالت تو یہ ہے کہ عراق میں کوئی مسجد نہیں جس کی چٹائیاں ظالموں نے بیچ کر گھر کے لیے اعلیٰ درجے کا فرش نہ تیار کیا ہو اور کوئی بیوہ ایسی نہیں ہے کہ جس کی روئی چھین کر ریشمی کپڑے نہ مہیا کر لیے ہوں، ظلم و ستم کے مارے لوگ آوارہ پھر رہے ہیں اور ہزاروں قحط کی وجہ سے لقمۂ اجل ہو چکے ہیں۔" معارف عراق در آفاق آوارہ اند و اہل اسواق بجو در ماندہ و بیچارہ اند و چون حال بدین رسید و کار بدین انجامید بر جہانیان واجب است کہ بہ تضرع و ابتہال از ملک خدا الجلال درخواہند تا از آنجا کہ لطف اوست احیای دولت آل سلجوق بکند و بیخ ظلم از جہان برکند" راحۃ الصدور ۳۸۔

اب ہم سعدی کے مرثیۂ بغداد کا ذکر کریں گے۔ سعدی فارسی کے مشہور و مقبول شاعر (وفات ۶۹۲ھ) ہیں۔ خاقانی سے تقریباً ایک صدی بعد گزرے ہیں انھوں نے منگول وحشیوں کا دور دیکھا تھا اور ان کے ہاتھوں اہل اسلام جن مصائب سے دوچار ہوئے ان کے وہ شاہد رہے ہیں، ۶۵۶ھ میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے بغداد پر حملہ کیا، بغداد اسلام کا سب سے بڑا تہذیبی مرکز تھا اور عباسی خلافت باوجود اس کے کہ اس کی ساری عظمت ختم ہو رہی تھی لیکن اس وقت بھی ساری دنیا کے مسلمان حکمراں عباسی خلفاء کی تہنیت اور خلعت کے منتظر رہتے تھے، یہ رہی سہی اسلامی عظمت کی نشانی ہلاکو کے ہاتھوں ختم ہوئی اور خلافت[1] عباسیہ کا

(حاشیہ ص ۲۶۱ پر)

آخری حکمراں المستعصم باللہ اس وحشی منگولوں کے ہاتھوں بے دردی سے شہید ہوا، یہ امت مسلمہ کے لیے زبردست سانحہ تھا، اس اندوہناک واقعے سے سارا عالم اسلام دہل گیا۔ سعدی کی زندگی میں یہ لرزہ خیز واقعہ رونما ہوا، وہ اس سے بے حد متاثر ہوئے اور اپنے تاثرات کو ایک منظومہ کی شکل میں پیش کیا، جس کا ہر شعر دلی سوز و گداز کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ذیل میں اس مرثیے کے اشعار مع ترجمے کے درج کیے جاتے ہیں، یہ مرثیہ کافی مشہور ہے اور عام طور پر پڑھے لکھے لوگ اس سے واقف ہیں، لیکن عام قاری واقف نہ ہوگا، اس لیے اس کو یہاں پیش کیا جاتا ہے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

خلیفہ مستعصم باللہ کی خلافت کے خاتمے پر اگر آسمان خون کے آنسو زمین پر برسائے تو وہ حق بجانب ہے۔

ای محمد گر قیامت می برآری سر ز خاک
سر برآور وین قیامت درمیان خلق بین

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ قیامت کو اٹھیں گے، قیامت آگئی ہے، اٹھیے

(حاشیہ ص ۲۶۰) ۱؎ خلافت عباسی کی بنیاد ۱۳۲ھ میں ابو العباس [illegible] کے ہاتھوں پڑی اور ۵۲۴ سال تک یہ خلافت باقی رہی، عباسی خلفاء کے دوران خلافت علوم و فنون تہذیب و تمدن کی بڑی ترقی ہوئی، [illegible] خلافت عباسیہ کے ۳۷ویں اور آخری خلیفہ (۶۴۰ - ۶۵۶ھ) ۲؎ دیکھیے کلیات سعدی ص ۶۴۴ - ۶۴۵ (جامع فروغی) ۳؎ غالب کا یہ شعر کیسی مناسبت رکھتا ہے:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

اور خلق کے درمیان قیامت ملاحظہ کریں۔

نازنینان حرم را خون خلق بے دریغ
ز آستان بگذشت و ما را خون چشم از آستین

حرم کے نازنین کا جو خون بے دریغ بہایا گیا وہ آستان سے آگے بڑھ گیا ہے اور ہماری آنکھوں سے موج خوں ابل رہا ہے۔

زینہار از دور گیتی انقلاب روزگار
در خیال کس نیامد کانچنان گردد چنین

دور گیتی اور انقلاب روزگار سے پناہ مانگتا ہوں کسی کے خواب و خیال میں نہیں آسکتا تھا کہ ایسی بلندی اتنی پستی میں بدل جائے گی۔

دیدہ بردار ای کہ دیدی شوکت باب الحرام
قیصران روم سر بر خاک و خاقانان جبین

اے حضرت رسول ذرا آنکھ کھول کر آپ دیکھیں تو آپ نے تو باب الحرام کی عظمت و شوکت دیکھی تھی جہاں قیصر روم اور خاقان چین بڑی خاکساری سے بیٹھا کرتے تھے۔

خون فرزندان عم مصطفیٰ شد ریختہ
ہم بر آن خاکی کہ سلطانان نہادندی جبین

حضرت محمد مصطفیٰ کے بیٹوں کا خون اسی خاک پہ بہایا گیا، جہاں بڑے بڑے بادشاہ سجدہ کیا کرتے تھے۔

وہ کہ گر بر خون آن پاکان فرود آید مگس
تا قیامت در دہانش تلخ گردد انگبین

سمجھ لو اگر ان پاک شہیدوں کے خون پہ مکھی بیٹھ تو پھر اس کا اثر یہ ہوگا کہ قیامت تک مکھی کا منہ کا مزا تلخ ہی رہے گا۔

بعد ازین آسایش از دنیا نباید چشم داشت
قیر در انگشتری ماند چو بر خیزد نگین

اس کے بعد اب دنیا میں آسایش کا تصور بے معنی ہے عام بات یہ ہے کہ جب انگوٹھی کا

نگینہ گر جاتا ہے تو انگوٹھی میں صرف تیر ہی باقی رہ جاتا ہے۔

دجلہ خونابست ازیں پس گر نہد سوی نشیب
خاک نخلستان بطحا را کند در خون عجین

دجلہ خون آلود ہے، اگر نیچے کی طرف یہ دریا بہا تو بخوبی ممکن ہے کہ مدینے کا نخلستان خون میں ڈوب جائے۔

روی دریا درہم آمد زین حدیث ہولناک
می توان دانست بر رویش ز موج افتاد چین

اس ہولناک واقعہ سے دریا بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اس کا چہرہ چیں بجبیں ہے، موجیں اس کی نشانی ہیں۔

گریہ بیہودست، و بیحاصل بو شستن بآب
آدمی را حسرت از دل اسپ را داغ از سرین

رونا بیکار ہے، سب کو معلوم ہے آدمی کے دل رنج و الم کا اور گھوڑے کے داغ کا مٹنا بے حاصل ہے۔

نوحہ لایق نیست بر خاک شہیدان زانکہ ہست
کمترین دولت ایشان را بہشت برترین

شہیدوں پر رنج و غم کرنے کا موقع نہیں، وہ عزت اور دولت والے ہیں، انکی کمترین دولت بہشت بریں ہے۔

لیکن از روی مسلمانی و کوی مرحمت
مہربان را دل بسوزد بر فراق نازنین

لیکن دوست کا دل دوست کی جدائی میں کڑھتا ہے، یہ مسلمانی اور مرحمت کا تقاضا ہے۔

باش تا فردا کہ بینی روز داد و رستخیز
وز لحد با زخم خون آلودہ برخیزد دفین

کل جب قیامت کا دن، انصاف کا دن ہوگا، تو قبر سے مردے خون آلود زخم کے ساتھ نکلیں گے۔

بر زمین خاک قدمشان توتیای چشم بود
روز محشر خون نشان گلگونہ حوران عین

دنیا میں ان کے قدم کی خاک آنکھوں کیلئے توتیا کا کام دیتی ہے قیامت کے دن ان کا خون حوروں کے لیے گلگونہ ہوگا۔

قالب مجروح اگر در خاک و خون غلطد چہ باک
روح پاک اندر جوار لطف رب العالمین

اگر مجروح دل خاک و خون میں لتھڑا ہوا ہو تو کوئی فکر کی بات نہیں، روح پاک تو رب العالمین کی مرحمت کے جوار میں ہے۔

تکیہ بر دنیا نشاید کرد و دل بر وی نہاد
کاسمان گاہی بہ مہر است ای برادر گہ بکین

دل پر بھروسہ کرنا چاہیے اور نہ اس سے دل لگانا چاہیے، اس لیے کہ اے بھائی آسمان کبھی مہربان ہے تو کبھی کینہ پرور۔

چرخ گردان بر زمین گوئی دو سنگ آسیاست
در میان ہر دو روز و شب دل مردم طحین

یہ گردش کرنے والا آسمان زمین پر چکی کے دو پاٹ کی طرح ہے، ان دونوں کے درمیان آدمی کا دل دن رات پسا جاتا ہے۔

زور بازوی شجاعت بر نتابد با اجل
چون قضا آمد نماند قوت رای دلیر

بہادری کے زور بازو سے اجل کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، جب موت آجاتی ہے تو آدمی کی ہمت ساری بیکار ہو جاتی ہے۔

تیغ ہندی بر نیاید روز پیکار از نیام
شیر مردی را کہ باشد مرگ پنہان در کمین

اس شیر مرد کی تیغ ہندی لڑائی کے موقع پر نیام سے نکلتی ہی نہیں جس کی موت گھات میں چھپی ہوتی ہے۔

تجربت بی فایدہ است آنجا کہ برگردید بخت

جب قسمت پھر جاتی ہے تو تجربے سے کوئی

حملہ آورد دین چہ سود آنرا کہ در گردید زین — فایدہ نہیں، جس کی زین ہی پلٹ گئی ہو تو اسکا حملہ کرنا بیکار ہوتا ہے۔

گر کسا نند از پی مردار دنیا جنگجوی
ای برادر گر خرد مندی چو سیمرغان نشین

بہت سے لوگ اس مردار دنیا کے لیے لڑائی میں مشغول ہیں اسے بھائی، اگر تو عقلمند ہے تو سیمرغ کی طرح دنیا سے الگ تنہائی میں زندگی گزار

ملک دنیا را چہ قیمت، حاجت انیست از خدای
کو نگہ دارد بما بر ملک ایمان و یقین

دنیاوی دولت کی کوئی قیمت نہیں، خدا سے یہ دعا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ ایمان و یقین کی حکومت پر قائم رکھے۔

بغداد کا مرکز ہلاکو کے ہاتھوں ۱۲۵۸ میں اجڑ گیا، لیکن ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ یہ وحشی دین بیبی کی دولت سے مالا مال ہوئے، ہلاکو کی وفات ۱۲۶۴ء میں ہوئی، اس کے ۱۷ برس بعد اس کا بیٹا تکودار تخت نشین ہوا، اس نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام کی تبلیغ کی طرف متوجہ ہوا، کچھ ہی دن بعد وہ قتل کر دیا گیا، اس کے ۱۳ سال بعد غازان خان ایلخانی تخت پر بیٹھا، وہ زبردست مبلغ اسلام تھا، اس نے اسلام کی تبلیغ میں بڑا کام کیا۔ اس کا ایک خط جو حضرت بہاء الدین ملتانی کے پوتے کے نام ہے اور جس کو راقم الحروف نے اورینٹل کالج میگزین اسید [illegible] میں شائع کیا [illegible] اسلام کے سلسلہ میں [illegible] کے طاقتور کارکنان [illegible]

[illegible] (۱۲۹۱ء) [illegible]

[illegible] ۱۳۳۶ء ایلخانی تخت پر بیٹھے اور اسلام کی اشاعت کرتے رہے اقبال نے خوب کہا ہے:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اسفرائن کے دو شافعی فقیہ

امام ابو اسحاق اسفرائینی و امام ابو حامد اسفرائینی

از عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دار المصنفین

خراسان کی بستی اسفرائن[1] کی خاک سے ایسی متعدد ہستیاں اٹھیں جن کی وجہ سے اسفرائن کا نام اسلام کی علمی تاریخ میں زندۂ جاوید ہو گیا، ان میں امام ابو اسحاق اسفرائینی اور امام ابو حامد اسفرائینی خاص طور پر اس لیے قابل ذکر ہیں کہ ان کے بغیر فقہائے شافعیہ

---

[1] اسفرائن کے متعلق معجم البلدان میں لکھا ہے کہ یہ نیشاپور سے جرجان کے راستہ میں ٹھیک نصف فاصلہ پر ہے، امام سمعانی نے لکھا کہ یہ چھوٹا سا شہر ہر دور میں بڑا مردم خیز رہا ہے، یاقوت حموی کے الفاظ میں چھوٹا ہونے کے باوجود مضبوط و مستحکم شہر ہے، نام کے سلسلے میں ایک روایت یہ ہے کہ یہاں کے باشندے اپنے ساتھ ایک سپر رکھتے تھے اسی لیے اس بستی کو "سپر آیین" کہا گیا، لیکن اس کا مشہور قدیم نام مہرجان ہے، کسی بادشاہ نے یہاں کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر یہ نام رکھا تھا، ہو سکتا ہے یہ بادشاہ اسفندیار ہو جس نے اپنے نام پر بسایا تھا، کہتے ہیں کہ بعد میں بدلتے بدلتے یہ اسفرائن ہو گیا، ساتویں صدی ہجری میں اسے مغلوں نے تباہ کیا اور نویں صدی ہجری میں ازبکوں نے اسے تاراج کیا، یہاں کے باشندے عموماً فقہ شافعی پر عمل پیرا تھے، یہاں کے اور ناموروں میں ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق (م [illegible]ھ) محمد بن علی ابو علی (م [illegible]ھ) اور مشہور ماہر فلکیات (بقیہ حاشیہ ص ۲۶۷ پر)

کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں کہا جا سکتا، امام ابو اسحٰق اگر قاضی ابو الطیب طبری، امام ابو القاسم قشیری اور امام بیہقی جیسے ائمہ وقت کے استاد اور علوم فقہ و کلام میں امام زمانہ ہوئے تو امام ابو حامد کی شان اس سے ظاہر ہے کہ ان کو شافعی ثانی کہا گیا۔ ذیل میں ان دونوں نامور فقیہوں کے سوانح کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔

امام ابو اسحٰق اسفرائنی

امام صاحب کا پورا نام و نسب اس طرح ہے، ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن مہران، رکن الدین لقب اور ابو اسحٰق کنیت ہے، وطنی نسبت اسفرائنی ہے اور اسی سے وہ مشہور ہوئے۔

تعلیم و تربیت ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں، تاریخ ولادت کا بھی ذکر نہیں ملتا، مگر بعض تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق ۴۱۸ھ میں جب انکا انتقال ہوا تو عمر قریباً ۹۰ برس کی تھی[1]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۳۲۸ھ کے کچھ پہلے پیدا ہوئے، حصولِ تعلیم کے سلسلہ میں بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں، مگر نیشاپور کے قریب ہونے اور وہاں کے علماء سے اکتساب علم کی وجہ سے گمان غالب ہے کہ وہ جلد ہی نیشاپور گئے اور امام ابو بکر اسماعیلی اور ان کے معاصر علمائے حدیث و فقہ سے تعلیم حاصل کی[2]، بعد میں مزید تعلیم کے لیے عراق کا سفر کیا اور وہاں امام ابو بکر محمد بن

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۶) عصام الدین للکی (م ۱۵۳۶ء) بھی ہیں، ان کے علاوہ روایت یہ بھی ہے کہ نوشیروان عادل بھی یہیں پیدا ہوا تھا، محمود غزنوی کے مربی ابو العباس فضل بن احمد بھی اسی شہر کے فرزند تھے (روضات الجنات: ص ۷۹) [1] شذرات الذہب ج ۳، ص ۲۱۰ [2] طبقات کبریٰ، سبکی ج ۳، ص ۱۱۱۔

عبداللہ شافعی اور امام ابو محمد دعلج بن احمد سجزی اور ان کے ہم عصر بغداد اور عراق کے دوسرے فقہاء سے اکتساب فیض کیا۔ ان کے علاوہ جن اور علماء سے انھوں نے استفادہ کیا ان میں ابوبکر محمد بن یزداد، ابو جعفر محمد بن علی جرجانی اور ابو احمد محمد بن احمد غطریفی وغیرہ کے نام بھی تذکروں میں ملتے ہیں[1]۔ عراق میں انھوں نے طالب علمی کا جو وقت گزارا وہ اس درجہ کامیاب رہا کہ بقول سمعانی انھوں نے وہ سب حاصل کر لیا جو دوسرے نہ کر سکے تھے[2]۔ چنانچہ جب وطن واپس آئے تو اس وقت عراق و خراسان دونوں علاقوں کے علماء و فضلاء ان کی فضیلت اور اولیت کے معترف ہو چکے تھے[3]۔

نیشاپور میں قیام | عراق سے واپس ہوئے تو مستقل قیام کی غرض سے وطن ہی کا انتخاب کیا اور یہیں قاضی ابو الطیب طبری نے ان سے اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی، بعد میں طبری نے ایک فقیہ اور امام اسفرائینی کے خاص شاگرد کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی[4]۔ لیکن وطن میں امام اسفرائنی کے قیام کی مدت اس لیے مختصر رہی کہ اہل نیشاپور مصر تھے کہ وہ نیشاپور میں ہی قیام کریں، نیشاپور کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی خواہش کا مسلسل اظہار کرتے رہے آخر جب اصرار زیادہ ہوا تو نیشاپور تشریف لے گئے اور پھر تا دم آخر وہیں رہے۔

مدرسہ نیشاپور | ان کے سوانح میں یہ بات بڑے فخر کے ساتھ بیان کی جاتی ہے کہ نیشاپور میں ان کے لیے خاص طور سے ایک مدرسہ بنایا گیا تھا، یہ اس شان کا تھا کہ اب تک نیشاپور میں اس سے پہلے کوئی اور ایسا مدرسہ نہیں بنا تھا اسی میں انھوں نے

---

[1] طبقات الکبریٰ سبکی ج ۳ و تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۳۴ [2] انساب ج ۱ ص ۳۴ [3] ایضاً [4] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۷، تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۵ و طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۵۸۔

حدیث و فقہ کا درس دیا، نیشاپور میں مسجد عقیل نامی ایک مسجد تھی اس میں بھی ان کی ایک خاص مجلس صرف حدیث کے املا کے لیے منعقد ہوتی،[1] اس میں سب سے پہلے انھوں نے محرم ۴۱۱ھ میں حدیث کا املا کرایا، تذکروں میں اس حدیث کا بھی ذکر ہے جس سے انھوں نے اپنا درس املا شروع کیا تھا، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت علی اثر ثمانیۃ آلاف نبی منھم اربعۃ آلاف من بنی اسرائیل[2]۔

تلامذہ اور رواۃ: ان کے شاگردوں میں ان کے سوانح نگاروں کے مطابق خراسان اور خاص طور پر نیشاپور کے بے شمار لوگ ہیں، مگر خود ان کے لیے باعث فخر و نازش شاگردوں میں امام بیہقی، امام ابوالقاسم قشیری اور قاضی ابوالطیب طبری جیسے محدثین و فقہاء ہیں، قاضی طبری نے علم کلام و اصول حدیث میں خاص طور پر ان سے فیض حاصل کیا، امام قشیری ان کی مجلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور امام بیہقی کے متعلق لکھا جاتا ہے کہ وہ ان کی کتابوں کے سب سے بڑے راوی ہیں[3]، ان ائمہ کے علاوہ ابوالثنا ہبۃ اللہ بن ابی الصہباء، احمد بن محمد بن ابی الحسن الخوئی کا شمار بھی ان کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا ہے۔

علوئے مرتبت: ان کے درجہ بلند کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا گیا ہے، ابن خلکان نے الاستاذ اور سمعانی نے استاذ امام کے الفاظ سے ان کو یاد کیا ہے، امام حاکم ابو عبداللہ ان کے بزرگ معاصرین میں ہیں اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں کہ ابواسحٰق فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کے ایسے عالم ہیں جنھیں دست سبقت حاصل ہے[4]۔ امام ذہبی اور قاضی

[1] انساب بحوالہ سابقہ [2] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۱۱۲، ۱۱۳ [3] تذکرۃ ج ۳ ص ۶ [4] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۵۸ و شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۰۹۔

ابن شہبہ نے ان کو شیخ اہل خراسان لکھا ہے[1] امام یافعی نے ان کی شان میں الامام الکبیر، الاستاذ الشہیر اور احد الاعلام جیسے القاب استعمال کیے ہیں[2] امام نووی نے یہ قول نقل کیا کہ استاذ ابو اسحق کا شمار ان علماء میں ہے جو درجۂ اجتہاد پر فائز تھے، علوم فقہیہ میں انکو تبحر حاصل تھا اور امامت کی تمام شرائط عربیت، فقہ، کلام، اصول اور معرفت کتاب و سنت ان میں موجود تھیں[3] خود امام نووی کا قول ہے کہ استاذ اسفرائنی کے ہم عصر دو اور علماء تھے اور ان تینوں نے حدیث و سنت کے کلامی مسائل میں مسلک اشاعرہ کو تقویت پہنچائی باقی دونوں علماء امام ابوبکر باقلانی صاحب اعجاز القرآن و اسرار الباطنیہ اور امام ابوبکر بن فورک ہیں[4]۔ صاحب ابن عباد اپنے مسلک اعتزال کی وجہ سے ان تینوں کے مخالف تھے لیکن علم و فضل کے قائل تھے، ایک موقع پر انھوں نے ان تینوں کی صفات یوں بیان کی کہ باقلانی بحر مغرق (بحر بیکراں) ابن فورک صل مطرق (ماران بے پایاں) اور اسفرائنی نار محترق (آتش سوزاں) ہیں[5]

امام سبکی نے بھی ان کو الاستاذ در علم کلام، اصول و فروع کے امام اور جامع العلوم کی حیثیت سے یاد کیا ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا کہ تمام ائمہ ان کی تعظیم و تکریم پر متفق اور ان میں امام کی جملہ شرائط پائے جانے کے معترف ہیں، یہ بھی لکھا کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے[6] ابن سبکی نے مذکورہ صفات کے ساتھ امام لغات اور متقی کا اضافہ کیا[7]

ابو عمرو بن الصلاح نے لکھا کہ استاذ ابو اسحق نے اصول فقہ میں فقہائے شافعیہ کے

---

[1] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۸۵ و شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۰۹ و العبر ج ۳ ص ۱۲۸ [2] مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۳۱ [3] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۱۶۹ [4] ایضاً [5] طبقات کبریٰ و ابن شہبہ بحوالہ سابق [6] طبقات کبریٰ [7] طبقات العبادیہ ص ۱۰۴۔

مسلک کو بڑی تقویت ہوئی لیکن چند مسائل ان فقہاء کے لیے غلط پیچیدہ اور مشکل تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے ان مسائل میں امام شافعی کی موافقت اور تائید سے پہلو تہی کی تھی، مگر استاذ ابو اسحٰق نے ان فقہاء کے اصولوں ہی کی روشنی میں ان مسائل کو حل کیا، ان میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ کیا قرآن کے حکم کو سنت کے ذریعہ منسوخ کیا جاسکتا ہے؟ ایک بحث یہ بھی تھی کہ جب ایک ہی مسئلہ پر مجتہدین میں تعدد آراء کے ساتھ تضاد آراء بھی ہو تو راہ صواب پر ایک ہی مجتہد ہوگا، بخلاف اس قول کے کہ ہر مجتہد مصیب ہے خواہ ان میں سے کوئی غلط استدلال اور قیاس باطل پر ہو اور کوئی زندیق ہو، اس قول میں جو ابہام ہے وہ مخفی نہیں لوگوں نے اس کو امام شافعی کی جانب منسوب کیا تھا، اس وجہ سے بعض پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں، امام اسفرائنی نے ثابت کیا کہ امام شافعی سے اس قول کی نسبت درست نہیں امام اسفرائنی کی شان میں امام عبدالغافر کا یہ قول بھی نقل کرنے کے لائق ہے کہ وہ صرف نیشاپور کے لیے ہی نہیں پورے مشرق کے لیے مایۂ ناز و افتخار تھے[1]

زہد و تقویٰ | علم کی دولت کے ساتھ وہ عمل کی نعمت سے بھی بہرہ یاب تھے، انکے کمالات علمی کے جلو میں انکی عبادت، ریاضت، تقویٰ اور انابت کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے، امام نووی نے لکھا کہ وہ عابد و زاہد اور تقویٰ و پرہیزگاری میں حد کمال کو پہنچے ہوئے تھے، انھوں نے ان کی صفات میں آخری بات یہ کہی کہ امام ابو اسحاق کے فضائل و کمالات کے بیان کے لیے کئی ضخیم جلدوں کی ضرورت ہے[3]

سفارت | ایک روایت کے مطابق خلیفۂ عباسی نے ان کو ملک روم کے پاس نائندہ

---

[1] تہذیب الاسماء بحوالہ سابق [2] طبقات کبریٰ و وفیات ج ۱ ص ۶ [3] تہذیب الاسماء۔

بنا کر بھیجا تھا، لیکن اس سلسلہ میں تفصیلات نہیں ملتیں، صاحب روضات الجنات نے یہ اشارہ ضرور کیا ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جائے مگر ہماری نظر سے یہ واقعہ کہیں نہیں گزرا۔

تصنیفات | ان کی تصنیفات کا ذکر بھی تذکروں میں اہمیت کے ساتھ کیا گیا ہے، قاضی ابن شہبہ نے ان کو کثیر التصانیف لکھا اور ابن خلکان اور امام یافعی نے انکی کتابوں کو جلیل القدر کہا، امام سبکی نے بھی انکی تالیفات کو اعلیٰ درجہ کی بتایا، مگر ہم ان کی چند کتابوں کے ہی ناموں سے واقف ہو سکے، ان کی سب سے اہم کتاب جس کا ذکر قریباً ہر تذکرہ نگار نے کیا ہے وہ جامع الحلی فی اصول الدین والرد علی الملحدین ہے، ابن خلکان نے اسی نام کے ساتھ اس کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ انھوں نے اس کی پانچ جلدیں دیکھی تھیں[1]، علامہ حلبی نے اس کا پورا نام جامع الجلی والخفی فی اصول الدین والرد علی الملحدین لکھا ہے[2] اس کے علاوہ اصول فقہ میں ان کے ایک رسالہ کا ذکر ملتا ہے جو دراصل امام ابن الحداد کی کتاب الفروع کی شرح اور تعلیق ہے، اس سے پہلے اس کی ایک شرح امام قفال شاشی نے لکھی تھی، بعد میں قاضی ابو الطیب طبری، امام فورانی اور امام صیدلانی نے بھی اس کی شرحیں لکھیں[3]، ایک اور کتاب کا ذکر بھی آتا ہے جس کی تخریج حاکم ابو عبد اللہ نے دس حصوں میں کی تھی[4] مگر اس کتاب کا اصل نام کسی نے نہیں لکھا۔

مناظرے | دوسرے کمالات اور علوم و فنون میں مہارت کے ساتھ ہی امام ابو اسحٰق کے

---

[1] وفیات [2] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۳۶۱ [3] ایضاً [4] شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۰۹۔

مناظروں کا ذکر بھی ملتا ہے، عموماً ان کے مناظرے معتزلہ سے ہوئے، امام سبکی نے مشہور معتزلی قاضی عبدالجبار سے ان کے ایک مناظرہ کے حال کو مختصراً نقل بھی کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنزیہہ باری تعالیٰ، مشیت، جبر، قضا جیسے مسائل پر ہی یہ مناظرے برپا ہوتے تھے۔

وفات | نیشاپور میں طویل قیام کے وجہ سے ان کو اس شہر سے خاص الفت ہوگئی تھی، ایک بار فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ آخری بار اپنی آنکھیں یہیں بند کروں، تاکہ یہاں کے باشندے میری نماز جنازہ میں شریک ہوں، ٹھیک پانچ مہینوں کے بعد انکی یہ آرزو پوری ہوئی، عاشورا کے روز ۴۱۸ھ میں وہ اپنے رسالہ سے جاملے، اس دن بارش ہو رہی تھی، ظہر کے بعد سورج نکل آیا، مقبرہ حیرہ میں امام موفق نے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر ابو بکر طوسی کے قبرستان میں تدفین ہوئی، بعد میں انکے صاحبزادے اسفرائن کے باشندوں کی بڑی جمعیت کے ساتھ آئے، ان کو اصرار تھا کہ امام صاحب کی آخری آرام گاہ اسفرائن ہی میں ہو، چنانچہ تین دن کے بعد میت کو پھر قبر سے نکالا گیا اور اسفرائن کے آبائی قبرستان میں دوبارہ تدفین ہوئی،[1] امام سمعانی متوفی ۵۶۲ھ نے ان کی قبر کی زیارت کی تھی، مشہور تھا کہ امام ابواسحٰق کی قبر کے پاس دعائیں قبول ہوتی ہیں۔[2]

وفات کے وقت عمر قریباً ۹۰ برس یا کچھ زیادہ تھی۔[3]

مسائل | امام سبکی نے ان کے بعض اقوال و مسائل نقل کیے ہیں جن کا تعلق اہلِ تحقیق

---

[1] تہذیب الاسماء، وفیات، شذرات اور انساب بحوالہ سمعانی [2] انساب بحوالہ رسالہ [3] شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۱۰۔

سے ہے۔ امام نووی نے بھی ایک دو مسئلے نقل کیے ہیں، بعض کتب فقہیہ میں کہیں کہیں ان کے چند تفردات کا ذکر ہے اور یہی ان کا معلوم علمی متروکہ ہے، ممکن ہے کہیں سے ان کے کسی مخطوطہ کی دریافت کی خبر آجائے تو انکی تحقیق و تدقیق کے بعض امور سامنے آئیں۔

امام ابو حامد اسفرائینی

شیخ العراق، صدر نشین مسند فقہائے عراق، مرکز نجابت و شرافت اور یکتائے زمانہ امام ابو حامد اسفرائینی کی شان اسی سے ظاہر ہے کہ ان کو شافعی ثانی کہا گیا۔

نام و نسب | ان کا پورا نام و نسب اس طرح ہے: احمد بن ابی طاہر محمد بن احمد، ابو حامد کنیت ہے اور اسی سے وہ مشہور ہوئے[1]، اسفرائینی نسبت وطنی ہے اور یہ انکے نام کا ایسا جزء ہوئی کہ جب مطلق اسفرائینی لکھا جاتا ہے تو امام ابو حامد اسفرائینی ہی مراد ہوتے ہیں[2]۔

ولادت اور تعلیم | وہ ۳۴۴ھ میں اسفرائن میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کی تفصیلات نہیں ملتیں، لیکن تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ انہوں نے ستر[3] برس کی عمر میں پہلا فتویٰ دیا تھا[4]، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم شروع سے وطن ہی میں ہوئی، اسفرائن بھی چونکہ اہل علم و فضل سے معمور تھا اس لیے حصول علم میں دشواریاں بھی حائل نہ ہوئی ہوں گی، مشہور محدث ابراہیم بن محمد بن عبدک کا قیام مستقلاً وہاں تھا

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات: نووی ج ۲ ص ۲۰۸ [2] روضات الجنات: محمد باقر [illegible]

طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۷۱ [illegible] ابن خلکان نے [illegible] لکھا ہے، وفیات ج ۱ ص ۳۲۔

روایتوں سے ظاہر ہے کہ ان سے امام اسفرائنی نے سماعت و روایت حدیث کی[1]

بغداد میں آمد | ابن اثیر نے لکھا کہ وہ کم عمری میں بغداد آئے[2] العبر کے الفاظ میں وہ بچپن میں بغداد آئے[3] یہی الفاظ ابن عماد کے بھی ہیں[4] سمعانی و ابن الجوزی کے بقول وہ نوجوانی میں آئے[5] اور امام سبکی کے الفاظ میں وہ جوانی میں بغداد تشریف لائے[6] اور یہی زیادہ واضح قول ہے کیونکہ خود امام اسفرائنی نے ایک موقع پر کہا کہ میں ۳۴۴ھ میں پیدا ہوا اور ۳۶۴ھ میں بغداد آیا[7] اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بیس۲۰ برس کی عمر میں بغداد آ گئے تھے۔

حصول تعلیم | ان کے خاص شاگرد امام سلیم[8] بن ایوب رازی نے ان کے حالات میں لکھا کہ انھوں نے اپنی تعلیم پر بہت توجہ دی، شروع میں معاشی حالت سقیم تھی اسلئے ایک گھر کی دربانی کی خدمت انجام دی اور اسی ملازمت کے دوران وہ اپنے شوق علم کی پاسبانی بھی کرتے رہے، راتوں کو وہ چوکیداری کرنے کے ساتھ دروازہ پر رکھے ہوئے چراغ کی روشنی میں اسباق کا مطالعہ کرتے اور پاسبانی کی اجرت سے ضروریات زندگی کو پورا کرتے، وکان یحرس فی درب وکان یطالع الدرس علی زیت الحرس[9] ویاکل من اجرۃ الحرس[10]

اساتذہ | انھوں نے فقہ کی تعلیم مشہور فقیہ امام ابوالحسن علی بن احمد ابن المرزبان

---

[1] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۶۸ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲ [3] العبر فی خبر من غبر ج ۳ ص ۹۳
[4] شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۷۸ [5] انساب ج ۱ ص ۴۴ [6] طبقات کبری ج ۳ ص ۲۵ [7] معجم البلدان ج ۱ ص ۲۲۹ المنتظم ج ۷ ص ۲۷۷ [8] صاحب روضات الجنات نے سلیمان بن ایوب لکھا جو صحیح نہیں ہے ص ۸۴ [9] طبقات کبری ج ۳ ص ۲۷ [10] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۱۱-

بغدادی سے حاصل کی لیکن یہ مدت بڑی مختصر رہی کیونکہ ۳۶۶ھ ہی میں شیخ ابن المرزبان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد انہوں نے دوسرے امام وقت ابوالقاسم عبدالعزیز بن عبداللہ دارکی (م ۳۷۵ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے اور نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کیں دلم یزل یترقی بہ الاحوال[1]۔ ان کے علاوہ انہوں نے بغداد کے اور فقہاء اور ائمہ سے بھی تعلیم حاصل کی۔ علم کی جستجو اور اس میں انہماک ان کی زندگی تھی، انہوں نے یکسو ہوکر اپنے شیوخ سے اس طرح استفادہ کیا کہ تنگی داماں کی شکایت نہ رہی، وہ خود فرماتے تھے کہ جب بھی کسی علم و نظر کی مجلس سے اٹھا تو یہ احساس نہ ہوا کہ جو کچھ مجھے یاد رکھنا چاہیے تھا وہ یاد نہ رکھ سکا[2]۔ علوم حدیث میں انہوں نے امام ابن عبدک اسفرائنی کے علاوہ امام عبداللہ بن عدی، امام ابوبکر اسماعیل جرجانی، امام ابوالحسن دارقطنی سے اکتساب فیض کیا، گو انہوں نے احادیث کی روایت کم کی ہے مگر علوم حدیث میں بھی اس درجہ کو پہنچے کہ امام اصحاب حدیث کہلائے[3]۔

جلالت شان | نامور محدثین و فقہاء سے استفادہ کے بعد وہ علم و فضل کے اس مقام بلند پر فائز ہوئے کہ ان کو یکتائے روزگار کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا حتی صار اوحد وقتہ[4] وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز اور سب کا مرجع و ماوی بن گئے[5]۔ شیخ ابواسحٰق شیرازی نے لکھا کہ مکتب شافعی کی ریاست ان پر ختم تھی[6]، دین و دنیا کی جامعیت دنیاست کا

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲ [2] طبقات، ابن شہبہ ج ا ص ۱۶۱ [3] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۳، [4] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۶۸ [5] روضات الجنات ص ۸۴ [6] انساب ج ۱ ص ۳۴ [7] روضات الجنات ص ۸۴ [8] طبقات شیرازی ص ۱۰۳ ۔

تذکرہ تقریباً سبھی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، امام سبکی نے انکا ذکر شیخ طریقہ العراق، حافظ المذہب، امام مذہب، علم کا کوہ رفیع اور امت کے جید ترین عالم وغیرہ جیسے شکوہ الفاظ وتعبیرات سے کیا ہے۔[1]

عوام وخواص اور علماء وملوک سب کی نظروں میں وہ صاحب وجاہت تھے بلکہ خطیب بغدادی کے الفاظ میں ان کا رعب ودبدبہ بڑی شان کا تھا۔[2] انکی وجاہت اور دبدبہ وشان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک بار انھوں نے خلیفہ وقت کو لکھا کہ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جس منصب جلیل پر فائز کیا ہے اس سے آپ مجھے معزول نہیں کر سکتے، جبکہ مجھے یہ طاقت بخشی گئی ہے کہ میں خراسان سے چند الفاظ لکھ کر آپ کو خلافت کے عہدہ سے سبکدوش کر سکتا ہوں۔[3] ابن اثیر نے لکھا ہے کہ وہ جلیل ونبیل تھے۔[4] امام نووی کی رائے یہ ہے کہ امام اسفرائنی ہی سے عراق کے شوافع کے مسلک کو فروغ عام حاصل ہوا۔[5] امام یافعی نے امام الجلیل الفاضل کے الفاظ کے علاوہ مقدم النجابة والفضائل (نجابت وشرافت اور خوبیوں کے مرکز) کے توصیفی الفاظ کے ساتھ ان کا ذکر کیا۔[6] اپنے زمانہ میں احناف کے امام اور نامور فقیہ امام ابوالحسین قدوری جو ان کے ہم عصر تھے اور باوجود معاصرت اور اختلاف مسلک کے وہ امام اسفرائنی کی بہت تعظیم کرتے اور سارے فقہائے عصر پر انکو فوقیت دیتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ میں نے ان سے بڑھ کر شافعیہ میں اور کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔[7]

۱؎ طبقات کبریٰ، ج ۳ ص ۲۴ ۲؎ تاریخ بغداد، ج ۴ ص ۳۶۸ ۳؎ طبقات کبریٰ ج ۳، ص ۲۶ ۴؎ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۳ ۵؎ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۱۰ ۶؎ مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۵ ۷؎ المنتظم ج ۷، ص ۲۷۷۔

ایک اور قول ..... میں انہوں نے فرمایا کہ امام ابو حامدؒ میرے نزدیک امام شافعی سے بھی زیادہ صاحب فقہ اور صاحب نظر تھے[1] جب شیخ ابو اسحاق شیرازی نے یہ سنا تو فرمایا کہ یہ امام قدوری کا اپنا خیال ہے، کچھ لوگوں نے اس قول میں امام شافعی کی شخصیت سے احناف کے تعصب کی جھلک محسوس کی اسی لیے یہ کہا گیا کہ جہانتک امام شافعی جیسا ہونے کی بات ہے تو بقول شاعر[2]

نزلوا بمکۃ فی قبائل نوفل　　ونزلت بالبیداء ابعد منزل

امام قدوری کی نیت جو بھی رہی ہو اس سے قطع نظر بعض دوسرے حضرات شوافع نے بھی امام اسفرائنی کو شافعی ثانی لکھا ہے[3] یہ بھی لکھا ہے کہ امام شافعی اگر انکو دیکھتے تو خوش ہوتے[4]

ایک دوسرے نامور حنفی فقیہ امام عبداللہ صیمری نے بھی امام اسفرائنی کی جلالت علمی کے اعتراف میں کہا تھا کہ میں نے امام ابو حامد اور امام ابو الحسن خرزی داؤدی سے بڑھ کر کسی اور فقیہ کو نہیں دیکھا[5] امام نووی کے شیخ عمرو ابن الصلاح نے فرمایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی مشہور حدیث ہے،

ان اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔ (کتاب الملاحم، سنن ابی داؤد)

بعض علماء نے لکھا کہ چوتھی صدی میں اس حدیث کا مصداق امام ابو حامد اسفرائنی ہیں، ان سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام شافعی اور امام ابن سریج کو پہلی صدی

---

[1] طبقات شیرازی ص ۱۰۳، [2] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۷ [3] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۶۱
[4] تاریخ بغداد و وفیات بحوالہ سابقہ [5] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۱۰۔

اور تیسری صدیوں کا مجدد ملت قرار دیا گیا تھا[1]۔

ابن اثیر نے جامع الاصول میں اور زیادہ صراحت کے ساتھ لکھا کہ امام ابو حامد بقول شافعیہ، چوتھی صدی کے مجدد ہیں، احناف ابو بکر محمد بن موسیٰ خوارزمی کو، مالکیہ ابو محمد عبد الوہاب بن نصر کو، حنبلیہ ابو عبد اللہ حسین بن علی حامد کو اور فرقہ امامیہ کے لوگ شریف مرتضیٰ موسوی کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے چوتھی صدی کے مجدد مانتے ہیں[2]۔

بہرحال یہ طے ہے کہ ان کے تمام ہم عصروں کو ان کی جلالت علمی، فضیلت اور نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی پر اتفاق تھا[3]۔ شیخ شیرازی اور ابن خلکان نے لکھا کہ جودت فقہ، حسن نظر اور نظافت علم میں ان کے تقدم و فضیلت پر مخالف و موافق سب متفق تھے[4]۔ امام سبکی جن کے تبصرے اپنی جامعیت کے لحاظ سے بہت خوب ہوتے ہیں، لکھتے ہیں کہ تصانیف کی شہرت، تلامذہ کی کثرت اور اقوال کی وسعت کے لحاظ سے فقہائے شافعیہ میں ابن سریج کے بعد امام ابو حامد جیسا کوئی اور نہ ہوا، بہت سے ائمہ مسلک ایسے ہیں جو ان سے زیادہ جلیل القدر ہیں، مگر مذکورہ خوبیوں کے وہ ..... بیک وقت ایسے جامع نہیں جیسے امام ابن سریج اور امام ابو حامد ہیں[5]۔

تقویٰ اور خدا ترسی | ان کی وجاہت دینی و دنیوی کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے، علماء و فضلا کے علاوہ اعیان سلطنت ان کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے، فخر الملک ابو غالب ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے مگر امام اسفرائنی کی زندگی تقویٰ، ورع اور زہد کا نمونہ تھی، ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ درس و تدریس کے لیے وقف تھا

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۱۰ [2] روضات الجنات ص ۵۴ [3] مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۷ [4] طبقات شیرازی و وفیات بحوالہ سابقہ [5] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۹۔

ہر آن وہ مواخذہ نفس کا عمل پیش نظر رکھتے، کلام کی دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں وہ اس کا بھی لحاظ رکھتے کہ کہیں کوئی نامناسب بات زبان سے سرزد نہ ہو، زبان کی لغزش پر خاص توجہ تھی، سبقت لسانی پر بھی اپنا احتساب کرتے۔

ایک بار مناظرہ کے دوران زبان سے کوئی ایسی بات نکلی جو نامناسب تھی، بعد میں اس کا احساس ہوا تو اسی دن فریق مخالف کے پاس معذرت کرنے کے لیے تشریف لے گئے اور یہ شعر پڑھے:

جفاء جری جہراً لدی الناس وانبسط ۔۔۔ وعذر اتی سراً فاکد ما فرط

ومن ظن ان یمحو جلی جفاء ۔۔۔ خفی اعتذار فھو فی اعظم الغلط

دوسروں کو بھی انہی باتوں کی تلقین کرتے، چنانچہ ایک بار طاہر عبادانی سے یہ فرمایا کہ جدل و مناظرہ کی مجلسوں میں میری تمام باتوں کو زیادہ اہتمام سے نقل نہ کرو، اس لیے کہ اس قسم کی مجالس میں مقصد فریق مخالف کو قائل و مغلوب کرنا ہوتا ہے یا پھر اس کو مغالطہ و غلط فہمی میں مبتلا کرنا ہوتا ہے، خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی نیت کم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو تو ان چرب زبانیوں کے مقابلہ میں خاموشی و سکوت کہیں زیادہ بہتر ہے اور حق تو یہ ہے کہ اگر ہمارا زیادہ وقت ایسے مشغلوں میں صرف ہوتا رہا تو ہم اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوں گے یہ اور بات ہے کہ اس کی رحمت ہماری دستگیری کرے۔

امام سبکی نے اس قول پر بہت اچھا تبصرہ کیا ہے کہ امام ابو حامد اسفرائنی کے مذکورہ قول سے خود ان کے اخلاص کا اظہار ہوتا ہے، وہ خدا کی رحمت کے آرزومند ہیں، یہ آرزو برحق ہے کیونکہ ان کی مجالس بحث و جدل اور مناظروں کا مقصد، علم کی

نشر و اشاعت، طلب علم کی تحریص اور اقامت حجت کی تعلیم ہے اور اہل حق کی نظر میں یہ قابل قدر ہے اور اس کی برکت اور اس کا نفع و فیض جاری ہو کر رہتا ہے، بقول امام سبکی یہ امام ابو حامد اسفرائنی کے اخلاص اور پاکیزگی نیت کا ثمرہ تھا کہ جس قدر علم ان کی شخصیت کے ذریعہ سے عام ہوا اتنا ان کے اور کسی ہم عصر یا بعد میں آنے والوں سے نہیں ہوا، انھوں نے اپنے علم سے ایک جہان آباد کر دیا، امام سبکی کے الفاظ یہ ہیں:

کتب عنه من العلم ما لم	علم جتنا ان سے حاصل کیا گیا اسکی
یکتب نظیرہ عن احد بعدہ	نظیر ان کے بعد کبھی نہیں ملتی، اس
فللّٰہ هذا الاخلاص فی	کثرت نفع میں اخلاص شامل تھا
هذہ الکثرۃ فانه طبق الدنیا بعلمه	اسی لیے وہ اپنے علم سے دنیا پر چھا گئے۔

امام اسفرائنی کی یہ فیاضی اور سخاوت صرف علم کی دولت ہی سے خاص نہ تھی، انکے پاس کثرت سے تحفے اور ہدیے آتے رہتے تھے اور یہ سب کے سب مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیے جاتے، بعض نادار شاگردوں کو وہ ہر ماہ ۱۶۰ دینار دیتے تھے۔

ایک موقع پر انھوں نے حج کے ایک خواہشمند کو ہزار دینار دیے[1]

ذکر و شکر ایک بار انھوں نے مشہور شاعر ابو الفرج دارمی صاحب الستذکار کی عیادت کی تو دارمی نے یہ اشعار کہے، خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ دارمی نے مجھے یہ اشعار سنائے تھے[2]

[1] طبقات کبریٰ بحوالہ سابق [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۹۔

مرضت فارتحت الی عائد　　فعاد فی العالم فی واحد

ذاك الامام ابن ابی طاهر　　احمد ذوالفضل ابوحامد

جلوتوں کے علاوہ خلوت میں بھی زبان ذکر الٰہی میں مشغول رہتی، قلم ہاتھ سے رکھ دیتے تو قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگتے یا پھر تسبیح کا ورد کرتے، راستہ سے گزرتے وقت بھی تسبیح و تحمید سے زبان تر رکھتے[1]

ایک وقت وہ تھا جب تلاش معاش میں وہ گھروں کی چوکیداری کرتے تھے پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے انکو نوازا تو انھوں نے مصر سے امام شافعی کی کتاب امالی سو دینار میں خرید کی[2] عیسیٰ بن ملامس نے انکو موسم حج میں مکہ میں دیکھا کہ شاہانہ پوشاک ان کے زیب تن ہے اور انکی سواری بھی نہایت قیمتی ہے، وہ طواف کرتے اور لوگ تعظیم میں ان کے جلو میں رہتے، ایک ایسے ہی موقع پر قاری نے یہ آیت تلاوت کی کہ:

تلک الدار الاخرۃ نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا

اسے سن کر وہ بہت روئے اور فرمایا کہ اے رب! ہم علو و سربلندی چاہتے ہیں فساد نہیں چاہتے۔

اما العلو یا رب فقد اردنا و اما الفساد فلم نرده[3]

بعض مروی احادیث | اوپر گزر چکا ہے کہ انھوں نے نامور محدثین سے سماع و استفادہ روایت حدیث کی، اگرچہ ان کی مرویات کی تعداد بہت کم ہے مگر وہ ثقہ تھے اور

---

[1] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۶۸ [2] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۶ [3] لیکن امام سبکی نے اس واقعہ کے متعلق حج کا ذکر نہیں کیا صرف یہ لکھا ہے کہ ایک بار انکی مجلس میں یہ آیت تلاوت کی گئی تو انھوں نے مذکورہ جملہ کہا۔ طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۶۔

طبقہ محدثین میں بھی درجۂ امامت رکھتے تھے، امام خطیب بغدادی نے محمد بن احمد بن شعیب رویانی کے سلسلہ سے ان سے یہ حدیث بیان کی لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ۔[1]

امام سبکی نے بھی ان سے مروی ایک حدیث نقل کی ہے، اس کے سلسلۂ اسناد میں ان کے شیخ ابراہیم بن محمد بن عبدک وغیرہ ہیں جنھوں نے حضرت نعمانؓ بن بشیر سے یہ روایت کی ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الحلال بین والحرام بین وبین ذلک امور مشتبہۃ لا یعلمہا کثیر من الناس فمن اتقی الحرام کان اوفی لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبہۃ وقع فی الحرام کالراتع یرتع حول الحمی وان حمی اللہ فی الارض محارمہ ومن یرتع حول الحمی یوشک ان یجسر۔[2]

تلامذہ ورواۃ | وہ منارۂ علم تھے، ان سے روشنی حاصل کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہے، بقول امام شیرازی "زمین ان کے شاگردوں سے معمور تھی" طبق الارض بالاصحاب۔[3] ابن شہبہ نے لکھا کہ پورے عالم اسلام میں ان کے شاگرد موجود تھے لیکن بغداد کے فقہا اور ائمہ نے تو عام طور سے ان سے اکتساب فیض کیا،[4] ان کی ایک ایک مجلس میں تین سو طالبین علم تو عام طور سے شریک ہوا کرتے، کبھی کبھی یہ تعداد سات سو تک پہنچ جاتی،[5] وہ عام طور سے مسجد عبداللہ بن مبارک میں درس دیتے تھے، یہ مسجد

---

[1] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۱ [2] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۰ [3] طبقات شیرازی ص ۱۰۳

[4] طبقات شہبہ ج ۱ ص ۱۶۱ [5] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۵ العبر ج ۳ ص ۹۲۔

قطیعۃ الربیع کے قلب میں واقع تھی[1] اوپر امام سبکی کا یہ قول گذر چکا ہے کہ شاگردوں کی کثرت میں امام ابن سریج کے بعد امام ابوحامد جیسا اور کوئی نہ ہوا، انکے شاگردوں کی اس کثرت کو دیکھتے ہوئے ان کے نام شمار نہیں کیے جا سکتے، تاہم ان کے نامور شاگردوں میں سے بعض کے نام یہاں نقل کیے جاتے ہیں کہ ان شاگردوں کی جلالت علمی سے استاد کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

فقہ کے علوم حاصل کرنے والوں میں اقضی القضاۃ امام ابوالحسن ماوردی صاحب الحاوی، قاضی ابوالطیب طبری، ابوعلی سنجی اور ایک روایت کے مطابق امام قفال مروزی اور ابوالحسن احمد محاملی اور سلیم بن ایوب رازی ہیں۔

قاضی ابوالطیب طبری برابر ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، انھوں نے بعض مسائل میں اپنے استاذ کی تعقیب بھی کی[2]

ابوالحسن محاملی ان کے خاص شاگرد تھے، شریف مرتضی موسوی کا قول ہے کہ ایک بار یہ دونوں استاد شاگرد میرے پاس آئے تو امام اسفرائنی نے فرمایا کہ یہ محاملی ہیں اور حفظ فقہ میں مجھ سے بہتر ہیں[3] لیکن جب محاملی نے اپنی مشہور کتاب المقنع لکھی تو امام اسفرائنی نے اس سے سخت اختلاف کیا، ان کا خیال تھا کہ اس کتاب میں بے اعتدالیاں ہیں اور اس کا نقطۂ نظر جمہور سے الگ ہے اور اس سے لوگوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے کیونکہ وہ مسلک شافعی اور علم اختلاف الفقہاء سے بے رغبت ہو جائیں گے اسی لیے انھوں نے محاملی کو اپنی مجلس میں آنے سے روک دیا، چنانچہ وہ اگرچہ ان مجلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے تاہم کوشش کرتے تھے کہ دوسرے

---

[1] المنتظم ج ۷، ص ۲۷۰ [2] طبقات کبری ج ۲ ص ۲۹ [3] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۱۰۔

ذرائع سے مجالس کی بحثوں سے واقف ہو جائیں[1]۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام اسفرائنی نے ناراض ہوکر بددعا دی کہ محاملی نے میری کتابوں کو قطع کیا ہے، خدا ان کی عمر کو قطع کرے، بترکتبی بترالله عمره[2] کہا جاتا ہے کہ اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد محاملی کا انتقال ہوگیا۔

ان کے سب سے خاص اور عزیز شاگرد سلیم بن ایوب رازی ہیں، ان کا ذکر امام سبکی نے شیخ فقیہ فاضل کے الفاظ سے کیا ہے، سلیم رازی نے امام اسفرائنی سے اپنے تعلق کا ذکر خاص انداز میں کیا ہے کہ وہ بغداد میں کسی بزرگ کی خدمت میں جا رہے تھے، راستہ میں امام اسفرائنی کی مجلس دیکھی تو سر راہ کچھ دیر کے لیے وہاں رک گئے، اس وقت کتاب الصیام کے مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی، ان کو یہ بحث اچھی لگی تو اسے قلم بند کر لیا، گھر آکر جب پھر انکو دیکھا تو انکو یہ اقوال اس قدر پسند آئے کہ انہوں نے مستقل انکی خدمت میں حاضری کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ امام اسفرائنی کے اقوال و تعلیقات کے سب سے بڑے راوی وہی ہوئے[3]۔

ان حضرات کے علاوہ حدیث میں ان سے سماعت و روایت کرنے والوں میں ابو محمد حسن بن محمد الخلال، ابو القاسم عبد العزیز بن علی الازجی، ابو منصور محمد بن احمد بن شعیب رویانی اور ابو الحسین احمد بن محمد النفور ہیں[4]۔

شعر و شاعری سے دلچسپی وہ شاعر تو نہیں تھے، مگر ذوق شعری سے بیگانہ بھی نہیں تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے یہ اشعار پڑھے[5]

لا یغلون علیک الحمد فی ثمن　　فلیس حمد وان اثمنت بالغال

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۱۰ [2] ایضاً [3] روضات الجنات ص ۲۸ [4] انساب ج ۱ ص ۳۴۳ [5] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۶۔

الحمد یبقی علی الایام ما بقیت　　والدھر یذھب بالاحوال والمال

ایک دوسری روایت کے مطابق قاضی ترند نے ان کو یہ اشعار لکھ کر بھیجے تھے، اوپر گذر چکا ہے کہ ایک اور موقع پر انھوں نے یہ اشعار پڑھے تھے۔

جفاء جری جھرا لدی الناس وانبسط　　دعذر اتی سراً فاکد ما فرط

ومن ظن ان یمحو جلی جفائہ　　خفی اعتذار فھو فی اعظم الغلط

ایک اہم واقعہ ۳۹۸ھ میں بغداد میں شیعہ اور اہل سنت کے درمیان سخت کشیدگی پیدا ہوئی، وجہ یہ تھی کہ بعض شیعہ نے قرآن مجید کے ایک نئے نسخے کے متعلق کہا کہ یہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا مصحف ہے اور یہی صحیح ہے، مذکورہ نسخہ قرآن مجید کے مروجہ نسخے سے بالکل مختلف تھا، اہل سنت اسے دیکھ کر سخت ناراض ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ فتنہ میں شدت آگئی، اس موقع پر تمام علماء اور قضاۃ ایک مجلس میں جمع ہوئے، انھوں نے اس معاملہ کا جائزہ لیا اور پھر فیصلہ کے لیے امام ابوحامد کے سامنے مصحف شیعہ پیش کیا گیا، انھوں نے اسے دیکھ کر فیصلہ دیا کہ اسے جلا دیا جائے، چنانچہ تمام لوگوں کی موجودگی میں اسے نذر آتش کر دیا گیا، شیعہ یہ دیکھکر مشتعل ہوگئے اور ان کے چند نوجوانوں نے ابوحامد کے گھر پر حملہ کر دیا، وہ اگرچہ بچ گئے لیکن کچھ عرصہ کے لیے ان کو گھر چھوڑنا پڑا، حکومت نے جب اس فتنہ کو پوری طرح فرو کیا تو پھر وہ واپس گھر تشریف لائے[1]

ایک وہم کا ازالہ علامہ شہرستانی نے کتاب الملل والنحل میں عہد اسلامی کے ان فلاسفہ کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے حکمت کی کتابوں کو یونانی سے عربی میں منتقل کیا ہے اور

---

[1] طبقات کبری ج ۳ ص ۲۶

جن کی زیادہ تر رائیں ارسطالیس کی رایوں کے موافق ہیں، ان .... میں حنین بن اسحٰق، ابوالفرج المفسر، ابوسلیمان شجری، یحییٰ نحوی، یعقوب کندی، محمد بن معشر مقدسی، فارابی اور ابن سینا وغیرہ کے ساتھ ابو حامد احمد بن محمد اسفزاری کا نام بھی ہے، امام سبکی کے سامنے ایک نسخہ میں بجائے اسفزاری کے اسفرائنی لکھا تھا، جس سے بہتوں کو یہ وہم ہوا کہ یہ امام ابو حامد اسفرائنی ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمارے امام اسفرائنی کو فلسفہ سے کوئی مس نہ تھا، چنانچہ جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اسفرائنی کی جگہ اسفزاری ہی صحیح ہے، یہ امام ابو حامد کے ہم نام شہر اسفزار سے تعلق رکھتے تھے جو ہرات اور سجستان کے درمیان واقع ہے، اس وہم کے ازالہ کے محقق ہو جانے کے بعد امام سبکی کو اطمینان ہوا[1]

وفات | تقریباً چالیس[2] سال تک علم و فضل کی روشنی سے ایک عالم کو منور کرنے کے بعد یہ آفتاب علم قیامت تک کے لیے روپوش ہو گیا، ۱۷ برس کی عمر سے انہوں نے اپنے علم کا فیض عام کرنا شروع کیا اور تا دم آخر یہ سلسلہ جاری رہا، پھر جب وفات کا وقت قریب آیا تو یہ بلیغ جملہ ارشاد فرمایا کہ ہم تو ایسے علم کی نہ سمجھ پائے تھے، ۱۹ شوال ۴۰۶ھ سنیچر کی شب میں انتقال ہوا، اگلے روز جسر ابی الدین کے پیچھے ایک وسیع میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی، جنازہ میں شرکت کے لیے ایک خلقت امنڈ پڑی تھی، بے شمار لوگ تھے[3] اور شدت غم سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، بقول ابن ہدایہ تاریخ کے صفحات میں یہ دن لوگوں کی کثرت اور گریہ وبکا اور غم والم کی شدت کی وجہ سے یاد کیا جائے گا[4] امام کے ساتھ ہی امام

---

[1] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۷ [2] المنتظم ج ۷ ص ۲۷۸ [3] طبقات ابن ہدایہ ص ۴۲

اسفرائنی کی مقبولیت اور ان کی شخصیت کی محبوبیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم و فضل اور صفات حمیدہ کی بنا پر ہر خاص و عام کے دل میں جاگزیں تھے۔

امامت ابو عبداللہ بن مہتدی (مہدی) خطیب جامع منصور نے کی، امام خطیب بغدادی بھی اس نماز میں شریک ہوئے، تدفین ان کے گھر ہی میں ہوئی لیکن وجہ نہ معلوم ہو سکی کہ ایسا کیوں ہوا، پھر چار برس کے بعد ۴۱۰ھ میں مقبرہ باب حرب میں دوبارہ تدفین ہوئی، امام یافعی کہتے ہیں کہ چار برس کے بعد بھی ان کی میت پر کسی قسم کی بوسیدگی کے آثار نہیں تھے، بقول امام یافعی اسے ان کے حق میں کرامت کا ظہور ہی کہیں گے [۱]

تصنیفات | ہم امام سبکی کا یہ قول اوپر نقل کر چکے ہیں کہ تلامذہ کی کثرت، اقوال کی وسعت اور تصنیفات کی شہرت کے لحاظ سے امام ابن سریج کے بعد سر فہرست امام ابو حامد اسفرائنی ہیں، ان کی تصنیفات تعداد میں گرچہ نسبتاً کم ہیں، تاہم شہرت اور قدر و قیمت کے لحاظ سے وہ نہایت اہم ہیں، امام ابن خلکان نے لکھا کہ انہوں نے مختصر المزنی پر ایک تعلیق مرتب کی تھی، اس کے علاوہ انہوں نے التعلیقۃ الکبری اور کتاب البستان کا ذکر کیا ہے [۲] صاحب العبر نے لکھا کہ ان کی تعلیق ۵۰ جلدوں میں ہے [۳] اصول فقہ میں بھی انکا ایک رسالہ تھا [۴]

تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے انھی کتابوں کا ذکر کیا ہے، حاجی خلیفہ چلپی نے التعلیقۃ الکبری فی الفروع کے مکمل نام سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلک

---

[۱] مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۷ [۲] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۳ [۳] العبر فی خبر من غبر ج ۳ ص ۹۲ [۴] البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۳۔

شافعی میں یہ عظیم کتاب ہے[1] اس اجمال کی شرح امام نووی کے اس قول سے ہوتی ہے کہ جمہور فقہاء، خصوصاً عراق و خراسان کے فقہائے شافعیہ کی کتابوں کا دارو مدار امام اسفرائنی کی اسی تعلیق پر ہے، جو کم و بیش پچاس جلدوں پر محیط ہے، اس میں اصول و فروع، فقہاء کے مسلک، ان کے مفصل دلائل اور اعتراضوں کے جواب پر مشتمل نہایت عمدہ بحثیں جمع کر دی گئی ہیں، بے شبہ اس جیسی کوئی اور کتاب نہیں ہے، یہ بے مثل ہے[2] البتہ اس کتاب کے چند نسخوں میں بعض مسائل کی عبارتوں میں باہم اختلاف تھا جن کو امام نووی نے شرح مہذب میں یکجا کر دیا تھا[3] یہی بات امام سبکی نے بھی لکھی ہے کہ انھوں نے دمشق کے مدرسہ ناصریہ کے کتبخانہ میں اس کتاب کے اکثر حصے سلیم رازی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دیکھے تھے، جن پر امام بندنیجی کے ہاتھ کے تعلیقات بھی موجود تھے، کچھ اور بھی نسخے تھے جن میں قدرے تفاوت تھا[4] ابن شہبہ نے اس کتاب کی تعریف میں لکھا کہ اس میں فقہاء کے اختلاف اور انکے اقوال، مآخذ اور مناظرے جمع کیے گئے تھے[5]

مختصر المزنی پر ان کی تعلیق کا ذکر کئی لوگوں نے کیا لیکن اس پر تبصرہ کسی نے نہیں کیا، البتہ امام ابو اسحاق شیرازی نے یہ ضرور لکھا کہ اس تعلیق پر بھی کئی اور تعلیقات لکھی گئیں[6]

یہی حال کتاب البستان کا ہے جس کا پورا نام علامہ چلپی نے بستان فی النوادر والغرائب تحریر کیا ہے[7] صرف امام یافعی نے اتنا اور لکھا کہ یہ ایک مختصر حجم کی کتاب تھی،

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۹۵ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۱۰ [3] ایضاً [4] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۸
[5] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۶۱ [6] طبقات شیرازی ص ۱۰۳ [7] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۹۷۔

جس میں غرائب اقوال و مسائل تھے[1] امام سبکی نے ایک کتاب رونق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ یہ کتاب بھی امام اسفرائنی سے منسوب ہے[2] علامہ چلپی نے مزید تصریح کرتے ہوئے لکھا کہ یہ امام محاملی کی مشہور کتاب الالباب کے طرز پر تھی، مختصر تھی اور اس میں فروع مسائل پر گفتگو تھی، لیکن یقین سے انہوں نے بھی اس کتاب کو ان سے منسوب نہیں کیا اور یہ لکھا کہ یہ ابوحاتم قزوینی کی تصنیفات میں بھی شمار ہوتی ہے اور یہ بات یوں بھی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ابوحاتم قزوینی، امام محاملی کے شاگرد تھے اور رونق کے مسائل میں امام محاملی کا رنگ صاف نمایاں ہے[3] صاحب اعلام نے البتہ مطلقاً اسے امام اسفرائنی کی تصنیفات میں شمار کیا ہے[4]

اصول فقہ میں ان کے رسالہ کا ذکر بعض جگہ ملتا ہے لیکن تفصیلات کہیں نہیں ملتیں، حتی کہ کشف الظنون کے صفحات بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔

مسائل و فوائد وغیرہ اس قدر اہم کتابوں کے مصنف ہونے کے باوجود ہم براہ راست ان کے علمی تبرکات کے استفادہ سے محروم ہیں کہ اب یہ کتاب عموماً دستیاب نہیں، ممکن ہے کسی کتبخانہ میں ان کے نسخے محفوظ ہوں، لیکن سر دست وہ ہماری دسترس سے باہر ہیں، امام سبکی نے حسب عادت ان کے چند اقوال و مسائل کو نقل کیا ہے جو زکوٰۃ، طلاق، عتاق اور باب الشہادت سے متعلق ہیں، لیکن وہ نہایت مختصر اور غیر اہم ہیں، اس لیے ان کو یہاں نقل کرنا غیر ضروری ہے۔

---

[1] مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۵ [2] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۶۲ و طبقات کبری ج ۳ ص ۲۸ [3] کشف الظنون ج ۱ ص ۵۸۰ [4] اعلام ج ۱ ص ۶۵۔

از جناب رام لعل نابھوی صاحب

یہ کتاب فارسی زبان میں بالکل فرضی اور تمثیلی داستانوں پر مشتمل ہے۔ شیخ عنایت اللہ کمبو لاہوری نے اسے ۱۰۶۱ ہجری میں مکمل کیا۔

یہ ایک شاہکار ہے اور سنسکرت داستان پر مبنی ہے۔ اس کی کڑیاں ابوالفضل کی "بہار دانش"۔ حسین واعظ کاشفی کی "انوارِ سہیلی"۔ کلیلہ و دمنہ" کے توسط سے سنسکرت کے "پنج تنتر" سے ملتی ہیں۔ اس کتاب کو شاہجہاں کی خدمت میں پیش کیا گیا اور جب وزیر نے سفارش کے کلمے کہے تو بادشاہ نے فرمایا:

"خط ز بہشت است و بہ آب از نوشت است۔ حق محنتش را بہ دہند"[1]

یہ کتاب ضخیم ہے۔ نثر میں ہے۔ اس کے قلمی نسخے اور مختلف مطبعوں سے چھپے ہوئے نسخے موجود ہیں۔ اردو۔ انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمنی اور کچھ اور زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ حسن علی عزت حسن خاں حسین عوض رائے حسرت اور محمد اسمٰعیل طپش نے اسے اردو میں منظوم کیا۔ دکنی نثر میں بھی لکھا گیا۔ جن نسخوں کا پتہ چل سکا ان کا ذکر ملحقہ فہرست میں کیا گیا ہے۔

---

[1] محمد حسین آزاد۔ سخندان فارس طبع لاہور ۱۹۵۵ء ص ۲۵۳ بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند چوتھی جلد فارسی ادب دوم ص ۲۰۷۸ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

تذکروں میں اس کتاب کا ذکر عام طور سے ملتا ہے۔ نفسِ مضمون اور عمدہ فارسی نثر کی حامل تمثیلی داستانوں کے اس شگفتہ مجموعہ نے صدیوں تک عوام کو مسحور کیے رکھا۔ ایسی مقبولیت کم ہی کتابوں کے حصہ میں آئی ہے۔

ظاہر ہے کہ مصنف کو سنسکرت زبان پر بھی عبور حاصل تھا ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ سنسکرت زبان سے داستان کو اخذ کرتا پھر اسے فارسی میں جامہ پہناتا۔ مصنف کی کوشش زورِ بیان پر صرف ہوئی ہے۔ عبارت مسجع اور مقفیٰ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مصنف نے دینی اور دنیوی علوم پڑھے۔ پھر دل دنیا سے اچاٹ ہوگیا اور خدا سے لو لگائے رہے۔ ۱۰۸۲ہجری میں ۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حکایتیں پڑھتے جایئے کہیں کوئی طوطی دور دیش کی ایک حسین شاہزادی کے حسن کو بتا رہی ہے اور ایک شاہزادہ شاہزادی کو دیکھے بغیر ہی فریفتہ ہوگیا ہے۔ ایک شخص خلع بدن اور انتقال روح کا علم جانتا ہے اور شاہزادہ کو ہرن کے بدن میں داخل کر دیتا ہے اور خود شاہزادہ کے بدن میں داخل ہو جاتا ہے اور محلات میں عیش و نشاط کے مزے لوٹتا ہے۔ اصل راز کھل جاتا ہے۔ شہزادہ اپنے اصلی جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ کہانی چلتی جاتی ہے اور تب ختم ہوتی ہے جب شاہزادی اور شاہزادہ کنیزوں کو لے کر صحرا میں خلوت گزیں ہو جاتے ہیں اور جان آفریں خدا کے حوالے کرتے ہیں۔

پانچ کہانیاں ایسی ہیں جن میں عورتوں کی عیاری اور غداری بتائی جاتی ہے۔ پانچ عورتیں ہیں اور سب شوہر دار۔ شوہروں کی موجودگی میں بدکاری کرتی ہیں اور خاوندوں کو علم تک نہیں ہوتا۔ ملک زادہ اور مہر بانو کی عشقیہ داستان کے

بعد داستان بہرام و زہرہ، داستان حسن تاجر۔ داستان فرخ خاں۔ داستان عزیز سوداگر اور آخر میں خلیفہ ہندوستان کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ دیو۔ پریاں عام ملتی ہیں۔ صحرانوردی کے واقعات ہیں۔ الف لیلہ۔ حاتم طائی اور سندباد جہازی جیسے قصے بھی ہیں۔ ان کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر موجود ہیں۔ عشق مرض۔ محبت۔ رفاقت۔ عداوت سبھی کچھ ہے۔ کہانی کے لحاظ سے صرف ایک داستان دلچسپ اور سبق آموز کہی جاسکتی ہے۔ جس میں تین دوستوں۔ شہزادہ۔ سوداگر اور زرگر کا قصہ ہے۔ پھول والوں کا میلہ ہے۔ عورتیں بن سنور کر گھر سے نکلتی ہیں۔ ایک شخص کسی عورت کے تیر نظر کا گھائل ہو جاتا ہے۔ بیمار ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہی کچھ عشق۔ جوانی۔ حسن پرستی۔ کہیں کہیں صبر۔ قناعت۔ ایفائے عہد کی تلقین بھی ہے۔

انسانی فطرت میں تجسس ہے۔ یہ داستانیں اس خوبصورتی سے بیان کی گئی ہیں کہ تجسس بڑھتا رہتا ہے اور قاری کتاب ختم کرکے ہی اٹھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس کتاب کی مقبولیت کی یہی دلیل ہے۔ بہار دانش کا قدیم قلمی نسخہ ۱۰۶۱ھ کا دستیاب ہے[1] ۱۱۴۱ھ کا قلمی نسخہ میرے پاس ہے۔ ملحقہ نقشے میں ایسے تمام نسخوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جن کا پتہ لگ سکا۔ ہوسکتا ہے کوئی نسخہ رہ گیا ہو لیکن کام کرنے والے اسکالر کو مختلف جگہوں کا پتہ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ نسخے اب بازار میں نہیں ملتے۔

بہار دانش از منشی عنایت اللہ

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی یا سال کتابت	سائز صفحات	مطبوعہ نام پریس	زبان	کیفیت
	بہار دانش	۱۱۴۱ ہجری	چھوٹا سا درج نہیں		فارسی نثر	نابھوی کے پاس ہے یہ ۲۷۵ سال پرانا قلمی نسخہ ہے۔

[1] بحوالہ نسخہ ہائے فارسی خطی پاکستان مرکز تحقیقات فارسی پاکستان و ہند ج ۶

تذکروں میں اس کتاب کا ذکر عام طور سے ملتا ہے۔ نفس مضمون اور عمدہ فارسی نثر کی حامل تمثیلی داستانوں کے اس شگفتہ مجموعہ نے صدیوں تک عوام کو مسحور کیے رکھا۔ ایسی مقبولیت کم ہی کتابوں کے حصہ میں آئی ہے۔

ظاہر ہے کہ مصنف کو سنسکرت زبان پر بھی عبور حاصل تھا ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ سنسکرت زبان سے داستان کو اخذ کرتا پھر اسے فارسی میں جامہ پہناتا۔ مصنف کی کوشش زور بیان پر صرف ہوئی ہے۔ عبارت مسجع اور مقفیٰ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مصنف نے دینی اور دنیوی علوم پڑھے۔ پھر دل دنیا سے اچاٹ ہوگیا اور خدا سے لو لگائے رہے۔ ۱۰۸۲ ہجری میں ۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حکایتیں پڑھتے جایئے کہیں کوئی طوطی دور دیش کی ایک حسین شاہزادی کے حسن کو بتا رہی ہے اور ایک شاہزادہ شاہزادی کو دیکھے بغیر ہی فریفتہ ہو گیا ہے۔ ایک شخص خلع بدن اور انتقال روح کا علم جانتا ہے اور شاہزادہ کو ہرن کے بدن میں داخل کر دیتا ہے اور خود شاہزادہ کے بدن میں داخل ہو جاتا ہے اور محلات میں عیش و نشاط کے مزے لوٹتا ہے۔ اصل راز کھل جاتا ہے۔ شہزادہ اپنے اصلی جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ کہانی چلتی جاتی ہے اور تب ختم ہوتی ہے جب شاہزادی اور شاہزادہ کنیزوں کو لے کر صحرا میں خلوت گزیں ہو جاتے ہیں اور جان آفریں خدا کے حوالے کرتے ہیں۔

پانچ کہانیاں ایسی ہیں جن میں عورتوں کی عیاری اور غداری بتائی جاتی ہے پانچ عورتیں ہیں اور سب شوہر دار۔ شوہروں کی موجودگی میں بدکاری کرتی ہیں اور خاوندوں کو علم تک نہیں ہوتا۔ ملک زادہ اور مہر بانو کی عشقیہ داستان کے

بعد داستان بہرام و زہرہ، داستان حسن تاجر۔ داستان فرخ خاں۔ داستان عزیز سوداگر اور آخر میں خلیفہ ہندوستان کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ دیو۔ پریاں عام ملتی ہیں۔ صحرا نوردی کے واقعات ہیں۔ الف لیلہ۔ حاتم طائی اور سندباد جہازی جیسے قصے بھی ہیں۔ ان کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر موجود ہیں۔ عشق مرض۔ محبت۔ رفاقت۔ عداوت سبھی کچھ ہے۔ کہانی کے لحاظ سے صرف ایک داستان دلچسپ اور سبق آموز کہی جاسکتی ہے۔ جس میں تین دوستوں۔ شہزادہ۔ سوداگر اور زرگر کا قصہ ہے۔ پھول والوں کا میلہ ہے۔ عورتیں بن سنور کر گھر سے نکلتی ہیں۔ ایک شخص کسی عورت کے تیر نظر کا گھائل ہو جاتا ہے۔ بیمار ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہی کچھ عشق۔ جوانی۔ حسن پرستی کہیں کہیں صبر۔ قناعت۔ ایفائے عہد کی تلقین بھی ہے۔ انسانی فطرت میں تجسس ہے۔ یہ داستانیں اس خوبصورتی سے بیان کی گئی ہیں کہ تجسس بڑھتا رہتا ہے اور قاری کتاب ختم کرکے ہی اٹھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس کتاب کی مقبولیت کی یہی دلیل ہے۔ بہار دانش کا اولین قلمی نسخہ ۱۰۶۱ھ کا دستیاب ہے[1] ۔ قلمی نسخہ پریا ہیں۔ ملحقہ نقشے میں ایسے تمام نسخوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جن کا پتہ لگ سکا۔ ہوسکتا ہے کوئی نسخہ دہرایا گیا ہو لیکن کام کرنے والے اسکالر کو مختلف جگہوں کا پتہ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ نسخے اب بازار میں نہیں ملتے۔

بہار دانش از منشی عنایت اللہ

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی یا سال کتابت	سائز صفحات	مطبوعہ نام پریس	زبان	کیفیت
	بہار دانش	۱۱۸۱ ہجری	چھوٹا سا درج نہیں		فارسی نثر	۔ بھوی کے پاس ہے یہ ۲۷۵ سال پرانا قلمی نسخہ ہے۔

[1] بحوالہ نسخہ ہائے فارسی خطی پاکستان مرکز تحقیقات فارسی پاکستان و ہند ج ۶

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۲	بہار دانش	x	نول کشور ۱۸۹۶ء	۱۲ ۴۳۹	فارسی نثر	نا بجوی کے پاس ہے۔
۳	بہار دانش ترجمہ	x	نول کشور ۱۹۰۶ء	۱۲ ۸۸	اردو منظوم	نا بجوی کے پاس ہے، مرزا جان طپش کا ترجمہ ہے۔
۴	بہار دانش	قلمی	x x	x	فارسی نثر	قلمی نسخہ سنٹرل لائبریری پٹیالہ SS m نمبر ۲۲۳۴۔
۵	بہار دانش	قلمی	x	x	فارسی نثر	" " "
۶	"	"	۹۶۲ھ	x	بزبان پاکستانی	قلمی نسخہ ترجمہ ہائے متون فارسی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان صفحہ ۲۵۔
۷	ترجمہ منظوم	"	۱۲۱۷ ہجری	x	x	" " " مرزا جان طپش
۸	"	x	نولکشور ۱۲۸۶ ہجری	x	x	ترجمہ از تنہا " " صفحہ ۲۵۸
۹	"		۱۲۱۳ ہجری	x	x	ترجمہ از حسین " " " "
۱۰	بہار دانش	x	x	x	x	ترجمہ ہائے متون فارسی بزبان ہائے پاکستان مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان صفحہ ۱۲۸۔
۱۱	"					فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی بمبئی کتابخانہ موسسہ صفحہ ۱۰۱

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۱۲	بہار دانش					DESCRIPTIVE CATALOGUE OF THE PERSIAN MSS — ASIATIC SOCIETY NUMBER WORK 244
۱۳	منتخب بہار دانش					صفحہ ۱۹ — do — BY DEEPAK ROY فارسی
۱۴	بہار دانش	۱۹۰۰ بکرمی				صفحہ ۱۰۹ نسخہ ہائے خطی کتابخانہ شعبۂ تحقیق و اشاعت کشمیر۔
۱۵	"					صفحہ ۱۴۱ " "
۱۶	"					" " "
۱۷	"					" " "
۱۸	"					" " "
۱۹	"					" " "
۲۰	"					" " "
۲۱	"					" " "
۲۲	"					" " "
۲۳	"	۱۲۰۵ ہجری				نسخہ ہائے خطی فارسی کتب خانہ ندوہ لکھنؤ صفحہ ۴۸۸۔
۲۴	فرہنگ بہار دانش					کیٹلاگ فارسی عربی قلمی مخطوطات صولت لائبریری رامپور صفحہ ۹۴۔

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۲۵	قصہ جہاندار شاہ					بہار دانش کا دوسرا نام یہ رکھا گیا۔ صولت لائبریری صفحہ ۱۰۰
۲۶	بہار دانش	قلمی ۱۱۱۰ ہجری				فہرست مخطوطات شیرانی جلد سوم صفحہ ۳۱۵
۲۷	فرہنگ بہار دانش	۱۱۴۲ ہجری				صفحہ ۱۹۱۳ CATLOG OF PERSIN MSS MAU- LANA AZAD LIBRARY HABIBGANJ COLLE- CTION
۲۸	بہار دانش	قلمی ۱۰۶۱ ہجری				نسخہ ہائے فارسی قلمی پاکستان مرکز تحقیقات فارسی پاکستان و ہند جلد ششم صفحہ ۱۰۰۶
۲۹	بہار دانش	قلمی ۱۰۸۲ ہجری				DSCRIPTIVE CA- TALOGUE OF PE- RSIAN MSS ASI- ATIC SOCEITY WARK 241 صفحہ ۱۰۶
۳۰	بہار دانش					" " "
۳۱	"					------- DES- CRIPTIVE CAT- LOGUE OF PE- RSIAN MSS-ASIA-

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	نایاب	کیفیت
۳۲	بہار دانش	قلمی ۱۱۹۴ ہجری				صفحہ ۴۴۰ مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان فارسی، عربی۔
۳۳	"					" " "
۳۴	"					" " " "
۳۵	"					" " "
۳۶	"					" " " "
۳۷	ہمیشہ بہار					فارسی بہار دانش کا اردو ترجمہ ہے، تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول ڈاکٹر سید علی الدین قادری زور صفحہ ۱۷
۳۸	بہار دانش	قلمی ۱۲۱۱ ہجری				تذکرہ مخطوطات جلد پنجم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صفحہ ۱۵۶
۳۹	"	قلمی ۱۲۴۹ ہجری				یہ بہار دانش کا اردو منظوم ترجمہ ہے جسے طپش دہلوی نے کیا۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی جلد چہارم صفحہ ۴۲۸
۴۰	بہار دانش	قلمی ۱۲۱۹ ہجری				فہرست مخطوطات شفیع صفحہ ۳۲۶
۴۱	"	۱۲۴۲ ہجری				صفحہ ۴۰ فہرست نسخہ ہائے خطی موزہ ملی پاکستان کراچی۔

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۴۲	فرہنگ بہار دانش					صفحہ ۲۷۲ فہرست نسخہ ہائے قلمی موزۂ پاکستان کراچی۔
۴۳	"					۲۷۳ " "
۴۴	بہار دانش	قلمی ۱۱۱۵ ہجری				صفحہ ۲۷۶ فہرست نسخہ ہائے خطی کتابخانہ راجہ محمود آباد، لکھنؤ۔
۴۵	"	قلمی ۱۱۹۹ ہجری				" " "
۴۶	"	قلمی				قلمی دکنی نثر صفحہ ۵۷۴۔ اردو کی نثری داستانیں۔ ڈاکٹر گیان چند
۴۷	گلزار دانش	۱۸۰۲ء				حیدر بخش حیدری " " "
۴۸	بہار دانش (نثر)					ولایت علی " " "
۴۹	"	۱۱۴۴ ہجری				صفحہ ۶۲ فورٹ ولیم کالج کلکتہ نیشنل آرکائیوز
۵۰	انگریزی					الگزینڈر ڈو ۱۷۶۸ء لندن ۳ جلدوں میں۔ دیکھیے اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند صفحہ ۵۷۴۔
۵۱	"					از سکاٹ۔ JONATHAN SCOTT ۱۷۹۹ء - do -

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۵۲	جرمن					از HORKMANN ۱۸۰۲ ہیمبرگ دیکھیے اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند صفحہ ۴۸، ۵۸۔
۵۳	بہاردانش	قلمی ۱۸۹۶ء	۳۵۴			محکمہ السنہ پنجاب کے MSS ۱۶۰ نمبر پر درج ہے۔
۵۴	‘‘					JERCATHA ZEIFRZIG نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔
۵۵	‘‘					فہرست نسخہ قلمی عربی۔ فارسی۔ اردو سبحان اللہ اورینٹل لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سنہ ۱۹۲۹ صفحہ ۵۱
۵۶	‘‘					بہاردانش از عنایت اللہ۔ مطبع حیدری ۴۰۸ صفحات ڈیمائی سائز ریفرنس سکشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری
۵۷	‘‘					مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری۔ دیکھیے فہرست مخطوطات انگریزی انڈیا آفس لائبریری۔
۵۸	‘‘		[illegible]	۴۳۹ ڈیمائی سائز	اردو نثر	نا بھوی کے پاس ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
[illegible]	بہار دانش		مطبع دار السلام ۱۲۶۴ ہجری	[illegible]	اردو نثر	نا بھوی کے پاس ہے۔
۶۰	″		مطبع علوی ۱۲۶۴ ہجری	۳۴۴ ۱۲	″	″ ″
۶۱	گلشن دانش ترجمہ بہار دانش		بکارخانہ شیخ نثار علی طبع	۱۸۵ [illegible]	″	″ ″
۶۲	بہار دانش				″	″ نا مکمل
۶۳	بہار دانش		مطبع مصطفائی ۱۳۰۷ ہجری	۲۸۸	فارسی	″
۶۴	″					عوض ہائے حسرت نے اسکا ترجمہ کیا۔ منظوم ہے۔ دیکھیے نوابی عہد میں ہندوؤں کا فارسی لٹریچر صفحہ ۱۸۲
۶۵	″	قلمی نسخہ ۱۵ مئی ۱۸۷۶ء		۲۳۸ ۱۰		پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ۔ صفحات ۲۳۸ نسخہ نمبر ۶۵۔
۶۶	″		مطبع ہند پریس	۲۷۰		نا بھوی کے پاس ہے۔
۶۷	″	قلمی			فارسی	پنجاب یونیورسٹی ریفرنس سکشن قلمی نسخہ بہ نمبر ۶۹۵۔
۶۸	″					پنجابی یونیورسٹی۔ لائبریری۔ پٹیالہ۔
۶۹	″		مطبع نول کشور	۳۸۸ ۱۰		″ ″
۷۰	″		مطبع دار السلام ۱۲۶۴ ہجری	[illegible]	فارسی	″ ″

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	سائز صفحات	مطبوعہ نام پریس	زبان	کیفیت
۷۱	بہار دانش		۳۶۴	مطبع علوی		پنجابی یونیورسٹی لائبریری۔ پٹیالہ
۷۲	”					سنٹرل لائبریری۔ پٹیالہ۔
۷۳	”	قلمی				مرآۃ العلوم جلد اول فہرست نسخ خطی اورینٹل پبلک لائبریری۔ بانکی پور
۷۴	”	”				بہ نمبر ۷۳۱۔ عنایت اللہ سیریل نمبر ۷۲ ایضاً
۷۵	”					بہ نمبر ۷۳۲، عنایت اللہ سیریل نمبر ۲۵۹، فہرست مطبوعات جلد دوم سبحان اللہ اورینٹل لائبریری علی گڑھ ۱۹۳۱ء۔ مولوی عنایت اللہ بہ نمبر قصص و حکایات

مقالات شبلی جلد دوم

یہ جلد مولانا شبلیؒ کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، اس کے ایک مضمون "بھاشا زبان اور مسلمان" میں دکھلایا گیا ہے کہ سنسکرت اور بھاشا زبان میں مسلمانوں نے کیا کیا تصنیفات کیں اور بھاشا کی شاعری میں کس درجے کا کمال پیدا کیا ہے۔ اس میں "تحفۃ الہند" کے نام سے بھی مولانا کا ایک مضمون شامل ہے۔ "تحفۃ الہند" میں ہندوؤں کا موضوع فن بلاغت عروض وقافیہ وغیرہ ہے۔ ان مضامین سے مسلمانوں کی بے تعصبی اور علمی فیاضی کا اندازہ ہوگا۔

قیمت ۱۵ روپے "منیجر"

غالب کا مذاق اجتہاد

از ڈاکٹر محمد حسین فطرت، بھٹکلی۔

غالب کی شاعری گلبانگ معانی اور گنجینۂ حقائق ہے سہ

گنجینۂ معانی کا طلسم اسکو سمجھیے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

غالب نے اپنے ایک مصرعے میں اپنی شاعری کا پورا تعارف کرایا ہے ع

سادگی و پُرکاری بیخودی و ہشیاری

غالب کی شاعری سادگی و پُرکاری اور بیخودی و ہشیاری کی متضاد و متخالف کیفیتوں کی آئینہ دار ہے اور یہی غالب کی شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہیں۔ غالب کی پہلودار شخصیت بڑی رنگارنگی اور تنوع کی حامل تھی۔ انکی نگاہِ حقائق آشنا نے کیسے کیسے اسرار و معارف سے نقاب کشائی کی، انھوں نے غم و انبساط کے گوناگوں معانی و مفاہیم کا سراغ لگایا۔ خواب و بیداری اور موت و حیات کی متعدد فلسفیانہ تاویلات بیان کی ہیں اور مختلف زاویہ ہائے نظر سے نور و ظلمت۔ خار و گل اور دشت و صحرا کی تعبیریں پیش کی ہیں، وہ انسانی نفسیات کے نباض اور رمز شناس تھے۔ ان کی شاعری میں کہیں شعلے کی حرارت ہے اور کہیں شبنم کی برودت و لطافت، جلال و جمال کے دلنشیں امتزاج نے غالب کی شاعری کو رنگ دیا اور حسن و رعنائی کا مرقع بنا دیا ہے۔ غالب کے نزدیک شاعری اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے

یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے غالب کی شاعری کو ہر قاری اپنے ہی دل کی
دھڑکن تصور کرتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مگر غالب نے جب معانی و مفاہیم کے نئے افق کا پتہ لگایا اور اپنے افکار کو
جدت و تنوع کی کہکشاں سے مزین و آراستہ کیا تو انکی بلندی فکر کے نقوش
ان کے زمانہ کے مروجہ فکری پیمانے سے متصادم ہو گئے۔ اس لیے انکی شاعری
اپنے اور بیگانے کے لیے معمہ بن گئی اور رموز غالب کی عقدہ کشائی سے لوگ
قاصر رہے۔ آخر کار غالب احباب کی ناقدریوں کے شکار ہو گئے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل انکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

غالب کے اجتہادی ذہن کو لکیر کا فقیر بننا قطعی گوارا نہ تھا۔ انکی پرواز تخیل نے
شاعری کے ہر موڑ پر فکر و استدلال اور بصیرت و فراست کے رنگ برنگ پھول
کھلائے ہیں اور مروجہ شاعری کے مطابق محبوب کے جور و ستم کا رونا رونے کے
بجائے ستم یار سے لطف اندوزی کا ثبوت پیش کیا ؎

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

غالب کی روایت شکنی تیشۂ فرہاد کی کوہ کنی کے مترادف ہے۔ کیونکہ انکو خامۂ معجز نما

کی جنبش سے حقایق و معارف کے کوہ گراں سے جوئے شیر لانے کا فن بخوبی آتا ہے۔
جدتِ فکر اور ندرتِ خیال کی چمن آرائی ملاحظہ ہو سے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے — پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
گر چھپے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

روایتی مضامین کا اعادہ غالب کے مجتہدانہ ذہن کے شایانِ شان نہ تھا۔ ان کی پوری شاعری مروجہ روایتی شاعری کے خلاف ایک صدائے احتجاج کے مترادف ہے۔ غالب کی جدت پسندی اور روایت شکنی کی یہ بھی ایک دلیل ہے کہ سرسید احمد خاں نے جب اپنی تازہ تصنیف دربارِ اکبری کی تقریظ کے لیے غالب سے گذارش کی تو غالب نے جدید تہذیب کا قصیدہ لکھ بھیجا۔ غالب کی جدت طرازی کی نامقبولیت کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ناسخ اور شاہ نصیر کا اسلوب بیان اس عہد میں مقبول و معروف تھا۔ ذوق جو ناسخ و نصیر کے مقلد تھے غیر معمولی مقبولیت اور ہر دلعزیزی سے سرفراز ہوئے اور غالب کے فکر و فن کا بول بالا نہ ہو سکا مگر غالب خود اپنی پیشین گوئی کے

مطابق مستقبل کے عظیم فنکار تسلیم کیے گئے۔ غالب نے کہا تھا ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

سچ پوچھیے تو غالب کی شاعری فردوسِ تخیل ہے۔ ان کی شاعری کے نگارستان میں گویا فردوسِ معانی کا دریچہ کھلا ہوا ہے ؎

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

اس شعر کی تشریح میں پروفیسر احتشام حسین کے یہ الفاظ پیش کرنا بہتر ہوگا۔ "حسن خود نیکی ہے۔ برکت ہے۔ حق ہے۔ سچائی میں حسن ہے اور عمل صالح حسن کا بدل یا حسن عمل ہے۔ سچائی نیکی اور خوبصورتی کے اس مثلث میں زندگی کا ہر دہ پہلو پوشیدہ ہے جس کا حصول موجب تسکین ابدی ہے۔ کیٹس نے جب حسن کو سچائی اور سچائی کو حسن کہا تھا تو وہ احساس کی نہیں فکر کی اسی منزل میں تھا۔

اسی طرح غالب نے فکر و خیال کو بے پناہ وسعت بخشی۔ بلندیٔ افکار میں غالب کا کوئی حریف نہ تھا۔ میر تقی میر کے یہاں بھی تخیل کی اتنی بلندی نہیں ہے جو اردو غزل کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ غالب کے فکر و فن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بے جان و بے حقیقت چیز کو ذی حقیقت اور معنی خیز بنا دیا۔ مثلاً سایہ کے متعلق کہتے ہیں ؎

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

غالب کے یہاں لفظ سایہ بے حسی، مایوسی اور تاریکی کا غماز نہیں ہے بلکہ سایہ ان کے نزدیک دھواں اٹھنے کے پھیلاؤ کی طرح ہے جس کی نقل و حرکت میں تگ و تازِ حیات پائی جاتی ہے ؎

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر　　تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

شوق، خواہش، آرزو، تمنا اور حسرت جیسے الفاظ غالب کے اشعار میں جا بجا پائے جاتے ہیں جو غالب کے مطمحِ نظر کو سمجھنے میں ممد و معاون ہیں ؎

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار　　کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب　　دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا　　قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ　　سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

غالب کے فکر و فن کی جدت طرازی بعد کے دور میں بہت مقبول ہوئی اور اردو شاعری کے بہت سے قافلے انکے نقشِ قدم پر جادہ پیما ہو گئے۔ مثال کے طور پر وحشت کلکتوی اور عزیز لکھنوی کو غالب کے پیچیدہ اور متنوع اندازِ فکر و فن کا ترجمان کہا جاتا ہے غالب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ وحشت کلکتوی کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ امتیازِ حسن ہے معنی و لفظ کا　　وحشت کو جس نے غالبِ دوراں بنا دیا

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف　　ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

مری ہستی کی کیا ہستی مگر اے دیدۂ بینش　　ذرا رنگینیاں تو دیکھنا اس نقشِ باطل کی

نغمۂ مطرب ہے عشق خانہ ویراں سازکا　　وہ نوائے درد جو مضمر شکستِ دل میں ہے

بیگانگی عیاں ہے گو آشنا ہے عالم　　نیم جہاں میں گویا حرفِ شنیدہ ہوں میں

مولانا ابوالکلام آزاد نے عزیز لکھنوی کے کلام پر تبصرہ اور غالب سے انکی اثر پذیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"آج کل مرزا غالب کی تقلید عام طور پر پسند کی جاتی ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرزا غالب کے خصائص صرف فارسی الفاظ و تراکیب کے کثرت استعمال اور بشدت توالی اضافات اور لفظی اشکال اور غرائب میں محدود ہیں۔ اس گمراہی نے بہت لوگوں کو اس درجہ سے بھی محروم کر دیا۔ جو بصورت عدم تقلید غالب وہ حاصل کر سکتے تھے۔ مرزا غالب کی اصلی خصوصیت ان کے محاسن معنوی ہیں۔ نہ کہ مجرد لفظی۔ فارسی الفاظ و معانی بالقصد نہیں ہیں۔ بلکہ بوجہ وسعت و بلندی فکر و عدم مساعدت تراکیب اردو۔ پس تقلید اس کی ہونی چاہیے۔ نہ کہ الفاظ کی۔ آپ (عزیز لکھنوی) اس گروہ سے بالکل الگ ہیں اور آپ کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال میں غلو اور افراط سے ہر جگہ اجتناب کرتے ہیں۔"

مولانا آزاد کا یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے۔ عزیز ان شعراء سے مختلف ہیں جنھوں نے غالب کے اسلوب شعری کی کورانہ تقلید کو اپنا وظیفۂ حیات بنایا۔ انکے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رگ رگ میں ذوق بادیہ گردی تھا اسقدر
ہر ذرہ میری خاک کا صحرائے گرد تھا

ہے فنا آموز ہر اک خط تری تحریر کا
رنگ اڑتا کھ رہا ہے پیکر تصویر کا

شوریدگی کے ذوق سے فارغ نہیں ہنوز
چھینٹیں لہو کی ہیں مرے سر میں بھری ہوئی

مذکورہ بالا حقایق کی روشنی میں غالب کو اردو شاعری کا مجتہد قرار دینا بیجا نہیں ہے کلام غالب کی معنویت کے آفاق ابھی سربستہ و پنہاں ہیں جن کو آنے والا دور نمایاں کریگا۔

ہے رنگ لالہ گل و نرگس جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

معارف کی ڈاک

مکتوب پیرس

پیرس، فرانس

۲۶ ستمبر ۱۹۶۹ء

مخدوم و محترم زاد مجدکم وعم فیضکم!

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ ابھی ابھی معارف کا تازہ شمارہ بابت ماہ مئی ۱۹۶۹ء ملا۔ ممنون بھی ہوا اور سرفراز بھی۔ اگر کسی اور سے کام بنتا تو آپ کو زحمت نہ دیتا۔ آپ نے ایک نئے (ہندی) ترجمۂ قرآن مجید کا ذکر فرمایا ہے۔ کیا آں محترم اطلاع دے سکتے ہیں کہ سورۃ المنافقون ۶۳/۴ کی آیت کا نہم خشب مسندۃ کا اس میں کیا ترجمہ ہوا ہے[1]؟ ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کے ترجمے دل کو نہیں لگتے۔ دیوار پر ٹیکے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں کو منافقین سے کیا شباہت ہے؟ مجھے پسند وہ ترجمہ ہے جو تاج العروس نے "مسندۃ" کے مادے میں دیا کہ وہ مالدار لوگوں کا شاندار لباس ہے نہ کہ استناد؛ جھکانا۔

حفظکم اللہ وعافاکم

خادم: الفقیر الی اللہ: ح

---

[1] ترجمہ کا جو حصہ خدابخش لائبریری سے شائع ہوا ہے اس میں سورۂ منافقون کا ترجمہ نہیں ہے۔ (معارف)

مکتوب لاہور

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۳ ستمبر ۱۹۹۴ء

مکرمی و معظمی جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب!

السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔ آپ کے دو خطوط یکے بعد دیگرے ملے تھے۔

آپ نے ماہ اگست کے شذرات میں بھارت کے مسلم معاشرے کی جن خرابیوں کی نشاندہی کی ہے۔ وہی خرابیاں کم و بیش ہمارے ہاں بھی راہ پاگئی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ملک سے باہر ملازمت کے حصول کی جان توڑ دوڑ لگی ہوئی ہے۔ لوگ مکانات گروی رکھ کر یا فروخت کر کے اجازت نامے (ویزے) حاصل کر رہے ہیں۔ والدین فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بیٹا خیر سے سعودی عرب یا لیبیا میں ملازمت کر رہا ہے۔ اس سے ملک میں نو دولتیوں (مترفین) کا ایک طبقہ ظہور میں آگیا ہے جو نمود نمائی اور اسراف میں حد سے بڑھ گیا ہے اور کسی حد تک مہنگائی کا بھی ذمہ دار ہے۔

پڑھے لکھے نوجوان امریکہ میں اعلیٰ تعلیم یا ملازمت کی خاطر گرین کارڈ کے حصول کے لیے سرگرداں رہتے ہیں اور یہ سرگردانی جنون بنتی جا رہی ہے۔

ہمارے ہاں کے "بڑے علماء" کا معیار زندگی کسی رئیس یا امیر کبیر سے کم نہیں۔ ان میں سے بعض حضرات اپنے بزرگوں کے کمالات بیان کر کے شکم پروری کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ اگر ایک جماعت صرف نماز کی دعوت دیتی ہے تو دوسرا گروہ صرف صلوٰۃ و سلام کے فضائل و مناقب بیان کرتا رہتا ہے۔ خدمت خلق اور حقوق العباد کی پاسداری کی کوئی بھی تلقین نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے سے محبت، ہمدردی،

خیر خواہی اور غمخواری کے جذبات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ بیگانگی کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک گھر میں میت پڑی ہوئی ہے تو ہمسائے میں ٹیلی ویژن پر فلمی گانے لگے ہوئے ہیں۔ لاہور کی جدید اور فیشن ایبل بستیوں کا یہ حال ہے کہ اڑوس پڑوس میں رہنے والے ایک دوسرے کی صورت سے ناآشنا رہتے ہیں۔

قوم کی اکثریت خود غرض، خود پسند اور خود گزیں ہوتی جا رہی ہے۔ ایک آدمی کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے مال و دولت کے تناسب سے لگایا جاتا ہے اور اس کی تعظیم و تکریم اس کی سیاسی اہمیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ بس پیسہ ہی پیسہ ہمارا دین و ایمان بنتا جا رہا ہے۔ آرام طلبی، تساہل پسندی، کام چوری اور ڈیوٹی (فرض) سے گریز اور پہلوتہی جیسے مفاسد وبائی امراض کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم پر اپنا رحم نازل فرمائے اور ہمیں ہر بلا اور فتنہ سے محفوظ رکھے۔

فقط والسلام ؛ نیاز مند

(شیخ) نذیر حسین

مکتوب بریلی

۳۰۔ پھول والان، بریلی

۳ ستمبر ۹۶ء

میرے محترم ! السلام علیکم

میں نے آپ کا مضمون "مولانا ابوالجلال ندوی کی یاد میں" (معارف اگست ۱۹۹۶ء) بہت شوق سے پڑھا۔ میں مولانا کا پرانا معترف ہوں۔ مولانا کے جو مضامین ماہ نو کراچی میں شائع ہوئے تھے انکی تفصیل مندرجۂ ذیل ہے :

۱۔ نقوش صحرا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء۔ سات اہل کے حوالے سے قرآن کے مقطعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ حقیقی جمہوریت، ایک نعمت عظمیٰ۔ دسمبر ۱۹۵۹ء۔ بنیادی جمہوریت کا جائزہ قرآنی تعلیم کی روشنی میں لیا گیا ہے۔

۳۔ بلوچی ظروف پر نقوش۔ جون ۱۹۶۰ء۔ ان نقوش کا جنوبی عرب کے قدیم رسم خط یعنی سند کے حوالے سے مطالعہ کیا گیا ہے۔

۴۔ نقش سلیمانی، قدیم سندھی رسم خط کی روشنی میں۔ دسمبر ۱۹۶۱ء۔ نقش سلیمانی کے سات نقوش پر بحث کر کے ان کے معنی بتائے گئے ہیں اور نقش سلیمانی کے اسم الٰہی اور ایک مقدس جز ماننے سے انکار کیا گیا ہے۔

مولانا کے اور بھی مضامین ماہ نو کراچی میں شایع ہوئے ہوں گے۔ لیکن میرے پاس مذکورہ بالا مضامین ہی ہیں۔

آپ نے اپنے مضمون کے آخری پیراگراف میں جو لکھا وہ درست اور ضروری ہے۔ میری رائے میں آپ ہی سعی فرمائیں۔ مولانا کے مضامین کی اشاعت سے علمی دنیا کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

احقر العباد

لطیف حسین ادیب

معارف: ماہ نو میں مولانا ابوالجلال صاحب کے مندرجہ ذیل مضامین بھی شایع ہوئے ہیں۔

۱۔ سندھی مہریں، اگست ۱۹۵۶ء تا دسمبر ۱۹۵۶ء (پانچ اقساط)

۲۔ پیکران بے سخن، مارچ ۱۹۵۸ء۔

۳۔ سند نام کی بستیاں، مارچ ۱۹۵۹ء۔

۴۔ سندھی ظروف پر نقوش، مارچ ۱۹۶۱ء

اس کے علاوہ ماہی "تاریخ و سیاسیات" (کراچی) نومبر ۱۹۵۳ء میں "موہن جوداڑو کی زبانیں" شایع ہوا تھا۔

مکتوب اسلام آباد

اسلام آباد
۱۰ ستمبر ۱۹۹۶ء

محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ! السلام علیکم

میں مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم کا بھتیجا ہوں اور مولوی ابوالحسنات صدیقی کا سب سے چھوٹا بیٹا۔ آج کل انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں افسر تعلقات عامہ ہوں۔ اس ادارے کے سربراہ جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر پروفیسر خورشید احمد سینیٹر ہیں۔ معارف اس ادارے کی لائبریری میں آتا ہے۔

اگست ۹۶ء کے شمارے میں مولانا ابوالجلال ندوی کے بارے میں آپ کا مضمون پڑھا۔ خود ہمارے علم میں بھی بے حد اضافہ ہوا لیکن چند باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ مولوی ابوالحسنات صدیقی میرے والد۔ مولانا ابوالجلال ندوی کے چھوٹے بھائی تھے، بڑے بھائی نہیں تھے جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کی تعلیم مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں ہوئی تھی۔ ان کا انتقال مولانا ابوالجلال کے انتقال سے کافی پہلے ۱۷ دسمبر ۷۱ء کو ہوا تھا۔ وہ سقوط مشرقی پاکستان کا صدمہ نہ سہہ سکے تھے۔ محمود اعظم فاروقی مولانا کے حقیقی بھانجے نہیں تھے۔ مولانا کے بھانجے حکیم یامین صدیقی اور ان کے کئی بھائی ہیں۔ حکیم یامین صدیقی اور محمود اعظم فاروقی

دونوں اعظم گڑھ کے گاؤں علی پور سرسینہ کے رہنے والے تھے۔ اس بنا پر محمود اعظم فاروقی ان کو ماموں کہا کرتے تھے۔

جنید صغیر صدیقی آج کل انگلستان سے پی ایچ ڈی کر کے جامعہ کراچی میں شعبۂ شماریات کے استاد ہیں۔

جس ہفت روزے کا آپ نے "جہان" کے نام سے ذکر کیا ہے وہ ادارہ جنگ کا مشہور ہفت روزہ "اخبار جہاں" ہے۔ اس ہفت روزے کے لیے انٹرویو کا اہتمام میں نے کروایا تھا۔ جو اخبار جہاں کے اُس وقت کے ایڈیٹر نثار احمد زبیری نے کیا تھا۔ جو آج کل اسلامی یونیورسٹی ملائیشیا میں صحافت کے استاد ہیں اور انٹرویو جناب رضی الدین نے لیا تھا جو آج کل ماہنامہ سائنس ڈائجسٹ کے ایڈیٹر ہیں۔ اس انٹرویو کو لکھنؤ کے ایک رسالے تعمیر حیات نے شایع کیا تھا۔

پنڈت جواہر لال مولانا ابو الجلال کو مولانا اُدل جلول کہتے تھے۔ ابو الجلول نہیں کہتے تھے۔ جیسا کہ اس مضمون میں آپ نے لکھا ہے۔ اکلوتے صاحبزادے والی بات بالکل درست ہے۔

یہ بات بھی درست ہے کہ وہ پاکستان کی تحریک کے مخالف تھے جب یہاں (پاکستان میں) لوگوں نے کہا کہ آپ یہاں کی سیاست میں حصہ لیں تو انھوں نے جواب دیا کہ جب ہم نے اس کی مخالفت کی تھی تو یہاں کی سیاست میں حصہ لینا کہاں کی دیانت داری ہے۔ انھوں نے کبھی خود نمائی سے کام نہیں لیا بلکہ حد درجہ بے اعتنائی سے کام لیا، اس کا احساس مجھے ان کے انٹرویو کے اہتمام میں ہوا تھا۔

البتہ وہ کانگریس کے کبھی ممبر نہیں رہے۔ جبکہ میرے والد مسلم لیگ کے شدید حامی تھے لیکن وہ مولانا کے پاکستان آنے کے بعد پاکستان آئے۔ یہ مقالہ میرے لیے ایک ایسی علمی دستاویز ہے جس پر میں اور میرے عم زاد بھائی جنید صغیر صاحب بلاشبہ فخر کر سکتے ہیں۔ آپ سے میری ملاقات بھی ہو چکی ہے جب میں ہندوستان آیا تھا تو میرے بڑے بھائی اور میں آپ سے مولانا عبدالباری سے اور مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے ملے تھے۔ میں نے تب وہاں کتبہ لگے میں نصب ایک قدیم مولانا ابوالجلال کے نام کا بھی دیکھا تھا۔ اس پر کیا تحریر ہے اگر اس کے بارے میں کچھ پتہ چل جائے تو بہتر ہو۔ مولانا کی جو تحریریں آپ کے یہاں موجود ہیں کم ازکم ان پر مشتمل کوئی کتاب شایع کر سکتے ہوں تو کر دیجئے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ مولانا کی کوئی کتاب تو شایع ہو۔ لیکن مالی وسائل اجازت نہیں دیتے اور علم سے محبت کی کمی نے اس کام کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ بہرحال میں نے ایک اکیڈمی مولانا ابوالجلال ندوی اکیڈمی کے نام سے بنائی ہے۔ اسکے ارکان میں فی الحال تو میرے بڑے بھائی احمد حاطب صدیقی، جنید صغیر صدیقی، یحییٰ ابن ذکریا صدیقی (مولانا کے نواسے) اور میں وجیہ احمد صدیقی شامل ہیں لیکن یہ اکیڈمی فی الحال فعال نہیں ہے۔ اگر آپ کچھ رہنمائی فرمائیں تو ہم اپنی ترجیحات کا تعین کر لیں گے اور مولانا کا کون سا کام پہلے منظر عام پر آنا چاہیے اس سلسلے میں فیصلہ کر لیں گے۔

آپ کے خط کا منتظر

والسلام، وجیہ احمد صدیقی۔

وفیات

مولانا سید اخلاق حسین دہلوی

افسوس گذشتہ ماہ مولانا سید اخلاق حسین دہلوی کی رحلت سے علم و ادب اور دلی کی تہذیب و شرافت کا ایک روشن نقش بھی مٹ گیا۔

وہ سنہ ۱۹۰۶ء میں دہلی کے ایک معزز سادات عالیات کے خاندان میں پیدا ہوئے، ان کے پردادا سید علی بغدادی محمد شاہ کے زمانہ میں بغداد سے دہلی تشریف لائے، ان کے پوتے اور مرحوم کے والد ماجد محمد ابراہیم حسین کا شمار دلی کے نامور شرفاء میں ہوتا تھا، سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ ان کے رشتہ کے چچا تھے اور مولانا دہلوی کے بھائی حکیم سید حسین دہلوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دلی کی تہذیب و معاشرت کے شاید آخری کامل نمونہ تھے۔ ان کا انتقال کچھ عرصہ قبل ہوا۔ پہلے عرب سرائے دلی کے شرفاء کی قابل احترام بستی تھی، گردش روزگار سے جب یہ اپنے مکینوں سے خالی ہوئی تو اس کے آثار و باقیات کو سخت حالات کے باوجود ان دونوں بھائیوں نے قائم رکھنے کی سعی کی اور اس کے قبرستان و مسجد کی تولیت ان ہی کے ہاتھوں میں رہی۔

خاندان کے علمی ماحول کے اثر سے سولہ برس کی عمر ہی میں مولانا اخلاق دہلوی کے قلم سے ایک کتاب نکلی۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے میرٹھ کے قصبہ بڑھوت کے ایک کالج میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے، اسی زمانے میں انھوں نے درسیات کا

سلسلہ شروع کیا جیسے مضمون نگاری، میزان سخن، خلاصہ مصباح القواعد اور شمیم بلاغت وغیرہ۔ اردو کالج دہلی کے طالب علموں کی سہولت کے لیے مولانا امام بخش صہبائی کی کتاب حدائق البلاغت کی تلخیص روح بلاغت کے نام سے کی، یہ سب کتابیں مقبول ہوئیں اور طلبہ کے علاوہ عام اردو خواں طبقہ کو بھی اس سے فائدہ پہنچا، مولانا کی علمی و تحقیقی کاوشوں کا موضوع خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سوانح اور مشائخ چشت کے ملفوظات ہیں، حضرت امیر خورد سید محمد کرمانی کی سیر الاولیاء میں الحاق و تحریف کا احساس اہل نظر کو تھا لیکن حقائق سے روشناس کرانے کی سعادت علامہ مرحوم کے حصہ میں آئی اور اہل علم نے اسے نگاہِ تحسین سے دیکھا، بعد میں انہوں نے حیات طیبہ حضرت محبوب الٰہی کے نام سے ایک کتاب لکھی جو مستند ہونے کے علاوہ مولف کے جذبۂ خلوص اور شائستہ و شستہ انداز تحریر کا نمونہ ہے، اس میں ایک جگہ انہوں نے سیر الاولیاء کے متعلق لکھا کہ "اسلوب بیان سبحان اللہ، کیا سادہ و پُرکار ہے کہ داد نہیں دی جاسکتی، طرز ادا شائستہ اور بیان سلجھا ہوا ہے، روانی اور بے ساختگی سے مالا مال، مطالب کا یہ عالم ہے کہ مونھ سے پڑے بول رہے ہیں، جیسے موتیاں کی لڑیاں اور لفظ ڈھلکتے ہوئے موتی ہیں، معرفت کی رنگ آمیزی سے اسلوب کا رنگ چوچہا اٹھا ہے"۔ حق یہ ہے کہ یہی تعریف ان کی کتاب پر بھی صادق آتی ہے، پوری کتاب ایسے ہی حسین اور دلکش جملوں سے آراستہ ہے۔ مثلاً ایک جگہ امیر التبلیغ مولانا محمد یوسف کے متعلق لکھا کہ "نفوذ و ہیبی کا یہ عالم ہے کہ کٹر سے کٹر بھی دو چار ملاقات میں گرویدہ ہو جاتا ہے"۔ ایک جگہ سجادہ نشینی و آستانہ نشینی کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ "خلاصہ کلام یہ ہے کہ سجادہ نشینی اور آستانہ نشینی میں،

زمین و آسمان کا فرق ہے بلکہ وہی فرق ہے جو نانی اور جانی میں ہے، سجادہ نشین فرزند جانی ہوتا ہے، دونوں میں امتیاز نہ کرنا کھلا جہل ہے"۔ اس کتاب کے حواشی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو دلی کے قدیم خانوادوں کی تاریخ پر کس درجہ عبور حاصل تھا۔ ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "آئینہ ملفوظات" ہے، خواجگان چشت کے ملفوظات کے متعلق جب ایک حلقہ میں یہ بحث شروع ہوئی کہ وہ جعلی و الحاقی ہیں تو وہ کبیدہ خاطر ہوئے اور پھر معارف ۱۹۷۰ء کی کئی قسطوں میں انھوں نے "مطالعہ ملفوظات خواجگان چشت کے مبادیات" کے نام سے ایک بلند پایہ تحریر سپرد قلم کی، بعد میں یہ کتابی شکل میں بھی شایع ہوئی ان کے علم و مطالعہ، حسن استدلال اور زبان و بیان کی صفائی کا یہ بہترین نمونہ ہے، خود ان کو بھی اس کا احساس تھا کہ "اگرچہ معاندین کے تحقیر آمیز اشتعال انگیز پیدا کر سکتے تھے لیکن میں نے دلی کی قدیم تہذیبی روایات کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑا نہیں اور ترکی بہ ترکی جواب نہیں دیا، یہی آئین تصوف کا اقتضا بھی ہے"۔

آخر عمر میں انھوں نے "ویدک دھرم اور اسلام" کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی، اس میں انھوں نے ویدک دھرم کے آسمانی مذہب ہونے اور ویدوں اور شاستروں کی تاریخی و مذہبی حیثیت پر دلچسپ بحث کی، معارف میں تبصرہ کے لیے یہ کتاب آئی لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں اس پر تبصرہ نہیں آسکا۔

معارف اور دار المصنفین کے وہ قدر داں تھے اور محبت کا تعلق رکھتے تھے، ایک بار ایک خط میں بڑی اپنائیت سے لکھا کہ "معارف کی کتابت و طباعت

کا وہ معیار نہیں رہا جو تھا، کاتب صاحب احتیاط سے کام لیں، قلم جما کر لکھیں اور اشکال صحیح بنائیں، نوک پلک کا بھی خیال رکھیں، شین مین صاحب روشنائی میں وارنش کی آمیزش گوارا کریں تو معیار پہ آ جائے گا، بقول مہدی افادی پیکر جمیل بہ لباس حریر ہی دل کو بھاتا اور لبھاتا ہے۔"

اب دلی کی ٹکسالی منجھی اور صاف زبان لکھنے والے ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے، مولانا مرحوم ان کی آخری یادگار تھے۔ ان کو دیکھنے والے ان کی تہذیب و شرافت، زندہ دلی اور مجسم اخلاق ہونے کے گواہ ہیں۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی غارت گری کے زمانہ میں ان کا کل اثاث البیت لٹ گیا، گھر پر غیر قابض ہو گئے، لیکن جس سرمایہ کے لٹنے کا غم ان کو آخر تک رہا وہ انکے بزرگوں کا اندوختہ اور صدیوں کے بیش بہا نوادر کا ذخیرہ اور ان کی زندگی کا آسرا ان کا کتب خانہ تھا، یہ ایسا برباد ہوا کہ پھر ایک پرزہ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر اپنے فضل و کرم کی ردائے خاص کا سایہ کرے، آمین۔

ع۔ ص۔

مطبوعات جدیدہ

مونس الارواح تالیف شہزادی جہاں آرا بیگم، تصحیح و مقدمہ از جناب قمر جہاں بیگم، متوسط سے قدرے بڑی تقطیع، بہترین کاغذ اور نہایت عمدہ کتابت و طباعت، مجلد صفحات حصہ فارسی ۱۴۳ اور حصہ انگریزی ۱۰۲، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: ۲-اے ۱۷/۷، ناظم آباد کراچی ۱۸، پاکستان۔

مونس الارواح، جہاں آرا بیگم کی مشہور و مقبول کتاب ہے۔ جس کا موضوع خواجہ معین الدینؒ اجمیری چشتی اور ان کے سلسلہ سلوک کے مزید پانچ مشائخ کے حالات و سوانح ہیں اس کتاب سے جہاں مشائخ چشت سے شہزادی جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں بادشاہ کی عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اس کی علمی لیاقت اور تصنیفی صلاحیت بھی ظاہر ہوتی ہے، اس کتاب کے صرف چار قلمی نسخے موجود ہیں جن میں ایک نہایت خوبصورت و بیش قیمت نسخہ کتب خانہ دار المصنفین کی زینت ہے، اب پاکستان سے قمر جہاں صاحبہ نے اس کا متن تصحیح و تحشیہ کے بعد اپنے مفید مقدمہ کے ساتھ شایع کیا ہے، انھوں نے فارسی کے علاوہ انگریزی زبان میں شہزادی کے مفصل حالات بھی تحریر کیے ہیں مونس الارواح میں جا بجا اشعار کے موتی بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ خود جہاں آرا کے ہیں، لیکن مقدمہ نگار نے ایک رباعی کے متعلق یقین سے لکھا کہ یہ مولانا جامی کی ہے، دوسرے اشعار بھی ان کے خیال میں اوروں کے ہوں گے، بہتر ہوتا کہ ان کی باقاعدہ تخریج کرکے اصل شاعروں کے ناموں کی تعیین

کردی جاتی۔ اس کتاب کی کتابت و طباعت اور جلد وغیرہ مونس الارواح کے شایان شان ہے۔

مولانا آزاد کا قیام رانچی احوال و آثار مرتب جناب جمشید قمر متوسط

تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۱۵، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

بہار کے شہر رانچی کو مولانا ابوالکلام آزاد سے خاص نسبت ہے، اپنی پہلی نظر بندی و جلاوطنی کے عالم میں انہوں نے اسی زمین پر وہاں کے مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح عقائد اور تبلیغ دین کا فریضہ انجام دے کر سنت یوسفی کا احیاء کیا اور اس خوبی سے کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی "رانچی کی شوروسنگلاخ زمین ان کے سحر زبان اور جادوئے بیان سے پانی ہوگئی"، خوشی کی بات ہے کہ رانچی کے اہل علم و نظر نے مولانا کی یاد میں مولانا آزاد اسٹڈیز سرکل قائم کیا اور اب اسی کی جانب سے زیر نظر کتاب شایع ہوئی، اس میں لائق مولف نے مولانا آزاد اور رانچی کے تعلق سے تمام تحریروں کو بڑے سلیقہ سے یکجا کردیا ہے، 'احوال' کے زیر عنوان مولانا کے بعض معاصرین کی تحریریں ایک حصہ میں ہیں اور 'آثار' کے تحت مولانا کے مکاتیب اور انکی نمایندہ تحریروں کا انتخاب ہے، کتاب کا ایک اہم حصہ نوادر کا ہے۔ جس میں لائق مولف نے مولانا کے ان مراسلات کو پیش کیا ہے جو انہوں نے حکومت بہار و اڑیسہ کے چیف سکریٹری اور رانچی کے ایس۔ پی کو اردو میں لکھے تھے، ان خطوط کے عکس بھی دیے گئے ہیں، مولانا آزاد کے عقیدتمندوں اور قدردانوں کے لیے یہ کتاب مطالعہ و استفادہ کے لائق ہے۔

ع۔ ص۔

جلد ۱۵۴ ماہ جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۴ء عدد ۵

مضامین

مقالات

استفسار و جواب

آثار علمیہ و ادبیہ

نومبر ۱۹۹۳ء

شذرات

دنیا کی تاریخ بارہا یہ ہوا ہے کہ قوت و اقتدار کے نشہ اور اکثریت کے گھمنڈ میں پروپگنڈا کے زور سے سیاہ کو سفید، جھوٹ کو سچ اور افسانہ کو حقیقت بنادیا گیا ہے، جبر و قہر اور والوں نے اپنی دھاندلی اور عیاری سے اپنی جارحیت و زیادتی کو بھی حق و انصاف امر ہوا ہے اور اپنی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی سے اپنے جرم و خطا کو صحیح و ثواب اور بے گناہ و بے خطا کو مجرم اور قصور وار ثابت کر دیا ہے، نصف صدی سے اس ملک میں یہی کہانی دہرائی جارہی ہے، اکثریت کے فرقہ پرست، شرپسند اور فتنہ پرداز لوگ ظلم و تشدد اور ناانصافی و زیادتی کے مرتکب ہونے کے باوجود اپنی چرب زبانی اور ملمع کاری سے معصوم، بے گناہ اور عدل و انصاف پسند بنے ہوئے ہیں اور جو لوگ ان کی جارحیت، شرپسندی، فتنہ انگیزی اور تشدد کا برابر نشانہ بنے ہوئے ہیں، وہ ان کے زور بیان اور کٹ حجتی سے تمام تر خطاکار اور گنہگار سمجھے جاتے ہیں، یہ امن و امان اور آئین و قانون کو درہم برہم کر کے بھی آئین پسند اور ہنرمند کہلاتے ہیں اور قانون کی بالادستی تسلیم کر کے ملک پر جان نچھاور کرنے والوں کو آئین شکن اور مجموعۂ عیوب قرار دیا جاتا ہے۔

اس کی مثالیں بہت ہیں، سب سے نمایاں اور تازہ مثال بابری مسجد کی ہے جس کو رام جنم بھومی قرار دینے کی کوشش نہایت شد و مد سے جاری ہے اور اس بالکل ہی بے سر پیر کی بات کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے نہ جانے کتنی مختلف و متضاد باتیں کہی جارہی ہیں کیونکہ ایک غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے سینکڑوں من گھڑت اور جھوٹی باتیں کہنی پڑتی ہیں، لطف یہ ہے کہ فرقہ پسند اور جانبدار انتظامیہ اور فسطائی جماعتیں ہی یہ کارنامہ انجام نہیں دے رہی ہیں بلکہ نام نہاد سیکولر جماعتوں کے افراد بھی اپنا کرتب پوری مہارت سے

دکھا رہے ہیں اور انہی بازیگروں اور کرتب بازوں نے بالآخر مسجد کو مسمار کرادیا جو اس ٹکنیک سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جس طرح جھوٹ کو مسلسل سچ کہتے رہنے سے آخر کار عام لوگ بھی اسے سچ باور کر لیتے ہیں، اسی طرح بابری مسجد کو بھی بار بار رام جنم بھومی کہنے سے ایک نہ ایک دن وہ واقعی رام جنم بھومی بن ہی جائے گی، ان کے زور زبردستی، عیاری اور کٹ حجتی کے سامنے ساری دلیلیں اور معقول باتیں ہوا ہو جائیں گی۔

عام لوگوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے لیکن اخلاق و قانون کو بالائے طاق رکھ کر بابری مسجد کو رام مندر بنانے کی کوششیں ایسے بھونڈے اور ڈرامائی انداز سے ہوئی ہیں کہ مسجد کے سارے واقعات ذہنوں میں محفوظ ہو گئے ہیں، انکو دہرانا بیکار ہے، اس وقت ہم سپریم کورٹ کے فیصلے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، اس کی جو تفصیل اخباروں میں شایع ہوئی ہے اس سے یہ صاف عیاں ہے کہ مسمار ہونے کے بعد بھی بابری مسجد کو خواب و خیال اور افسانہ بنا دینا آسان نہیں ہے، زور و زیادتی دھاندلی اور دغابازی اور فریب و مکاری سے اسے رام جنم بھومی بنانے کی راہ میں رکاوٹیں اور دشواریاں حائل ہو گئی ہیں، ڈھٹائی بے شرمی اور بے حیائی کی بات الگ ہے ورنہ مسجد و مندر کے نام پر شورش، ہنگامہ اور ہیجان برپا کر کے ملک کے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کا منصوبہ خاک میں مل گیا ہے، اس کے مقابلہ میں کمزوروں، بے بسوں اور مظلوموں کو حوصلہ ملا ہے اور عدالت پر ان کا اعتماد بحال ہوا ہے، ۶ دسمبر ۹۲ء کو مسجد ڈھاکر درندہ صفت لوگوں نے وطن عزیز کو ساری دنیا میں ذلیل و رسوا کر دیا تھا، مگر ۲۴ اکتوبر ۹۴ء کے فیصلے نے انکی مجرمانہ غیر ذمہ دارانہ اور غیر آئینی حرکتوں کو بے نقاب کر کے ملک کا وقار بلند کیا ہے۔

عدالت عالیہ نے ابھی مسجد مندر تنازع کا فیصلہ نہیں کیا ہے اور وہ یہ کر بھی نہیں سکتی تھی، اس سے تو صرف یہ رائے طلب کی گئی تھی کہ کیا مسجد کی جگہ پر پہلے کوئی مندر تھا یہ بات

دینا مورخین، محققین اور آثار قدیمہ کے ماہرین کا کام ہے اور وہ اس کا واضح اور مدلل جواب دیتے رہے ہیں جس کا علم ارباب حکومت کو اچھی طرح ہے مگر وہ حقائق سے آنکھ بند کرکے صرف مسئلے کو الجھانا اور سیاسی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں، حکومت کی بدنیتی کا اندازہ عدالت کو بھی ہوگیا تھا اگر وہ واقعی نیک نیت ہوتی تو سپریم کورٹ سے اصل نزاع کا تصفیہ کراتی مگر اس نے مسجد اور اس سے متصل آراضی کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مسجد کی جگہ پر ہی مندر بنانے کا تہیہ کیے ہوئے ہے، عدالت نے گو زمین اکوائر کرنے کو درست مانا ہے لیکن حکومت کو صرف رسیور کا درجہ دیا ہے جس کے بعد نہ رام للا ٹرسٹ کو مسجد کی جگہ پر مندر بنانے کا استحقاق ہے اور نہ وشو ہندو پریشد کو۔ سپریم کورٹ نے عدالت یا گفت وشنید کو حق ملکیت کے تصفیہ کی راہ بتا کر واضح کر دیا ہے کہ عقیدہ و مذہب سے اجودھیا کے مسئلہ کا کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن گفت وشنید کا تجربہ تو کئی بار ناکام ہو چکا ہے اس لیے اب عدالت کا بے لاگ فیصلہ ہی اس کا حل ہے، جس میں حکومت کے لیے مزید تاخیر و تعویق مناسب نہیں ہے۔

اس وقت کے وزیراعلیٰ اترپردیش کو توہین عدالت کے جرم کی علامتی سزا اس کا ثبوت ہے کہ کوئی شخص عدالت و قانون سے بالاتر نہیں ہے، کسی ریاست کے وزیراعلیٰ کو توہین عدالت پر جیل اور جرمانہ کی سزا کا یہ پہلا واقعہ ہے، ملک کی بدقسمتی ہے کہ مجرم بھی ہیرو بن جاتے اور راستے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں، ان کو تو انتخاب ہی کے لیے نااہل قرار دیا جانا چاہیے تھا، ممکن ہے آیندہ اسکی بھی سزا پا جائیں، یہ تو جولائی ۱۹۹۲ء میں عدالت کے حکم امتناعی کے باوجود بابری مسجد کی ملحقہ زمین پر چبوترہ تعمیر کرانے کی سزا ہے، ان پر عدالت کو متواتر یقین دہانیوں کے باوجود ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو مسجد گرا دینے کا جو مقدمہ قائم ہے، اس کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔

شذرات لکھے جا چکے تھے کہ راقم کے والد حاجی عبدالرحمٰن صاحب وفات پاگئے، اِنَّا لِلّٰہِ الخ، ۱۸ نومبر کو جمعہ کی نماز کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی، قارئین معارف سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

مقالات

مغربی افکار کی یورش اور علامہ شبلی کا کارنامہ

از مولانا حبیب ریحان خاں ندوی ازہری بھوپال

ہندوستان متعدد مذہبوں، ذاتوں، زبانوں اور رواجوں کا ملک تھا، غیر اللہ کی پرستش کے جتنے نت نئے اور متنوع طریقے یہاں رائج تھے وہ کسی اور خطۂ زمین میں نہیں تھے۔ چودہ سو سال پہلے جب جزیرۂ عرب میں اسلام کا ظہور ہوا تو وہاں بھی غیر اللہ کی پرستش کی جاتی تھی۔ اسلام نے عقائد صحیحہ کو پھیلا کر انسانوں کو اپنے خالق اور اپنی ذات کا عرفان بخشا۔

ہندوستان میں اسلام | جزیرۂ عرب کی حدود سے نکل کر اسلام کا پیغام ساری دنیا میں پھیل گیا، خدا نے وعدہ فرمایا تھا کہ "لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ" اس کی تعمیل میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور عظیم خلفائے اسلام نے اس دین حق کو دلائل و براہین اور قوت و طاقت سے ظاہر و غالب کیا، اوائل عہد صحابہ ہی میں سرزمین ہند تک اسلام کا پیغام پہنچ چکا تھا اور بنو امیہ کے دور میں حجاج بن یوسف کی وساطت سے محمد بن قاسم نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں اس سرزمین پر خدا کی توحید کا کلمہ بلند کیا، اسی زمانہ میں افریقہ و ایشیا کی آخری حدود چین و مراکش تک بھی اسلام کا نور پہنچا

اور یورپ میں اسپین بھی اس دولت سے محروم نہ رہا۔

اُس وقت جد و جہاد اور اجتہاد کی روح کارفرما تھی اور صحیح اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر عمارت کھڑی ہو رہی تھی، نہ عجمی افکار و عقائد نے اسلام کے آبِ زلال کو گندلا کیا تھا اور نہ انکے زہر نے دینِ اسلام میں اپنی مہلک تعلیمات کے اجزاء ملا کر اس کے چشمۂ شیریں و فرات کو کڑوا اور زہریلا بنایا تھا، اسلام قوت و اقتدار کے بجائے اپنی ذاتی اور داخلی اعلیٰ دینی، اخلاقی، اجتماعی اقتصادی اور انسانی تعلیمات کی بنا پر پھیلتا چلا گیا۔

ادبار و تنزل کا سایہ

پھر زمانہ نے کروٹ بدلی، ایک دن وہ تھا کہ اسلامی تعلیمات نے کفر و شرک و طاغوت کو ختم کیا تھا، اسلامی وحدت نے دلوں کو جوڑا تھا، اسلامی مساوات کے کامیاب تجربے نے اہلِ ہند کو تکریم انسانی اور مساوات بنی نوع آدم کا سبق پڑھایا تھا لیکن ادبار و تنزل کے سایے جب بڑھنے لگے تو توحید کے چشمۂ صافی میں شرک کی آمیزش ہوئی، غیر اللہ کی پرستش کے نت نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ عبادت و استعانت میں فرق قرآن و سنت میں موجود نہیں تھا لیکن اس کو فلسفیانہ انداز سے واضح کیا گیا۔ خدا کو الوہیت و خالقیت کی صفات سے متصف کرنے کے باوجود استمداد و استعانت و ربوبیت یعنی کارخانۂ ہستی پر اقتدار و تسلط کی ساری صفات اس سے زبانی نہ سہی لیکن عملاً سلب کر لی گئیں اور دوسری زندہ یا مردہ شخصیتوں کو سونپ دی گئیں مساواتِ اسلامی کے بجائے تہذیب وطنی سے نسب و حسب پر فخر کی داستانیں شروع ہوئیں، روحِ جد و جہاد و اجتہاد میں کمی واقع ہوئی، تقلیدِ محض کی بادشاہت عقائد و اعمال میں بڑھتی گئی، تکفیر و تفسیق کی گرم بازاری ہوئی اسلاف کے

جہاد کی حقیقت روپوش ہوگئی، حلم وکرم کے جذبات ختم ہوتے گئے اور کلی اسلام پر عمل پیرا ہونے سے گریز کیا گیا۔

مسلمانوں کی غفلت اور ان کے سامراجی مغربی دشمنوں کی چالاکی اور جنگی قوت سائنسی ترقی اور بے شمار اسباب کی بنا پر جزوی سامراجی تسلط شروع ہوا جو آخر کار انگریزوں کے مکمل اقتدار اور مسلمانوں کی صدیوں پر مشتمل حکمرانی کے زوال اور خاتمہ پر منتج ہوا۔ خدا کا رشتہ کسی قوم سے اس طرح پختہ نہیں ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کے محبوب رہیں گے، وہ محبوبیت کا حق ادا کریں یا نہ کریں کسی بھی باعزت قوم کو برباد کر دینا خدا کے قانون تکوینی میں ایک معمولی بات ہے" وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا"

امت کا ہر طبقہ ذمہ دار ہے

اسلامی سلطنت کے زوال کے اسباب بے شمار ہیں اور ہر فلسفی مورخ اور صاحب رائے اپنے انداز فکر کے مطابق اس پر تبصرہ کرتا ہے، کوئی اس کا ذمہ دار صرف حکام کو گردانتا ہے کہ انہوں نے روح جہاد وعسکریت کو ختم کیا، کوئی عوام کو کہ ان میں بے دینی وبے حمیتی پھیل گئی تھی، کوئی علماء کو کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غافل تھے، کوئی بزرگان دین کو کہ انہوں نے پہاڑوں اور غاروں اور گھروں میں بیٹھ کر گوشۂ عافیت کو ترجیح دی اور اصلاح حال کا نبوی طریقہ جاری نہیں کیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک گروہ پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی بلکہ ہندوستان کی پوری امت اسلامیہ کی غفلت کا یہ نتیجہ تھا، آخری عہد میں بدعتوں کا رواج، روح اتحاد کا فقدان، مسائل فروع میں تکفیر وتفسیق کا رجحان ایسے تاریخی واقعات ہیں جن سے روگردانی نہیں کی جا سکتی، بدعتوں اور دین میں نت نئی اصطلاحات

تعبیروں اور الفاظ کا ایسا انبار جمع ہوا کہ وہ سچے، مخلص اور پاکباز بندے جو واقعی بگڑے ہوؤں کی اصلاح کے لیے اٹھے وہ خود کسی نہ کسی بدعت کا شکار ہو گئے یا کم از کم کتاب و سنت کی واضح اور روشن تعلیمات ہدایت کے بجائے اپنے ذاتی تجربات یا دوسروں کے تجربات کے داعی بن گئے اور عجیب و غریب قسم کے طلسماتی اسلام کے موید ہوئے۔ یہ تحریریات آج بھی شاہد ہیں کہ انکو سمجھنا مشکل ہے اور ان میں کتاب و سنت کی اصطلاحات کا فقدان پایا جاتا ہے۔

اسباب کی تلاش اور قانون قدرت کا نفاذ | امتوں کے زوال، حکومتوں کے انحطاط اور محکومیت کے آغاز کے بعد اسباب کی تلاش مورخین کا دلچسپ مشغلہ رہا ہے، لیکن قانون قدرت لاگو ہوتا رہا ہے، اسباب جو بھی ہوں لیکن واقعہ یہی ہے کہ صدیوں تک جو قوم حکومت و امامت کے منصب پر فائز تھی دفعتاً محکوم بن گئی اور مغربی سامراج اپنی فوجی قوت، سائنسی ایجادات، ترقی و تمدن اور زندہ امنگوں کے ساتھ ہندوستان کے افق پر چھا گیا۔

انگریزوں کے مقاصد | یہاں اختصار کے ساتھ ہندوستان میں انگریزوں کے مقاصد پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ ہمیشہ کے لیے ہندوستان کو برٹش امپائر کا ایک الوٹ حصہ بنا دینا۔

۲۔ یہاں کے اقتصادی موارد سے استفادہ کرنا۔

۳۔ یہاں کے باشندوں میں مخالفت و منافرت کے جذبات پھیلانا تاکہ اس طرح اپنا اقتدار باقی رہے اور مضبوط ہو۔

۴۔ تہذیب و تمدن کے نام پر تعلیم میں تبدیلی اور قوم کو یہ احساس دلانا کہ تم

قرون وسطیٰ کی ظلمتوں اور جہالتوں میں تھے اب انگریزی حکومت، تہذیب و ترقی کی صبح امید بن کر طلوع ہوئی ہے اس لیے اس کا ساتھ دو اور یہ بھول جاؤ کہ وہ بدیسی حکومت ہے۔

۵۔ عام ہندوستانیوں سے نفرت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے خصوصی نفرت کیونکہ وہ سابق حکام تھے۔

۶۔ مسلمان حکام اور عہد سلطنت کے خلاف انتہائی چالاکی سے یہ پروپگنڈہ کہ وہ غیر مہذب، متعصب، خونخوار اور ظالم تھے۔

۷۔ اسلام چونکہ حکومت کھو چکا تھا لیکن اس میں اپنی ذاتی اور داخلی قوت رہی اس لیے اس کی تعلیمات کے خلاف زبردست محاذ قائم کرنا اور منظم طریقے سے اس کو ہندوستان میں پھیلانا۔

۸۔ ہندوستان کو ایک مسیحی ملک بنانا اور مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا دروازہ وسیع پیمانے پر کھولنا۔

۹۔ مسلمانوں میں مذہب سے بغاوت کی روح پھیلانا اور یورپ کے تہذیبی نقوش کو اس انداز سے واضح کرنا کہ وہ اپنے مذہب سے دور ہو جائیں تاکہ اس طرح وہ ذکر الٰہی سے غفلت کی بنا پر کسی بھی مغربی شیطان سے متاثر ہو جائیں۔

سامراج کو ملک سے نکالنے کی کوشش سامراجی تسلط کے بعد سامراج دشمنی کا مظاہرہ ملک کے بہت سے علماء و مفکرین اور سیاست دانوں نے کیا، ایک عظیم کوشش یہ تھی کہ برطانوی راج کو ختم کیا جائے، انگریز واپس جائیں اور ہندوستان آزاد و خود مختار ملک بنے، اس سیاسی کوشش میں بھی مختلف النوع نظریات سامنے

آئے اور تمام ابنائے وطن اس میں شریک ہوئے اور تقریباً ایک صدی کی کوششوں کے بعد برطانوی سامراج ہندوستان سے واپس گیا اور اس کے نتیجہ میں دو ملک وجود میں آئے ... ہندوستان و پاکستان کو تاج برطانیہ سے آزادی وخود مختاری ملی۔

فکری بالادستی کے خلاف احتجاج | ان سیاسی کوششوں کے علاوہ دوسری کوششیں وہ تھیں جن کا تعلق سامراج کی علمی وتمدنی وفکری بالادستیوں کے خلاف قوم کو بیدار کرنا تھا، جسم کی غلامی ہمیشہ فکر وذہن کی غلامی سے کم نقصان دہ ہوتی ہے جسم آزاد بھی ہو جاتا ہے لیکن فکر غلام رہتی ہے اور اس کا مشاہدہ تمام ان ملکوں میں بآسانی کیا جا سکتا ہے جہاں سے برطانوی ویورپی سامراج واپس جا چکا ہے لیکن فکری غلامی نہ صرف یہ کہ اب تک باقی ہے بلکہ روز بروز ترقی کرتی جارہی ہے۔

جو علماء ان فکری ودینی وعلمی کوششوں میں شریک ہوئے، ان کی تعداد کا تعین ناممکن ہے، سب سارے علماء نے ان کوششوں میں حصہ لیا، اس وقت امت کی اصلاح اور انگریزی افکار سے نبرد آزما ہونے کے لیے جو مختلف النوع کوششیں ہوئیں انکو تین طرح کے نظریات کے ماتحت لکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ علاج بالضد | انگریزوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے، انکی گفتار، رفتار اور کردار کی مخالفت کی جائے، فارسی زبان بحیثیت سرکاری زبان ختم ہو جانے کے بعد اب انگریزی زبان نہ سیکھی جائے اور نہ وہ جدید علوم جو انگریزوں کے ساتھ آئے ہیں ان پر کوئی توجہ دی جائے اور فارسی وعربی اور دینی واسلامی علوم کی حفاظت پر پورا زور دیا جائے۔

اس نظریہ کا مثبت پہلو یہ تھا کہ اس طرح انگریزی سامراج کو شکست دی جاسکتی تھی اس کی زبان، تہذیب اور تمدن کی اثرانگیزی کم سے کم ہوسکتی تھی، اپنی قدیم میراث اور تہذیب و علوم کی حفاظت ہوسکتی تھی۔

لیکن منفی پہلو یہ تھا کہ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی آباد نہیں تھے کہ انکا یہ جزوی احتجاج پوری طرح کامیاب ہوسکتا، مصر میں جب عربی کی جگہ انگریزی سرکاری زبان بنائی جانے لگی تو تمام اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں چھ ماہ تک اسٹرائک رہی، وہاں ایک ہی زبان پورے ملک میں جاری و ساری تھی اور اس کی بقا کے لیے مصری قوم پوری طرح متحد تھی اس لیے انگریزوں کی یہ کوشش ناکام ہوئی اور عربی زبان باقی رہی، لیکن ہندوستان چونکہ مختلف زبانوں، تہذیبی اکائیوں اور مذہبوں کا ملک تھا اس لیے یہاں پر یہ جزوی احتجاج کارگر نہ ہوسکا اور چشم زدن میں انگریزی زبان سرکاری زبان بن گئی اور ہندوستان کی دوسری قوموں نے اس کی پذیرائی کی کیونکہ فارسی زبان بھی اس خطۂ زمین کی زبان نہیں تھی بلکہ وہ بھی ایک غیر ملکی زبان تھی۔

دوسرا منفی پہلو یہ تھا کہ خود دین کی خدمت، دفاع اور حفاظت کا پہلو اس طرح نئے حالات میں مکمل طور پر پورا نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ انگریزوں کی مشنریوں اور انگریزی مولفین کے اسلام پر اعتراضات وغیرہ کے جواب دینے کے لیے وہ زبان اور وہ علوم ضروری تھے جن کے ذریعہ کامیاب مدافعت ممکن ہو۔ کامیاب اور فوری ترجمے بھی اسکا کسی حد تک بدل ہوسکتے ہیں، لیکن خود ترجمے کے لیے دونوں زبانیں اچھی طرح جاننا ضروری ہے۔ دشمن کے پاس اگر ٹینک اور ہوائی جہاز ہوں تو مدافعت کے لیے صرف تیر و تفنگ نہ کارگر ہیں اور نہ ہوشمندی کی علامت ہیں۔

۲۔ علاج بالمثل | دوسرا نظریہ یہ تھا کہ دنیاوی ترقی اور تمدن کے حصول کے لیے حکام کی مکمل تقلید کی جائے اور زندگی، معاشرت، تمدن، رہن سہن، وضع قطع و لباس اور تعلیم وغیرہ سب میں انگریزوں کی اتباع کی جائے تاکہ لوگوں میں حاکم قوم سے مرعوبیت کی فضا ختم ہو یعنی اعتقاد و عبادات کو چھوڑ کر مکمل طور سے قوم انگریز بن جائے۔

اس نظریہ کا ایجابی پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان میں بسنے والی دوسری قومیں انگریزی زبان اور تعلیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں اور اس طرح آگے چل کر وہ ملک کے تمام کلیدی مناصب، نوکریوں، درسگاہوں، شفاخانوں، زندگی کے تمام مرحلوں اور سیاسی مورچوں پر قابض ہو جائیں گی اور مسلمان سیاسی و اجتماعی و اقتصادی میدانوں میں بالکل پیچھے رہ جائیں گے۔

لیکن اس کا منفی پہلو یہ تھا کہ شروع سے آنکھ کھولنے کے بعد جب بچہ انگریزی ثقافت و تمدن سے آشنا ہوگا اور گھر، اسکول اور شاہراہ پر اور اخبار، رسالوں، کتابوں اور مدرسوں میں جب اسے اسلام کے صحیح عقائد و اعمال کا کہیں نشان نہیں ملے گا تو تعلیم یافتہ ہونے کے بعد وہ انگریز بن جائے گا اور صرف اقتصادی و اجتماعی و سیاسی میدانوں ہی میں نہیں بلکہ عقائد و عبادات میں بھی شک و تذبذب کا شکار ہو کر الحاد کے فریب میں مبتلا ہو جائے گا، انگریزوں کی قومی، علمی، فکری، تمدنی اور ہمہ گیر برتری کی داستانیں جب وہ نصاب تعلیم میں اور ہر جگہ پڑھے اور سنے اور دیکھے گا اور مسلمانوں کی عالمگیر تباہی، جہالت، ظلم و ناانصافی اور بربریت کے قصے جب وہ سنے گا اور مسلمانوں کی قربان اور اسلام کی روشن تاریخ و تہذیب سے وہ ناواقف ہوگا تو اس میں نادانستہ طور پر مخالفانہ جذبات ابھریں گے اس پر مستزاد یہ کہ جس زبان کو

دہ سیکھے گا اس میں انتہائی منظم طریقے پر اسلام کے بنیادی عقائد، پیغمبرِ اسلام کی عظیم شخصیت اور خلفائے اسلام کی مثالی زندگی پر بہتان و افترا کا ایک انبار اسے ملے گا ان سب چیزوں کا عکس اور منفی اثر ملتِ اسلامیہ کے پڑھے لکھے طبقہ پر انتہائی برا اور مہلک ہوگا۔

مرکب علاج مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ تیسرا نظریہ تھا کہ اصل مقصد مریض کی اصلاح اور بیماری کی شفا ہے، کسی ایک علاج یا دوا پر اصرار کسی حاذق طبیب کا شیوہ نہیں ہے، وقت، حالات، موسم، مزاج اور بیماری کے خطرات کو دیکھتے ہوئے مرکب علاج بھی ممکن ہے اور ہر علاج کے طریقے میں سے مضر پہلوؤں کو ہٹا کر مفید پہلو اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

اس لیے ہندوستان کے نئے حالات سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں، برطانوی سامراج کا اقتدار گو شرعی و قانونی طور سے کالعدم ہے کہ کسی دوسرے کے ملک پر بالجبر یہ بغیر اس کی مرضی کے زبردستی قبضہ کر لینے سے قانونی حق حاصل نہیں ہوتا لیکن واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ کا غاصبانہ قبضہ و تسلط یہاں قائم ہو چکا ہے، آخری امید کا سہارا یعنی ۱۸۵۷ء کا انقلاب بری طرح ناکام ہو چکا ہے، اس میں شریک ہونے والوں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں، سرکاری زبان فارسی کی جہانگیری ختم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ پر انگریزی زبان سرکاری زبان تسلیم کی جا چکی ہے، سائنسی ترقی نے محیر العقول ایجادوں کا دروازہ کھول دیا ہے، انسانی ترقی اور راحت رسانی کے سامانوں کے علاوہ سائنس نے نئے جنگی ہتھیار بھی پیدا کیے ہیں اس لیے انگریزی زبان اور نئے علوم کا سیکھنا۔ چند شرطوں اور قومی و دینی نگرانی

کے ساتھ۔ از بس ضروری ہو گیا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اپنے مسلمہ عقائد و عبادات سے پوری طرح واقف ہونا بھی ضروری ہے، عربی و فارسی زبان اور اسلامی تعلیمات سے دوری انتہائی مہلک نتائج پیدا کر سکتی ہے، ساتھ ہی اسلامی تاریخ و تمدن و ثقافت و علوم کی روشنی سے واقف ہونا بھی لابدی ہے تاکہ یورپ سے فکری مرعوبیت کی بیماری میں قوم مبتلا نہ ہو، نیز اسلام دشمن پروپگنڈہ کے اثر سے قوم کو بچانا وقت کا سب سے اہم فریضہ ہے۔

اسلامی اصول سے یہ نظریہ صحیح ہے | یہ نظریہ معقول و معتدل ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل مثبت و ایجابی پہلوؤں کا حامل ہے اور کتاب و سنت کے نصوص اور اسلامی اصولوں پر پورا اترتا ہے اور اسلامی تاریخ سے اس کے شواہد و نظائر مل سکتے ہیں، قرآن و سنت نے علم کے دروازے کبھی بند نہیں کیے، فکر و نظر اور تدبر و تعقل کی جگہ دعوت دی، ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں ارسال کرنے کی حکمت یہ تھی کہ جہاں بھی اسلام کا عالمی پیغام پہنچایا جائے وہاں کی زبان داعی کو سیکھنی چاہیے، حکمت مومن کا گمشدہ سرمایہ ہے جہاں بھی ملے اس کو حاصل کرے وغیرہ، علماء و حکمائے اسلام نے ہر دور کی ضروریات اور ہر زمانہ کے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا اور اس سے اسلام کی مدافعت و حفاظت اور تبلیغ کا کام لیا ہے۔

یہ تیسرا نظریہ جن علماء و مفکرین کا تھا ان کے گوہر شب چراغ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

اسلام کے چشمہ صافی میں زہر کی آمیزش | برطانوی سامراج کے زیر اثر آزادی صحافت و حریت رائے کی آڑ لے کر مغربی ریسرچ اسکالروں اور تبشیری اداروں

نے اسلام کے چشمۂ صافی میں زہر ملانے کی کوششیں کیں، اسلام کے عقائد، عبادات، اجتماعی، اقتصادی اور انسانی قواعد و قوانین کو چیلنج کیا، ان پر ظلم و ناانصافی کا الزام لگایا، اسے جنگلی اور صحرائی عربوں کا نظام حیات ثابت کیا جو ترقی یافتہ زمانہ اور قوموں کے لیے موزوں نہیں ہے، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو ظالم بدزبان گستاخ خونخوار منتقم اور سفاک و جابر ثابت کیا جنھوں نے اسلام کو بزور شمشیر پھیلایا اور عظیم خلفائے اسلام کی ہر خوبی کو خرابی بتایا اور ہندوستان میں ان افکار کو بڑے پیمانہ پر پھیلایا۔

ان حالات میں ضرورت تھی کہ عالم اسلام سے کوئی عظیم عالم و مفکر، فلسفی و مورخ انسان اٹھے جو ان باطل دعووں کی تردید کرے اور علمی و استدلالی انداز میں مستشرقین یورپ کے حملوں کا جواب دے اور ان کی علمی غلطیاں دنیا کے سامنے واضح کرے۔

شب دیجور سے صبح پر نور | ۱۸۵۷ء کے پرآشوب سال کی جو تصویر مورخین کے قلم نے کھینچی ہے اسے دیکھ کر بجا طور پر ان دنوں کو "ایام نحس مستمر" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جس طرح شب دیجور سے صبح پر نور کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح خدا کی قدرت سے ۱۸۵۷ء کے مطلع سیاہ سے شبلیؒ کا آفتاب نور طلوع ہوا جس نے اسلامی افکار، تاریخ، تمدن اور عظیم شخصیتوں پر دشمنوں کے ڈالے ہوئے غبار کو اس طرح صاف کیا کہ وہ آئینۂ شفاف بن کر عظمت کا نشان بن گئیں۔

مولانا شبلیؒ کی عظمت کے مختلف پہلو ہیں ہم یہاں انتہائی اختصار کے ساتھ صرف انگریزوں اور مستشرقین کی اسلام دشمنی کے سلسلے میں ان کی علمی کاوشوں کو نمایاں کریں گے۔

علامہ سید سلیمان ندوی ؒ نے عیسائی مشنریوں کے حملوں کا تذکرہ کیا ہے اور بعض علماء و مفکرین کی کوششوں کو تائید غیبی ثابت کیا ہے، پھر ان حضرات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے سائنس کے انکشافات کی روشنی میں جواب دیے ہیں لیکن باقاعدہ عالم نہ ہونے کی وجہ سے وہ دور ازکار تاویلات کا شکار ہو گئے ہیں، پھر مغرب کے ریسرچ اسکالروں کا طریقہ واضح کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی تاریخ پڑھ کر علم و ریسرچ کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کو اعتراض کرتے ہیں" ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلے کے لیے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ؒ تھے جنھوں نے ان ہی کے طریقہ سے، ان ہی کے اسلوب پر انکو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی" (حیات شبلی: مقدمہ ۲۵)

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم | اس سلسلہ میں مولانا شبلی ؒ کی سب سے پہلی تصنیف "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" تھی، یہ دراصل ایک مقالہ تھا جو ایجوکیشنل کانفرنس لکھنؤ (محمڈن تعلیمی مجلس) کے لیے لکھا گیا تھا، اور ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا، اس خطبہ کی دھوم سارے ملک میں مچ گئی، اسلام دشمن مغربی دانشوروں نے مسلمانوں کی جہالت اور علم دشمنی کے جھوٹے افسانے جس طرح پڑھے لکھے لوگوں میں پھیلا رکھے تھے اس مضمون میں انکا علمی و تاریخی جواب تھا اور مسلمانوں کے لازوال علمی کارناموں کو نمایاں کیا گیا تھا اور ان کے مکاتب و مدارس اور علمی مشغلوں کی حقیقی دستاویز تھی، مسلمانوں کے کانوں میں پہلی بار اپنے عظیم اسلاف کے عظیم الشان علمی

کانوں کی آواز آئی، یہ خطبہ مولانا کی شہرت کا پہلا زینہ بنا۔

گذشتہ دینی تعلیم کو غور سے پڑھنے والا یہ جان سکتا ہے کہ مولانا کے دل میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی وغیرہ کے جو منصوبے تھے اس کا تخم اول اس کتاب میں موجود ہے، اس خطبہ نے دینی مدارس میں اصلاح کا عام خیال پیدا کیا۔

مسلمانوں کی علمی ترقی اور المامون | مسلمانوں کی علم دوستی و علم پروری ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے، لیکن علم و ریسرچ کے نام پر ان کے اسلاف کی سیرتوں کو بگاڑ کر پیش کرنا مستشرقین اور یورپ کے دانشوروں کا شعار رہا ہے، مسٹر پامر نے ہارون الرشید پر کتاب لکھکر اس عظیم خلیفہ کا حلیہ بگاڑنے کی پوری کوشش کی تھی، مولانا شبلیؒ نے جب ناموران اسلام لکھنے کا ارادہ کیا تو تاریخ بنی عباس کی سب سے اہم علمی شخصیت المامون پر قلم اٹھایا، اس کتاب میں علمی و تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ گویا مسٹر پامر کے زہر کا تریاق بخشنا بھی مولانا کے خیال میں تھا۔

یہ کتاب بھی مغربی مورخین کے اعتراضات اور مفروضات کے ابطال میں معین ثابت ہوئی اور مسلم فرمانرواؤں کی علم دوستی کا بین ثبوت فراہم ہوا، یہ تصنیف بہت مقبول ہوئی اور تین ماہ کے اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔

سفرنامۂ مصر و روم و شام | یہ بظاہر ایک مسافر کا سفرنامہ ہے لیکن جا بجا مسافر نے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے پیوست کردیے ہیں، اسلامی حمیت و غیرت، اسلامی حکومت اور سرزمین اسلام سے محبت و تعلق، مسلمانوں کی محکومی پر غم و الم، اسلامی ممالک پر سامراجی کوششوں کی تصویر، وہاں کے علمی و سیاسی و اجتماعی احوال پر کہیں مسرت اور کہیں ماتم، تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں اپنی آرا کا نچوڑ، خصوصاً عالم عربی و ترکی میں

کتب خانوں سے استفادہ اور نادر مخطوطات سے کام کی چیزوں کی نقول حاصل کرنا، اس کی تفصیل سفرنامہ میں ملتی ہیں، پھر مدرسوں کی زیارت اور نظام تعلیم و نصاب درس پر تبصرہ بھی ہے جس میں وہی رونا ہے کہ:

"عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے، جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کے حدود جدا جدا رکھے گئے ہیں اور جب تک یہ ڈانڈے نہیں ملیں گے ترقی نہ ہو سکے گی"[1]

جدید کالجوں میں ملٹری کالج، لا کالج، ٹکنیکل کالج، ایگریکلچر کالج، سول سروس کالج وغیرہ کا انھوں نے قسطنطنیہ میں مشاہدہ کیا اور قابل ذکر باتوں کو لکھا تاکہ ان کو ہندوستان میں رائج کیا جائے، کالج میں ہر طالب علم کے لیے ایک لباس انہیں بہت پسند آیا، اس سے مساوات کا درس ملتا ہے اور غریب طلبہ میں احساس کمتری پیدا نہیں ہوتا، آگے لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ ترکی نہایت فخر سے اس بات کا دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس نے بورڈنگ کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہیں اور ان میں نہایت کثرت سے طلباء رہتے ہیں۔ لیکن یہ التزام ہے کہ خوراک، لباس، وضع، مکان، فرنیچر تمام چیزیں ایکسی ہوں اور طالب علموں کی حالتوں میں فرق مراتب کا شائبہ نہ ہو، ..... اسکا اثر یہ ہے کہ کالج کے احاطہ میں جاکر کوئی شخص کسی طرح تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے۔" (سفرنامہ مصر و روم و شام ص ۵۰۔۵۱)

---

[1] مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۴، قسطنطنیہ سے ۱۵ جون ۱۸۹۲ء کا لکھا ہوا خط بنام سرسید۔

مطبوعہ علی گڑھ، جولائی ۱۸۹۴ء)

انگریزوں نے مساواتِ انسانی وغیرہ کے نام نہاد دعووں سے دنیا کے ناواقفوں کو مرعوب ومسحور کر رکھا ہے لیکن فرقِ مراتب کا چلن جس طرح ان کے دور اور ان کی ریاستوں میں ہوا کہیں نہیں ہوا، حاکم و محکوم میں فرق، بڑے افسر اور چھوٹے افسر میں فرق، طلبہ میں فرق، گورے اور کالے میں فرق، رہن سہن اور رہائش گاہوں میں فرق، سفر کے طریقوں میں فرق وغیرہ، مولانا شبلیؒ کے قلم نے اشارہ کی زبان سے اس کا پردہ چاک کیا ہے اور ترکوں کو اس باب میں یورپ کے لوگوں سے فوقیت دی ہے، لکھتے ہیں:

"یورپ کے بڑے بڑے کالجوں میں یہ بڑی کمی ہے کہ کم مقدور لوگوں کو انکی فیاضی سے چنداں فائدہ نہیں پہنچتا، ترکوں نے اسی نقصان کا تدارک کیا ہے اور نہایت خوبی سے کیا ہے۔" (سفرنامہ ۵۱)

یہ اسلامی وانسانی مساوات دیکھ کر ان کو یقیناً علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کی حالت زار بھی یاد آئی:

"بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا مدرسۃ العلوم یاد آتا تھا اور میں اسکے بورڈنگ کے اختلاف مراتب پر افسوس کرتا تھا"... میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے اور نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع، خوراک، مکان، فرنیچر کلیتہً ایک کر دیا جائے اور جو مختلف سطحیں آج کل قائم ہیں بالکل مٹادی جائیں" (سفرنامہ ص ۵۱-۵۲)

یہی بات وضاحت کے ساتھ انہوں نے اپنے والد شیخ حبیب اللہ کے خط میں قسطنطنیہ سے ۵ رجون ۱۸۹۲ء کو کہی :

" ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا، سید صاحب قبلہ (سرسیدؒ) بغیر کسی پس وپیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہے "

(مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۱۲)

الغرض مغربی تہذیب کے زیر سایہ جو مصائب آئے تھے ان ہی سے یہ فرق مراتب بھی تھا، مولانا شبلیؒ کو اس سے سخت نفرت تھی اور اسلامی مساوات کے اصولوں کا بڑا پاس تھا، علی گڑھ اور پھر جب مولانا ندوہ تشریف لائے تو وہاں بھی ان اصولوں کی پابندی اور مظاہر کا انہیں بڑا خیال تھا اور طلبہ کو اپنی ذہنی آسودگی، بلند فکری، عالی ظرفی اور اپنی علمی و دینی قیمت پہچاننے پر وہ بڑا زور دیتے تھے۔ آج بڑے بڑے دینی مدرسوں میں لوگ لباس خواب میں سڑکوں پر چلتے نظر آتے ہیں، امیر طلبہ کے ساتھ خصوصی برتاؤ ہوتا ہے بلکہ ایسے مالدار علاقوں جہاں سے چندے یا ہدایا وصول ہوتے ہوں ان کو خصوصی رعایتیں دی جاتی ہیں۔

اس سفر میں انہیں حاکم اور محکوم ملکوں میں جو تفاوت ہے اور غلام اور آزاد قوموں کی ذہنیتوں میں جو فرق ہے وہ محسوس ہوا، مولانا نے مصر میں ازہر کی زبوں حالی پر بھی نوحہ کیا ہے۔ لیکن جامعہ ازہر میں جو اصلاحی کوششیں بعد میں ہوئیں انکی وجہ سے وہ اب دنیائے اسلام میں اسلام کا سب سے بڑا قلعہ ہے۔ مولانا نے مصر کے کتبخانے آثار قدیمہ، اہرام وغیرہ بھی دیکھے۔

الغرض مولانا کا یہ سفرنامہ ان کے اصلاحی نظریۂ تعلیم و تربیت کا آئینہ دار

بھی ہے اور مغربی طاقتوں کے مقابلہ کے لیے وہ جس قسم کی علمی و عملی صلاحیتوں سے مزین قوم دیکھنا چاہتے تھے اس کا اظہار بھی ہے

خلیفہ عثمانی کی طرف سے اس سفر میں انہیں تمغۂ مجیدی ملنے کی وجہ سے برٹش حکومت اندر ہی اندر چراغ پا تھی، بہرحال جب یہ طے ہو گیا کہ اس سفرنامہ میں شہد ہی شہد رہے گا کوئی زہریلی چیز نہ ہوگی تو اس کے لکھنے کی اجازت ملی، یہ سفرنامہ خالص علمی اور معاشرتی پہلوؤں تک محدود رہا پھر بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس سفرنامہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ترکی کی محبت کا بیج نہیں بویا اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی "اسی لیے انگریزوں نے مولانا کے اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کیا۔"

مولانا کے رسائل و مقالات بے شمار ہیں، موضوع سے متعلق تمام مضامین پہ تبصرہ یا انکا تذکرہ بھی اس مختصر مضمون میں مشکل ہے تاہم چند اہم تحقیقات کی نشاندہی ضروری ہے۔

الجزیہ | مولانا کا اہم مضمون ہے، اس کی تفصیل اس لیے بیان نہیں کرتا کہ اس کی شہرت عام ہے، مولانا نے فقہ و تاریخ و سیر سے یہ ثابت کیا کہ جزیہ نصرت و قتال کا معاوضہ ہے، اگرچہ بعض فقہاء نے اس کو قتل کا بدل اور بعض نے دارالاسلام میں سکونت کا بدل بھی لکھا ہے، مولانا نے اس الزام کا پردہ چاک کیا کہ غیر مسلم جزیہ کی حقیر رقم کے بدلے اپنا ایمان فروخت نہیں کر سکتے۔ راقم یہاں مزید یہ کہنا ضروری سمجھتا ہے کہ جزیہ میں دی ہوئی قلیل رقم کی جگہ پر ایک مسلمان اپنی دولت کا چالیسواں حصہ ہر سال زکوٰۃ میں ادا کرتا ہے، پس اگر اقتصادی اور مالی مسائل کی بنا پر کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہے تو سارے مالدار مسلمان زکوٰۃ کی عدم ادائیگی

کی غرض سے کسی دوسرے مذہب میں شامل کیوں نہیں ہوئے؟

اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا انگریزی و عربی میں ترجمہ ہوا اور سر سید مرحوم نے اس کی تعریف میں یہ الفاظ لکھے کہ اگر شبلی نعوذ باللہ" اپنے رسالے الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ کہیں کہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ تو کچھ تعجب نہ ہوگا" (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میگزین ۱۰ مارچ ۱۸۹۳ء) (حیات شبلی: ص ۲۳۴)

حقوق الذمیین | یورپی متعصب مستشرقین نے صلیبی جنگوں سے پہلے ہی یہ غلط الزام لگایا تھا کہ مسلم ممالک میں غیر مسلم رعایا پر ظلم و ستم ہوتا ہے اور ان کو کسی قسم کے شہری حقوق حاصل نہیں ہیں، پھر جب ترکی مقبوضات میں سے صوبہ ارمینیا میں مسلح بغاوت ہوئی اور ترکی حکومت نے اس کو بزور فرو کیا تو مسیحی دنیا چیخ اٹھی اور متعدد زہریلے مضامین لکھے گئے جن میں مسلمانوں کے تعصب اور مسیحیوں پر ظلم و ستم اور زیادتی کے افسانے لکھے گئے تھے، اس موقع پر مولانا شبلی نے "حقوق الذمیین" لکھ کر ان اعتراضات کی دھجیاں بکھیر دیں، کتاب و سنت کی نصوص، فقہ اسلامی کے حوالوں اور تاریخ کے صحیح اور مسلّم الثبوت واقعات سے اس الزام کی تردید کی اور الزامی طور پر یہ دعویٰ کیا کہ دنیا کے کسی مذہب یا قوم نے ایسے حقوق آج تک عطا نہیں کیے جو اسلام نے عطا کیے وہ عدل و انصاف پر مبنی تھے، بلکہ اسکی بلندی تک یورپ کی سلطنتوں کے قول کا پرپرواز ہنوز نہیں پہنچا ہے۔

اسی موضوع سے متعلق تیز فرمانروایان اسلام پر تعصب کے الزام کی تردید میں وہ اہم مضمون ہے جو مولانا نے اورنگزیب عالمگیر پر لکھا تھا۔

کتب خانۂ اسکندریہ | مسلمانوں کی علم دشمنی کے من گھڑت قصوں میں سے فتوحات اسلامیہ کے دوران کتب خانۂ اسکندریہ کو جلا دینے کا واقعہ بھی تھا جس کو خوب شہرت دی گئی تھی، یہ کتب خانہ صدیوں کی محنتوں کا خزانہ تھا، مولانا نے علمی و تاریخی طور پر یہ ثابت کیا کہ یہ الزام سراسر غلط ہے بلکہ خود مسیحیوں نے اپنے زمانہ میں صدیوں پہلے اسے برباد کر دیا تھا، خود یورپین مورخین نے اسکا اعتراف کیا ہے۔

تمدن اسلامی پر تنقید | مصر کے مشہور عیسائی مورخ جرجی زیدان نے قبۃ الاسلام قاہرہ میں بیٹھ کر تمدن اسلامی پر جو کتاب لکھی اس میں بظاہر تعریفی انداز ہے لیکن خلفائے اسلام کے مثالب و معائب کو اس میں شاطرانہ انداز سے جمع کر دیا گیا ہے، نادان مسلمان اس کے شکر گذار تھے اور دانا دشمنوں نے اس کی قدر کی، پروفیسر مارگولیتھ نے اس کا ترجمہ انگریزی میں چھپوایا، عالم اسلامی میں سے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کی سعادت مولانا شبلیؒ کے حصے میں آئی، علامہ رشید رضا نے الانتقاد کو تعریف و تقریظ کے ساتھ مجلہ المنار میں چھاپا، علمائے مصر و عالم عرب نے اس کی پوری قدر کی اور مولانا کی جلالت مرتبت کا اعتراف کیا۔

الفاروق اسلامی کارناموں کی دستاویز | مولانا شبلیؒ نے جب اہم اور مشہور آفاق کتاب الفاروق لکھی تو بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ایک خلیفۂ اسلام کی سیرت و سوانح ہے اور ممکن ہے اس سے سنی اور شیعہ تنازعہ بڑھے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ جس طرح آج اسلامی فلمیں بنانے پر اعتراضات ہیں اس سے کہیں بڑھ کر اس وقت الفاروق لکھنے پر اعتراضات تھے، ہر طرف سے یہ صدا آرہی تھی کہ الفاروق کی تالیف نہ ہو حتیٰ کہ سرسید جیسے روشن خیال نے بھی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۸۸۹ء میں

ایک مضمون لکھا جس میں مولانا شبلیؒ کے علمی کاموں کی فراخدلی کے ساتھ پوری قدردانی کی اور تعریف کے بعد آخر میں لکھتے ہیں "مگر ہم مولوی شبلی کی اس رائے پر کہ بزرگان دین کو بھی ہیروز آف اسلام میں داخل کر کے ان کی لائف لکھیں ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ اس سے متفق ہیں، وہ لوگ فادر آف اسلام ہیں نہ ہیروز آف اسلام اور ہم دعا کرتے ہیں کہ مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں۔"

لیکن آخر کار مولانا نے الفاروق لکھی اور اس طرح اسلام کے تمدنی و قانونی امور کی ایک ایسی دستاویز تیار ہو گئی جو یورپ و امریکہ کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے، دنیا کے بڑے سے بڑے مدبر اور فرمانرواؤں کے کارنامے فاروقی کارناموں کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔

ایک بات ضروری یہ ہے کہ فادر آف اسلام خالص مسیحی پادریوں کی اصطلاح ہے، اسلام کا کوئی فادر نہیں ہے، خدائے پاک اسلام کو نازل کرنے والا ہے اور رسول پاکؐ اسوۂ و نمونہ ہیں اور صحابۂ کرام و خلفائے عظام اس کی صحیح اور عملی تطبیق کرنیوالے ہیں۔

الفاروق کا مقصد بھی اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور اسلام دشمن مخالفین کی دسیسہ ریزیوں کا جواب تھا۔

سیرۃ النبیؐ | مغربی مورخین نے اسلام پر اعتراضات کے زمرہ میں ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو رکیک اور غیر مستند الزام لگائے ہیں اور مستشرقین یورپ کی ایک جماعت نے تعریضی انداز اختیار کر کے جن مسموم نظریات کا بیج بویا ہے، اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مولانا شبلیؒ نے سب سے آخر میں سیرۃ النبی لکھکر ان تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے، یہ اپنے طرز کی عظیم سیرت ہے اس کی خوبیوں اور کمالات کے لیے

پورا ایک مفصل مضمون درکار ہے' الفاروق اور سیرۃ النبی نے کتنے گروہوں کو تمام لیا ہے۔

علامہ شبلیؒ نے سیرت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اسلامی عقائد و عبادات و معاشرت کے جملہ موضوعات پر بحث کا منصوبہ بنایا تھا جو ان اسلامی تعلیمات پر مشتمل تھیں جن کو لے کر آپؐ مبعوث کیے گئے تھے، جس کو باحسن و اتم وجہ ان کے شاگرد رشید اور استاذ الاساتذہ سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے پورا کیا۔

مولانا نے اپنے اشعار' مثنویوں اور بے شمار مقالات میں مغربی طلسم کو توڑا ہے' اسلام کے محاسن بیان کیے ہیں، ترکوں سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ ترکوں کی فتوحات خوشی اور مسرت کے ترانے گائے ہیں، واقعہ مسجد کانپور پر ان کی نظمیں اور شہر آشوب اسلام وغیرہ ہمارے اس دعوے پر شاہد ہیں، لیکن ہم طوالت کے خوف سے یہاں ان چیزوں کا تذکرہ نہیں کرتے۔

شبلی کا اثر عصر حاضر پر | آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ مولانا شبلیؒ نے علمی و تاریخی و مذہبی نثر نگاری کا جو نیا اسلوب اردو میں ایجاد کیا اس کا علمی و ادبی اثر برصغیر ہند و پاک کے تمام لکھنے والوں نے قبول کیا اور اب جو شخص بھی اچھی علمی زبان لکھتا ہے وہ انکے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا، مولانا شبلیؒ کی اصلاح تعلیم کی تحریک بھی کامیاب ہوئی اور مغربی پروپگنڈہ کا اثر بھی زائل ہوا۔

ابنائے شبلیؒ | علامہ شبلیؒ اولاد کے بارے میں زیادہ خوش قسمت نہ تھے اور ان میں سے کسی نے کوئی قابل ذکر دینی یا علمی خدمت نہیں کی لیکن جس شخص کی معنوی اولاد اور شاگرد مولانا سید سلیمان ندویؒ مولانا مسعود علی ندویؒ مولانا عبد السلام ندوی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا ابو الکلام آزاد جیسی شہرۂ آفاق ہستیاں ہوں اس سے

زیادہ خوش نصیب کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

مولانا کا مقصد یہ تھا کہ اپنے بعد بھی علماء کا ایک ایسا تربیت یافتہ گروہ چھوڑ جائیں جو وقت کی ضرورتوں پر مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ قلم اٹھائے، ندوۃ العلماء کی پوری جماعت اور دارالمصنفین سے منسلک تمام حضرات مولانا کی فکری وادبی تاثیر کی وجہ سے براہ راست ابنائے شبلی میں شمار کیے جاتے ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی بھی شاگردوں ہی کی طرح مولانا شبلی کی صحبت سے مستفید ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال ندوی حلقہ سے باہر کی دو اہم شخصیتیں اور ہیں جنھوں نے مغربی تہذیب کے خلاف جو کام مولانا نے شروع کیا تھا اس کو آگے بڑھایا اور وہ مولانا کے دائرہ اثر میں شمار کی جاتی ہیں، ایک شاعر مشرق علامہ اقبال جنھوں نے شاعری کی زبان میں مغربی تہذیب کے ایک ایک نقش باطل کو مجاہدانہ روح کے ساتھ مٹایا، لیکن مغرب کی مخالفت میں وہ مشرق کے قدیم و جدید آستانوں پر کچھ دیر کے لیے جھکے، تذبذب کی وادیوں میں بھی بھٹکے، متعدد نظریات حیات کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا لیکن آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ عصر حاضر کے لیے بھی اسلام کا پیغام حیات بخش ہے اور انھوں نے اس کو طرح طرح شاعرانہ اسلوب میں واضح کیا۔

مولانا مودودی دوسری شخصیت جو ابنائے شبلی میں بافتخار شامل ہے وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ہے گو انھوں نے اسلامی تاریخ و تمدن کے سلسلے میں مولانا شبلیؒ کی آراء سے بعض جگہ کلی اور بعض جگہ جزوی اختلاف کیا ہے، کیونکہ ہر غیر معصوم سے یہ اختلاف روا رکھا جا سکتا ہے اور ہر غیر معصوم کے لیے اجتہادی و غیر اجتہادی غلطیوں کا امکان موجود ہوتا ہے، مولانا مودودیؒ نے مغربی تہذیب و تمدن اور قانون و معاشرت

کو تقابلی مطالعہ اور برہانی و استدلالی طریقے سے توڑا اور اسلام کو مدافعانہ پوزیشن سے نکال کر مغربی اور تمام لادینی تہذیبوں پر ہجوم کی شکل میں حملہ کر کے ان کے معائب کو واضح کیا۔ اب سوال یہ نہیں رہا کہ اسلام بزور شمشیر کیوں پھیلا؟ بلکہ سوال اس طرح پیدا ہوا کہ قدیم جاہلی اور جدید تمدنی قوموں نے جنگ میں جو ظلم اور ناانصافی روا رکھی وہ کیوں؟ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے تھے وہ آج تک جدید قوانین نے کیوں عطا نہیں کیے؟ مولانا مودودیؒ نے صرف مجموعی اور عمومی طور پر مغربی تہذیب کے خلاف مضمون نگاری نہیں کی اور نہ نوحہ و ماتم کا شیوہ اختیار کیا بلکہ علامہ شبلیؒ ہی کی طرح متعین موضوعات اور مغربی تہذیب کی شہ رگ پر وار کیا، اصولی مسائل، جہاد، سود، پردہ، حقوق الزوجین، برتھ کنٹرول، اسلامی و مغربی قوانین اور اسلامی نظام زندگی بندگی کو اپنا موضوع بنایا اور فکر و نظر کا اعلیٰ معیار قائم کیا، مغربی جاہلیت جدیدہ کو جاہلیت قدیمہ کا وارث ٹھہرایا اور تمام سامراجی طاقتوں اور حکومتوں کی قانونی بالادستی کے کالعدم ہونے کا اعلان کیا اور ساری زمین پر خدائے رب العالمین کی حکمرانی، خلافت کی پاسبانی اور قانون اسلامی کی بالادستی کا تصور پیش کیا۔

مولانا نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا کوئی غیر مسلم حاکم یا ثالث نکاح کو فسخ کر سکتا ہے، فرمایا تھا:

"سوال یہ کرنا چاہیے تھا کہ جو عدالتی نظام خدا سے بے نیاز ہو کر انسان نے خود قائم کر لیا ہو اور جس کے فیصلے انسانی ساخت کے قوانین پر مبنی ہوں، اسکو خدا کا قانون تسلیم کرتا ہے یا نہیں... صرف نکاح و طلاق ہی کے معاملات میں نہیں بلکہ جملہ معاملات میں غیر اسلامی عدالت کا فیصلہ اسلامی شریعت

کی رو سے غیر مسلّم ہے۔ اسلام نہ ایسی حکومت کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک الملک یعنی اللہ سے بے تعلق ہو کر آزادانہ خود مختارانہ قائم ہوئی ہو اور نہ اس قانون کو تسلیم کرتا جو کسی انسان یا انسانوں کی جماعت نے بطور خود بنالیا ہو۔"

حاشیہ میں قانون الٰہی کے اندر رہ کر اجتہاد و استنباط کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"نہ ایسی عدالت کے حق سماع و فصل خصومات کو تسلیم کرتا جو اصل مالک و فرمانروا کے ملک میں اس کی اجازت کے بغیر اس کے باغیوں نے قائم کرلی ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے ایسی عدالتوں کی حیثیت وہی ہے جو انگریزی قانون کی رو سے ان عدالتوں کی قرار پائی ہے جو برطانوی سلطنت کے حدود میں "تاج" کی اجازت کے بغیر قائم کی جائیں۔"

حاشیہ میں مولانا نے برما و ملایا پر جاپانی قبضہ کے بعد "آزاد ہند ریاست" اور "آزاد ہند فوج" قائم ہونے اور اس کے خاتمہ کے بعد تاج برطانیہ کی طرف سے اس پر مقدمہ چلنے کی تفصیلات پیش کی ہیں، ان عدالتوں کے جج، ان کے کارندے اور وکیل اور ان سے فیصلہ کرانے والے جس طرح انگریزی قانون کی نگاہ میں باغی و مجرم اور بجائے خود مستلزم سزا ہیں، اسی طرح اسلامی قانون کی نگاہ میں وہ پورا عدالتی نظام مجرمانہ و باغیانہ ہے جو بادشاہ ارض و سما کی مملکت میں اس کے سلطان (چارٹر) کے بغیر قائم کیا گیا ہو اور جس میں اس کے منظور کیے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسرے کے منظور کردہ قوانین پر فیصلہ کیا جاتا ہو، ایسا نظام عدالت جرم مجسم ہے ۔۔۔ اور ان کے جملہ احکام قطعی طور پر کالعدم ہیں۔"

مولانا کا یہ پورا مضمون حرف بہ حرف پڑھنے کے قابل ہے جو حقوق الزوجین

ضمیمہ نمبر ا میں درج ہے، لیکن مجبوری اور اضطراری احوال میں مولانا کے فیصلہ سے انحراف کی پوری گنجائش ہے تاہم یہ بات اصولی طور پر مسلم ہے کہ خدا کی زمین پر خدا ہی کا قانون اصل قانون ہے، اس سے بڑھ کر برطانوی اور غیر برطانوی قوانین اور حکومت پر اصولی تنقید میری نظر سے نہیں گزری۔

یہاں مجھے علامہ بدرالدین عینی نیز دوسرے شارحین حدیث کے وہ جملے یاد آگئے جو انھوں نے شرح صحیح البخاری باب بدء الوحی کی طویل حدیث کی شرح میں لکھے ہیں، جہاں ہرقل کو "عظیم الروم" لکھنے اور "ملک الروم" نہ لکھنے کی توجیہات پیش کی ہیں اور یہ لکھا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد سارے دنیا کے بادشاہوں کی بادشاہت ختم اور کالعدم ہوگئی ہے، اب کوئی حقیقی بادشاہ یا حاکم ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ آپ کی طرف سے بادشاہت یا حکومت کا پروانہ حاصل نہ کرلے۔

علامہ شبلی اہل نظر کی نظر میں علامہ شبلی پر اہل نظر نے جتنا لکھا ہے اس کو جمع کرنے کے لیے ایک کتاب درکار ہے، ان کی تعریفیں بھی ہوئیں اور ان پر سخت تنقیدیں بھی ہوئیں اور یہی ان کی عظمت کی نشانی ہے، اس مختصر مضمون میں مغربی علماء و دانشوروں نے ان پر جو لکھا ہے ہم اسے قلم انداز کرتے ہیں اور صرف چند ہندوستانی افراد کے اقتباسات پیش کرتے ہیں، واضح رہے کہ مصر کے مشہور عالم اور عظیم فاضل علامہ رشید رضا مصری اور عظیم عیسائی مورخ جرجی زیدان نے بھی ان کے علمی و تاریخی تفوق اور اصلاح تعلیم کی کوششوں کا تذکرہ کیا ہے۔

سرسید کا تبصرہ ہم الجزیہ کے ضمن میں پیش کرچکے ہیں، معاصرین میں مولانا حالی ان کے بڑے قدرداں تھے اور ڈاکٹر اقبال نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو لکھا ہے کہ

آپ شبلیؒ کے بعد استاذ الکل ہیں۔

مسٹر جناح نے وقف علی الاولاد کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے لکھا تھا علامہ موصوف کا اسلامی جماعت پر بہت بڑا اثر ہے اور ملک کی نظر میں ان کی رائے بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں (فروری و مارچ الہلال ۱۹۱۳ء) "اگرچہ شیخ دس سال تک ازہر کے شیخ الجامعہ رہنے کے بعد بھی اسے ازہر میں جاری نہ کر سکے لیکن شبلیؒ نے اسے ندوۃ العلماء میں عملی جامہ پہنا دیا"۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے انہیں "عہد جدید کا معلم اول" اور "قدیم و جدید کا سنگم" مانا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی انہیں "مصنف اور مصنف گر" کا لقب دیتے ہیں۔

شیخ اکرام لکھتے ہیں "حالی، آزاد، محسن الملک، وقار الملک کتنے آسمانوں کے تارے ہیں۔ ... ان میں شبلیؒ کی بوقلمونی کہاں سے آئے گی ... قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا وہ ایک معجزہ سے کم ہے"۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں (شبلی نامہ: ۲۰۱) "پرانے رنگ کے علماء شبلیؒ سے ناراض تھے یہی ہمارے نزدیک شبلی کی روشن خیالی، بیدار مغزی اور دور بینی کی دلیل ہے"۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"شبلی کے ... حریفوں کو آج کون جانتا ہے؟ مسلم گزٹ کے جن پرچوں میں انکے خلاف اعتراضات اور الزامات چھپے تھے انہیں سخت تلاش کے بعد بھی حاصل کرنا دشوار ہے لیکن شبلی کے قلم کی ایک ایک سطر موجود ہے اور سارا دو ادب کا جزو بنتی جاتی ہے شبلی کے خیالات آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں اور قوم کے دل و دماغ پر انکا سکہ جاری ہے"۔

اقتباسات اور بھی پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن اس مختصر مقالے میں گنجائش نہیں۔

دین کی تبلیغ میں نبی اکرمؐ کا ابلاغی طریقہ کار اور دورِ حاضر میں اس کی معنویت

از ڈاکٹر فضل احمد، کراچی

آج سے پندرہ سو برس پہلے جب دنیا کفر و ضلالت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی تو بطحا کی سنگلاخ چٹانوں سے رشد و ہدایت کا ماہتاب نمودار ہوا جس نے چند سال کے قلیل عرصے میں مشرق سے مغرب تک دنیا کو منور کر دیا، رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین جس قدر سرعت سے روئے زمین پر پھیلا وہ مذاہب کی تاریخ کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے، آپؐ کی وفات کے تیئس سال کے اندر اسلام لاکھوں انسانوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا، مکاشفِ حرا کی آواز تین براعظموں کو عبور کر کے فضائے عالم میں گونج رہی تھی، قیصر و کسریٰ کی فوجیں ان بادیہ نشینوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئیں اس تحریک کے اندر وہ کون سا انقلابی طریقہ کار تھا جس نے خون کے پیاسے کو ایک دوسرے کا جان نثار بنا دیا جن بدویوں کو جانور چرانے کے علاوہ کسی اور چیز سے سروکار نہیں تھا وہ قوم و ملت کی قیادت بطریقِ احسن کرنے لگے، عیسائیت کی تبلیغ صدیوں سے ہو رہی تھی لیکن اب صرف اکا دکا اس کے گروہ کہیں کہیں دکھائی دیتے تھے، یہودیت نے بھی جو عیسائیت سے کہیں زیادہ طاقتور اور قدیم تھی اپنے

حلقے میں کوئی نمایاں کارکردگی انجام نہیں دے سکی۔

بعثتِ نبویؐ سے قبل کے کے مشرکانہ مذاہب اور طریقہ ہائے عبادت لوگوں کے دلوں میں گھر کیے ہوئے تھے، قبیلوں کے باہمی تفرقوں اور رقابتوں نے نسلی اور مذہبی اختلافات برپا کر رکھے تھے، ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کا حریف تھا، اس پرفتن دور میں بس خال خال افراد ہی حق کی تلاش میں سرگرداں تھے ان کو کسی مردِ حق آگاہ اور نجات دہندہ شخص کی آمد کا انتظار تھا۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اسی ماحول و معاشرہ میں ہوا جو ذہنی اور اخلاقی پستیوں کی حد انتہا کو پہنچ گیا تھا، اس میں اخلاق سازی اور رہنمائی کا فرض آپؐ اس حکم خداوندی کے مطابق شروع کرتے ہیں: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ[1] (پڑھو اپنے خداوند کے نام سے جس نے پیدا کیا۔)

اس آیت مبارکہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام کی دعوت اور خدائے وحدہٗ لاشریک پر عقیدہ لازم و ملزوم ہے اسی کے نام سے نبوت کے منصب کا آغاز ہو رہا ہے، یہیں سے اخلاق اور عبادات کا نظام جنم لے رہا ہے، گویا ایک ایسا نظام تشکیل پاتا ہے جس کی فلاح و بہبود کی ابتدا خدائے واحد پر ایمان لانے سے اور قدم قدم پر اسی کی مدد و نصرت سے ہوتی ہے۔ گویا اس کے اندر ہر داعی و مبلغ کے لیے یہ پیام مضمر ہے، خدا ہی کی ذات پر انحصار اور اسی کی تائید و امداد سے اسکی تبلیغی جدوجہد اور ساری سرگرمیوں کی ابتدا و انتہا ہونی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلے طور پر دین کی دعوت دینے کا حکم اس طرح دیا:

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ[۱]	اے محمد (صلعم) آپ اپنے نزدیک ترین قرابتداروں کو (عذاب الٰہی سے) ڈرائیے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے:

قام النبی صلعم حین انزل اللہ تعالیٰ "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ" فقال یا معشر قریش اشتروا انفسکم من اللہ لا اغنی عنکم من اللہ شیئاً یا بنی عبد مناف لا اغنی عنکم من اللہ شیئاً یا فاطمۃ بنت محمد سلینی ما شئت لا اغنی عنک من اللہ شیئاً[۲]	جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ اتری تو نبیؐ نے کھڑے ہو کر فرمایا، اے قریش کے لوگو! اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچاؤ، میں تمہارے کچھ کام نہیں آؤنگا، اے بنو عبد مناف! میں تمہارے کچھ کام نہیں آؤں گا، اے میری بیٹی فاطمہ (دنیا) میں جو چاہو مجھ سے مانگ لو اور اللہ تعالیٰ کے یہاں میں تمہارے کچھ کام نہیں آؤں گا۔

اس آیت مبارکہ اور حدیث شریف سے ایک داعی کو یہ ابلاغی طریقہ سمجھایا گیا ہے اور یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت کو اپنے گھر اور رشتہ داروں سے شروع کرے اور پہلے ان پر توجہ دے، کیونکہ حضورؐ کو خصوصیت کے ساتھ اس بات کا حکم دیا گیا ہے۔

سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات میں آپؐ کو انذار کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے:

یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ	اے (محمدؐ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ ۱؎

اٹھو اور ہدایت کرو اور اپنے خداوند کی بڑائی کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور ناپاکی سے دور رہو اور (اس نیت سے) احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ کے طالب ہو۔

علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہاں ظاہری کپڑا اوڑھنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ اے خلوت و گوشہ نشینی کی چادر اوڑھنے والے کب تک مخفی رہو گے اٹھو اور لوگوں کو متنبہ کرو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ دین کا علم و فہم رکھنے والوں کو صرف اپنی ذات کے دائرے میں محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ انہیں ہر خاص و عام کو دعوت دینی چاہیے وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ کہہ کر حکم دیا گیا کہ اپنے رب کی عظمت و شوکت بیان کرو، اس کے آثار جبرت و قدرت کا اظہار کرو تا کہ اس کی قدرت و یکتائی کے تصور سے مشرکین کے دلوں میں اپنے بتوں اور خیالی معبودوں کی وقعت کم ہو اور وہ توحید کی طرف مائل ہوں اور یہ بھی سمجھ لیں کہ نافرمانی پر جو بلا آئے گی اس کو ان کے معبودان باطل کبھی دفع نہ کر سکیں گے۔

اس تفسیر سے ایک ابلاغی انداز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ داعیان حق کو اپنے دلائل بیان کرنے میں مخالفین سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنی بات اس انداز سے پیش کریں کہ معبودان باطل کو ماننے والے اپنی شکست تسلیم کر کے معبود حق کی طرف رجوع ہو جائیں وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اپنی ذات و صفات اور اخلاق کو نجاست سے پاک رکھیں کیونکہ ظاہری طہارت کا بڑا اثر قلبی طہارت پر

ہوتا ہے اسی طرح اپنی صفات میں ایسی قبیح حرکتوں کو شامل نہ کریں جو ایک داعی کے شان کے خلاف ہو اور جس سے لوگ قریب ہونے کے بجائے اور متنفر ہو جائیں۔

آگے وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ کا حکم دے کر مبلغوں کو سمجھایا کہ تعلیم و تبلیغ اور پند و نصائح کرنے کا احسان نہ جتلانا چاہیے اور اپنے معتقدوں کی کثرت کا آرزومند اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ لوگوں کی زیادتی سے زیادہ امداد ملے گی۔

اس کے بعد وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ سے لوگوں کی ایذارسانی اور بدگوئی پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ کیونکہ دعوت و تبلیغ حق کی راہ میں قدم قدم پر حوصلہ شکنی کی باتیں، ہنسی مذاق اور دوستوں اور دشمنوں کے طعن و تشنیع اور ناسازگار ماحول کا سامنا کرنا پڑے گا، ان تمام تکلیف دہ حالات میں اللہ کی رضا کے لیے پیہم صبر کرتا اور اپنے منصب کو انجام دیتا رہے۔ یقیناً یہ وہ ابلاغی طریقہ کار ہے جو ایک دن انسانوں کو اپنی طرف رجوع کرلے گا۔

ان آیات کے نزول کے بعد آپؐ نے دعوت و تبلیغ کے کام کو مزید وسعت دی، مگر اس کے ساتھ ساتھ دشمنوں کی مخالفتیں بھی شروع ہوتی گئیں۔ قریش مکہ جو نبوت ملنے سے پہلے آپؐ کو امین و صادق کہا کرتے تھے اب خائن کہنے لگے، جھوٹ وغیرہ کا الزام لگانے لگے، مگر آپؐ بدگوئی اور ایذارسانی سے متاثر ہو کر اپنے منصب سے پیچھے نہیں ہٹے۔

ابن اسحاق سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح قبائل عرب کو اسلام کی دعوت دینا شروع کی کہ آپؐ بنفس نفیس قبائل اور اس کے سرداروں کے پاس تشریف لے جاتے اور اللہ کی رحمت و ہدایت کو انکے سامنے

پیش کرتے ہے۔

ان واقعات وقصص سے پتہ چلتا ہے کہ جبتک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے منصب پر فائز نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت تک مشرکین مکہ نے آپؐ کی شان میں کوئی نازیبا بات نہیں کی بلکہ وہ آپؐ کی مداحی میں رطب اللسان رہتے تھے، مگر جب آپؐ نے یایھا الناس، قولو الا الہ الا اللہ تفلحوا کہا تو آپؐ کی مخالفت شروع ہوگئی، اس سے معلوم ہوا کہ ایک داعی کو بھی ایسی ہی آزمایش سے دوچار ہونا پڑے گا، ایسے مواقع پر بجائے برانگیختہ ہونے کے محمد مصطفیٰ صلعم کی تعلیمات کو مدنظر رکھے گویا ان واقعات سے ابلاغی صورت کی توضیح وتشریح ہوگئی۔

مندرجہ ذیل آیات سے بھی تبلیغی اصول کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی، اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی،	(محمدؐ) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے
وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی ؕ ۶	کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا اور تم کو
	کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔

مفسرین سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم ایک دفعہ قریش کے سرداروں کو اسلامی تعلیم دے رہے تھے اور پورے انہماک کے ساتھ ان کی طرف توجہ فرما تھے دل میں خیال تھا کہ کیا عجب اللہ تعالیٰ انہیں اسلام نصیب کرے۔ ناگاہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم آپؐ کے پاس آئے جو مسلمان ہو چکے تھے اور عموماً حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے اور دین اسلام کی تعلیم سیکھتے رہتے تھے۔ آج بھی حسب عادت آتے ہی سوالات شروع کیا اور آگے بڑھ کر حضورؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا، اسوقت حضورؐ چونکہ صناویدِ قریش کو اسلام کا پیغام پہنچانے میں پوری طرح منہمک تھے اس لیے

ان کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ بلکہ آپؐ کو اس طرح انکا آنا اور سوال کرنا بارِ خاطر ہوا جس کے اثرات روئے انور سے بھی ظاہر ہونے لگے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ آپؐ کی بلند و برتر شان اور اعلیٰ اخلاق کے یہ منافی ہے کہ اس نابینا سے جو ہمارے خوف سے دوڑتا بھاگتا آپؐ کی خدمت میں علم دین سیکھنے کے لیے آیا تھا آپؐ اس سے منہ پھیر لیں اور ان لوگوں کی طرف التفات فرمائیں جو سرکش مغرور اور متکبر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تبلیغ دین میں شریف و ضعیف، فقیر و غنی، آزاد و غلام، مرد و عورت، چھوٹے بڑے سب برابر ہیں، سب کو یکساں نصیحت کی جائے، ہدایت[ع] خدا کے ہاتھ میں ہے وہ اگر کسی کو راہ راست سے دور رکھے تو اس کی حکمت وہی بہتر جانتا ہے

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ۞ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو) سمجھاتے رہیے کیونکہ سمجھانا ایمان لانے والوں کو نفع دے گا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے قرآن پاک کی آیات سنا کر نصیحت کرنا مقصود ہے

ع معارف : ان آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے واسطے سے آپؐ کی امت کو تبلیغ و دعوت کے اس طریقہ سے مطلع کیا گیا ہے کہ رؤسائے قریش کے ایمان لانے کی توقع میں آپؐ انکی طرف غیر معمولی التفات فرما کر ان ضعفائے مسلمین کی اصلاح و تربیت کی جانب سے بے توجہی اور غفلت نہ اختیار کریں۔ انکے مقابلہ میں آپؐ کے التفات فراواں کے اصل مستحق یہ خستہ حال مومنین ہی ہیں جو تزکیہ و ہدایت کی طلب میں مخلص ہیں اور رہے وہ امراء و رؤساء جنکے ایمان لانے کی امید ہی نہ ہو یا امید موہوم ہو انکے پیچھے اپنی قوت و وقت صرف نہ کریں۔

کہ وہ مومنین کے لیے نفع رساں ہے تو ظاہر ہے کفار کے لیے بھی اس لحاظ سے کہ وہ انشاء اللہ اس کے ذریعے مومنین میں داخل ہو جائیں گے اور آیت کے مصداق میں شامل ہو جائینگے۔

قرآن مجید کی ایک آیت یوں آئی ہے جس کے سمجھنے پہ تبلیغی انداز کے سمجھنے کا دارومدار ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ	اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر
قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ	وہ اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ انکو
مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ	سمجھائے پھر راستہ بھلاتا ہے اللہ
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؏	جس کو چاہے اور راستہ دکھاتا ہے
	جس کو چاہے اور وہ زبردست
	حکمتوں والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف بھیجا ہے تو اسے اس قوم کا ہم زبان بنا کر بھیجا ہے تاکہ وہ احکام الٰہی کو ان ہی کی زبان میں اور ان ہی کے محاورات میں بتلائے اور قوم کے لیے انکا سمجھنا آسان ہو لیکن اگر رسول کی زبان امت کی زبان سے مختلف ہو تو ظاہر ہے کہ اسے اس کو ترجمہ کرانے کی مشقت اٹھانا پڑتی جس کے بعد بھی احکام کو صحیح سمجھنا مشکوک رہتا اس لیے اگر اللہ نے عبرانی بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا تو رسول کی زبان بھی عبرانی بنائی اور فارسیوں کے رسول کی زبان فارسی۔

ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مکان کے اعتبار سے پوری دنیا کے لیے اور زمانے کے اعتبار سے قیامت تک کے لیے ہے۔ دنیا کی کوئی قوم خواہ وہ کسی ملک کی رہنے والی یا کوئی بھی زبان بولنے والی ہو آپ کے دائرۂ رسالت سے

باہر نہیں۔ جب رسولؐ کی بعثت اور دعوت دنیا کی تمام اقوام کے لیے عام ہے جن میں سینکڑوں زبانیں رائج ہیں تو ان سب کی ہدایت کے لیے دو ہی صورتیں ممکن تھیں، ایک یہ کہ قرآن مجید ہر قوم کی زبان میں جدا جدا نازل ہوتا اور رسول کریمؐ کی تعلیمات و ہدایات بھی ہر قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کیلئے یہ انتظام مشکل نہ تھا لیکن تمام اقوام عالم کے لیے ایک رسول، ایک کتاب، ایک شریعت اس لیے بھیجی گئی کہ ہزاروں اختلافات کے باوجود ان میں دینی، اخلاقی اور معاشرتی وحدت اور یکجہتی پیدا ہو اور یہ عظیم الشان مقصد اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ آپؐ کی دعوت و تبلیغ کی وجہ سے عرب و عجم کا فرق مٹ گیا، ہر ملک و قوم اور ہر زبان بولنے والوں میں ایسے علماء پیدا ہو گئے جنھوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی اپنی قومی زبان میں نہایت سہولت کے ساتھ پہنچایا اور رسولؐ کو قوم کی زبان میں بھیجنے کی جو حکمت تھی وہ حاصل ہو گئی[11]۔

محمد مصطفےٰ صلعم نے دنیا کی قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر رکھا اور خدا کے پیغام کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا اس لیے آپؐ نے اپنی تبلیغ کے لیے قریش، غیر قریش، حجاز، یمن، عرب، عجم کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔

اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہوئی کہ ایک مبلغ کو اپنی تبلیغ میں رنگ و نسل کے امتیازات کو مٹا دینا چاہیے جو بھی طالب حق آئے اس کا تعلق کسی بھی زبان، ملک، قوم سے ہو اسے جتنا نفع پہنچا سکتا ہے پہنچائے، اسلام نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا اور

مسلمانوں کا یہ فرض بتایا کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔ ارشاد ربانی ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ	تم بہترین امت ہو جو بھیجی گئی ہے عالم
لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	میں، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ	منع کرتے ہو برے کاموں سے اور
بِاللهِ [۱۲]	ایمان لاتے ہو اللہ تعالیٰ پر۔

گویا دوسری امتوں سے ممتاز ہونے کی جہاں متعدد وجہیں ہیں وہاں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسانیت کو اس کے خالق کی طرف بلانے کا منصب عطا کیا گیا یقیناً یہ فضیلت ایک داعی کو اپنے داعیانہ کام میں، ہمت، حوصلہ اور بلند ارادہ جیسی صفات عنایت کر دے گی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیام الٰہی لوگوں تک پہنچایئے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہ دیا ۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ	اے اللہ کے رسول پہنچا دیجئے لوگوں
إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ	کو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر اتارا
تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللهُ	ہے اگر تونے ایسا نہ کیا تو تم نے
يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ [۱۳]	اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھکو
	خدا لوگوں سے بچالے گا۔

اس آیت مبارکہ سے ایک داعی کو یہ سبق ملتا ہے کہ وہ ابتدا تو وہ علوم سیکھے جو

حضرت محمد صلعم پر نازل ہوئے، یعنی قرآن حدیث وغیرہ پھر سیکھنے کے بعد اس علم کا حق یہ ہے کہ اسکو دوسروں تک پہنچائے۔ ایک اور جگہ ارشاد باری ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ۚ

اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعے سے بلائیں اور ان سے مناظرہ خوش آیند طریقے سے کیا کریں۔

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے ہیں، ہم کسی کے سامنے کوئی بات پیش کر کے اس کو قبول کرنے کی اسے دعوت دیتے ہیں تو عموماً یہی تین طریقے استعمال کرتے ہیں، اس بات کے ثبوت و تائید میں کچھ دلائل (دلیلیں) پیش کرتے ہیں یا مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور موثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا اس کی دلیلوں کو مناسب طریقے سے رد کر کے اس کی غلطی اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقے کا نام حکمت دوسرے کا نام موعظۂ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے، اسلام نے دعوت و تبلیغ کے یہی طریقے بتلائے ہیں۔

اس تشریح سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کریں، سختی اور شدت کا طریقہ دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے جن کے تحت اچھی اور حق بات کو بھی مسترد کر دیا جاتا ہے، اس طرح دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے، اسی لیے قرآن حکیم نے اپنے پیغمبر کو مخالف اور دشمن سے بھی نرمی برتنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت

ہارون علیہ السلام کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لیکر جانیکی ہدایت ہوتی ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوتا ہے :

اذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ۱۵	تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا (خدا سے) ڈرے۔

دعوت و تبلیغ میں رفق و تحمل اور حلم و بردباری کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی، نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی سرکش ہو سکتا ہے۔ پھر ایسے مجرم و سرکش کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعیوں، مبلغوں اور واعظوں کو تمام مخالفین، مجرمین اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقوں کے بارے میں جو آپ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے تھے یہ حکم ہوتا ہے :

فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ۱۶	تو ان سے درگذر کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کر جو انکے دلوں میں اثر پیدا کرے۔

اس تعلیم میں دعوت و تبلیغ کے تین طریقوں کو بیان کیا گیا، اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفین کی بدتہذیبی اور درشتی سے درگزر کرنا چاہیے، دوسرے یہ کہ انکو نصیحت کرنا چاہیے اور شیریں کلامی سے سمجھانا چاہیے، تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ موثر انداز ہو جو مخاطبین کے دل میں جگہ پیدا کرے۔ ایک حدیث میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے :

یسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا	یعنی آسانیاں پیدا کیجئے، مشکلات نہ پیدا کیجئے، خوشخبری سنایا کیجئے اور لوگوں کو متنفر مت کیا کیجئے۔

یہ وہ تبلیغی طریقہ ہے جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی کلید ہے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے سامنے اور انہوں نے عام مسلمانوں کے سامنے انہی اصولوں کے مطابق دین الٰہی کو پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ کے لطف وشفقت رحم وکرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤں سے دلوں کو پُر امید اور مسرور بنانا اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو مایوس اور خوفزدہ بنایا جائے۔

تبلیغ کا ایک اور اصول حضور اقدس صلعم کی تعلیم سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ انکو اس کے سامنے پیش کیا جائے، پہلے توحید و رسالت کو پیش کیا جائے اس کے بعد عبادات اور ان میں بھی اہم فالاہم کو مدنظر رکھا جائے، اس حدیث سے یہ مضمون واضح ہوتا ہے:

عن ابن عباسؓ ان معاذاً قال بعثنی رسول اللہ صلعم فقال انک تاتی قوماً من اھل الکتاب فادعھم الی شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ فان ھم اطاعوا	حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ مجھ حضورؐ نے یمن کا حاکم بنا کر، بھیجا تو فرمایا جب تمہاری اہل کتاب سے ملاقات ہو تو پہلے انکو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت

لذلك فاعلمهم ان الله افترض عليهم خمس صلوات في كل يوم وليلة فان هم اطاعوا لذلك فاعلمهم ان الله افترض عليهم صدقة تؤخذ من اغنيائهم فترد الى فقرائهم فان هم اطاعوا لذلك فاياك وكرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانه ليس بينها وبين الله حجاب[١٥]

اور میری رسالت کی شہادت کی دعوت دینا جب وہ اسے مان لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں جب وہ یہ بھی مان لیں تو انہیں بتلانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جو انکے دولتمند لوگوں سے لے کر انکے فقراء میں تقسیم کی جائے گی، جب وہ اس کو قبول کر لیں تو تم زکوٰۃ میں انکا بہترین مال ہرگز نہ لینا کیونکہ مظلوم کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔

اس حدیث سے یہ سبق ملا کہ دعوت و تبلیغ کا کام جذباتی نہیں ہے کہ اسے بغیر کسی اصول و ضابطے کے کیا جائے بلکہ ہوش و خرد کے ساتھ مخاطب کے احوال کو مدنظر رکھتے ہوئے گاہے گاہے اسلام کی دعوت موثر انداز میں دینا چاہیے۔

اسلام کی شاندار کامیابی اور لوگوں کے دلوں پر اس کی حیرت انگیز حکومت نے اس کو اس الزام کا مورد بنا دیا ہے کہ وہ تلوار کا مذہب ہے چنانچہ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت تلوار سے ہوئی ہے اور اسی کے بل بوتے پر اس کو قائم رکھا گیا ہے۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو قعر مذلت سے نکالنے اور خبائث سے پاک

اور جنگ بند ہوگئی اور رزم کا میدان محبت و اخوت کی بزم بن گئی۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین فرماتے تو سردار کو یہ ہدایت فرماتے:

واذا لقیت عدوك من المشرکین	یعنی جب مشرکوں میں سے کسی دشمن
فادعهم الی ثلاث خصال فایتهن	قوم سے مقابلہ ہو تو ان کو تین باتوں
ما اجابوك فاقبل منهم وکف عنهم	میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی
ثم ادعهم الی التحول من دارهم	دعوت دو، ان میں سے جو بات بھی وہ مان
الی دار المهاجرین واخبرهم	لیں اس کو قبول کر لو اور اس پر تلوار
انهم ان فعلوا ذلك فلهم ما	نہ اٹھاؤ، اس کے بعد ان سے خواہش
للمهاجرین وعلیهم ما	کرو کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آ جائیں
علی المهاجرین فان ابوا ان	تو ان کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے
یتحولوا منها فاخبرهم انهم	اگر وہ نہ مانیں تو ان کی حالت بدوی مسلمانوں
یکونون کاعراب المسلمین	کی سی ہوگی، قانون مسلمانوں کا جاری
یجری علیهم حکم الله	ہوگا لیکن غنیمت اور فئی میں ان کا
الذی یجری علی المؤمنین	حصہ نہ ہوگا جب تک کہ وہ جہاد نہ کریں
ولا	اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو انہیں
یکون لهم فی الغنیمة والفئ	جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہو اگر وہ
شیء الا ان یجاهدوا مع المسلمین	اس کو مان لیں تو قتال سے رک جاؤ
فان هم ابوا فسلهم الجزیة	اگر وہ اس کو بھی نہ مانیں تو پھر خدا کی
فان هم اجابوك فاقبل منهم	مدد مانگ کر لڑائی شروع کر دو۔

وکف عنهم فان هم ابوا فاستعن

بالله وقاتلهم[۲۳]

یہ وہ ابلاغی طریقہ تھا جس سے قبیلے اور قوم اسلام کی جانب بغیر کشت وخون کے کھنچے چلے آرہے تھے۔ دعوت وتبلیغ کے وہ اصول جو صحابہؓ نے اختیار کیے تھے اگر ان پر طائرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دین کی اشاعت کے سلسلے میں وہ مخاطبین و سامعین کی طبیعت ومزاج کو بھی سامنے رکھتے تھے مثلاً ایک حدیث ہے:

عن ابی وائل قال کان عبد الله	حضرت ابو وائلؓ فرماتے ہیں کہ عبداللہ
یذکر الناس فی کل خمیس فقال	بن مسعودؓ ہر جمعرات کو لوگوں کے سامنے
له رجل یا ابا عبد الرحمٰن	وعظ کرتے تھے، ایک شخص نے کہا
لوددت انك ذکرتنا کل یوم	ابو عبدالرحمٰن، میری خواہش ہے کہ
قال اما انه یمنعنی من ذلك	آپ ہمیں ہر روز وعظ کیا کریں فرمایا
انی اکره ان املکم وانی	روزانہ وعظ میں یہ امر مانع ہے کہ
اتخولکم بالموعظة کما کان	کہیں تم اکتا نہ جاؤ، اور میں نے تمہاری
النبی صلعم یتخولنا بها	نصیحت کے لیے اسی طرح مقرر کیا ہے،
مخافة السآمة علینا[۲۴]	جس طرح رسول اللہؐ نے لوگوں کو وعظ
	کرنے کے لیے وقت مقرر کیا تھا کہ
	کہیں ہم اکتا نہ جائیں۔

اس حدیث سے یہ بات عیاں ہوئی کہ داعی ومبلغ کو سامعین اور مخاطبین کے احوال کو مدنظر رکھنا چاہیے اور آسانی وسہولت کے ساتھ دین کی تعلیم کو آگے بڑھانا چاہیے۔

جو شخص امت محمدیہ صلعم کو کسی نیک کام کی طرف بلاتا ہے اور اس کے بلانے کی وجہ سے دوسرے اشخاص نیک عمل کرتے ہیں تو ان لوگوں کے ثواب میں کمی کیے بغیر بلانے والے کو اس کا ثواب ملتا رہے گا، آپؐ کا ارشاد ہے :

عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ	حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال	نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا جو شخص ہدایت
من دعا الی ھدی کان لہ	کی طرف بلائے اسے ہدایت پر چلنے
من الاجر مثل اجور من تبعہ	والوں کا بھی ثواب ملے گا اور چلنے
لا ینقص ذالک من اجورھم	والوں کے ثواب میں کسی قسم کی کمی
شیئاً ومن دعا الی ضلالۃ	نہیں کی جائے گی اور جو شخص گمراہی
کان علیہ من الاثم مثل	کی طرف بلائے اس پر گمراہی میں چلنے
آثام من تبعہ لا ینقص ذالک	والوں کا بھی گناہ ہوگا اور ان چلنے
من آثامھم شیئاً[1]	والوں کے گناہ میں بھی کسی قسم کی کمی
	نہیں کی جائے گی۔

محمد عربیؐ کا یہ فرمان ایک داعی و مبلغ کو ہمت، ولولہ اور شوق فراہم کرتا ہے کیونکہ جب اس کے قلب میں یہ بات سما جائے کہ میرے اقوال اور میری تقریریں اور میری تگ و دو کا ثمرہ آخرت میں ان لوگوں کے اعمال کی وجہ سے بھی ملے گا جنھوں نے اس کی دعوت کے نتیجہ میں کوئی کار خیر کیا ہوگا یا اس کی تلقین سے ان کو اپنے گناہوں پر ندامت ہوئی ہوگی اور وہ اس کی وجہ سے ان سے باز آئے ہوں گے۔

اس حدیث میں ایک ابلاغی پہلو یہ بھی ہے کہ داعی اور مبلغ مایوسی اور کم ہمتی کے وقت

اس حدیث کو ذہن نشین کرے تو اس کے دل میں امید کے دیے روشن ہو جائیں گے اور وہ پہلے سے زیادہ مستعد و منہمک ہو جائے گا۔

سطور بالا میں دین کی تبلیغ میں نبی اکرمؐ کے ابلاغی طریقوں اور اصولوں کا جائزہ لیا گیا ہے عصر حاضر میں روس کی تباہی و بربادی کے بعد نو آزاد ریاستوں کے قیام اور دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو مدنظر رکھتے ہوئے دور حاضر میں تبلیغ دین کے امکانات اور ضرورت واہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے مزید یہ کہ عصر حاضر کی بڑھتی ہوئی لادینی شورشوں اور تباہ کن ثقافتی یلغاروں کے دفاع اور حقانیت دین حنیف کے اثبات و اشاعت کے نقطۂ نظر سے بھی اس کے امکانات نہایت ہی روشن اور وسیع ہیں۔

دور حاضر میں عالم اسلام میں عموماً اور برصغیر پاک و ہند میں خصوصاً جو دینی قوتیں و جماعتیں اس اہم دینی فریضہ کی تکمیل میں مصروف ہیں اگر انکا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں نبی اکرمؐ کے ابلاغی اسلوب اور طریقہ مثلاً وسیع النظری رواداری، حکمت و موعظت اتحاد و یگانگت، احسن مجادلہ، ضبط و تحمل، اخلاص و تقویٰ اور تکریم انسانیت کا بڑی حد تک فقدان نظر آتا ہے، کیونکہ یہ ساری جماعتیں اپنے اپنے مکتب و مسلک کے عقائد و نظریات کی تبلیغ میں مصروف ہیں، ان میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ ایک دوسرے کے عقائد و نظریات اور خیالات کو سن کر برداشت کر سکیں، جس کا نتیجہ یہ ہے مسلمان گروہوں، فرقوں، مسلکوں اور مکتبوں کی حدود میں محدود ہوتے جا رہے ہیں اور اسلام کا آفاقی اور عالمگیر پیغام محدود ہوتا جا رہا ہے، مسلمان ملکوں اور مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی نظام کا عملی نفاذ نہ ہو سکنے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے۔

کرنے کے مقدس عمل میں مصروف تھے تو آپ صلعم کے دشمن آپؐ سے انتقام لینے کے منصوبے تیار کر رہے تھے، وہ آپ صلعم کو ہلاک کرنے اور دینِ الٰہی کو تباہ کرنے کا عزم مصمم کیے ہوئے تھے، قریش آپؐ کو اور آپؐ کے متبعین کو اپنا آبائی مذہب ترک کر دینے کی وجہ سے مرتد شمار کرتے تھے، انھیں یہ امر بہت کھٹکتا تھا کہ ان مرتدوں نے مکہ کے حریف شہر میں پناہ لے رکھی ہے تاکہ وہاں رہ کر اپنے انقلابی مذہب کو پروان چڑھائیں اسی لیے ان کے نزدیک متحدہ عرب کا یہ فرض تھا کہ ان سرپھرے اور پُرجوش لوگوں کو نیست و نابود کر دیں جنھوں نے اپنے گھر بار اور مال و دولت کو اس مقصد سے خیرباد کہا تھا کہ ایک ایسے ان دیکھے خدا کا پیغام دنیا کو پہنچائیں جو اپنی عبادت کے معاملے میں اتنا سخت گیر تھا کہ دوسروں کی شرکت برداشت نہیں کرتا تھا۔

عرب کے تمام قبائل قریش کے لیے گوش بر آواز رہتے تھے کیونکہ وہ ان کے ان خداؤں کے قدیم خادم تھے جن کے منکروں کو مٹانے کا وہ بیڑا اٹھائے ہوئے تھے، ایسی صورت میں اگر آپؐ اور آپؐ کے جاں نثار اپنے تحفظ کے لیے تلوار ہاتھ میں نہ لیتے تو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، پھر بھی جب [illegible] پیش قدمی کر کے ان پر حملہ آور نہیں ہوئے، اس وقت تک یہ اعلان نہیں ہوا کہ چونکہ کفار مومنوں کے معاملے میں خون کے رشتے اور عہد و پیمان کا خیال نہیں رکھتے نیز انھوں نے صلح کے معاہدے توڑ دیے ہیں اس لیے تم بھی ان پر حملہ آور ہو کر اپنی حفاظت کرو۔

ارشادِ ربانی ہے:۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ	اور لڑو ان سے یہاں تک کہ فساد باقی
وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۔	نہ رہے اور صرف اللہ تعالیٰ کا مجوب

دین ہی رہ جائے۔

مسلمانوں کے لیے مدافعانہ کارروائی اپنے تحفظ کا معاملہ بن گئی ان کے لیے دو ہی صورتیں تھیں یا تو دشمنوں کے آگے اپنا سر رکھ دیں یا حملہ آور دشمنوں کا مقابلہ کریں۔ انھوں نے آخرالذکر طریقہ اختیار کیا اور ایک طویل کشمکش کے بعد دشمنوں پر غلبہ پانے میں کامیاب ہوئے۔

جو قانون سرتاپا امن پسندی، سلامت طبعی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے، اس کو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا کہ آنحضرتؐ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، مندرجۂ ذیل واقعہ سے اس کے صدق وکذب کی وضاحت ہو جائے گی۔

اسامۃ بن زید بن حارثۃ
یحدث: قال بعثنا رسول اللہ ﷺ
الی الحرقۃ من جھینۃ
فصبحنا القوم فھزمناھم
قال ولحقت انا ورجل من الانصار
رجلا منھم فلما غشیناہ قال
لا الٰہ الا اللہ قال فکف عنہ
الانصاری وطعنتہ برمحی
حتی قتلتہ قال فلما قدمنا
بلغ ذالک النبی صلعم فقال

حضرت اسامہ بن زیدؓ بیان کرتے
ہیں کہ رسول اللہؐ نے ہمیں جہاد کے لیے
حرقہ کی طرف روانہ کیا جو قبیلہ جہینہ
کی ایک شاخ ہے، ہم صبح وہاں پہنچ
گئے اور ان کو شکست دیدی میں نے
اور ایک انصاری نے مل کر ایک
شخص کو پکڑ لیا جب وہ ہمارے
حملہ کی زد میں آگیا تو اس نے کہا
لا الٰہ الا اللہ، انصاری تو کلمہ
سُن کر الگ ہو گیا لیکن میں نے نیزہ

لی یا اسامۃ اقتلتہ بعد	مار کر اس کو ہلاک کر دیا جب ہم واپس
ما قال لا الہ الا اللہ قال قلت	آئے تو حضورؐ کو بھی اس واقعہ کی خبر
یا رسول اللہ انما کان متعوذاً	ہوئی آپؐ نے مجھ سے فرمایا تم نے کلمہ
قال فقال اقتلتہ بعد ما	پڑھنے کے باوجود قتل کر ڈالا، میں نے
قال لا الہ الا اللہ قال فما	عرض کیا یا رسول اللہ اس نے جان بچانے
زال یکررھا علیّ حتیٰ تمنیت	کے لیے کلمہ پڑھا تھا، حضورؐ نے پھر فرمایا
انی لم اکن اسلمت قبل	تم نے کلمہ پڑھنے کے باوجود اس کو قتل
ذالک الیوم [۱]	کر ڈالا اور حضورؐ یہ کلمات بار بار دہراتے
	رہے اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں
	آج سے پہلے اسلام نہ لایا ہوتا ۔

جنگ کے اس اصول سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی کو مجبور کر کے بزور شمشیر مسلمان بنا لینا، یہ واقعہ مغربی فکر و لٹریچر سے ان مرعوب ذہنوں اور مستشرقین کے جیسے دوئں کا عمدہ جواب ہے جو اسلام کو تشدد پسند مذہب کے نام سے یاد کرتے ہیں، قرآن حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے :

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ	اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں
فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ	سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ
ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ	دے، یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ [۱]	پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے
	یہ اس لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں ۔

آیت مذکورہ میں کلامِ الٰہی سُننے کے بعد اگر کوئی شخص مسلمان نہ ہوا تو اسے قتل کرکے جہنم رسید کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسے اپنی جائے امن میں پہنچانے کی تلقین کی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے امن پسندی اور رواداری کو کیسی اہمیت دی ہے، یہاں تک کہ اس نے ان مشرکوں سے بھی لڑنے کو منع کیا جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلے کے دوست ہوں اور صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ	تو اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں
وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا	تو پھر نہ لڑیں اور اگر وہ تمہارے
جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝	سامنے صلح کرنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ
	نے تم کو حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔

اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنیٰ ہوتے کہ "تلوار یا اسلام" تو کیا اس امن پسندی صلح جوئی اور ترک جدال کی صورت ممکن ہو سکتی تھی ؟

اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال رکھا جائے بلکہ تلوار اٹھانے سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کی جائیں، اول یہ کہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائیں اور بھائی بن جائیں اگر ایسا کریں تو وہ حکومت دین اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جائیں گے اور اگر یہ انہیں منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہکر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کرلیں اس صورت میں انکی حفاظت ہمارے ذمے ہوگی ان دو باتوں میں سے کوئی بات قبول کر لینے کے بعد ان سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں اس کی کتنی مثالیں موجود ہیں کہ کسی دشمن نے اسلام یا محض اطاعت قبول کرلی تو خونریزی

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام دینی جماعتیں ایک متفقہ منصوبہ تبلیغ پر جو کہ اسلام کی اساسی تعلیمات پر مشتمل ہو متحد ہو جائیں اور پوری قوم کو صرف اور صرف دین حنیف کی دعوت دیں۔

اگر ہماری دینی جماعتیں باہم متحد ہو گئیں تو انشاء اللہ اسلامی نظام کے عملی نفاذ میں دنیا کی کوئی بھی طاغوتی قوت حائل نہ ہو سکے گی۔

حوالے

[1] القرآن، العلق: ۱ [2] ایضاً، شعراء: ۲۱۴ [3] ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی، سنن دارمی، ج ۲، ص ۲۱۵، کتاب الرقاق باب ۲۳، "وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ" نشر السنۃ ملتان، پاکستان [4] القرآن، المدثر: ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ [5] ابو محمد عبدالحق حقانی، تفسیر حقانی، ج ۷، ص ۲۵۹، مکتبۃ الحسن لاہور [6] محمد بن اسحٰق، سیرۃ ابن اسحاق، بحوالہ نقوش رسول نمبر ج ۱۱، ص ۲۴۹، باب ۳۱، قبائل عرب کو دعوت، شمارہ نمبر ۱۳۰، جنوری ۱۹۸۵ء، ادارہ فروغ اردو لاہور [7] القرآن، العبس: ۱ تا ۳ [8] ایضاً، الذاریات: ۵۵ [9] القرآن، ابراہیم: ۴ [10] محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، ج ۵، ص ۲۱۲، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۹۹۱ء [11] القرآن، آل عمران: ۱۱۰ [12] ایضاً، المائدہ: ۶۷ [13] ایضاً، النحل: ۱۲۵ [14] ایضاً، طٰہٰ: ۴۳ [15] ایضاً، النساء: ۶۳ [16] محمد بن اسمٰعیل بخاری، صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۲۰، کتاب العلم باب ۱۱ کان النبی صلعم یتخولہم بالموعظۃ الحسنۃ کی لا ینفروا، ناشر حامد اینڈ کمپنی، مدینہ منزل ۳۸ اردو بازار لاہور، ایڈیشن بار اول ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء [17] مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب الایمان باب الدعاء الی الشہادتین وشرائع الاسلام، ج ۱، ص ۱۱۱، فرید بک اسٹال، اردو بازار لاہور [18] القرآن، البقرہ: ۱۹۳ [19] مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم قتل الکافر

بعد قولہ لا الٰہ الا اللہ، ج ۱، ص ۹۹ ؎ القرآن، التوبہ: ۶ ؎ ایضاً، النساء: ۹۰
؎ مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الجہاد، والسیر باب تامیر الامام الامراء علی البعوث
ووصیتہ، ایاھم بآداب الغزو، ج ۲، ص ۸۳۴، قرآن محل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔
باہتمام محمد سعید اینڈ سنز ؎ محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، کتاب العلم باب من جعل
لاھل العلم ایاما معلومۃ، ج ۲، ص ۱۲۷ ؎ مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب العلم
باب من سن سنۃ حسنۃ او سیئۃ ومن دعا الی ھدی او ضلالۃ، ج ۲،
ص ۷۹، قرآن محل، کراچی۔

سلسلہ سیرۃ النبیؐ

از علامہ شبلیؒ و مولانا سید سلیمان ندویؒ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وغزوات اخلاق وعادات تعلیم وارشاد کے اس عظیم الشان کتابی ذخیرہ کو مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کیساتھ سات جلدوں میں مرتب کیا گیا ہے، پہلی جلد میں ولادت باسعادت سے فتح مکہ، دوسری میں قیامت امن خلافت تکمیل شریعت وفات اور اخلاق وعادات نبوی اور دعوت وتبلیغ کے طریقے کا مفصل بیان ہے حصہ سوم میں معجزہ کی حقیقت اور اسکا امکان ووقوع اور خصائص نبوت پر مکمل بحث وتبصرہ ہے حصہ چہارم میں منصب نبوت کی تشریح کیساتھ تبلیغ نبوت کے اصول اور حضور اکرمؐ کے پیغمبرانہ طریق کار پر نہایت مفصل بحث کی گئی ہے حصہ پنجم کا موضوع عادات اور جلد ششم اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے ساتویں جلد میں اسلام کے طرز حکومت کا بیان ہے پہلی جلد کے مقدمے میں ابتدائی عہد کے سیر ومغازی کے مصنفین کا تذکرہ اور اہم کتب سیر پر تبصرہ بھی ہے۔

قیمت جلد اول ۶۰/، دوم ۵۰/، سوم ۲۵/، چہارم ۲۵/، پنجم ۱۰/، ششم ۲۵/، ہفتم ۲۵ روپے

"منیجر"

دینی مدارس کے اساتذہ اور فن تعلیم و تربیت

از جناب مظفر حسین غزالی صاحب، دہلی۔

تعلیمی نظام میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے، جس کا کام نوخیز نسل تک علمی ورثے کو منتقل کرنا ہوتا ہے، یہ بذات خود ایک بڑی ذمہ داری ہے جس کو انجام دینے کے لیے یقیناً نوخیز نسل کے ذہن، اس کے میلان، دلچسپی اور پسند و ناپسند سے واقفیت استاد کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ سیکھنے والوں کو جو سکھانا چاہتا ہے، نہیں سکھا سکتا، مثلاً جس وقت طلبہ کھیل تفریح کے موڈ میں ہوں اگر ایسے وقت میں استاد ان کو کوئی علمی مسئلہ یا نکتہ سمجھائے تو اس کی باتوں میں طلبہ کوئی دلچسپی نہیں لیں گے ایسی صورت میں ممکن ہے استاد کو طلبہ پر غصہ آجائے اور وہ انہیں سزا دیدے تو کیا اس میں خود استاد کی غلطی نہیں ہے کہ وہ طلبہ کی خواہش کو نہیں سمجھ سکا، اگر وہ اس وقت طلبہ کی مرضی کو دیکھ کر اس کے مطابق انہیں کچھ سکھاتا اور بتاتا، بچوں کی تعلیم میں حکمت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، حکمت انگریزی لفظ TECHNIC کے قریب المعنی ہے اسی کو ماہرین تعلیم نے طریقہ سے موسوم کیا ہے۔ پھر اس میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ کس عمر اور کس سطح کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے کس طریقے کو اختیار کیا جائے، کیونکہ ہر عمر اور ہر سطح کے بچوں کی دلچسپیاں دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح انکے ذہنوں میں بھی فرق ہوتا ہے، استاد کو سبق شروع کرنے سے پہلے یہ اندازہ ضرور رہنا چاہیے کہ

وہ جن کو پڑھانے جارہا ہے ان کا ذخیرۂ الفاظ اور ذہنی سطح کیا ہے۔ جب یہ اندازہ ہو جائے گا تو اسے یہ طے کرنے میں دیر نہیں لگے گی کہ سبق کے کن مباحث کو کس طرح رکھنا چاہیے تاکہ طلبہ کی دلچسپی سبق میں قائم رہے۔ پھر سبق کو شروع کرنے سے پہلے اس کی تمہید کس طرح باندھنی چاہیے اس کا فیصلہ کرنا بھی استاد کو آسان ہوگا۔ ایک معروف طریقہ یہ ہے کہ جانی پہچانی چیزوں کی مدد سے انجانی چیزوں کو سکھایا جائے۔ مثلاً ایک بچہ کتے کو جانتا ہے۔ اسے گیدڑ کے بارے میں بتانا ہے تو کتے کی مدد سے اسے بتایا جاسکتا ہے کہ گیدڑ اس سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔

عصری درسگاہوں میں اپنائے جانے والے تدریسی طریقے عصری درسگاہوں میں تدریس کے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں اس بات پر زور ہوتا ہے کہ طلبہ تجربات و مشاہدات اور مطالعہ سے خود واقعات و حقائق سے دوچار ہوں اور پھر انکا تجزیہ کرکے کسی خاص نتیجے پر پہنچیں۔ اس کے لیے متعدد طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

۱۔ استقرائی طریقۂ تدریس:۔ یہ وہی طریقہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، یعنی طلبہ متعدد واقعات، حقائق یا مثالوں کا تجزیہ کرکے براہ راست کسی نتیجے پر پہنچتے اور کوئی اصول ضابطہ یا کلیہ اخذ کرتے ہیں۔ اس طریقہ میں طلبہ سبق میں عملی دلچسپی لیتے ہیں اور ہمہ تن مصروف رہتے ہیں اس کی وجہ سے ان میں غور و فکر، استدلال اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، خود اعتمادی بڑھتی ہے اور تحقیق و جستجو کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ البتہ استاد کی نگرانی ضروری ہوتی ہے کیونکہ صحیح نگرانی اور رہنمائی نہ ہونے کی صورت میں بسا اوقات طلبہ چند مخصوص واقعات یا مثالوں سے کوئی کلیہ بنالیتے ہیں حالانکہ دوسری بہت سی مثالوں پر اس کا انطباق نہیں ہوتا۔

۲۔ استخراجی طریقہ تدریس:۔ یہ طریقہ استقرائی کی ضد ہے اس میں معلم خود ہی طلبہ کو کوئی عام اصول، ضابطہ یا کلیہ بتا دیتا ہے اور مخصوص مثالوں سے اس کی وضاحت کر دیتا ہے، اس طریقے میں طالب علم کی حیثیت مجہول سامع کی ہوتی ہے اس لیے وہ سبق میں عملی دلچسپی نہیں لے پاتا، البتہ اس میں استاد کا کام آسان ہوتا ہے کہ وہ طلبہ کو اپنے تجربے اور علم کی بنیاد پر کوئی قاعدہ یا اصول بتا دیتا ہے اور طلبہ اسے یاد کر کے متعدد مسائل اس کی مدد سے حل کرتے رہتے ہیں، یہ طریقہ پختہ ذہن اور بڑی عمر کے طلبہ کے لیے مفید ہے۔ اس میں کم وقت میں زیادہ معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں' تحقیقاتی طریقے میں طلبہ کو خود تجربہ و مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس میں طلبہ عملی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس طریقہ سے جو علم انہیں حاصل ہوتا ہے اسے وہ زندگی بھر نہیں بھولتے۔ وہ علم مستحکم ہوتا ہے اور انہیں اس پر بھروسہ بھی ہوتا ہے۔ اس سے طلبہ میں جستجو اور تحقیق کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان میں مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ کنڈر گارٹن طریقہ (بچوں کا باغ)، اور مانٹیسری طریقہ بہت چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مفید ہے۔ ان دونوں طریقوں میں کھیل کے ذریعہ تعلیم پر زور ہوتا ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ بچوں کی مختلف ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے مختلف دلچسپ کھیلوں میں بچوں کو مصروف کیا جائے، اس طریقے سے رسمی تعلیم کے لیے بچہ تیار ہو جاتا ہے اور اس کا علم اس سطح پر آ جاتا ہے کہ اب وہ رسمی تعلیم کو آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں اسکول کے ماحول کو گھر جیسا بنایا جاتا ہے اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ گھر کے آزاد اور مانوس ماحول میں بچے کی جو تربیت

ہوسکتی ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہوسکتی۔

۴۔ منصوبی طریقہ (پروجیکٹ میتھڈ) اور ڈالٹن پلان کا استعمال بھی عصری درسگاہوں میں کیا جاتا ہے۔ منصوبی طریقہ میں طلبہ بہت دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ وہ خود اپنی پسند سے منصوبے کا انتخاب کرتے ہیں، اس میں عملی کام زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس کی تکمیل کے لیے فطری ماحول پیدا کیا جاتا ہے۔ مثلاً بیماریوں کی روک تھام کے لیے نالیاں صاف کرنا یا معذوروں کی مدد کرنے کے لیے کیمپ لگانا وغیرہ۔ ڈالٹن پلان اس سے مختلف ہے۔ اس میں اساتذہ کو سال بھر کا کام مضمون وار اس انداز سے ترتیب دینا پڑتا ہے کہ ہر مضمون کا پھیلاؤ اور اس ضمن میں انہیں کیا کرنا ہے طلبہ کو اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سال بھر کے کام کو ایک ایک ماہ کی میقات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، عمومی قاعدے بتا کر طلبہ سے مقررہ مدت میں کام کی تکمیل کا معاہدہ لیا جاتا ہے دوران میقات کام میں زحمتوں اور مشکلات کو دور کرنے میں اجتماعی و انفرادی امداد دی جاتی ہے۔ اس سے طلبہ میں احساس ذمہ داری اور کام کو مکمل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف طلبہ پوری طرح استاد پر منحصر نہیں رہتے، ان میں خود سے کتابوں، چارٹوں، پوسٹروں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اسی کی بنیاد پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سیمسٹر (SEMESTER SYSTEM) نظام قائم ہوا۔ عصری درسگاہوں میں اس کے علاوہ بھی کئی اور طریقوں کو اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً بات چیت کا طریقہ، سوال وجواب کا طریقہ، اخباری یا اطلاعی طریقہ (اسے بیانیہ طریقے کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) اور لکچر یا خطابت کا طریقہ وغیرہ۔ اب سمعی و بصری آلات کا استعمال بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس جدید ٹکنالوجی کو صرف تعلیم کے

عمل کو دلچسپ بنانے اور اس میں طلبہ کا شوق پیدا کرنے کے لیے ہی استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے تعلیم کو زیادہ مفید اور بارآور بنانے کے ساتھ جو مقاصد پیش نظر ہیں انکا حصول بھی آسان ہوتا ہے۔

عصری اور دینی مدارس کا طریقہ تدریس عصری درسگاہوں میں تدریس کے جو طریقے رائج ہیں ان کا ایک مجمل تعارف اوپر پیش کیا جا چکا ہے، البتہ دینی مدارس اور عصری درسگاہوں کے طریقہ تدریس میں کیا فرق ہے اس کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے میرے ناقص مطالعہ اور مشاہدے میں جو باتیں آئی ہیں انکی بنیاد پہ میرا یہ احساس ہے کہ دینی مدارس میں استخراجی اور بیانیہ طریقہ کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے میں غالباً اہل مدارس کی دو مجبوریاں ہیں۔ اول یہ کہ ان کے نصاب میں موضوعات (CONTENT) کی جگہ کتابیں ہیں، اس لیے استاد کا پورا زور کتابوں کی عبارت کو حل کرنے اور ان کی تشریح کرنے پر صرف ہوتا ہے، اگر موضوعات طے ہوتے تو استاد کے لیے یہ آسان ہوتا کہ وہ اس موضوع سے متعلق مختلف کتابوں سے استفادہ کر کے لکچر دے دیتا، جیسا کہ قرون اولی کے اساتذہ کے یہاں "املا" کا طریقہ رائج تھا۔ جس معنی میں آج لکچر لفظ کا استعمال ہوتا ہے اسی معنی میں "املا" لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔ اسی لیے قدیم زمانے کے طلبہ کو بحث و مباحثہ کرنے اور اساتذہ کے ساتھ سوال و جواب کرنے کا پورا موقع حاصل تھا۔ پھر کتابوں کو مقرر کرنے میں اس بات کا خیال نہیں رکھا گیا ہے کہ جس عمر اور جس سطح کے طلبہ کو جتنے وقت میں یہ کتابیں پڑھائی جارہی ہیں اس اعتبار سے ان کی تعداد زیادہ ہے۔ شاید اسی لیے اساتذہ پورے سال ان کتابوں کو ختم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

دوسری مجبوری یہ ہے کہ استاد نے جو کچھ پڑھا ہے اور جس انداز سے پڑھا ہے اسی طریقے سے اپنی سوچ، اپنے تجربے اور اپنے مشاہدے کی بنیاد پر حاصل کیے ہوئے علم کو کم سے کم وقت میں طلبہ تک پہنچا دینا چاہتا ہے، اس لیے اس کا انداز روایتی ہوتا ہے، مدارس میں کئی استاد ایسے بھی ہوتے ہیں جو فی الواقع استاد بننا ہی نہیں چاہتے تھے اور ان کے اندر معلم کے اوصاف بھی موجود نہیں ہیں، لیکن حالات کی مجبوری اور کوئی دوسرا کام نہ ملنے کیوجہ سے انھوں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ ایسے اساتذہ سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کرنا کوئی دانش مندی کی بات نہیں ہوگی وہ نہ تو تعلیم میں طلبہ سے دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی تدریس کے نئے نئے طریقوں کو اختیار کر کے طلبہ میں علم کو منتقل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

وہ جدید طریقے جو دینی تعلیم کے لیے اختیار کیے جا سکتے ہیں | دینی تعلیم کے مختلف موضوعات کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں اور عقائد اور فقہ کے لیے استقرائی طریقہ اپنایا جا سکتا ہے یعنی مختلف مثالیں طلبہ کے سامنے اس ترتیب سے رکھی جائیں کہ عقائد اور فقہ کے اصول طلبہ از خود مرتب کر سکیں۔ فقہ کے لیے منصوبی طریقہ بھی مفید ہو سکتا ہے کہ استاد کچھ ایسے مسائل طلبہ کے سامنے رکھے، جن کے بارے میں طلبہ واقف نہ ہوں، وہ ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے مطالعہ، مشاہدہ اور تحقیق کے بعد کچھ نتائج اخذ کر کے استاد کے سامنے پیش کریں، پھر استاد ان کی مناسب رہنمائی کر کے حقیقت تک پہنچنے میں مدد کر سکتا ہے، حدیث کے لیے سوال و جواب اور بات چیت کا طریقہ بھی مناسب ہو سکتا ہے، حضورؐ اسی اسلوب میں اپنی حکیمانہ تعلیمات کو پیش فرمایا کرتے تھے کہ سامع اور مخاطب پورے ذوق و شوق اور رغبت کے

ساتھ اپنے کان اور دل کو آپؐ کی آواز کی طرف لگا دیتے تھے۔ کبھی آپؐ سوال فرماتے کیا پتہ ہے تمہیں کہ مفلس کون ہے؟ کیا سب سے بڑے بخیل سے تم واقف ہو؟ کبھی آپؐ فرماتے ہلاک ہو گیا، تباہ ہو گیا، صحابۂ کرام سوال پر مجبور ہو جاتے کہ کون برباد ہوا؟ کس پر تباہی آئی؟ تب آپؐ ان کے سوال اور اشتیاق کے بعد اپنی بات کی تکمیل فرماتے جو مبلغ اور داعی روانہ کیے جاتے انکو تاکید کی جاتی کہ دیکھو آسان باتیں سکھاؤ مشکلات میں نہ ڈالو، قریب کرنے والی تعلیم دو، دور لے جانے والی تعلیم سے احتراز کرو وغیرہ قرآن کی بہت سی آیتوں کا اسلوب بھی ایسا ہے کہ ذہن متکلم کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس سے بھی تدریسی طریقہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

صرف و نحو، زبان، ریاضی اور بلاغت وغیرہ کے لیے استخراجی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، لیکن تفسیر، اصول تفسیر، فلسفہ اور تاریخ کے لیے لکچر کا طریقہ ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے استاذ زیادہ مفید باتیں کم وقت میں بتا سکتا ہے اور طلبہ کی دلچسپی بھی قائم رہ سکتی ہے، تحقیقاتی اور بیانیہ طریقے کو بھی ضرورت کے مطابق مختلف جگہ اپنایا جا سکتا ہے۔ البتہ ڈالٹن پلان کی مدد سے مدارس کے تدریسی نظام میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ کنڈر گارٹن اور مانٹیسری طریقوں کی ضرورت غالباً اعلیٰ تعلیم کے مدارس میں نہیں ہے، البتہ کچھ مخصوص مضامین کے لیے مخصوص جماعتوں میں سمعی و بصری آلات کو بھی استعمال کرنا مفید ہوگا۔

سلف صالح اور ائمہ دین نے درس و تدریس کو مفید اور موثر بنانے کے طریقے خود بھی اختیار کیے اور اپنے متبعین کو بھی ایسے رہنما اصول عطا کیے۔ بعض بزرگان دین کے حالات پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ متعلم میں اکتاہٹ اور کسل مندی طاری نہ

نہ ہونے دیتے تھے اور سبق بوجھل یا بے جان نہ بن جائے اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بعض حضرات استاد بننے کی خواہش میں ان بزرگوں کی مجلس میں سالہا سال گزار کر پڑھانے اور تربیت کرنے کا ڈھنگ سیکھتے تھے۔ اس لیے تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعض اساتذہ کے حلقۂ درس میں ہزاروں طالب علم بے اختیار کھنچے چلے آتے تھے۔

درس وفا اگر بود زمزمۂ محبتے — جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

معلمین کی تربیت کی ضرورت کیوں

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان مدارس میں جو طلبہ آتے ہیں وہ سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ماحول بھی الگ ہوتا ہے، ان کی صلاحیت اور ذہانت میں بھی فرق پایا جاتا ہے، سب کا فکر و خیال اور یہاں آنے کا مقصد بھی مختلف ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سیکھنے کا ان کا ذوق بھی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ کچھ ایک ہی بات کو بہت جلد سمجھ جاتے ہیں اور کچھ بہت سست رفتاری سے سیکھتے ہیں۔ اتنے متضاد افکار و اذہان اور مختلف اطوار و مزاج کے طلبہ کی تعلیم ایک ہی ڈھنگ اور ایک ہی طریقے سے کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ استاد کو پڑھاتے وقت پیچھے رہ جانے والوں کا خیال بھی رکھنا ہوگا اور بہت تیز آگے چلنے والوں کی دلچسپی بھی بنائے رکھنی ہوگی۔ استاد کی کامیابی اس میں نہیں ہے کہ وہ کتاب کی مشکل عبارت کو حل کرا دے بلکہ اصل کام تو طالب علموں کی سیکھنے کی مشکلات کا حل کرنا ہے۔

دینی مدارس میں بھی استاد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں استاد کی ذمہ داری صرف درس دینا نہیں ہے بلکہ تربیت کرنا بھی ہے۔ اس لیے استاد کی شخصیت، اس کے اخلاق، کردار، عادات و اطوار، معاملات اور انداز گفتگو تک کا طلبہ پر اثر پڑتا ہے، یہی وہ چیز ہے جو اسلامی نظام تعلیم کو دوسرے نظام

بائے تعلیم سے الگ کرتی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں استاد کو مربی کا مقام دیا گیا ہے اس کی صحبت میں طلبہ علم کو عمل میں لانا سیکھتے ہیں۔ اس طرح طلبہ کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اور ذہن و فکر، دل و دماغ اور جسم نشو و نما پاتا ہے۔ استاد کے اعلیٰ مقام کو کسی شاعر نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

شیخ مکتب ہے ایک عمارت گر جس کی صنعت ہے روح انسانی

استاد کی عظمت کا اندازہ اس حدیث سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں محسن انسانیت حضرت محمدؐ نے فخریہ ارشاد فرمایا ہے کہ "اِنَّما بُعِثْتُ معلما" بیشک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اب اگر وہ شخص جس پر ایک بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہو وہ اس ذمہ داری کو اٹھانے کا اہل نہ ہو تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کام کا کیا حشر ہوگا جو اس کے سپرد تھا۔ یوں سمجھا جائے کہ اگر استاد کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے حلقۂ درس میں شریک طلبہ کی ذہنی استعداد کیا ہے؟ ان کے سامنے سبق کی مشکلات کیا ہیں؟ وہ جو کچھ سکھانا چاہتا ہے طلبہ اسے سیکھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اس کا طلبہ کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ وہ انکی تربیت کیسے کر سکتا ہے؟ وہ ان کو کس طرح درس دے کہ ان کی اسمیں دلچسپی پیدا ہو جائے .... وہ اپنی آواز کو کہاں پست کرے اور کہاں زور سے بولے؟ وہ جن مباحث پر گفتگو کر رہا ہے وہ ان طلبہ کے کس کام آئیں گے؟ اسے اپنے طلبہ سے محبت، شفقت اور خیر خواہی کس حد تک کرنی چاہیے؟ وہ جو کچھ پڑھا رہا ہے، اس کا طلبہ کی عملی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ اس کی گفتگو ان کے معیار سے بلند تو نہیں ہے؟ اس کی باتیں ایسی سطحی اور غلط تو نہیں ہیں کہ طلبہ انہیں استاد کی کم علمی پر محمول کریں؟ وغیرہ یہ ادر

اس طرح کے بہت سے سوال ہیں جن پر استاد کو اپنی بہترین کارکردگی کے لیے توجہ دینی ہوتی ہے، اسی لیے آج کے زمانے میں 'استاد کی تربیت' ہر نظام تعلیم کا جز بن چکی ہے، تدریس کے لیے مختلف معیار کے تربیتی ادارے اور ان کے نصاب موجود ہیں، لیکن ہر استاد کے لیے خواہ وہ ابتدائی جماعتوں کو پڑھائے یا انتہائی جماعتوں کو۔ تربیت ناگزیر ہے۔

تربیت کیسے کی جائے؟ اس بات کو تو اب اہل مدارس تسلیم کرتے ہیں کہ مدارس کے معلمین کے لیے تربیت ضروری ہے لیکن ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ مدارس کے معلمین کی تربیت کیسے کی جائے؟ اور کون ان کی تربیت کرے؟ تربیت کا خاکہ کیا ہو؟ اور اس کے لیے وسائل کی فراہمی کس طرح ہوگی؟ وغیرہ۔ اس ضمن میں دو باتوں پر اگر اتفاق ہو جائے تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ یہ تربیتی نظام بین المدارس ہو یعنی کسی مدرسہ میں یہ پروگرام ایک ماہ یا اس سے زیادہ ضرورت کے مطابق چلایا جائے۔ اس میں اس مدرسہ کے کچھ یا سب اساتذہ کے علاوہ قرب وجوار کے مدارس کے اساتذہ تشریف لے آئیں۔ یہ اپنی سہولت کے مطابق طے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مدرسہ کتنے اساتذہ کو ایک کیمپ میں بھیجے۔ اسکی دوسری شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند، سبیل الرشاد بنگلور، سبیل السلام حیدرآباد اور اسی طرح کے دوسرے صوبوں میں کسی ایک یا دو مدارس کو تربیت معلمین کا مرکز بنا دیا جائے اور ان میں وقتاً فوقتاً کیمپ لگائے جائیں۔ ان کیمپوں میں ملک کے منتخب دینی مدارس کے بزرگ اساتذہ کو جن کی نظر اپنے مضمون پر بہت گہری ہو اور وہ فن تعلیم و تربیت سے بھی واقف ہوں انہیں تربیت کرنے کے لیے دعوت

دی جائے اور کچھ شعبہ تعلیم کے ایسے مخلص مسلمانوں کو بلایا جائے جو مدارس سے ہمدردی بھی رکھتے ہوں اور ان مدارس کے معلمین کو نفسیات تعلیم، تاریخ تعلیم مقصد تعلیم اور فلسفہ تعلیم سے بھی واقف کرا سکیں اور تدریسی مشق کے وقت ان چیزوں کو عملی طور پر دکھا بھی سکیں تاکہ تربیت کے بعد انہیں پڑھانے میں آسانی ہو۔

ان کیمپوں کے لیے وسائل کی فراہمی کی ذمہ داری یا تو ان مدارس کے سپرد ہو جن کے اساتذہ ان میں تربیت حاصل کر رہے ہیں یا پھر وہ ادارے معاونت کریں جو دینی مدارس کے معلمین کے لیے 'فن تعلیم و تربیت' کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یا پھر مخیر حضرات سے تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ بات عرض کرنا ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تربیت یافتہ معلمین کو مدارس میں تقرر کے وقت ترجیح ملنی چاہیے اور جو حضرات کسی مدرسہ میں پڑھا رہے ہیں اگر وہ تربیت حاصل کرتے ہیں تو ان کی تنخواہ میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہونا چاہیے تاکہ اس طرف اساتذہ کا رجحان ہو سکے۔ اس تھوڑی سی قربانی کے لیے بھی اہل مدارس کو تیار ہونا پڑے گا کہ تربیت کے وقت کی پوری تنخواہ ان کو دی جائے تاکہ اساتذہ کو ان کیمپوں میں شریک ہونے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

تربیت اساتذہ کے لیے نصاب کا خاکہ تربیتی نظام کا مرکزی نکتہ یہ ہو کہ مستقبل کے معلمین میں ان کے نصب العین کا واضح شعور اور اس سے گہری وابستگی پیدا کرے اور ان میں وہ اخلاقی کردار اور مشنری جذبہ پروان چڑھائے جو انہیں اس منصب کے تقاضے صحیح صحیح ادا کرنے کے لیے تیار کرے۔ نیز انکے اندر مربی ہونے کا جذبہ پیدا کرے اور طلبہ کے ساتھ ان کے رشتہ کا احیاء کرے۔ تربیت معلمین کے لیے ترتیب

دیا جانے والا نصاب درج ذیل نکات پر مشتمل ہو سکتا ہے۔

* اسلام میں تعلیم کی اہمیت۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں۔
* اساتذہ کا معیار اور مثالی اساتذہ۔
* تعلیم اور مقاصد تعلیم، فلسفہ تعلیم کی اسلامی نقطۂ نظر سے تشریح۔
* تعلیمی نفسیات۔ بچوں کی نفسیات، مختلف سطح کے طلبہ کی ضرورتیں اور نفسیات۔
* تعلیمی تاریخ۔ علوم کی تاریخ۔
* دوسرے ممالک کے اساتذہ کا معیار تدریس اور طریق تدریس، جدید طریقہ ہائے تدریس کا تنقیدی جائزہ۔
* برصغیر میں توسیع علم کے سلسلے میں مسلمان اساتذہ کا کردار۔
* قرآن پڑھانے کا طریقہ۔
* حدیث پڑھانے کا طریقہ۔
* علم الکلام، فلسفہ، صرف و نحو، ہندسہ، ریاضی، بلاغت، زبانیں وغیرہ پڑھانے کا طریقہ۔
* فقہ، اصول فقہ پڑھانے کا مطلوبہ طریقہ۔
* تفسیر اور اصول تفسیر پڑھانے کا طریقہ۔
* سیاست، اخلاق اور تدبر کا علم۔
* امت مسلمہ کے مسائل کا شعور و آگہی تاکہ زیر تعلیم و تربیت طلبہ تک اسے منتقل کیا جاسکے۔
* تدریس کو موثر کرنے کے لیے جدید سمعی و بصری آلات کے استعمال سے واقفیت

* جدید علوم مثلاً علم سیاست، علم سائنس، علم معاشیات، علم سماجیات، طبیعی وحیاتی علوم اور عمرانیات کے پڑھانے کا طریقہ۔

* خارجی مطالعہ کی اہمیت، ضرورت اور مطالعہ کے لیے کتب کے منتخب کرنے کا طریقہ۔

یہ چند باتیں خاکے کی شکل میں بطور تجویز پیش کی گئی ہیں۔ اس کا فیصلہ کہ ان میں سے کون سی چیزیں مفید ہیں اور تربیتی نصاب میں انھیں جگہ دی جائے اہل مدارس ہی اپنی ضرورت کے تحت کر سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان باتوں کو سامنے رکھ کر کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ کچھ نئے نکات مرتب کیے جائیں۔ راقم کا مقصد اس ضروری مسئلہ کی جانب قوم کو متوجہ کرنا ہے۔

اخبار علمیہ

استنبول ترکی کے میوزیم کے نوادر و عجائب میں خانۂ کعبہ کے قفل اور کنجیوں کا ایک نہایت قیمتی ذخیرہ بھی ہے، مسلمان خلفاء و سلاطین اپنی تخت نشینی اور جشن وغیرہ کے موقعوں پر خانۂ کعبہ کے لیے نئے تالے اور کلیدیں عام طور سے بطور نذرانہ بھیجتے تھے خانۂ کعبہ کی عظمت کے پیش نظر ان تالوں کی ساخت اور سجاوٹ میں جو نفیس کاریگری فنی خوبی اور کمال ہنر دکھایا گیا ہے اس سے شاہان وقت کے لطیف مذاق، بلند حوصلوں کے علاوہ بیت اللہ سے جوش عقیدت کا اظہار بھی ہوتا ہے، یہ قریباً ۵۵ تالے اور کنجیاں ہیں جو مسلمانوں کے شاندار ماضی کے بعض بند دروازوں کو بھی کھولتے ہیں، اب ترکی سے ایک کتاب خاص اسی موضوع پر شایع ہوئی ہے، اس کے دو ابواب ہیں، پہلے باب میں استنبول میں اس ذخیرہ کی فراہمی اور اس موقع پر شاندار تقریبات کی تاریخ ہے، پھر ان تالوں کی شکلوں اور ان کی فنی خوبیوں، ان کی تزئین نقش نگاری اور ان کے صناعوں کا ذکر عہد بہ عہد کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں عباسی، عثمانی اور مملوک خلفاء و سلاطین کے عہد حکومت میں تیار شدہ ان تالوں کا بہ لحاظ سنین ذکر کیا گیا ہے، جن تالوں کے عکس کتاب میں شامل ہیں ان میں ایک سے تو تک عباسی خلافت کے، ۱۰ سے ۲۲ مملوکوں کے اور ۲۳ سے ۵۵ تک دولت عثمانیہ کے سلاطین کے زمانہ کے ہیں، یہ کتاب ترکی اور عربی زبانوں

میں شایع ہوئی ہے اور اب اس کا انگریزی ایڈیشن بھی طبع ہو رہا ہے۔

صنعت و حرفت کے میدان میں تلوار سازی کا فن بھی مسلمان اہل ہنر کی جدت طرازی کا مظہر رہا ہے، استنبول کے عجائب خانہ میں جو بیش قیمت تلواریں محفوظ ہیں وہ تاریخی اور فنی لحاظ سے بڑی اہم ہیں، ان میں ۱۱۴ تلواروں کی تصویروں اور ان کی تاریخی اہمیت کو چند سال پہلے کتابی شکل میں پیش کیا گیا تھا، یہ کتاب کویت سے شایع ہوئی تھی، اب اس کا ترجمہ ملیشیا کی مالے زبان میں شایع ہوا ہے، یہ کتاب کئی ابواب پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ان تلواروں کی مصور تاریخ ہے جن کی نسبت جناب حضور اکرم ﷺ، خلفائے راشدینؓ اور حضرات صحابۂ کرامؓ سے ہے، دوسرے حصہ میں اموی، عباسی، ایوبی، مملوک اور عثمانی سلاطین و خلفاء کی تلواروں کا ذکر ہے، ایک اور باب میں تلوار سازی کے ۲۴ ماہرین کے متعلق معلومات درج ہیں، حواشی اور تعلیقات نے اس کتاب کو اور بھی صیقل و مجلی کر دیا ہے، سادہ تصویروں کے علاوہ رنگین تصاویر بھی ہیں۔

مسلمانوں کے دور عروج کی ایک بہت نمایاں خوبی ان کا ذوق تعمیر اور اس میں ان کا کمال فن بھی ہے، اسپین سے چین و انڈونیشیا تک ان کے اس ذوق کی جلوہ آرائیاں آج بھی تابندہ و درخشاں ہیں، مستشرقین یورپ نے جہاں مسلمانوں کے علوم و فنون سے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا ہے وہاں انھوں نے اس فن کو بھی اپنے مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنایا ہے، حال ہی میں ہم ایسی ہی ایک کتاب سے واقف ہوئے ہیں، جرمنی میں برلن کے اسلامک آرٹ کے میوزیم کے ڈائرکٹر میخائیل مینخ دو دہائیوں سے عہد مملوک کی عمارتوں کو اپنی تحقیق کا مرکز بنائے ہوئے ہیں، اب انھوں نے دو جلدوں میں اپنے مطالعہ و مشاہدہ کا نچوڑ اس طرح پیش کیا ہے کہ پہلی جلد میں مملوک سلاطین کے نمونہ تعمیر کی ابتداء و ارتقاء

اور اثر کا جائزہ لیا ہے، انہوں نے قاہرہ کی عمارتوں پر خاص توجہ کی کیونکہ قاہرہ کے طرز تعمیر کا اثر دور دور تک ہوا، دوسری جلد میں مملوک سلطنت کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے، اس میں مجموعی طور پر ۲۲۷۹ عمارتیں زیر بحث آئی ہیں، ان میں اب بھی تقریباً ۰۰ ۵ عمارتیں باقی ہیں جو ۹ ملکوں کے ۵۰ سے زیادہ شہروں میں موجود ہیں، ان سب کا سنہ وار جائزہ لے کر ان کی تعمیر، ترمیم اور بازیابی کی مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے، ناقدین اور ماہرین فن کی نظر میں یہ کتاب فن تعمیر کے ادب میں نہایت عمدہ اضافہ ہے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں اور ان کے آثار، مساجد و مدارس اور کتبخانوں کی تباہی و بربادی اس صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے، اب یہاں کے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب پر معلومات افزا کتابیں برابر شایع ہو رہی ہیں، خلافت عثمانیہ کی ان سابق ریاستوں کا توجہ و اہم قدرتاً ترکی میں زیادہ ہوا، چنانچہ حال ہی میں وہاں کے مشہور علمی ادارہ (IRCICA) نے دو کتابیں شایع کی ہیں، ایک کتاب بوسنیا کے اسلامی فن تعمیر سے متعلق ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی رواداری نے صدیوں پہلے بوسنیا کے مختلف مذاہب اور قومیتوں کے درمیان جس رنگا رنگ تہذیب کو وجود بخشا تھا اس میں بڑی خوشنما ہم آہنگی تھی اور اس کا سب سے خوبصورت عکس وہاں کے فن تعمیر میں جھلک رہا تھا، مسجدوں، گرجا گھروں، اسکولوں، بازاروں اور رہائشی مکانوں میں اس کا اثر بڑا خوش رنگ تھا، لیکن ۹۲-۱۹۹۴ء کی دو سالہ خانہ جنگی میں سربوں اور کروشیائی عیسائیوں نے اپنے قدیم صلیبی انتقام کا جو نمونہ پیش کیا اور جس طرح انہوں نے تمام انسانی اور اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھا اس نے بوسنیا

کے عافیت کدہ کو آتش کدہ میں بدل ڈالا، یہ کتاب انگریزی زبان میں اپنے موضوع پر شاید سب سے جامع کتاب ہے، اس میں بوسنیا کی تاریخی عمارتوں کے دور تعمیر و تخریب کا مفصل جائزہ لے کر بتایا گیا ہے کہ اب ان عمارتوں کی از سر نو تعمیر کس طرح ممکن ہے، دوسری کتاب میں بوسنیا کے باشندوں اور اس کی آبادی کی تاریخ بیان کی گئی ہے، تاریخی اعتبار سے بوسنیا کی آبادی سے مراد بوسنیائی چرچ (بوگو ملس) کرسچین آرتھوڈوکس چرچ، کیتھولک اور اسلام کے ماننے والے ہیں، بوسنیا کے سلاوی باشندے بوسنیائی زبان بولتے تھے، انھوں نے قرون وسطیٰ میں اور عثمانی و آسٹریائی ہنگری دور میں خود کو بوسنیائی کہلانا ہی پسند کیا، بوگو ملی فرقہ کے لوگ زیادہ تعداد میں اسلام لائے، چونکہ آبادی کا بڑا حصہ انہی لوگوں پر مشتمل تھا، اسلیے روایتی طور پر بوسنیا میں اکثریت مسلمانوں ہی کی رہی، سولھویں صدی میں وہاں بڑی تعداد میں یہودی آباد ہوئے لیکن اختلاف مذاہب کے باوجود یہ سب بوسنیا کی تہذیب میں بڑی خوبی سے رنگ گئے، اس کتاب کے مولف ڈاکٹر آدم ہینرک خود ایک بوسنیائی اہل قلم اور محقق ہیں اور اس وقت حالت مہاجرت میں ترکی میں ہیں، انھوں نے اپنے وطن اور ہم وطنوں کی بربادی کو دیکھا ہے، اس لیے یہ کتاب پر از معلومات ہونے کے علاوہ پر تاثیر بھی ہوگئی ہے۔

ملکوں اور تہذیبوں کے عروج و زوال اور ان کے بننے بگڑنے میں مورخوں اور محققوں کے لیے محنت، جاں کاہی اور دیدہ ریزی کا سامان ہوتا لیکن موجودہ دور میں اطلس سازوں اور نقشہ نویسوں کے لیے اس میں اور بھی نئی نئی دقتیں پیدا ہوگئی ہیں، روئے زمین کے خط و خال میں پہلی جنگ عظیم کے بعد تیزی سے تبدیلیاں

آئی ہیں اور ان کا اثر سب سے زیادہ اطلس و نقشہ جات کے ناشرین پر پڑا، اسکی ایک واضح مثال گذشتہ سال دیکھنے میں آئی، جرمنی کے اتحاد تو کی وجہ سے ٹائمز بکس والوں نے اپنے ٹائمز ورلڈ اٹلس میں نئے رنگ بھرے اور نظر ثانی کی ہوئی فہرست کو دوبارہ شایع کیا تو اس کے لیے ان کو ۹۵ ہزار امریکی ڈالر کا مزید صرفہ برداشت کرنا پڑا، اب بلقانی ریاستوں کی کشمکش، ہانگ کانگ پر ۱۹۹۷ء میں چینی اختیار، جنوبی افریقہ کے نام کی ممکنہ تبدیلی اور سوویت یونین کی شکست و ریخت کی وجہ سے ان ناشرین کی پریشانیاں بہت بڑھ گئی ہیں، ناموں اور رنگوں کی تبدیلی، نئی سرحدوں کا تعین، ناموں کے تلفظ کا تغیر اور جلد جلد طباعت کے مسائل ان کے سامنے ہیں، کمیونزم کے زوال نے شہروں، بستیوں اور کوہ و دریا کے ناموں کو بدل دیا ہے، سوویت یونین میں اس قسم کے ۳۰۰۰۰ ناموں میں قریباً ۴ فیصد نام کمیونسٹ تحریک کے زیر اثر رکھے گئے تھے، اب وہ سب بدل گئے اس طرح گویا ۱۲ سے ۱۵ ہزار ناموں کی تصحیح ناگزیر ہو گئی ہے۔

بوسنیا کے المیہ پر صلیبی جنون و وحشت کی یاد کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی کے جذبۂ جہاد اور اسکی فتوحات کے نقوش بھی تازہ ہوتے ہیں، حال ہی میں یہ خبر آئی ہے کہ اسرائیل کے شمال میں بحیرۂ جلیل یا بحیرہ مردار کے قریب کھدائی کے دوران ایک ایسا چھوٹا قلعہ برآمد ہوا ہے جسکو ۸۰۰ سال پہلے سلطان صلاح الدین ایوبی نے فتح کیا تھا، قلعہ میں کمان و پیکان، نیزوں اور تیشوں اور منجنیق کے گولوں کا بڑا ذخیرہ بھی برآمد ہوا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلعہ میں موجود اور مقابض صلیبیوں سے سخت جنگ کے بعد اس میں سلطان فاتحانہ داخل ہوا تھا، ہتھیاروں کے علاوہ کدال کلہاڑی جیسے اوزار بھی خاصی تعداد میں ملے ہیں، قلعہ کی دیوار کے پاس تعمیر میں کام آنے والے مسالہ کا ایک ڈھیر بھی ملا ہے۔

استفسار و جواب

اردو میں حوالے کا رواج

جناب محمد ایوب صاحب۔ بی۔ اے
شاد کالونی، اشوکا گارڈن، بھوپال۔

اردو تصنیفات میں حوالے دینے کا طریقہ کب سے رائج ہوا کیا علامہ شبلیؒ نے اس کی ابتدا کی ؟

معارف: ابھی تک اس حیثیت سے اس کا کوئی جائزہ نہیں لیا گیا ہے تاہم یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق و استناد کا جو معیار و اسلوب علامہ شبلیؒ نے قائم کیا وہ ان سے پہلے اردو کی مذہبی و علمی تصنیفات میں عموماً مفقود ہے، ان کے نامور معاصرین کی قابل قدر کتابوں میں بھی حوالوں اور حواشی کا التزام و اہتمام نہیں ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے استاد کے امتیازات و اولیات میں لکھا کہ "تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو پیرایہ یورپ نے قائم کیا... مولانا نے اپنی تصنیفات اور تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا... انھوں نے ہر علم و فن کی بکثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادر کتب بہ کثرت بہم پہنچائے، کتبخانے چھانے، دنیا کے گوشہ گوشہ سے مطبوعات منگوائے اور ادب، محاضرات، فتوح، تاریخ، رجال، فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا اور اپنی تصنیفات اور مضامین میں ان کے حوالے دیے"۔
(حیات شبلی ص ۳۲، ۳۶)

مہدی افادی نے علامہ شبلی کے اسی بانکپن کا اظہار اس خوبصورت جملہ میں کیا کہ "علمی تصنیفات و تالیف کے میدان میں ہماری زبان کے سب سے بانکے شہسوار اور پھر یہ

لکھا کہ "سچ یہ ہے کہ شبلی جامعیت اور وسیع النظری نیز مورخانہ تدقیق اور کمال فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے سے بڑے مورخ کے پہلو بہ پہلو ہو سکتے ہیں"۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے علامہ کے اولیات کے پیش نظر لکھا کہ "وہ مجتہدانہ صلاحیتوں کے آدمی تھے" اور مولوی اسمٰعیل مدراسی ندوی مرحوم نے صراحتاً لکھا کہ "مولانا شبلی نے اپنی تحریر میں ہر بات کا حوالہ دینے اور ماخذ بتانے کا اہتمام کیا، اردو ہی نہیں عربی مصنفین پر بھی اس حیثیت سے وہ اثر انداز ہوئے، جرجی زیدان نے اپنی تاریخ تمدن اسلامی میں شبلی کے خط کو شایع کیا اور اس پر عمل بھی کیا"۔

سلطان شمس الدین کا لقب

ایضاً۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اپنی تصنیفات میں سلطان شمس الدین التمش کو ایلتتمش لکھا ہے، مگر مجھے تلاش کے باوجود تتمش نہیں مل سکا، رہنمائی کی درخواست ہے۔

معارف: سلطان شمس الدین کے لقب کے تلفظ و املا میں بڑا اختلاف ہے۔ التمش اور ایلتتمش کے علاوہ اَلْتمش، اِیلتمش، اَلْتیمش کا املا بھی ملتا ہے، بعض قدیم کتب تاریخ مثلاً منتخب التواریخ، تاریخ فرشتہ، طبقات اکبری اور طبقات ناصری میں التمش ہی موجود ہے، یہی املا الیٹ کی ہسٹری آف انڈیا میں بھی ہے اور اردو کے بعض اہل قلم جیسے منشی ذکاءاللہ اور میرزا حیرت دہلوی نے بھی اسی لفظ کو پسند کیا ہے اس لفظ کی قبولیت کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ترکی زبان میں چاندگرہن کی رات میں پیدا ہونے والے بچہ کو التمش کہا جاتا ہے اور التمش کے معنی ترکی فوج کے ہراول دستہ کے ہیں۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اسی زبان میں چھ کے عدد کو التمش کہا جاتا ہے۔

لیکن چند اور قدیم کتابوں جیسے انتخاب المنتخب، روضات الصفا اور تاریخ مبارک شاہی

میں ایلیتمش نقل ہوا ہے اور اس کے معنی سورج گرہن کے بتائے گئے ہیں جبکہ ایلتتمش کا املا تاریخ جہاں کشا اور روز روشن میں نظر آتا ہے، روز روشن کی ایک عبارت میں ہے کہ "روحانی سمرقندی ... ہنگامیکہ سلطان شمس الدین ایلتتمش رنتنھبور را فتح کردہ" (ص ۲۵۶) اس کے علاوہ مولانا عصامی صاحب فتوح السلاطین نے جس کا زمانہ سلطان شمس الدین کے قریباً دو سو سال بعد کا ہے اپنی کتاب کے متفرق اشعار میں ایلتمش یا التتمش کا املا ہی نقل کیا ہے مثلاً :

همان چیرہ التتمش سرفراز — کہ بد محرم خاص ایبک ہراز
شنیدم کہ التتمش دیو بند — بگفتا بصفدار فیروز مند
وزاں پس التتمش نام دار — فرستاد یک چتر گوہر نگار
غرض چونکہ خورشید روئے زمین — شہ التتمش آں شمس دنیا و دین

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک شعر میں اس نے التمش بھی نقل کیا ہے :

چو برایبک التمش ایں قصہ گفت — دل ایبک از عیش چوں گل شگفت

لیکن اس کتاب کی سرخیوں میں صرف ایلتتمش ہی لکھنے کا التزام کیا گیا ہے۔

دور جدید کے مورخین اور اہل قلم جیسے ہوروڈٹز، مورلینڈ، ہوتسما، آرنلڈ، ایشوری پرشاد، ایس آر شرما، اے ایل سریواستو کے علاوہ پروفیسر خلیق احمد نظامی محمد عزیز احمد، اے بی ایم حبیب اللہ، سید معین الحق، وغیرہم نے بھی ایلتتمش کے تلفظ کو ترجیح دی ہے، اس کے معنی محافظ سلطنت اور عالمگیر WORLDGRASPER بتائے گئے ہیں، یہ تو قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خاندانی لقب تھا یا تخت پر بیٹھنے کے بعد اسے اختیار کیا گیا یا پھر اپنے معنی کے لحاظ سے یہ جزو نام ہوا تھا، البتہ یہ ضرور

کہا جاسکتا ہے کہ سلطان کو ترکی زبان سے لگاؤ تھا، اس نے آم کو انب سے نغزک کردیا تھا کہ ترکی زبان میں اس لفظ کے معنی اچھے نہیں تھے (فوائد الفواد ص ۲۱۲)۔

جدید مورخین نے صرف معنی کی وجہ سے لفظ ایلتیمش کو ترجیح نہیں دی ہے بلکہ انکی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ منہاج سراج جو سلطان کا ہم عصر تھا اس نے طبقات ناصری میں سلطان کی مدح میں ایک شعر میں اسے التمش یا ایلتمش کے لفظ سے یاد کیا ہے، غلام رسول مہر نے اسے یوں نقل کیا ہے:

آں شہنشاہی کہ حاتم بذل و رستم کوشش است ناصر دنیا و دیں محمود بن التمش است

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس شعر کے نقل میں بھی اختلاف ہے مثلاً طبقات ناصری کے مصحح ولیم ناسولیس نے دوسرے مصرع میں التمش ہی نقل کیا ہے:

ناصر دنیا و دیں محمد بن التمش است ص ۲۰۲

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہ مصرع اس طرح لکھا کہ:

ناصر الدنیا و دین محمد بن ایلتتمش است

اور محمد عزیز احمد کا نقل کردہ مصرع یوں ہے: ناصر الدنیا و دین محمود بن التمش است انھوں نے یہ بھی لکھا کہ قواعد عروض کے لحاظ سے یہاں صرف التمش ہی ہو سکتا ہے، اختلاف کتابت نے اس گواہی کو کمزور بنا دیا تھا، لیکن منہاج سراج کے ایک اور شعر میں التمش کے لفظ کی موجودگی نے اس ضعف کو دور کر دیا، شعر یہ ہے:

اگر سلطانی ہند است ارث دودہ شمسی بحمد للہ ز فرزنداں کوئی التمش ثانی

(ارلی ٹرکش ایمپائر آف دہلی، عزیز احمد، ص ۱۵۶)

لیکن ایلتیمش یا التمش کے قائلین کے پاس ان شہادتوں کے علاوہ ایک اور

مضبوط دلیل یہ بھی ہے کہ کتبات وسکہ جات میں بھی ایلتتمش کندہ ہے، قطب مینار کی دوسری اور تیسری منزل اور صدر دروازہ پر لفظ ایلتتمش لکھا ہوا دیکھا گیا (لسٹ آف محمڈن اینڈ ہندو مونومنٹس کلکتہ ج ۳ ص ۵) آثار الصنادید میں سر سید احمد خاں نے قطب مینار کی چوتھی منزل کی ایک عبارت نقل کی ہے اور اس میں بھی ایلتتمش موجود ہے ان کتبوں کے علاوہ عزیز احمد نے ایچ این رائٹ کی کتاب (THE SULTANS OF DELHI THEIR COINS AND METROLOGY) کے حوالے سے لکھا ہے کہ سکہ نمبر ۱۲۱ کے ایک رخ پر ناگری میں صریحاً دو "ت" موجود ہیں "THE TWO 'TS' ARE GIVEN CLEARLY IN THE NAGRI TRANSLITERATION ON THE REVERSE OF COIN NO 121"

غلام رسول مہر مترجم طبقات ناصری نے اس اختلاف کی توجیہ کو مشکل قرار دیتے ہوئے لکھا کہ یا تو ان سکوں اور کتبوں کی تحریر کو نادانستہ غلطی سمجھا جائے یا پھر یہ کہا جائے کہ التتمش کے بجائے التمش محض سہولت کی وجہ سے زبان زد ہو گیا یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ خود سلطان کی زندگی میں یہ لقب ان متعدد شکلوں میں بولا جاتا تھا، لیکن مولانا مہر کے ان خیالات کی تائید میں کوئی مضبوط دلیل نہیں اسلیے جدید مورخین نے بجا طور پر معاصر شہادتوں کی موجودگی میں ایلتتمش کے لفظ کو زیادہ رائج قرار دیا، ایشوری پرشاد لکھتے ہیں کہ اب عام طور سے یہی لفظ ایلتتمش رائج و مقبول ہے (ہسٹری آف میڈیول انڈیا ص ۱۶۸)

ع۔ ص۔

آثار علمیہ و ادبیہ

مکتوب مولانا عبدالسلام ندوی[1]

بنام

مولوی عبدالباری صاحب[2]

محبی السلام علیکم

اعظم گڈھ کی خوشگوار ہوا کے جھونکے مبارک، یہاں اگر اعظم گڈھ کی لو کی لپٹ بھی آجائے تو اُس کو بوی پیراہن یوسف سے بھی عزیز تر سمجھیں۔

الا انعم صباحا ایھا الطلل البالی

یہاں الندوہ کی مکمل جلدیں تھیں اور جو ہیں ان میں مضمون مطلوب نہیں ملا آپ رسالہ اردو کی پرانی جلدوں سے وہ رسالہ الگ کر لیجئے جن میں مولانا شبلیؒ کی شعرالعجم پر تنقید نکلی ہے، نیز حسن البیان بجواب سیرۃ النعمان بھی تاکہ مجھکو جب ان کتابوں کی ضرورت ہو فوراً منگوالوں۔

اعظم گڈھ کے دلچسپ حالات سے مطلع فرماتے رہیے، غالباً اعظم گڈھ نے مجھ کو فراموش کر دیا ہو گا، لیکن میں بذات خود اعظم گڈھ کی یاد میں خود فراموش رہتا ہوں۔ والسلام

عبدالسلام ندوی

علی گڈھ ۴ جون ۱۹۳۶ء

---

[1] مصنف اسوۂ صحابہ و شعرالہند [2] دارالمصنفین کے ایک قدیم کارکن جو اہل قلم بھی تھے۔

مطبوعات جدیدہ

ڈاکٹر مشیر الحق شخصیت اور فکری بصیرت مرتبہ جناب شاہ عبدالسلام، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور بہترین کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۱۴، قیمت ۱۳۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

پروفیسر مشیر الحق بحری آبادی، سری نگر یونیورسٹی کشمیر کے وائس چانسلر تھے کہ وہ کشمیر کے سلسلہ کشت و خون کا ایک حصہ بن گئے، چار سال گزرنے کے بعد اب بھی انکی یادوں کے زخم تازہ ہیں، اس عرصہ میں ان کی یاد میں برابر تحریریں شایع ہوتی رہی ہیں، ان کا ذکر علماء اور دانشوروں میں ہوتا رہا، اس کا سبب یہ تھا کہ وہ قدیم روایات وجدید نظریات دونوں سے واقف تھے، مگر بعض مسائل میں ان کے خیالات ایک طبقہ کی نظر میں زیادہ پسندیدہ اور قابل قبول نہیں تھے، اب ان کے عزیز قریب اور لائق مرتب نے اس کتاب میں مختلف اہل علم و قلم کی ایسی تحریروں کو جمع کر دیا ہے جن سے صاحب تذکرہ کی شخص[illegible] اور خیالات کی قدر و قیمت ظاہر ہوتی ہے، مضامین خاصی تعداد میں ہیں اور اس لیے ان میں تنوع بھی نمایاں ہے، ایک مضمون میں پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی مدظلہ کے نام پر رحمۃ اللہ کی علامت ہے، اسی مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ پروفیسر مرحوم کی دعوت پر مختلف مکاتب فکر کے لوگ جمع ہو جاتے تھے مضمون نگار نے اس خوبی کو "ان کی فراست کا کمال" بتایا ہے، ایک اور مضمون نگار نے انکساری، رواداری، خوش مزاجی کی صفات میں "ذہنی توازن" کا ذکر کر کے لکھا کہ یہ خوبیاں انکے احباب کے درمیان ضرب المثل تھیں۔

اسلامی کارکنوں کیلئے تربیتی گائیڈ از ڈاکٹر ہشام الطالب،

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد صفحات ۵۱۹، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، دیپچ بلڈنگ، نظام الدین نئی دہلی ۱۳۔

اس کتاب کے مولف عراقی نژاد ہیں اور امریکہ میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد وہ تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ دعوتی اور تبلیغی کاموں میں بھی پیش پیش ہیں، اپنے تجربہ کی روشنی میں انہوں نے تبلیغ کے سلسلہ میں بعض اصولوں اور ضابطوں اور منصوبہ سازی کی اہمیت محسوس کی اور اس کے لیے بعض مفید طریقے ڈھونڈے ان کے یہ اصول یورپ میں خاص طور پر زیادہ کارگر ثابت ہو سکتے ہیں، اس مفید کتاب کا ترجمہ سلیس اور عام فہم ہونا چاہیے تھا، افسوس ہے اسکا خیال نہیں رکھا گیا، قدم قدم پر ترجمہ پن کا احساس ہوتا ہے، جیسے یہ جملہ کہ "انکے لیے یہ بات قابل فہم ہے کہ اس کام کیلئے وقت درکار ہے جو جماعت کے ذہنی یقین کو حقیقی زندگی میں اس کی تعلیمات کے بتدریج نفاذ کے ساتھ خلط ملط کردیتے ہیں"۔ اکثر جملوں کا مفہوم واضح نہیں ہو پایا ہے جیسے "ایک کامیاب رہنما میں بچکانہ پن ہوتا اور اس کا طور طریق ایک ذمہ دار اور بالغ انسان جیسا ہوتا ہے، وہ نفسیاتی طور پر کفیل ہوتا ہے اور اپنے پیروؤں کو نفسیاتی محافظت کا نمونہ پیش کرتا ہے"۔ تعبیرات میں بھی یہی حال ہے جیسے رسول اللہؐ کی افتاد مزاجی، انظامی ہیئت، بہتری تحریر، نصیحت طبع، بلاوابستگی، متفرقہ دلچسپیوں والا، تذکیر و تانیث کا فرق بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا جیسے ایک پریڈ گزر رہا تھا، آج کل کی اہل مغرب وغیرہ، اس قسم کی کتابوں کا عام فہم ہونا ضروری ہے، ناشرین کو اس کا احساس ہونا چاہیے اور اچھے اہل قلم سے ترجمہ کراکے ہی کتابیں شائع کرنا چاہیے۔

ع۔ ص۔

جلد ۱۵۴ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۴ء عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

شذرات

دسمبر ۱۹۸۶ء

... وحشت، بربریت، قتل، خوں ریزی، تشدد، دہشت گردی اور

... جرم ہے، تعلیمی ادارے جو افراد سازی کے کارخانے تھے آج طلبہ کی شورش پسندی اور ہنگامہ آرائی اور اساتذہ کی غیر ذمہ داری اور اپنے فرائض سے عدم دلچسپی کی وجہ سے بدعنوانیوں کا مرکز بن گئے ہیں، جس طبقہ پر امن وامان قائم کرنے اور خرابیوں کی اصلاح کی ذمہ داری تھی وہی امن وعدل اور آئین وقانون کا شیرازہ درہم برہم کر رہا ہے، سماج دشمن اور جرائم پیشہ لوگ کھلم کھلا ہر قسم کی زیادتی اور سرکشی کے مرتکب ہوتے اور آئین شکنی کرتے ہیں مگر نہ حکومت کو انکے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی ہمت ہوتی ہے اور نہ پولیس ان سے کوئی تعرض کرتی ہے، البتہ بے خطا، کمزور اور مظلوم لوگوں کو پریشان کرنا، ان کے خلاف فرضی اور جھوٹے مقدمے قائم کرنا، انہیں ہر قسم کی اذیت دینا اور زدوکوب کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے۔

ملک کے اس بگڑے اور بدتر ماحول میں صرف مسلمانوں کے دینی عربی مدارس ہی کانّھا مَنارۃُ مُمسیٰ راھبٍ مُتَبَتِّلٍ کے مصداق ہیں جن سے اسکی شب تاریک میں ضوفشانی ہو رہی ہے، یہ سب کے سب سیاسی ہنگاموں، قومی بکھیڑوں، ہر قسم کی شورشوں اور دہشت وتشدد سے الگ رہکر اپنی دھن میں مست اور اپنے حال میں مگن ہیں، انکا کام پیغام محبت پہنچانا ہے، یہ صرف قوم وملک کی تعمیر وترقی اور خلق خدا کی خدمت ونفع رسانی سے سروکار رکھتے ہیں، محبت، اخوت، میل ملاپ، صلح وآشتی اور رواداری کی دعوت دیتے ہیں، اپنے اور پرائے کی تمیز کے بغیر سب کی بھلائی اور خیر خواہی چاہتے ہیں، حق وصداقت کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں، ظلم وناانصافی کی مذمت کرتے ہیں، لوگوں کو شروفساد سے باز رکھتے ہیں اور انہیں عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تلقین کرتے ہیں، مسلمانوں کا ہر دینی مدرسہ اسی اصول پر کاربند ہے، وہ جانتا ہے کہ جھگڑوں، تفرقوں اور نفرتوں سے ملک کمزور ہوگا، اسکی بھلائی میل ملاپ، دوستی اور بھائی چارگی میں پنہاں ہے۔

آسائش دوگیتی تفسیر ایں دو حرف است با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ہندوستان کے دینی مدارس میں ندوۃ العلما لکھنؤ بہت ممتاز ہے، اسکے اساتذہ و طلبہ خاموشی اور ذمہ داری سے علم، مذہب، قوم اور وطن کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اسکے ناظم اور سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان اور مسلمانوں کے ہر طبقہ کے معتمد ہیں، وہ اپنی حب الوطنی اور قوم و وطن کی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کی وجہ سے ہندوؤں کے حلقہ میں بھی مقبول ہیں، جس قدر ملک میں ان کی عزت و عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے اس سے زیادہ عرب اور اسلامی ملکوں میں ان کا اعزاز و اکرام کیا جاتا ہے، ان کا آوازۂ شہرت عرب و عجم ہی میں نہیں یورپ، امریکہ اور افریقہ کے ملکوں میں بھی پہنچ گیا ہے، وہ ندوۃ العلماء کے علاوہ ہندوستان، اسلامی ملکوں اور یورپ کے متعدد علمی، تعلیمی، تحقیقی اور تصنیفی اداروں کے سربراہ ہیں جن میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی بھی ہے، ملک کو فتنہ و فساد، جنگ و جدال اور تباہی و بربادی کے دہانے پر دیکھ کر انکا درد مند دل تڑپ اٹھا اور وہ انسانیت کا پیغام پہنچانے کے لیے اسکے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئے۔

ہمارے ہندوستان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی کی ذات گرامی ہے جن کو اسلامی ملکوں کے علماء و فضلاء، اعیان حکومت اور فرمانروا اپنے یہاں مدعو کرتے اور ان سے مہمات امور میں رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں اور ان سے ملنے کے لیے لکھنؤ اور رائے بریلی تشریف لاتے ہیں، ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے سربراہ انکے پاس آنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، وزرائے اعظم مسز اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، وی۔ پی سنگھ اور اترپردیش کے وزرائے اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا، نرائن دت تیواری، ملائم سنگھ اور دوسرے متعدد مرکزی و صوبائی وزراء اور کئی ریاستوں کے گورنران کے بوریائے فقر پر فروکش ہوتے رہے ہیں اور ہم جیسے مسلمان انکی مجلسوں میں حاضر ہو کر اپنا ایمان و یقین تازہ کرتے ہیں تعال نومن ساعۃ۔ اگر انکی سربراہی میں چلنے والا دنیائے اسلام کا یہ مقبول

ادارہ ہی تشدد اور دہشت گردی کا اڈا بن جائے تو کیا ماند مسلمانی ؟

گذشتہ ماہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بے گناہ طلبہ پر رات کے سناٹے میں پولیس نے گولیاں چلا کر انہیں زدوکوب کیا، گرفتار کیا اور ندوہ کی عمارتوں کو نقصان پہنچایا، اس سے ہندوستان ہی نہیں دنیا کے مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچا ہے دراصل حکومت اور اس کی انتظامیہ نے مسلمانوں کی تذلیل واہانت کا جو ناروا سلسلہ شروع کیا ہے یہ اسی کی ایک کڑی ہے ابھی تک مسلمان بابری مسجد کی شہادت سے کراہ ہی رہے تھے کہ اس دوسرے سنگین حادثہ نے انکو پھر نہایت بے قرار و بے چین کر دیا، وہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ ان کے اتنے باوقار، معتبر، صلح و آشتی، امن وامان اور انسانیت کے داعی و علمبردار ادارہ پر شب خون مارا جا سکتا ہے، اگر حکومت اور انتظامیہ کو مولانا سید ابوالحسن علی کی حب الوطنی پر بھروسہ نہیں اور وہ ان کے ساتھ دوسرے اور تیسرے درجہ کے شہریوں جیسا برتاؤ کر سکتی ہے تو عام مسلمان کس شمار قطار میں ہیں، انہیں بڑی سنجیدگی اور دوراندیشی سے اپنے بارے میں سوچنا اور اپنی اصلاح و تنظیم کا پروگرام بنانا ہوگا۔ حکومت کے لاعلمی کا عذر کر دینے اور شرمندگی ظاہر کرنے یا معافی مانگ لینے سے مسلمانوں کی تشفی نہیں ہو سکتی، انکی تسلی تو اس سے ہوگی کہ آیندہ اس طرح کے واقعات کا سدباب کرنے کے لیے ندوہ پر پولیس ایکشن کے ذمہ دار ہر ہر شخص کو عبرت ناک سزا دی جائے۔

حضرت پیر محمد شاہ درگاہ ٹرسٹ کی دعوت اور اپنے مخلص بزرگ جناب ضیاء الدین ڈیسائی کی خواہش پر راقم نے اس ماہ کے اوائل میں احمد آباد کا سفر کیا اور درگاہ ٹرسٹ کے سیمنار میں شرکت کی جس کی روداد آیندہ سپرد قلم ہوگی۔

خاکسار کے والد بزرگوار کی وفات کی خبر سنکر متعدد مخلصین نے تعزیتی خطوط لکھے اور تار دیئے، ان سب کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔

مقالات

مدینہ منورہ کی دینی و علمی و ادبی مجلسیں

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری۔

حضرات صحابہ و تابعین کی عام تعلیمی و تدریسی مجلسوں اور حلقوں کے علاوہ مختلف اوقات میں ان کی خصوصی مجلسیں اور حلقے بھی قائم ہوتے تھے، جن میں ہم ذوق اہل علم مختلف علوم و فنون اور حالات و معاملات پر بحث و مذاکرہ کرتے تھے اور اس کا محور دین ہوتا تھا، کتاب و سنت، فقہ و فتویٰ، سیر و مغازی، شعر و ادب اور ایام عرب ان کے خاص اور دلچسپ موضوعات تھے، مدینہ عجمی افکار و خیالات سے پاک تھا، کوفہ و بصرہ کی طرح یہاں فکری و ذہنی فتنے نہیں تھے، اہل مدینہ کا مزاج سراسر دینی و مذہبی تھا، اسی کے ساتھ ان میں شرعی حدود کے اندر جمالیاتی ذوق، تفنن طبع، زندگی اور زندہ دلی پائی جاتی تھی، اسلئے ان کی یہ مجلسیں بڑی نظیف و لطیف، بابرکت اور دلکش ہوتی تھیں، رفاہیت اور خوشحالی کا دور شروع ہو چکا تھا، بڑی حد تک زندگی کا معیار بلند ہو گیا تھا، ارباب جاہ و حشم کی داد و دہش، سخاوت، مروت اور فتوت کی وجہ سے ذہنی و طبعی سکون تھا اور ہر موضوع پر کھل کر بات چیت ہوتی تھی۔

یہ مجلسیں عام طور سے مسجد نبوی کے مختلف حصوں میں مختلف اوقات میں منعقد ہوتی تھیں، اس کے علاوہ مدینہ کے عوالی و اطراف میں بھی ان کا انعقاد ہوتا تھا، خاص طور سے وادی عقیق کے قصور و محلات میں علمی و ادبی مجلسیں کئی کئی دن تک جمی رہتی تھیں،

یہاں کے حسین وجمیل قدرتی مناظر شعراء ادباء اور اہل ذوق کے لیے جاذب قلب ونظر تھے، اس فرحت افزا اور صحت بخش دلکش علاقہ میں سیر وتفریح، دعوت ومدارات اور مجلسی بحث ومذاکرہ میں خوش وقت کرتے تھے۔

اس وقت تک امالی، مجالس، نوادر اور تعلیقات کے جمع وترتیب کا رواج نہیں ہوا تھا، اس لیے مدینہ اور وادیٔ عقیق وغیرہ کی مجالس کے دینی، علمی، ادبی، لسانی، شعری شہ پارے کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں، زبیر بن بکار کی کتاب نوادر المدنیین اور کتاب العقیق واخبارہا اور ابو علی ہارون بن زکریا ہجری کی کتاب العقیق واخبارہا اور کتاب النوادر والتعلیقات (معلوم ہوا ہے کہ چھپ گئی ہے) میں ان مجلسوں کے نوادر درج رہے ہوں گے، مگر یہ کتابیں ناپید ہیں، ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی اور ابو علی قالی کی کتاب الامالی وغیرہ میں مدینہ کے شعراء وادباء کے کچھ نوادر ملتے ہیں، ذیل میں مدینہ منورہ اور وادیٔ عقیق کی چند مجلسوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مجلس القلادہ عہد صحابہ وتابعین میں مدینہ منورہ میں علمی ودینی مجلسیں منعقد ہوتی تھی، جن میں مختلف موضوعات پر کھل کر گفتگو ہوتی تھی اور ان میں شریک ہونے والے علماء فقہاء، محدثین اور اعیان واشراف اظہار رائے کرتے تھے، بعض اوقات مسائل حاضرہ اور وقتی سیاست پر بھی بحث ہوتی تھی، یہ مجلسیں مسجد نبوی کے مختلف حصوں اور گوشوں میں عام طور سے رات میں نماز عشاء کے بعد منعقد ہوتی تھیں، ان کے علاوہ شہر کے مختلف مقامات پر ہم ذوق اہل علم وادب کی مستقل نشست ہوتی تھی، جس میں حدیث، تفسیر، فقہ، مغازی، شعر وادب پر مذاکرہ ہوتا تھا۔

ان ہی مجلسوں میں ایک مجلس القلادہ تھی جو مسجد نبوی کے اسطوانۂ وفود کے پاس ہر رات عشاء کے بعد جمتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف قبائل کے وفود آتے تو آپ اسی ستون کے پاس ان کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے یہ حجرۂ مبارکہ سے متصل ستون محرس کے بعد دوسرا ستون ہے، اسی کے پاس مجلس القلادہ منعقد ہوتی تھی۔

مدینہ منورہ کے ہر مورخ نے اس مجلس کا شاندار طریقہ پر ذکر کیا ہے قدیم ترین مورخ محمد بن حسن بن زبالہ مخزومی مدنی نے ۱۹۹ھ میں تاریخ المدینہ تصنیف کی اس میں لکھا کہ:

وانہ المجلس الذی یقال لہ مجلس القلادۃ وکان یجلس فیہ سروات الناس قدیما۔

اسی مجلس کو مجلس القلادہ کہا جاتا تھا پہلے زمانہ میں اس میں نامی گرامی حضرات بیٹھا کرتے تھے۔

علامہ سمہودی نے وفاء الوفاء میں بیان کیا ہے:

وکانت تعرف ایضاً بمجلس القلادۃ ویجلس الیھا سروات الصحابۃ وافاضلھم رضوان اللہ علیھم۔

یہ مجلس القلادہ کے نام سے مشہور تھی اس میں طبقۂ صحابہ کے علماء و فضلاء اور سربرآوردہ حضرات شریک ہوتے تھے۔

اور صاحب قاموس علامہ مجد الدین نے المغانم المطابہ میں لکھا ہے:

وانما سمی القلادۃ لشرف من کان یجلس الیھا من بنی

اس میں بنو ہاشم وغیرہ کے اعیان و اشراف کے شریک ہونے کی وجہ سے

هاشم وغيرهم[1]	اسکو قلادہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

اس میں اجلہ صحابہ وتابعین قریش کے اعیان واشراف، انصار اور مہاجرین کے سربرآوردہ حضرات پابندی سے شریک ہوتے تھے اور مدینہ منورہ کے دینی وعلمی یواقیت وجواہر کا یہ حلقہ اس کے گلے کا ہار تھا، محمد بن حبیب بغدادی نے کتاب المنمق میں اسکو یوں بیان کیا ہے:

وكان ذلك المجلس يسمى مجلس	یہ [illegible] اور اہل مجلس
القلادة يشبه بالقلادة المنظومة	شرف شرکاء کی وجہ سے موتیوں سے
بالجوهر لحسنه وجماله وشرف	گندھے ہوئے ہار کے مانند تھی اسی لیے
اهله[2]	اس کا نام مجلس القلادہ پڑ گیا۔

اس کے شرکاء میں چند حضرات کے نام یہ ہیں (۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۲) حضرت حسن بن علیؓ (۳) حضرت عبیداللہ بن عدی بن خیار (۴) عبدالرحمن بن عبداللہ بن ابوربیعہ مخزومی (۵) حضرت ابویسار بن عبدالرحمن بن عبیداللہ (۶) حضرت موسیٰ بن طلحہ بن عبیداللہ (۷) حضرت عبدالرحمن بن عبد قاری رضی اللہ عنہم، ان کے علاوہ بنو ہاشم، بنو امیہ، انصار، مہاجرین وغیرہ کے اہل علم وفضل اور اعیان واشراف ہر رات اس میں پابندی سے شریک ہوکر مختلف امور ومسائل پر بحث ومذاکرہ کیا کرتے تھے، مذکورہ بالا شرکائے مجلس کے ناموں سے اس کی [illegible] اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حضرت معاویہؓ قیام مدینہ کے زمانہ میں پابندی سے اس میں شریک ہوتے تھے اور اس کو بڑی اہمیت دیتے تھے، ملک شام جانے کے بعد بھی اس مجلس کی یاد

---

[1] وفاالوفاء ج ۱، ص ۴۴۹ ـ ۴۵۰۔ [2] کتاب المنمق، ص ۴۴۵۔

ان کو ستاتی تھی اور جب کوئی شخص مدینہ سے ان کے پاس جاتا تو اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے اور کہتے تھے کہ :

لن تبرح المدینۃ عامرۃ — جب تک مجلس قلادہ برپا رہے گی،

ما دام مجلس القلادۃ — مدینہ آباد رہے گا۔

اس مجلس کے علمی، دینی، ادبی شہ پارے اور نوادرات یکجا نہیں ملتے ہیں، صرف محمد بن حبیب بغدادی متوفی ۲۴۵ھ نے دو واقعات بیان کئے ہیں جو اس کے شیعی رجحان سے تعلق رکھتے ہیں، ہم ان کو بیان کرتے ہیں۔

اس مجلس کے حاضر باش لوگوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ایک بزرگ محمد بن عبداللہ بن ابوعتیق محمد بن عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق بھی تھے جو ابن ابوعتیق کی کنیت سے مشہور تھے، ان کے ذمہ ایک تاجر کا چھ ہزار درہم قرضہ تھا تاجر نے تقاضا کیا تو ابن ابوعتیق نے اس سے کہا کہ فی الحال قرضہ کی ادائیگی کا انتظام نہیں ہے، البتہ تم کو ایک ترکیب بتاتا ہوں جس سے میں قرضہ سے سبکدوش ہو سکتا ہوں میں جب مجلس قلادہ میں جاکر بیٹھوں تو تم میرے پاس آکر مجھ سے بنی عبد مناف والوں کے بارے میں سوال کرنا۔

اس گفتگو کے بعد ابن ابوعتیق رات کو مجلس قلادہ میں جاکر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ گئے، وہ تاجر بھی طے شدہ بات کے مطابق وہاں آکر بیٹھ گیا اور ابن ابوعتیق سے کہا کہ ابو محمد! آپ مجھے خاندان بنو عبد مناف کے بارے میں کچھ باتیں بتایئے، انھوں نے بتایا کہ بنو عبد مناف کی شاخ آل حرب نے شرک کیا تو دوسرے لوگوں نے

بھی شرک کیا اور جب آلِ حرب نے اسلام قبول کیا تو دوسرے لوگ بھی مسلمان ہوگئے، تاجر نے پوچھا کہ اس کے بعد اس خاندان کے دیگر افراد کیسے ہیں؟ ابن ابو عتیق نے کہا کہ بنو عاص میں شہداء اور اشراف سب سے زیادہ ہیں، تاجر نے یہ سن کر کہا کہ سبحان اللہ، اس صورت میں آپ بنو عبد المطلب کو کس درجہ پہ رکھیں گے، ابن ابو عتیق نے غصہ کے انداز میں تاجر سے کہا :

یا احمق انما سألتنی عن بیوت	ارے احمق! تو نے آدمیوں کے گھرانے
الآدمیین ولو سألتنی عن وجوہ	کے متعلق پوچھا تھا، اگر معزز و مقرب
الملائکۃ لاخبرتك عن بنی	ملائکہ کے متعلق مجھ سے دریافت کرتا تو
عبد المطلب فیہم رسول اللہ	میں تم کو خاندان عبد المطلب کے بارے
صلی اللہ علیہ وسلم وفیہم	میں بتاتا کہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ
اسد اللہ وفیہم الطیار	علیہ وسلم اور حضرت حمزہ اسد اللہ اور
فی الجنۃ۔	جعفر طیار ہیں۔

حضرت حسنؓ نے ابن ابو عتیق کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی کہا کہ ابو محمد! میں تم سے قسم دے کر کہتا ہوں کہ کوئی حاجت ہو تو مجھ سے بیان کرو، ابن ابو عتیق نے کہا کہ ہاں اس شخص کا چھ ہزار درہم میرے ذمہ باقی ہے، حضرت حسنؓ نے کہا :

قد قضاھا اللہ عنك ھی	اللہ تعالیٰ نے یہ قرض تمہاری طرف
علینا دونك۔	سے ادا کر دیا، وہ ہمارے ذمہ ہے،

حسب معمول ایک رات یاران باصفا مجلس قلادہ میں مختلف موضوعات پر باتیں کر رہے تھے، اسی درمیان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ

ونے لگا اور عبید اللہ بن عدی بن خیار نے کہا کہ بلاغت و تفقہ میں حضرت علیؓ جیسا
ں نے کسی کو نہیں دیکھا، یہ سُن کر ابو یسار بن عبد الرحمٰن نے ان سے کہا کہ گویا آپ نے
ضرت معاویہؓ کو نہیں دیکھا ہے، خدا کی قسم معاویہ کی ذات اور قلب کو انسان ہی پہچان
سکتا ہے، مجلس میں عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر بھی موجود تھے، انہوں نے ابو یسار سے کہا
کہ گویا آپ نے حضرت عمرؓ کے عدل و انصاف اور کمالات کو نہیں دیکھا، عبد الرحمٰن بن عبد اللہ
ابو ربیعہ نے ان باتوں کو سُن کر کہا کہ آپ لوگ صرف مہاجرین میں فضیلت دیکھ رہے ہیں،
ان میں اسلام لانے کے علاوہ اور کون سی خاص بات ہے؟ کیا آپ لوگوں نے حارث بن
ہشام کو نہیں دیکھا ہے؟ اس پر موسیٰ بن طلحہ نے کہا کہ اس مجلس میں آپ حارث بن ہشام
وغیرہ کا ذکر مہاجرین کے ساتھ کر رہے ہیں، حالانکہ وہ مہاجرین کے غلام تھے جنھوں
نے ان کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد آزاد کر دیا۔

اس بحث و تکرار نے اتنا طول پکڑا کہ عبد الرحمٰن اور موسیٰ آپس میں الجھ پڑے،
اور حاضرین نے بیچ بچاؤ کر کے اس وقت معاملہ رفع دفع کر دیا، مگر عبد الرحمٰن نے کہا کہ
میں اس بات کو امیر مدینہ مروان بن حکم سے بیان کر کے کہوں گا کہ موسیٰ نے آپ کو اور
معاویہ کو غلام بتایا ہے، یہ سُن کر موسیٰ کو مروان کی سخت گیری سے خطرہ محسوس ہوا
اور اسی وقت مجلس سے اٹھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پہونچے، وہ موسیٰ
کی رضاعی خالہ تھیں، خادمہ بریرہ نے دروازہ کھولا، معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ سو گئی
ہیں اور موسیٰ کچھ کہے سُنے بغیر واپس چلے گئے۔

ادھر عبد الرحمٰن نے رات ہی میں مروان کو سارا واقعہ سُنا دیا تھا، مروان صبح کی
نماز کے بعد منبر پر بیٹھا اور کہا کہ وہ شخص کہاں ہے جو کہتا ہے کہ امیر المومنین آزاد کردہ

غلام ہیں، اس کے بعد طرح طرح کی دھمکی دی، حضرت عائشہؓ حجرہ کے اندر مصلی پر بیٹھی مروان کی باتیں سن رہی تھیں، انکا معمول تھا کہ طلوع آفتاب سے پہلے کسی سے بات چیت نہیں کرتی تھیں، دن نکلنے کے بعد بریرہ سے پوچھا کہ کیا بات ہے، مروان کیا کہہ رہا ہے؟ موسیٰ وہیں موجود تھے، فوراً سامنے جاکر بتایا کہ مروان مجھ کو یہ سب باتیں سنا رہا ہے، پھر رات کی مجلس کا پورا واقعہ بیان کیا، حضرت عائشہؓ نے تمام ماجرا سُنکر فرمایا کہ افسوس مروان اس حقیقت کا انکار کر رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو وکرم نے فتح مکہ کے موقع پر ان لوگوں کو اپنی پناہ میں لینے کے بعد ان کی جان ہی ان کو ہبہ کردی، اسوقت حضرت عائشہؓ کی آواز کچھ تیز ہوگئی تھی۔

اس کے بعد موسیٰ سے کہا کہ تم اپنے مکان چلے جاؤ، موسیٰ نے کہا کہ مروان کی طرف سے مجھے خطرہ ہے، حضرت عائشہؓ نے کہا کہ کیا مروان میں اتنی ہمت ہے کہ تم کو تکلیف پہونچا سکے، یہ سُنکر موسیٰ اپنے گھر چلے گئے۔

اس کے بعد مروان نے حضرت عائشہؓ کی تمام باتیں حضرت معاویہؓ کے پاس لکھیں، حضرت معاویہؓ نے مروان کا خط پڑھ کر کہا کہ:

فسد۔ واللہ مجلس القلادۃ — واللہ مجلس قلادہ اجڑ گئی، تف ہے

لعن اللہ مروان — مروان پر

اور مروان کو لکھا کہ تم پر تمہارے خطبہ پر اور منبر رسول پہ بیٹھنے پر تف ہے، اس خط کے بعد اس معاملہ میں کوئی گفتگو نہ کرنا اور نہ ہی کسی قسم کی کارروائی کرنا، اس واقعہ کی رات میں لوگ مجلس قلادہ سے نکلے تو اس میں نہیں گئے اور مجلس ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی [1]

---

[1] کتاب المنمق، ص ۴۴۵ تا ۴۴۹، حیدرآباد۔

محمد بن حبیب کے بیان کردہ پہلے واقعہ میں حضرت حسنؓ کے جود و سخا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد پر ان کے احسان و ترحم کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے واقعہ سے حضرت معاویہؓ اور بنوامیہ کی تحقیر معلوم ہوتی ہے، اس میں خاص ذہنیت کام کرتی ہے۔

مجلس فقہائے سبعہ | مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ کی المجلس الفقہی مسجد نبویؐ میں منعقد ہوتی تھی، یہ مجلس ان حضرات کی تدریسی و تعلیمی مجلسوں کے علاوہ حوادث و نوازل میں بحث و مذاکرہ اور غور و فکر کے لیے منعقد ہوتی تھی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا فقہی مسلک ان کے تلامذہ نے مدینہ میں عام کیا جن میں فقہائے سبعہ (سات فقہاء) خاص شہرت کے مالک ہیں، ایک شاعر نے کہا ہے:

اذا قیل من فی العلم سبعۃ ابحر روایتہم لیست عن العلم خارجہ

فقل ہم عبید اللہ عروۃ قاسم سعید، ابوبکر، سلیمان، خارجہ

یعنی عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود متوفی ۹۸ھ، عروہ بن زبیر بن عوام متوفی ۹۴ھ، قاسم بن محمد بن ابو بکر صدیق متوفی ۱۰۷ھ، سعید بن مسیب متوفی ۹۴ھ، ابو بکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام متوفی ۹۴ھ، سلیمان بن یسار ہلالی متوفی ۱۰۷ھ، خارجہ بن زید بن ثابت متوفی ۱۰۰ھ، ابن رشیق قیروانی نے العمدہ فی محاسن الشعر و نقدہ میں فقہاء کے اشعار نقل کیے ہیں، اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ قبیلہ ہذیل کی ایک حسین و جمیل عورت مدینہ آئی اور جمالیات پسند ارباب ذوق اس کو شادی کا پیغام دینے لگے، فقہائے سبعہ میں سے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود نے ازراہ تفنن و زندہ دلی اس عورت کے بارے میں یہ اشعار کہے اور المجلس الفقہی

کے ارکان کے نام ان میں جمع کیے ۔

احبک حبا لو علمت ببعضہ — لجدت ولم یصعب علیک شدید

وحسبک یا ام الولید مولعی — شھیدی ابو بکر فنعم شھید

ولیعلم وجدی قاسم بن محمد — وعروۃ ما اخفی بکم وسعید

ولیعلم ما القی سلیمان علمہ — وخارجۃ یبدی بنا ولیعید

متی تسألی عما اقول تخبری — فللہ عندی طارف وتلید

اس کے بعد ابن رشیق نے ان چھ حضرات کے تفصیلی نام درج کرکے لکھا ہے کہ ساتویں یہی شاعر عبید اللہ بن عبد اللہ ہیں۔ یہی حضرات فقہائے مدینہ ہیں[1]

بعض اہل علم نے سالم بن عبد اللہ بن عمر کو ان میں شمار کیا ہے، یہ مجلس مسجد نبوی میں خاص خاص مسائل کے بارے میں منعقد ہوتی تھی اور ان میں کتاب و سنت، تعامل صحابہ اور سنت ماضیہ کی روشنی میں غور کرکے متفقہ فتویٰ دیا جاتا تھا، اسکے بعد اسی کے مطابق مدینہ کے قاضی فیصلہ صادر کرتے تھے، حضرت عبد اللہ بن مبارک کا بیان ہے:

کان فقہاء المدینۃ سبعۃ — فقہائے مدینہ سات تھے، ان حضرات

وکانوا اذا جاء تھم — کے پاس جب کوئی مسئلہ آتا تو سب

المسئلۃ دخلوا فیھا جمیعا — جمع ہوکر اس کے بارے میں غور

فنظروا فیھا ولا یقضی القاضی — و فکر کرتے اور قاضی کوئی فیصلہ

حتی یرجع الیھم فینظرو — نہیں کرتا تھا، یہاں تک کہ انکی

---

[1] العمدہ ج ۱ ص ۲۵ و ۲۶۔

	طرف رجوع کرتا تھا اور وہ حضرات
فیھا فیصدرون[1]	اس میں غور کر کے فیصلہ و فتویٰ
	صادر کرتے تھے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا یہ فقہی مجلس عام طور سے مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی اور بعض اوقات حسب ضرورت دوسرے مقامات پر بھی اس کا انعقاد ہوتا تھا، یہ اجتہاد و اجماع کی ابتدائی شکل تھی۔

مجلس اصحاب شوریٰ فقہائے سبعہ اور مدینہ کے دوسرے علماء و فقہا اور اہل الرائے حضرات حکومت و امارت کے معاملات بھی طے کرتے تھے اور امراء و اعیان حکومت کے یہاں ان کی مجلس مشاورت منعقد ہوتی تھی، جس کی حیثیت مجلس شوریٰ کی تھی،

حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ولید بن عبدالملک کی طرف سے مدینہ منورہ کے امیر بنائے گئے تو یہاں آتے ہی مسجد نبویؐ میں نماز ظہر کے بعد شہر کے ان دس فقہاء و علماء کو جمع کیا، عروہ بن زبیر، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؓ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، ابوبکر بن سلیمان بن ابوحثمہ، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق، سالم بن عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عامر بن ربیعہ، خارجہ بن زید بن ثابت رحمۃ اللہ علیہم۔

اور ان حضرات کے سامنے حمد و صلوٰۃ کے بعد مختصر سا خطبہ دیکر ان سے کہا:

انی دعوتکم لامر توجرون علیہ	میں نے آپ لوگوں کو ایسے امر کیلئے
وتکونون فیہ اعوانا علی الحق	دعوت دی ہے جس میں آپ کے لیے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۳، ص ۴۳۴ و سیر اعلام النبلاء ذکر سالم بن عبداللہ۔

ما اریدان اقطع امرا الا	اجر و ثواب ہے اور آپ حق کے
برائکم اوبرای من حضرمنکم	اعوان و انصار ہوں گے، میں نہیں
فان رایتم احدا یتعدی	چاہتا کہ آپ سب کی رائے یا آپ
او بلغکم عن عامل لی ظلامة	میں سے جو حاضر ہو اس کی رائے
فاحرج باللہ علی احد	کے بغیر کسی بات کا قطعی فیصلہ کروں
بلغہ ذلك الا بلغنی فجزوہ	اگر آپ کسی کو حدود شرع سے گزرتے
خیرا وافترقوا۔[1]	ہوئے دیکھیں یا میرے کسی عامل کی
	طرف سے ظلم و زیادتی کی خبر پہنچے تو
	میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ جسکو
	اس کی اطلاع ہو مجھے خبر کرے،
	یہ سُن کر تمام حضرات نے جزاک اللہ کہا۔

یہ ابن سعد کی روایت ہے، ابو حنیفہ دینوری نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دس فضلاء کو بلایا اور ان حضرات میں سے عروہ بن زبیر، عبداللہ بن عتبہ، ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث، ابوبکر بن سلیمان بن ابو حثمہ، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد بن ابوبکر، سالم بن عبداللہ کے نام درج کیے ہیں، جب یہ حضرات جمع ہو گئے تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان سے فرمایا:

اعلموا انی لست اقطع امرا	آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہئیے کہ
الا برائکم و مشورتکم	میں آپ کی رائے مشورہ کے بغیر

[1] طبقات ابن سعد ج ۵، ص ۲۴۳۔

فاشیروا علی۔　　کسی بات کا قطعی حکم نہیں کر سکتا
اس لیے مجھے مشورہ دیتے رہیں۔

اس پر ان حضرات نے کہا۔

نفعل ایھا الامیر جزیت علی　　اے امیر! ہم ایسا ہی کریں گے،
ما نتوی خیر ما جزی موثر　　اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزا دے
لمرضاۃ ربہ ثم خرجوا[1]　　یہ کہہ کر وہ لوگ چلے گئے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز ۸۶ھ کے آخر یا ۸۷ھ کی ابتدا میں امیر مدینہ بنکر آئے اور ۹۳ھ تک اس عہدہ پر رہے، اس سات سالہ مدت میں ان کے ہر قسم کے امور و معاملات فقہائے مدینہ کے مشورہ اور صوابدید سے انجام پاتے رہے، ایک مثال ملاحظہ ہو۔

۹۱ھ میں خلیفہ ولید کے حکم سے عمر بن عبد العزیز نے مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع کی، اس سے پہلے حضرت عثمانؓ کی توسیع میں مسجد کے حدود مشتبہ ہو گئے تھے، اس لیے حضرت عمر بن عبد العزیز نے قاسم بن محمد، سالم بن عبد اللہ، نافع بن جبیر، عبید اللہ بن عبد اللہ، عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ، خارجہ بن زید بن ثابت کو بلایا اور ان لوگوں نے عہد رسالت کی مسجد کی حد بتائی تو اسی کے مطابق تعمیر کا نقشہ بنوایا[2]

مجلس علمائے مغازی اس دور میں مدینہ منورہ میں مختلف علم و فن کے ممتاز علما و فضلا اپنے اپنے ذوق کے مطابق مذاکرات کی مجلسیں منعقد کرتے تھے اور خاص خاص موضوعات پر مذاکرہ و مباحثہ کر کے معلومات بہم پہنچاتے تھے، تفسیر، حدیث، فقہ و فتویٰ

---

[1] الاخبار الطوال ص ۳۱۳ [2] کتاب المناسک حربی، ص ۳۶۶۔

سیر و مغازی، ایام وحروب اور شعر و ادب اس دور کے عام موضوع تھے، چنانچہ سیر و مغازی کی علٰحدہ مجلس قائم ہوتی تھی جس میں غزوات وسرایا کے علما و مصنفین شریک ہوتے تھے، مغازی کے مشہور مصنف ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی متوفی سنہ ۱۷۰ھ نے علمائے مغازی کی اس مجلس میں بیٹھ کر اس فن میں امامت کا درجہ پایا۔

ان کے صاحبزادے محمد بن ابو معشر سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے والد نے مغازی کو کیسے یاد کیا؟ انھوں نے بتایا کہ:

کان التابعون یجلسون الی استاذہ فکانوا یتذاکرون المغازی فحفظ[1]	تابعین حضرات ان کے استاد کے یہاں بیٹھ کر مغازی کے بارے میں مذاکرہ کرتے تھے، اسی مجلس میں ابو معشر نے مغازی یاد کی۔

اس دور میں مدینہ منورہ میں علم المغازی کے علما و مصنفین کی ایک بڑی جماعت تھی، جس میں یہ حضرات نمایاں ہیں، عروہ بن زبیر متوفی سنہ ۹۴ھ ابان بن عثمان بن عفان متوفی سنہ ۱۰۵ھ، عاصم بن عمرو بن قتادہ متوفی سنہ ۱۲۰ھ، شرحبیل بن سعد متوفی سنہ ۱۲۳ھ، محمد ابن شہاب زہری متوفی سنہ ۱۲۳ھ، عبداللہ بن ابوبکر بن حزم متوفی سنہ ۱۳۵ھ، ولید بن کثیر متوفی سنہ ۱۵۱ھ، موسیٰ بن عقبہ متوفی سنہ ۱۴۱ھ، عبداللہ بن جعفر متوفی سنہ ۱۷۰ھ، محمد بن اسحاق متوفی سنہ ۱۵۱ھ، یہ حضرات مغازی کی علٰحدہ مجلس منعقد کرکے باہمی افادہ و استفادہ کرتے تھے اور شرکا و سامعین اس سے مستفید ہوتے تھے، ان ہی میں امام ابو معشر سندی بھی ہیں۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۴۲۸۔

مجلس عقیل بن ابوطالب حضرت علیؓ کے بھائی حضرت عقیل بن ابوطالبؓ انساب اور ایام عرب کے زبردست عالم تھے، خاص طور سے قبیلہ قریش کے مثالب و معائب کے بارے میں ان کو بہت زیادہ معلومات تھیں، مسجد نبویؐ میں ان کی مجلس بڑے اہتمام سے منعقد ہوتی تھی، خاص طور سے ان کے لیے تکیہ رکھا جاتا تھا اور لوگ ان کے پاس بیٹھکر انساب و حروب اور دوسری معلومات حاصل کرتے تھے۔

قریش میں چار ایسے مستند و معتبر اہل علم تھے کہ لڑائی جھگڑے میں انکا فیصلہ مانا جاتا تھا، عقیل، مخرمہ، حویطب اور ابوجہم، عقیل قریش کے معائب اور انکی غلط کاریوں کے واقعات بیان کرتے تھے اور باقی تین حضرات قریش کے محاسن اور کارناموں کو سناتے تھے۔ [1] حضرت عقیل کی شاندار مجلس کا ذکر اسد الغابہ میں یوں ہے:

وکان اعلم قریش بالنسب واعلمهم بایامها... وکانت له طنفسة تطرح له فی مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم و یجتمع الناس الیه فی علم النسب وایام العرب وکان یکثر مثالب قریش فعادوه لذلك وقالوا فیه بالباطل [2]	وہ قریش کے انساب و حروب کے سب سے بڑے عالم تھے، مسجد نبوی میں ان کے لیے تکیہ رکھا جاتا تھا اور لوگ نسب اور ایام عرب کی معلومات کے لیے ان کے پاس جمع ہوتے تھے وہ قریش کے معائب زیادہ بیان کرتے تھے، اس لیے لوگ ان کے مخالف ہوکر ان کے بارے میں غلط باتیں کہنے لگے۔

---

[1] اصابہ، ج ۴، ص ۲۵۵ [2] اسد الغابہ، ج ۴، ص ۴۲۳۔

حضرت عقیل اپنی مجلس میں ہر سوال کا فوراً مسکت جواب دیتے تھے، اصابہ میں لکھا ہے:

وکان عالماً بانساب قریش و	وہ قریش کے انساب، کارنامے اور
مآثرھا و مثالبھا وکان الناس	معائب کے بڑے عالم تھے، مسجد نبوی
یاخذون ذلک عنہ بمسجد المدینۃ	میں لوگ ان باتوں کی معلومات حاصل
وکان سریع الجواب المسکت۔	کرتے تھے، وہ فوراً مسکت جواب دیا کرتے تھے۔

حضرت عقیل ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق گئے تو حضرت معاویہؓ نے کہا کہ عقیل نے علیؓ کے مقابلہ میں مجھ کو بہتر جانا اس لیے میرے پاس آئے ہیں، حضرت عقیل نے جواب دیا کہ علی دینی لحاظ سے بہتر ہیں اور آپ دنیاوی اعتبار سے بہتر ہیں۔

مجلس زین العابدین و عروہ | حضرت زین العابدین علی بن حسین، حضرت عروہ بن زبیر، حضرت عبداللہ بن علی کی مجلس ہر رات عشاء کے بعد مسجد نبوی کے آخری گوشہ میں منعقد ہوتی تھی، جس میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی، بعض اوقات وقتی سیاست اور اموی خلفاء و امراء کے بارے میں تبادلۂ خیالات بھی ہوتا تھا، حضرت حسن کے صاحبزادے کا بیان ہے:

کان علی بن حسین بن علی بن ابی طالب	علی بن حسین اور عروہ بن زبیر ہر رات
یجلس کل لیلۃ ھو و عروۃ بن	نماز عشاء کے بعد مسجد نبوی کے آخری
الزبیر فی مؤخر مسجد رسول اللہ	حصہ میں بیٹھا کرتے تھے اور میں بھی
صلی اللہ علیہ وسلم بعد العشاء	ان دونوں حضرات کے ساتھ بیٹھا
الآخرۃ فکنت اجلس معھما	کرتا تھا۔

اس کے بعد بیان کرتے ہیں کہ حسبِ معمول ایک رات ہم لوگ آپس میں گفتگو کر رہے تھے، باتوں باتوں میں بنی امیہ کے ظلم و جور کی بات چل پڑی اور یہ کہ جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ حالات میں تبدیلی کی طاقت نہیں رکھتے ہیں ایسے لوگوں کے متعلق علی بن حسین اور عروہ بن زبیر کو عذاب الہٰی کا خطرہ محسوس ہوا اور عروہ بن زبیر نے علی بن حسین سے کہا کہ اگر کوئی شخص بنو امیہ اور ان کے اعوان و انصار سے میل بھر دور رہے گا اور ان پر آفت آئی تو وہ محفوظ رہے گا، اس گفتگو کے بعد عروہ بن زبیر وادیٔ عقیق میں اپنے قصرِ عروہ میں رہنے لگے اور میں مقام سویقہ میں منتقل ہو گیا[1]۔

مجلس زبان و ادب | مسجد نبوی میں زبان و ادب کی مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں اور شعراء، ادباء، فصحاء و بلغاء کے کلام سے ارباب ذوق محظوظ ہوتے تھے، اس بارے میں آل زبیر مشہور تھے، ان میں حضرت ثابت بن عبد اللہ بن زبیرؓ سخاوت، شجاعت، خطابت، فصاحت اور بلاغت میں گویا قریش کے ترجمان تھے اور مسجد نبوی میں بیٹھ کر فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے تھے، اہلِ مدینہ خاص طور سے ان کی مجلس میں ان کا کلام سننے کے لیے آتے تھے، مسور بن عبد الملک کا بیان ہے:

کنا ناتی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما نزعنا الیہ الا استماع کلام ثابت بن عبد اللہ بن الزبیر بالفاظہ	ہم لوگ مسجد نبوی میں حاضر ہوتے تھے، صرف ثابت بن عبد اللہ کے کلمات و الفاظ سننے کی کشش ہم کو وہاں لیجاتی تھی۔

اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا کلام اور انداز گفتگو کس قدر پرکشش

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۸۱ و جمہرۃ نسب قریش و اخبارہا ص ۸۹۔

ہوتا تھا اور ان کو سننے کے لیے اہل ذوق کس طرح کھنچ کھنچ کر ان کے پاس آتے تھے۔

اسی طرح ان کے پوتے حضرت عبد اللہ بن مصعب بن ثابت اپنے زمانہ میں مدینہ میں قریش کے مشہور خطیب اور زبان آور تھے اور جود و سخا، خوش خلقی کے ساتھ ظاہری حسن و جمال میں مشہور تھے، قدر و منزلت کے اونچے مقام پر فائز تھے، فصاحت و بلاغت میں اپنے دادا کی یاد تازہ کرتے تھے، ان کی مجلس بھی مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی اور لوگ ان کے فصیح و بلیغ کلام سننے کے لیے دور دور سے آکر لطف اندوز ہوتے تھے، عبد الرحمن بن مغیرہ حزامی کہتے ہیں:

کنا ناتی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنجلس فیہ ما نزعنا الی الجلوس فیہ الا استماع کلام عبد اللہ بن مصعب و الفاظہ[1]	ہم لوگ مسجد نبوی میں جاکر بیٹھا کرتے تھے صرف عبد اللہ بن مصعب کے کلمات و الفاظ سننے کی کشش ہم کو وہاں لیجاتی تھی۔

عبد اللہ بن مصعب بن ثابت کے پوتے زبیر بن بکار بھی آل زبیر کے نامور شخص تھے، تاریخ انساب، ایام اور اخبار و آثار کے عالم اور حدیث و فقہ میں امام تھے، ان کی کتاب جمہرۃ نسب قریش و اخبارہا کا معتد بہ حصہ چھپ چکا ہے، وہ بھی اپنے دادا اور خاندان والوں کی طرح مسجد نبوی میں علمی و ادبی مجلسیں قائم کرتے تھے جس میں مدینہ کے اعیان و اشراف، شعراء، ادباء اور قضاۃ شریک ہوتے تھے، عام طور سے یہ مجلس مغرب اور عشاء کے درمیان منعقد ہوتی تھی، ان کی مجلس میں بعض اوقات ایک باوقار، خوش پوش ہاشمی شخص بیٹھتا تھا اور اس کی ظاہری ہیئت

---

[1] جمہرۃ نسب قریش و اخبارہا، ص ۱۴۳۔

وحیثیت دیکھ کر زبیر بن بکار نمایاں جگہ بٹھاتے تھے، ایک دن اس نے پوچھا کہ فرزدق شاعر جاہلی یا تمیمی تھا؟ یہ سنتے ہی زبیر بن بکار نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا اور کہا:

اللهم اردد علی قریش اخطارها[1] — اے اللہ! قریش کو اس کی شان و شوکت لوٹا دے۔

فرزدق (ہمام بن غالب) اموی دور کا مشہور شاعر اور جریر کا معاصر تھا اس کا تعلق قبیلہ بنو تمیم سے تھا۔

ایک مجلس کا واقعہ زبیر بن بکار خود یوں بیان کرتے ہیں:

وکان ابو غزیۃ محمد بن موسیٰ الانصاری کثیراً ما یجلس الی مجلس لیلۃ بین المغرب والعشاء الآخرۃ فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وھو اذ ذاک قاض۔ فتحدثنا الی ان ذکرنا الشعر فقال: ابن ابی صبح المزنی اشعر الناس حیث یقول لعمک۔	ابو غزیہ محمد بن موسیٰ انصاری اکثر میری مجلس میں بیٹھا کرتے تھے ایک رات مغرب اور عشاء کے درمیان میرے پاس بیٹھے، اس وقت وہ مدینہ کے قاضی تھے، ہم گفتگو کرتے رہے اور باتوں بات میں شعر و شاعری کا ذکر ہونے لگا اور ابو غزیہ نے کہا کہ ابن ابو صبح مزنی (عدی بن عبداللہ بن عمرو بن ابو صبح مزنی) سب سے بڑا شاعر ہے، اس نے آپ کے چچا کے بارے میں یہ اشعار کہے ہیں۔

---

[1] تاریخ بغداد، ج ۸، ص ۴۰۰۔

فما عیشنا الا الربیع و مصعب | یدور علینا مصعب و یدور
وفی مصعب ان غبنا القطر والندی | لنا ورق مغرور ورق و شکیر
متی ما یری الرادون غرة مصعب | ینیر بها اشراقه فینیر
یزدوا ملکا کالبدر اماقناوه | فرحبوا ماقدرة فکبیر
له نعم من عند قصر دو معفا | ولیس بها عابر بدی قصور
علد دنا فاکثر نا و مدت ناکثرت | نقلنا کثیر طیب و کثیر
لعمری لئن عددت نعماء مصعب | لاشکرها انی اذا الشکور[1]

مصعب بن عبد اللہ بن مصعب، زبیر بن بکار کے چچا تھے، وہ بھی علم و عمل، مروت و شرافت، جود و سخا، خطابت اور جاہ و منصب میں قریش کے ممتاز اشخاص میں تھے اور ابوغزیہ محمد بن موسیٰ انصاری امام مالک کے تلمیذ اور مدینہ کے قاضی تھے۔

مجلس وادی عقیق مدینہ منورہ کے جنوب مغرب میں چند میل پر وادی عقیق بہت لمبا چوڑا علاقہ چھ سات میل میں ہے، وادی عقیق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وادئی مبارک فرمایا ہے، یہ وادی نہایت سرسبز و شاداب، ہوا نہایت خوشگوار، پانی شیریں و صحت بخش اور فضا فرحت افزا ہے، ہرے بھرے کھیت اور نخلستان، امرا اور اہل ثروت کے شاندار قصور و محلات، کنوئیں اور چشمے اپنے اندر بڑی کشش رکھتے تھے، وہاں صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کی جاگیریں تھیں، چند قصور و محلات یہ ہیں، قصر عروہ بن زبیر، قصر عاصم بن عمرو، قصر مغیرہ ابو العاص، قصر عینیہ بن عمرو، قصر عقبہ بن سعید، قصر ابوبکر بن عبد اللہ، قصر عبد اللہ بن ابوبکر، قصر ابراہیم بن ہشام، قصر آل طلحہ بن عمر، قصر خارجہ

---

[1] جمہرة نسب قریش و اخبارہا، ص ۲۱۲۔

بن حمزہ، قصر عبداللہ بن عامر، قصر مروان بن حکم، قصر سعید بن عاص وغیرہ، وادی عقیق کے یہ قصور و محلات ارباب جاہ و حشم کے مسکن ہی نہیں تھے بلکہ مدینہ کے علماء و فضلاء، شعراء و ادباء اور باذوق حضرات کے مرجع و مرکز بھی تھے، ان میں ان کی دینی، علمی، ادبی، شعری مجلسیں بھی منعقد ہوا کرتی تھیں اور یاران باصفا کئی کئی دن تک اس تفریحی مقام میں مختلف مباحث و مسائل پر اظہار خیال کرتے تھے، وادی عقیق کی اس اہمیت و عظمت کی وجہ سے کئی اہل علم نے اس کو موضوع بنایا اور کتاب لکھی، زبیر بن بکار اور ابوعلی ہارون بن زکریا ہجری کی کتاب العقیق و اخبارہا زیادہ مشہور ہیں۔

یہاں کی علمی و ادبی مجلسوں اور اہل فضل و کمال کے اجتماعات میں شریک ہونے والے حضرات کو مدتوں ان کی یاد تڑپاتی تھی اور نہایت جذباتی انداز میں ان کا تذکرہ کرتے تھے، عبدالسلام بن یوسف جماہری بغدادی نے وادی عقیق اور اس کے مکینوں اور مجالس کو یوں یاد کیا ہے:

علی ساکنی بطن العقیق سلام	وان اسھرونی بالفراق وناموا

وادی عقیق کے باشندے اگرچہ اپنی جدائی میں مجھے جگا کر خود سو گئے ہیں ان کو میرا سلام پہنچے۔

حظرتم علی النوم وھو محلل	وحللتم التعذیب وھو حرام
حلال نیند کو تم لوگوں نے مجھ پر حرام کر دیا،	اور عذاب کو جو حرام ہے حلال کر دیا ہے
اذا نبتم عن حاجر وحجر تم	علی السمع ان یدنو الیہ سلام

جب سے تم نے جدائی اختیار کر لی ہے اور کانوں تک سلام پہونچنے کو روک دیا ہے

فلا عیلت ریح الصبا فرع بانۃ	ولا سجعت فوق الغصون حمام

نہ باد صبا کے جھونکوں نے درخت بان کی ٹہنیوں کو ہلایا اور نہ اس کی ڈالیوں پر فاختہ نے نواسنجی کی۔

ولا تعقعقت فیہ الرعود والکی   علی حافتیہ بالعشی غمام

اور نہ وادی عقیق میں بجلیاں کوندیں اور نہ ہی سرِشام اس کے دونوں کناروں پر بادل برسا

فما لی وما للربع قد بان اھلہ   وقد قوضت من ساکنیہ خیام

اب مجھے اس مسکن سے تعلق ؟ جس کے مکیں جا چکے اور وہاں کے باشندوں کے خیمے اکھاڑ دیئے گئے

الا لیت شعری ھل الی الرمل عودۃ   وھل لی بیتلک الباشتین لمام ؟

اے کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ کیا اسکے مقام رمل میں میری واپسی ہوسکتی ہے اور کیا میں بان کے دونوں درخت کے پاس ٹھہر سکتا ہوں!

وھل نھلۃ من بئر عروۃ عذبۃ   اداوی بھا قلبا براہ اوام ؟

اور کیا میں بیر عروہ کے شیریں پانی سے سیراب ہوسکتا ہوں جس سے اپنے بیمار دل کا علاج کرسکوں؟

الا یا حمامات الاراک الیکم   فما لی فی تغریدکن مرام

اے درخت اراک کی فاختاؤ! تم اپنی راہ لو، کیونکہ تمہاری نواسنجی میں میرے لیے کوئی کشش نہیں ہے۔

فوجدی وشوقی مسعد ومؤانس   ونوحی ودمعی مطرب ومدام [1]

میرا وجد و شوق میرے لیے مونس و مددگار ہے اور میری گریہ وزاری اور آنسو میرے لیے مطرب و مدام ہے۔

وادی عقیق کے علمی و ادبی اور شعری و لغوی نوادر امالی اور مجالس کی صورت ضبط نہیں ہوسکی، اس زمانہ تک اس کا رواج نہیں تھا، زبیر بن بکار اور ابو علی ہجری کی کتابوں میں یہ نوادرات رہے ہوں گے کتاب الاغانی میں شعرائے مدینہ کے نوادر و لطائف مل جاتے ہیں۔

مجلس بیر عروہ | وادی عقیق میں حضرت عروہ بن زبیر کے بہت سے املاک و اموال اور نخلستان تھے، لمبی چوڑی جاگیر و جائداد تھی۔ اس کے درمیان قصر عروہ اور بیر عروہ

[1] المغانم المطابۃ فی معالم طابۃ، ص ۲۷۲، قسم الامکنہ۔

اپنی خصوصیات کی وجہ سے وہاں کے سارے قصور و آبار میں ممتاز تھے، بیر عروہ کا پانی کثرت، برودت اور حلاوت میں مشہور تھا، بوتلوں میں بھر کر خلیفہ ہارون رشید کو ہدیہ و تحفہ کے طور پہ مقام رقہ بھیجا جاتا تھا، اس کنوئیں کے بارے میں ملکری بن عبدالرحمٰن انصاری نے کہا ہے:

کفنونی ان مت فی درع اروی　　　　واغسلونی من بئر عروۃ ماء

میں مرجاؤں تو مجھے محبوبہ اروی کے قمیص کا کفن دینا اور بیر عروہ کے پانی سے غسل دینا

سخنۃ فی شتاء باردۃ فی الصیف معراج فی اللیلۃ الظلماء

جو جاڑے میں گرم اور گرمی میں سرد، اور شب تاریک میں چراغ ہے۔

یہ کنواں باب عنبر یہ سے ۳۵ ۔ ۴۰ منٹ کی دوری پر ہے، ۱۳۹۶ھ میں راقم نے پیدل جاکر اس کی زیارت کی اور اس سے سیراب ہوا ہے، مصری حجاج بوتلوں میں اس کا پانی بطور تبرک کے لے جارہے تھے، اس سے کچھ دور پورب کی جانب قصر سعید بن عاص کے کھنڈر تھے، پتھر کی دیواریں گری پڑی تھیں، اندر نہیں جا سکا۔

حضرت عروہ بن زبیر نے یہاں کے تمام اموال و املاک کو بھائیوں پر وقف کر دیا تھا اور ان کے صاحبزادے ہشام بن عروہ اس کے وارث و نگراں ہوئے اسی بیر عروہ کے پاس ان کی علمی و دینی اور ادبی مجلس برپا ہوتی تھی اور اہل ذوق جمع ہو کر خوش وقت ہوتے تھے، اس مجلس کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، منذر بن عبداللہ حزامی کہتے ہیں کہ میں نے حدیث کی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے تیرہ سال تک اشعار عرب کی روایت کی، ایک مرتبہ میرے والد ہشام بن عروہ کی ملاقات کے لیے گئے، انہوں نے کہا کہ

معلوم ہوا ہے کہ اشعار کی روایت کر رہا ہے، اس کو میرے پاس بھیج دینا۔
لب یہ سُنکر بہت خوش ہوئے اور واپس آکر سواری کا انتظام کیا اور کہا کہ
تم کل صبح سویرے وادی عقیق میں ہشام بن عروہ کے پاس چلے جانا، انھوں نے
تم کو بلایا ہے۔

فغدوت علیه فوجدته	میں صبح کو ان کے پاس پہنچا تو دیکھا
جالسا فی مجلس بئر عروة	مجلس بیر عروہ میں بیٹھے ہیں، میں سلام
فسلمت علیه وجلست معه	کر کے ان کے پاس بیٹھ گیا۔

انھوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اشعار عرب یاد کر رہے ہو، تم کو کس
قبیلہ کے اشعار زیادہ یاد ہیں؟ میں نے شعرائے بنو سلیم کے نام لیے، انھوں نے کہا کہ
کیا بنی سلیم کے فلاں فلاں شعراء کے اشعار بھی تم کو یاد ہیں؟ اور ان سب کے اشعار
سُنائے جن کو میں نے ابتک نہیں سُنا تھا، اس کے بعد کہا:

یا ابن اخی! اطلب الحدیث۔	بھتیجے! تم حدیث کی تعلیم حاصل کرو

اور اسی دن سے میں نے حدیث کی روایت شروع کر دی[1]

بیر عروہ کی ایک مجلس نے منذر بن عبداللہ حزامی کو شعر و شاعری کی وادی سے
نکال کر احادیث نبویہ کی بزم میں پہنچا دیا، اسی طرح معلوم نہیں کتنے مجلس نشین ان
مجلسوں سے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور اسی انداز پہ انھوں نے مجلس برپا کی،
چنانچہ منذر بن عبداللہ حزامی نے اس روایت کو زندہ رکھا اور قصر اسحاق میں مدتوں
علمی و ادبی مجلسیں قائم کی۔

---

[1] جمہرۃ نسب قریش و اخبارہا، ص ۳۰۱ و ص ۳۰۲۔

مجلس قصر اسحاق بن ایوب منذر بن عبداللہ بن منذر نے ہشام بن عروہ کی ہدایت کے مطابق حدیث کی تعلیم حاصل کرکے خاندانی روایت کو زندہ رکھا، وہ بھی قریش کے اعیان و اشراف میں بڑے فضل و کمال کے مالک تھے، انھوں نے وادی عقیق کے قصر اسحاق بن ایوب مخزومی میں اپنی مجلس منعقد کرکے اخوان صفا اور یاران وفا کو جمع کیا، اس مجلس میں علماء، فقہاء، محدثین، شعراء، ادبا کئی کئی دن تک جمع رہتے تھے اور ہر قسم کے موضوع پر کھل کر بحث و مذاکرہ کرتے تھے، زبیر بن بکار کا بیان ہے:

وکان آخی اخوانا اهل فضل
ودین وادب یخرجون المخارج
ویکونون بالعقیق الایام
یجتمعون ویتحدثون وبین ذلك
خیر کثیر، وصلاة، وذکر
وتنازع فی العلم[1]

منذر بن عبداللہ نے اہل علم و فضل، اشعار دین و دیانت ارباب شعر و ادب سے برادرانہ تعلقات قائم کیے یہ لوگ تفریح گاہوں میں جاکر کئی دن تک وادی عقیق میں پڑے رہتے اور باہمی مباحثہ و مذاکرہ کرتے، اس مجلس میں بڑی خیر و برکت ہوتی، لوگ نماز پڑھتے اللہ کو یاد کرتے اور علمی مناقشہ و مباحثہ میں مشغول رہتے تھے۔

اس مجلس اخوان الصفا کے نمایاں ارکان یہ ہیں، عبدالمجید بن علی لیثی، عمران بن موسیٰ بن عمران بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق، صالح بن محمد بن مسور بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف، محمد بن طلحہ بن عمیر بن طلحہ بن عامر بن ابو وقاص، مفتی بن

---

[1] جمہرۃ نسب قریش و اخبارہا، ص ۳۹۶۔

عبداللہ بن عنبسہ بن سعد بن عاص۔

بعد میں اس مجلس کی یادان احباب واخوان کو تڑپاتی رہی، منذر بن عبداللہ نے بغداد چلے جانے کے بعد اپنے جذبات یوں ظاہر کیے ہیں:

من مبلغ عُمَر المجيد ودونه مسيرة شهر او يزيد الى شهر

کون ہے جو ایک ماہ یا اس سے زیادہ مسافت پر رہنے والے عبدالمجید کو۔

وعمران والرهط الذين تركتهم بطيبة في الفرع المهذب من فهر

اور عمران کو اور قبیلہ فہر کی جماعت اشراف کو جنھیں میں نے مدینہ منورہ میں چھوڑا ہے،

والافهم من معشر قد بلوتهم يزيدون طيبا حين يبلون بالخبر

اور ان احباب کو جنھیں میں نے آزمایا تو اور بھی صاف دل اور مخلص نکلے۔

باني لما شطت الدار بيننا واشفقت ان لا نلتقي آخر الدهر

یہ خبر پہونچا دے کہ جب مختلف مقام نے ہم کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور مجھے خطرہ ہو گیا کہ تا حیات ہم نہیں مل سکیں گے۔

ذكرتكم فاعتادني الشوق والاسى وضاق بما ضمرت من ذكركم صدري

تو میں نے تم لوگوں کو یاد کیا، ملاقات کا شوق اور فراق کا غم میری عادت بن گیا ہے اور تمھاری یاد سے میرا سینہ تنگ ہو گیا ہے۔

واعجبني ان لم تفض عين واحد غداة الوداع من مقيم ومن سفر

اور مجھے تعجب ہوا کہ جدائی کی صبح کو کسی مقیم اور مسافر کی آنکھ نے آنسو نہیں بہایا۔

كانا علمنا اننا سوف نلتقي ولست اخال تعلمون ولا ادري

گویا ہم سب جانتے تھے کہ عنقریب ملیں گے مجھے معلوم نہیں کہ تم لوگ اس بات کو جانتے تھے،

أآخر عهد بيننا ذاك، ام لنا　　　تلاق على ما نشتهي باقي العصر

کہ یہ ہمارے تمہارے درمیان آخری ملاقات ہے، یا آیندہ زمانہ میں ہماری خواہش کے مطابق ملاقات ہوگی۔

فاقسم انساكم ولو حال دونكم　　　من الارض غيطان المتوهة القفر

خدا کی قسم میں تم لوگوں کو نہیں بھول سکتا، اگرچہ تمہارے ہمارے درمیان بے نام و نشان زمین کی وسعتیں حائل ہیں۔

ولا مجلسا في قصر اسحاق بينكم　　　تنازعنا في محكم الراي والشعر

اور نہ ہی قصر اسحاق کی مجلس بھول سکتا ہوں جس میں ہمارے درمیان اصابت رائے اور شعر و شاعری پر بحثیں ہوتی تھیں۔

ولهو من اللهو الجميل تزينه　　　خلائق اقوام عففن عن الغدر

اور اس میں دلچسپ کھیل تھے۔ جن کو وفادار احباب کے حسن اخلاق نے اور بھی دلچسپ بنا دیا۔

واسرار هم ذات النفوس فما ترى　　　لهم خلة يوما يدني ولا يزري[1]

وہ اپنے دل کی باتوں کو کھل کر ظاہر کرتے تھے اور کسی دن ان سے کوئی معیوب حرکت سرزد نہیں ہوتی تھی۔

منذر بن عبد اللہ نے بغداد جاکر مدینہ کے جن احباب و اخوان کے نام یہ مکتوب روانہ کیا تھا اس مدت میں ان میں سے اکثر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، ایک صاحب نے ان کو وادی عقیق کی سیر و تفریح کے لیے بلایا تو اس کے جواب میں منذر بن عبد اللہ نے لکھا:

قل للصديق الذي جاءت رسائله　　　واعملت كاتبا نحوي وقرطاسا

جس دوست کے خطوط میرے پاس آئے ہیں، اس سے کہدو کہ

يدعو الى نزهة قد كنت آلفها　　　حتى عدا بيننا ما فرق الناسا

مجھے ایسی تفریح کی دعوت دے رہا ہے جس سے میں مانوس تھا، یہانتک کہ انسانوں کو جدا کرنے والی بات نے ہم میں راستہ پالیا۔

---

[1] جمہرۃ نسب قریش و اخبارہا ص ۳۹۰-۳۹۶ و تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۲۴۵-۲۴۲۔

موت تخون اخوانی فشتتھم فاصبحوا فرقاھا مادارماسا

یعنی موت نے میرے احباب کو جدا کر دیا اور وہ الگ الگ قبروں میں سو گئے۔

الفتنی ذاھلا انی رزیتھم بیض الوجوہ ذوی عزوا ناسا

تم مجھکو ان سے غافل پا رہے ہو؟ حالانکہ ان روشن چہرہ معزز اور مانوس لوگوں کی جدائی سے مصیبت زدہ ہوں۔

فلن تقر بعیش بعدھم ابدا عینی وقد شربوا بالموت القاسا

ان کے بعد کبھی بھی میری آنکھ ٹھنڈی نہیں ہوگی، انھوں نے موت کا پیالہ پی لیا ہے۔

الا التغرۃ نسیانا فان ذکروا ھاج ادکارھم للقلب وسواسا[1]

البتہ کبھی غفلت ہو جاتی ہے اور جب یاد آجاتے ہیں تو ان کی یاد دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا کر دیتی ہے۔

مجلس بنی المولیٰ | قبا مہاجرین اولین کا پہلا تعلیمی مرکز تھا اور جنکے بال بچے ساتھ نہیں ہوتے تھے وہ حضرت کلثوم بن ہدم کے خالی مکانات بیت العزاب میں قیام کرتے تھے، قبا میں مجلس بنی المولیٰ کے نام سے ایک مجلس تھی جس کا اجمالی تذکرہ علامہ مجدالدین نے المغانم المطابہ میں کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ قبا میں بنو عمرو بن عوف نے مجلس بنی المولیٰ اور حمام کے درمیان بحرج نامی ایک قلعہ تعمیر کیا تھا، جس کے مالک بنی عزیزہ بن مالک تھے اور بنو عمرو بن عوف ہی نے ایک اور قلعہ شنیف نامی تعمیر کیا تھا جو ابو سفیان بن حارث کے مکان کے قریب احجار المرا اور مجلس بنی المولیٰ کے درمیان تھا، اس کے مالک بنو ضبیعہ بن زید تھے[2]۔ غالباً اس مجلس میں ان دونوں قلعوں کے افراد بیٹھتے تھے اور دیگر مجالس کی طرح مختلف موضوعات پر بحث و مذاکرہ کرتے تھے، بنو عمرو بن عوف میں مشاہیر صحابہ و تابعین اور اہل علم و فضل گذرے ہیں، یہاں انکی مجلس برپا ہوتی رہی ہوگی۔

---

[1] جمہرۃ نسب قریش واخبارہا ص ۹۹۶ - ۹۹۰ [2] معجم الشعراء مرزبانی ص ۳۴۸ [3] المغانم المطابہ ص ۱۵/۲۰۴۔

مصطفیٰ صادق الرافعی

از جناب ابو سفیان اصلاحی۔ علی گڑھ

فرانسیسی اور انگریزی تہذیب و تمدن کے اثر سے مصر میں ایک ایسا طبقہ ظہور پذیر ہوا جو مغربی ثقافت کا اس قدر عاشق اور دلدادہ تھا کہ وہ مشرقی علوم کو نظر انداز کرنے کے علاوہ انھیں ذلت و حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا، اس طبقہ کی جانب سے قرآن کریم، احادیث نبوی اور صحابۂ کرام پر طرح طرح کے رکیک اعتراضات کیے گئے جو دلائل و شواہد سے خالی اور مستشرقین کی تقلید اور تائید کا نتیجہ تھے، اسلام سے دلچسپی رکھنے والے جن ادیبوں اور مصنفین نے ان مہمل اور بے سر و پا اعتراضات کے علمی جواب دیے، ان میں ایک ممتاز نام مصطفیٰ صادق الرافعی کا بھی ہے۔

رافعی شامی النسل تھے، لیکن ان کی ولادت ۱۸۸۰ء میں مصر میں ہوئی، ان کا سلسلۂ نسب امیر المومنین حضرت عمر سے ملتا ہے، ان کے خاندان میں متعدد اصحاب علم و کمال پیدا ہوئے، رافعی کے والد عبد الرزاق رافعی مختلف ملکوں میں محکمۂ عدالت شرعیہ کے صدر رہے، حنفی المسلک تھے۔ لیکن مصطفیٰ صادق رافعی شافعی مسلک کو ترجیح دیتے تھے[1]

---

[1] محمد سعید العریان، حیاۃ الرافعی۔ طبع ثالث۔ مطبع الاستقامہ۔ قاہرہ ۱۹۵۵ء ص ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۷۔

رافعی کے خاندان میں دینداری، زہد و ورع اور بزرگوں کی عزت و احترام کی روایتیں پہلے سے چلی آرہی تھیں[1] ان کی نشو و نما اسی ماحول میں ہوئی، بارہ برس کی عمر سے باقاعدہ اسکول جانا شروع کیا۔

رافعی معمولی فرانسیسی بھی جانتے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد چند برس تک وہ علمی سرگرمی سے کنارہ کش رہے، اس کے بعد جب مطالعہ کتب کا سلسلہ شروع کیا تو سارا وقت اسی میں گزارتے تھے جب وہ طانطا کی عدالت میں مقرر تھے تو روزانہ ٹرین سے آتے جاتے راستہ بھر کتب بینی میں محو رہتے، اسی حالت میں انھوں نے نہج البلاغہ کا مطالعہ کیا، غرض مسلسل محنت و مطالعہ سے ان کی نظر میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی، وہ اسلام کے ہمیشہ شیدائی رہے[2] ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم ادب پر فریفتہ تھے اور جدید افکار و احساسات سے زیادہ آشنا نہ تھے۔

رافعی کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور وہ اس میدان میں تمام شعراء سے گوئے سبقت لے جانا چاہتے تھے، رافعی اور حافظ میں گہری رفاقت تھی، یہ تعلقات آخری وقت تک قائم رہے، وہ عراق کے عظیم شاعر محسن الکاظمی کے بھی بہت مداح تھے، انھیں ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے تسلیم کرتے، شاعری میں انھوں نے اپنے معاصرین شعرا بارودی، حافظ اور کاظمی کے اثرات قبول کیے، شوقی، صبری اور مطران کا شمار بھی اسی قبیل سے تھا۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں رافعی کا پہلا دیوان شایع ہوا جو مقبول ہوا، اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں

---

[1] نعمات احمد فؤاد۔ دراسة فی ادب الرافعی۔ دار الفکر العربی (بدون تاریخ) ص ۲۴-۲۵

[2] حیاة الرافعی۔ ص ۲۸۔

دوسرا مجموعہ منظر عام پر آیا اور ۱۹۰۶ء میں تیسرا دیوان زیور طباعت سے آراستہ ہوا اور ۱۹۰۸ء میں دیوان النظرات کا پہلا حصہ قارئین کے ہاتھوں میں آیا۔ مسلسل طبع آزمائی کی وجہ سے وہ شاعری کی دنیا میں ایک انفرادی حیثیت کے مالک بن گئے۔[1]

چوبیس سال کی عمر میں رافعی کی شادی ہوئی، ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار تھی اور ان کا برتاؤ اپنے بال بچوں سے بہت اچھا تھا۔ وہ گو اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے تاہم جہاں سختی کا موقع ہوتا وہاں سختی سے بھی کام لیتے۔[2]

۱۹۰۵ء میں نثر نگاری کی طرف میلان ہوا تو مقالہ نگاری کے ساتھ ہی مستقل کتابوں کی تصنیف کا سلسلہ بھی شروع کیا[3] جو شاعری کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں، وہ شاعر کی حیثیت سے کم اور نثر نگاری کی حیثیت سے زیادہ مشہور رہا۔

۱۹۱۰ء میں ان کی اہم کتاب "تاریخ آداب القرآن" منظر عام پر آئی جس نے مخالفین کو حیرت زدہ کر دیا، اسی کا دوسرا حصہ اعجاز القرآن کے نام سے شائع ہوا۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد رافعی اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گئے۔[4] علامہ رشید رضا نے بھی اس کتاب کو سراہا ہے۔[5]

۱۹۱۲ء میں "حدیث القمر" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی، جس میں ایک لبنانی شاعرہ کا تعارف کرایا ہے، اس سے ان کا گہرا تعلق تھا، یہ کتاب اسلوب اور انداز بیان کے اعتبار سے عربی ادب میں ایک اضافہ تھا۔[6]

---

[1] حیاۃ الرافعی ص ۵۰ [2] دراسۃ فی العرب الرافعی ص ۲۰ [3] اعجاز القرآن، مصطفیٰ صادق الرافعی طبع ہشتم، المکتبہ التجاریہ مصر [4] حیاۃ الرافعی ص ۱۱ [5] مصطفیٰ صادق الرافعی، تاریخ آداب العرب طبع ثانی، دار الکتب العربی بیروت لبنان ۱۹۷۴ء ص ۱۱۲ [6] مصطفیٰ صادق الرافعی، حدیث القمر، طبع ثانی، مطبع الاستقامہ، قاہرہ ۱۹۲۳ء ص ۳

کتاب المساکین ۱۹۱۷ء میں شایع ہوئی، اس میں جنگ عظیم کے احوال کا ذکر ہے، اس سے ان کے مجروح جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے[1]

اغانی الشعب میں قومی اور ملی نغمے ہیں، اس سے بلند ہمتی اور جرأت پیدا ہوتی [illegible] اس کا پہلا حصہ ۱۹۰۳ء میں شایع ہوا تھا[2]

رسائل الاحزان ۱۹۲۴ء کی تصنیف ہے، اس میں انہوں نے ایک خیالی دوست کی مدد سے اپنی داستان محبت اور امیدوں کو بیان کیا ہے[3]

اوراق الورد ۱۹۳۱ء میں منظر عام پر آئی، اس میں حسن و عشق اور الفت و محبت کے جذبات و احساسات فلسفیانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں[4] اس لیے ان کا نظریۂ فلسفۂ عشق عیاں ہوتا ہے[5]، یہ دوستوں کے خطوط کا مجموعہ ہے[6]

رافعی کی کتابوں اور مقالات سے معاصر ادیبوں کو شدید اختلاف تھا۔ عبداللہ عفیفی، ترکی مبارک، طٰہٰ حسین اور عقاد نے ان کے خیالات پر شدید ردعمل کا اظہار کیا[7]۔ وہ اپنے مخالفین [illegible] نہایت سخت لب و لہجہ اختیار کرتے تھے، ان کے دل میں [illegible] ادیبوں کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا، عقاد، مازنی اور طٰہٰ حسین کی جدت پسندی سے انہیں سخت نفرت تھی[8]۔ القرآن طٰہٰ حسین کے نظریات ہی کے ردعمل میں منظر عام

---

[1] کتاب المساکین، ص ۵ [2] حیاۃ الرافعی، ص ۸۳ [3] مصطفیٰ صادق الرافعی، رسائل الاحزان، طبع سادس مطبع الاستقامہ۔ قاہرہ، ۱۹۵۲ء ص ۲۲، نیز ملاحظہ ہو: حیاۃ الرافعی، ص ۱۲۷ [4] مصطفیٰ صادق الرافعی اوراق الورد، طبع خامس، مطبع الاستقامہ، قاہرہ، ۱۹۵۳ء [5] حیاۃ الرافعی، ص ۱۴۱ [6] ایضاً ص ۳۲ [7] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المعارک الادبیۃ ص ۳۰۷-۳۸۲ و مابعد [8] احمد الجندی، مصطفیٰ صادق الرافعی (مجلۃ المجمع العلمی العربی بدمشق۔ اپریل ۱۹۷۱ء، ۴۶/۲، ص ۴۱۲)۔

پر آئی۔ شیخ عبداللہ عفیفی سے رافعی کے اختلاف کی بنیاد یہ تھی کہ رافعی کے خیال میں انھیں "شاعر الامیر" کا جو لقب دیا گیا ہے، یہ اس کے اہل نہیں ہیں، عقاد ان کے نظریۂ اعجاز قرآن کے منکر تھے اور انہیں صاحب علم بھی نہیں مانتے تھے۔

مختلف علمی ادبی اور دینی خدمات انجام دیتے ہوئے مصطفیٰ صادق الرافعی ۹ مئی ۱۹۳۷ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔[1]

ذیل میں رافعی کی تصانیف کی ایک فہرست پیش کی جا رہی ہے، اس میں وہ بھی شامل ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ (۱) دیوان الرافعی (تین جلدیں) (۲) دیوان النظرات (۳) ملکۃ الانشاء (۴) تاریخ آداب العرب (۵) اعجاز القرآن (۶) حدیث القمر (۷) المساکین (۸) نشید سعید پاشا زغلول (۹) النشید الوطنی المصری (۱۰) رسائل الاحزان (۱۱) السحاب الاحمر (۱۲) المعرکۃ تحت رایۃ القرآن (۱۳) علی السفود (۱۴) اوراق الورد (۱۵) رسالۃ الحج (۱۶) وحی القلم (تین جلدیں)

غیر مطبوعہ تصانیف کے نام یہ ہیں، (۱) تاریخ آداب العرب (جلد سوم) (۲) اسرار الاعجاز (۳) دیوان اغانی الشعب (۴) مقالات جو مختلف جرائد و رسائل میں منتشر پڑے ہیں (۵) ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۷ء تک کی شاعری ابھی تک مجموعہ کی صورت میں منظر عام پر نہیں آئی۔ اسی میں ان کی عشقیہ شاعری اور بادشاہ فواد کی شان میں کہے گئے مدحیہ قصائد بھی شامل ہیں۔[2]

---

[1] مصطفیٰ صادق الرافعی۔ تحت رایۃ القرآن۔ طبع رابع۔ مطبع الاستقامہ، قاہرہ، ۱۹۵۶ء، ص ۸

[2] المعارک الادبیہ، ص ۱۲۴؛ نیز ملاحظہ ہو: حیاۃ الرافعی، ص ۱۷۵، ۱۹۰، ۶۱۵، ۶۱۷، ۶۳۰

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حیاۃ الرافعی، ص ۲۴۹-۲۵۳۔

کتاب المساکین ۱۹۱۷ء میں شایع ہوئی، اس میں جنگ عظیم کے احوال کا ذکر ہے، اس سے ان کے مجروح جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے [1]

اغانی الشعب میں قومی اور ملی نغمے ہیں، اس سے بلند ہمتی اور جرأت پیدا ہوتی [illegible]
اس کا پہلا حصہ ۱۹۱۰ء میں شایع ہوا تھا [2]

رسائل الاحزان ۱۹۲۴ء کی تصنیف ہے، اس میں انہوں نے ایک خیالی دوست کی مدد سے اپنی داستان محبت اور امیدوں کو بیان کیا ہے [3]

اوراق الورد [4] ۱۹۳۱ء میں منظر عام پر آئی، اس میں حسن و عشق اور الفت و محبت کے جذبات و احساسات فلسفیانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں، اس لیے ان کا نظریۂ فلسفۂ عشق عیاں ہوتا ہے [5]، یہ دوستوں کے خطوط کا مجموعہ ہے [6]

رافعی کی کتابوں اور مقالات سے معاصر ادیبوں کو شدید اختلاف تھا۔ عبد اللہ عفیفی، ترکی مبارک، طہٰ حسین اور عقاد نے ان کے خیالات پر شدید رد عمل کا اظہار کیا [7] وہ اپنے مخالفین [illegible] نہایت سخت لب و لہجہ اختیار کرتے تھے، ان کے دل [illegible] ادیبوں کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا، عقاد، مازنی اور طہٰ حسین کی جدت پسندی سے انہیں سخت نفرت تھی [8] القرآن طہٰ حسین کے نظریات ہی کے رد عمل میں منظر عام

[1] کتاب المساکین، ص ۵ [2] حیاۃ الرافعی، ص ۸۳ [3] مصطفیٰ صادق الرافعی، رسائل الاحزان، طبع سادس مطبع الاستقامہ۔ قاہرہ، ۱۹۵۲ء ص ۲۲، نیز ملاحظہ ہو: حیاۃ الرافعی، ص ۱۲۷ [4] مصطفیٰ صادق الرافعی اوراق الورد، طبع خامس، مطبع الاستقامہ، قاہرہ، ۱۹۵۳ء [5] حیاۃ الرافعی، ص ۱۴۱ [6] ایضاً ص ۱۴۶ [7] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المعارک الادبیہ، ص ۳۰۷۔ ۳۸۳ و ما بعد [8] احمد الجندی، مصطفیٰ صادق الرافعی (المجمع العلمی العربی بدمشق۔ اپریل ۱۹۷۱ء، ۴۶/۲، ص ۴۱۲)۔

پر آئی۔[1] عبداللہ عفیفی سے رافعی کے اختلاف کی بنیاد یہ تھی کہ رافعی کے خیال میں انہیں "شاعر الامیر" کا جو لقب دیا گیا ہے، یہ اس کے اہل نہیں ہیں، عقاد ان کے نظریۂ اعجاز قرآن کے منکر تھے اور انہیں صاحب علم بھی نہیں مانتے تھے۔

مختلف علمی ادبی اور دینی خدمات انجام دیتے ہوئے مصطفیٰ صادق الرافعی ۹ مئی ۱۹۳۷ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔[2]

ذیل میں رافعی کی تصانیف کی ایک فہرست پیش کی جا رہی ہے، اس میں وہ بھی شامل ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ (۱) دیوان الرافعی (تین جلدیں) (۲) دیوان النظرات (۳) ملکۃ الانشاء (۴) تاریخ آداب العرب (۵) اعجاز القرآن (۶) حدیث القمر (۷) المساکین (۸) نشید سعید پاشا زغلول (۹) النشید الوطنی المصری (۱۰) رسائل الاحزان (۱۱) السحاب الاحمر (۱۲) المعرکۃ تحت رایۃ القرآن (۱۳) علی السفود (۱۴) اوراق الورد (۱۵) رسالۃ الحج (۱۶) وحی القلم (تین جلدیں)

غیر مطبوعہ تصانیف کے نام یہ ہیں، (۱) تاریخ آدب العرب (جلد سوم) (۲) اسرار الاعجاز (۳) دیوان اغانی الشعب (۴) مقالات جو مختلف جرائد و رسائل میں منتشر پڑے ہیں (۵) ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۷ء تک کی شاعری ابھی تک مجموعہ کی صورت میں منظر عام پر نہیں آئی۔ اسی میں ان کی عشقیہ شاعری اور بادشاہ فواد کی شان میں کہے گئے مدحیہ قصائد بھی شامل ہیں۔[3]

---

[1] مصطفیٰ صادق الرافعی۔ تحت رایۃ القرآن۔ طبع رابع۔ مطبع الاستقامہ قاہرہ، ۱۹۵۶ء ص ۸

[2] المعارک الادبیۃ ص ۴۲۱ نیز ملاحظہ ہو: حیاۃ الرافعی، ص ۱۸۵، ۱۹۰، ۶۱۵، ۶۱۷

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حیاۃ الرافعی، ص ۳۴۹۔۳۵۳۔

رافعی کی مقالہ نگاری | انیسویں صدی کے بعد اور بیسویں صدی کے اوائل میں مصر سے متعدد جرائد و رسائل شایع ہو رہے تھے، اسی زمانے میں مصطفیٰ صادق رافعی کی مقالہ نگاری کی ابتدا ہوئی اور انہوں نے البیان، النشریا، الثقافہ، الرسالہ، المقتطف، الزہرا، العصور اور المنیر میں مضامین لکھے۔

رافعی کے مقالات میں اسلامی اور ادبی رنگ غالب ہے، زبان و بیان بہت مرصع ہے، پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ وہ قدیم کلاسیکی ادب سے متاثر تھے، جاحظ اور ابوالفرج کی تحریروں کے شیدائی تھے[۱] سعد زغلول نے کہا کہ "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اعجاز القرآن ایک الہامی کتاب ہے یا قرآن کریم کا کوئی اقتباس ہے"[۲] اکثر مقالات میں قرآن اور حدیث پر کیے جانے والے بے بنیاد اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، انکے مقالات تین[۳] طرح کے ہیں ۱۔ سیرت پاک سے متعلق مقالات ۲۔ معاشرتی مقالات ۳۔ ادبی مقالات۔

سیرت پاک سے متعلق مقالات | ایک مقالہ کی تمہید میں بتایا ہے کہ نبی ایک سورج کے مانند ہوتا ہے، جس طرح سورج کے طلوع ہونے سے تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں اسی طرح ایک نبی کی بعثت سے جہالت و ضلالت اور فحاشی دور ہو جاتی ہے اور ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل جاتی ہے، اضطراب امن و آشتی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور بغض و حسد کی جگہ الفت و محبت لے لیتی ہے۔

اسی مقالہ میں بتایا گیا ہے کہ زندگی جیسی بیش قیمت چیز کو انبیائے کرام کے اقوال

---

[۱] حیاۃ الرافعی، ص ۱، [۲] مصطفیٰ صادق الرافعی، تاریخ آداب القرآن، طبع ثانی۔ دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان۔ ۲/۲۰۰۸۔

وافعال اور تعلیمات ہی سے صحیح رخ لگایا جا سکتا ہے، نبی بنی نوع انسان کے لیے خدا
کی طرف سے نذیر اور معلم اخلاق ہوتا ہے، اسے ہر طرح کی صلاحیت سے نوازا جاتا ہے
وہ صد درجہ فصیح وبلیغ ہوتا ہے تاکہ اس کی باتیں موثر ہوں اور لوگوں کے دلوں میں اتر
جائیں۔ اس کی گفتگو تمثیل نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہے۔ اس کی باتیں تضاد سے خالی
ہوتی ہیں، نبی کی بعثت اس وقت ہوتی ہے جب دنیا ظلمت وتاریکی میں گم ہو جاتی ہے،
وہ آنے کے بعد تاریکیوں کو دور کر کے روشنی پھیلاتا ہے۔

نبی کے تعارف کے بعد بتایا کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے جس بلند
درجہ پر فائز ہیں، وہاں تک دنیا کے تمام حکماء وفلاسفہ پہنچنے سے قاصر ہیں، آپؐ کی
ذات لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ تھی۔ آپؐ کی زندگی کے تمام پہلو تا قیامت تابندہ
رہیں گے۔

آپؐ اس حیثیت سے بھی عظیم اہمیت کے حامل ہیں کہ آپؐ کی شریعت آخری
اور مکمل ترین تھی جو ہر نقص وعیب سے پاک ہے[1] انہوں نے اسلامی احکام کی حکمت
ومصلحت اور ان کے معتدل ومناسب اور فطرت انسانی کے عین مطابق ہونے کو واضح
کر کے دکھایا ہے کہ ان کی پیروی میں تمام کامیابیوں کا راز پنہاں ہے۔

رافعی نے اپنے مقالہ "وحی الہجرۃ" میں بتایا کہ ہجرت سے قبل کفار مکہ نے آنحضور
صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی اذیتیں دیں، آپؐ کو کاذب کہا گیا، آپؐ کی اہانت کی گئی
اور آپؐ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا۔

مشرکین عرب آپؐ کے چچا ابو طالب کے پاس شکایت کے لیے گئے، آپؐ نے جب

---

[1] مصطفیٰ صادق الرافعی۔ وحی القلم طبع سادس مطبع الاستقامۃ قاہرہ ۱۹۰۰ بدون تاریخ، ۲/۴۳-۵۰

محسوس کیا کہ میری وجہ سے چچا کو تشویش ہے اور وہ میری مدد کرنے سے قاصر نظر آرہے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیں پھر بھی میں اپنے اس کام سے باز نہیں آسکتا اب اللہ تعالیٰ مجھے چاہے ہلاک کرے اور چاہے فتح و نصرت سے ہم کنار کرے۔ اس کے بعد آپؐ کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔[۱]

ایک دوسرے مقالہ میں رافعی نے بتایا کہ ابو طالب اور حضرت خدیجہ کی ذات آپؐ کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ قدم قدم پر ان سے آپؐ کو تسلی ملتی تھی، نبوت کے دس سال پورے ہونے کے بعد یہ دونوں سہارے رخصت ہوگئے، ابو طالب قریش کی تکالیف سے آپ کو بچاتے اور حضرت خدیجہ نے پریشانیوں میں آپؐ کو سکون دیا اور آپؐ کی ان تمام باتوں کو بخوشی تسلیم کیا جن سے لوگوں نے اعتراض کیا۔ رافعی نے اس میں آپؐ کو دی جانے والی دوسری اذیتوں اور طائف میں آپ کو لہولہان کیے جانے کا ذکر کرکے دکھایا ہے کہ آپؐ نے کس قدر عزم و استقلال سے مشکل حالات کا مقابلہ کیا اور کبھی اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا خیال بھی دل میں نہیں لائے۔[۲]

ایک مقالہ میں رافعی نے واقعۂ معراج کا ذکر کرکے آپؐ کی عظمت و بلندی اور غیر معمولی فضل و کمال کو دکھایا ہے[۳]

اس پر بھی بحث کی گئی ہے کہ معراج جسمانی ہوئی تھی اور یہی جمہور علماء کا خیال بھی ہے۔ اس خیال کو بھی ترجیح دی جائے گی کہ معراج جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ سورہ النجم کی آیت اذ یغشی السدرۃ ما یغشی۔ ما زاغ البصر و ما طغی سے انکے نزدیک یہی ثابت ہوتا ہے اور اس کی وضاحت انھوں نے اپنے موثر انداز میں کی ہے۔

---

[۱] وحی القلم ۲/۱۰۰، ۱۰۴ [۲] وحی القلم ۲/۱۹، ۲۱ [۳] وحی القلم ۲/۲۴، ۲۵، ۲۶ [۴] وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: ۲/۳۱

جسمانی معراج کے سلسلے میں دوسری مثال یہ دی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ملکوتی و بشری صفات کے مالک تھے۔ عربوں کو سمجھانے کے لیے براق کو جانور کہا گیا ہے یہ دراصل برق سے بنا ہے جس کے معنی بجلی کے ہیں اور یہی اس سے مراد بھی ہے کہ یہ ایک کہربائی قوت ہے جو ایک جست میں تمام عالم کو طے کر لیتی ہے[1]

اپنے ایک مقالہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو موضوع بحث بنایا ہے کہ کسی ایک شخص میں ان کا جمع ہونا محال ہے اور ثابت کیا ہے کہ ایسا ہی افضل و اکمل اور جامع صفات شخص لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے مامور کیا جاتا ہے جو ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہو۔

ایک مقالہ میں دکھایا ہے کہ امت آپ کی دعوت و تعلیم کی اشاعت اور کتاب و سنت کے احکام کی تبلیغ پر مامور کی گئی ہے۔

اسی مقالہ میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ آپ کے تمام اقوال ادبی و فنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ افکار و معانی سے پُر ہوتے ہیں۔

آپ کے اسلوب بیان کی دلکشی و دلاویزی اور اثر و نفوذ کا ذکر بھی کیا ہے اور احکام محمدی کی حکمت و خوبی بھی بیان کی ہے اور کلام رسول کو موجودہ دور کے اقتضا کے مطابق نئے انداز میں مدون کرنے پر زور دیا ہے[2] (باقی)

---

[1] وحی القلم ۲/۳۰۲، ۳۰۸ [2] ایضاً ۳/۹، ۱۵، ۱۷، ۲۲۔

اسلام اور عربی تمدن

از شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

امام ابوعمرو زبان بن العلاء البصری

از

جناب محمد الیاس الاعظمی ۔

امام ابوعمرو زبان بن العلاء البصریؒ گوناگوں اوصاف و کمالات کے جامع تھے وہ قرآن و حدیث، لغت و عربیت، نحو اور شعر و ادب میں یکتائے روزگار تھے، زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں بھی ممتاز تھے، ان کو درس و تدریس کے ساتھ ہی تصنیف و تالیف سے بھی سروکار رہا، لیکن ان کا اصل سرمایہ افتخار علم قرأت ہے اسکے حصول و فروغ میں انہوں نے اپنی پوری زندگی صرف کردی اور اس فن کے امام کہلائے ۔

نام و نسب زبان نام، ابوعمرو کنیت، والد کا نام العلاء اور شجرۂ نسب حسب ذیل ہے:

ابوعمرو زبان بن العلاء بن عمار بن عریان بن عبداللہ بن حسین بن حارث بن جلہمہ[1] بن حجر بن خزاعی بن مازن بن مالک بن عمرو بن تمیم بن مربن ادبن طانجہ بن الیاس بن مضر بن معد بن عدنان۔[2]

---

[1] علامہ ابن الجزری نے یہی نام لکھا ہے مگر اکثر تذکرہ نگاروں نے جلہم لکھا ہے [2] علامہ ابن الجزری، غایۃ النہایہ فی طبقات القراء ۱/ ۲۸۸، مکتبہ الخانجی، مصر ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء۔

ان کے شجرۂ نسب میں قدرے اختلاف ہے، مذکورہ بالا نسب نامہ علامہ ابن الجزری کی تحقیق کا نتیجہ ہے، نام میں بھی اختلاف ہے، تقریباً تیس نام ملتے ہیں صاحب روضات الجنات اور علامہ جلال الدین سیوطی نے ان کے اکیس ناموں کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) ابو عمرو (۲) زبان (۳) جبر (۴) جنید (۵) جزو (۶) حماد (۷) حمید (۸) خیر (۹) ربان (۱۰) عتیبہ (۱۱) عثمان (۱۲) عریان (۱۳) عقبہ (۱۴) عمارہ (۱۵) عیاد (۱۶) عیینہ (۱۷) قائد (۱۸) قبیصہ (۱۹) محبوب (۲۰) محمد (۲۱) یحییٰ وغیرہ۔[۱]

ابن باذش نے زبان، ابوالعلاء نے ریان، عمرو بن شبہ، ابن العماد حنبلی، ابن خلکان، ابن الانباری اور الدکتور شوقی ضیف نے ان کی کنیت ہی کو ان کا نام قرار دیا ہے[۲] اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کا نام زبان ہی لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بقول علامہ ابن الجزری اکثر علماء و حفاظ کے نزدیک ان کا نام زبان ہے[۳] علامہ ذہبی نے بھی اسی کو صحیح بتایا ہے،[۴] صاحب روضات الجنات نے بھی ابو عمرو کا صحیح نام زبان ہی لکھا ہے[۵]، صاحب نزہۃ الالبا نے بھی واسمہ زبان

---

[۱] محمد باقر الحاجی الموسوی، روضات الجنات ۲/ ۳۹۹، مطبوعہ ۱۳۰۷ھ و علامہ جلال الدین سیوطی، بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ ۲/ ۲۶۷ مطبع السعادۃ مصر طبع اول ۱۳۲۶ھ [۲] غایۃ النہایہ ۱/ ۲۸۹ و علامہ شمس الدین ذہبی، معرفۃ القراء الکبار ۱/ ۱۰۰ موسسۃ الرسالہ بیروت ۱۴۰۸ھ ۱۹۸۸ء و ابن العماد حنبلی، شذرات الذہب ۱/ ۲۳۷ مکتبہ القدسی قاہرہ ۱۳۵۰ھ و ابن خلکان ۱/ ۱۰۶ و ابن الانباری، نزہۃ الالبا ص ۳۰ و الدکتور شوقی ضیف، المدارس النحویہ ص ۲۹ دار المعارف قاہرہ [۳] غایۃ النہایہ ۱/ ۲۸۹ [۴] ایضاً و معرفۃ القراء ۱/ ۱۰۰ [۵] روضات الجنات ۱/ ۳۹۹

لکھا ہے[1] اصمعی کا بیان ہے کہ مجھے خود ابوعمرو نے اپنا یہی نام بتایا تھا[2]

علامہ جلال الدین سیوطی اور صاحب روضات الجنات اس اختلاف کی یہ وجہ تحریر کرتے ہیں:

وسبب الاختلاف فی اسمہ	ان کے نام میں اختلاف کا سبب یہ
انہ کان لجلالتہ لا یسئل	ہے کہ کسی نے ان کی جلالت کی وجہ
عنہ[3]	سے انکا نام نہیں پوچھا۔

ابوعمرو کے نام کی طرح ان کے والد کے نام میں بھی اختلاف ہے، العلاء اور عمار عریان کے علاوہ صاحب روضات الجنات نے عبدالعلاء لکھا ہے[4] خیرالدین زرکلی نے العلاء کو ابوعمرو کے والد کا لقب بتایا ہے[5] لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کا نام العلاء تھا جیسا کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔

ابوعمرو خالص عرب تھے ابوعبیدہ فرماتے ہیں:

وکان من اشراف العرب	ابوعمرو عرب کے نمایاں اور ممتاز
ووجوھھم[6]	لوگوں میں سے تھے۔

مگر قاضی اسد یزیدی کا بیان ہے کہ ابوعمرو فارس کی ایک مشہور جگہ کازرون کے رہنے والے تھے[7] علامہ ابن القاصح بغدادی نے بھی انہیں کازرونی الاصل لکھا ہے[8]
علامہ ابن الجزری نے اس بارے میں تین اقوال نقل کیے ہیں، اول یہ کہ ابوعمرو کا

---

[1] نزھۃ الالباء ص ۲۹ [2] معرفۃ القراء ۱/ ۱۰۱ [3] بغیۃ الوعاۃ ۲/ ۲۳۱ [4] روضات الجنات ۲/ ۳۹۹ [5] ایضاً [6] الاعلام ۳/ ۴۱ [7] معرفۃ القراء ۱/ ۱۰۴ [8] غایۃ النہایہ ۱/ ۲۸۹

[9] علامہ ابن القاصح بغدادی سراج القاری المبتدی ص ۰۱ دارالفکر مصر طبع چہارم ۱۹۵۸ء۔

تعلق بنو حنیفہ سے تھا، بنو حنیفہ شمالی عرب میں قبیلہ بکر بن وائل کی ایک شاخ تھی۔
دوم یہ کہ وہ بنی عنبر سے تھے، سوم یہ کہ بنو تمیم سے ان کا خاندانی تعلق تھا[1] لیکن ایران سے ابو عمرو کا تعلق واضح نہیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ تمیمی تھے۔ حافظ ابوالعلا ہمدانی کا بیان ہے کہ ماہرین نسب کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ ابو عمرو تمیمی تھے[2]

نسبت | قبیلہ بنو تمیم کے حلیف — قبیلہ مازن سے تعلق کی بنیاد پر مازنی اور قبیلہ بنو تمیم سے نسبی تعلق کے سبب تمیمی کہے جاتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جداعلیٰ تمیم کی طرف منسوب ہو کر وہ تمیمی کہلاتے ہیں مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ اوپر ابوالعلا ہمدانی کا قول گذر چکا ہے کہ وہ ماہرین نسب کے نزدیک تمیمی ہیں۔

مدۃ العمر بصرہ میں اقامت گزینی کی وجہ سے بصری اور نحو میں ید طولیٰ رکھنے کی وجہ سے نحوی وغیرہ نسبتوں سے معروف ہیں۔

پیدائش وطن اور پرورش | امام ابو عمرو ۶۸ھ / ۶۸۷ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے[3]، علامہ ابو عمرو عثمان دانی اور عبدالوارث کا بیان ہے کہ ابو عمرو بن العلاء کی جائے پیدائش مکہ معظمہ ہے، پرورش و پرداخت بصرہ میں اور وفات کوفہ میں ہوئی[4]

بعض لوگوں نے علامہ ابن الجزری کی تصنیف [illegible] کے حوالہ سے قاری عبدالوارث کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابو عمرو کی ولادت ایران کے مشہور شہر کازرون میں ہوئی، مگر غایۃ النہایہ میں یہ قول مذکور نہیں بلکہ اس کے برعکس قاری عبدالوارث کا یہ بیان مذکور ہے کہ وہ مکہ میں پیدا ہوئے[5]

---

[1] غایۃ النہایہ ۱/۲۸۸، ۲۸۹ [2] ایضاً ۱/۲۸۸ [3] ایضاً ۱/ [illegible] [4] [illegible] ۱/۱۰۱

[5] ایضاً [6] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۲ [illegible] ۳/۱۴ [illegible]

سنہ ولادت ۵۵ھ، ۶۵ھ اور ۷۰ھ بتایا جاتا ہے[1] مگر اول الذکر ہی زیادہ مشہور و معروف ہے۔

ابو عمرو کے تین بھائیوں کا ذکر ملتا ہے، جنکے نام یہ ہیں۔

(۱) ابو سفیان بن العلاء (۲) معاذ بن العلاء (۳) ابو حفص عمر بن العلاء۔

امام ابو عمرو بن العلاء اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے[2]

اساتذہ و شیوخ امام ابو عمرو نے مکہ، مدینہ، بصرہ اور کوفہ کے اجلۂ تابعین اور ائمہ علوم و فنون کی ایک عمر کردہ جماعت سے کسب فیض کیا جن کی تعداد ستر ہ بتائی جاتی ہے[3] اور بقول علامہ ابن الجزری قرائے سبعہ میں سب سے زیادہ اساتذہ ابو عمرو کے ہیں[4] چند نامور شیوخ کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حسن بن ابو الحسن بصری، حمید بن قیس الاعرج، ابو العالیہ رفیع بن مہران ریاحی، سعید بن جبیر، شیبہ بن نصاح، عاصم بن ابو النجود، عبد اللہ بن اسحاق حضرمی، عبد اللہ بن کثیر مکی، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ بن خالد مخزومی، [illegible] بن جبیر، محمد بن عبد الرحمٰن بن محیصین، نصر بن عاصم، ولید بن یسار، ابو جعفر یزید بن القعقاع مدنی یزید بن رومان، یحییٰ بن یعمر وغیرہ[5]

ابو عمرو کے شیوخ میں ابو العالیہ کا بھی نام آتا ہے، مگر علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ انہیں ابو العالیہ کے بیس سال کا زمانہ ملا تاہم ان سے استفادہ کی روایت درست نہیں[6]

---

[1] غایۃ النہایہ ۱/۲۸۹ و ابن خلکان ۱/۱۰۷ [2] علامہ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰ طبع اول دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد دکن و معرفۃ القراء ۱/۱۰۱ و روضات الجنات ۲/۳۹۹

[3] غایۃ النہایہ ۱/۲۸۹ [4] ایضاً و تہذیب التہذیب ۱۲/۱۷۸ [5] معرفۃ القراء ۱/۱۰۲۔

سند و سلسلہ قرأت | امام ابوعمرو بصری کی قرأت دو واسطوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتی ہے، انہوں نے مجاہد بن جبیر، عکرمہ بن خالد اور عطاء بن ابی رباح وغیرہ اجلہ تابعین سے فن قرأت کی تحصیل کی اور ان حضرات نے حضرت ابی ابن کعب اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا جنھوں نے براہ راست آنحضور صلعم سے اس کی روایت کی ہے۔

حلقہ فیض اور طلبہ کا ازدحام | امام ابوعمرو کے حلقہ فیض سے وابستہ تبع تابعین اور انکے اتباع کے علم و فضل اور علوئے کمال و قبولیت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انکا حلقہ درس کس درجہ شاندار رہا ہوگا، قرآن مجید کا درس جامع بصرہ میں دیا کرتے تھے، اس کے علاوہ حدیث شریف، لغت و عربیت، شعر و ادب، نحو وغیرہ کی تحصیل و تکمیل بھی ان سے بے شمار طلبہ نے کی، وہ جب بصرہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی یہی کیفیت رہی، شیخ حسن بصریؒ نے جب ان کے درس میں طلبہ کا ہجوم دیکھا تو فرمایا:

لا الہ الا اللہ کادت العلماء	لا الٰہ الا اللہ علماء تقریباً ارباب کی
ان تکون اربابا کل عز لم یؤکد	حد تک پہونچ گئے تھے اور جس عزت
بعلم فالی ذل یؤول[1]	کی بنیاد علم پر نہ ہو اس کا انجام ذلت ہے۔

وکیع کا بیان ہے کہ ابوعمرو بن العلاء جب کوفہ آئے تو لوگ ان کے سامنے (حصول علم کے لیے) اسی طرح مجتمع ہوتے تھے جیسا کہ ہشام بن عروہ کے سامنے ہوتے تھے۔[2]

تلامذہ | مدینہ منورہ، بصرہ اور کوفہ وغیرہ جہاں بھی رہے علم کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول مصروف رہے، ان کے بے شمار شاگردوں میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱؎ غایۃ النہایہ ۱/۲۹۱ ۲؎ معرفۃ القراء ۱/۱۰۲۔

سنہ ولادت ۵۵ھ، ۶۵ھ اور ۷۰ھ بتایا جاتا ہے[1] مگر اول الذکر ہی زیادہ مشہور و معروف ہے۔

ابوعمرو کے تین بھائیوں کا ذکر ملتا ہے، جنکے نام یہ ہیں۔

(۱) ابوسفیان بن العلاء (۲) معاذ بن العلاء (۳) ابوحفص عمر بن العلاء۔

امام ابوعمرو بن العلاء اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے[2]

اساتذہ و شیوخ امام ابوعمرو نے مکہ، مدینہ، بصرہ اور کوفہ کے اجلہ تابعین اور ائمہ علوم و فنون کی ایک سرکردہ جماعت سے کسب فیض کیا جن کی تعداد دستر ہ بتائی جاتی ہے[3] اور بقول علامہ ابن الجزری قرائے سبعہ میں سب سے زیادہ اساتذہ ابوعمرو کے ہیں[4] چند نامور شیوخ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:-

حسن بن ابوالحسن بصری، حمید بن قیس الاعرج، ابوالعالیہ رفیع بن مہران ریاحی، سعید بن جبیر، شیبہ بن نصاح، عاصم بن ابوالنجود، عبداللہ بن اسحاق حضرمی، عبداللہ بن کثیر مکی، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ بن خالد مخزومی، مجاہد بن جبیر، محمد بن عبدالرحمٰن بن محیصن، نصر بن عاصم، ولید بن یسار، ابوجعفر یزید بن القعقاع مدنی یزید بن رومان، یحییٰ بن یعمر وغیرہ[5]

ابوعمرو کے شیوخ میں ابوالعالیہ کا بھی نام آتا ہے، مگر علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ گو انہیں ابوالعالیہ کے بیس[2] سال کا زمانہ ملا تاہم ان سے استفادہ کی روایت درست نہیں[6]۔

---

[1] غایۃ النہایہ ۱/۲۸۹ و ابن خلکان ۱/۱۰۷ [2] علامہ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰ طبع اول دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد دکن و معرفۃ القراء ۱/۱۰۱ و روضات الجنات ۲/۳۹۹

[3] غایۃ النہایہ ۱/۲۸۹ [4] ایضاً و تہذیب التہذیب ۱۲/۱۷۸ [5] معرفۃ القراء ۱/۱۰۴ -

سند وسلسلہ قرأت | امام ابوعمرو بصری کی قرأت دو واسطوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتی ہے، انہوں نے مجاہد بن جبیر، عکرمہ بن خالد اور عطاء بن ابی رباح وغیرہ اجلۂ تابعین سے فن قرأت کی تحصیل کی اور ان حضرات نے حضرت ابی ابن کعب اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا جنھوں نے براہ راست آنحضور صلعم سے اس کی روایت کی ہے۔

حلقۂ فیض اور طلبہ کا ازدحام | امام ابوعمرو کے حلقۂ فیض سے وابستہ تبع تابعین اور انکے اتباع کے علم وفضل اور علوئے کمال وقبولیت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انکا حلقۂ درس کس درجہ شاندار رہا ہوگا، قرآن مجید کا درس جامع بصرہ میں دیا کرتے تھے، اس کے علاوہ حدیث شریف، لغت وعربیت، شعر وادب، نحو وغیرہ کی تحصیل وتکمیل بھی ان سے بے شمار طلبہ نے کی، وہ جب بصرہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی یہی کیفیت رہی، شیخ حسن بصریؒ نے جب ان کے درس میں طلبہ کا ہجوم دیکھا تو فرمایا:

لا الٰہ الا اللہ کادت العلماء	لا الٰہ الا اللہ علماء تقریباً ارباب کی
ان تکون اربابا کل عز لم یؤکد	حد تک پہونچ گئے تھے اور جس عزت
بعلم فالی ذل یؤول[1]	کی بنیاد علم پر نہ ہو اس کا انجام ذلت ہے

وکیع کا بیان ہے کہ ابوعمرو بن العلاء جب کوفہ آئے تو لوگ ان کے سامنے (حصول علم کے لیے) اسی طرح مجتمع ہوتے تھے جیسا کہ ہشام بن عروہ کے سامنے ہوتے تھے[2]

تلامذہ | مدینہ منورہ، بصرہ اور کوفہ وغیرہ جہاں بھی رہے علم کی تبلیغ واشاعت میں مسلسل مصروف رہے، ان کے بے شمار شاگردوں میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

---

[1] غایۃ النہایہ ۱/ ۲۹۱ [2] معرفۃ القراء ۱/ ۱۰۲۔

احمد بن محمد بن عبداللہ لیثی، احمد بن موسیٰ لؤلوی، ابوبحر البکراوی، اسحاق بن یوسف بن یعقوب انباری الازرق، حماد بن زید، حسین بن علی الجعفی، خارجہ بن مصعب، خالد بن جبلہ یشکری، داود بن یزید الاودی، ابوزید سعید بن اوس، سلام بن سلیمان طویل، سہیل بن یوسف، شجاع بن ابی نصر بلخی، عباس بن فضل، عبدالرحیم بن موسیٰ، عبداللہ بن داود خریبی، عبداللہ بن مبارک، عبدالملک بن قریب الاصمعی، عبدالوارث بن سعید تنوری، عبدالوہاب بن عطاء خفاف، عبداللہ بن معاذ، عبید بن عقیل، [illegible] بن فضل بن عامر ازدی، علی بن نصر جہضمی، عصمہ بن عروہ [illegible]، قطرب [illegible] ہمدانی، محبوب بن حسن، محمد بن حسن، ابوجعفر رواسی، مسعود بن صالح، معاذ بن مسلم نحوی، معاذ بن معاذ، نعیم بن میسرہ، نعیم بن یحییٰ سعیدی، ہارون بن موسیٰ الاعور، یحییٰ بن مبارک یزیدی، یحییٰ بن عبید، یونس بن حبیب نحوی، محمد بن حسن بن ابی سارہ [illegible] سیبویہ وغیرہ۔[1]

<u>رواۃ قرأت</u> | ان کی قرأت کی روایت مندرجہ ذیل دو اشخاص نے کی ہے۔

(۱) ابوعمرو حفص بن عمر بن عبدالعزیز صہبان دوری۔

(۲) ابوشعیب صالح بن زیاد بن عبداللہ بن اسمٰعیل سوسی۔

علم و فضل | [illegible] اپنے عہد کے عبقری اور نابغہ شخص تھے، تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شمار سید العلماء میں ہوتا ہے[2] اور ابن الندیم نے من الاعلام فی القرآن لکھا ہے[3]، امام اصمعی کو ان سے زیادہ [illegible] کا موقع ملا، ابوعمرو کی مدح و توصیف سے متعلق ان کے متعدد اقوال ملتے ہیں جن کو اختصار کے خیال سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

---

[1] معرفۃ القراء ۱/۸۰، وغایۃ النہایہ ۱/۲۹۰، وتہذیب التہذیب ۱۲/۱۷۹ [2] تہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰

[3] ابن الندیم، الفہرست ص ۴۲، طبع الرحمانیہ مصر۔

علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ابو عمرو قرآن اور علوم عربیہ کے بڑے عالم تھے[1]۔ ابو عمرو شیبانی کا بیان ہے کہ میں نے ابو عمرو کا مثل نہیں دیکھا[2]۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ امام ابو عمرو کے پاس (کتابوں، اور عربی فصحاء کے اقوال پر مشتمل) ایک دفتر تھا جو پورے گھر پر محیط تھا، جب ابو عمرو عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے تو اس کو جلا دیا اور وہ جب دوبارہ علم و فن کی طرف راغب ہوئے تو ان کے پاس حفظ کی ہوئی چیزوں کے علاوہ کچھ نہ تھا[3]۔ احمد بن اسود کا بیان ہے کہ جب ابو عمرو بن العلاء روپوش ہو گئے تھے تو ان کے پاس مشہور شاعر فرزدق آئے[4] اور ان کی شان میں مدح و تحسین کے چند اشعار پیش کیے۔

ما زلت افتح ابواباً و اغلقها   حتى اتيت ابا عمرو بن عمار

میں نے بہت سے دروازے کھولے اور بند کیے یہاں تک کہ ابو عمرو بن عمار کی خدمت میں پہنچ گیا۔

حتى اتيت فتى ضخماً دسيعته   مر المريرة حرا ابن احرار

ان کو میں نے ایک تنومند جوان پایا جو آزاد اور آزاد کے بیٹے تھے۔

ينميهم مازن في فرع نبعتها   جد كريم و عود غير خوار[5]

ان کا تعلق قبیلہ مازن کی ایک ایسی شاخ سے تھا جس کا سلسلہ ایک شریف النسل سے ہوتا ہے اور وہ معزز اور شریف تھا۔

ابن مناذر نے بھی ان کی مدح کی ہے فرماتے ہیں:

سميتم آل العلاء لانكم   اهل العلاء و معدن العلم

تمہارا نام آل علاء اس لیے رکھا گیا ہے کہ تم لوگ عالی مرتبت ہو اور علم کے خزانے ہو

---

[1] غایۃ النہایہ [2] تہذیب التہذیب ۱۲/۱۷۹ [3] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۰ و علامہ ذہبی العبر فی خبر من غبر ۱/۲۴۳، دائرۃ المطبوعات والنشر کویت ۱۹۶۰ء و ابن خلکان ۱/۵۰۱ [5] معرفۃ القراء ۲/۱۰۴۔

ولقد بنیٰ آل العلاء لمازن بیتاً احلوا مع النجم [1]

آل علاء نے اپنے قبیلہ مازن میں ایک ایسا گھر آباد کیا ہے جس کو ستاروں سے مزین کیا ہے۔

ابوعمرو اسدی کہتے ہیں کہ میں امام ابوعمرو کے انتقال کے بعد ان کے فرزندوں کے پاس تعزیت کے لیے گیا ابھی وہیں تھا کہ یونس بن حبیب آگئے، انہوں نے فرمایا کہ آج تک ہم نے ان کا ثانی نہیں دیکھا اگر ان کے علم و فن اور زہد و ورع کو سوانسانوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے تو وہ سب کے سب عالم و زاہد ہو جائیں گے اور اگر یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو آپ ان کو ضرور ان کے درجہ و مرتبہ کی خوش خبری دیتے [2] ابوعمرو علم و فضل کے ساتھ سنت کے بھی پابند تھے [3]

حجاج کے مظالم | حجاج کے مظالم کی وجہ سے ابوعمرو اپنے والد کے ہمراہ عراق سے جنوبی عرب چلے آئے، اس وقت ان کی عمر تقریباً بیس سال تھی، یہ لوگ ایک عرصہ تک جنوبی عرب میں روپوشی کی زندگی گزارتے رہے، اس سفر کی وجہ سے غالباً ابوعمرو کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں قرأت کی ترویج کا موقع ملا [4] اور یہ سلسلہ بظاہر ۹۵ھ حجاج کی موت تک جاری رہا، اس کی وفات کے بعد ابوعمرو اور ان کے والد عراق واپس آئے۔ لیکن ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ ابوعمرو نے خود مجھ سے بیان کیا کہ مجھے اور میرے والد کو حجاج بن یوسف نے طلب کیا تو ہم اس کے خوف سے یمن کی طرف نکل بھاگے مگر راستہ ہی میں ایک شخص کو یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا [5]

لا تضیقن بالامور فقد تکـ ـشف غماؤها بغیر احتیال

---

[1] روضات الجنات ۲/۲۴۹ [2] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۲ [3] ایضاً ۱/۲۸۹ [4] ابن خلکان ۲/۱۰۹۔

[5] معرفۃ القراء ۱/۱۰۳۔

معاملات سے تنگ دل نہ ہو کیونکہ پریشان حالی کا خاتمہ بغیر کسی کوشش کے خود بخود ہوگیا۔

ربَّ ما تکرہ النفوس من الامر   لہا فرجۃ کفرج العقال

کتنے ایسے ناپسندیدہ معاملات ہوا کرتے ہیں جو نفس پر گراں گزرتے ہیں، مگر ان کا راستہ اسی طرح نظر آتا ہے جیسے اونٹ اپنی رسی سے آزاد ہو جاتا ہے۔

میرے والد نے اس سے دریافت کیا کہ معاملہ کیا ہے، اس نے بتایا کہ حجاج کا انتقال ہوگیا، یہ سن کر ہمیں محسوس ہوا کہ ہم غموں سے نجات پاگئے[1] چنانچہ بصرہ واپس لوٹ آئے۔

امرا کے دربار میں رسوخ | اپنے علم و فضل اور زہد و اتقا کی وجہ سے انہیں بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور عوام کے علاوہ ارباب حکومت میں بھی وہ باریاب ہوگئے تھے، خلیفہ السفاح کے چچا سلیمان سے اور خلیفہ مہدی کے چچا یزیدی سے نیز شام کے حاکم عبدالوہاب سے ان کے اچھے مراسم و تعلقات تھے، عبدالوہاب سے ملاقات کر کے آئے تھے کہ انکا انتقال ہوا۔

فن قرأت میں علوئے مرتبت | امام ابوعمرو کا درجہ فن قرأت میں بہت بلند ہے انہوں نے تابعین کی ایک جماعت سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی تھی علم قرأت کے حصول میں خاص طور پر بڑی سعی کی اور قرأت قرآن میں ایک طرز خاص کے موجد و امام ہوئے خود ان کا بیان ہے کہ میں نے قرآن پاک کا ایک حرف بھی بغیر نقل و اثر کے اپنی رائے سے نہیں پڑھا[2] امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ ابوعمرو کی قرأت میری پسندیدہ ہے[3] وہ ان کی قرأت کو قریش اور فصحا کی قرأت کہتے ہیں[4] امام اصمعی کا بیان ہے کہ ابوعمرو نے

---

[1] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۱ و ابن خلکان ۱/۱۰۴ [2] ملا علی قاری شرح شاطبی ص ۱۳ [3] ایضاً [4] حافظ ابو شامۃ ابراز المعانی، ص ۵۔

شیخ سلطان الاولیا حسن بصری کی زندگی ہی میں سیادت کے مرتبہ پر پہونچ گئے تھے۔ اور اپنے عہد میں سب پر فائق و برتر تھے[۱] اہل مدینہ اسے قاری ہی تسلیم نہ کرتے تھے جس نے ابوعمرو سے اخذ قرأت نہ کیا ہو، خود امام ابوعمرو کا بیان ہے کہ مجھے اس علم سے بہت کم سنی ہی سے دلچسپی تھی اور اب میری عمر ۸۴ سال ہے[۲]

سفیان بن عیینہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سو قت بہت سی قرأتیں رائج ہیں، میں کس کی قرأت پڑھوں۔ آپ نے فرمایا ابوعمرو بن العلاء کی قرأت اختیار کرو[۳]

شجاع بن ابونصر کا بیان ہے میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی تو میں نے آپ کی خدمت میں ابوعمرو بن العلاء کی قرأت سے متعلق کچھ چیزوں کو پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے دو حرفوں کے کسی کو رد نہیں فرمایا پہلی آیت وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا (۲۰ - ۱۲۸) اور دوسری آیت مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا (۲ - ۱۰۶) ہے[۴]

نصر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ آپ کا عمل کس قرأت پر ہے تو انہوں نے فرمایا کہ ابوعمرو بن العلاء کی قرأت پر[۵]

شعبہ کا بیان ہے کہ ابوعمرو بن العلاء کی قرأت کو مضبوطی سے پکڑ لو کیونکہ یہ لوگوں کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے[۶] وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ جو پڑھتے ہیں اس پر توجہ

---

[۱] معرفۃ القراء ۱/۱۰۱ و ابن خلکان ۳/۱۰۵ [۲] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۱ و معرفۃ القراء ۱/۱۰۲ و بغیۃ الوعاۃ ۲/۲۳۱ [۳] غایۃ النہایہ و معرفۃ القراء ۱/۱۰۳ [۴] ایضاً [۵] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۱ معرفۃ القراء ۱/۱۰۳ [۶] ایضاً ۱/۲۹۱۔

کیونکہ یہ لوگوں کے لیے سند بننے والی ہے[1] علامہ ابن الجزری نے شعبہ کے اقوال پر مفصل تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

"شعبہ کی یہ بات درست ثابت ہوئی کہ شام، حجاز، یمن اور مصر میں لوگوں کے درمیان امام ابو عمرو ہی کی قرأت رائج ہے، ان ممالک میں ایک بھی شخص نہ ملے گا جو ان کی قرأت کے علاوہ کسی اور قرأت کی تعلیم دیتا ہو خاص طور پر فرش میں ہاں اصول کے اندر لوگ غلطی کرتے ہیں اور شام کے لوگ امام ابن عامر کی قرأت کے مطابق پڑھتے تھے مگر ایک شخص نے جامع الاموی میں بیٹھ کر لوگوں کو امام ابو عمرو کی قرأت کی تعلیم دینا شروع کیا اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا یہاں تک کہ ابو عمرو کی قرأت لوگوں میں مشہور ہو گئی"[2]

علامہ دانیؒ فرماتے ہیں:-

والیہ انتهت الامامة فی القرأة بالبصرة[3]	بصرہ میں امام ابو عمرو پر امامت قرأت ختم ہو گئی۔

یزید کا بیان ہے کہ:

کان ابو عمرو قد عرف القرأت فقرأ من کل قرأة باحسنها وبما یختار العرب وبما بلغه النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجاء تصدیقه فی کتاب اللہ	ابو عمرو عارف قرأت، تمام قرأتوں کے ماہر اور ہر اس قرأت کو احسن طریقے سے پڑھتے تھے جس کو اہل عرب اختیار کرتے ہیں اور اس لغت کو پڑھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۲ [2] ایضاً [3] معرفۃ القراء ۱/۱۰۱

عزوجل[1] کی لغت ہے اور جس کی تصدیق کتاب اللہ نے کی ہے۔

خود ابوعمرو بن العلاء کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر نے میری قرات سن کر فرمایا کہ تم اسی قرأت پر مضبوطی سے عمل کرو[2] ابوبکر بن مجاہد فرماتے ہیں کہ:

وکان فی عصرہ بالبصرۃ جماعۃ	ان کے زمانہ میں بصرہ میں قرات
من اهل العلم بالقرأۃ	کے عالموں کی پوری جماعت تھی لیکن
لم یبلغوا مبلغه والی قرأته	ان میں سے کوئی ان کی ہمسر نہ تھی اہل
صار اهل البصرۃ او اکثرهم[3]	بصرہ یا ان کی اکثریت ابوعمرو کی قرات پر عمل کرتی تھی۔

حدیث: امام ابوعمرو کا شمار محدثین میں بھی ہوتا ہے، انہوں نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق اپنے والد اور انس بن مالک، عطاء بن ابی رباح، ابوصالح السمان ایاس، حسن بصری، ابن سیرین، نافع مولی ابن عمر، بدیل بن میسرہ، فرقد سبخی، مجاہد اور ابورجاء العطاردی سے احادیث روایت کیں[4] اور خود ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے بھائی معاذ بن العلاء، شعبہ، حماد بن زید، شریک نخعی، معمر ابن راشد، وکیع، ہارون بن موسیٰ نحوی، اصمعی، عبید بن عقیل، شبابہ، ابواسامہ اور ابوزید سعید بن اوس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں[5] لیکن علامہ ذہبی کا قول ہے کہ کتب حدیث میں انکے واسطے سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے[6] اور اس کی وجہ ان ہی کے الفاظ میں

---

[1] معرفۃ القراء ۱/۱۰۲ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰ [4] ایضاً ۱۲/۱۷۹ وغایۃ النہایۃ ۱/۲۸۹ و معرفۃ القراء ۱/۱۰۱ والعبر فی خبر من غبر ۱/۲۲۳ [5] ابن خلکان ۲/۱۰۵ [6] معرفۃ القراء ۱/۱۰۴

یہ ہے کہ وہ حدیث میں قلیل الروایۃ تھے[1]

ثقاہت وعدالت ابو عمرو ثقہ صادق اور ضابط تھے[2]، علامہ ابن حجر عسقلانی نے ان کا شمار تابعین کے پانچویں طبقہ میں کرتے ہوئے ثقۃ من علماء العربیۃ لکھا ہے[3] جرح وتعدیل کے امام ابن معین کا بیان ہے کہ ابو عمرو ثقہ تھے[4] ابو حاتم نے لا بأس بہ کہا ہے[5] علامہ ذہبی فرماتے ہیں:۔

وھو صدوق حجۃ فی القراءۃ[6]	ابو عمرو صدوق اور فن قرأت میں حجت تھے۔

ملا علی قاری کا بیان ہے کہ ابو عمرو ثقہ عادل، زاہد اور سچے تھے[7]، ابن حبان نے ان کا ذکر کتاب الثقات میں کیا ہے[8] ابو عبید قاسم بن سلام فرماتے ہیں:۔

وکان صدوقا ماموناً[9]	ابو عمرو سچے اور قابل اطمینان تھے۔

گو انکی ثقاہت میں کلام نہیں کیا گیا ہے تاہم وہ کبار حفاظ کے ہم پایہ نہ تھے، اسی لیے ابو خیثمہ نے کہا ہے:

کان ابو عمرو بن العلاء رجلاً لا بأس بہ ولکنہ لم یحفظ[10]	ابو عمرو ایسے شخص تھے جن میں کوئی حرج نہیں تھا مگر وہ درجہ حفظ میں نہیں تھے۔

---

[1] روضات الجنات ۲/۳۹۹ و بغیۃ الوعاۃ ۲/۲۶۷ [2] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۰ [3] ابن حجر عسقلانی، تقریب التہذیب ص ۲۷۲ مطبع مجتبائی، دہلی [4] معرفۃ القراء ۱/۱۰۴ و بغیۃ الوعاۃ ۲/۲۶۷ [5] معرفۃ القراء ۱/۱۰۴ [6] روضات الجنات ۲/۳۹۹ و بغیۃ الوعاۃ ۲/۲۶۷ [7] شرح شاطبی ص ۱۳ [8] تہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰ [9] ایضاً [10] ایضاً ۲/۱۷۹۔

نحو امام ابوعمرو فن نحو کے امام اور بصرہ کے دبستان نحو کے گل سر سبد تھے، نحو کی تعلیم نصر بن عاصم سے حاصل کی اور خود ان سے یونس بن حبیب نحوی، خلیل بن احمد نحوی اور ابو محمد علی بن مبارک زیدی نے فن نحو کی تحصیل کی[1] انکا شمار نحو کے چوتھے طبقہ میں ہوتا ہے[2] خلیل بن احمد بصرہ کے سب سے ممتاز و مشہور عالم مانے جاتے ہیں لیکن ابوعمرو کو ان پر بھی فوقیت و برتری حاصل تھی، علاوہ ازیں وہ ان کے شاگرد بھی تھے[3]

نحو میں اپنے بلند مرتبہ کی وجہ سے وہ نحوی کی نسبت سے معروف ہوئے[4]

ابن جنی فرماتے ہیں:

کان ممن نظر وافی النحو والتصریف وتدربوا وقاسوا[5]	وہ ان لوگوں میں سے تھے جو نحو و صرف میں اہل نظر، ماہر اور صاحب قیاس ہیں۔

لغت وعربیت ابو عمرو بن العلاء لغت وعربیت میں بھی یگانۂ روزگار تھے تذکرہ نگاروں نے انہیں لغت وعربیت کا امام لکھا ہے، ابن مجاہد فرماتے ہیں:

وکان مع علمہ باللغۃ وفقھہ بالعربیۃ متمسکا بالآثار[6]	لغت وعربیت کے علم و معرفت کے ساتھ وہ آثار پر عمل پیرا تھے۔

---

[1] .... نزہۃ الالباء ص ۳۰ [2] علامہ یافعی، مرآۃ الجنان ۱/۳۲۵ دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد دکن ۱۳۳۷ھ [3] مولوی جمیل احمد، تذکرۃ النحاۃ ص ۳ [4] ابن الاثیر، اللباب فی تہذیب الانساب ۲/۲۱۷، مکتبہ القدسی قاہرہ ۱۳۶۹ھ [5] المدارس النحویہ ص ۲۷ [6] تہذیب التہذیب ۱۲/۱۷۹

ابن الاثیر کا بیان ہے کہ :

امام فی القراءۃ والنحو واللغۃ[۱] ۔ فن قرات، نحو اور لغت کے امام تھے۔

شعروادب امام ابوعمرو کو شعروادب سے بھی دلچسپی تھی دور جاہلیت کے شعراء کے بہت سے اشعار ان کو یاد تھے اور وہ انہیں برمحل اور برموقع استعمال بھی کرتے تھے، اشعار ان لوگوں کے حوالے سے نقل کرتے جن لوگوں نے دور جاہلیت کے شعراء کو دیکھا تھا[۲] امام اصمعی کا بیان ہے کہ میں ابوعمرو کے پاس دس سال تک رہا مگر میں نے ان کی زبان سے کبھی دور اسلام کے کسی شاعر کا شعر نہیں سنا[۳] میں نے ابوعمرو سے ہزار مسئلے دریافت کیے ابوعمرو نے ہر مسئلہ کا مدلل جواب دیا جس کے ثبوت میں شعرائے جاہلیت کا کلام بھی پیش کیا[۴] ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ ابوعمرو بن العلاء السفاح کے چچا سلیمان علی کے پاس گئے تو اس نے کسی چیز کے بارے میں اس سے سوال کیا، اس نے جواب دیا وہ اسے پسند نہیں آیا، ابوعمرو کو اس کا احساس ہوگیا اس لیے اس نے یہ شعر پڑھا ؎

انفت من الذل عند الملوک وان اکرمونی وان قربوا

میں نے بادشاہوں کے پاس ذلت ہی محسوس کی اگرچہ وہ میری عزت کریں اور مجھے قربت بخشیں۔

اذا ما صدقتھم خفتھم ویرضون منی بان یکذب بوا[۵]

جب میں ان کی تصدیق کرتا ہوں تب بھی ان سے ڈرتا ہوں جبکہ وہ مجھ سے اس پر راضی ہوتے ہیں کہ ان کی تکذیب کی جائے۔

---

۱ اللباب ۳/۱۷۰ ۲ الاعلام ۳/۱۴ ۳ ابن خلکان ۲/۱۰۶ ۴ مرآۃ الجنان ۱/۳۲۵ ۵ ابن خلکان ۲/۱۰۷۔

اصمعی کا بیان ہے کہ وہ رمضان المبارک میں کبھی شعر نہیں پڑھتے تھے[1]

جامعیت | ان کی جامعیت کا اندازہ مندرجہ ذیل اقوال سے ہوگا، صاحب تذکرۃ النحاۃ لکھتے ہیں:

در علم قرآن و عربیت واشعار عرب یگانہ روزگار بود[2]	علم قرآن وعربیت اور اشعار عرب میں یگانۂ روزگار تھے۔

علامہ سیوطی اور باقر موسوی لکھتے ہیں:

کان امام اھل البصرۃ فی القرأۃ والنحو واللغۃ[3]	ابوعمرو قرآت عربیت لغت میں اہل بصرہ کے امام تھے۔

ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ:

کان ابوعمرو اعلم الناس بالقرآن والعربیۃ وایام العرب والشعر وایام الناس[4]	ابوعمرو فن قرآت نحو اور ایام عرب شعر اور ایام الناس کے اعلم الناس تھے۔

ابوبکر ابن مجاہد کا قول ہے:

کان ابوعمرو مقدما فی عصرہ عالما بالقراءۃ ووجوھا قدوۃ فی العلم واللغۃ امام الناس فی العربیۃ[5]	ابوعمرو اپنے زمانہ میں فائق ومقدم تھے جو فن قرات اور اس کے مختلف وجوہ سے واقف اور علم ولغت میں ایک مثالی نمونہ اور عربیت میں

---

[1] ابن خلکان ص ۱۰۲۱ [2] تذکرۃ النحاۃ ص ۳ [3] بغیۃ الوعاۃ ۲/۲۶۷ وروضات الجنات ۲/۳۹۹

[4] معرفۃ القراء ۱/۱۰۳ [5] تہذیب التہذیب ۱۲/۱۷۹۔

لوگوں کے امام تھے۔

ابو معاویہ الازہری فرماتے ہیں:

کان من اعلم الناس بوجوہ	قرات کے وجوہ، عرب کے الفاظ انکے
القرأت والفاظ العرب و	نوادر کلام اور فصیح اشعار کے سب سے
نوادر کلامھم وفصیح اشعارھم[1]	بڑے عالم تھے۔

جاحظ کا قول ہے کہ:

کان اعلم الناس بالغریب	غریب الفاظ، عربیت، قرآن، شعر،
والعربیۃ وبالقرآن والشعر	ایام عرب اور ایام الناس کے سب
وبایام العرب وایام الناس[2]	سے بڑے عالم تھے۔

کرامات | ابو عمرو کے بعض خوارق و کرامات بھی بیان کیے گئے ہیں عبدالوارث کا بیان ہے کہ ایک سال میں ان کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوا، ایک دن راستے میں ایک چٹیل میدان میں ہمیں بٹھایا اور خود کہیں چلے گئے یہ تاکید بھی کر گئے تھے کہ میری واپسی تک یہاں سے کہیں نہ جانا لیکن جب بہت دیر ہو گئی تو میں ان کی تلاش میں نکلا اچانک میری نظر ان پر پڑی دیکھا کہ وہ اس بے آب وگیاہ سرزمین میں ایک سرچشمہ پر وضو کر رہے ہیں یہ راز فاش ہو جانے پر انہوں نے مجھ کو تلقین فرمائی کہ اسے کسی سے بیان مت کرنا، میں نے اس کا عہد کیا، خدا کی قسم ان کی زندگی بھر اسکا کسی سے ذکر نہیں کیا[3]

تصانیف | ان کی پوری زندگی تعلیم و تدریس میں بسر ہوئی، مگر انہیں تحریر و تصنیف

---

[1] تہذیب التہذیب ص ۱۸۰ [2] المدارس النحویہ ص ۲۷ [3] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۱۔

سے بھی شغف تھا، ابن الندیم نے انکی دو کتابوں کتاب النوادر[1] اور کتاب القرأت کا ذکر کیا ہے[2]۔ ان کی نظر سے ان کے بعض مخطوطات گزرے تھے[3]۔ انکا بیان ہے کہ کتاب النوادر کا ایک نسخہ جو ابوعمرو نے چھوڑا تھا بعینہ باقی ہے[4]۔

متعدد اہل فن نے ان پر کتابیں لکھی ہیں مثلاً احمد بن یزید الحلوانی کی کتاب قرأۃ ابی عمرو اور ابودہل کی تصنیف کتاب قرأۃ ابی عمرو بن العلاء وغیرہ[5]۔

اقوال زریں: ابوعمرو بن العلاء سے بعض زریں اقوال منقول ہیں، مثلاً امام اصمعی کا بیان ہے کہ میں نے ابوعمرو کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ اہل خیر سے خیر لے لو اور اہل شر کے لیے شر چھوڑ دو[6]۔ ابن مناذر کہتے ہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ حصول علم کی مدت کیا ہے فرمایا زندگی بھر[7]۔ نیز فرماتے ہیں:

اول العلم الصمت ثم حسن السوال	خاموشی اولین علم ہے پھر عمدہ سوال
ثم حسن اللفظ ثم نشرہ عند	کرنا پھر الفاظ کا حسن پھر لائق و اہل
اھلہ وقال احتمال الحاجۃ	لوگوں میں اسکی اشاعت ہے اور فرمایا
خیر من طلبھا من غیر اھلھا	کہ ضرورت مند رہ جانا اس سے بہتر ہے
قال وما تساب اثنان الا غلب	کہ نا اہل لوگوں سے حاجت روائی کی
الامھا وقال اذا تمکن الاخاء	درخواست کی جائے، دو گالی گلوج
قبح الثناء وما ضاق مجلس بمتحابین	کرنے والوں میں جو زیادہ کمینہ ہے

---

[1] الفہرست ص ۴۱ بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ ۱/ ۸۷۰ [2] الفہرست ص ۵۳ مطبع الرحمانیہ مصر [3] الفہرست ص ۴۱ بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ ۱/ ۸۷۰ [4] ایضاً [5] الفہرست ص ۴۳ [6] معرفۃ القراء ۱/ ۱۰۲ [7] ابن خلکان ۳/ ۱۰۴۔

فما التسعت البلاد بمتباغضين[۹] — وہی غالب آتا ہے، دوستی جب پختہ ہوتی ہے تو (رسمی) تعریف بری لگتی ہے، دو آپس میں محبت کرنے والوں کے لیے کوئی مجلس تنگ نہیں ہوتی لیکن نفرت کرنے والوں کے لیے دنیا بھی تنگ ہو جاتی ہے۔

انتقال امام ابوعمرو بصری نے ۱۵۴ھ میں عباسی خلیفہ منصور کے زمانہ میں ۸۶ برس کی عمر میں کوفہ میں انتقال کیا[۱۰] بعض لوگوں کا بیان ہے کہ انکا انتقال شام کے راستے میں ہوا،[۱۱] ابن خلکان اور دوسرے تذکرہ نگاروں کے مطابق یہ گورنر شام عبد الوہاب بن ابراہیم سے ملاقات کر کے آئے تھے کہ کوفہ میں انتقال ہوا[۱۲] کوفہ میں ان کی قبر پر یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ ابوعمرو بن العلاء مولیٰ بنو حنیف کی قبر ہے[۱۳]

گو وفات کے متعلق متعدد اقوال ہیں، مگر اکثر لوگوں کے نزدیک انکی وفات ۱۵۴ھ میں ہوئی۔

انکی وفات پر عبداللہ بن مقفع نے مرثیہ لکھا تھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

رزئنا اباعمرو ولا حی مثله — فللّٰه ریب الحادثات بمن وقع

فان تک قد فارقتنا وترکتنا — ذوی خلة ما فی انسداد لها طمع

فقد جرّ نفعا فقدنا لک اننا — امنا علی کل الرزایا من الجزع

یہ اشعار دوسروں سے بھی منسوب کیے گئے ہیں مگر صحیح قول کے مطابق یہ ابن مقفع ہی کے اشعار ہیں۔

---

[۱۰] شذرات الذہب ۱/۲۳۸ [۱۱] معرفۃ القراء ۱/۱۰۵ وغایۃ النہایہ ۱/۲۹۲ ونزہۃ الالباء ص ۳۸ و تقریب التہذیب ص ۴۲۲ [۱۲] المعارف ص ۵۴۰ وتہذیب التہذیب ۱۲/۱۸۰ والاعلام ۳/۴۱ وابن خلکان ۲/۴۰۱ [۱۳] ابن خلکان ۲/۴۰۱ والمعارف ص ۵۴۰ وشذرات الذہب ۱/۲۳۸ [۱۴] معرفۃ القراء ۱/۱۰۵ [۱۵] غایۃ النہایہ ۱/۲۹۲

اقبال کے کلام میں "قیصر" کی اصطلاح

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب

اقبال نے اپنی پیام رسانی کی پوری عمارت خود اپنی وضع کردہ اصطلاحوں پر کھڑی کی ہے، پہلے وہ اگلوں کی طرح طائر زیر دام نہیں بلکہ بہت اونچی سطح پر کھڑے طائر زیر بام تھے۔ اس کی ضرورت انہیں اس لیے بھی لاحق ہوئی کہ روایتی علامات و اصطلاحات کثرت استعمال سے ایک تو اپنا حسن کھو چکی تھیں دوسرے وہ اقبال کے پیام کا بوجھ اٹھانے کی مطلق متحمل نہ تھیں۔ اگر انہوں نے روایتی علامات و اصطلاحات کو اپنے کلام میں استعمال بھی کیا تو ان کے معنی اس طرح بدل دیے جن سے اردو شاعری قطعی طور پر نا آشنا تھی۔

اقبال کے کلام میں خود ان کی وضع کردہ اصطلاحات کی تعداد پانچ سو سے بھی زائد ہے، جن میں نام سے منسوب ۱۱۵ اصطلاحیں ہیں، جغرافیائی اصطلاحات کی تعداد ۶۵ ہے، قرآنی تلمیحات کی تعداد سو سے بھی زائد ہے اور الفاظ سے مشتق اصطلاحوں کی تعداد کی کوئی گنتی نہیں مگر کلام میں زیادہ مستعمل ایسی اصطلاحیں قریب دو سو ہیں۔

اقبال کا مقصود ان ساری اصطلاحوں سے خواہ وہ نام سے منسوب ہوں یا جغرافیہ سے قرآنی تلمیحات ہوں یا الفاظ سے مشتق، اگر ایک طرف اسلامی تاریخ کے پس منظر میں

اسلاف کے کارناموں کی یاد دلاتی ہے تو دوسری طرف ان اصطلاحوں سے مسلمانوں میں وہی جذبۂ ایمانی اور جوشِ کردار کی ترغیب دیتی ہے جو ان اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا اور جن اوصاف نے انہیں تختِ فغفوری اور سریرِ کَے عطا کیا۔

نام سے منسوب ایسی ہی ایک اصطلاح "قیصر" ہے جس سے انہوں نے دو اور اصطلاحیں "قیصری" اور "سیزر" وضع کی اور جو اس مضمون کے موضوع ہیں۔ مگر ان اصطلاحات سے ترتیب دیے گئے اشعار کو گرفت میں لانے کے لیے ہیں اس پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے جس پس منظر میں مسلمانوں کو رومی سلطنت سے واسطہ پڑا۔

"قیصر" عجمی زبان کا لفظ ہے اور عجمیوں نے رومی سلطنت کے ہر بادشاہ کو اسی لقب سے یاد کیا ہے حالانکہ ان کے نام الگ الگ تھے۔ انگریزی زبان میں "قیصر" کو "سیزر" کہتے ہیں۔ رومی سلطنت ۲۷ ق م میں آگسٹس نے قائم کی تھی جسے تاریخ میں "ہولی رومن امپائر" کہتے ہیں۔ مگر اس سلطنت کا خاتمہ ۴۷۶ء میں جرمن قبائلیوں نے کر دیا۔ رومی سلطنت قائم ہونے کے چند سالوں قبل تک روم ایک جمہوریہ تھا مگر جولیس سیزر (۱۰۰ - ۴۴ ق م) اس کا مطلق العنان ڈکٹیٹر اور بادشاہ بن بیٹھا۔ سیزر کی اصطلاح انگریزی لغت میں ایک مطلق العنان اور جابر بادشاہ ہی کے معنوں میں آتی ہے۔ سیزر کی پیدائش چونکہ ماں کا پیٹ چاک کر کے ہوئی تھی اس لیے آج بھی ماں کا پیٹ چاک کر کے بچہ پیدا کرنے کے طریقہ کو مغربی علمِ طب "ہسٹریکٹومی" کو "سیزارین آپریشن" کا نام دیا جاتا ہے۔

سیزر کے بعد رومی جرنلوں میں عرصہ تک خانہ جنگی چلتی رہی۔ رومی بادشاہ

کونسٹین ٹائن اول نے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں اپنے نام پر شہر قسطنطنیہ آباد کیا اور اسے رومی سلطنت کا پائیہ تخت قرار دیا۔ اسی قسطنطنیہ کو موجودہ زمانہ میں موجودہ ترکی کا ایک مشہور شہر استنبول کہتے ہیں۔ ۳۹۵ء میں رومی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ اس سلطنت کے مغربی حصہ پر جس میں یورپ کے بہت سارے علاقے شامل تھے، روم سے حکومت کی جانے لگی اور مشرقی حصہ پر جس میں مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے علاقے شامل تھے، قسطنطنیہ سے حکومت کی جانے لگی مسلمانوں کا واسطہ ان دونوں رومی سلطنتوں سے پڑا اور تاریخ اسلام ان ہی دونوں سے لڑی گئی جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ آج نہر سویز سے جبرالٹر تک بحیرۂ روم کے دونوں جانب اسلامی ملکوں کا ایک وسیع و عریض خطہ نقشہ پر جو نظر آتا ہے یہ مسلمان جانبازوں نے انہی دونوں رومی سلطنت کو شکست دے کر فتح کیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات ہی میں ایرانی اور رومی دو سب سے بڑی حکومتیں تسلیم کی جاتی تھیں اور یہ دونوں اسلام کی فتوحات کو بڑی تشویش کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ ایرانی سلطنت کا علاقہ چھوٹا تھا مگر رومی نہر سویز سے جبرالٹر تک حکمراں تھے۔ اقبال جب "قیصر" کی اصطلاح لاتے ہیں تو وہ رومی سلطنت کے اس وسیع و عریض علاقہ پر مسلمانوں کے فتوحات کی یاد دلا کر جذبۂ ایمانی اور جوشِ کردار کی یاد دلاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ: تھے تو آباء وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ ہی سے ان دونوں سلطنتوں پر یلغار شروع ہو گئی تھی۔ رومیوں کے خلاف شام پر اسامہ بنؓ زید کا حملہ اور حضرت خالدؓ بن ولید کا رومیوں کو اجنادین میں شکست دے کر دمشق میں فاتحانہ داخلہ؛ ملک شام میں حضرت ابوعبیدہؓ

کے ہاتھوں یرموک کے مقام پر ۱۵ھ مطابق ۶۳۶ء میں رومیوں کا شکست فاش (جس فتح پر "بانگِ درا" کی نظم "جنگِ یرموک کا ایک واقعہ" ہے) اور پھر ۱۶ھ مطابق ۶۳۷ء میں بیت المقدس کی فتح اور حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں مصر اور اسکندریہ پر ۲۱ھ مطابق ۶۴۲ء میں قبضہ اور پھر جزیرۂ قبرص اور روڈس کے فتوحات پھر خلافت بنی امیہ کے دور میں ۱۳۶ھ مطابق ۷۵۵ء میں عبدالرحمٰن بن معاویہ کا اسپین میں خود مختار اور آزاد اسلامی حکومت کا قیام اور بتدریج پورے شمالی افریقہ پر قبضہ۔ یہ ہیں وہ سارے پس منظر جن سے ہم اقبال کی اصطلاح "قیصر" کو گرفت میں لا سکتے ہیں۔ اقبال کے ایسے اشعار جن "قیصر" سے مراد رومی سلطنت ہے خواہ وہ مغربی رومی سلطنت ہو یا مشرقی رومی سلطنت جن کا پایہ تخت علی الترتیب روما اور قسطنطنیہ تھا۔ اسلامی تاریخ کے اس پس منظر میں اب اس اصطلاح کو گرفت میں لانا آسان ہے۔

قیصر: اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کتنا جو درج ذیل اشعار ہیں جو علی الترتیب "بانگِ درا" کی نظمیں "صبح کا ستارہ"، "بلادِ اسلامیہ"، "شکوہ" اور "طلوعِ اسلام" اور "بالِ جبریل" کی غزل ۱ (اول) کے آخری دو دو اشعار ہیں۔

ہے چمکنے میں مزا حسن کا زیور بن کر　　زینتِ تاجِ سرِ بانوئے قیصر بن کر

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار　　مہدئ امت کی سطوت کا نشانِ پائدار

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟　　شہر قیصر کا جو تھا، اس کو کیا سر کس نے؟

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے　　وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی　　وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ

محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا　　محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری

پہلے شعر میں "بانوئے قیصر" سے مراد کسی عظیم سلطنت کی ملکہ ہے، اقبال نے ستارے کی زینت کو "زینتِ تاجِ بانوئے قیصر" کہہ کر استعارے کی بہترین مثال پیش کی ہے۔

دوسرے شعر میں "قیصر کا دیار" سے مراد قسطنطنیہ ہے جو مشرقی رومی سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ اس شہر کو ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے عثمانی شہنشاہ سلطان محمد دوم کی قیادت میں فتح کر کے اس خطے سے رومی حکومت ختم کر کے سلطنتِ عثمانیہ ترکیہ کا حصہ بنا لیا اور یہ اس اسلامی حکومت کا دارالخلافہ بن گیا، جنھوں نے اس کا نام بدل کر استنبول رکھا، مصطفیٰ کمال پاشا نے جو ۱۹۲۳ء میں ترکی میں برسرِ اقتدار آیا اس نے دارالخلافہ استنبول سے انقرہ منتقل کر دیا جو آج بھی ہے۔

تیسرے شعر میں "قیصر" کی اصطلاح کے ساتھ اقبال کی ایک جغرافیائی اصطلاح "خیبر" بھی آگئی، اور جیسا میں نے کہا اقبال کی کوئی اصطلاح نہیں جس کا تعلق دینِ اسلام یا اسلامی تاریخ سے نہ ہو۔ خیبر یا درِ خیبر سے مراد وہ درۂ خیبر نہیں جو پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر پاکستان کے شہر پشاور اور افغانستان کی سرحد پار کر کے افغانستان کے شہر جلال آباد جاتی ہے۔ اقبال جس درِ خیبر کا ذکر کر رہے ہیں وہ خیبر مدینہ منورہ سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر ہے جو زمانۂ دراز سے یہودیوں کا مرکز تھا۔ یہاں ساتویں ہجری میں رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں اسلام کی ایک فیصلہ کن جنگ لڑی گئی۔ یہودیوں نے بیس ہزار کی فوج جمع کی مگر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف سولہ سو جاں نثار تھے۔ یہودیوں کو کھلے میدان میں مسلمانوں سے لڑنے کی ہمت نہ تھی اس لیے انھوں نے مقابلہ کے لیے سات قلعے بنا رکھے تھے جن میں ایک قلعہ قموص نام کا تھا اور ان ہی سات میں بیس ہزار فوج

رکھی گئی تھی۔ جب مسلمانوں کے ہاتھوں جنگ میں چھ قلعے فتح ہو چکے تو قلعہ قموص، جس کا سردار مرحب تھا، جنگ میں کود پڑا جس کا مقابلہ حضرت علیؓ نے کیا اور قلعہ کے پھاٹک کو توڑ ڈالا۔ راویوں کا بیان ہے کہ جس پھاٹک کو ساٹھ ستر آدمی اٹھا سکتے تھے اسے حضرت علیؓ نے اکیلے اٹھا لیا۔ یہ تھا "بازوئے حیدر" جسے اقبال نے چوتھے شعر میں "زورِ حیدر" سے موسوم کیا ہے اور "بالِ جبریل" کی ایک رباعی میں اسے "بازوے حیدر" کا نام دیتے ہوئے مسلمانوں کے لیے خدا سے دعا کی ہے کہ ؎

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

حضرت علیؓ کے عشقِ رسول میں خیبر کی اس جنگ میں گرویدگی پر اقبال نے "بالِ جبریل" ہی کی ایک رباعی میں عشقِ رسول میں اس گرویدگی کو "خیبر شکن عشق" سے تعبیر کرتے ہوئے عشقِ رسول میں گرویدگی کی ایک علامت یہ بتائی ہے کہ ؎

کبھی سرمایۂ محراب و منبر کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

اقبال کے یہاں نام سے منسوب اصطلاحوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ ایک حضرت علی کے لقب "حیدر" سے اقبال نے "حیدر"، "حیدرِ کرار"، "کراری" اور "حیدری" اور "اسدی" سے "اسداللٰہی" وضع کی جن سے علی الترتیب کلام میں تین، دو، ... پانچ اور تین اشعار ہیں جب کہ حضرت علی سے یہ طور اصطلاح تین اشعار الگ ہیں۔ خیبر کی اس جنگ کے پس منظر میں اقبال نے یہودی مرحب کے نام سے منسوب "مرحبی" اور اس کے بھائی "عنتری" کی اصطلاحیں وضع کرکے مسلمانوں کو کفر پر تالیف آستے کی تلقین بنائی کی نظم "میں اور تو" (بعد از نظم "شیکسپیئر") میں اس طرح کی ہے کہ ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے وہی فطرتِ اسداللٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

"خیبر" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں دو ہی اشعار ہیں۔ دوسرا شعر بالِ جبریل کی غزل سوم کا ہے۔

قیصر کی اصطلاح کے زیر تجزیہ تیسرے شعر میں "شہرِ قیصر" سے مراد قسطنطنیہ ہے۔

چوتھے شعر میں "قیصر" سے مراد مغربی اور مشرقی دونوں رومی سلطنتیں ہیں جنھوں نے استبداد کو اسلام کے فدائیوں نے ختم کر کے نہر سوئز سے جبرالٹر تک بحیرۂ روم کے دونوں جانب اسلامی ریاستیں قائم کیں۔ اس شعر میں نام سے منسوب اقبال کی ایک اور اصطلاح "کسریٰ" ہے۔ جو ترجمان ہے ایرانی سلطنت کا۔ جیسا مضمون کے شروع میں کہا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اور اس کے بعد اس وقت دنیا کی یہی دو بڑی سلطنتیں ایرانیوں اور رومیوں کی تھیں جن سے مسلمانوں کو ٹکر لینی پڑی۔ "کسریٰ" کی اصطلاح معرب ہے، خسرو کا لقب نوشیرواں بادشاہ کا خصوصاً اور یہ لقب تھا شاہانِ فارس اور مدائن کا۔ اس کی جمع اکاسرہ آتی ہے۔ کیخسرو اور کسریٰ ایک ہی بادشاہ کا لقب تھا۔ "کسریٰ" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ خسرو سے اقبال نے دو اصطلاحیں وضع کیں۔ ایک "خسروانہ" جس سے کلام میں صرف ایک شعر ہے اور دوسری "خسروی" جس سے دو اشعار ہیں۔ مگر اقبال نے "کیخسرو" سے "کیخسروی" کی اصطلاح وضع کی جس سے تین اشعار ہیں۔ اس شعر میں کسریٰ کی مٹنے کی بات لا کر اقبال نے حضرت عمرؓ فاروق کے دورِ خلافت میں حضرت خالدؓ بن ولید کا ۱۲ھ مطابق [illegible]ء میں عراق پر قبضہ جو سلطنت ایران کا صوبہ تھا، پھر ابو عبیدہ ثقفی اور مثنیٰ بن حارث کا ایک سال بعد دریائے فرات کے کنارے بویب کے مقام پر ایرانیوں سے لڑی گئی جنگ، پھر سعد بن وقاص کی قادسیہ میں فتح اور آخر میں شاہ ایران

ہے جس سے صرف ایک ہی شعر ہے۔

اقبال کے کلام میں "فغفور" الگ اصطلاح ہے جس سے کلام میں بہت اشعار ہیں مگر "فغفوری" کی اصطلاح سے کل دو اشعار ہیں۔ اس سے پہلے کے دو مصرعہ میں اقبال نے موت کے یقینی ہونے پر سورۂ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۸۵، سورۂ العنکبوت ۲۹ کی آیت ۵۷، سورۃ الجمعہ ۶۲ کی آیت ۸ اور سورۃ نوح ۷۰ کی آیت ۴ کی ترجمانی کی ہے۔

دوسرے شعر میں "نوائے قیصری" سے مغربی ممالک کی ملک گیری اور ملوکیت مراد ہے اور تیسرے شعر میں "قیصری" سے مراد وہ بادشاہی ہے جو فوج اور خزانہ کی محتاج ہو۔ اس تیسرے شعر میں نام سے منسوب اقبال کی وضع کردہ ایک اصطلاح "سکندری" بھی ہے اور "شانِ سکندری" سے مراد دنیا میں کمال حاصل کرنا مراد ہے۔ اقبال نے یونانی سپہ سالار۔ اور تاریخ کے ایک عظیم فاتح سکندر اعظم کے نام سے کئی اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ ایک "سکندر" جو [illegible] آٹھ اشعار میں ہیں، دوسری "سکندرانہ" جس سے صرف ایک شعر ہے، تیسری "سکندری" جس سے چھ اشعار ہیں، چوتھی "اسکندر" جس سے چار اشعار ہیں اور پانچویں "اسکندری" جس سے کل دو اشعار ہیں۔

"مینڈر" اس اصطلاح سے ایک ہی درج ذیل شعر ارمغان حجاز کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا ہے، جہاں ابلیس اپنے مشیروں کو اطمینان دلاتا ہے کہ

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ آل سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

اس شعر میں "آل سیزر" سے مراد مسولینی ہے جس نے ۱۹۲۲ء میں اٹلی میں اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کر لی اور دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء - ۴۵) میں جرمنی کے ہٹلر کے ساتھ مل کر اتحادیوں سے جنگ کی مگر اسے خود اٹلی کے باشندوں نے ۱۹۴۵ء

میں پھانسی دے دی اور اتحادی روم پر قابض ہو گئے۔

نومبر ۱۹۳۱ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے بلائی گئی گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد واپسی میں اقبال نے اٹلی میں مسولینی سے ملاقات کی۔ دوران ملاقات جب مسولینی نے اقبال سے پوچھا کہ "میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" تو اقبال نے جواب دیا:۔

"آپ نے ڈسپلن کے اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہو سکتا ہے۔"

ایسے تو آل سیزر یعنی روم کے حکمرانوں کا ۱۹۱۱ء سے لیبیا پر قبضہ تھا ہی مگر متذکرہ شعر کا پس منظر مسولینی کا ۱۹۳۵ء میں ابی سینیا (موجودہ ایتھوپیا) پر غاصبانہ قبضہ ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ اقبال کے انتقال کے بعد انکی یہ پیشگوئی اور بھی صحیح ثابت ہوئی جب مسولینی نے دوسرے مسلم ملک البانیہ پر ۱۹۳۹ء میں قبضہ کر لیا۔

اقبال کے مجموعۂ کلام "ضرب کلیم" میں ایک خصوصی نظم "مسولینی" پر اور ایک خصوصی نظم بنام "ابی سینیا" اس غاصبانہ قبضہ پر ہے جو ابلیس کے ذریعہ آل سیزر کو سیزر کا خواب دکھانے کی تعبیر ہے۔

اقبال کامل

از مولانا عبدالسلام ندوی ؒ

اس میں علامہ اقبال کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ انکے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل ہے نیز انکی اردو فارسی شاعری پر انکے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور انکی شاعری کے اہم موضوعوں کی تشریح کی گئی ہے۔

قیمت ۔۴ روپے

وفیات

پروفیسر رشید الظفر مرحوم

گذشتہ ماہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ جامعہ ہمدرد دہلی کے لائق وائس چانسلر پروفیسر رشید الظفر کا انتقال ایک حادثہ میں ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ وہ سعودی عرب سفر پر تھے جہاں ریاض اور ظہران کی شاہراہ پر ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا اور اس طرح یہ سفر ان کے لیے سفر آخرت بن گیا۔

وہ مسلم یونیورسٹی کے قابل فخر طالب علم تھے۔ ان کے والد پروفیسر حفیظ الرحمٰن کلیمی اسی یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے ممتاز اساتذہ میں تھے۔ انہوں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی خاص مضمون اسٹرکچرل انجینئرنگ تھا، اس میں بیرون ملک کی دانشگاہوں سے بھی استفادہ کیا اور اعلیٰ سندیں حاصل کیں، معلم و متعلم کی حیثیت سے ان کی زندگی قابل رشک و مثالی رہی، صرف ۳۱ سال کی عمر میں وہ مسلم یونیورسٹی میں سول انجینئرنگ کے پروفیسر ہوگئے، بعد میں انہوں نے اس موضوع پر بین الاقوامی شہرت و مقبولیت حاصل کی، چنانچہ ظہران کی پٹرولیم یونیورسٹی میں جہاں عالم اسلام کے ممتاز ترین ماہرین فن کو یکجا کرنے کی سعی کی جاتی ہے ان کا بحیثیت پروفیسر تقرر ہوا اور وہاں انہوں نے برسوں نہایت خوبی سے تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیے، چند برس قبل جب دہلی میں ہمدرد یونیورسٹی کی شکل میں محترم جناب حکیم عبدالحمید دہلوی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تو حکیم صاحب کی جوہر شناس نگاہ ان پر پڑی اور وہ اس جامعہ کی وائس چانسلری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

اور اپنی جانکاہی، جگر سوزی، خاموش خدمت اور مسلسل جدوجہد و عمل سے نہایت قلیل مدت
ہی میں بڑی نیک نامی حاصل کی، اپنی مادر علمی یونیورسٹی کے اعلیٰ مقاصد سے ہمیشہ خاص
رابطہ و تعلق رکھا اور جب بھی اس پر کوئی آنچ آئی تو وہ سینہ سپر ہو گئے، ۱۹۷۲ء میں
مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کی وجہ سے جب اس کے بنیادی کردار کو ختم کرنے کی
سازش کی گئی تو انھوں نے نہایت وقار و پامردی سے اس کی مخالفت کی پاداش
میں وہ زیر عتاب بھی آئے لیکن بالآخر کامیاب و کامران ہوئے، دوسرے
معاملات میں بھی ان کا یہی حال تھا، انھوں نے ذاتی مفاد و حصول منفعت کیلئے
مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو قربان کرنا کبھی پسند نہیں کیا، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی
دور کرنے کے لیے وہ برابر سرگرم عمل رہتے تھے اور اس سلسلہ میں ہر تعلیمی و علمی ادارہ کے
متعلق باخبر اور فکرمند رہتے تھے۔

دارالمصنفین کے قدردان تھے، اس کے اراکین خصوصاً جناب حکیم عبدالحمید کے دیرینہ
تعلق اور اس کے مسائل سے ان کے تعلق کی وجہ سے بھی وہ یہاں کے ذمہ داروں
سے نہایت خلوص و محبت سے پیش آتے، ایک مرتبہ اس کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے
تو بہت مسرور ہوئے۔

بڑے عہدوں پر فائز رہنے [illegible] اور بے شمار
علمی اعزازات پانے کے باوجود وہ علمی پندار اور احساس تفوق میں مبتلا نہ ہوئے،
ان کے حسن اخلاق، جذبۂ ایثار و ہمدردی اور پاکیزہ نفسی کا تاثر ہمیشہ دلوں پر قائم ہوتا
رہا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نیک اعمال کو قبول فرمائیں اور اپنے جوار رحمت کی نعمت
سے سرفراز فرمائیں۔

"ع۔ص"

ادبیات

بہ یاد ۶ دسامبر ۱۹۹۲ء

از ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی علی گڑھ

بام و در ریختہ شد، گنبد و دیوار شکست — آہ کز منزل الفت ہمہ آثار شکست

آسمان بوس مقامات صفا و عرفان — تیرہ دل دستہ ای شیطان جفاکار شکست

پانصد سالہ بنائی کہ زبس محکم بود — ساعتی چند نہ رفتہ کہ بیکبار شکست

صانع ہر دو جہاں، سالزدہ دور زماں — بین کہ آں قصر محبت بچہ ہنجار شکست

سنۂ سیزدہم در سدۂ پانزدہم — اعتبار مہ و خورشید ضیا بار شکست

(۱۴۱۳ھ — ۱۰ جمادی الثانیہ)

غزل

از جناب محمد انعام اللہ صبا ہمی

کسی کی رہگذر ہے اور میں ہوں — مرا ذوق سفر ہے اور میں ہوں

نہیں کچھ اعتبار شوق پھر بھی — یہی رخت سفر ہے اور میں ہوں

میں اک ذرہ ہوں اس صحرا میں لیکن — شعور دیدۂ تر ہے اور میں ہوں

نگاہ لطف ہے کیا سحر آگیں — کہ ہر شے معتبر ہے اور میں ہوں

صبا یہ کون سا عالم ہے جس میں
فغان بے اثر ہے اور میں ہوں

مطبوعات جدیدہ

صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات از جناب مولانا سید جلال الدین عمری، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۸۸، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ یوپی ۲۰۲۰۰۱۔

انسان کی روح و قلب کی طرح اس کے بدن کی تندرستی اور جسمانی بیماریوں کے لیے بھی قرآن و حدیث میں نسخہ شفا موجود ہے، خصوصاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و تعلیمات میں ایسے اصول بکثرت ملتے ہیں جن کی بنیاد پر علم طب کی عمارت قائم ہے، اسلام کے دوسرے احسانات کی طرح موجودہ دور میں طب جدید نے اس کے اس احسان کے اعتراف میں بھی بخل سے کام لیا ہے، زیر نظر کتاب میں فاضل مصنف نے اسی جذبہ سے ان صحت بخش تعلیمات کی ضرورت و افادیت کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق نہایت دلکش اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے، انہوں نے فضائی آلودگی، منشیات کی کثرت اور ذہنی اضطراب جیسے مسائل کا جائزہ لے کر طہارت و غذا وغیرہ کی اہمیت بیان کی ہے، اس سلسلہ میں ایک باب میں مرض و علاج کی شرعی حیثیت اور حلال و حرام کے فرق کا بھی جائزہ لیا ہے، خودکشی کی ممانعت اور مریض کے قطع حیات جیسے مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے، ایک بحث میں انہوں نے محرمات کے ذریعہ علاج کے متعلق مختلف مکاتب فقہ کے خیالات

کو بھی پیش کر دیا ہے، روحانی علاج پر بھی مختصر بحث کی گئی ہے، اس طرح اس مفید کتاب میں طب اسلامی کا مکمل و جامع احاطہ کر لیا گیا ہے، مصنف کا اسلوب دل میں اتر جانے والا ہے اور یہ اس کتاب کی نمایاں خوبی ہے وہ حکیمانہ انداز میں اہم نکتے بیان کرتے جاتے ہیں مثلاً ایک جگہ سرمایہ دارانہ نظام کی نفسیات کو یہ لکھ کر واضح کیا کہ "ایڈز کی تحقیق و علاج میں جو رقم صرف ہو رہی ہے اس کا دسواں حصہ بھی ملیریا یا کالازار جیسی بیماریوں کے ختم کرنے پر صرف نہیں ہوتا، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایڈز اونچے طبقہ کی بیماری ہے اور ملیریا میں عام لوگ گرفتار ہوتے ہیں"۔ ایک جگہ لکھا کہ "تیمم سے طہارت نہیں حاصل ہوتی البتہ طہارت کا تصور زندہ رہتا ہے"۔ کتابت و طباعت کا معیار اعلیٰ درجہ کا ہے، البتہ ص ۲۵ پر ایک عبارت میں 'مغرب' کا لفظ دوبارہ آیا ہے اس میں پہلا لفظ مشرق ہونا چاہیے۔

سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے

از جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہترین، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۷، قیمت ۱۷۵ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر راؤز اوینیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

زیر نظر کتاب فاضل مولف کے ان چند مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جن کو وقتاً فوقتاً سرسید احمد خاں کے تعلق سے انھوں نے سپرد قلم کیا تھا، ان میں بعض مضامین سرسید کے نامور رفقاء مولانا حالی، نواب وقار الملک، شیخ عبداللہ اور مولوی فرید احمد امروہوی سے متعلق ہیں، لیکن زیادہ تر تحریروں کا موضوع سرسید

کی مفکرانہ اور مصلحانہ شان اور ان کے مقام بلند کی تعیین ہے، فاضل مولف نے ایک صاحب نظر مورخ کی حیثیت سے سرسید کے عہد اور ماحول کا جائزہ لے کر ان کی سیرت و شخصیت کے تابناک پہلوؤں کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ سرسید کے فکر و نظر کی بعض ناہمواریاں ان کی روح و جذبہ کی پاکی اور سچائی کے سامنے بے عیب نظر آتی ہیں، فاضل مولف کا خیال ہے کہ سرسید کی فکر کو محض ان کی تعلیمی جد و جہد یا ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل یا یہاں کے مخصوص سیاسی حالات کے پس منظر میں دیکھنا' بنیادی طور پر ایک غلط کوشش ہے' بلکہ ان کی فکر وسعی کو سمجھنے کے لیے اس زمانہ کے اور ایشیائی ممالک اور عالم اسلام کا پس منظر بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے' کیونکہ وہ مسلمانوں کی بہتری میں ہندوستان کی بہتری اور اس کی بہتری میں ایشیا کی بہتری دیکھتے تھے، سرسید کی مذہبی فکر کی بنیاد عقلیت' تطبیق اور اجتہاد پر تھی، اس سلسلہ میں جمال الدین افغانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار و خیالات اور سرسید کے اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، ایک جگہ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "خطبات احمدیہ دور جدید میں اسلامی فکر کا ایک سنگ میل ہے اور ان کی تفسیر قرآن کو معرکہ سائنس و مذہب کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے، سرسید کی تفسیر کے متعلق یہ بھی لکھا کہ "سرسید اور مولانا آزاد نے جس طرح اپنی تفسیروں کو اٹھایا ہے اس کا آخر تک نبھانا آسان نہیں تھا، ان دونوں تفسیروں کا نامکمل رہ جانا کوئی اتفاقی امر نہیں اس کے پیچھے فکری ماحول اور تحقیقی قدروں اور پیمانوں کی تبدیلی تھی" اس اجمال کی اگر وضاحت کر دی جاتی تو یہ بحث زیادہ دلچسپ اور فکر انگیز ہو سکتی تھی، البتہ انھوں نے یہ بجا طور پر لکھا کہ "سرسید کے طرز فکر نے ہندوستانی مفسروں کو

قرآن کی ایسی تفسیروں کی جانب متوجہ کر دیا جو وقت اور حالات کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں" فاضل مولف نے ایک جگہ یہ اعتراف کیا کہ سرسید کی فکر جس کی توانائی، افادیت اور مقصدیت اپنی جگہ مسلم تھی صدا بصحرا بن گئی، لیکن ان کے خیال میں سرسید کی سیرت کے تمام پہلو اگر کسی قالب میں پھر جمع ہو جائیں تو یہ فکر آج بھی اسی درجہ موثر ثابت ہو سکتی ہے، یہ کتاب متفرق مضامین کا مجموعہ ہے اس لیے بعض خیالات کی تکرار ظاہر ہے، لیکن بعض مضامین میں عبارتیں تک یکساں ہیں۔

فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں) از جناب پروفیسر

وحیدالدین، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۱۴۸

قیمت ۳۰ روپے ؛ پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

علامہ اقبال کی شاعری ہی ان کے فکر و فلسفہ کی حقیقی ترجمان ہے، لیکن انکے مشہور خطبات مدراس میں ان کے فلسفیانہ خیالات زیادہ دقیق و عمیق اور ایک مربوط شکل میں ظاہر ہوئے ہیں، اور زیر نظر کتاب کے فاضل مولف جو خود اچھے فلسفی ہیں کی نگاہ میں ان خطبات میں اسلامی الٰہیات کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ ارباب فکر و نظر کے لیے یہ خطبات اتبک موضوع بحث بنے ہوئے ہیں؟ فلسفہ اقبال کے طالب علموں کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے، لیکن اسلوب بحث کی دقت کی وجہ سے ان سے استفادہ آسان نہیں، اسی مقصد کے پیش نظر فاضل فلسفی مولف نے ان خطبات کی تلخیص و توضیح زیر نظر کتاب میں بڑی خوبی سے کی ہے، اس کے علاوہ فکر اقبال کا ابہام کے عنوان سے خود انکا ایک نہایت عمدہ مقالہ بھی اس میں شامل ہے اور تشریح مزید کی صورت میں تین

ضمیمے بھی ہیں، جن سے خطبات کے بعض مصطلحات اور اشخاص کو سمجھنے میں آسانی ہو گئی ہے، شروع میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے قلم سے ایک مختصر تعارفی تحریر بھی ہے، اس میں ان کا یہ خیال محل غور و نظر ہے کہ "اقبال کو غالباً بالکل اس کا اندازہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کا انگریزی داں طبقہ ذہنی سہل پسندی میں قدیم فکر والوں سے کہیں آگے تھا، اسے اسلام سے زیادہ تر جذباتی تعلق تھا، ذہنی و فکری سطح پر مجموعی اعتبار سے وہ طبقہ علماء کو ہی اپنا پیشوا سمجھتا تھا اور یہی صورت حال اب بھی ہے"۔

قوام العقائد مترجم جناب پروفیسر نثار احمد فاروقی، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۱۳۱، قیمت ۴۰ روپے،
پتہ: ادارہ نشر و اشاعت، جامع العلوم فرقانیہ، مسٹن گنج، رامپور، یوپی ۲۴۴۹۰۱

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ایک مرید و خلیفہ شمس العارفین حضرت قوام الدینؒ نے امیر حسن سجزیؒ دہلوی کے مانند اپنے پیر و مرشد کے واقعات و حالات کی روایت کی جن کو ان کے پوتے محمد جمال قوام نے ان کی زندگی ہی میں قلم بند کر لیا تھا جو اہمیت میں فوائد الفواد سے کم نہیں لیکن تعجب ہے کہ یہ نہایت بیش قیمت مجموعۂ روایات اب تک پردہ خفا میں رہا اور حضرت محبوب الٰہی کے تذکرہ نگاروں کی رسائی اس تک نہیں ہو پائی، اب جناب نثار احمد فاروقی کو اس کا ایک نادر قلمی نسخہ دستیاب ہوا تو انہوں نے تصحیح و تحشیہ کے بعد اسے اصل فارسی زبان میں شایع کر دیا، یہ کتاب انہی کے قلم سے اسی کا ترجمہ ہے، جو پہلے رام پور کے ماہنامہ ضیاء وجیہہ کے خاص شمارہ کی شکل میں شایع کیا گیا اور اب اسی ادارہ نے عام فائدہ کے لیے کتابی صورت میں شایع کر دیا ہے، ترجمہ کی خوبی کے لیے فاضل مترجم کا نام ہی

پوری ضمانت ہے' ان کا فاضلانہ مقدمہ بھی ان کی ژرف نگاہی اور رعنائی بیان کا نمونہ ہے جس سے اس نسخہ کی تاریخی اہمیت، راوی کی شخصیت اور مشمولات کی امتیازی خصوصیات کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔

نظام رنگ از جناب ڈاکٹر اسلم فرخی، متوسط تقطیع اور عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۱۷، قیمت ۳۰ روپے پتہ: احسن مطبوعات، ب ۔ ۵/۱۵۵ گلشن اقبال، کراچی، پاکستان۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سوانح پر مشتمل یہ ایک ادبی خاکہ ہے اور چونکہ صاحب سوانح کی ذات بابرکات لائق مولف کی فکر و نظر اور محبت و عقیدت کا محور ہے اس لیے اس میں تاثیر اور دلکشی کی تمام خوبیاں ہیں اور طرز و اسلوب کی جدت اس پر مستزاد ہے، بڑی بات یہ ہے کہ اس میں کرامتوں اور تصرفات روحانی کا سہارا نہیں لیا گیا بلکہ سلطان المشائخ کے مکارم اخلاق، پاکیزہ اعمال اور معاشرتی اصلاح کے پُرخلوص جذبہ کو اس خوبی سے نمایاں کیا گیا ہے کہ یہ خاکہ شنیدہ مانند دیدہ کی کیفیتوں سے معمور ہوگیا ہے، مصنف کی یہ انوکھی ادا داد کے لائق ہے۔

رنگ و آب از جناب سید محمود حسن قیصر امروہوی متوسط تقطیع کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ مجلد مع گرد پوش صفحات ۲۰۸ قیمت ۸۵ روپے پتہ: سید محمود حسن قیصر امروہوی ۶۲/۴ زہرا باغ علیگڑھ

جناب سید محمود حسن قیصر امروہہ کی قابل احترام علمی و ادبی روایات کے وارث و امین ہیں، انکی کئی کتابیں اردو اور انگریزی میں طبع ہوئی ہیں اور انکی تحریریں معارف کے علاوہ ملک کے دیگر مجلوں کی زینت بنتی رہی ہیں، زیر نظر مجموعہ کلام انکے شعری کمالات کا آئینہ ہے اس میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ دیگر اصناف سخن جیسے قطعات، قصائد، مراثی و مناقب اور سہرے وغیرہ بھی شامل ہیں اور ان سے شاعر کی قادر الکلامی اور مشاقی صاف نمایاں ہے خصوصاً حصہ نظم زیادہ جاذب اور پُراثر ہے۔

ع ۔ ص ۔

تصنیفات علامہ شبلیؒ وعلامہ سید سلیمان ندویؒ

علامہ شبلیؒ		قیمت	علامہ سید سلیمان ندویؒ		قیمت
سیرۃ النبیؐ	اول	۶۵۔۰۰	سیرۃ النبیؐ	سوم	۱۲۵۔۰۰
"	دوم	۵۰۔۰۰	"	چہارم	۱۲۵۔۰۰
لفاروق		۹۵۔۰۰	"	پنجم	۶۰۔۰۰
لمامون		۵۰۔۰۰	"	ششم	۱۲۵۔۰۰
کلام		۵۰۔۰۰	"	ہفتم	۳۵۔۰۰
م الکلام		۳۵۔۰۰	خطبات مدراس		۲۵۔۰۰
لام اور مستشرقین	چہارم	۴۰۔۰۰	الرسالۃ المحمدیہ (ترجمہ خطبات مدراس عربی)		۴۰۔۰۰
ر العجم	اول	۴۰۔۰۰	رحمت عالم		۱۰۔۰۰
"	دوم	۳۵۔۰۰	تاریخ ارض القرآن	دوم	۳۰۔۰۰
"	سوم	۲۵۔۰۰	عرب وہند کے تعلقات		۷۵۔۰۰
"	چہارم	۳۵۔۰۰	سیرت عائشہؓ		۴۰۔۰۰
"	پنجم	۲۵۔۰۰	حیات شبلیؒ		۹۰۔۰۰
ات شبلی اردو		۲۵۔۰۰	یاد رفتگاں		۵۰۔۰۰
تیب شبلی	اول	۴۰۔۰۰	رسالہ اہلسنت والجماعت		۱۰۔۰۰
"	دوم	۳۰۔۰۰	اسلام اور مستشرقین	پنجم	۲۵۔۰۰
ات شبلی (مکمل سیٹ)		۲۲۰۔۰۰	دروس الادب	اول	۵۔۰۰
			"	دوم	۵۔۰۰
ات شبلی		۲۵۔۰۰	شذرات سلیمانی		۴۵۔۰۰
			برید فرنگ		۲۵۔۰۰
ات شبلی		۲۵۔۰۰	نقوش سلیمانی		۶۰۔۰۰
			خیام		۶۵۔۰۰
....		......	مقالات سلیمان	سوم	۴۵۔۰۰

معارف اعظم گڈھ

کی

۵۴ ویں جلد

ماہ جولائی ۱۹۹۴ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۵۴ ویں جلد

ماہ جولائی ۱۹۹۴ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۵۴

ماہ جولائی ۱۹۹۴ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)